حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
کی
سیاسی ڈائری
اخبار و افکار کی روشنی میں
(جلد ہشتم)
(سلسلہ مقالات)
مقالاتِ سیاسیہ
حصہ سوم
تالیف و تدوین
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

سیاسی ڈائری

اخبار وافکار کی روشنی میں

جلد ہشتم

(سلسلہ مقالات)

مقالاتِ سیاسیہ

(حصہ سوم)

مختلف اہلِ قلم

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی
سیاسی ڈائری
(جلد ہشتم)
مقالاتِ سیاسیہ (حصہ سوم)

تالیف و تدوین .... ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام .... محمد ناصر خان

صفحات 1048

اشاعت 2018ء

Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki
Siyasi Diary
Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein
(Vol. 8)
Maqâlât-e-Siyasiyyah (Part-3)

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri
Edition : 2018
Pages : 1048

ناشر

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998
E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com
Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمد اللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبۂ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیرِ نظر کتاب **''حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں''** شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند ومعتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے تالیف ومدوّن کیا ہے۔ 'سلسلہ **مقالاتِ سیاسیہ**' اسی سلسلے کے نہایت اہم مرقعے ہیں جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تحریر کردہ نادر سیاسی مقالات کے مجموعے ہیں۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی سوسالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرینِ جمعیۃ علماء ہند کی یاد میں ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغِ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دارالعلوم دیوبند و جمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

مقالات سیاسیہ (جلد سوم)

متعلقہ سیاسی ڈائری (جلد ہشتم)

پیش لفظ

۱۹۰۵ء میں جنگِ جاپان وروس میں جاپان لی فتح نے ایشیا میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، بنگال میں انقلابی تحریکات کو جو شروع ہو چکی تھیں، اسی سے تقویت ملی تھی، اور ان میں ایک جوش اور سرگرمی پیدا ہو گئی تھی، ان تحریکوں کے روابط پنجاب کے انقلابی عناصر تک پھیلے ہوئے تھے، مسلمان نوجوان بھی ان تحریکوں سے متاثر ہو رہے تھے، انگریز جو ہواؤں میں خطرات کی بو سونگھ لیتے تھے، آزادی کی تحریکات کی طرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر پہلے چوکنے ہوئے تھے، اب متوحش ہوئے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری کی خلیج کو وسیع کرنے کے لیے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت ایک منصوبہ بنایا، مسلمانوں کے مفاد کے نام پر بنگال کی تقسیم کا اعلان کر دیا (فروری ۱۹۰۴ء)۔ مسلمانوں کا ایک پرجوش اور برطانوی حکومت کا پروردہ و پرستار طبقہ اس اعلان کو نیک نیتی پر مبنی فیصلہ سمجھ بیٹھا، لیکن سنجیدہ غور و فکر کرنے والا، صاحبِ نظر و بصیرت اور ملک کی آزادی سے دلچسپی رکھنے والا مسلمان طبقہ جو انگریز ڈپلومیسی کو سمجھتا تھا، اس اعلان سے متاثر نہیں ہوا، یہ اعلان، اعلان ہی رہا، اور تقسیم کی مخالف تحریک کے مقابلے کی تاب نہ لا کر ۱۹۱۱ء میں انگریز نے اس اعلان کو واپس لے لیا، حکومت کے اس فیصلے نے حکومت کے حامیوں اور وفاداروں کو سخت مایوس کیا، نواب سلیم اللہ خاں جو بہت سرگرم تھے بہت مایوس ہوئے اور سیاست ہی سے ریٹائر ہو گئے، لیکن ہندو مسلم اتحاد اور حریت پسند تحریکوں کو اس سے بڑی تقویت ملی، کامریڈ کلکتہ (۱۹۱۱ء)، الہلال کلکتہ (۱۹۱۲ء) ہمدرد دہلی (۱۹۱۳ء) کے اجرا نے ان تحریکات کو اور زیادہ مؤثر بنا دیا، جنگِ بلقان اور ترکی کے حالیہ حوادث (۱۳-۱۹۱۲ء) اور مسجدِ کانپور کے واقعے (۱۹۱۳ء) نے انگریزوں کے خلاف ملک

کے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔

ملک کی آزادی کا مسئلہ گلی کوچوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا، ترکی خلافت، اس کے مقبوضات اور اس کے حدود و اختیارات کا مسئلہ جلسوں اور اخبارات کے صفحات میں چھڑا ہوا تھا، مکہ کا شریف (گورنر) حسین ترکی خلافت سے بغاوت، عربوں کی آزادی اور اپنی امارت کا اعلان کر چکا تھا، برٹش استعمار اور اس کے عزائم و مقاصد نے مقاماتِ مقدسہ کے بقا و تحفظ کے لیے خطرات پیدا کر دیے تھے، ملک کی آزادی کا مسئلہ پہلے سے تھا، اور جنگِ عظیم اول کے ختم ہوتے ہی وہ اُبھر کر دنیا کے سامنے آ گیا تھا، ملک کی حریت پسند قوتیں تحریکِ آزادی کو آگے بڑھانے کا سر و سامان کر رہی تھیں، ملک میں بنگال سے پنجاب و سرحد تک انقلابی تحریکیں سرگرمِ عمل تھیں، ۱۹۱۵ء میں ترکی خلافت کی محبت میں لاہور کے کالجوں کے کچھ طلبہ نے افغانستان فرار ہو کر اور ۱۹۱۷ء میں ریشمی رومال کی تحریک کے انکشاف نے حکومت کو چوکنا کر دیا تھا، کہ اب وفادارانِ ازلی کی وفاداریوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، تحریک سے متعلق شخصیات کی گرفتاریوں اور نظر بندیوں نے ملک میں برٹش حکومت کے خلاف نفرت کی فصل تیار کر دی تھی، رولٹ ایکٹ کے نفاذ نے ملک میں عام بے چینی پھیلا دی تھی، وائسرائے کی کونسل کے بعض حریت پسند اور قوم کے غم خوار ارکان نے استعفیٰ دے دیا تھا، گاندھی جی نے ملک کے عام جذبات کو منظم کر دیا تھا، اور عوام کے غم و غصے کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی، جلیاں والا باغ (امرتسر) کے واقعے نے قوم کے جذبات کو اور زیادہ بھڑکا دیا تھا، اس پر حکومت کے ظالمانہ اور پر تشدد رویے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی حکومت کے خلاف مغرب سے مشرق تک اور شمال سے جنوب تک نفرت کے جذبات پھیل گئے تھے، جس پر قابو پانا حکومت کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

جمعیت علمائے ہند کا قیام اسی پر آشوب اور ہنگامہ خیز دور میں عمل میں آیا تھا، اس نے اپنے قیام کے اول دن سے حالات کی سنگینی اور راہِ عمل کی مشکلات کا اندازہ کر لیا

تھا، اس کے سامنے ملک اور بیرونِ ملک اور فرد سے لے کر طبقات تک کے تمام حالات، اور قوم وملت کے تمام مسائل اور ان کے اسباب تھے، تحریکِ خلافت منظّم ہوئی تو اس کے مقاصد میں خلافت ترکی کے مسئلے کے حل کے علاوہ ملک کے سوراج کا حصول شامل کیا، تا کہ برٹش استعمار کے خلاف ایک منظّم، بھرپور اور متحدہ تحریک چلائی جا سکے، اور جمعیت علماے ہند کے اغراض و مقاصد میں مسلمانوں کی اجتماعی، معاشرتی، مذہبی، تہذیبی، تعلیمی ضرورتوں کے ساتھ ملک کی آزادی، قوم کی بہبود، عوام کی ترقی کے مسائل کا اعتراف اور حصولِ مقاصد کے لیے عزائم کا اظہار موجود تھا، جمعیت علماے ہند کے سامنے مقاصد کی تقسیم کچھ اس طرح تھی:

۱۔ ملّی دایرے میں خاص مسلمانوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و ترقی، تنظیم واتحاد کی ضرورتیں، اور مذہبی، اخلاقی، تہذیبی اور دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے بے شمار مسائل تھے، اور ان کا انتظام مسلمانوں کو خود کرنا تھا۔

۲۔ ملکی اور قومی دایرے میں آزادی کا مسئلہ سب سے اہم تھا، اسی پر ملک اور قوم کی آیندہ معاشی، اقتصادی ترقی، قوم کی فلاح و بہبود کا دارومدار اور مستقبل کی آرزوؤں کا انحصار تھا۔

۳۔ بین الاقوامی دایرے میں سب سے پہلے مسلم ممالک کو استعمار کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانا تھا، آزادی کے حصول میں ملک کی انقلابی قوتوں اور تحریکوں کو امداد دینا اور قوت بہم پہنچانا تھا، ان کے حدودِ مملکت کو مستحکم، غیروں کی مداخلت سے پاک، مقاماتِ مقدسہ کو محفوظ اور ان کی حکومتوں کو مضبوط بنانا تھا اور

۴۔ انسانیت کے میدان میں بلا امتیاز مذہب و قوم سب کی خدمت کرنا اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دینا تھا۔

جمعیت علما نے اپنے مقاصد کے ہر دایرے اور خدمت کے ہر میدان میں اپنی بہترین خدمات کا نمونہ پیش کیا اور اخلاص وایثار کا ثبوت دیا، ملکی اور قومی دایرے میں جنگِ آزادی میں جان و مال کے ایثار سے اور ہر طرح کی قربانیوں سے حصہ لیا، اور ملّی

دایرے مسلمانوں کی اصلاح و تعلیم، اتحاد و اتفاق، تعلیم کی اشاعت، اسلام کی تبلیغ، اوقاف کی تنظیم، مدارس اور مساجد کی اصلاح و تنظیم، معاشی، اقتصادی حالات کی درستگی میں بہترین صلاحیتوں اور وسائل کو کام میں لایا گیا، لیکن میں یہاں جمعیت علماے ہند کی خدماتِ ملّی کے ایک خاص دایرے کی طرف توجہ دلاؤں گا، جمعیت کی ملّی جدوجہد کا یہ اہم محاذ اس کے قیام سے رہا ہے، یہ محاذ مسلمانوں کے تہذیبی، دینی، سماجی نظام کے تشخص اور اسے مسلمانوں کے استحقاق کے طور پر تسلیم کرانے اور انہیں قانونی و دستوری تحفظ دلانے کا تھا، اس سلسلے میں اسے کئی دایروں اور سطحوں پر کام کرنا پڑا!

۱۔ کام کا ایک دایرہ یہ تھا کہ مذہبی، تہذیبی، تعلیمی معاملات میں کانگریس کی عنان فکر درست رہے، اور اسے اعتدال و اقتصاد کی راہ سے ہٹنے نہ دیا جائے، کانگریس ملک کی سب سے بڑی اور مقتدر جماعت تھی، یا ہندوستان کی مختلف اقوام کا مشترکہ پلیٹ فارم تھا، اپنے قیام کے آغاز سے ہندوستان کی اقوام و مذاہب کے مسائل، ان کے تضادات، اختلافات ونزاعات کے ہجوم میں اعتدال و توازن کی پُرامن اور دستوری راہ نکالنا اس کے مقاصد میں شامل تھا، اس کا کوئی اجلاس ایسا نہیں ہوا جس میں مذہبی، تہذیبی، تعلیمی...... کوئی نہ کوئی مسئلہ پیش نہ ہوا ہو، اور اس نے اس کے حل کی راہ تلاش کرنے کی سعی نہ کی ہو۔

۲۔ جمعیت کا دوسرا اہم کام ہمیشہ یہ رہا کہ ملک کی ادنیٰ اور اعلیٰ سطح کے قانون ساز اداروں اور دستور ساز اسمبلیوں کے ارکان کو کسی بل کی اہمیت اور اس کے مالہٗ و ما علیہ سے واقف کرائے اور انھیں بل کی حمایت کے لیے آمادہ کرے۔

۳۔ تیسرا دایرۂ کار ابلاغ عامہ کے ذرایع سے کسی بل کو پاس کرانے یا کسی بل میں ترمیم اور تنسیخ کے لیے راے عامہ کو ہموار کرنے اور اس سے بااختیار اداروں اور افراد پر دباؤ ڈالنے کا تھا۔

۴۔ جمعیت علماے ہند نے اس دستور و قانون سازی کے اداروں کے اندر اور باہر ہر سطح پر سب سے زیادہ قانونی جنگیں لڑی ہیں، ان میں ساردا ایکٹ، سول میرج

ایکٹ، شریعت بل، قاضی بل، نکاح و طلاق کے قانون، اوقاف بل، واردھا تعلیمی اسکیم، ودیامندر اسکیم، جبری تعلیم کے بل، قانونِ وراثت، مسجدوں، خانقاہوں، درگاہوں، قبرستانوں پر ناجائز قبضوں کے مقدمات، ان کی واگذاریوں میں قانونی رکاوٹوں اور دشواریوں کے مسائل، حتیٰ کہ کسٹوڈین اور بحالیات کے قوانین کی تیاری اوران کی ترمیم و تنسیخ کے ایک ایک نکتے پر، ایک ایک پہلو پر، اوران کی ذیلی و ضمنی دفعات اوران کے مفاہیم و اطلاقات کے ہر ہر پہلو پر طویل اور مسلسل دستوری اور قانونی جنگیں لڑیں اور معرکے سر کیے ہیں۔

ان مسائل اوران کے متعلقات میں جمعیت علماے ہند کی کارگذاریاں، اس کی تاریخ کے معلوم واقعات ہیں، میں یہاں قارئینِ کرام کی توجہ ایک اور میدان میں اس کے مساعی کی طرف بھی دلانا چاہتا ہوں، یہ میدان ہندوستان میں قیامِ نظم جماعت کے لیے جدو جہد کا میدان ہے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک آزاد ملی نظام کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا، مولانا نے اس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو آمادہ کیا تھا، لیکن ۱۹۱۵ء میں حضرت کے سفرِ حجاز پر روانگی کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، مارچ ۱۹۱۶ء میں خود مولانا کو کلکتہ سے خارج البلد کردیا گیا، مولانا رانچی (بہار) چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہیں انھیں نظر بند کردیا گیا، نظر بندی کا یہ سلسلہ ۱۹۲۰ء تک پورے چار سال جاری رہا، اُدھر ۱۹۱۶ء کے اواخر میں حضرت شیخ الہند کو مکہ میں گرفتار کر کے جزیرۂ مالٹا میں لے جا کر قید کردیا گیا، اس طرح نظم جماعت کا منصوبہ پورا نہ ہوسکا، البتہ مولانا آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے دوران اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رانچی سے مولانا آزاد کو رہائی ملی، اور اسی سال کے وسط میں حضرت شیخ الہند مع اپنے رفقا کے مالٹا سے رہائی پاکر وطن واپس پہنچے، لیکن ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی، اور وہ موت کے کنارے پہنچ چکے تھے، ان کی وطن واپسی پر ابھی چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء کو حضرت کے

انتقال کا حادثہ پیش آ گیا، مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریک کو اپنی صوابدید پر جاری رکھا، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ صرف بیگانوں ہی میں کوئی شخص اس کی اہمیت سے آشنا نہیں بلکہ اپنوں کی کم فہمی اور تعصبات نے بھی تحریک کے راستے مسدود کر دیے ہیں، تو انھوں نے اس کی ذمہ داری جمعیت علماے ہند کے تیسرے اجلاس (۱۹۲۱ء) میں اس کے سپرد کر دی، اور خود اس کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو گئے، جمعیت علماے ہند کے راستے میں بھی مشکلات کی کمی نہ تھی، لیکن اس نے اپنی زندگی کے ایک طویل دور تک اسے کامیاب بنانے کی کوشش جاری رکھی، اس مجموعۂ تحریرات میں اس تحریک کے بارے میں ''مسودۂ فرائض واختیارات امیر الشریعۃ فی الہند، مسودۂ نظام نامہ امیر الشریعۃ فی الہند اور مسودۂ نظارت امورِ شرعیہ'' کے عنوان سے تین نہایت اہم دستاویزات شامل ہیں، یہ وہی تحریک ہے جس کے تحت صوبائی سطح پر بہار میں امارت شرعیہ کا نظام عمل میں آیا تھا، پنجاب میں ابتدائی سطح سے کام آگے نہ بڑھ سکا، اور یہی صورتِ حال کل ہند سطح پر بعض رکاوٹوں کی وجہ سے پیش آئی کہ بعض ابتدائی کاموں کے سوا بات آگے نہ بڑھ سکی، اس مجموعے کی چند تحریرات سے اس تحریک پر اور اس سلسلے میں جمعیت علماے ہند کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اور مذہبی حقوق کی جنگ کی تاریخ ۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ سے شروع ہوتی ہے، حال آں کہ یہ مسئلہ کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے زیرِ غور آ رہا تھا، اور حقوق کے تعین اور ان کے لیے قانونی و دستوری تحفظات کے لیے قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور اس وقت بھی جب جمعیت علماے ہند کا قیام عمل میں نہ آیا تھا، اس کے بزرگ اس جنگ میں مصروف تھے۔

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ ۱۹۱۶ء میں جب کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین فرقہ وارانہ حقوق کے مسئلے پر ایک معاہدہ کیا گیا جسے عام طور پر ''میثاقِ لکھنؤ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسے مسلم لیگ کی تاریخ میں تو محمد علی جناح کا بڑا کارنامہ بیان

کیا جاتا ہے، لیکن مسلمان مدبرین کی اکثریت نے اسے پسند نہیں کیا تھا، دیوبند کے نامور عالم دین، مشہور فقیہ اور مدبر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی نے جو بعد میں جمعیت علمائے ہند کے پہلے صدر مقرر کیے گئے، اس معاہدے پر تنقید کی اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق میں جو حق تلفی کی گئی تھی اس کے تدارک کے لیے تجاویز پیش کیں، ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت کے چیلنج سے بہت پہلے کانگریس ہندوستان کے دستور کی تیاری کا قدم اٹھا چکی تھی، چناں چہ کانگریس کی ایک کمیٹی نے جس کے ارکان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، لالہ لاجپت رائے وغیرہ تھے ایک ''میثاقِ ملیہ ہند'' مرتب کر کے تنقید و تبصرہ کے لیے شایع کیا تھا، جمعیت علمائے ہند نے اس پر رائے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی تھی، انھی مسائی کے سلسلے میں ایک ''میثاق ملیہ ہند'' بنگال پراونشیل کانگریس کمیٹی نے تجویز کیا تھا، ''جمعیت علماء کیا ہے؟'' میں یہ میثاق بھی شامل ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے لالہ دیش بندھو داس نے نہایت پر جوش اور مدلل تقریر فرمائی اور کہا:

''نمایندگی کا اصول صرف آبادی کے تناسب پر طے کیا جا سکتا ہے، اور کوئی صورت نہیں، جب بنگال میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے تو یقیناً ان کی نمایندگی بھی زیادہ ہوگی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ آج ۲۵ فی صد ان کو دے دو، کل ۳۰ فی صد کر دو اور پرسوں ۳۵ فی صد بنا دو۔ دفتری حکومت بھی تو یہی کرتی ہے۔ ہم کو تو یہ شایاں نہیں ہے۔ اگر واقعی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج نہیں ہو سکتا تو پھر اس اتحاد کو مضبوط بنیاد پر قایم کرو اور جس کا جو حق ہے خلوص و صداقت کے ساتھ وہ اسے دے دو، اس مسئلے میں ہر صوبہ اپنی حالت کو دیکھ کر خود طے کر لے۔ ان معاملات میں ہر صوبے کو آزادی ہونی چاہیے۔''

اس بیان کی معقولیت محتاجِ تبصرہ نہیں، یہ ٹھیک وہی اصول ہے جس کی طرف حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے میثاق لکھنؤ پر اپنے تبصرے میں اشارہ کیا ہے،

اور جمعیت علماے ہند کا ہمیشہ یہی اصول رہا ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اسے دے دو، اس کے بغیر اعتماد و اطمینان کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔

۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر بحث و نظر کا جو معرکہ پیش آیا تھا، اس میں جمعیت علماے ہند کی تنقید سب سے معقول و متوازن تھی، اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کے بعد تمام غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات پر عموماً اور مسلمانوں کے ہمہ قسم کے حقوق کے تمام مباحث کو خصوصاً دفعہ وار مرتب کر دیا گیا ہے۔

اسلامی پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت کی ایک بدترین مثال ۱۹۲۹ء میں "ساردا ایکٹ" کا نفاذ ہے، مسلمانوں نے ہر چند احتجاج کیا کہ اس قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا جائے، لیکن مسلمانوں کی ایک نہیں سنی گئی اور بشمول مسلمانوں کے اسے ملک میں نافذ کر دیا گیا، مسئلہ یہ تھا کہ شریعت اسلامیہ نے اجازت دی ہے کہ:

"جب لڑکا ۱۸ سال سے پہلے بالغ ہو جائے یا لڑکی ۱۴ سال سے پہلے بالغ ہو جائے اور قواے جسمانیہ کے قوی اور مستحکم ہونے کی وجہ سے اس کے زنا میں مبتلا ہو جانے یا کسی مرض کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ولی پر اور خود لڑکے اور لڑکی پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ نکاح کر لے۔"

ساردا ایکٹ کی بنیاد اسلام کی بخشی ہوئی اس اجازت کے خلاف تھی، اس سلسلے میں جمعیت علماے ہند نے لیجسلیٹو کونسل میں اس کے ارکان کے ذریعے، اخبارات میں مضامین اور جلسوں میں تقاریر کے ذریعے کوشش کی کہ اس قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا جائے، یہ اسلامی شریعت میں صریح مداخلت ہے، اس سلسلے میں جمعیت علماے ہند کے صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی نے وائسراے ہند لارڈ اروِن کو ایک نہایت مفصل اور مدلل خط لکھا تھا، اور بتایا تھا کہ اس قانون سے مسلمانوں کی بیزاری اور اس کی مخالفت کے اسباب کیا ہیں؟ مثلاً:

الف۔ گورنمنٹ کے وعدوں اور اعلانوں کے خلاف ہے،

ب۔ اس سے مذہبی مداخلت ہوتی ہے،

ج۔ مسلمان قوم کی نارضامندی کے باوجود اس کا اطلاق مسلمانوں پر بھی کیا گیا ہے،

د۔ اس کی حیثیت آئینی نہیں جبری ہے،

ہ۔ اس قانون کے پاس ہو جانے سے ایک ایسا خطرناک اصول قایم ہو گیا ہے، جس سے مسلمانوں کے مخصوص شرعی قانون (پرسنل لا) میں مداخلت کا دروازہ کھل گیا ہے، اور اس کے محفوظ رہنے کا کوئی اطمینان نہیں رہا۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے ہر پہلو سے اس قانون کے ناواجب ہونے کو ثابت کیا ہے، یہ خط اخبارات میں بھی شایع کرادیا گیا تھا، اور جب ۷؍ جنوری ۱۹۳۰ء کو جمعیت علماے ہند نے اس قانون کے نفاذ کے خلاف یوم احتجاج منایا تو اسے جلسوں میں پڑھ کر سنایا گیا، اور کتابچے کی شکل میں چھاپ کر شایع کیا گیا، اور جمعیت علماے ہند کی جانب سے اس کے ناظم حضرت مولانا احمد سعید دہلوی نے اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی سے چھپوا کر شایع کر دیا تھا، مسلم پرسنل لا کو حکومت کی مداخلت سے بچانے اور شریعت اسلامیہ کے تحفظ کے لیے جمعیت علماے ہند کی یہ اہم خدمت تھی جو اس نے انجام دی، لیکن افسوس! حکومت اور غیر مسلموں کی مداخلت کی بجائے مسلم لیگی اراکینِ کونسل نے اپنا سارا زور اس قانون کے منوانے میں صرف کر دیا اور جمعیت کی مساعی کو ناکام بنادیا۔

واضح ہو کہ جب یہ بل سینٹرل اسمبلی میں پیش ہوا تھا تو اس کا دایرۂ اثر ہندوؤں تک محدود تھا، اور اسی لیے ''ہندو چائلڈ میرج بل'' کے نام سے پیش ہوا تھا، لیکن مسٹر جناح پر اس کی افادیت اس طرح واضح ہوئی کہ جب بل پاس ہو کر ایکٹ بنا تو قانوناً اس کا نفاذ مسلمانوں پر بھی ہوتا تھا، سر محمد یامین خاں نے اپنی خودنوشت ''نامۂ اعمال'' میں اس کا مختصر ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''۲۳؍ ستمبر (۱۹۲۹ء) ''ہندو چائلڈ میرج بل'' جو سارda بل کے نام

سے مشہور ہے، اور پہلے وہ ہندوؤں کی شادی کی بابت تھا، اور کئی دن سے پیش ہو رہا تھا، سلیکٹ کمیٹی میں جا کر اس کا اطلاق تمام ہندوستانیوں پر ہو گیا، اب یہ تجویز ہوئی کہ ۱۶ سال سے کم عمر لڑکی اور ۱۸ سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کرنا جرم ہے، جو نکاح پڑھائے وہ بھی مجرم، لڑکے لڑکی کے والی بھی مجرم اور جو جان بوجھ کر ایسی شادی میں شریک ہوں وہ بھی مجرم۔

میں نے کہا کہ میں قانونِ شرع کے خلاف گورنمنٹ کا ساتھ نہیں دے سکتا، میں نے کہا کہ جس وقت لڑکی بالغ ہو جائے اس کو شادی سے کوئی نہیں روک سکتا، تمام قانون دانوں اور قانون سازوں کا فیصلہ ہے کہ لڑکی پندرہ سال میں بالغ ہو جاتی ہے...... لہٰذا پندرہ سال کی لڑکی کی شادی کو جرم بنانا قانونِ شرع کے خلاف ہے اور لڑکے پر پابندی لگانا کہ وہ اٹھارہ سال کی عمر تک شادی نہ کرے بالکل غلط ہے۔ اگر لڑکے میں سولہ سال کی عمر میں جنسی خواہشات پیدا ہو جائیں اور اس کو شادی سے روکا جائے تو گویا اس کو بدچلنی کی ترغیب دی جائے گی، اور امیر لڑکا خراب عورتوں کے پھندے میں پھنس جائے گا، اس لیے اصولاً میں اس دفعہ کا مخالف ہوں کہ اس کو جرم بنایا جائے، لیکن چند مسلمان ممبران نے ہی میری مخالفت کی، اور یہ دفعہ کثرت رائے سے پاس ہو گئی اور سارد ھا بل پاس ہو گیا۔"

(نامۂ اعمال، لاہور ۱۹۷۰ء، جلد اول ۱۶-۳۱۵)

اس اقتباس کے پہلے پیراگراف سے اس قانون کی نوعیت، مقصد اور اس کے دائرۂ اطلاق پر بخوبی روشنی پڑتی ہے، دوسرے پیراگراف کی دو باتوں کے متعلق عرض ہے:

۱۔ سر یامین خاں کا یہ کہنا کہ گویا شریعتِ اسلامیہ کے احترام میں انھوں نے گورنمنٹ کا ساتھ نہیں دیا تھا، تو یہ بات تکلف سے خالی نہیں، مرحوم کتنی ہی بار شریعت کے واضح احکام کی اسی اسمبلی میں مخالفت کر چکے تھے، اسلامی شرعی بل پیش کرنے

والوں کا تمسخر اڑا چکے تھے، اپنی جدت پسندانہ ترمیمات سے ان کی شکل بگاڑ چکے تھے، یا انھیں ناکام بنا چکے تھے، اب اگر انھوں نے حکومت کا ساتھ نہیں دیا تھا تو اس لیے کہ یہ شرط نہایت غیر معقول تھی، خود غیر مسلم ممبران بچپن کی شادی کے مخالف تھے، لیکن اس بات کا کوئی مخالف نہ تھا کہ "جب لڑکا اور لڑکی جسمانی اور جنسی طور پر بالغ ہو جائیں تو شادی ہو جانی چاہیے۔"

۲۔ اس دفعہ کے چند مخالف مسلمان ممبروں کا یامین خاں مرحوم نے نام نہیں لیا، لیکن سب لیگی ممبران تھے، اور انھی کی پیش کردہ ترمیم سے اس کا دائرۂ اطلاق مسلمانوں تک وسیع ہوا تھا۔

ترمیم کے مخالف ممبران کا مطالبہ اتنا منطقی، معقول اور مدلل تھا کہ اسلامی شریعت کے منشا و مقتضیٰ کا حوالہ دیے بغیر غیر مسلم ممبران بھی اس مطالبے کی معقولیت سے متفق ہو سکتے تھے، لیکن افسوس! کہ اسلامی شریعت کے جوش اور جدت پسندی کے شوق میں دوسروں کو اپنا بنانا تو دور کی بات ہے وہ خود بھی اسلامی شریعت کے احترام اور مطالبے کی معقولیت سے اتفاق نہ کر سکے۔

بہ ہر حال حضرت مفتی کفایت اللہ کا یہ ایک خط ہے جو انھوں نے ۷/نومبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے کو لکھا تھا، اس میں شرعی احکام کی واضح ترجمانی بھی ہے اور معقولیت بھی ہے، نیز قانونی اور دستوری میدان میں جمعیت علمائے ہند کی خدمات کا نہایت جلی عنوان ہے۔ ضروری تھا کہ اسے جمعیت کی تاریخ خدماتِ ملی میں نمایاں جگہ دی جاتی۔

اس مجموعے میں میثاقِ لکھنؤ پر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا تبصرہ اور نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر جمعیت کی سب کمیٹی کی رپورٹ اور ساردا ایکٹ کے بارے میں حضرت مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کی تحریر کو بھی شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں نے اسلامی نظم جماعت کے قیام، مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کیا کوششیں کی ہیں اور زندگی کے مختلف دائروں اور دستور سازی کی مختلف سطحوں پر جو آئینی اور قانونی جنگ لڑی ہے وہ اس کا کتنا بڑا کارنامہ

ہے۔

خدمت کے ان میدانوں میں جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں کے بے شمار مساعی، جمعیت کی سیکڑوں قراردادیں اور اقدامات و مساعی کے پچاسوں دایرے ہیں جو ماضی میں بنتے رہے ہیں، ان سب کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں البتہ یہاں جمعیت اور اس کی مجلس عاملہ کی کچھ قراردادوں اور بعض دستاویزوں اور رپورٹوں کو مرتب کر دیا گیا ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مساعی کے عام میدانوں سے لے کر دستور سازی کی اعلیٰ سطح تک اس کی خدمات کی تاریخ کتنی شان دار ہے۔

اس مقام پر اس سے زیادہ خامہ فرسائی کی ہرگز ضرورت نہیں، امید ہے کہ یہ کتاب برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ کے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں اور جمعیت علماے ہند اور جمعیت علماے اسلام (پاکستان) کے ارا کین و کارکنان میں پسند کی جائے گی۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

۱

جمعیت علماے ہند کی خدمات ملّی و سیاسی

اور

دیگر پہلو

نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر جمعیت علما
کی
سب کمیٹی کا تبصرہ

مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

فہرست

حرفے چند

جمعیت علماے ہند کا قیام تاریخ سیاسیات ہند کے ایک موڑ پر عمل میں آیا تھا۔ وہ اپنے رہنماؤں کے تدبر و بصیرت کی ایک مثال، دینی و سیاسی مقاصد کی جامعیت، مختلف مکاتب فکر کے مرکز اتحاد و اعتماد اور اپنی عظیم الشان خدمات اور کارناموں کی بہ دولت تحریک آزادی وطن کے دور میں اپنی مثال آپ تھی۔

اگر چہ اس کا وجود ۱۹۱۹ء میں نقش پذیر ہوا تھا لیکن جن بزرگوں کے فکر و تدبر کا رہین منت تھا، ان کے اسلاف دو سو برس سے مصروف خدمت تھے۔ حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی زندگی ہی میں جب کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا سفر نہایت تیزی سے جاری تھا، مستقبل ہند میں مسلمانوں کی سیاسیات کا لائحہ عمل تیار کر دیا تھا۔ ان کے بعد ان کے اسلاف اور اس خانوادہ علم و فکر کے اسلاف و اساطین تقریباً ایک صدی کے علم و تجربہ اور بے شمار آزمائشوں اور قربانیوں سے گزر کر دیو بندی تحریک کے آغاز...... دارالعلوم دیو بند کے قیام تک پہنچے تھے۔

جمعیت علماے ہند کے بزرگ کانگریس کے قیام سے پہلے وطن کی آزادی کی راہ میں فکر کی اشاعت تربیتِ اصحابِ استعداد اور جد و جہد کا ایک دور گزار چکے تھے۔ جمعیت کے قیام کی بنیاد میں ایک صدی کا بہترین تدبر و بصیرت، اعلیٰ فکر اور اس کی تحریک و اجرا میں بہترین ذوقِ عمل کا استعمال ہوا تھا۔

جمعیت علماے ہند ایک جامع جہات تحریک تھی۔ اس کی خدمات کا دائرہ مذہب، سیاست، درس و تدریسِ علوم و فنون، تبلیغ و اشاعت دین، تصنیف و تالیف، اصلاح معاشرت، تعمیر سیرت و اخلاق سے لے کر انسانی خدمت کے میدانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے رہنما اور خدام راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ لیکن آزادیِ وطن کی جد و جہد اور

ملی خدمات کے میدان میں ان کے ذہن وقلوب جماعتی، گروہی، نسلی، قومی اور مسلک ومذہب کے تعصبات سے پاک تھے۔

جمعیت علماے ہند کی ہمہ جہت خدمات کے تذکار میں چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں اور مستقل تواریخ موجود ہیں اور اس کے رہنماؤں پر سوانحی لٹریچر جمعیت کی خدمات کے تذکرے سے لبریز ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کی پانچ ضخیم جلدیں اور اس کے ساتھ مقالات سیاسیہ کی تین جلدیں بہ عنوانِ دیگر جمعیت علماے ہند ہی کی تاریخ وتذکرہ ہے۔

اس کتاب میں میرے پیش نظر ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے قیام میں جمعیت کی تقریباً نصف صدی کی جدوجہد...... خصوصاً ان کے اسلامی حقوق اور ملی مفادات کے تحفظ کے لیے آئینی جدوجہد پر روشنی ڈالنا اور خود اپنے قلم سے لکھ دینے کے بجائے بعض تحریکات وحوادث سے متعلق اہم تاریخی ڈاکومنٹس کو مرتب کردیا ہے۔

امید ہے کہ خاکسار کی یہ کوشش مسلمانوں کی سیاسی تاریخ اور اسلامی وملی تحریکات سے دل چسپی اور ان کے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں خصوصاً جمعیت علماے ہند اور جمعیت علماے اسلام (پاکستان) کے حلقۂ فکر میں ضرور پسند کی جائے گی۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

۱۷ر ستمبر ۲۰۰۲ء

ملّت اسلامیہ کی شرعی تنظیم

اور

قیام محاکم اسلامیہ

از قلم

مورخِ ملّت مولانا سید محمد میاںؒ

ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ملتِ اسلامیہ کی شرعی تنظیم

اور

قیامِ محاکم اسلامیہ

قانونِ فسخ نکاح اور دار القضاء:

جمعیت علماے ہند ایک عرصۂ دراز سے اس امر کی کوشش کر رہی ہے کہ ہندوستان کے صوبجات میں مسلمانوں کے باہمی معاشرتی معاملات کے فیصلہ کے لیے دار القضاء قایم کیے جائیں۔ اگر حکومت اس دار القضاء کو سردست قانوناً تسلیم نہ کرے، جب بھی شرعی نقطۂ نگاہ سے بہت سی مشکلات کا حل قیام دار القضاء سے ہو سکتا ہے۔ مگر صوبہ بہار کے ماسوا جہاں امارت شرعیہ قایم ہو چکی ہے۔ کسی صوبہ میں باضابطہ شرعی عدالتیں آج تک قایم نہیں ہو سکیں۔ اور اسی وجہ سے اکثر صوبوں میں ظالم شوہروں کی وجہ سے ہزاروں ہزار مسلمان عورتیں اپنے جائز حقوق سے محروم ہیں۔ اور سخت مصیبتوں میں مبتلا رہتی ہیں۔ اور اکثر یہ بھی سنا گیا ہے کہ مسلمان عورتوں نے ظالم شوہروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ارتداد کی راہ اختیار کی۔ اس لیے ارکان جمعیت علماے ہند کی یہ راے ہوئی کہ سردست مسلمان عورتوں کو ظالم شوہروں سے شرعی حقوق دلانے اور ان مظالم سے نجات دلانے کے لیے مرکزی اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون اسلامی اصول کے ماتحت پیش کیا جائے۔ چناں چہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب قدس اللہ سرہٗ نے اس مقصد کے لیے ایک مسودۂ قانون مرتب کیا اور اخبارات میں اس کا مسودہ شایع کر دیا گیا۔ اس اثناء میں سید محمد احمد صاحب کاظمی اور میر غلام بھیک نیرنگ صاحب ممبران مرکزی اسمبلی نے بھی علاحدہ علاحدہ ایک مسودہ مرتب کیا۔ اس موقع پر جمعیت علماے ہند نے مراد آباد میں

اپنی مجلس عاملہ کا جلسہ ان تینوں مسودوں پر غور کرنے کے لیے طلب کیا۔ جس میں ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ دیگر علما اور چند ممبران مرکزی اسمبلی اور بعض دوسرے صائب الرائے حضرات کو مدعو کیا گیا۔

اس جلسہ میں اسلامی اصول اور فروع کا پوری طرح لحاظ رکھ کر ایک مسودہ مرتب کیا گیا جو مسودۂ قانونِ فسخ نکاح کے نام سے مشہور ہے۔

اس مسودہ میں عورتوں کو اپنے ظالم شوہروں سے نجات حاصل کرنے کے وہ تمام اختیارات دیے گئے جو شریعت اسلامیہ نے انھیں عطا کیے ہیں۔ اور اس قسم کے تمام معاملات کے فیصلوں کا اختیار صرف مسلم حاکم کو دیا گیا۔ کیوں کہ غیر مسلم حاکم کا حکم طلاق یا حکم فسخ نکاح شرعاً نافذ نہیں ہوتا۔

جمعیت علماے ہند کو امید تھی کہ تمام مسلم ممبران اسمبلی خاص کر غلام بھیک نیرنگ اور محمد احمد صاحب کاظمی جمعیت علماے ہند کے منظور کردہ مسودہ کو پیش کر کے منظور کرائیں گے۔ مگر ہم لوگ نہایت افسوس اور دلی رنج کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اسمبلی سے جو مسودہ پاس ہوا وہ جمعیت علماے ہند کے منظور کردہ مسودہ سے بہت مختلف ہے اور وہ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لیے سخت مہلک ہے۔ سب سے بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے طلاق و فسخ نکاح کے فیصلہ کے لیے مسلم حاکم کی شرط قانون میں باقی نہ رہی اس لیے عورت کو شرعاً اس قانون سے فایدہ اٹھانے کا موقع جاتا رہا اور اگر غیر مسلم کی عدالت سے حکم طلاق اور فسخ نکاح کی ڈگری حاصل کی گئی تو وہ شرعاً باطل ہوگی۔ دوسری ایک غلطی یہ کی گئی کہ اس قانون میں ایک دفعہ بڑھا دی گئی جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر خاندانی مسلمان عورت مرتد ہو جائے تو اس کا نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کوئی غیر مسلم عورت مسلم ہونے کے بعد کسی مسلمان سے شادی کر لے اور اس کے بعد پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کر لے تو اس کا نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا۔ اور اگر اسلام سے مرتد ہو کر اپنا قدیم مذہب اختیار نہ کرے، بلکہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے تو اس کا نکاح بھی فسخ نہیں ہوگا۔ حال آں کہ شرعی اصول

اور قانون سے اس دفعہ کی یہ تمام باتیں غلط ہیں اور کسی طرح درست نہیں ہیں۔

جمعیت علماے ہند اس قانون کی غلط دفعات کے خلاف بارہا آواز بلند کر چکی ہے۔ مسلم ممبران اسمبلی کو بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اخبارات میں مضامین بھی لکھے گئے۔ مگر آج تک نہ حکومت نے کوئی توجہ کی اور نہ کسی دوسری انجمن نے جو مسلمانوں کے نام سے ہندوستان میں قایم ہیں۔ آخر جمعیت علماے ہند کے اجلاس جون پور میں جمعیت علماء نے حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کو اختیار دے دیا کہ اب وہ خود ایک ترمیمی مسودۂ قانون مرتب کر کے کسی مسلم ممبر اسمبلی کے حوالے کریں۔ تاکہ وہ اس ترمیمی بل کو پیش کر کے اس قانون کو قابل عمل اور مفید بنانے کی سعی کریں۔

یہ امر کس قدر قابل افسوس ہے کہ ہندوستان کے اندر جمعیت علماے ہند کے علاوہ اور جتنی جماعتیں ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی مدعی ہیں۔ انھیں اس قسم کے خالص اسلامی، معاشرتی اور تمدنی احکام کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

اگر احکام اسلام کی پوری ناواقفیت کی وجہ سے بطور خود اسمبلیوں کے قوانین کی مضرتوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس وجہ سے اس کی مخالفت اور اصلاح کی طرف اقدام کرنے سے معذور ہیں تو جمعیت علماے ہند کی رہنمائی اور ہدایت کے بعد تو ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ توجہ کریں۔ مگر وہ اس کے بعد بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ اسلام اور مسلمانوں کے کس مفاد کی حفاظت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

رہا مرکزی اسمبلی کا پاس کردہ موجودہ قانون فسخ نکاح تو وہ عظیم نقصان رساں اور تباہ کن قانون ہے۔ جس سے آج کوئی پڑھا لکھا مسلمان شاید ہی ناواقف ہو۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بھی مسلم لیگ کو اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب قدس سرہٗ نے مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کو خصوصیت کے ساتھ بذریعہ خطوط متوجہ کیا۔ کیوں کہ وہ مسلم

لیگ کے صدر ہونے کے علاوہ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بھی ہیں۔

ان خاص خطوط کے علاوہ جمعیت علماے ہند کی تجاویز کے ذریعہ مسلمانان ہند کو توجہ دلائی گئی۔ ارکان جمعیت نے اس کے متعلق اخبارات میں مضامین لکھے۔ ان تمام باتوں کے بعد کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ دوسری جماعتوں اور ان کے لیڈر روز ... واقفیت نہیں ہے۔ اور کس طرح ان کا کوئی عذر مقبول ہو سکتا ہے۔

بہر حال صرف ایک جمعیت علماے ہند ہے جو اس معاملے سے کسی وقت بھی غافل نہ رہی اور جو کچھ اس کے بس میں تھا، کرتی رہی اور آیندہ بھی کرے گی۔

جمعیت علماے ہند بلاشبہ اس مسئلے میں عام ایجی ٹیشن پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ تو اس کی سب سے بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ پورے ملک میں ایک عام ایجی ٹیشن کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور وہ جمعیت علماء کے پاس ہے نہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ جمعیت علماے ہند کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کے کاموں کے لیے زیادہ سے زیادہ امداد کرتے رہیں۔

شریعت بل

جب سے ہندوستان میں انگریزی اقتدار اور غلبہ ہوا ہے۔ اسلامی احکام میں خلل اندازی روز بروز ترقی پذیر ہے چناں چہ مختلف مقامات پر مسلمانوں کے پرسنل لا اور خصوصی قوانین پر بھی دست درازی کی گئی اور ارباب "ہوا و ہوس" کی خواہشات کے مطابق رواج کو انگریزی حکومت نے قانون قرار دیا۔

وراثت اور تبنیت (متبنیٰ بنالینا۔ لے پالک بنانا) اور وصیت کے وہ احکام جو قرآن حکیم کی آیات میں صراحۃً موجود ہیں یا احادیث صحیحہ میں وضاحت کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں رواج کے ذریعہ سے منسوخ قرار دے دیے گئے۔ چناں چہ اودھ، فرنٹیر (سرحد)، پنجاب، بمبئی کے کچھی میمنوں میں اور صوبجات متوسطہ وغیرہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت سے یہ قانون جاری ہے کہ مذکورہ بالا مسائل میں احکام شریعت اور قانون اسلام پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ رواج ہی کو قانون سمجھا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں رواج بالعموم ہندوؤں کے طریقہ پر مبنی ہوتا ہے۔ چناں چہ اس میں بیوہ کو، لڑکیوں کو اور عورتوں کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ شریعت اسلامیہ میں وصیت وارث کے لیے نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ شریعت نے اس کے لیے حصہ مقرر کر دیا ہے۔ نیز ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے متعلق صاف اور صحیح احادیث موجود ہیں تبنیت یعنی کسی کو بیٹا یا بیٹی بنالینے کا بھی شرعاً اعتبار نہیں۔ حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ابن (بیٹے) کہے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ زید ابن حارثہ کے بجائے ان کو "زید ابن محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا تھا۔ قرآن پاک کی سورۂ احزاب میں پورا ایک رکوع اس کی تردید

میں نازل ہوا ہے۔ چناں چہ متبنیٰ ہونے کی بنا پر شرعاً ابن کی حیثیت نہیں حاصل ہوتی مگر ہندوستان کے رواج میں وصیت میں بھی تعمیم ہے کہ جو شخص جس کو چاہے جتنے مال اور جائداد کی چاہے وصیت کر دے اور متبنیٰ بنانا بھی معتبر مانا جاتا ہے اور ''ابن'' کی حیثیت اس کو دے دی جاتی ہے۔

صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو تنبہ ہوا اور انھوں نے اصلاحات سننے کے بعد حضرت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی زیر سرپرستی (جو اس زمانہ میں جمعیت علماے ہند کے صدر مستقل تھے) پوری جدو جہد کی کہ رواج کے قانون کو بدل کر شریعت ایکٹ اور محمڈن لا کی صورت پیدا کی جائے۔ خود غرضوں اور رواج کے گرویدہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ مگر صوبہ سرحد کی اکثریت اسلام اور مذہب کی وفادار تھی۔ اس نے پوری جدو جہد کی۔ چناں چہ جمعیت علما کی سرکردگی میں ان کی کوششیں کام یاب ہو گئیں۔ اور سرمایہ دار ''ارباب ہوا و ہوس'' کے خلاف شریعت ایکٹ وہاں پاس ہو کر نافذ ہو گیا۔

اس پر مسلمانان پنجاب کو بھی تنبہ ہوا اور انھوں نے کوشش کی کہ تمام ہندوستان کے لیے ایسا ہی قانون پاس ہو جائے۔ چناں چہ حافظ عبداللہ صاحب لائل پوری نے ۱۹۳۵ء میں شریعت بل کا مسودۂ وائسراے کی اسمبلی میں پیش کر دیا۔ جس کی غرض مندرجۂ ذیل دفعہ نمبر ۲ سے واضح ہوتی ہے۔

دفعہ نمبر ۲:

کسی متناقض رواج یا دستور کے تمام معاملات جس کے فریق مسلمان ہوں۔ حسب شرع اسلامی طے کیے جائیں۔ یعنی تبنیت (متبنیٰ بنانا اور لے پالک بنانا) وصیت، عورتوں کی جائداد حاصل کردہ بذریعہ وصیت، معاملات متعلقہ وراثت، عورتوں کی مخصوص جائداد بشمول ذاتی جائداد جو کہ ان کو وراثۃً ملی ہے۔ یا کسی معاہدہ یا ہبہ کے ذریعہ یا کسی اور قانونی وجہ کی بنا پر ملی ہے۔ نکاح، انفساخ نکاح، بشمول طلاق،

ایلاء، ظہار، لعان، خلع اور مبارأۃ نان نفقہ، دین مہر، ولایت، ہبہ، ٹرسٹ اور جائداد ٹرسٹ اور وقف۔

یہ بل اسمبلی میں پیش ہونے کے بعد رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا۔ اکثر مقامات سے اس بل کی تائید ہوئی۔ مسلمان تعلقہ داروں نے اس کی عموماً مخالفت کی۔ لیکن بالآخر گورنمنٹ اس پر رضامند ہوگئی اور بل کمیٹی انتخاب کے سپرد کردیا گیا۔

کمیٹی منتخبہ نے اس میں چند لفظی ترمیمات کر کے اس کو منظور کرلیا۔ اب بل آخری خواندگی کے لیے ستمبر ۱۹۳۷ء میں ایوان میں پیش ہوا تو مسٹر جناح نے اس میں ترمیم پیش کی کہ دفعہ نمبر ۲ سے لفظ ''قانون'' نکال دیا جائے۔

تبنیت اور وصیت اور وہ ترکہ جو کہ بطور وصیت ہوں اس سے مستثنیٰ کیا جائے یہ شرط بڑھادی جائے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ آئندہ ان چیزوں پر بھی شریعت کا قانون حاوی ہو تو وہ ایک افسر کے سامنے اس بات کا اقرار کرے کہ آئندہ وہ اور اس کے نابالغ بچے اور آئندہ نسلیں ان امور ثلاثہ میں شرعی قانون کی پابند ہوں گی۔

مزید فرمایا کہ ۱۹۲۰ء میں کچھی میمنوں کے متعلق کونسل میں یہ پاس ہو چکا ہے کہ تبنیت، وصیت اور وہ جائداد جو وصیت سے ملی ہو، ان میں رواج کے موافق فیصلے کیے جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس مسودے میں سے بھی یہ تینوں چیزیں مستثنیٰ کردی جائیں۔ اس لیے لفظ (بلاوصیتی) لفظ وراثت کے بعد زاید کیا جائے۔ اور یہ تینوں امور بجائے لازمی کے اختیاری قرار دیے جائیں۔ اور اس بنا پر دفعہ نمبر ۲ سے ان تینوں کا نکال کر دفعہ نمبر ۳ جداگانہ بنائی جائے۔ اور اس کی رو سے اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے چاہے تو وہ مقرر کردہ حاکم کے سامنے اقرار کر کے اپنے اوپر اپنے بچوں اور آئندہ نسلوں کے اوپر امور متذکرہ بالا میں قانون شریعت نافذ کراسکتا ہے جس کا طریقہ دفعہ نمبر ۳ میں دیا گیا ہے اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال اس ترمیم کے ساتھ ۱۶ رستمبر ۱۹۳۷ء کو یہ بل پاس ہوگیا۔ لیکن ظاہر ہے

کہ ترمیم نے بل کی روح ختم کر دی۔

شریعت بل کی بعض تفصیلات:

(شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء پروسیڈیا)

دفعہ نمبر۲:

باوجود کسی متناقض رواج یا دستور کے تمام معاملات ذیل (باستثناء معاملات متعلقہ زراعت یا ارضی) جس کے فریق مسلمان ہوں حسب شرع اسلامی طے کیے جائیں۔ یعنی معاملات متعلقہ وراثت (بلا وصیتی) عورتوں کے مخصوص بشمول ذاتی جائداد جوان کو وراثۃً ملی ہے۔ یا کسی معاہدہ یا ہبہ کے ذریعہ یا اور کسی قانونی وجہ کی بنا پر ملی۔ نکاح، انفساخ نکاح، بشمول طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مبارأۃ نان نفقہ، دین مہر، ولایت، ہبہ، ٹرسٹ، اور جائداد ٹرسٹ اور وقف (باستثناء خیرات، خیراتی ادارے اور خیراتی و مذہبی اوقاف) کے، (نوٹ اول بر تحریر بالا)۔

الف: زراعتی جائداد اور خیرات اور خیراتی اداروں اور خیراتی اور مذہبی اوقاف کا استثناء اس دفعہ میں اس لیے کیا گیا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۳۵ء کی رو سے ان امور کے متعلق قانون صرف صوبجاتی اسمبلیوں میں پاس کیا جا سکتا ہے (۱)۔

ب۔ وراثت کے ساتھ بلا وصیتی اس وجہ سے تحریر کیا گیا ہے کہ مسٹر جناح کی ترمیم کی رو سے وصیت کرنے کا اختیار حسب رواج سابق مسلمانوں کو کرنے کا رکھا گیا ہے۔ جس کی تفصیل دفعہ نمبر۳ سے معلوم ہوتی ہے۔

نوٹ ثانی:

مسٹر جناح نے دفعہ نمبر۲ کے متعلق یہ ترمیم کی:

تبنیت، وصیت اور جائداد وصیت لازمی کے بجائے اختیاری رکھی جائیں۔ اس

وجہ سے ان چیزوں کو دفعہ نمبر ۲ سے نکال کر ان کے لیے دفعہ نمبر ۳ حسب ذیل جداگانہ بنائی گئی۔ اس کی رو سے اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے چاہے تو اپنے لیے اپنے بچوں کے اوپر اور آیندہ نسلوں کے اوپر امور متذکرہ بالا میں قانون شریعت نافذ کرا سکتا ہے۔ جس کا طریقہ دفعہ نمبر ۳ میں دیا گیا ہے اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ نمبر ۳ ضمن ج:

وہ مقررہ فارم کے مطابق اس بات کا اقرار کر کے دے اور اس کو حاکم مقررہ کے سامنے پیش کرے جس میں اس بات کا اقرار ہو کہ وہ چاہتا ہے کہ اس دفعہ کا فایدہ حاصل کرے تو اس اقرار کے بعد دفعہ نمبر ۲ آیندہ ایسے قرار کرنے والے اور اس کے نابالغ بچوں اور آیندہ نسلوں پر اسی طرح عاید ہوگی گویا کہ اس میں الفاظ تبنیت و وصیت اور جائداد جو بذریعۂ وصیت کے دی گئی ہے وہ بھی شامل ہے۔

ضمن نمبر ۲:

اگر حاکم مقرر کردہ اقرار نامہ حسب ضمن نمبر ۱ منظور کرنے سے انکار کر دے تو وہ شخص جس نے اقرار نامہ داخل کیا ہو اس کی اپیل ایسے افسر کے سامنے پیش کرے گا جس کو صوبجاتی گورنمنٹ نے اس غرض کے لیے خاص یا عام حکم کے تحت مقرر کیا ہو۔

(سنٹرل اسمبلی پروسیڈنگ رپورٹ ۱۶ر ستمبر ۱۹۳۷ء)

۱۰ر جنوری ۱۹۴۲ء کو کاظمی صاحب نے اس میں ترمیمی بل پیش کیا کہ یہ ترمیمات پیش کردہ مسٹر جناح اب منسوخ ہونی چاہئیں۔ جس طرح حاجی عبدالرزاق صاحب نے ۱۹۳۸ء میں کچھی میمن کے لیے ۱۹۲۰ء کے قانون تبنیت اور وصیت رواجی کو منسوخ کرا لیا ہے۔ مگر مسلم لیگ پارٹی نے آج تک باوجود مطالبہ موافقت نہیں کی اور نہ پاس ہونے دیا۔ بلکہ مسٹر جناح مندرجۂ ذیل الفاظ فرما کر سکوت پذیر ہو گئے۔

میں اس ایوان کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ یہ میری اطلاع ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ رضامندی کا طریقہ یعنی لوگوں کو رضامند کرنے کے طریقہ کو نصف سے زیادہ پنجھی مین اجازت کی درخواستیں دے کر شرعی قانون کے پابند ہو گئے ہیں۔ ہم کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ہم کو لوگوں کو ترغیب دینے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس لیے ہم کو اس طریقہ کا تجربہ کرنا چاہیے جو بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ لیکن اگر بالآخر ہم کو معلوم ہو کہ ترغیب دینے کا طریقہ کامیاب نہیں ہوتا اور اس وقت اس ایوان کا یہ خیال ہو کہ تبنیت اور وصیت کے بارے میں بھی یہی مسلم پرسنل لا نافذ کیا جائے تو ہم اس پر غور کریں گے۔ (اسمبلی رپورٹ ۱۶ر ستمبر ۱۹۳۵ء)۔

زنا بامنکوحہ واغوا منکوحہ:

دفعہ نمبر ۴۹۷ و دفعہ نمبر ۴۹۸ تعزیرات ہند میں سزا فقط زانی کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ عورت بطور شہادت پیش ہوئی ہے اس کو کوئی سزا نہیں۔ اس میں ترمیم پیش کی گئی کہ زانیہ کو بھی سزا ہونی چاہیے۔ سر رضا علی نے مخالفت کی لیگ پارٹی نے بالکل خاموشی اختیار کی۔ بالآخر بل مسترد ہو گیا۔ (رپورٹ اسمبلی ۹ر فروری ۱۹۴۴ء)

حاشیہ:

(۱)۔ چوں کہ اس سے پہلے زرعی اراضی کا قانون صوبوں کے اختیار میں دیا جا چکا تھا۔ اس لیے اس کا نفاذ فقط سکنائی اراضی کے متعلق ہوتا تھا۔

قانون انفساخ نکاح اور مسلم قاضی بل کی سرگزشت

جمعیت علمائے ہند اور عمایدین لیگ کے کارنامے

قرآن حکیم ایک مکمل قانون ہے۔ عرش معلیٰ سے نازل فرمودہ، انسانی خطا اور لغزش سے پاک، اس کا ہر حکم صحیح، ہر فقرہ صحیح، ہر حصہ پر ایمان لانا فرض، ہر حکم پر عمل کرنا لازم، اس کے ہر نظریہ کو تسلیم کرنا شرط ایمان، قانون حکومت کی طاقت چاہتا ہے۔ حکومت کے بغیر ایک قالب ہے بے جان، ایک جسم ہے بے روح۔

علمائے ملت اس حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ وہ جس طرح کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں جس طرح اس کی عظمت اور احترام کا سکہ ان کے قلوب پر ہے۔ جس طرح اس کی قانونی شوکت و حشمت ان کے دل و دماغ پر حاوی ہے اسی طرح وہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرانا بھی فرض سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسی آزاد حکومت کا قیام فرض سمجھتے ہیں جو قرآن حکیم کی اس حیثیت کو تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہو۔ وہ ایسی آزاد حکومت کے قیام کے لیے ہر ایک جدو جہد کو فرض سمجھتے ہیں۔ اگر اس کے لیے ان کو دوسری کسی قوم سے تعاون، اشتراک عمل کرنا پڑے، وہ اس کو بھی فرض سمجھتے ہیں کیوں کہ وسیلہ فرض فرض ہوتا ہے (۱)۔ اس اہم نصب العین کی خاطر وہ جزئیات کی نہ پروا کرتے ہیں اور نہ شرعاً یا عقلاً یہ جائز ہے کہ جزئیات کے لیے اصول کو قربان کر دیا جائے۔

دور خلافت راشدہ کے بعد تقریباً چھ سو برس تک دنیا آباد کا بیشتر حصہ مسلم فرماں رواؤں کی نصرت اور فیروز مندی کے قدم چومتا رہا اور عساکر اسلام کی حشمت و

شوکت اپنے تمام رقیبوں اور حریفوں کی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہی۔ لیکن پھر خود مسلمانوں کی اندرونی کمزوریوں نے وہ حالت پیدا کردی جس سے قرآن پاک نے ڈرایا تھا۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ خود قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ تھا کہ

فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

''تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

چناں چہ عیسائی دنیا جس سے جنگ کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا، جب کہ خود سرور کائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ۹ ھ میں ''غزوۂ موتہ'' کے موقعہ پر عیسائی فوجوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا زاد بھائی اور حضرت علی ابن ابی طالب کے حقیقی بڑے بھائی یعنی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب خاص، محب صادق حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اس لشکر اسلام کے تیسرے سالار اعظم حضرت عبد اللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو اور ان کے ساتھ مسلم مجاہدین صحابہ کی ایک جماعت کو شہید کر دیا تھا۔

یہ عیسائی دنیا جو اسلام کی پوری تاریخ میں اسلام کی حریف اور مسلمانوں سے نبرد آزما رہی۔ سات سو برس کی متواتر شکستوں کے بعد اندرونی خامیاں دور کر کے ایک تازہ دم دشمن کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑی ہو گئی۔

اسپین (اندلس) سے نہ صرف اسلامی طاقت کو ختم کیا بلکہ مسلمانوں کا نام ونشان بھی مٹا دیا۔ اسپین کے علاوہ سسلی، مالٹا، تیونس وغیرہ دیگر اسلامی جزائر اور ممالک پر اس نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

برسر اقتدار مسلم فرماں رواؤں کے ان اعمال واطوار کی بنا پر (جن کا اس وقت ذکر نہ کرنا بہتر ہے) جب علمائے اسلام کی اصلاحی اور انقلابی کوششیں ناکام رہیں تو تا حد امکان مسلمانوں کے معاشی اور سماجی نظام کو قایم رکھنے اور خود مسلمانوں کے اندرونی معاملات کو اپنے طور پر احکام اسلام کے بموجب طے کرنے اور سلجھانے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کا معاشی نظام قایم کیا۔ اور نکاح، طلاق، فسخ نکاح، وراثت

وغیرہ اور اسلام کے ایک مخصوص نظم کے بموجب جمعہ، جماعتوں اور عید کی نمازوں کے متعلق قاضی اور والی مقرر کیے اور ان معاشی معاملات میں حکومت متسلطہ سے ان قاضیوں اور والیوں کے لیے اختیارات حاصل کیے اور عام مسلمانوں کے لیے فتویٰ صادر کیا کہ

امافی بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد ویصیر القاضیی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب والی مسلم

(ردالمختار: ص ۲۷۷، ج ۳ آخر فصل استیمان الکافر قبیل باب العشر والخراج والجزیۃ والیضا ردالمختار: ص ۵۹۵، ج ۱ باب الجمعۃ)

"وہ شہر جن کے فرماں روا کفار ہوں۔ وہاں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدوں کا ادا کرنا جائز ہے اور مسلمان اپنی رضا سے کسی کو قاضی بنادیں تو وہ قاضی ہو جائے گا اور مسلمانوں پر والی مسلم کا طلب کرنا واجب ہوگا۔"

یہ سب اس لیے کہ شرعی نظام اجتماعی کے بغیر مسلمان کی زندگی گویا اسلام کے تخیل سے بھی خارج ہے۔

اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے حالات یہ ہیں؛

ہندوستان میں غیر مسلم حکام کے تسلط کا آغاز گیارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوا۔ شاہان مغلیہ کے زمانے میں نکاح، فسخ نکاح، امامت، نابالغوں کی تولیت وغیرہ۔ نیز دیوانی اور فوج داری کے مقدمات قاضیوں کے سپرد تھے۔ سلطان عالم گیر نے اپنے زمانے میں مسائل فقہ کا وہ مجموعہ مرتب کرایا جو فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالم گیریہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہی اس زمانہ کا قانون تھا۔ یہ صیغہ ایک قاضی القضاۃ کے ماتحت رہتا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال

کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا عروج ہو رہا تھا۔ عام مسلمان اس عروج کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی طاقت اگر چہ منتشر تھی۔ خود غرض وزرا اور آرام طلب یا نااہل امرا کے جھگڑوں نے عالم گیرؒ کے بنائے ہوئے متحدہ ہندوستان کو درجنوں حکومتوں اور ریاستوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ مگر عام مسلمان علمائے مجاہدین کی زیر سرکردگی انگریزوں سے تقریباً ایک صدی (۲) تک جہاد کرتے رہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب کا ترجمہ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے عنوان سے اقبال اکاڈمی لاہور نے شایع کیا ہے) انگریز جو اپنی ڈپلومیسی میں تمام دنیا سے فایق ہے اور رفتہ رفتہ تسلط جمانے کا عادی ہے۔ اس نے ابتدا ہی میں وہ سب کچھ نہیں کیا جو اس کا آخری منشا تھا۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتدا میں قاضیوں کے سلسلے کو بحالہ قایم رکھا۔ ابتدا میں عدالتوں کا کام انگریز ججوں کے سپرد کیا گیا تو ان کے ساتھ مسلمانوں کے لیے قاضی اور مفتی اور ہندوؤں کے لیے پنڈت مقرر کر دیے۔ جج محض قاضی اور مفتی کے فتوے کو تحریر کر دیتے تھے۔

لیکن یہ حالت نہ باقی رکھنی تھی نہ باقی رکھی گئی۔ ملک کے قوانین میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں شروع کر دی گئیں۔ تاکہ اس کو مغربی ڈھچر پر جاری کر دیا جائے بلکہ ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جو نہ مغربی ہو نہ مشرقی، ہاں غلاموں کے عین مناسب ہو اور بقائے غلامی کا بہترین وثیقہ ہو۔ مثلاً ہندو اور مسلمان دونوں زنا اور اغوا کو انتہا درجہ شرم ناک جرم سمجھتے ہیں۔ لیکن یورو پین تہذیب میں یہ صرف ایک تفریحی مشغلہ ہے بشرطے کہ حد تفریح سے آگے نہ بڑھے۔

چناں چہ ۱۸۴۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قانون بنا کر عورت کو جرم سے بری کر دیا۔ یعنی عصمت فروشی اور عصمت دری کے باوجود وہ معصوم، اور مرد کے لیے صرف معمولی سی سزائے قید تجویز کی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ عورت کا شوہر دعویٰ دائر کرے (۳)۔ اور استغاثہ کا حق صرف اس کے شوہر کو دیا گیا۔ غرض اس قسم کے قوانین نے دن بدن ترقی شروع کی اور آج جو قوانین ملک کی حالت ہے وہ سامنے

ہے۔

علمائے ہند جب صرف ہندوستانیوں کے اعتماد پر انقلابی تحریکوں میں ناکام ہوگئے تو حکومت ہند کے انقلاب، اسلام کے معاشی اور سماجی نظام کے قیام کی دوسری صورتیں اختیار کیں (جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں ہوسکتی) حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں تشدد کے ذریعے انقلاب کے بجائے "مقاومۃ بالصبر" یا عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی گئی اور ہندو مسلم اشتراک عمل کے ذریعے آئینی جنگ کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک دینی نظم قایم کرنے کی غرض سے اولاً علما کی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا۔ جو "جمعیت علمائے ہند" کی شکل میں بفضلہٖ تعالیٰ مسلمانان ہند کے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی نظم وہی ہوسکتا ہے جو وارثان انبیا علیہم السلام کی زیر قیادت ہو جن کو "شریعت غرا" کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور جن کو اولی الامر کا خطاب دے کر عام مسلمانوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ حضرت حق جل مجدہ کا حکم ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا، اور اس کے رسول کا اور حاکموں کا، جو تم میں سے ہوں۔"

اسی کے ساتھ ساتھ فقہاء کے مذکورہ بالا قول کے بموجب کہ ایک والی مسلم کی طلب مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے۔ امارت شرعیہ کا قیام جمعیت علمائے ہند کے پیش نظر رہا۔ اگر چہ صرف صوبہ بہار میں اس پر عمل ہوسکا۔ مگر باقی صوبجات میں جد و جہد جاری ہے جیسا کہ امارت شرعیہ فی الہند کے بیان میں گزر چکا۔

جمعیۃ العلماء کے نظام دینی میں عام مسلمانوں کو شامل کرنے کے لیے جمعیت علما کی دو آنے والی ممبری کا سلسلہ قایم کیا گیا اور چند شرایط کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے نظام کو جمہوری نظام بنا دیا گیا (وللہ الحمد)۔

اس تمام غیر سرکاری اور آزاد جدو جہد کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ آئین ساز اسمبلیوں کے ذریعہ سے جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے لیے شریعت کے مطابق قوانین بنوائے جائیں۔

اسمبلیوں کی قانون سازی سے اگر چہ وہ فرض نہیں ادا ہوتا جو مسلم پر بحیثیت مسلم عاید ہوتا ہے کیوں کہ اسمبلی کا وضع کردہ قانون اگر کلیتہً شریعت کے مطابق بھی ہو تب بھی وہ اسمبلی کا قانون ہوگا۔ اور مسلمان پر فرض یہ ہے کہ وہ خود قرآن کو قرآن کی حیثیت سے تسلیم کرلے اور بحیثیت قانون اس کے احکام نافذ کرائے جب تک "ان الحکم الا للہ" کے بموجب حکم اور قانون صرف اللہ کا نہیں مانا جائے گا مسلم اپنے فرض سے سبک دوش نہ ہوگا۔ تاہم اتنا فایدہ ضرور ہوسکتا ہے کہ عملی حیثیت سے قانونی فیصلے شریعت کے مطابق ہوجاتے ہیں اور مسلمان فیصلہ کرنے والوں پر خلاف شرع فیصلے کا گناہ نہیں عاید ہوتا اور عمل کرنے والے کو بھی خلاف شرع حکم کی تعمیل پر مجبور نہیں ہونا پڑتا۔ نیز اس قسم کے قوانین کے لیے اگر مسلم حکام کی شرط منظور کرلی جائے تو آئینی طور پر مسلمانوں کا ایک سماجی نظام بآسانی قایم ہوسکتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ نہایت مستحکم نظام شرعی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے علاوہ ازیں اگر دور حاضر میں کوئی ایسا نظام قایم ہوجائے تو آزاد یا خود مختار ہندوستان میں بھی وہ واجب التسلیم ہوگا اور اس طرح کلچرل اٹانمی (یعنی مذہبی اور معاشی آزادی) کا مطالبہ آزاد ہندوستان میں ایک بنا بنایا تسلیم کردہ نظام ہوتا۔ اس وقت نہ کمیونسٹوں کی لامذہبیت اثر انداز ہوسکتی تھی نہ نیچریوں کی نیچریت روڑا اٹکا سکتی تھی۔ ان تمام امور کا لحاظ کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جہاں مسلمانوں کی کافی اکثریت ہے شریعت بل منظور کرایا گیا اور اس زمانے کے اخبارات کے مطالعے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں جمعیۃ العلماء نے اور اس کے صدر محترم حضرت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے کتنی جدو جہد کی۔

لیکن۔ افسوس مرکزی اسمبلی میں پہنچ کر مسٹر جناح کی ترمیم اور حامیان مسٹر جناح

کی ہم نوائی سے یہ بل اگرچہ قانون بنا مگر قطعاً غیر موثر اور اپنی اصلی روح سے سراسر خالی۔

قانون فسخ نکاح کے سلسلے میں اس تمام پس منظر کے علاوہ ایک نہایت دردناک صورت اور بھی پیش تھی۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق سے بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان مرد خانگی زندگی میں یا تو یورپ کی اتباع کر کے عورتوں کو مطلق العنان اور قطعاً آزاد کر دیتے ہیں یا زمانہ جاہلیت کی متابعت کرتے ہوئے ان کے حق میں خونخوار درندے بن جاتے ہیں۔ پہلی صورت کے نتیجہ میں لامذہبیت، دہریت، بے حجابی اور بے حیائی کو فروغ ہو رہا ہے۔

اور دوسری صورت کا خطرناک اور نہایت افسوس ناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتیں ان ظالم شوہروں سے نجات پانے کے لیے یا تو ایک دردناک زندگی کا شکار ہو کر عمر بھر سسکتی رہتی ہیں۔ ورنہ اغوا وغیرہ کے جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں۔ اور سب سے بدتر یہ کہ ظالم شوہروں سے گلوخلاصی کے لیے (معاذ اللہ) تبدیلی مذہب اور ارتداد کی شکل نکالنے لگیں جس کے نتیجے میں ہر سال سیکڑوں بلکہ ہزاروں عورتیں تمام ہندوستان اور بالخصوص صوبہ پنجاب میں، عیسائی یا آریہ ہونے لگیں۔ اور ان کی تعداد روز افزوں ترقی کرتی گئی۔

یہ حالت اس وجہ سے اور بھی خراب ہوگئی کہ پنجاب ہائی کورٹ کی نظیریں اس مضمون کی ہوئیں کہ اگر کوئی عورت محض یہ کہہ دے کہ اس نے مذہب اسلام چھوڑ دیا ہے تو اس کا یہ کہنا فسخ نکاح کے لیے بالکل کافی ہے حال آں کہ اس قسم کا ارتداد بیشتر بلکہ تمام تر فرضی اور نمائشی ہوتا ہے۔ کورٹ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ یہ ارتداد اور تبدیلی مذہب محض فرضی ہے۔

(تقریر محمد احمد کاظمی بسلسلہ قاضی بل اجلاس اسمبلی ۵ / اپریل ۱۹۳۵ء)

اس حالت کی روز افزوں ترقی نے علمائے ملت کو سراسیمہ کر دیا۔ انھوں نے بالخصوص سابق صدر جمعیۃ العلماء مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، شیخ الاسلام حضرت

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہما اور حضرت حکیم الامۃ مولانا محمد اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اجتماعی طور پر اس مسئلے کی طرف خاص توجہ کی چناں چہ جمعیت علماے ہند کے قیام سے چند سال بعد (۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء) میں ان حضرات نے اس مسئلے کی طرف خاص توجہ فرمائی کہ ہندوستان میں قاضی شرع نہ ہونے کی صورت میں ان مظلوم اور مجبور عورتوں کے لیے کیا انتظام کیا جائے جو شوہروں کے ظلم و تعدی یا مفقود اور لاپتہ ہوجانے کی وجہ سے انتہائی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔

چوں کہ اس سلسلے میں بہت سے مسائل بضرورت شدیدہ مذہب مالکیہ سے لینے ضروری تھے نیز ان مسائل کو اختیار کرنے میں علماے حنفیہ سے مشاورت ضروری تھی اس لیے مدینہ طیبہ، مکہ معظمہ وغیرہما کے علماے مالکیہ سے عرصہ دراز تک تنقیح مسائل کے لیے خط و کتابت اور بار بار مراجعت ہوتی رہی۔ چناں چہ پانچ چھ سال کی جدو جہد اور تحقیق و تدقیق کے بعد الحمدللہ ایک مکمل قانون شرعی تیار ہوگیا اور ۱۳۵۱ھ میں اس مجموعہ کو "حیلہ ناجزہ" کے نام سے شایع بھی کردیا گیا۔ پھر ایک مسودہ قانون انفساخ نکاح مرتب کر کے جناب سید محمد احمد صاحب کاظمی کے ذریعہ سے اسمبلی میں پیش کرایا گیا (۴)۔

یہ بل راے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا۔ ہندو مہا سبھا اور بعض آریہ سماجوں کی طرف سے شدت سے اس کی مخالفت ہوئی۔ مسلم لیگی ممبران نے اس میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ البتہ کانگریسی ہندو ممبران اسمبلی نے ساتھ دیا اور ۱۹۳۹ء میں یہ بل اسمبلی میں منظور ہوگیا۔ جو قانون انفساخ نکاح اہل اسلام ۱۹۳۹ء سے موسوم ہوا لیکن گورنمنٹ نے مسلم حاکم کی دفعہ کو ماننے سے قطعاً انکار کردیا۔ یہاں تک کہ یہ ظاہر کردیا گیا کہ اگر اس موقعہ پر اصرار کیا گیا تو وہ پورے قانون کو نافذ نہ ہونے دے گی۔ بہ ہر حال وہ دفعہ اس قانون میں نہیں رکھی گئی اور یہ قانون اس صورت سے منظور ہوا کہ اس کا نقصان نفع سے زیادہ تھا۔

اس نقص اور خامی کے تدارک کے لیے مسلم قاضی بل کا مسودہ تیار کیا گیا اور ۱۹۴۱ء میں یہ مسودۂ بل پیش کیا گیا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے اس مسوّدے کی ترتیب میں نمایاں حصہ لیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ قاضیوں کا ایک نظام قایم کیا جائے اور نکاح اور طلاق کے معاملات قاضیوں کے سپرد کردیے جائیں۔ لیکن گورنمنٹ نے پھر قاضیوں کو نکاح اور انفساخ کے اختیارات دینے سے انکار کردیا اور مسلم لیگی ممبر صاحبان نے مجرمانہ خاموشی اور بے التفاتی اختیار کی۔

بالآخر مجبوراً مسلم قاضی بل کا وہ حصہ جو نکاح پڑھانے سے متعلق تھا جداگانہ قاضی بل کے نام سے ۱۹۴۲ء میں پیش کیا گیا اور اس دوران میں مسلم قاضی بل کو بھی جاری رکھا گیا۔ منشا یہ تھا کہ قاضیوں کا ایک مرتبہ نظام مقرر ہوجائے تو پھر نکاح اور طلاق وغیرہ معاملات ان کے سپرد کرنے میں اتنی دشواری نہ ہوگی۔

چناں چہ گورنمنٹ نے قاضی بل کو رائے عامہ کے لیے مشتہر کرنے میں مخالفت نہیں کی۔ آراء کی کثرت بل کے موافق تھی۔ بالآخر گورنمنٹ نے اپنا منشاء ظاہر کردیا کہ اگر مسلم ممبران اسمبلی اس کی تائید کریں گے تو گورنمنٹ کو اس کے مان لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا چناں چہ مسودے کے محرک مولوی محمد احمد صاحب کاظمی نے سلیکٹ کمیٹی (منتخبہ کمیٹی) کی تحریک کی اور اس میں ممبران مسلم لیگ کی اکثریت رکھی۔ مسلم لیگ کے ممبران اسمبلی سے اس بارے میں گفت وشنید کی۔ لیکن ان کے رائے قایم کرنے میں بہت دیر لگی متواتر تقاضوں کے بعد انھوں نے اپنا جلسہ کرکے کاظمی صاحب کو اطلاع دی کہ چوں کہ مختلف صوبوں میں مختلف رواج ہیں، اس لیے وہ اس بل کے مخالف ہیں۔ جب لیگی ممبران اسمبلی سے جو حفاظت اسلام کے سب سے بڑے مدعی ہیں اور کلچر اسلام کے تحفظ کے نام پر مسلمانوں کو دھوکا دے کر ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ تین سال کی گفت وشنید کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اپریل ۱۹۴۵ء میں اس بل کو پیش کردیا گیا۔ افسوس مسلم لیگ کے حضرات نے اس بل کی

مخالفت کی اور مسلم لیگ کے معزز رکن سر محمد یامین نے ایک توہین آمیز اور مضحکہ خیز تقریر کی۔ جس میں محمد احمد صاحب کاظمی پر نہایت مکروہ اور تلخ انداز میں ذاتی حملے بھی کیے جو تہذیب اور شرافت اور آداب مجلس کے لحاظ سے نہایت شرم ناک ہیں۔ (اسمبلی کی رپورٹ میں سر یامن کی وہ تقریر بھی محفوظ ہے)۔ لطف یہ ہے کہ لیگی ممبران نے جو اسلامی قومیت کے نام پر علماے ربانی کو چوبیس گھنٹے کوستے رہتے ہیں۔ عین اس زمانے میں کہ اسلام کی عالم گیر قومیت کے ڈھول پیٹ کر حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے رفقا کو بدنام کرر ہے تھے۔ اپنی مخالفت کی دلیل یہ پیش کی کہ مختلف صوبوں میں مختلف رواج ہیں۔ محمد احمد صاحب کاظمی نے اس کا جواب نہایت معقول دیا کہ:

> "ہندو جن کا قانون اور رواج چپہ چپہ پر مختلف ہے۔ وہ تمام ہندوستان کے لیے ایک عام قانون بنانا چاہ رہے ہیں اور اس کے لیے راؤ کمیٹی بھی مقرر کردی ہے، مگر تعجب ہے کہ مسلمان جن کا قانون تمام دنیا کے لیے ایک ہے وہ رواج کی بنا پر اس سے انکار کرر ہے ہیں۔"

کاظمی صاحب نے اس بل کے متعلق باہمی سمجھوتے کی پوری پوری کوشش کی حتیٰ کہ اس پر بھی آمادگی ظاہر کی کہ میں اس بل کو واپس لے لوں گا آپ حضرات کوئی بل پیش کردیں۔ مگر افسوس کہ قایدین لیگ جو اقتدار علما کے زوال ہی میں اپنی ترقی سمجھتے ہیں اور قاید اعظم کے اس فخر یہ اعلان پر کہ میں نے علما کا اقتدار ختم کردیا ہے خوشیاں مناتے ہیں۔ کسی طرح بھی تائید کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور حکومت کو اس عذر کرنے کا موقع دے دیا کہ چوں کہ لیگ پارٹی مخالف ہے، اس لیے حکومت اس بل کی تائید نہیں کرسکتی۔ (ملاحظہ ہو تقریر آسوک راے ممبر قانون)

اب یہ اس افسوس ناک سرگزشت کو مولوی محمد احمد صاحب اور سر محمد یامین صاحب کی تقریروں کے خلاصہ پر ختم کرتے ہیں اور چوں کہ سر محمد یامین صاحب نے

اپنی تقریر میں یہ اعتراض کیا تھا کہ محمد احمد صاحب نے یہ بل صرف خاندانی قاضیوں کے فایدے کے لیے پیش کیا ہے اور قاضی کی نکاح خوانی کی جو فیس مقرر کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہے، لہٰذا ہم اس بل کی چند دفعات کا خلاصہ نقل کیے دیتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۱:

صوبہ کی گورنمنٹ ہر ضلع میں نکاح خوانی اور دیگر امور مذہبی کی ادائیگی کے لیے قاضی کا تقرر کرے گی اور مقدمات نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کے تصفیے کے لیے ایک یا ایک سے زاید پنچایتیں مقرر کرے گی (۵)۔ اور قاضیوں کے ممبران کی نامزدگی اور ان کے کاموں کی نگرانی وغیرہ کے لیے ہر ضلع میں ایک کمیٹی مقرر کرے گی جو ضلع کمیٹی کے نام سے نامزد کی جاے گی۔

دفعہ نمبر ۲:

ضلع کمیٹی، ضلع کے جج، کلکٹر، مسلم وکیل (جس کا انتخاب وکلاء کریں گے) مسلم ممبر میونسپل بورڈ اور ایک مسلمان ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ (جس کا انتخاب بورڈ کے مسلم ممبران کریں گے) اور سند یافتہ علما جن کا انتخاب علما کریں گے، پر مشتمل ہوگی۔

دفعہ نمبر ۴:

عہدۂ قاضی پر تقرر کے لیے قاضی میں صفات ذیل ضروری ہوں گی۔

(۱)۔ دیانت دار اور پرہیز گار ہو، تعلیم یافتہ ہو، مسائل نکاح سے بخوبی واقف ہو۔ اور جو قاضی تصفیہ نکاح اور مقدمات نکاح وغیرہ کے متعلق مقرر کیا جاے اس کے لیے مزید شرط یہ ہوگی کہ وہ مدارس اسلامیہ مندرجہ ذیل فہرست ضمیمہ کا مستند تعلیم یافتہ ہوگا اور صفات مذکورہ کے ساتھ وہ قاضی جو اس شہر یا قصبہ کا باشندہ ہو۔ خاندانی اثر رکھتا ہو اور اس کے خاندان میں عہدۂ قضا نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا ہو وہ مستحق ترجیح ہوگا۔

یہ قاضی حلقہ دار اپنے نائب مقرر کردے گا جو دین دار اور نیک ہوں اور وہ اپنے اپنے حلقوں میں نکاح پڑھائیں۔

سید محمد احمد صاحب کاظمی کی تقریر کے چند فقرے:

۲۵؍اپریل ۱۹۴۳ء کو اجلاس اسمبلی میں ''قاضی بل'' پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''منصب قضا سے مسلمانوں کا بہت پرانا تعلق ہے مشترک سماجی اور مذہبی امور قاضیوں کے ذریعے سے انجام پاتے رہے۔ نماز جمعہ اور عید کا انتظام، طلاق، نکاح، نابالغوں، دیوانوں، گم شدگان کی تولیت اور نگرانی وغیرہ امور ان کے متعلق رہے ہیں۔ انگریزی دور کے آمد کے بعد قاضیوں کے ہاتھ سے ان کے بیشتر منصبی فرائض خارج ہو گئے۔''

۱۷۹۳ء کی دفعہ نمبر ۹۳ کی تمہید میں درج ہے:

''ٹپرہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور دیگر خاص پرگنوں اور قصبوں میں قاضی موجود ہیں۔ جو معاملات انتقال وتصدیق میں کاغذات کی تکمیل اور دیگر دستاویزات قانونی دربارہ تقریبات شادی اور دیگر امور شرعی کی تعمیل اور تکمیل کرتے ہیں۔ جن کو زیر حکومت برطانیہ وہ اب تک انجام دیتے رہے ہیں۔ قرق جائدادوں کا فروخت کرنا اور ریگولیشن ۱۷۹۳/۲۴، ۱۷ء کے تحت خیرات، وظائف اور بھتے بھی تقسیم کرتے رہے ہیں۔'' (تمہید مذکورہ)

متذکرہ امور اور فرائض کا تقاضا ہے کہ ایسے منصبوں پر نیک چال چلن اور قانونی قابلیت کے لوگوں کو مقرر ہونا چاہیے اور ان کی قدر افزائی ہونی چاہیے تاکہ محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض

انجام دیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حکومت ان کا منصب تسلیم کر لیا گیا تھا جو ۱۸۶۴ء تک بھی شامل دستور رہا۔ اس وقت ایک قانون بنا کر یہ کہا گیا کہ آیندہ قاضی کا منصب قانونی طور پر قایم نہ رہے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی اور سماجی دشواری پیش آگئی۔ قاضیوں کے واسطے نفاذ حکم اور اجراے فیصلہ کے لیے حکومت کی ضرورت تھی اور حکومت نے ان کے اختیار ختم کر دیے تھے۔"

"۱۸۸۰ء میں سرسید نے قانون ساز کونسل سے قانون نمبر ۱۲ کو منظور کرایا جس کا مضمون یہ تھا کہ کسی شہر کے مسلمانوں کی طرف سے درخواست موصول ہونے پر وہاں قاضی مقرر کیا جائے گا اور اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس کو عدالتی یا اور کسی قسم کے اختیارات نہ ہوں گے۔"

"یہ بے کار قانون بھی اپنی عبارت کی چند الجھنوں کے باعث قابل عمل نہ ہو سکا۔ میں اس وقت ۱۸۸۰ء کے قانون نمبر ۱۲ کو مفید اور قابل عمل بنانا چاہتا ہوں جو مسودۂ بل میں نے پیش کیا ہے اس کے متعلق ہر ایک ترمیم مناسب مسودۂ کو قبول کر لوں گا۔ اگر اس منشا کو پورا کرنے کے لیے اس سے بہتر مسودہ بل پیش کیا جائے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کہ اپنا مسودہ واپس لے لوں۔"

"اس سے پہلے میں نے مسلم قاضی بل پیش کیا تھا۔ یہ بل آج تک مختلف اوقات میں ایجنڈے میں شامل رہا۔ لیکن آج میں حکومت اور مسلم لیگ پارٹی کے طرز عمل سے مایوس ہو کر آیندہ ایجنڈے پر رکھنا بے کار سمجھتا ہوں، افسوس ہے کہ مسلم لیگ کے ارکان کو اس سادہ اور بے خطر بل پر غور کرنا بھی بار معلوم ہوا ہے۔ اس بل کے ذریعے مسلمانوں کی یہ دیرینہ شکایت رفع کرنی مقصود ہے کہ انفساخ

نکاح وغیرہ مقدمات کے لیے مسلمان حاکم کی ضرورت ہے۔"

"میں نے مستند اور شہرہ آفاق علما مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی صاحب، مولانا حسین احمد مدنی صاحب وغیرہ سے مشورہ کرکے یہ دستور بنایا ہے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ انفساخ نکاح کے تصفیہ کے لیے آزاد عدالت قایم کرنے کو تیار نہیں۔ ایسے معاملے میں حکومت کے اس قابل اعتراض رویے کو نہیں سمجھ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ حکومت نے قانون وقت کے ماتحت عیسائیوں، اینگلو انڈین اور یورپ والوں کو جو یہاں اتفاقی طور پر نکل آئے ہیں اور ملک کے مستقل باشندے نہیں ہیں۔ شادی کے قضیے طے کرنے کے لیے خاص عدالتوں کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ حال ہی میں اس ایوان میں میرے سامنے ایک قانون کے ذریعے پارسیوں کی شادی کے قضیے طے کرنے کے لیے خاص عدالتی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ مگر مسلمانوں کا سوال آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معمولی حق بھی دینا نہیں چاہتی۔"
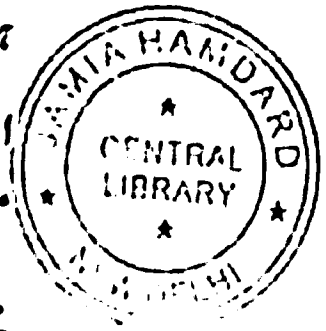
ہمارے سامنے مسلمانوں کی تنظیم کے ارادے تھے اور امید تھی کہ شرع محمدی کا نفاذ کرا کے اور کم سے کم جہاں تک ان کے نکاح اور طلاق کے قضیے ہیں، ان کے شدید متعصبات رفع کر سکیں گے۔ مگر ہمیں جب ناکامی ہوئی تو ابتدائی ارادے ترک کرکے میں نے دوسرا بل پیش کیا جو اصل بل کا محض ایک جز ہے۔ اور مجھے امید تھی کہ حکومت اس پر ہمدردانہ توجہ کرے گی کیوں کہ اس کی طرف سے کہا گیا تھا کہ خاص عدالتوں کا قیام مختلف چیز ہے۔ حکومت آزاد عدالتیں قایم کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن جہاں تک شادیوں کا تعلق ہے حکومت غور کرنے اور منظور کرنے کے لیے تیار ہے(۲)۔

اگر مسلم ممبران اسمبلی اس کی تائید کریں۔"

(رپورٹ اجلاس اسمبلی)

لیگی ممبران اسمبلی اس کی تائید تو کیا کرتے ان کو تقریر سننا بھی گوارا نہ تھا۔ چناں چہ چند مرتبہ اثنائے تقریر میں مداخلت کی۔ حتیٰ کہ صدر کو خاموش کرنا پڑا۔

کاظمی صاحب کی تقریر کے بعد سر محمد یامین صاحب نے تقریر فرمائی مگر وہ سراسر استہزا اور مذاق تھا۔ کچھ توہین آمیز پھبتیاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ آپ قاضی ہیں اس لیے یہ بل اپنے خاندان کے مفاد کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے صرف شمالی ہند کے چند مدارس کے علما کا تذکرہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جن میں سے ایک بھی اعتراض سنجیدہ اور مہذب نہ تھا اور جب کہ ارکان لیگ اپنی پالیسی ظاہر کر چکے تھے کہ وہ کی حمایت نہ کریں گے تو درحقیقت سر محمد یامین کی تقریر کا منشا صرف وقت کو پورا کرنا اور ایک خیالی خاکے کو بھر دینا تھا اور بس۔

نتیجہ یہ کہ ممبر قانون سر آسوک رائے نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ پارٹی کی سرگرم مخالفت کی وجہ سے حکومت سلیکٹ کمیٹی میں منتخبہ کمیٹی کے لیے سفارش نہیں کر سکتی۔ یہ ہے جمعیت علمائے ہند جیسی کانگریسی جماعت اور مسلم لیگ جیسی حفاظت اسلام کی ٹھیکہ دار جماعت کے ایک کارنامے کی مختصر روئیداد۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه. آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

محمد میاں عفی عنہ

۴ر ذی الحجہ ۶۴ھ، ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء

حواشی:

(۱) وضو، غسل درحقیقت مقصود بالذات عبادت نہیں۔ لیکن یہ فرض کی حیثیت حاصل

کر لیتے ہیں کیوں کہ نماز بلا وضو یا بلا غسل جنابت ادا نہیں ہو سکتی ۔ اسی طرح بقائے زندگی کے لیے کھانا پینا فرض ہو جاتا ہے ۔ جب کہ کھائے پیے بغیر زندگی کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو ۔

(مولانا سید میاںؒ)

(۲) جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے جہاد حریت ۱۸۵۷ء تک پورے ایک سو ایک سال اس جہاد میں صرف کر دیے ۔ علما کی جدو جہد اس کے بعد بھی جاری رہی ۔ جیسا کہ ابتدار سالہ میں ذکر کیا جا چکا ہے اور ''شان دار ماضی'' نیز ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' میں ان کی تشریح ہے ، مگر فرق صرف یہ ہوا ۱۸۵۷ء تک صرف ہندوستانیوں کے اعتماد پر انقلاب کی کوشش تھی ۔ اس کے بعد بیرونی طاقتوں سے ساز باز شروع کر دی گئی ۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں عدم تشدد کی پالیسی اختیار کر کے ہندو مسلم اشتراک عمل کے ساتھ جنگ آزادی کا فیصلہ کیا گیا ۔ (مولانا سید محمد میاںؒ)

(۳) ایک واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب ہے ۔ دفعہ نمبر ۴۹۷ و دفعہ نمبر ۴۹۸ تعزیرات ہند جو اغوا اور زنا کے متعلق ہے اور جس میں صرف مرد کو سزا ہے عورت کو نہیں ہے ۔ اس میں محمد احمد صاحب کاظمی نے ایک ترمیم پیش کی کہ عزت اور اخلاق مرد اور عورت دونوں کو مجرم گردانتے ہیں لہٰذا دونوں کو سزا ہونی چاہیے ۔ بات معقول تھی ۔ مگر لیگ کے حضرات نے حمایت نہ کی اور سر رضا علی صاحب نے ایک دھواں دھار تقریر کر دی کہ عورتوں کو آزادی ملنی چاہیے ۔

(مولانا سید محمد میاںؒ)

(۴) یہ بل ۲۶ / اگست ۱۹۳۸ء اور ۲۰ / ستمبر ۱۹۳۸ء کو مرکزی اسمبلی میں زیر بحث آنے کے بعد ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہو گیا تھا ۔ مسٹر جناح بحث کے دنوں میں غیر حاضر رہے مسلم لیگ نے با قاعدہ حمایت نہیں کی لیگی ممبران کی یہ سرد مہری دیکھ کر سرکاری ممبر نے مسلم جج یا مسلم حاکم کی قید کی (جو اس بل میں تھی) مخالفت کی اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس شرط کو واپس نہ لیا جائے گا تو گورنمنٹ پورے قانون کو نفاذ سے روک دے گی ۔ (ماخوذ از رپورٹ اسمبلی) (مولانا سید محمد میاںؒ)

(۵) گرام سدھار کے متعلق کانگریس کی اسکیم ہے کہ ہر گاؤں یا چند گاؤں کے حلقے میں ایک پنچایت بنائی جائے جس کو رفتہ رفتہ تصفیۂ مقدمات کے اختیارات دیے جائیں ۔ اور معمولی مقدمات اس پنچایت کے سپرد ہوں ۔ ظاہر ہے کہ یہ دیہاتی پنچایتیں بہت زیادہ مفید ہیں ۔ عام

باشندے ان بے پناہ مصارف اور پریشانیوں سے نجات پا جائیں گے جو ان کو مقدمات کی موجودہ صورتوں میں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ نیز ہر ضلع میں جس قدر ڈپٹی مجسٹریٹ اب مقرر کرنے پڑتے ہیں ان میں بہت کمی کر دی جائے گی جس سے قوم کا روپیہ بچے گا اور عام ہندوستانیوں پر جو ٹیکسوں کی بھرمار ہے اس میں تخفیف ہو سکے گی۔ یہ تمام فواید ہندو مسلمانوں کے لیے عام ہوں گے اور اس لیے ان کی مخالفت کرنا خود اپنی قوم کو نقصان پہنچانا ہوگا۔ لیکن شرعی نقطۂ نظر سے ان پنچایتوں میں قباحت یہ پیش آئے گی کہ مسلمان طلاق و نکاح وغیرہ کے مقدمات بھی انھیں پنچایتوں میں رکھیں گے کیوں کہ ان کو اس میں سہولت نظر آئے گی لیکن یہ پنچایتیں چوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں پر اور بہت ممکن ہے بعض مقامات میں صرف ہندو ممبران پر مشتمل ہوں گی لہٰذا نکاح، طلاق وغیرہ شرعی امور میں ان پنچایتوں کے فیصلے شرعاً ناجائز ہوں گے تو مسلم حاکم کی شرط منظور نہ کرنے کے باعث جو قباحت انفساخ نکاح کے سلسلے میں اس وقت درپیش ہے، اس وقت بھی رہے گی یہ قاضی بل اس قباحت کا انسداد تھا۔ یہ گرام سدھار کی پنچایتوں کے موازی مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص نظام ہوتا۔ کیوں کہ اس قسم کا کوئی نظام اگر اب بن جاتا ہے تو آزاد ہندوستان یا خود مختار ہندوستان میں اس کا تحفظ بہت آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ مسلمان از سر نو آزاد ہندوستان میں اس قسم کا کوئی نظام قایم کریں۔ (مولانا سید محمد میاںؒ)

(۶) کیا اس کو لیگ اور حکومت کی خفیہ ساز باز نہیں کہا جا سکتا؟ (مولانا سید محمد میاںؒ)

سول میرج ایکٹ (۱)

یہ قانون ہندوستان میں ۱۸۷۲ء سے نافذ ہے۔ اس کو "اسپیشل میرج ایکٹ" بھی کہتے ہیں۔ اس کی غرض اسی ایکٹ کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"ہرگاہ کہ یہ مناسب ہے کہ ان لوگوں کے لیے شادی کا طریقہ مقرر کیا جائے جو عیسائی، یہودی، ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ یا جینی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ اور بعض شادیوں کو جائز قرار دیا جائے جن کا جواز مشتبہ ہے اس لیے قانون ذیل بنایا جاتا ہے۔"

اس ایکٹ میں تحریر ہے کہ شادی سے پہلے نکاح کے دونوں فریق (مرد و زن) اور تین گواہ لازماً ان شادیوں کے رجسٹرار کے سامنے ایک اعلان پر دستخط کریں گے جو اس ایکٹ کے ضمیمہ (شیڈول) نمبر ۲ کے مطابق ہوگا۔ اعلان حسب ذیل ہے:

"میں فلاں شخص حسب ذیل اعلان کرتا ہوں۔

۱۔ میں اس وقت غیر شادی شدہ ہوں۔

۲۔ میں عیسائی، یہودی، ہندو، مسلم، پارسی، بودھ، سکھ یا جین مذہب کا پیرو نہیں ہوں۔

۳۔ میں اٹھارہ برس کی عمر حاصل کر چکا ہوں۔

۶۔ اگر میں جانتا ہوں کہ اس اعلان کا کوئی حصہ جھوٹ ہے اور اگر یہ بیان دیتے وقت میں یہ جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے یا اسے سچ یقین نہ کرتا ہوں تو مجھے قید اور جرمانہ کی سزا ہو سکتی ہے۔"

یہ اعلان عورت کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ البتہ عورت کے لیے بجائے ۱۸ سال کے ۱۴ سال کی عمر ہونی ضروری ہے۔ (ہم نے دفعہ ۴ اور دفعہ ۵ کو حذف کر دیا کیوں کہ وہ غیر

ضروری ہیں۔)

ترمیمات اور مسٹر جناح:

۲۶ر فروری ۱۹۱۲ء کو وائسرائے کی کونسل میں مسٹر ''بھوپندرا ناتھ باسو نے'' اس قانون میں ترمیم (۲) کا مسودہ پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس کو منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ پاس ہو کر ملک میں نافذ ہو۔ اس ترمیم کی تائید کرتے ہوئے مسٹر جناح نے حسب ذیل تقریر کی:

مسٹر جناح کی تقریر:

''یقیناً اس کونسل میں ایک ہندو یا مسلمان نمایندے کی حیثیت اس سبب سے پر خطر ہے کہ کٹر لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔ لیکن میری گذارش یہ ہے کہ ایک نمایندہ جو اپنی قوم کے متعلق کچھ فرائض رکھتا ہے کوئی وجہ (۳) نہیں ہے کہ اپنے ذاتی عقیدے کو بے خوفی کے ساتھ ظاہر کرنے سے احتراز کرے۔

اس سے یہ نتیجہ لازم نہیں آتا کہ چوں کہ اکثریت اس کے خلاف ہے اس لیے وہی لوگ صحیح راستہ پر ہیں جن کی اکثریت ہے (۴)۔

اس کونسل کے کسی نمایندے کو اگر اس بات کا یقین ہو کہ کوئی قانون ایسا ہے جو اس کے ملک اور قوم کے لیے مفید ہے تو اس کی تائید کرنا چاہیے۔

محترم رکن قانون (سر علی امام) نے کہا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے قرآن شریف میں صاف احکام ہیں کہ ایک مسلمان مسلمان عورت یا کتابیہ کے سوا کسی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ میں یہ تسلیم کرلوں گا کہ ان کا بیان درست ہے۔ پھر کیا میں محترم رکن سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اس ملک میں قانون سازی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کونسل کو قانون اسلامی نظر انداز کرنا پڑا یا اس میں ترمیم کرنی پڑی۔ تاکہ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو جائے۔

اس کونسل نے بہت سی حیثیتوں سے اسلامی قانون کو نظر انداز کیا یا اس میں ترمیمات کی ہیں۔ مثلاً اسلامی قانون معاہدہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسلامی قانون فوج داری جس پر انگریزی حکومت قایم ہونے کے بعد بھی عمل درآمد ہوتا رہا اب کلیتہً منسوخ کر دیا گیا ہے۔ قانون شہادت جیسا کہ اسلامی قانون میں تھا اس ملک میں اب کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس سب پر بالا یہ کہ ابھی زمانۂ حال کا ایک قانون ہے یعنی کاسٹ دس ایبلٹیز ریموول ایکٹ (Caste Disabilities Removal Act) نمبر ۲۱، ۱۸۵۰ء یا ذات پات کی رکاوٹ مٹانے کا قانون۔ جس کی طرف میں اس کونسل کی توجہ اس بنا پر مبذول کروں گا کہ جیسے قرآن شریف میں کھلے ہوئے احکام موجود ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے کی صورت میں تمام حقوق وراثت ساقط ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی محترم رکن نے بتایا ہے کہ غیر مسلمہ سے شادی کی صورت میں بھی یہ حق ساقط ہو جاتا ہے (۵)۔ مگر اب ایک مسلمان اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے اور پھر بھی اس کا حق وراثت زائل نہیں ہوتا۔ اور قرآن شریف میں جو حکم اس باب میں ہے وہ بالکل منسوخ ہو گیا ہے (۶)۔ اور جہاں تک اس قانون کا تعلق ہے یہی دلیل ہندوؤں پر بھی چسپاں ہوگی۔ بشرطیکہ ایک اچھا اور مضبوط مقدمہ مرتب کیا جائے۔

میں عرض کروں گا کہ یہ نظیریں ہیں جن کی ہم کو پیروی کرنی ہے تاکہ مقتضیات زمانہ اور موجودہ ضروریات کا ہم ساتھ دے سکیں۔ جس کے لیے بہت سے نظائر خود اسلامی قانون میں موجود ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک میں غور کرتا ہوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے قوانین میں سے جن کو بھی آپ پیش نظر رکھیں ان کی وجہ سے بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر ایک ہندو غیر ہندو سے یا ایک مسلمان غیر کتابیہ سے شادی کر لے۔ لیکن کیا قانون سازی کے ذریعہ اس دقت کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ کیا اس معاملے میں مجلس قانون ساز کی دخل دہی کے لیے مواد موجود نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ بالکل اختیاری قانون ہے جس میں ذرا بھی

ودم نہیں قانون ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان کو کسی غیر مسلمہ کے ساتھ یا ہر ہندو کو کسی غیر ہندو کے ساتھ شادی کرنے ہوگی۔ اس لیے اگر کافی تعداد میں ایسے روشن خیال، تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر ہندوستانی موجود ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا پارسی اور وہ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو زمانے موجودہ کے احساسات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ تو کیوں اس طبقہ کو انصاف سے محروم رکھا جاے۔ جب اس سے ہندوؤں یا مسلمانوں کو کسی قسم کا شدید نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے (۷)۔

(گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ شعبہ قانون سازی: ص ۱۶۱-۱۶۰)

مسٹر جناح کی ترمیم کام یاب نہیں ہوئی مگر ان کی ذہنیت کا اس سے کافی اندازہ ہوگیا (۸)۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں پھر ایک ترمیم پیش کی گئی۔ جس کے ذریعہ سے ہندوؤں کی مختلف پارٹیوں، جین، بودھ، سکھ وغیرہ کا استثنا کر دیا گیا (یعنی ان کے لیے قانوناً حق ہوگیا کہ اپنے مذہب کی پیروی سے علیحدگی کا اعلان کیے بغیر آپس میں نکاح کرسکیں اور وہ نکاح قانوناً درست مانا جاے) اس کے بعد ۹ رفروری ۱۹۲۸ء کو مسٹر ہری سنگھ گور نے اسپیشل میرج بل ایوان میں پیش کیا۔

جس کے مختصر روئداد بحوالہ انڈین کوارٹرلی [(سہ ماہی) رجسٹر ۱۹۲۸ء ص ۲۵۰ جلد اول۔ ۲۲ ر مارچ ۱۹۲۸ء اسپیشل میرج ایکٹ (ترمیمی بل)] حسب ذیل ہے:

''سر ہری سنگھ گور نے تجویز پیش کی۔ ان کے اسپیشل میرج ایکٹ (ترمیمی) بل کو سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ سر ہری سنگھ نے اپنے اس اقدام کی تاریخ بیان کی اور کہا کہ ''سر ہنری مین'' نے ۱۸۶۸ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ کونسل ایک ایسا غیر مذہبی قانون شادی کے لیے بنادے جس سے تمام ہندوستانی رعایا مستفید ہو۔ اس وقت سے ملک کے لیے سول میرج کے قانون کی متعدد بار کوشش کی جا چکی ہے۔ اس کے ابتدائی اقدامات نے جو ۱۹۲۳ء میں نافذ ہوئے۔ ہندو، جین، سکھ اور بودھ مذہب والوں کے لیے آپس میں شادی کو جائز کر دیا۔ ہنری مین کے بل نے ایوان کے سامنے یہ پیش کیا تھا کہ تمام شادیوں کو بغیر ذات پات، رنگ و نسل کا لحاظ کیے ہوئے

جائز قرار دیا جائے۔ آج ہندوستان کو سخت دشواری پیش آرہی ہے کیوں کہ فریقین برٹش سول میرج کے ماتحت صرف ہندوستان کے باہر شادی کر سکتے ہیں اگر یہ بل پاس ہوگیا تو ہندوستان سے فرقہ وارانہ جذبہ ختم ہو جائے گا اور ہندوستان متحد ہو کر ایک قوم ہو جائے گا۔"

مسٹر انوار العظیم نے کہا کہ اس بل کے ذریعہ ہمارے اعتقادات کو کچلا جا رہا ہے اس لیے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ سر یامین خاں نے فرمایا کہ یہ بل غیر اسلامی نہیں ہے۔ ذات پات کی بندش کو جڑ سے اکھاڑ دینا اور دو محبت کرنے والوں کے لیے اتحاد کا بلا لحاظ ذات پات کوئی راستہ مہیا کرنا ایک عظیم اخلاقی کارنامہ ہے اور آزادیٔ ہند کا حل۔ اکبر نے جو کہ ایک بہت بڑا قومی شخص تھا اس کی مثال پیش کردی۔ مگر افسوس ہندوستان نے جو ذات پات سے مغلوب تھا اس کی تقلید نہیں کی۔ یہ کہتے ہوئے مسٹر یامین نے بل کے مشتہر کرنے کی حمایت کی (کوارٹری رجسٹر ۱۹۲۸ء) اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں پھر یہ بل پیش کیا گیا اور خواہش کی گئی کہ جس طرح ۱۹۲۳ء میں سول میرج کے قانون میں ترمیم کر کے ہندوؤں کے مختلف فرقوں، بودھ، جینی، سکھ وغیرہ کا استثنا کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں عیسائیوں وغیرہ کا بھی استثنا کر دیا جائے یا یہ قانون ہی منسوخ کر دیا جائے جس سے ہر مذہب والے کے لیے ہر مذہب والے کے ساتھ نکاح قانوناً صحیح ہو جائے۔

مگر جمعیۃ العلماء ہند نے ایسی کوشش کی جس سے یہ ترمیم پاس نہ ہو سکی جس کی مختصر روداد گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ (دیکھو جمعیت علمائے ہند کیا ہے؟ زیر عنوان مسلم اور غیر مسلم کی شادی کا قانون، ص ۱۷)

حواشی

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ مسمّٰی ''سول میرج ایکٹ اور لیگ''

(۲) ترمیم کا حاصل یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا جائے یعنی قانوناً جائز قرار دیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کی شادی غیر ہندو اور غیر مسلمان سے جائز مانی جائے اور اس اعلان کی ضرورت نہ رکھی جائے۔

(۳) وجہ تو ظاہر ہے بشرطیکہ یہ نمائندہ اپنی حیثیت اور اپنے فرض منصبی کو دیانت داری کے ساتھ پہچانے نمائندہ کے معنی اپنی ذاتی رائے پر چلنے والے یا عوام کے جذبات و اعتقادات کے بر خلاف اپنی ذاتی رائے منوانے والے کے نہیں ہیں بلکہ قوم کے نمائندہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس قوم کے جذبات و معتقدات کی ترجمانی کرے۔ بالخصوص جب کہ اس سے پہلے ۱۹۰۶ء کا جداگانہ انتخاب منظور ہو کر نافذ ہو چکا تھا تو اس کے تو معنی صاف طور پر یہی تھے کہ مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے معتقدات کے بموجب ترجمانی کرے۔ ورنہ جداگانہ انتخاب کا مطلب کیا۔ صرف ووٹ حاصل کرنے سے نمائندگی تو مخلوط انتخاب میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس سے بڑھ کر خیانت اور غداری کیا ہو سکتی ہے کہ ووٹ حاصل کرنے کے وقت تو اسلام، تحفظ اسلام اور تحفظ کلچر اسلام کا شور مچایا جائے اور اسمبلیوں میں پہنچ کر خود اسلام کے استیصال اور احکام اسلام میں تحریف کی کوشش کرے۔ بالخصوص ایسے مسئلے میں کہ اس کے متعلق کھلی ہوئی صاف صاف قرآن پاک کی آیتیں موجود ہوں۔

(۴) اس سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو لیگ میں داخل ہونے کے لزوم اور وجوب کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اس میں ہے۔ اور اس لیے اس کو صحیح راستہ بتاتے ہیں۔

(۵) یہ جملہ قوانین اس زمانے میں مستبد انگریزی حکومت نے بنائے ہیں جب کہ وہ مطلق العنانی کے ساتھ جو کچھ چاہتی تھی کرتی تھی مگر جب کہ کونسلیں قائم کی گئیں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے منتخب شدہ نمائندے وہاں اس لیے بھیجے جانے لگے کہ اپنے منتخب کرنے والوں کی ترجمانی کرتے ہوئے ایسی باتیں قوانین میں نہ آنے دیں جو اپنے مذہب یا ان کی معیشت کے

لیے مضرت رساہوں اور ایسی باتیں پاس کریں جوان کی دینی اور دنیاوی زندگی کی بہبودی کا ذریعہ بنیں۔ اس وقت کا حال دوسرا ہو گیا۔ مسٹر جناح کو مسلمانان بمبئی نے نمائندہ بنایا تھا ان کا فرض تھا کہ وہ اپنے ووٹ دینے والوں کی ترجمانی کرتے اور ایسے قوانین کی آڑ نہ پکڑتے جو انگریزوں نے خلاف مذہب اور خلاف قرآن و اسلام محض اپنے استبداد سے بنائے تھے۔ نیز یہ قوانین خلاف اسلام ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی قابل استدلال نہ تھے بلکہ اگر کونسل میں بھی ایسے قوانین بنائے گئے ہوتے تو ان کو منسوخ کرتے یا ان میں ترمیم کرنے کا مطالبہ لازم تھا۔ بالخصوص جب کہ تمام یا اکثر مسلمان ان سے ناراض بھی تھے۔ ایسے وقت میں ایسا قانون بنانا جو کہ خلاف قرآن اور خلاف اسلام تھا۔ اور فقط مسٹر جناح کے مغربیت زدہ ضمیر کی آواز تھی، کیا یہ غداری اور خیانت نہیں تھی۔ کیا ایک غلطی دوسری غلطی کی نظیر اور دلیل ہو سکتی ہے؟

(۶) یہ مسٹر جناح کی ناواقفیت اور اسلامی احکام سے لاعلمی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے مرتد ہو جانے پر تو بے شک ارث اور ترکے سے محروم ہو جاتا ہے لیکن غیر کتابیہ سے شادی کرنے پر وراثت سے محروم نہیں قرار دیا جاتا۔ ہاں! نکاح صحیح نہ ہونے کے باعث اولاد محروم الارث ہوگی۔ غلط ہے حکم قرآنی کو کوئی طاقت منسوخ نہیں کر سکتی۔ حکم قرآنی بہ ہر حال حکم ہے۔ یہ بدنصیبی لوگوں کی ہے کہ اس پر عمل نہ کریں۔

(۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح کے نزدیک قرآنی احکام میں بے انصافی بھی ہے۔ یہ غلط ہے کہ نقصان کا احتمال نہیں۔ یہ مسٹر جناح کی نفسیات سے سراسر ناواقفیت ہے خاوند اور اس کی اولاد کو مذہبی حیثیت سے بہت سخت نقصان کا اندیشہ ہے۔ کیوں خوف شدید ہے کہ علاقہ زوجیت کی استواری کہیں خاوند اور اس کے بچوں کو اسلام سے منحرف نہ کر دے۔ اور تبدیلی مذہب کا سبب بن جائے (معاذ اللہ) یا کم از کم ان کے اندر اسلامی عقاید اور اعمال میں کمزوری یا تبدیلی پیدا ہو جائے۔ بالخصوص جب کہ مسلمان عورتوں کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے ہو۔ اس وقت اس کے ارتداد کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔ اور یہ خطرہ تمام دنیاوی خطرات سے بڑھا ہوا ہے۔ اور یہ کوئی خیالی امر نہیں۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں، کتابی عورت عقیدے کے لحاظ سے رسالت کی قائل ہے اور مرد کے تابع ہونے کے باعث اس سے نکاح میں اتنا شدید خطرہ بھی

نہیں۔ مگر تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کتابی سے نکاح کو منع فرمایا ہے۔ بظاہر قرآنی اباحت کے لیے یہ احتیاط ضروری ہے کہ کتابی عورت اپنے اقتدار وغیرہ کے باعث مرد کے مذہب اور عقاید پر اثر انداز نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

(۸) مولانا ظفر الملک صاحب لکھنوی سوانح عمری مسٹر جناح صفحہ ۲۶۷ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۰۹ء میں مسلمانان بمبئی کی جانب سے منتخب ہو کر مسٹر جناح وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے، جہاں ۱۹۱۲ء میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف انھوں نے قانون شادی کے مسودۂ ترمیم کی پرزور تائید کی اور علی گڑھ پارٹی کے خلاف مسٹر گوکھلے کی ابتدائی تعلیم کے مسودۂ قانون کی بھی تائید کی جس سے مسلمانان بمبئی ناراض ہو گئے۔ اور ۱۹۱۲ء کے انتخاب میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مسٹر جناح نے تعلیمی مسودہ (مذکورہ) پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: جب میں شادی کے مسودۂ قانون پر اس سے پیشتر تقریر کر رہا تھا تو میں نے علانیہ آزادی کے ساتھ اسے تسلیم کیا تھا کہ قوم کی اکثریت اس مسودۂ قانون کے خلاف ہے مگر میرے دلی معتقدات اس مسودے کی موافقت میں تھے اور میں نے اپنا فرض تصور کیا کہ اس تجویز کی تائید کروں۔" (سوانح عمری مسٹر جناح: ص ۲۶۷)

جمعیت علماے ہند کے اوّلین دو عمایدین

کے

مساعی حسنہ

مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

حرف چند

اس عنوان کے تحت جمعیت علماے ہند کے پہلے دو صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے ادوار میں اسلامی زندگی کے احیا کے لیے قانونی، سیاسی، معاشرتی سطح پر جو کوششیں کی گئی تھیں۔ ان کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

قارئین کرام اس کے مطالعے سے بہ یک نظر محسوس فرمالیں گے کہ جمعیت کی سیاسی، قومی و ملّی زندگی میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کے شب و روز صرف اسلامی زندگی کے احیا کے مساعی کے لیے وقف تھے اور اس کا قومی سیاسی زندگی میں جان کھپانا بھی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ ہی کے لیے تھا۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۱)

عہد صدارت حضرت مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی

(۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۹ء)

۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء:

جمعیت علماے ہند کا ساتواں سالانہ اجلاس مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء کو بہ مقام کلکتہ منعقد ہوا۔ اس میں جو تاریخی قرار دادیں منظور کی گئیں، ان میں سے ایک کا تعلق ترکے میں عورتوں کے حصے، نااہل خاوندوں کی طرف سے حقوق زوجیت کی عدم ادائیگی اور ہندوستان میں محاکم قضا کے قیام سے تھا۔ قرار دادیں یہ ہیں:

۱۔ میراث میں عورتوں کا حصہ:

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اپنے اجلاس مراد آباد اور جمعیت عاملہ کی تجاویز کے سلسلہ میں از سر نو اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ پنجاب اور بمبئی وغیرہ کی بعض مسلم اقوام میں عورتوں کو حصۂ میراث نہ دینے کا جو رواج ہے وہ شریعت اسلامیہ کے احکام کے سخت مخالف اور دین و ایمان کو غارت کر دینے والا ہے۔ اس خلاف اسلام رسم و رواج کو مٹانے اور ان اقوام میں اسلامی احکام توریث جاری کرانے کے لیے جمعیت علما کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ موقر وفود کے ذریعہ اس امر کی تبلیغ کی جائے جو پنجاب بمبئی کے ذی اثر مسلمانوں سے مل کر اور ان کو سمجھا کر اس رسم کا استیصال کریں اور ناظم جمعیت علماے ہند کو اختیار دیتا ہے کہ وہ وفود مرتب کر کے روانہ کریں۔ نیز اس تجویز کو بذریعہ اشتہاروں اور اخباروں کے متعلقہ علاقوں میں بکثرت شایع کریں۔

۲۔ نااہل خاوند اور خواتین کی مشکلات کا حل:

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ان مشکلات اور صعوبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو نااہل خاوندوں کی جانب سے حقوق زوجیت ادا نہ کرنے کے سلسلہ میں عورتوں کو پیش آتی ہیں اور جن کی وجہ سے عورتیں معلقہ جیسی بن کر بہت سی معصیتوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ یا ان کی زندگی مصائب و مہالک کی نذر ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات مرتد ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے (معاذ اللہ من ذالک) تجویز کرتا ہے کہ

الف۔ اگرچہ ان مشکلات کا صحیح حل محکمہ جات قضا کے قیام سے ہی ممکن ہے لیکن جب تک محکمہ جات قضا قایم نہ ہوں اس وقت تک کے لیے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ شہروں اور قصبوں کے مسلمان جمع ہو کر عامہ مسلمین کے جلسہ میں کسی معتمد اور متدین عالم کو ایسے معاملات میں نکاح و طلاق و تاجیل کے فیصلوں کے لیے اپنا قاضی مقرر کر لیں۔

یہ قاضی عامۂ مسلمین کی جانب سے شرعی فیصلہ کرنے کا شرعاً مجاز ہو جائے گا۔

ب۔ مگر ضمن الف پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جس شہر اور قصبے کے مسلمان مقامی ضرورتوں کو پوری طرح محسوس کریں۔ وہ جمعیت علما سے درخواست کریں کہ ان کو اس امر کی اجازت دی جائے۔ جمعیت علماے کی مجلس عاملہ اس درخواست پر غور کرے۔ اور اگر اس کی رائے میں اس جگہ کی فضا اس کے مناسب ہو تو اجازت دے۔ اور تحریری اجازت موصول ہو جانے کے بعد وہاں کے مسلمان نصب قاضی کی کارروائی کریں۔

ج۔ ضمن الف اور ب کے عمل میں آجانے کے بعد جو قاضی مقرر ہو۔ اسے لازم ہوگا کہ وہ مقدمات دایرہ کے متعلق قواعد شرعیہ متعلقہ قضا کی پوری پابندی کرے اور تحقیقات کاملہ کے بعد شہادت یا اقرار یا یمین و نکول کے موافق حکم صادر کرے۔

۳۔ محاکم قضا کا قیام:

ہندوستان میں شریعت اسلامی کے مطابق محاکم قضا کا قیام جس میں مسلمانوں کے طلاق و نکاح، وراثت و اوقاف وغیرہ کے مذہبی مسائل مسلمان قاضیوں کے ذریعہ سے طے کیے جائیں۔ مسلمانوں کا مذہبی حق ہے۔ اور حکومت ہند اب تک یہ حق غصب کرتی رہی ہے۔ لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ یہ مذہبی حق مسلمانوں کو واپس دے اور یہ جلسہ مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس کے قیام کی جدو جہد کریں۔

۴۔ قربانی میں عدم مداخلت کی ضمانت:

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ریاست جیند کے اس حکم کو جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بھیڑ بکری تک کی قربانی کرنے سے گزشتہ ماہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور اکادشی کے اجتماع کی وجہ سے روک دیا گیا تھا۔ صریح مذہبی مداخلت سمجھتا ہے اور حکام ریاست سے توقع رکھتا ہے کہ وہ آیندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کریں گے۔ جس کا نتیجہ مسلمان رعایا کے اندر فتنہ اور تشویش پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

۵۔ ایک جدید ترجمۂ قرآن کی ضرورت:

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اس روز افزوں ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو انگریزی اور دیگر زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ اور ایسے تفسیری فواید کی اشاعت کے متعلق ملک میں محسوس ہو رہی ہے۔ جو عام فہم ہونے کے علاوہ تمام دیگر مذاہب کے اعتراضات اور شبہات کے رفع کرنے کے لیے کافی ہو۔ جمعیت علما نے اپنے سابقہ جلسوں میں اس کام کے انصرام کے متعلق ایک تجویز منظور کی تھی مگر اب تک مالی صعوبت کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہوسکا۔ جمعیت کے خیال میں اردو ترجمہ اور تفسیری فواید تیار کرانے اور پھر مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانے اور پھر شایع کرنے کے مبادیات کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ جمعیت علما اس ضروری اور

عظیم الشان اسلامی خدمت کے انصرام کو نہایت ضروری سمجھتی ہے۔ اور مخلص دردمند مسلمانوں کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کام میں جمعیت کا ہاتھ بٹائیں اور جلد از جلد رقم مذکور فراہم کردیں۔ جمعیت علما کا یہ اجلاس صدر و ناظم جمعیت کو اختیار دیتا ہے کہ جب مالی حالت اجازت دے تو وہ مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کریں اور اس کی رائے اور صوابدید کے ساتھ معتمد و مستند علما کی نگرانی میں ترجمہ و تفسیری فواید تیار کرا کے طباعت کی کارروائی شروع کردیں۔ تفسیری فواید کا کام مولانا شبیر احمد صاحب کے سپرد کیا جاتا ہے۔ مولانا موصوف کی علامہ سید سلیمان صاحب اعانت کریں گے۔

۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء:

جمعیت علماے ہند کا سالانہ اجلاس ہشتم بہ مقام پشاور مورخہ ۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو زیر صدارت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شرعی مسائل میں فیصلے کے لیے مسلمان حاکم اور زکوٰۃ، عشر اور صدقات و خیرات کے نظام کے لیے بیت المال کے قیام کے سلسلے میں یہ قراردادیں پاس کی گئیں۔

۱۔ محاکم قضا کا قیام:

چوں کہ مسلمانوں کے بہت سے مذہبی معاملات ایسے ہیں جن میں حاکم مسلم کا فیصلہ ضروری ہے اور غیر مسلم حاکم کا فیصلہ شرعی طور پر نافذ نہیں ہوتا اور حکومت موجودہ نے مسلمانوں کی اس ضرورت کو اب تک پورا نہیں کیا۔ اس بنا پر مسلمان سخت مذہبی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ظالم اور جاہل شوہروں سے ان کی مظلوم اور زندہ درگور عورتوں کی گلوخلاصی نہیں ہوسکتی۔ مرتدہ کے نکاح فسخ ہونے میں اس کے شوہر کے حقوق زائل ہوجاتے ہیں خیار بلوغ میں شرعی طور پر حکم فسخ حاصل نہیں ہوسکتا۔ طلاق کے بہت سے مسائل الجھے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ جلسہ گورنمنٹ سے مطالبہ کرتا

ہے کہ مسلمانوں کی ان مذہبی مشکلات کے حل کے لیے بااختیار شرعی قاضی مقرر کرے۔ جن کے انتخاب کا حق مسلمانوں کو ہو تا کہ ان قضاۃ کی عدالتوں میں ایسے معاملات کا شرعی فیصلہ ہو سکے۔ جمعیت علما کا یہ جلسہ حسبِ ذیل حضرات کی کمیٹی مقرر کرتا ہے تا کہ وہ اس قسم کے تمام مسائل کو معین کر کے ان قضاۃ کی حدِ عمل معین کردیں۔ تا کہ ان مسائل میں گورنمنٹ سے اختیارات دینے کا مطالبہ کیا جاے۔

مولانا حسین احمد صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب،
مولانا محمد سجاد صاحب، مولانا سید محمد انور شاہ صاحب،
مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا قطب الدین صاحب،
مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی، مولانا شبیر احمد صاحب،
مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبدالحکیم صاحب پشاوری۔

۲۔ بیت المال کا قیام:

جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ علما صوبہ سرحد کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ و عشر و صدقات و خیرات کے لیے ایک شرعی بیت المال قایم کرے۔ جس میں مذکورہ بالا مدات کی آمدنی جمع کی جائے اور جمعیت صوبہ کی نگرانی میں پورے اہتمام سے اپاہجوں، بیواؤں، یتیموں، لاوارث بچوں، مدارس دینیہ کے طلبا کے وظائف اور سامان تعلیم نومسلموں کی تربیت و کفالت میں ضرورت اور استحقاق کی رعایت کے ساتھ صرف کی جائے اسی سلسلہ میں گورنمنٹ سے استدعا کی جاے کہ لاوارثی ترکہ کو وہ اس قومی بیت المال میں داخل کرنے کی اجازت دے دے تا کہ لاوارث بچوں کی کفالت و تربیت میں خرچ کی جا سکے۔

نیز جمعیت صوبہ کو لازم ہے کہ ایک تبلیغی جماعت قایم کرے جس کے ذریعہ سے سرحدی مقامات کے باشندوں کی معاشرت اور اخلاق و اعمال کی اصلاحی خدمت انجام دی جاے۔

۳۔ قرآن مجید کی طباعت و اشاعت:

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید تمام اسلامی برکات کا سرچشمہ اور دین و مذہب کا اصل الاصول ہے۔ مسلمانوں کا سب سے مقدم فرض اس کی اشاعت و تبلیغ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو قرآن مجید کے نشر و تبلیغ کے ساتھ چنداں شغف و اہتمام نہیں ہے۔ ہندوستان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں غیر مسلم مطابع کے چھپے ہوئے قرآن مجید ہدیہ ہوتے ہیں جو صرف تجارتی اغراض کے لیے چھاپے جاتے ہیں۔ اور ان کی تصحیح اور احترام و تکریم سے چھاپنے والوں کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

۴۔ اسلامی تہذیب کی حفاظت:

چوں کہ مغربی تہذیب اور تمدن کا سیلاب روزانہ تیزی سے بڑھتا آرہا ہے اور ایشیائی قومیں اپنی شان دار روایات اور مذہبی احکام سے بیگانہ ہوتی جارہی ہیں۔ مسلمان بھی اسلامی تہذیب اور قومی وضع چھوڑ کر یورپین تہذیب اور وضع اختیار کر رہے ہیں۔

عورتوں کی بے پردگی بے حیائی کے درجہ تک پہنچ رہی ہے۔ ایک طرف انگریزی خواں طبقہ میں یہ باتیں نہایت سرعت کے ساتھ سرایت کررہی ہیں۔ دوسری طرف یورپین تجارتی تعلقات نے تجارتی معاملات میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا کردی ہیں جن سے سود اور انشورنس اور اسی قسم کے بہت سے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لیے جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ علماے کرام سے پرزور استدعا کرتا ہے کہ اس آنے والے خطرے کا پورا احساس کریں اور اپنی منتشر قوت کو جمعیت علما کے مرکزی دایرے میں جمع کرکے پوری طاقت کے ساتھ دہریت و الحاد کا مقابلہ کریں۔

جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ اس اعلان کے ساتھ کہ سود کی حرمت قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے اور کوئی شخص کسی حرام کو حلال نہیں کرسکتا۔ علما و واقفین

معاملات تجارت کی حسب ذیل کمیٹی منتخب کرتا ہے جو حالات حاضرہ کی تنقیح و تحقیق کرے اور شرعی تیسیر کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب وسنت کی روشنی میں جمہور مسلمین کی رہنمائی کرے اور ظاہر کردے کہ حوادث جدیدہ میں کتنے امور جائز اور حلال ہیں اور کتنے ناجائز اور حرام۔ کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے:

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب، مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محلی،
مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا نثار احمد صاحب کان پوری،
مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا معین الدین صاحب اجمیری،
مولانا عبدالقہار صاحب (مرتستہ علما) مولانا محمد علی صاحب،
مولانا عبدالحکیم صاحب پشاوری، سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب،
مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی، میاں ہاشم غلام علی مصطفیٰ صاحب،
مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی،

جمعیت علما ہند کے صدر اور سیکرٹری اس کمیٹی کے صدر اور سیکرٹری ہوں گے اور کمیٹی کو اضافہ ممبران کا اختیار ہوگا۔

۵۔ اوقاف کی نگرانی:

وقف اسلامی خصوصیات میں سے ہے اور اوقاف مسلمین کے ساتھ مذہب وقوم کے بڑے بڑے مصالح وابستہ ہیں اس لیے مسئلہ اوقاف خاص طور پر توجہ کا مستحق ہے۔ شریعت اسلامیہ میں وقف کے احکام پوری صراحت کے ساتھ موجود اور اس کی حدود متعین ہیں۔ مگر افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے اوقاف متولیوں کی دست برد میں آجاتے ہیں اور ان کی آمدنی حقیقی مصرف میں صرف ہونے کی جگہ متولیوں کے ذاتی مصارف میں صرف ہوتی ہے۔ اس لیے جمعیت علمائے ہند کے یہ جلسہ جمہور اہل اسلام کو توجہ دلاتا ہے کہ اوقاف کی نگرانی کے لیے عام انتخاب کے

ذریعہ سے ایسی کمیٹیاں مقرر کریں جن کے ممبروں میں معتبر علما اور باا‌ثر اہل الرائے اصحاب شامل ہوں وہ تحقیق کریں اور جس متولی کی خیانت اور نااہلیت ثابت ہو اس کے قبضہ سے وقف کو نکال کر کسی متدین صالح شخص کو متولی مقرر کریں۔ کسی ایسی کمیٹی کو جس میں معتبر علما وصلحا شامل نہ ہوں اور اس کے فیصلے وقف کے احکام شرعیہ اور شرائط واقف کے موافق نہ ہوں تو اس کو وقف کی نگرانی کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اور نہ متولیون کو اس کے احکام کی پابندی ضروری ہوگی۔

نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید اور اس میں اصلاحات:

۲۷ راگست ۱۹۲۸ء

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ۲۷ راگست ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا۔ اس میں نہرو رپورٹ پر تنقید وتبصرہ کے لیے ایک کمیٹی صدر جمعیت علماے ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کی سربراہی میں مقرر کی گئی تھی۔ کمیٹی کے ارکان مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولوی سید فضل الحسن حسرت موہانی اور ناظم جمعیت مولانا احمد سعید دہلوی تھے۔

کمیٹی نے رپورٹ پر سخت تنقید کی اور نہایت غور وخوض کے بعد اس میں بنیادی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حقوق وغیرہ کے تعین اور ان کے دائرہ اثر اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں جو اصلاحات وتجاویز مرتب فرمائی تھیں، یہاں درج کی جاتی ہیں۔

مذہبی حقوق اور ان کی حفاظت

جمعیت علما کے نزدیک ضروری ہے کہ مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے دستور اساسی میں حسب ذیل دفعات شامل ہوں۔

ا۔ مسلمانوں کے لیے قربانی گاؤ ذبیحہ گاؤ کی آزادی اور ہندوؤں کے لیے مساجد کے سامنے باجا بجانے کا مسئلہ اس مسئلہ کے متعلق مدراس کانگریس اور مسلم

لیگ کلکتہ نے تجاویز پاس کی ہوئی ہیں ان کی روشنی میں تجویز یا دفعہ کے الفاظ بنانے میں جمعیت علما آل پارٹیز کے ساتھ مل کر کام کر سکتی ہے بشرطے کہ اس کا اضافہ اصولاً تسلیم کرلیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کی بہت سی مذہبی ضرورتیں بغیر مسلمان قاضی کے پوری نہیں ہوتیں اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لیے دارالقضاء کے قیام کو اصولاً تسلیم کرلیا جائے اور حکومت مشترکہ ہند اس کی کفیل ہو۔ اس قسم کی عملی صورتیں آج بھی موجود ہیں اور جمہوری حکومتیں اس پر عمل کر رہی ہیں۔ جزائر فلپائن میں امریکہ کی طرف سے اور روسی حکومت میں اور کئی غیر مسلم ہندوستانی ریاستوں میں آج بھی یہ طریقہ جاری ہے اور سیلون کے مسلمانوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے اور یو پی کونسل میں بھی یہ تجویز پیش کی جا چکی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو آزادی ہو کہ وہ امارۃ شرعیہ کا ادارہ قایم کریں جیسے کہ آج بھی صوبہ بہار میں اس کا نمونہ قایم ہے۔

۴۔ مذہبی تعلیم، مذہبی تعلیم کی زبان، مذہبی تعلیم کا نصاب، مذہبی ادارے، مذہبی تحریکیں، مساجد، عیدگاہیں، تکیے، امام باڑے، کربلائیں، اوقاف، خانقاہیں، مدارس، مقابر و قبرستان، آثار قدیمہ اسلامیہ، عمارات اسلامیہ محفوظ رکھی جائیں گی۔ اور آیندہ بھی ان کی تشکیل و تعمیر و قیام و استعمال کے لیے مسلمان آزاد ہوں گے۔

۵۔ حکومت کے مدارس میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم، اشیاء متعلقۂ تعلیم میں کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو مسلمانوں کی تہذیب یا ان کے مذہب پر برا اثر ڈالتی ہو یا ان کے جذبات کو مجروح کرتی ہو۔

۶۔ مسلمان اپنے مذہبی مدارس اور مذہبی اداروں میں ممالک اسلامیہ کے ماہرین سے خدمات لینے اور اس غرض کے لیے ان کو بلانے اور ان کا تقرر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ حکومت اس کے خلاف پابندی عاید نہ کرے گی۔

۷۔ مسلمانوں کو کسی ایسی چیز پر مجبور نہ کیا جائے گا جو ان کے مذہب کے خلاف

ہو اور نماز کے اوقات میں بالخصوص جمعہ کے لیے ادائے نماز کی غرض سے ان کو چھٹی دی جائے گی۔

۸۔ مذہبی تبلیغ آزاد رہے گی۔

۹۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، ولایت، حضانت، بلوغ، تفریق زوجین، خلع، فسخ نکاح، عنین، مفقود، سفر حج وزیارت، اوقاف کے لیے اسلامی احکام کے خلاف قانون نہ بنایا جائے گا۔ نہ کوئی غیر مسلم ایسے قانون بنانے والی کمیٹی میں شریک ہوگا اور نہ کوئی ایسا قانون اسلامی، مذہبی اداروں کی تصدیق کے بغیر قابل قبول ہوگا۔

۱۰۔ ان تمام امور مذکورہ دفعات بالا کا اہتمام وانتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

وقف بل:

۱۶/مارچ ۱۹۳۴ء

مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس مورخہ ۱۴/تا ۱۶/مارچ ۱۹۳۴ء بہ مقام مرادآباد وقف بل کے بارے میں یہ کارروائی عمل میں آئی۔

بتاریخ ۱۵/مارچ ۱۹۳۴ء زیر نگرانی مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند مجلس مشاورت کا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ صوبہ کے دیگر اصحاب الرائے حضرات کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی اس مشترکہ مجلس مشاورت نے اپنی تجاویز میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جو مجلس کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں وقف بل صوبہ متحدہ پیش کردہ خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب پر غور کر کے شرعی نقطۂ نگاہ سے اس میں ترمیم کر کے اپنا مسودہ مجلس مشاورت کے سامنے پیش کرے۔ یہ کمیٹی حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب،

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کنوینر،
مولانا عبدالحامد صاحب قادری،
مولوی بدرالدین صاحب وکیل نگینہ،
مولوی فضل علی صاحب وکیل بدایوں۔

صدر محترم نے مجلس کے اختتام پر مولانا احمد سعید صاحب کی مزید نامزدگی فرمائی۔ چناں چہ مذکورہ حضرات پر مشتمل سب کمیٹی نے بچھرایوں اور دہلی کی متعدد نشستوں میں کافی غور وخوض کے بعد حافظ ہدایت حسین صاحب کے مسودۂ وقف بل صوبہ متحدہ میں شرعی نقطۂ نگاہ سے جو ترمیمات ضروری سمجھیں مجلس مشاورت کے سامنے ۱۹/اپریل ۱۹۳۴ء کو نگینہ میں پیش کیں اور مجلس مشاورت میں غور وخوض کرنے کے بعد جمعیت عاملہ کے جلسہ میں مجلس شوریٰ کی تمام کارروائی پیش کرے گی۔

مسودہ قانون اوقاف پر غور:

۱۸/۱۹/اپریل ۱۹۳۴ء کو نگینہ میں جمعیت علماے ہند کی مجلس مشاورت کا ایک نہایت اہم اجلاس منعقد ہوا جو حافظ ہدایت حسین صاحب کے مسودۂ قانون متعلقہ اوقاف پر غور کرنے کے لیے طلب کی گئی تھی اجلاس کی متعدد نشستوں میں ہندوستان کے متبحر وجید علما اور قابل وماہر وکلاء اور اہل الراے حضرات نے شرکت فرمائی۔

حضرت مفتی صاحب صدر جلسہ نے اوقاف کے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس اہم ترین مذہبی معاملہ میں مسلمانوں کی جانب سے شرعی نقطۂ نگاہ پیش کردیا جائے تاکہ مسلم اراکین مجلس مقننہ اور خود گورنمنٹ کو صحیح پوزیشن معلوم ہوجائے۔ سید علی متقی خان صاحب نے سب کمیٹی کی ترمیمات کو ایک ایک دفعہ کرکے پیش کیا اور اس پر کافی بحث وتمحیص کے بعد جو ترمیمات اتفاقی طور پر منظور ہوئیں وہ حافظ ہدایت حسین صاحب کے مسودہ کے ساتھ مطبوعہ مسودہ قانون اوقاف میں درج کی گئیں اوران کو طبع کراکے ممبران کی خدمت میں ارسال کردیا گیا۔

مجلس عاملہ جمعیت کی ایک تجویز:

۱۹؍اپریل ۱۹۳۴ء کو حافظ محمد ابراہیم صاحب ایم ایل سی نگینہ ضلع بجنور کے مکان پر زیر صدارت حضرت العلامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علماے ہند، جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کافی غور وخوض کے بعد متفقہ طور پر متعدد تجویزیں منظور ہوئیں۔ ان میں سے مسودہ قانونِ اوقاف میں اصلاحات وترمیمات کے بارے میں تجویز یہ ہے:

مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ سب کمیٹی وقف بل کی رپورٹ اور جلسۂ مشاورت کے منظور کردہ ترمیمات کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے اور ضروری سمجھتا ہے کہ مسلمانان صوبہ متحدہ متفقہ طور پر بجاے مسودہ حافظ ہدایت حسین صاحب کے اس مسودہ کی تائید کریں کہ یہ احکام شرعیہ کے موافق اور وقف اور اغراض وقف کا کفیل ہے۔ یہ جلسہ تمام مسلم ممبران کونسل سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس مسودہ کی ترمیمات کی کونسل میں تائید کریں اور جب تک کہ حافظ ہدایت حسین صاحب ان تمام ترمیمات کو منظور نہ کرلیں۔ وقف بل ہرگز پاس نہ ہونے دیں۔ اس مسودہ کی اشاعت اور راے عامہ حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع ممکنہ اختیار کیے جائیں۔

یکم و۲؍فروری ۱۹۳۶ء:

یکم و۲؍فروری ۱۹۳۶ء جمعیت مرکزیہ جمعیت علماے ہند نے مرادآباد میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں علماے جمعیت کے علاوہ بہت سے دیگر علما نے بھی شرکت کی۔ اس میں شرکت کرنے والے علما اور مجلس کی کارروائی کی تفصیل یہ ہے۔ اور جمعیت علما ہند کا مرتبہ مسودۂ قانونِ فسخ نکاح بھی درج ہے جس پر غور و بحث کی گئی تھی۔

مسودۂ قانون فسخ نکاح:

مرکزی جمعیت علما کی مجلس عاملہ کے اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے دیگر علما کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چناں چہ جمعیت علماے ہند کی

دعوت پر علماے سہارن پور، تھانہ بھون اور علماے پنجاب نے بھی مجلس عاملہ میں شرکت فرمائی اور جمعیت علما کی مجلس عاملہ کی جانب سے یکم فروری کو ایک عام مجلس مشاورت کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں حضرات ذیل نے شرکت فرمائی۔

شرکاے اجلاس:

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، سید غلام بھیک صاحب نیرنگ
مولانا حافظ عبداللطیف صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ
مولانا مفتی محمد نعیم صاحب، مولانا عبدالکریم صاحب
مولانا نورالدین صاحب، مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب
مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبدالحامد صاحب قادری
مولانا معین الدین صاحب، مولانا فخرالدین صاحب
مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا عبدالواحد صاحب
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی
مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب، مولانا عبدالحفیظ صاحب۔

سب سے پہلے سید غلام بھیک صاحب نیرنگ نے مسودہ قانون مسلم انفساخ نکاح کے تفصیلی حالات بیان کیے اس کے بعد مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت و سید بدرالحسن صاحب ایم ایل اے، سید محمد احمد صاحب کاظمی ایم ایل اے کے مسودے بھی سامنے لائے گئے اور چاروں مسودوں کی تمہید اور دفعات پر بحث شروع ہوئی۔ جس میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علماے ہند اور مولانا حافظ عبداللطیف صاحب مہتمم مدرسۂ مظاہرالعلوم سہارن پور اور مولانا قاری احمد سعید صاحب مفتی مدرسۃ العلوم سہارن پور و مولانا عبدالکریم صاحب مفتی خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون اور مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے کافی بحث و تمحیص کی اور دو روز کی متواتر و پیہم جدوجہد کے بعد مجلس مشاورت کی کثرت رائے سے مسودہ ازسرنو مرتب کیا گیا جو دفعہ وار درج ذیل ہے:

’’مسودہ قانون فسخ نکاح

مرتبہ مجلس شوریٰ جمعیت مرکزیہ علمائے ہند

مسلمان عورتوں کے حقوق ونکاح کا قانون

بدیں غرض کہ مسلمان عورتوں کے لیے فسخ نکاح کے ان حقوق کو حاصل کرنے کا راستہ نکالا جائے جو شریعت اسلامی نے ان کو عطا کیے ہیں مگر موجودہ ملکی قانون ان کے لیے ناکافی ہے۔

ہرگاہ کہ ہندوستان میں مسلمان عورتیں اپنے نکاحوں کو فسخ کرانے کے ان حقوق سے محروم ہیں جو بروئے شریعت اسلامی ان کو حاصل ہیں مگر ملک کا موجودہ مروجہ قانون ان کے حصول کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے حسب ذیل قانون نافذ کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس قانون کا نام ’’مسلم قانون فسخ نکاح‘‘ ہوگا۔

۲۔ یہ قانون تمام برٹش انڈیا میں اطلاق پذیر ہوگا اور فوراً نافذ ہوجائے گا۔

۳۔ اس قانون کے منشا یا کسی دفعہ کے خلاف برطانوی ہند کا کوئی قانون یا ریگولیشن یا آرڈیننس موجود ہوتو وہ قانون اور ریگولیشن اور آرڈیننس اس قانون پر یا اس کی کسی دفعہ پر اثر انداز نہ ہوگا۔

۴۔ اس قانون میں جب تک مضمون یا سیاق وسباق میں کوئی امر متناقض نہ پایا جائے۔

۱۔ مالکی قانون سے شریعت اسلام مطابق مذہب امام مالکؒ مراد ہوگی۔

۲۔ حنفی قانون سے شریعت اسلام مطابق مذہب امام ابوحنیفہؒ مراد ہوگی۔

۵۔ مسلمان عورت مندرجہ ذیل وجوہ میں سے کسی ایک وجہ یا زیادہ کی بنا پر اپنے

شوہر کے خلاف فسخ نکاح کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

الف۔ا۔ یہ کہ اس کا شوہر مفقود الخبر ہو۔

۲۔ یہ کہ اس کا شوہر جنون یا جذام یا برص میں مبتلا ہو جب کہ یہ امراض بہ سخت قسم کے ہوں۔

۳۔ یہ کہ اس کا شوہر اس کو نفقہ نہ دیتا ہو یا دینے پر قادر نہ ہو۔

۴۔ یہ کہ اس کا شوہر اس پر متواتر نا قابل برداشت مظالم کرتا ہو۔

۵۔ یہ کہ شوہر کی مفقود الخبری یا طویل قید یا تعنت کی وجہ سے اس کی عصمت خطرہ میں ہو۔

ب۔ا۔ یہ کہ عورت کو خیار بلوغ حاصل تھا اور اس حق سے اس نے نکاح کو مسترد کر دیا ہو۔

۲۔ یہ کہ اس کا نکاح فاسد منعقد ہوا تھا یا بعد میں کسی وجہ سے فاسد ہو گیا ہو۔

۳۔ یہ کہ اس کا شوہر عنین یا مجبوب ہو۔

۴۔ کسی اور وجہ کی بنا پر جو بروئے فقہ حنفی فسخ نکاح کے لیے کافی ہو۔

۵۔ جو مقدمات زیر دفعہ ۵ (الف) دایر کیے جائیں گے ان کی سماعت اور فیصلہ بروئے قانون مالکی کیا جائے گا۔

۶۔ جو مقدمات زیر دفعہ ۵ (ب) دایر کیے جائیں گے ان کی سماعت اور فیصلہ بروئے قانون حنفی کیا جائے گا۔

۷۔ الف۔ مقدمات کی سماعت کے بارے میں ضابطہ دیوانی ایکٹ نمبر ۵ ۱۹۰۸ء کے احکام کے ماتحت مسلمان عورت کا دعویٰ انفساخ نکاح عدالت مجاز میں دایر کیا جائے گا بشرطے کہ اس عدالت کا حاکم مسلمان ہو۔

ب۔ اگر عدالت مذکورہ (الف) کا حاکم مسلمان نہ ہو تو ایسا دعویٰ عدالت ڈسٹرکٹ جج میں دایر کیا جائے گا جو خود اگر مسلمان ہو گا وہ اس کی سماعت کرے گا یا اپنے ضلع کے کسی مسلمان جوڈیشنل افسر کے یہاں بغرض سماعت بھیج دے گا اور اس

معاملہ میں حدود سماعت ارضی ومالی کا خیال نہ کرے گا۔

ج۔ اگر ڈسٹرکٹ جج مسلمان نہ ہو اور حسب ضمن (ب) ضلع میں کوئی مسلمان حاکم دست یاب نہ ہو تو ڈسٹرکٹ جج اس مقدمہ کو سماعت کے لیے کسی قریب ترین ضلع کے مسلمان حاکم کے اجلاس میں بھیج دے گا۔

د۔ اگر مقدمہ بھیجے جانے کے بعد مسلمان حاکم کی جگہ کسی وجہ سے غیر مسلم حاکم آجائے تو مقدمہ اس ضلع کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں واپس کیا جائے گا جہاں دایر ہوا تھا۔ اور وہ حسب ضمن (ب) و (ج) متذکرۂ صدر مقدمہ کو فیصلہ کے لیے سپرد کر دے گا۔

۸۔ ابتدائی عدالت کے فیصلے کا اپیل ہائی کورٹ میں ہوگا اور کوئی مسلم جج عدالت مذکور اس کی سماعت اور فیصلہ کرے گا۔

مسوداتِ قانونِ فسخ نکاح:

سید غلام بھیک نیرنگ اور سید محمد احمد کاظمی کے مسوداتِ قانونِ فسخ نکاح جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ مراد آباد مورخہ یکم تا ۳ رفروری ۱۹۴۶ء کو زیر غور و بحث آئے، انھیں منظور کرلیا گیا اور ایک تجویز کے ساتھ انھیں اسمبلی کے ذریعے پاس کرانے کی کوشش کا عزم کیا گیا ہے۔ تجویز یہ ہے:

''فسخ نکاح کے مسودات قانون مرتبہ سید غلام بھیک صاحب نیرنگ و سید محمد احمد صاحب کاظمی و مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب و سید بدرالحسن صاحب بہاری پر علما کی مشترک مجلس شوریٰ نے غور و بحث کر کے ایک ترمیم کردہ مسودہ تیار کرلیا ہے۔ جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ مسلمان عورتوں کے ان ناقابل برداشت مصائب پر نظر کرتے ہوئے، جن میں وہ مبتلا ہیں اور شرعی دارالقضا نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی صحیح حل مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس مسودۂ قانون کو منظور کرتا ہے۔ اور مسلم ارکان اسمبلی سے توقع رکھتا ہے کہ وہ علما کی مج[illegible]ری اور جمعیت علماے

ہند کی مجلس عاملہ کا منظور کردہ مسودہ اسمبلی میں پاس کرانے کی متحدہ قوت سے سعی کریں گے۔

۶/ مارچ ۱۹۳۹ء:

جمعیت علماے ہند کے گیارھویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی مورخہ ۳/ تا ۶/ مارچ ۱۹۳۹ء میں ایک تجویز فسخ نکاح کے اس بل کے متعلق ہے جو انھیں دنوں لیجسلیٹو اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا:

مسلمان عورتوں کی دردناک مصیبتوں کا قانونی تدارک کرنے کے لیے جو قانون فسخ نکاح اسمبلی میں پیش کی گیا تھا اس کی دفعہ نمبر ۶ قانون کی روح رواں تھی کیوں کہ اسلامی قانون کا مسئلہ ہے کہ فسخ نکاح کا فیصلہ مسلمان حاکم ہی کر سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس دفعہ کے خلاف حکومت اور بہت سے منتخب ارکان اسمبلی نے راے دے کر اس کو قانون سے خارج کرا دیا۔ اس دفعہ کے نکل جانے سے قانون کی اسلامی روح نکل گئی اور وہ ایک غیر اسلامی ایکٹ ہو گیا جو مضرت کہ قانون نہ ہونے کی صورت میں تھی وہ قانون کے اس شکل میں پاس ہونے سے کم نہیں ہوئی بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے مفاسد بہت زیادہ ہو گئے جمعیت علما کے نزدیک موجودہ شکل میں یہ قانون ہرگز منظوری کے قابل نہیں۔ سعی کی جاے کہ اس کو وائسراے کی منظوری حاصل نہ ہو۔ نیز اس کے ساتھ دار القضا اور نظارۃ شرعیہ کے قیام کی سعی کو تیز اور سرعت کے ساتھ عمل میں لانا چاہیے کہ اس قسم کی ضرورتوں کے پورا ہونے کا وہی باقاعدہ اور صحیح علاج ہے۔

محرک: حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب،

مؤید مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب بہاری

(۲)

عہد صدارت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

(۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۷ء)

۷ر تا ۹ر جون ۱۹۴۰ء

ہندوستانی معاشرے میں پیشہ وارانہ برادریوں کی سماجی حیثیت ہمیشہ قابل غور رہی ہے۔ جب کہ اسلام کی نظر میں علم وتقویٰ اور ایمان وعمل صالح ہی معیار فضیلت و بزرگی ہے۔ جمعیت علماے ہند کے پیش نظر ہمیشہ اسلامی تعلیمات کا فروغ اور سماجی اصلاح رہی۔ اس کی نظر سے یہ پہلو کیسے چھوٹ سکتا تھا۔ اس کی تاریخ میں یہ کوئی پہلی اور آخری قرارداد نہیں۔ اس کی بہت قراردادیں اس معاشرتی اونچ نیچ کو مٹانے اور ایک اسلامی معاشرتی زندگی کے قیام کے لیے یادگار ہیں۔ یہاں جمعیت کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے ایک قرارداد درج کی جاتی ہے۔

یہ قرارداد جمعیت کے بارھویں سالانہ اجلاس جون پور، مورخہ ۷ر تا ۹ر جون ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی تھی۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

"جمعیت علما کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے مسلمان شریف اور رذیل طبقات میں منقسم نہیں ہیں اور صنعت وحرفت کے لحاظ سے رذیل اور شریف قرار دینا ہندوستان کے ہندوؤں کا طریقہ تھا جو مذہبی تعلیم سے ناواقفیت اور عصبیت و جہالت کی وجہ سے بعض مسلمانوں میں بھی پیدا ہوگیا۔ اسلام نے شرافت کا مدار تقویٰ وصلاحیت پر رکھا ہے اور سید المرسلین رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "**لا فضل لعربي على عجمي الناس كلهم بنو ادم و ادم من تراب**" اس کی صاف وصریح دلیل ہے۔

یہ اجلاس ان لوگوں کے رویے کی پرزور مذمت کرتا ہے جو مسلم پیشہ ور

برادریوں کورذیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں اسلام کو نقصان پہنچاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتے ہیں۔''

قانونِ طلاق:

جمعیت علماے ہند کے بارھویں سالانہ اجلاس منعقدہ جون پور، مورخہ ۷/تا ۹/ جون ۱۹۴۰ء میں قانونِ طلاق یا کاظمی ایکٹ کے بارے میں یہ تجویز منظور ہوئی:

''جمعیت علمائے ہند کا اجلاس اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ ایکٹ نمبر ۸/ ۱۹۳۹ء جو قانون طلاق یا کاظمی ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ جس صورت میں پاس ہوکر شایع اور نافذ ہوا ہے۔ اس میں بعض دفعات اسلامی پرسنل لا کے خلاف ہوگئی ہیں جن کی ترمیم کرانی ضروری ہے۔ جمعینت کا یہ اجلاس حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ترمیمی مسودہ تیار کر کے جمعیت کے سامنے پیش کریں اور جمعیت تمام مسلم ارکان اسمبلی کو اس کی ضرورت اور اہمیت بتا کر اس کو مرکزی اسمبلی میں پیش کرانے اور منظور کرانے کی سعی کرے۔

قاضی بل:

۲۹/ ستمبر تا ۲/ اکتوبر ۱۹۴۰ء

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۲۹/ ستمبر تا ۲/ اکتوبر ۱۹۴۰ء، جمعیت کے مرکزی دفتر دہلی میں منعقد ہوا۔

اس اجلاس میں اراکین عاملہ کے علاوہ مولوی محمد احمد صاحب کاظمی ایم ایل اے نے بھی خصوصی دعوت پر اجلاس میں شرکت فرمائی اور ''قاضی بل'' پر اراکین مجلس عاملہ سے تبادلۂ خیالات فرمایا۔ جلسہ کی صدارت بعض نشستوں میں مولانا فخر الدین صاحب نائب صدر نے اور بعض نشستوں میں مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر نے اور بعض نشستوں کی صدارت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب صدر جمعیت

علمائے ہند نے فرمائی۔

حسب تجویز سالانہ اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ جون پور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا مرتب کردہ مسودہ پیش ہوا جو پوری بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا گیا۔ اور طے پایا کہ یہ ترمیمی مسودہ مرکزی اسمبلی کے کسی مسلم ممبر کے حوالہ کیا جائے جو ایکٹ مذکور کے ترمیمی بل کا باقاعدہ مسودہ تیار کر کے اسمبلی میں پیش کریں اور دوسرے مسلمان ممبران اسمبلی کو بھی اس کی حمایت کے لیے آمادہ کیا جائے۔

مسلم قانون انفساخ نکاح:

اسی اجلاس میں قانون انفساخ نکاح کے بارے میں مذکورۃ الصدر مسودے میں ذیل کی ترامیم منظور کی گئیں۔

ایکٹ نمبر ۸ / ۱۹۳۹ء مسلم قانون انفساخ نکاح کی دفعات مصرحۂ ذیل میں حسب ذیل ترمیم ہونی چاہیے۔ اور دفعہ ۷ کا اضافہ بھی نہایت ضروری ہے۔

دفعہ ۲ میں ''کوئی عورت جس کی شادی شریعت اسلامی کے مطابق ہوئی ہو'' کی بجائے کوئی عورت جو شریعت اسلامیہ کے بموجب کسی شخص کے عقد نکاح میں ہو۔ (تا کہ غیر مسلم زوجین اگر معاً مسلمان ہو جائیں تو اس عورت کو بھی الفاظ قانون شامل رہیں)۔

دفعہ ۲ ضمن ۷ میں کہ ''بیوی نے جس کو اس کے باپ یا کسی دوسرے ولی نے نکاح میں دیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے نکاح مذکور کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' کی بجائے ''بیوی نے جس کو باپ یا دادا کے سوا کسی دوسرے ولی نے نکاح میں دیا تھا۔ بالغ ہونے کے وقت نکاح مذکور کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا'' اور ''شرط یہ ہے کہ'' فقرہ بالکل حذف کر دیا جائے۔

متعلق ج میں لفظ ''عدالت کو لازم ہوگا'' کے بعد عبارت یوں ہو کہ ''شوہر کی نامردی کی صورت میں ایک حکم۔''

دفعہ ۴ میں لفظ ''بذات خود'' کے آگے ''اس کے لیے فسخ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کی قانونی وجہ قرار نہیں دیا جاے گا۔'' اور فقرہ ''شرط مزید یہ کہ'' حذف کر دیا جائے۔

دفعہ ۷ اس ایکٹ کے ماتحت دایر شدہ مقدمات کی سماعت مسلم جج کی عدالت میں ہوگی۔ اس دفعہ کی عبارت وہی ہونی چاہیے جو کاظمی بل کی دفعہ ۶ میں درج تھی۔

بنگال میرج ڈاوری پری ونشن بل:

مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا جو اجلاس ۲۹ ر ستمبر تا ۲ ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو دہلی میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں صوبہ بنگال کی اسمبلی میں ایک بل کے حوالے سے مجلس نے یہ قرارداد منظور کی۔

جناب مولوی آفتاب حسین صاحب ایم ایل اے بنگال میرج ڈاوری پری ونشن بل پر ورکنگ کمیٹی نے غور کیا۔ ورکنگ کمیٹی کی راے میں شادی کے موقعہ پر لین دین کی حد سے زیادتی کو روکنا نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ زیادتی نہ صرف مسلمانوں کی اقتصادی تباہی کا سبب ہے بلکہ اس سے مذہبی محرمات کا ارتکاب اور دین کی بربادی بھی ہوتی ہے۔ مگر قانون وضع کرنے میں اس امر کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ قانون صرف مفاسد کی اصلاح وانسداد تک محفوظ رہے۔ اس کی کوئی دفعہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو جائے۔ ورکنگ کمیٹی کی راے میں موجودہ بل اپنے عموم کے لحاظ سے حق مہر اور جہیز کے معتدل طریقے پر مخالفانہ اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس کی ترمیم واصلاح ضروری ہے۔ اسلامی احکام کے لحاظ سے ہر شرعی نکاح میں مہر ہونا لازم ہے۔ اسی طرح لڑکی کو اس کے ماں باپ کی طرف سے چند معمولی ضروری اشیاء بھی بطور جہیز دینا جائز ہے۔

لہٰذا قانون میں مہر کی زیادتی کو روکنا لازم ہے۔ مثلاً دفعہ اس طرح وضع کی جاے کہ ''مہر اس قدر مقرر کیا جاے کہ شوہر اس کی فی الفور ادائیگی یا عورت کے مطالبہ

کے وقت ادائیگی پر قادر ہو۔''

غرض مہر اور جہیز کی جائز حدود تک اجازت باقی رہنے کے بعد باقی تمام لین دین اور برات کے کھانے اور مسرفانہ رسوم کے انسداد کے لیے قانون بنایا جائے تو درست ہوگا۔

نیز کمیٹی کی رائے ہے کہ اس قانون میں جرمانہ کی سزا نہ رکھی جائے صرف سزائے قید رہے تاکہ مال دار لوگ جرمانہ ادا کرنے کی نیت سے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کریں نیز جرمانہ ان کی مزید اقتصادی تباہی کا سبب بھی نہ بنے۔'' (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم)

خلع بل:

۵/۶ رجنوری ۱۹۴۱ء

جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس ۵/۶ رجنوری ۱۹۴۱ء کو دہلی میں بصدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل تجویز منظور ہوئی۔

خلع بل کے استفتا کے متعلق موصول شدہ جوابات پر مجلس عاملہ نے غور کرکے طے کیا کہ جوابات کا خلاصہ اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شایع کرکے ممبران اسمبلی اور وائسرائے ہند کے پاس بھیجا جائے اور جن علمانے مزید تفصیلات کو قابل لحاظ قرار دیا ہے۔ ان سے مراسلت کرکے تفصیلات کو حاصل کیا جائے۔ نیز مزید جوابات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۰ رتا ۲۲ رمارچ ۱۹۴۲ء

جمعیت علمائے ہند کا تیرھواں سالانہ اجلاس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں بہ مقام لاہور منعقد ہو۔ اس اجلاس میں کئی قراردادوں کا تعلق حال اور مستقبل میں ملک کے اندر اسلامی زندگی کے قیام اور مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی،

سیاسی اور اقتصادی زندگی کی اصلاح اور نصب العین سے تھا۔ ایسی قرار دادیں یہ ہیں۔

جدید مسائل اور وقت کی ضرورت:

ا۔ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ فقہ اسلامی عبادات و معاملات، تمدن و معاشرت اور اقتصادیات کے تمام اصول پر حاوی ہے، دیکھ رہا ہے کہ عصری ایجادات اور غیر اسلامی اصول اقتصادیات کے رواج سے ایسی صورتیں پیش آرہی ہیں کہ ان کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علما مختلف الراے ہو جاتے ہیں اور ان کا باہمی اختلاف مسلمانوں کے لیے موجب تشویش و پریشانی ہوتا ہے۔

اس لیے یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ جمعیت علما ایسے جدید پیش آنے والے مسائل میں علما متبحرین کی معتمد جماعت سے تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے بعد ایسے فیصلے مرتب کرائے جن پر علما متبحرین کی زیادہ سے زیادہ جماعت متفق ہو، پھر ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لیے مسلمانوں میں شایع کر دیا جاے۔

اتحاد بین المسلمین کی ضرورت:

۲۔ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ وقت کی نزاکت اور باہمی افتراق و انشقاق کی ہلاکت خیزی اور اس کے عواقب و نتائج مشؤمہ کا پورا پورا احساس کرکے اور ان مختلف فیہ مسائل میں جو دور اول یعنی حضرت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و ائمہ مجتہدین کے زمانے سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں باہم دست و گریباں نہ ہوں۔ اپنی اپنی جگہ اپنے عقیدے کے موافق مذہب راجح پر عمل کرتے ہوئے دوسرے خیال کے مسلمانوں پر زبان طعن دراز نہ کریں اور سب و شتم سے محترز رہیں۔ اور انما المومنون اخوۃ کے ماتحت بھائی بھائی کی طرح

زندگی بسر کریں اور باہمی تعاون وتعاضد کر کے کالبنیان لیشد بعضه بعضا ایک مستحکم ومضبوط دیوار بن جائیں جس کو کسی مخالف کی دشمنی کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکے۔

اسی طرح یہ جلسہ موت وحیات کی کشمکش کے اس دور میں تمام مسلم جماعتوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہے کہ اسلام اور قوم کی فلاح ونجات کے خاطر آپس کے اختلافات کو دلائل وبراہین کی روشنی میں تحقیق حق کے اصول پر رفع کرنے کی سعی کریں۔ اور اختلاف رائے کے باوجود باہمی منافرت اور توہین وتذلیل کا مذموم طریقہ اختیار نہ کریں کہ یہ اسلامی وقار اور قومی زندگی کے لیے تباہ کن اور اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

اسلامی ممالک اور استعماری طاقتیں:

۳۔ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اسلامی ممالک خصوصاً عراق، ایران، شام و فلسطین وغیرہ کے موجودہ نازک ترین حالات کو نہایت خطرے کی نظر سے دیکھتا ہے کہ ان اسلامی ممالک کو استعمار پسند طاقتیں کس طرح اپنی اغراض فاسدہ میں استعمال کرنے کے لیے مقہور ومجبور کر رہی ہیں۔ ان کی تسلیم شدہ آزادی کو پامال کیا جا رہا ہے۔ یا ان کے فطری حق آزادی سے انھیں محروم کرنے یا رکھنے کے لیے کیسے کیسے حیلے تراشے جا رہے ہیں۔ جمعیت علما بار بار اس امر کا اعلان کر چکی ہے اور آج بھی اس اعلان کا اعادہ کرتی ہے کہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط اور قہر وغلبہ مسلمانان عالم کسی طرح برداشت نہیں کریں گے اور جب تک اسلامی ممالک پر سے استعمار پسند طاقتیں اپنا تسلط بالکلیہ نہ اٹھالیں گی اور ان کو آزادی کامل کی فضا میں سانس لینے کا موقع نہ دیں گی اس وقت تک مسلمان چین سے نہیں بیٹھیں گے اور مطمئن نہ ہوں گے۔ (محرک: مولانا احمد سعید صاحب، موید: مولانا عبدالماجد صاحب)

جمعیت علما کا نصب العین:

۴۔ جمعیت علما بارہا اس امر کا اعلان کر چکی ہے کہ اس کا نصب العین آزادی کامل ہے۔ اس پر تمام مسلمانان ہند متفق ہیں اور اسی کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ جمعیت نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا اور مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو ہر گز قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

جمعیت علمائے ہند، ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے جس میں غیر مصرحہ اختیارات بھی صوبوں کے ہاتھ میں ہوں اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں۔ اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

جمعیت علمائے ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک، نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

بہ سلسلہ قاضی بل:

۵۔ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس کاظمی ایکٹ نمبر ۸/ ۳۹ء کے متعلق اس حقیقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اس میں سے اس دفعہ کو حذف کر کے جس میں اس قسم کے مقدمات کے لیے مسلم جج کی عدالت میں پیش ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا نہ صرف اس ایکٹ کی مذہبی افادی حیثیت کو باطل کر دیا گیا بلکہ اس طرح اس کو مسلمانوں کے لیے سخت مضر اور خطرناک بنا دیا گیا ہے۔ جمعیت علما یہ واضح کر دینا

ضروری سمجھتی ہے کہ غیر مسلم جج کے فسخ کرانے سے شرعاً نکاح فسخ نہیں ہوتا اور عورت بدستور شوہر اول کے نکاح میں رہنے کے باوجود قانونی زد سے محفوظ ہو کر دوسرا نکاح کر لیتی ہے اور حرام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

جمعیت علما مسلم ارکان اسمبلی سے پرزور استدعا کرتی ہے کہ وہ اس ایکٹ نمبر ۸ میں یہ ضروری ترمیم کرانے کے لیے متفق ہو کر سعی کریں۔

(محرک: مولانا احمد سعید صاحب، موید: مولانا محمد یونس صاحب لائل پور)

بہ سلسلہ قانونِ انفساخ نکاح:

۶ رجولائی ۱۹۴۲ء

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس کی تجویز نمبر ۴ ان الفاظ میں منظور کی گئی ہے:

''قانون انفساخ نکاح مسلم کے سلسلہ میں مجلس عاملہ نے کاظمی صاحب کے ترمیمی بل کو دیکھا مجلس کی رائے میں یہ ترمیمات بجاے خود صحیح اور ضروری ہیں مجلس ان ترمیمات کی پرزور تائید کرتی ہے۔ مجلس یہ بھی مناسب سمجھتی ہے کہ دفعہ نمبر ۲ ضمن نمبر ۷ میں دادا کے کیے ہوے نکاح میں صغیرہ کو جو خیار بلوغ نہیں دیا گیا ہے تو اس کے مضرت رساں پہلو کی مضرت کو دفع کرنے کے لیے ایک دفعہ کا اضافہ کیا جاے جس کے الفاظ یہ ہوں گے:

دفعہ: اگر باپ دادا کا کیا ہوا نکاح ہو تو اس میں صغیرہ کو خیار بلوغ تو نہیں ہے لیکن اگر باپ دادا کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہو کہ وہ لالچ یا سفاہت کی وجہ سے یا فاسق متہتک یعنی بے غیرت و بے باک ہونے کی وجہ سے اپنی اولاد کے نکاح میں مصلحت و شفقت کو مدنظر نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں غیر کفو کے ساتھ یا غبن فاحش پر نکاح کیا ہوا باطل ہے۔''

اسی اجلاس میں ایک تجویز شریعت بل میں ترمیم کے مسودے کے بارے میں

منظور کی گئی:

"شریعت ایکٹ کے مسودۂ ترمیم پیش کردہ سید محمد احمد کاظمی پر مجلس نے غور کیا۔ مجلس کی رائے میں یہ ترمیمات صحیح ہیں اور جمعیت عاملہ اس کی پوری تائید کرتی ہے۔"

اسلامی قوانین میں خلافِ شرع تبدیلیاں:

۱۶، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۵ء

مذکورہ بالا تاریخوں میں جمعیت علمائے ہند کی دعوت پر دہلی میں ایک مسلم پارٹیز کانفرنس ہوئی تھی جس میں جمعیت کے علاوہ مسلم مجلس، مومن کانفرنس، خدائی خدمت گار، انڈین انڈیپنڈنٹ پارٹی، کرشک پرجا پارٹی کے نمائندوں اور آسام و یوپی کے بہت سے مسلمان نیشنلسٹوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کی رپورٹ کی تمہید میں کہا گیا ہے۔

گذشتہ اسمبلیوں میں شاردا ایکٹ، سول میرج ایکٹ معلم بل، حج بل جیسے خلاف شرع قوانین پاس کیے گئے۔ حال آں کہ یہ سب خلاف شرع ہیں اور ان کا پاس کرنا شریعت غرا میں مداخلتِ بیجا ہے۔

شریعت بل قانون انفساخ نکاح وغیرہ میں ایسی ترمیمیں کردی گئیں کہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ بل مسلمانوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے مضر ہو گئے۔ اور افسوس یہ کہ ان تمام بلوں کی منظوری یا منسوخی ان کے ہاتھوں ہوئی جو اسلام کے نام پر ووٹ لے کر اسمبلیوں میں پہنچے تھے اور لیگ کی قیادتِ عظمیٰ کی کلغی ان کے ہیٹ میں لگی ہوئی تھی یا رکنیت لیگ کے خود ساختہ تمغۂ ثائی کے کناروں میں آویزاں تھے۔

بہ ہر حال آیندہ شریعت غرا کو اس قسم کے خطرات سے بچانے کی صورت بھی یہی تھی کہ آیندہ انتخابات کا بارِ قیادت علمائے کرام اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔ کیوں کہ یہی حامل دین ہیں، یہی محافظ شریعت ہیں اور فیض حدیث انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں۔ یہ اور اس قسم کی مختلف ضرورتوں نے جمعیت علما کو مجبور کیا کہ وہ خود

بھی صورت حال پر غور کرے۔ اور ان جماعتوں سے بھی مشورہ کرے۔ جو اپنی قربانیوں یا سیاسی خدمات یا پنچایتی نظام وغیرہ کے باعث ملک میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور جن سے توقع ہے کہ جمعیت علما کی دعوت کو قبول کرلیں گی۔

اسی اجلاس کی ایک قرار داد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ آیندہ انتخابات میں کسی جماعت کے لیے غیر آئینی دشواریاں پیش نہ آئیں۔ کوئی سرکاری ملازم یا افسر کسی جماعت کی حمایت میں علانیہ یا در پردہ کسی قسم کا اثر اور رسوخ نہ استعمال کرسکے گمراہ کن اتہامات اور غنڈا گردی کا انسداد ہو۔

چوتھی تجویز میں ان علماے کرام کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا جو عرصہ دراز سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(بہ حوالہ ''جمعیت علماء کیا ہے؟'' حصہ دوم ص: ۸۴۔۲۸۲)

اسلام اور مذہب وتہذیب کا تحفظ:

انھی تاریخوں میں جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے ساتھ ۱۶/۱۷/ستمبر ۱۹۴۵ء کو جمعیت علماے ہند کی دعوت پر آل مسلم پارٹیز کانفرنس بھی ہوئی۔ جس میں جمعیت علماے ہند، مسلم مجلس، آل انڈیا مومن کانفرنس، خدائی خدمت گار سرحد، انڈیپنڈنٹ پارٹی بہار، کرشک پرجا پارٹی بنگال اور آسام ویوپی کے مسلم نیشنلسٹوں کے نمایندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ان تمام حضرات کے اسماے گرامی کانفرنس کی رپورٹ میں شایع کردیے گئے۔ یہاں ہم اس رپورٹ کی صرف تمہید نقل کرتے ہیں جس سے اس کانفرنس کی غرض و غایت کا اجمالی طور پر علم ہوسکتا ہے۔ رپورٹ کی تمہید میں مذکور ہے:

''آزاد ہندوستان میں دین وملت کی آزادی، مسلمانوں کے لیے مقام حیرت یہ ہے کہ جمعیت علماے ہند کا وہ محبوب نصب العین جس کے لیے اس کے محترم اراکین کی تمام قربانیاں وقف ہیں۔ جمعیت علماے ہند نے اجلاس لاہور کی تاریخی تجویز کے

نقرہ (الف) اور (ب) میں تصریح کردی ہے کہ:

"ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔ وطنی آزادی میں مسلمان
آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت
آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے قانون کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی
آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔"

آج جب کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی ہے۔ گردش ایام نے اتحادیوں کو دوبارہ فاتح کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اقوام عالم کا مطالبہ ہے کہ اتحادی ان وعدوں کو پورا کریں جو دوران جنگ میں کیے گئے تھے اور جن کو اس جنگ کا مقصود اور نصب العین گردانا گیا تھا۔

آج ہندوستان بھی منتظر ہے کہ وعدۂ آزادی ممنون وفا ہو۔ اور ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ہندوستان کے لیے دستور مرتب کرے۔ چناں چہ جدید انتخابات کا اعلان کیا جا چکا ہے اور جو جماعتیں خاص خاص نظریات رکھتی ہیں وہ انتخابات کے ذریعہ ان نظریات کے متعلق رائے عامہ معلوم کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہو چکی ہیں۔ جمعیت علما جو آزادی وطن اور حفاظت مذہب وملت کے لیے اہم ترین اصول اور نظریات کی حامل ہے۔ اس نے ان کے لیے قابل قدر قربانیاں پیش کی ہیں۔ اگر وہ چاہتی ہے کہ ان کی باضابطہ اور موثر ترجمانی ہو تو اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ براہ راست اپنے نمایندے اسمبلیوں میں بھیجے یا ان جماعتوں کے نمایندوں کو کام یاب کرائے جو جمعیت علما کے اصول ونظریات کو تسلیم کر کے ان کی ترجمانی اور تائید وحمایت کا وعدہ کریں۔......

ذمہ داران جمعیت علما کی طرح اس کا احساس دوسری جماعتوں اور ان ہمدردان ملت کو بھی تھا جو ان تمام حالات کا صحیح طور پر جائزہ لے رہے تھے اور لیگ کے بے پناہ پروپیگنڈوں نے ان کے دماغوں کو صحیح غور اور فکر سے معطل نہیں کیا تھا۔

چناں چہ متعدد اخبارات نے اس پر مقالے لکھے۔ متعدد جماعتوں اور رہنمایان

ملت کی جانب سے تار اور خطوط موصول ہوتے رہے اور اصرار کے ساتھ تقاضا کیا گیا کہ اس تمام صورت حال پر غور کرنے کے لیے جمعیت علماے ہند کا اجلاس بھی طلب کیا جاے اور تمام آزاد خیال جماعتوں کی مشترک کانفرنس بھی کی جائے۔

چناں چہ جمعیت علماے ہند کی جانب سے ۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہندوستان کے بہت سے مقتدر اور ممتاز رہنماؤں کی خدمت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے دعوت نامے ارسال کیے گئے اور ۱۸/۱۹ر ستمبر کو مجلس منتظمہ جمعیت علماے ہند کا اجلاس بھی دہلی میں طلب کیا گیا۔

الحمد للہ ان دعوتوں پر ملک کے ہر گوشے اور ہر طبقے سے بلند آہنگی کے ساتھ لبیک کہا گیا۔ آل پارٹیز کانفرنس اور مرکزیہ جمعیت علماے ہند کے سلسلہ میں چار روز تک دہلی میں قوم پرور جماعتوں اور افراد کا عجیب وغریب اجتماع رہا جو پورے ہندوستان کی نمایندگی کر رہا تھا۔ دو روز کی بحث وتمحیص اور جملہ حالات کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد کانفرنس نے چار تجویزیں پاس کیں:

پہلی تجویز میں سیاسی حالات پر روشنی ڈالتے ہوے طے کیا گیا کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ مرکزی اور صوبائی انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کرے۔

دوسری تجویز میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ایک عام رہائی (ایمنسٹی) کا اعلان کردے اور جو جو محبان وطن، جلاوطن یا روپوش ہیں ان سے بھی پابندیاں اٹھالی جائیں۔ (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم)

تحریکِ نظمِ جماعت

یا

دعوتِ قیامِ امارتِ شریعہ

مطالعے کے چند پہلو

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

تحریکِ نظمِ جماعت

(۱۹۱۴ء)

تحریکِ نظم جماعت مسلمانانِ ہند کی ملّی زندگی، کے قیام، اسلامی خصایص کے احیاد فروغ اور وقت کی حکومت کی امداد و اعانت سے بلند ہو کر صرف اپنی ہمت پر اعتبار اور اپنے ہی فراہم کردہ سروسامان و وسایل سے اجتماعی ملّی زندگی کے نظم و قیام اور اصلاحی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی ضروریات کی تکمیل اور محاکم اسلامیہ کی تشکیل و اجرا کی وہ تحریک تھی جو ملّت اسلامیہ ہند پاکستان کے فلاح و بہبود کی بنیاد تھی۔ جسے دوسری اقوام کے لیے بھی ایک مثال بننا اور سب کے لیے ایک سرچشمۂ فیضان ہونا تھا۔

ایک ایسے نظام کے قیام کا خیال سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن میں آیا تھا۔ وہی اس کے داعی تھے۔ اس نظام کی خصوصیات اور افادیت نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی علیہ الرحمہ کو اس درجے متاثر کیا تھا کہ حضرت نے اس کی صدارت اور راہ نمائی کی ذمے داری کو قبول فرما لیا تھا۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند کو حجاز کا سفر پیش آ گیا اور کچھ ہی عرصے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی رانچی میں نظر بند کر دیا گیا، لیکن تحریک کو انھوں نے جاری رکھا۔

۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام نے نظر بندی سے اور حضرت شیخ الہند نے اسارت مالٹا سے رہائی پائی تو یہ تحریک آگے بڑھی، ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماے ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس دہلی کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ چاہتے تھے یہ نظام قایم کر دیا جائے، لیکن حضرت کی بیماری کی وجہ سے اس فیصلے کو ملتوی کرنا پڑا اور چند ہی دن کے بعد حضرت کے سفر آخرت کا سانحہ پیش آ گیا۔ مولانا ابوالکلام نے اپنی ذمے داری پر تحریک کو جاری رکھا لیکن اب اس راہ میں کچھ ایسی رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں کہ مولانا نے جمعیت علماے ہند کے تیسرے اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) میں اس تحریک کو جمعیت کے حوالے کر دیا۔ جمعیت کے سامنے ہمیشہ یہ مسئلہ

رہا اور وہ اس کے قیام کی اہمیت اور ضرورت سے کبھی غافل نہیں ہوئی اور نہ اس کے لیے مساعی سے دست بردار ہوئی لیکن مواقع بے شمار اور مشکلات بے حد تھیں۔ ملک ایک انقلاب اور قیامت خیز حالات سے گزر رہا تھا اس لیے آزادی کے برسوں بعد تک بھی اس نظام کا قیام ممکن نہ ہو سکا۔

الحمد للہ! اکابر وارکانِ جمعیت کا اخلاص کلی اور مساعی مسلسل نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو دہلی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجلاس میں کل ہند سطح پر یہ نظام قایم کر دیا گیا۔ اس کے پہلے ''امیر الہند'' محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی منتخب کر لیے گئے اور مولانا سید اسعد مدنی اس کے نائب امیر الہند بنائے گئے۔ ۱۹۹۲ء میں حضرت محدث کبیر کے انتقال کے بعد ۹ر نومبر کو حضرت مولانا سید اسعد مدنی کو نظام شریعت کی کل ہند رہنمائی کے لیے ''امیر الہند'' منتخب کر لیا گیا۔ ہندوستان میں یہ نظام تقریباً بیس برس سے قایم ہے اور اس مدت میں کامیابی کی کئی منزلیں طے کر لی گئیں اور مسلمانوں کی خدمات کی بہترین مثال قایم ہوگئی ہے اور اس تحریک کے رہنما اور اس کے کارکنوں نے تاریخ خدماتِ ملت کا ایک قیمتی اور قابلِ ستایش باب رقم کر دیا ہے۔

یہاں ہمارے پیش نظر تحریک کی کامیابیوں کی تاریخ مرتب کرنا نہیں۔ جمعیت علماے ہند کی تاریخ میں تحریک تنظم جماعت یا تحریک نظام شریعت، جیسا کہ بعد میں یہ ادارہ ''امارت شرعیہ'' کے نام سے مشہور ہوا، کی تشکیل و تعمیر کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش و تالیف ہے۔ جو مورخ کی دست رس سے روز بہ روز دور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ مورخ کی دست رس سے بالکل ہی نکل جائیں اور مستقبل کا ریسرچ اسکالر ملت اسلامیہ کی تاریخ اور اس کی تعمیر میں جمعیت علماے ہند کے مساعی کی جستجو کے لیے نکلے تو اسے معلوم ہو کہ جمعیت علماے ہند نے بیسویں اور اکیسویں صدی میں ملت اسلامیہ ہند و پاکستان کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔

ابوسلمان

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

(۱)

مسئلۂ نظمِ جماعت

مولانا ابوالکلام آزادؒ

(جمعیت علمائے ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت سے ایک اقتباس)

حضرات! اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اُس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کروں، جس کو میں علی وجہ البصیرۃ آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں، اور کامل بارہ سال کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدۂ کار حل نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیاۃ انفرادی کو ترک کرکے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں؛ یعنی احکام و نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قاید شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے۔ یہی اصل و اساس کار ہے، اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات! اسلام کے نظام اجتماعی کی نسبت کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیق الٰہی سے اس وقت میرے گرد و پیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی فرادیٰ، متفرق، الگ الگ، اور منتشت نہ ہوں، ہمیشہ مجتمع، موتلف، متحد، اور کنفس واحدہ ہوکر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں

جا بجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر و شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جس قدر تفرقہ و تشتت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور و مرکز کے قرار پائی، اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قایم کی گیا۔ عقیدۂ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے۔ اور اسی بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا کہ

علیکم بالجماعۃ واسمع واطاعۃ۔ (رواہ ترمذی)

اور

علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذہ وھو من الاثنین ابعد۔ (رواہ بیہقی)

اور

اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا احدکم (رواہ اصحاب السنن)

اور اسی لیے نظم و قوام ملت کے لیے منصب خلافۃ کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب و سنت اس بارے میں بے شمار اور احد حصاء و استقصاء سے باہر ہیں، رسالۂ خلافت میں اس پر بحث کر چکا ہوں، اور زیادہ شرح و تفصیل تفسیر القرآن میں ملیں گی۔

میں یہاں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا کہ کیوں کہ گذشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازۂ اجتماع پراگندہ ہوا، اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے؟ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ باایں ہمہ تفرق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم تھی، اور جب تک وہ قایم رہی نظام جماعت بھی قایم رہا۔ لیکن اسلامی حکومت

کے انقراض کے بعد مسلمانانِ ہند کا نظم جماعت بالکل درہم برہم ہوگیا، اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آل عثمان کی موجود تھی، اور مسلمانان ہند کے لئے بھی تمام مسلمانان عالم کی طرح وہی خلیفۂ عہد و مطاع تھے، لیکن مسلمانان ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً وعملاً پائے گاہِ خلافت سے قایم کرتے اور اس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنا فرض اسلامی انجام دیتے، اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہی ہے کہ دشوار تھا تو پھر ضروری تھا کہ اپنے لیے ایک نائب امیر و امام منتخب کر لیتے اور اس کے ماتحت اعادۂ حال اور تہیۂ کار اور ادائے فرائض اسلامیہ میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا، اور جہاں غیر مسلم غلبہ و استیلاء پر محکومانہ قناعت کر لی گئی، وہاں اس اولین فریضۂ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہر حال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا، اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے، ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتۂ انسلاک ہے، نہ وحدۃ ملت کا کوئی رابطہ ہے، نہ کوئی قاید و امیر ہے، اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے، جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیاۃ غیر شرعی و جاہلی ہے، جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد و شرور میں سے ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہوگیا ہے۔ کیوں کہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے ہو نہیں سکتا اور قاضی کا وجود امارت و امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات! ایک منصب قضاء ہے اور ایک منصب امارت ہے، دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے، قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس میں مقاصد امارت کے فقدان کا

ذکر کر رہا ہوں۔ صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات! اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد و اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیاء و تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ کو لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں، جن کے لیے اولین شرط عقلاً و شرعاً وجود جماعتِ منظمہ اور امارتِ صحیحۂ شرعیہ ہے؟ چھوڑ دیجیے مصطلحات شرعیہ کو۔ اگر ان سے ہمیں اس قدر بُعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لیے تیار ہیں، مگر بحکم **اشمازت قلوب الذین لایومنون بالآخرۃ** طریق شرعی اور اس کے نظام و قوام کے الفاظ سن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں۔ صرف انھیں قواعد و اصول کو سامنے لایئے جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قاید اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قایم رکھ سکتی ہے؟ پھر رہی جمیعت تو شریعت نے بھی لفظ امیر و امام میں مضمر رکھی ہے، یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جائے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر و امام کا لفظ آ جائے تو نفرت و اسکراہ سے بھر جائیں؟ کیا یہ وہی غلطی نہیں ہے جس کو راہِ تاسیس اور راہِ تجدید کی اصلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑیے، آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض اسلامی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفۂ عہد، حفظ و حیانتِ بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلامی انجام دیں۔ خدارا بتلایئے اس صورت حال میں بھی طریق کار کیا ہونا چاہیے اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعوے تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل

نہیں؟ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجالس آرائی؟ کیا محض اتباع آرائے رجال اور تقلید ارباب ظن و تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے۔ اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے، چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تاتار و چین سے اٹھے تھے۔ اور تاتاریوں کے استیلاء سے تمام عالم اسلامی تہہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیۂ اسلامیہ کا یہی حال تھا، جو آج نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلاء ہو گیا تھا، وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولدۃ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا، اسی بنا پر فقہاءِ متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکومہ کفار میں طلب والی مسلم واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے انھی بلاد محکومہ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امام کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرع کی رو سے مسلمانان ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں۔ اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قایم کر کے ادائے فرضِ ملت میں کوشاں ہوں۔

حضرات! بعض اصحاب نے اس واضح و بین مسئلہ کی نسبت بھی شکوک و شبہات ظاہر کیے ہیں، لیکن وہ سب کے سب اہل نظر و بصیرت کے نزدیک **مالا یعبا بہ** میں داخل ہیں، اور اس لیے میں ان کے رد و نقد میں آپ کا وقت ضایع نہ کروں گا۔ بعض حضرات مسئلہ کی صحت و شرعیت تو تسلیم کرتے ہیں، مگر اس لیے آمادۂ عمل نہیں کہ اس کے نفاذ میں مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں گی۔ میں عرض کروں گا کہ بلاشبہ دنیا کے ہر عمل عظیم کی طرح اس عمل کی راہ میں بھی مشکلات پیش آ سکتی ہیں، لیکن یہ آپ

ے کس نے کہا ہے کہ آپ کی راہ عمل آسانیوں کا باغ اور راحتوں کا عیش کدہ ہے؟
آپ نے تو مشکلوں ہی کی طرف قدم اٹھایا ہے اور دشواریوں ہی کی طلب کی ہے۔
آپ قوموں کی قسمت پلٹنے کے لیے اٹھے ہیں اور تمام کرۂ ارض کی ظلم و ضلالت سے
آپ کو مقابلہ درپیش ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو صرف اس مسئلہ پر کیا
موقوف ہے؟ عمل و عزم ہی سے کنارہ کش ہو جایئے:

ناز پرورد تنعم نہ برد راہ بہ دوست
عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد!

آپ نے خلافت اسلامیہ و جزیرۃ العرب کی حفاظت و دفاع کا اعلان کیا ہے،
آپ ہندوستان کی آزادی کے لیے بے قرار ہیں، یہ کونسی آسانیوں کی راہ ہے؟ کونسی
پھولوں کی سیج یہاں آپ کے لیے تیار کی گئی ہے؟ آپ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی
قاہر و جابر طاقت کے دہن آز سے اس کا نگلا ہوا لقمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ یقیناً تنظیم
جماعت کی راہ اس سے زیادہ دشوار نہیں ہے۔

حضرات! یاد رکھیے کہ آج آپ نے جس راہ میں قدم اٹھایا ہے وہ سرتاسر
مشکلوں اور آزمائشوں ہی کی راہ ہے۔ وہ پھولوں کی روش نہیں ہے، کانٹوں کا دشت
بے کنار ہے۔ اگر آپ کے تلوے لذت زخم سے آشنا نہیں ہیں، تو مشکلات راہ کی
شکایت نہ کیجیے۔ بہتر یہ ہے کہ دیبا و مخمل کے فرش پر لوٹیے اور اس راہ کی زخم و کاوش
انھیں لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو اس ذوق کے لذت شناس ہیں:

کسے کو تشنۂ وصل است باکوثر نمی سازد
بہ آب خضر اگر عاشق رود تر نمی سازد
رہ الفت خطرناک است پنہانش نظر در کن
دراں راہی کہ عشق اوست تن باسر نمی سازد

اور حضرات! حق تو یہ ہے کہ جس راہ کو آپ مشکل کہہ رہے ہیں، ساری
آسانیاں اسی میں پنہاں ہیں، اور جس کو آپ نے سہل سمجھ رکھا ہے، مشکلوں ...

دشواریوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ مشکلیں انسان کے بنائے ہوئے طریقوں میں ہوسکتی ہیں، مگر اللہ کی کھولی ہوئی فطری راہوں میں نہیں ہوسکتیں، نہ وہاں دشواری ہے، نہ اعوجاج اور نہ کسی طرح کا ضیق وحرج۔ ملة المحجة الحنیفة لیلها کنهارها۔ البتہ ساری دشواری خود ہمارے نفس وغفلت ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، اور بلاشبہ جب تک اس سے ہمارا چھٹکارا نہ ہوگا، کوئی عمل حق بھی ہم پر آسان نہیں ہوسکتا۔

فیا دارها بالخیف ان مزارها

قریب، ولکن دون ذلک اهوال!

حضرات! بعض حضرات کا بیان ہے کہ اس سے ممکن ہے، کوئی نیا فساد اٹھ کھڑا ہو۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہ طریقہ احکام شریعت سے ماخوذ ہے، تو ہمارے سامنے یقین و برہان آگیا۔ اب کیا آپ یقین کو شک کی خاطر چھوڑ دیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کوئی فساد پیدا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ فوز وفلاح حاصل ہوگی۔ پھر کیا شک لے کر آپ یقین کے مقابلے کے لیے اٹھے ہیں؟ وان الظن لا یغنی من الحقِ شیئاً۔

حضرات! سچ یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر اس حقیقت کے ہیں کہ مدتوں کی غفلت اور ترک و بُعدِ کتاب وسنت کی وجہ سے ہمتیں مفقود ہوگئی ہیں، عزائم معدوم ہوگئے ہیں، اور عزائم امور کی راہ سے ہم سب یک قلم ناآشنا ہو گئے ہیں! ضرورت اس بات کی ہے کہ سنتِ الٰہی وقت کی مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی عادت جاریہ کے مطابق سرگرم انبعاث وظہور ہو، اور توفیق الٰہی قیام حق اور مقام عزیمت دعوت کے لیے کسی مرد غیب کے قلب کا انشراح فرمادے۔ یہ راہ اصحاب عزم کی ہے اور فاتحین عہد کی۔ ضعفاءِ طریق اور درماندگانِ راہ کا یہاں گزارہ نہیں ہوسکتا، آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے جو وقت اور وقت کے سروسامان کو نہ دیکھے بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار وخاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولانِ قدم کے نیچے خس وخاشاک بن کر پس جائیں۔

وہ وقت کا مخلوق نہ ہو کہ وقت کے حکموں کی چاکری کرے، وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبش لب پر حرکت کرے، اگر انسان اس کی طرف سے گردن موڑ لیں تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے، اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے نیچے اتار لے، اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو، اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو، اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے تمام اسرار و غوامض اور معالجہ اقوام اور طبابتِ عہد و ایام کے تمام سرائر و خفایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفہ کتاب و سنت اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کردے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

حضرات! ۱۹۱۴ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی، اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہو گا، ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کام یاب نہ ہو گی چناں چہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب و سعی کا نتیجہ تھی، انھوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورے سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کر دیا اور میری کوئی منت و سماجت بھی انھیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد میں نظر بند کر دیا گیا، لیکن ایام نظر بندی میں بھی اس کی فکر و تبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چناں چہ صوبہ بہار کے بعض احباب و مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی، اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اسی زمانے میں میرے عزیز و رفیق مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رانچی مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سے سعی و تدبیر میں مشغول ہو گئے تھے۔ جنوری ۲۰ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریک خلافت کی تنظیم شروع ہوئی تو اس وقت بھی

میں نے بار بار کوششیں کیں اور تمام کارکن طبقہ کو اس طرف توجہ دلائی مگر حالات موافق و مساعد نہ ہوے اور مجھے مجبوراً انھی اصلاحات پر قناعت کر لینی پڑی جو اس تحریک کے اندر رہ کر میں انجام دے سکتا تھا۔

گذشتہ موسم گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہوگئی کہ تمام ملک کے لیے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قایم ہو تو پھر یہ ارادہ کیا کہ اولاً صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چوں کہ صوبہ بہار میں تین سال سے ابتدائی بنیاد کام کر رہی تھی۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علماے بہار کو مبارک باد دوں کہ انھوں نے سبقت بالخیرات کا مقام اعلیٰ حاصل کیا اور جمعیۃ العلماء بہار کے جلسہ میں تین سو مجمع علما نے بالاتفاق اپنا امیر شرع منتخب کر لیا۔

اس کے بعد ارادہ تھا کہ فوراً دوسرے صوبوں میں بھی کام شروع کر دیا جاے، لیکن یکایک بعض حضرات نے اس مسئلہ کی نسبت اخبارات میں قیل و قال شروع کر دی، اور بلاضرورت علماے ملت کا ایک عملی کام انتظار عوام میں بصورت اختلاف و جدل نمایاں کر دیا گیا۔ یہ چیز مجھ کو اس کام سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں روک سکتی تھی مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظر عام پر آچکا ہے اور جمعیۃ العلماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کر دے سکتی ہے، تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس جمعیت کے حوالے کر کے بالفعل خود سبک دوش ہو جاؤں۔ چناں چہ ارکان جمعیت کی ایک خاص مجلس شوریٰ منعقدۂ دہلی میں یہ مسئلہ پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوا، اور اب اس کا آخری فیصلہ اس اجلاس کے ہاتھ میں ہے۔

حضرات! ارکان جمعیت و علماے کرام! آپ کی جمعیۃ کے لیے شریعت کا مقررہ نظام عمل یہ ہے اور صرف یہی ایک راہ فوز و فلاح کی ہے۔ (پیغام کلکتہ۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء)

(۲)

جمعیت علمائے ہند کے اجلاس پر ایک نظر

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

گذشتہ ہفتہ بمبئی کے فسادات اور گورنمنٹ کی بے ضابطیوں نے ملک کی توجہ اپنی طرف کر رکھی تھی، اور اس لیے جمعیت علماء کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور کی اہمیت پر لوگوں کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ حال آں کہ یہ اجلاس غایت درجہ اہم تھے اور عجب نہیں کہ ملک میں ایک ایسا دور پیدا کر دیں جس کی مثال اب تک اس نے نہیں دیکھی ہے۔

مسئلہ امارت یا امامتِ ہند:

جمعیت کے اجلاس میں سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مفید مسئلہ جو طے ہوگیا، وہ ''امارت یا امامت'' کا مسئلہ تھا، جس کی غرض یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے لیے ایک شرعی قاید، امیر یا امام ہو، جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرے، انھیں شرعی زندگی میں داخل کرے، اور ان کے اجتماعی و ملی مہمات میں رہبر ذمہ دار ہو۔ مسلمان اس کی اطاعت فی المعروف کا عہد کریں اور احکام شرع کی پیروی میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے اشاروں پر چلیں۔

یہ مسئلہ ایک عرصے سے علمائے امت کے پیش نظر تھا، اور وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر رہے تھے، یہاں تک کہ گذشتہ ہفتے ان کی متحدہ جمعیت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، اور ہندوستان میں ''امارت شرعیہ'' کے قیام کو ضروری ٹھہرایا، مسرت ہے کہ جملہ علما بالکل متفق الخیال تھے، اور ان میں سے کسی ایک نے بھی ادنیٰ اختلاف نہ کیا۔

انتخاب امام

امارت شرعیہ کے مسئلہ سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو سکتا تھا، خصوصا جماعت علما کسی طرح بھی اس میں متامل نہ ہو سکتی تھی، کیوں کہ اس بارے میں شریعت کے صاف وصریح احکام موجود ہیں اور ہرگز نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن جس بات میں شدید تصادم وتخالف اور سخت نزاع و منافست کا لوگوں کو یقین تھا وہ تعین شخصیت و انتخاب امام کا سوال تھا۔

علما کی باہمی منافست عرصہ دراز سے ضرب المثل ہو گئی ہے اور لوگ اسے مسلم قضیہ تسلیم کر کے کہا کرتے تھے کہ علما ہرگز مسئلہ انتخاب امیر میں متفق الخیال نہ ہو سکیں گے اور ضرور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے زعیمانہ دعوے باہم ٹکرائیں اور جمعیت کو پاش پاش کر ڈالیں۔ لیکن اس کارساز حقیقی کی ثناء وحمد کس زبان سے کی جائے جس نے علمائے امت کے بکھرے ہوئے دانوں کو جوڑ دیا اور سب میں ایثار و ہضم نفس کی روح پھونک دی جس سے وہ باہم متحد ومتفق ہو گئے اور امیر وحاکم بننے کے بجائے ہر ایک خدمت امت میں مامور ومحکوم بننے کے لیے پیش قدمی کرنے لگا۔

جمعیت علما کی سبجکٹ کمیٹی اور اجلاس عام دونوں میں ہم شریک تھے اور ہم انتہائی فخر ومباہات کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں ادنی منافست ومسابقت بھی کسی سے ظاہر نہ ہوئی، بلکہ سب پوری دلجمعی وخلوص کے ساتھ [شریک گفتگو رہے۔ البتہ انتخاب امیر کی آخری کارروائی (۱)] اس اجلاس میں باضابطہ نہیں ہوئی ہے، اور بدایوں کے اجتماع پر ملتوی کر دی گئی ہے، تاہم باہمی طور پر انتخاب ہو گیا ہے اور محترم علما نے انتہائی دانش مندی اور کامل ایثار نفسی کے ساتھ اپنے میں سے ایک ایسی شخصیت کو اس اہم خدمت کے لیے چن لیا ہے، جو ہر طرح اس کے لیے موزوں ہے۔

ہم جمعیۃ العلماء کو اس کی اس کارروائی پر پورے جوش سے مبارکباد دیتے اور امت مسلمہ کو بشارت پہنچاتے ہیں کہ ان شاء اللہ اب اس کا بیڑا ساحل مقصود پر پہنچا

ہوا ہے، کیوں کہ اس کے رہبروں نے جس "ناخدا" کو مقرر کیا ہے وہ ان شاء اللہ من کل الوجوہ اہل ہے، ہم ابھی اس سے زیادہ کوئی تصریح نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ موقر جمعیت خود ہی اس کا اعلان نہ کر دے۔ (پیغام، کلکتہ۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۲۱ء)

حاشیہ:

(۱) اس مقام پر رسالے میں ایک سطر کا مضمون مٹ گیا تھا۔ یہ عبارت سیاق و سباق مضمون اور ذاتی معلومات و تحقیق کی روشنی میں اضافہ کیا گیا ہے (ا۔س۔ش)۔

مسودہ

فرائض واختیارات

امیر الشریعۃ فی الہند

جناب محترم! دام مجدہم

حسب تجویز اجلاس جمعیت منتظمہ منعقدہ ۹۔۱۰ر فروری ۲۳ھ (۱) بمقام دہلی مطبوعہ مسودہ فرائض واختیارات امیر الشریعۃ فی الہند حاضر خدمت ہے۔
امید کہ جناب جلد از جلد غور وخوض کے بعد ترمیم واضافہ کی یادداشت تیار فرما کر دفتر جمعیت میں ارسال فرمائیں گے تاکہ کسی آئندہ قریبی اجلاس میں اس مسودہ پر بحث ومباحثہ ہو سکے۔

والسلام
عبد الحلیم الصدیقی
نائب ناظم جمعیت علماے ہند
۲۲ر رجب ۴۱ھ (۲)

روداد جلسہ سب کمیٹی منعقدہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

بمقام بدایون

اسماء حاضرین:

مولانا مولوی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند،

مولانا سبحان اللہ صاحب، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب،

مولانا محمد فاخر صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب (۳)،

مولانا محمد سجاد صاحب،

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی نائب ناظم جمعیت علمائے ہند۔

۸ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ روز جمعہ (۴) کو بعد نماز جمعہ سب کمیٹی کے ارکان موجودہ نے اجلاس کیا۔

اس اجلاس میں علاوہ ارکان سب کمیٹی کے حضرات ذیل بھی موجود تھے۔

حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی،

سید ظہور احمد صاحب سیکرٹری مسلم لیگ، مولانا غلام محمد صاحب شملوی،

مولانا احمد مختار صاحب صدیقی، مولانا نذیر احمد صاحب خجندی،

مولانا یعقوب بخش صاحب بدایونی، مولانا اعجاز احمد صاحب،

مولانا سراج احمد صاحب، مولانا عبدالوہاب صاحب،

مولانا عبدالودود صاحب، مولانا نورالحسن صاحب،

مولانا فرخندہ علی صاحب۔

(۱)

سب کمیٹی نے موافق تجویز منظور شدہ اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء بمقام لاہور امیر الہند کے فرائض و اختیارات کا حسب ذیل مسودہ تیار کیا:

امیر الہند کے فرائض:

دفعہ۱: فرائض اسلامیہ کی تعمیل کرانا، منہیات شرعیہ سے روکنا یعنی احکام شرعیہ کو بقدر استطاعت عملاً نافذ کرنا۔

تشریح:

فرائض اور منہیات اور احکام شرعیہ سے مراد وہ فرائض اور منہیات اور احکام ہیں جو متفق علیہا ہوں۔

دفعہ۲: اقامت بیوت مال

دفعہ۳: اقامت محکمہ جات قضا

دفعہ۴: اقامت نظارۃ اوقاف اسلامیہ

دفعہ۵: اقامت نظارۃ التعلیمات

دفعہ۶: اقامت نظارۃ التبلیغ والارشاد

دفعہ۷: اقامت نظارۃ منافع عمومیہ

دفعہ۸: اقامت محکمہ احتساب

نوٹ: امیر کو ان تمام فرائض میں سے کل یا بعض کو جاری کرنے یا مقدم، موخر کرنے کا حسب تفویض جمعیت علمائے ہند اختیار ہوگا۔

اختیارات امیر الہند:

دفعہ۹: امیر اپنے فرائض میں سے ان فرائض کو جن کی تنفیذ اصولاً جمعیت علمائے ہند اس کے سپرد کرے گی نافذ کرنے کا مجاز ہوگا۔

دفعہ۱۰: صوبجات کے امرائے شریعت اور محاکم شرعیہ کے نظار (اعلیٰ افسر) مقرر کرنے یا معزول کرنے کا اختیار امیر الہند کو ہوگا۔

دفعہ۱۱: امیر الہند بشرکت جماعت انتظامیہ جمعیت علمائے ہند سالانہ بجٹ تیار

کرے گا، اس کے موافق خرچ کرنے کا مجاز ہوگا۔

دفعہ ۱۲: امیر الہند اپنے تمام اختیارات کو اس مجلس شوریٰ کے مشورے کے مطابق استعمال کرے گا، جو جمعیت علماے ہند معین کرے گی۔

دستخط

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

محمد سبحان اللہ گورکھ پور، فقیر سید محمد فاخر بےخود محمدی الٰہ آبادی غفرلہٗ

بندہ محمد مرتضیٰ حسن عفی عنہٗ، امیر کی مدت امارت مقرر ہونی چاہیے۔

(۲)

فرائض و اختیارات کے بعد بغرض سہولتِ کار سب کمیٹی مناسب سمجھتی ہے کہ امارت شرعیہ کے دیگر متعلقات کی نسبت بھی اپنے خیالات کا اظہار کردے۔

امیر الہند کی حیثیت:

دفعہ ۱: امیر الہند کی منزلت شرعیہ ''امیر الناحیہ'' کی ہوگی اور مسلمانانِ ہند پر ان کی اطاعت لازم ہوگی۔

امیر الہند کے اوصاف لازمہ:

دفعہ ۲: علوم شرعیہ بالخصوص تفسیر و حدیث و فقہ میں متبحر عالم۔

دفعہ ۳: اعمال و اخلاص کے لحاظ سے امت کے لیے اسوۂ حسنہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دفعہ ۴: سیاسیات میں حسب ضرورت وقت واقفیت رکھتا ہو۔

دفعہ ۵: اس کی انتظامی قابلیت اور ایمانی جرأت کا تجربہ ہو چکا ہو۔

دفعہ ۶: ذاتی قابلیت اور اسلامی خدمات کی وجہ سے عوام و خواص کے اکثر

طبقات کی معتد بہ جماعت پر اس کا اثر ہو۔

نصب وعزل امیر الہند:

جمعیت علماے ہند کا اجلاس عام ہی امیر الہند کا تقرر وعزل کر سکتا ہے۔

امیر الہند کی مجلس شوریٰ:

جمعیت علماے ہند ایک مجلس منتخب کرے گی جس کے ارکان کی تعداد کم از کم سات ہوگی۔ اور جس میں پانچ عالم اور دو غیر عالم ماہرین سیاسیات ہوں گے، یہ مجلس امیر الہند کی مجلس شوریٰ کہلائے گی، اور امیر الہند اس کے مشورے کے مطابق کام کرنے کے پابند ہوں گے۔

(۳)

یہ صرف اصولی طور پر خاکہ مرتب کیا گیا ہے، فرعیات کے ابواب جداگانہ جمعیت علماے ہند کی ہدایت کے بموجب جمعیت التشریع مرتب کرے گی۔

حواشی:

(۱) مطابق ۲۲، ۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ بروز جمعہ و ہفتہ۔

(۲) مطابق ۹، ۱۰؍ مارچ ۱۹۲۳ء بروز جمعہ و ہفتہ۔

(۳) مولانا عبد الماجد قادری بدایونی۔

(۴) مطابق ۹؍ دسمبر ۱۹۲۱ء۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسودہ

نظام نامہ

امیر الشریعۃ فی الہند

از جناب مولوی محمد سجاد صاحب

تشریح امیر الہند:

(۱)

تمام مسلمانانِ ہند خصوصاً اہل سنت والجماعت کی سیادت و قیادت و تنفیذ و اجرائے احکام شرعیہ وانتظام وانصرام امور مذہبی کے لیے ایک شخص واحد والی بااختیار (امیر الشریعۃ للہند ہونا ضروری ہے، جس کا منصب امیر الہند ہوگا، اور اس کی تمام مسلمانوں پر بہ پابندیٔ اصولِ مقررہ پیروی لازم ہوگی، اور اس سے انحراف معصیت، لیکن اس کے ہر خیال اور ہر عمل کی اتباع ہر شخص کے لیے ضروری نہیں۔)

امیر کے لیے حسب ذیل صفات کا ہونا لازمی ہے اور یہی صفات اس کے شرائط ہوں گے۔

شرائط امیر الہند:

الف: مسلم مرد عاقل بالغ آزاد ہو۔

ب: عالم باعمل ہو، یعنی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معانی اور حقایق کا معتد بہ علم رکھتا ہو، اغراض ومصالح شریعت اسلامیہ وعلم الفقہ وغیرہ سے واقف ہو، اور احکام شرعیہ پر عمل کرنا اس کا شیوہ ہو۔

ج: سیاسیاتِ ہند و سیاسیاتِ عالم اسلامیہ سے واقفیت تامہ رکھتا ہو اور حتی

الامکان تجربے سے اکثر صائب الرائے ثابت ہو چکا ہو۔

د: ذاتی قابلیت و وجاہت کی وجہ سے عوام و خواص کے اکثر طبقات کے ایک معتد بہ جماعت پر اس کا اثر ہو۔

د: حق گو، حق شنو، قوی القلب، صاحب عزیمت ہو اور اس کی ذات سے مادی طاقتوں سے کسی حال میں مرعوب ہونے کا اور حکومت کافرہ سے ساز باز کرنے کا بظاہر اندیشہ نہ ہو، جس کا اندازہ اس کی گذشتہ و موجودہ زندگی سے کیا جائے گا۔

ق: سیٔ الخلق، غلیظ القلب، سریع الغیظ نہ ہو۔

فرایض امیر الہند:

(۴)

امیر الہند حقیقتاً شرعاً نائب خلیفۃ المسلمین ہوگا، اس لیے از روے احکام شرع جتنے فرایض خلیفۃ المسلمین کے ہیں وہ سب امیر الہند کے ہوں گے اور اس طرح اس کی تفصیل و تجدید کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر ہندوستان کے مسلمانوں کی حدیث النوعیت زندگی اور باہم مختلف الخیال فرق کا اجتماع، حکومت کافرہ کا تسلط، غیر مذہبوں کی بحالت بے چارگی ہمسائگی اس امر کی متقضی ہے کہ نظر بحالت موجودہ بغرض حصول مقصود شرعی و سد باب مفاسد و فتن فرایض امیر الہند اصولاً حسب ذیل امور تک محدود رہیں گے۔

الف: اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا، اور اس کے لیے اصلح وسائل اسباب مہیا کرنا۔

ب: عالم اسلامی کے داخلی و خارجی تغیرات احوال کے وقت مذہبی نقطۂ نظر سے بمشاورۂ اہل شوریٰ ایسے احکام جاری کرنا جس سے مسلمانان ہند اور اسلام کا فایدہ متصور ہو اور جس کا ماخذ کتاب و سنت و آثار صحابہ کرامؓ و فقہ ائمہ عظامؒ ہوگا۔

ج: مسلمانان ہند کو (باوجود مذہباً مختلف الخیال ہونے کے ان کی مذہبی آزادی

کو قایم رکھتے ہوئے) متحد رکھنا۔

د: حقوقِ مسلمین و احکام و شرع و وقار اسلام کو کلیتاً محفوظ رکھتے ہوئے بہ نظر تکمیل مقاصد شریعت ہندوستان کے دیگر اقوام کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ کرنا۔

ہ: بشرط امکان غیر مسلم مختلف المذاہب جماعتوں کے ذمہ دار قایم مقاموں سے موافق سنت اسلام تحریری موادعت نامہ مکمل کرنا۔

و: بنابر اخوات اسلامی و احکام شرع ممالک اسلامیہ کے ذمہ دار اصحاب کے ساتھ موثق و مستحکم طریقے پر ارتباط و تعلقات قایم کرنا۔

ز: مسلمانوں کی مذہبی و اخلاقی و تعلیمی و اقتصادی حالت کے درست ہونے کی کوشش کرنا۔

ح: مسلمانوں کو احکام منصوصہ متفق علیہا پر عمل کرنے کے لیے مجبور کرنا۔

ط: جن احکام شرع کا نفاذ حکومت کافرہ کی وجہ سے اس وقت تک مسدود ہے ان سب کو جاری کرنے کی کوشش کرنا۔

ی: مسلمانوں کے باہمی مذہبی مناظرات تحریری و تقریری جس سے محض اظہار حق ہو جاری رکھتے ہوئے اس کے ان عنوانوں و کارروائیوں کو روکنا جس سے نفاق و شقاق بین المسلمین پیدا ہو اور تفریق جماعت ہو۔

یا

نظام محکمۂ شرعیہ قایم کرنا، جس کے مفصلۂ ذیل شعبے ہوں گے اور حسب ضرورت دیگر شعبے قایم کیے جائیں گے۔

۱۔ بیت المال المرکزی للہند جس کے ماتحت صوبہ وار بیت المال ہوگا۔

۲۔ انفصال خصومات کے لیے محکمہ دارالقضا قایم کرنا۔

۳۔ نظارت التعلیمات

۴۔ دائرۃ التبلیغ والاشاعت

۵۔دائرۃ الاحتساب　　　۶۔نظارت الاوقاف

۷۔نظارت المساجد والائمہ　　　۸۔دایرۂ منافع عامہ

ب: آزادی ہندو جمہوریت ہند کے قایم ہونے کے بعد ملکی انتظام میں صدر رد جمہوریت سے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ مل کر کام کرنا، اور اسلامی محکمۂ شرعیہ کے نظام کو مستقلاً محض مسلمانوں کے اختیار میں رہنے کو جمہوریت سے تسلیم کرانا۔

اصول کار:

(۳)

محکمۂ امارت میں تین قسم کی مجلس ہوگی۔

الف: مجلس دارالخواص جس کے اندر کم از کم چار ارکان ہوں گے، تین جید عالم، متورع مدبر اور ایک انگریزی داں قابل دین دار

ب: مجلس دارالعوام جو جمعیت علما کے ارکان منتظمہ والراے صوبہ ہاے ہندو وزراے شعبہ ہاے دوایر نظارتوں سے مرکب ہوگی۔

ج: مجلس قوانین جس کے پانچ ارکان ہوں گے۔

(۴)

ہر صوبہ میں ماتحت امیر الہند ایک ایک حاکم شریعت ہوگا، بطریق امیر الہند امیر الناحیہ، جس کا لقب امیر صوبہ ہوگا، اور اس کے تمام کام بھی انھی اصولوں پر مبنی ہوں گے جو امیر الہند اور اس کے نظام کے متعلق طے پا چکے ہیں یا آیندہ طے پائیں۔

(۵)

نظام محکمۂ شریعت کے ہر شعبہ میں ایک ایک افسر ہوگا جس کا لقب وزیر (ناظر) ہوگا، اور ہر وزیر کی وزارت اسی شعبہ کی طرف منسوب ہوگی۔

(۶)

ارکان مجلس دارالخواص و مجلس قوانین کو جمعیت علما اپنے اجلاس میں منتخب کرے گی اور ان دونوں مجلسوں کو اختیار ہوگا کہ حسبِ اجازت امیر الہند کسی اہل الرائے و اعلم کو اپنی مجلس میں اضافہ کرلیں۔

(۷)

جب تک امرائے صوبہ و وزرا کا تعین نہ ہو صرف ارکان منتظمہ جمعیت علما مجلس دارالعوام رہے گی، اور جن جن صوبہ میں امرا کا تعین اور وزرا کا تقرر ہوتا جائے گا، دارالعوام کے ارکان میں وہ شامل ہوتے جائیں گے۔

(۸)

تقرر قضات میں سنی المذہب کے علاوہ جس علاقے میں اہل جدیث وغیرہ کی ایک معتد بہ جماعت ہوگی، وہاں حسب ضرورت اہل حدیث وغیرہ بھی قاضی مقرر کیے جائیں گے۔

طریق کار:

(۹)

مجلس قوانین شعبہ ہائے محکمۂ شرعیہ کے لیے مفصل قواعد و ضوابط مرتب کرے گی۔

(۱۰)

مجلس قوانین کے مرتب کردہ قوانین مجلس دارالعوام میں پیش ہوں گے اور دارالعوام کی رائے ظاہر ہونے کے بعد دارالخواص میں پیش ہوں گے اور وہاں جو فیصلہ ہوگا وہی منظور شدہ سمجھا جائے گا، اور اسی پر عمل درآمد ہوگا۔

(۱۱)

تمام شعبہ وتمام قومی و مذہبی کاموں کے مصارف کا متحمل صرف بیت المال ہوگا حتی کہ جمعیت علما کے مصارف بھی اسی سے ہوں گے۔

(۱۲)

جس مقام میں دارالامارت شرعیہ للہند ہوگا، امیر الہند وارکان مجلس دارالخواص کا قیام بھی وہیں رہے گا، اور جہاں جہاں حسب ضرورت امیر کی نقل وحرکت ہو ارکان دارالخواص اس کے ساتھ ہوں گے۔

اختیارات:

(۱۳)

امیر الہند تمام کام حسب قواعد واصول مجلس دارالخواص سے مشورہ کر کے انجام دیں گے اور احکام صادر فرمائیں گے، لیکن مہمات امور میں دارالعوام سے بھی مشاورۃ کے بعد احکام صادر فرمائیں گے۔

(۱۴)

مجلس دارالخواص و دارالعوام کے اندر مسائل شرعیہ کا فیصلہ کثرت رائے سے نہ ہوگا، بلکہ دلائل کے بعد قوت یا ترجیح دلیل کی بنا پر جو فیصلہ ہوگا، وہی قول فیصل ہوگا، اور حق فیصلہ صدر مجلس کو ہوگا۔

(۱۵)

انتظامی قواعد و مصالح کے متعلق بنابر کثرت آرا صدر مجلس کو حق فیصلہ ہوگا۔

(۱۶)

امیر الہند کو اختیار ہوگا کہ مجلس دار الخواص کے علاوہ جمعیت علما صوبہ دار سے مشورہ کر کے اس صوبہ کا والی کسی کو مقرر کر دے یا مقرر شدہ کو معزول کر دے، لیکن اگر جمعیت العلماء صوبہ باتفاق کسی کے عزل سے اختلاف کرے یا کسی کو والی مقرر کرنے کے خلاف ہو تو اس صورت میں امیر الہند جمعیت علما صوبہ کے مشورے پر عمل کریں گے۔

(۱۷)

شعبہائے محاکم شرعیہ کے تمام ملازمین کا تقرر و برخواست مجلس دار الخواص سے مشورہ کر کے کلیتہً امیر الہند اور اُن کے نائبین (امرائے صوبہ) کے اختیار میں ہوگا۔

(۱۸)

اگر کسی مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق کلیتہً حکم صادر کرنے کی ضرورت ہو تو مجلس دار العوام میں کامل گفتگو اور بحث کے بعد امیر الہند باصول نمبر ۱۴ فیصلہ کر کے حکم دیں گے۔

(۱۹)

امیر الہند اگر منصب امارت سے علاحدہ ہونا چاہے تو اعلان عزل سے پہلے دار العوام سے مشاورت ضروری ہوگی، اگر دار العوام باتفاق یا بکثرتِ آرا عدم عزل کی رائے قایم کرے یا بصورتِ تعلقاتِ خلافت خلیفہ بھی عزل پر رضامند نہ ہوں تو امیر کو اپنا ارادہ فسخ کرنا ہوگا۔

(۲۰)

اگر امیر الہند از خود اپنے عزل کا فیصلہ کرے اور دار العوام اس میں متفق ہو جائے

(اور خلافت سے تعلقات نہ قایم ہوں) اور عزل سے پہلے اپنا قایم مقام کسی جامع الشروط کو امیر الہند نامزد کرنا چاہیں تو یہ اختیار ہوگا، مگر جمعیت علما و دار العوام سے مشورہ لینا ضروری ہوگا۔

حق انتخاب ونصب وعزل:

(۲۱)

امیر الہند کے انتخاب ونصب وعزل کا حق کلیتہً جمعیت علماے ہند کو حاصل ہوگا اور اس وقت تک رہے گا، جب تک خلیفۃ المسلمین کلیتہً غیروں کے اثر سے آزاد اور با اقتدار خود مختار نہ ہو۔

(۲۲)

جس وقت خلیفۃ المسلمین غیروں کے اثر سے آزاد اور با اختیار و اقتدار ہو جائیں گے اور جمعیت علماے ہند براہ راست ان سے تعلقات قایم کر لے گی اس وقت خلیفۃ المسلمین جمعیت علماے ہند کے مشورہ سے جس شخص کو نامزد کر دیں گے اور اس کے نام سند امارت عنایت فرمائیں گے وہی شخص امیر الہند ہوگا، اور اس صورت میں امیر الہند کا عزل بھی خلیفۃ المسلمین کے اختیار میں ہوگا، جس کو حضرت خلیفۃ المسلمین بمشاورۂ جمعیت العلماء للہند عمل میں لائیں گے۔

وجوہِ عزل:

(۲۳)

امیر الہند بوجوہ ذیل معزول یا مستحق عزل ہوگا۔

الف: اگر امیر الہند سے خدانخواستہ کفر بواح کا ظہور ہو (نعوذ باللہ منہ) تو فی الفور معزول ہوگا۔

ب: امیر الہند کے ذاتی اعمال میں اس حد تک تغیر ہو جائے کہ محارم متفقہ علیہ کا ارتکاب کرنے لگے تو مستحق عزل ہوگا، تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہ آئے تو اس صورت میں معزول کیا جائے گا۔

ج: اگر امیر الہند کے رویہ و طریق عمل سے فساد دین یا افتراق جماعت مسلمین کا نہایت سخت اندیشہ ہو تو ان صورتوں میں اصلاح نہ ہونے پر مستحق عزل ہوگا۔

د: اگر امیر الہند اپنے فرایض کے انجام دہی سے قاصر و عاجز ثابت ہو بسبب عدم اہلیت یا بسبب غفلت اور اس سے بہتر شخص ملک کے اندر متصف بجمیع صفات مذکورہ دفعہ نمبر ا الف تا واؤ موجود ہو، تو اس صورت میں بھی مستحق عزل ہوگا، بشرطے کہ اس کے عزل میں اثارت فتنہ و اختلال جماعت مسلمین کا غالب اندیشہ نہ ہو۔

ہ: جو اختیارات شریعت اسلامیہ سے امیر کو حاصل ہیں اگر اس سے تجاوز کرے یا جو طریق کار جماعت علمانے اصولاً اس کے لیے متعین کر دیے ہیں اس کی خلاف ورزی خود رائی سے کرے اور بعد تنبیہ بھی اس سے باز نہ آئے تو اس صورت میں بھی مستحق عزل ہوگا۔

و: اگر امیر الہند خدانخواستہ حکومت کافرہ متسلطہ سے مرعوب ہو کر یا کسی طمع میں آکر اپنے فرایض کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی کرے یا خلاف مصالح شریعت و امت کوئی کام کرے تو اس صورت میں بھی مستحق عزل ہوگا۔

طریق عزل:

(۲۴)

امیر الہند منتخب یا نامزد ہونے کے بعد خدانخواستہ عزل کے وجوہات میں سے کوئی وجہ پائی جائے تو حسب ذیل طریق پر اس کا عزل عمل میں آئے گا۔

الف: جس وقت تک امیر الہند کا عزل و نصب کلیتہً مستقلاً جمعیت علما کے اختیار میں ہے اس وقت تک جمعیت علما اس کے عزل کا یہ طریق اختیار کرے گی۔

کہ وجوہِ عزل کے متحقق و مبرہن ہونے کے بعد جمعیت علماے ہند ایک خاص اجلاس کسی مقام پر منعقد کرے گی، اور کامل غور وخوض کے بعد اگر اس کے عزل کا فیصلہ علما کے خاص اجلاس میں ہو تو اجلاس عام میں اس کا اعلان کر دے گی، اور اسی اجلاس میں کسی دوسرے شخص کو حسبِ شرائط امیر الہند منتخب کر کے اس کا اعلان کر دے گی۔

ب: جس وقت عزل و نصب کا اختیار خلیفۃ المسلمین کو بمشاورت جمعیت علما حاصل ہوگا، تو اس وقت بصورت تحقیقِ وجوہ عزل بمشاورت جمعیت العلماء خلیفۃ المسلمین معزول فرمائیں گے۔

(۲۵)

جس وقت خلیفۃ المسلمین کو عزل و نصب کا اختیار ہوگا، تو اس صورت میں بغیر وجوہات عزل متذکرۂ صدر بھی کسی مصلحت یا کسی ضرورت سے خلیفۃ المسلمین معزول کر سکتے ہیں، مگر اس وقت بھی حضرت خلیفۃ المسلمین کو جمعیت العلماء للہند سے مشورہ کر لینا مناسب ہوگا۔

انتخاب یا تقررِ امیر:

(۲۶)

جس وقت تک جمعیت العلماء کو حق انتخاب امیر کلیتہً حاصل ہے، اس وقت تک جمعیت علماے ہند انتخاب امیر کے لیے ایک خاص (اسپیشل) اجلاس منعقد کرے گی اور اس اجلاس کے مجلس شوریٰ میں غور وخوض کے بعد جس شخص کو انتخاب کرے گی اس کا نام اجلاس عام میں ظاہر کیا جائے گا اور تمام اراکین جمعیت علما اور ارکان جو اس وقت موجود ہوں و دیگر حاضرین کو اسی وقت بیعت سمع وطاعت کرنی ہوگی۔

(۲۸)

اجلاسِ انتخابِ امیر کا اعلان تاریخ اجلاس سے کم از کم پندرہ روز قبل ہوگا۔

(۲۹)

جب جمعیت کا اجلاس عزل امیر پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوگا تو اس کا اعلان بھی پندرہ روز قبل ہوگا، اور اس وقت اس امر کا بھی اعلان کرنا ضروری ہوگا کہ بشرط فیصلہ عزل امیر کا جدید انتخاب بھی ہوگا۔

(۳۰)

امیر الہند از خود معزول ہونے کے پہلے یا مرض الموت میں کسی جامع الشروط کو حسب دفعہ ۲۰ امیر الہند نامزد کردیں، تو وہی شخص امیر الہند ہوگا۔

(۳۱)

جس وقت امیر الہند کا عزل ونصب خلیفۃ المسلمین کے اختیار میں ہوگا تو اس وقت جمعیت علما کے مقرر کردہ امیر الہند کے لیے جمعیت کی سفارش کی درخواست پر خلیفۃ المسلمین سند امارت مرحمت فرمائیں گے اور جدید تقرری کے وقت (حسب ضرورت) جمعیت علما اپنے اجلاس میں حسب قاعدہ کسی ایک شخص کو متعین کرکے خلیفۃ المسلمین سے تقررِ امیر الہند کی سفارش کرے گی اور سند آنے پر جمعیت اس کا اعلان کرے گی۔

جمعیت علما کا منصب:

(۳۲)

جمعیت علما امارت کی ایک زبردست طاقت ہوگی اس کا طریق عمل بعد انعقاد امارت حسب ذیل ہوگا:

الف: فرامین واحکام امیر پر عمل درآمد کرانے میں اپنی تمام اجتماعی قوت صرف کرے گی۔

ب: ضروریات دینی وملکی پر غور کر کے امیر الہند کے سامنے تجاویز پیش کرتی رہے گی۔

ج: ابواب عبادات و معاملات میں جدید تالیفات کا سلسلہ بزبان عربی اس طرح پر شروع کرے گی کہ ہر باب کے مسائل نمبروار ہوں۔

مسودہ

نظارتِ امیر الشریعۃ

۳ رتا ٦ / مارچ ۱۹۳۹ء:

نظم جماعت کی تحریک مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے زمانۂ نظر بندی رانچی میں شروع کی تھی۔ رہائی کے بعد مولانا نے یہ تحریک جمعیت علماے ہند کی رہنمائی میں دے دی۔ جمعیت نے نہ صرف ۱۹۴۷ء تک نظم جماعت کے قیام کے لیے اپنے مساعی جاری رکھے بلکہ اس کے بعد بھی اس اہم اسکیم کی طرف سے وہ غافل نہیں رہی اور بعض گوشوں میں اس نے کامیابی بھی حاصل کی۔ نظارت امور شرعیہ کا قیام اسی سلسلے کی چیز تھی، جس کے نظام کا مسودہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے جمعیت کے گیارھویں اجلاس منعقدہ دہلی میں پیش کیا تھا۔ یہ مسودہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ (ا۔س۔ش)

مسودہ نظارت امور شرعیہ:

اس اجلاس میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب قدس سرہ العزیز کا مکتوب گرامی بھی پیش کیا گیا جو ''نظارت امور شرعیہ'' کے متعلق ''اسکیم'' پر مشتمل تھا اور اردو اور انگریزی زبان میں طبع کرا کر ممبران اسمبلی اور دیگر مشاہیر و عمائدین کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اجلاس ہذا نے اس مکتوب کے پیش نظر تجویز نمبرے منظور کی۔ جو نقل مکتوب کے بعد درج کی جائے گی۔

مکتوب:

مکرمی السلام علیکم

ایک ضروری امر کے لیے یہ عریضہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس پر آپ خاص

توجہ فرمائیں گے۔

آپ کے علم میں ہے کہ ہندوستان میں علما اور مسلمانوں کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ یہاں کے نظام حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت، معاشرت اور قوانین مذہبی کے تحفظ کے لیے ایک مخصوص ادارہ قایم کیا جائے۔ لیکن ان بارسوخ حضرات کی وجہ سے جن کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی یہ مطالبہ وہ قوت حاصل نہ کرسکا جس کا یہ مستحق تھا اور انگریزوں کی اس کھلی روش کے بعد جو انھوں نے سو برس کے عرصے میں ہندوستان سے اسلامی تمدن کے مٹانے میں اختیار کی ہے، یہ توقع رکھنا کہ وہ آسانی سے اس مطالبے کو قبول کرلیں گے عبث تھا۔ لیکن اس مقصد کے حصول کی کوشش ہم لوگوں نے حتی الوسع جاری رکھی۔ اب جب کہ موجودہ اصلاحات کے نفاذ نے ہندوستان میں ناقص لیکن قومی حکومت کی بنیاد رکھ دی ہے اور بعض اموراب ایک حد تک نمایندگان جمہور کے ہاتھ میں آگئے ہیں ان مقاصد کے حصول کی ایک راہ نکل آئی ہے۔

مسلمانوں کا کم ازکم مطالبہ یہ تھا کہ ایک بااختیار حاکم امور شرعیہ کی انجام دہی کے لیے مقرر کیا جائے جو قاضی کا تقرر کرے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی قوانین اور امور مذہبی (جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو) کا نگراں رہے اور خصوصیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کا محافظ ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے بہتر راہ تو یہ تھی کہ اعلان بنیادی حقوق (FUNDAMENTEL RIGHTS) کے سلسلے میں ہندوستان کے نظام اساسی میں یہ چیز موجود ہوتی۔ لیکن افسوس یہ نہ ہوسکا۔ اب موجودہ حالات میں یہ مناسب ہے کہ نظام شرعی کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جائے جو موجودہ اصلاحات کے ذریعہ بآسانی چل سکے۔ اس سے اصلی مقصد تو پورا نہ ہوگا لیکن یہ ہوگا کہ ایک ناقص نقش ضرور تیار ہوجائے گا اور کسی حد تک مسلمانوں کی بعض شکایات ومشکلات کا ازالہ ہوجائے گا۔

اسکیم یہ ہے:

۱۔ ہر حکومت میں ''ناظر امورِ اسلامیہ'' کا ایک عہدہ رکھا جائے (جو مختلف محکموں کے ڈائریکٹر کے مثل ایک عہدہ ہو اور یہ عہدہ دار کسی مسلمان وزیر کے ماتحت ہو اور اس کے متعلق حسبِ ذیل امور ہوں:

الف: مسلم اوقاف

ب: تقرر قضاۃ یا تفویض اختیارات قاضی یا جیوری کے تعین میں مشورہ دینا۔

ج: ہندوستانی بین الاقوامی معاملات کے متعلق اسلامی بین الاقوامی اصول کے ماتحت حکومت کو مشورہ دینا (اس کی رائے کا ان معاملات میں اکسپرٹ (ماہر) کی رائے کی حیثیت سے لحاظ رکھا جائے۔)

د: تعلیم کے ہر صیغے اور درجے میں مذہبی تعلیم کا نظم یا نگرانی (جیسی صورت حال اور ضرورت ہو) اس کے ماتحت ہو۔

ہ: مسلمانوں کے ''پرسنل لا'' کے متعلق قانون سازی کی نگرانی اور اس کے متعلق اگر کوئی غلطی ہو رہی ہو یا کسی ذریعے سے ہو گئی تو حکومت کو اصلاح کے لیے مشورہ دینا۔

۲۔ ناظر امورِ اسلامیہ کے ساتھ ایک مختصر مجلس مشورہ لایق مسلمانوں کی ہو۔

۳۔ تمام تقرر اور انتخابات مؤقت ہوں۔

۴۔ الف: متذکرہ محکمہ کے ساتھ ساتھ حکومت ایک قانون فسخ نکاح اور طلاق و تفریق و خلع وغیرہ کے لیے اسلامی اصول کے ماتحت پاس کرائے جس سے وہ مشکلات دور ہو جائیں جو موجودہ عہد میں شرعاً قاضی مجتہد کے فقدان سے لاحق ہیں اور ہوں گی۔

ب: تقرر قاضی کے لیے فی الحال یہ صورت اختیار کی جائے کہ مسلمان منصف اور جج کے تقرر کے معیار میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ فقہ اسلامی کی براہ راست معلومات ان کو ہوں یا اقل درجہ اس خاص صنف میں ہندوستانی (اردو) میں ضروری

تالیفات مہیا کردی جائیں۔ (اور اس کا ڈیپارٹمنٹل امتحان بھی لے لیا جائے) اور تفویض اختیارات کے وقت ہائی کورٹ یا جوڈیشنل محکمہ جس کے بھی حدود ہوں ان ہی حکام کو نکاح، طلاق، اور تفریق وغیرہ مقدمات کی سماعت کے اختیار دے۔

ج: ان مقدمات کی سماعت کا ضابطہ اسلامی آداب قضا کے مطابق اردو میں تیار کردیا جائے۔ اس طرح تقرر قضاۃ کا مسئلہ بغیر کسی مزید مالی بار کے کسی حد تک حل ہوجائے گا۔

ناظر امورِ اسلامیہ مسلم اوقاف کے ساتھ دوسرے امور کو انجام دے گا، تو کوئی مزید مالی بار بھی حکومت پر ایسا نہ پڑے گا جو غیر معمولی ہو۔

ایک اور ضروری امر مسلمانوں کی فوری توجہ کا محتاج ہے:

یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر تہذیب وتمدن اور معاشرت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اب تک انگریزوں نے مسلمانوں کے تمدن کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے نظریے پیدا کیے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ "حکومت مذہبی تعلیم کے نظم کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی" اب جب کہ نئی اصلاحات نے صوبوں میں قومی حکومت کی ایک شکل پیدا کردی ہے۔ یہ حکومتیں جیسی کچھ بھی ہوں بہ ہرحال قومی حکومتیں ہیں تو ان کو مسلمانوں کے اس جائز اور واجبی مطالبہ سے کہ تعلیم کے درجے میں مذہبی تعلیم کا نظم کیا جائے، بے اعتنائی نہ برتنی چاہیے۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ وقت کے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے حکومت اور قوم کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مسلمانوں کے لیے ہر اجتماعی وانفرادی اخلاق کی کمزوری ان کی مذہبی معلومات اور تربیت کی کمی ہی کی وجہ سے ہے اور ایک اصلاح سے ان بہت سی کمزوریوں کی اصلاح بیک وقت ہوجائے گی جو حکومت، قوم، ملک سب کے لیے یکساں مفید ہوگی۔

ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ
پھلواری شریف۔ پٹنہ

ایک طویل بحث و مباحثہ کے بعد حسب ذیل تجویز پاس ہوئی۔

تجویز نمبر ۵۔ تہذیبی خود مختاری (کلچرا ٹانمی):

چوں کہ مسلمانان ہند کا پرسنل لا مخصوص و ممتاز پرسنل لا ہے اور ملت اسلامیہ ایک مستقل ملت ہے۔ اس ملت کی اسلامی زندگی اور تہذیب کے بقاء کے لیے از بس ضروری ہے کہ ایک بااختیار نظام قایم ہو۔ حکومت برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں پرسنل لا اور کسی ایسے نظام کے لیے کوئی چیز نہیں رکھی چوں کہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی مسلمانوں کو ایک ملت تسلیم کیا اور ان کے پرسنل لا کے تحفظ و آزادی کا وعدہ کیا ہے اور صوبہ جات میں صوبجاتی حکومت بھی قایم ہوگئی ہیں۔ اس لیے جمعیت علما ہند کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ بحالات موجودہ ایک مسودۂ قانون کلچرل اٹانمی کے وصول پر مرتب کیا جاے اور اس کو صوبجاتی مجالس قانون ساز میں پیش کرنے کے پاس کرنے کی سعی کی جانے۔ جس کے ذریعہ مسلمانوں کی ملی اور معاشرتی ضروریات پوری ہوسکیں۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کا مرتب کردہ مسودۂ بھی پیش نظر رکھا جاے۔ ایسا مسودہ مرتب کرنے کے لیے ذیل کی سب کمیٹی معین کی جاتی ہے۔ یہ سب کمیٹی آیندہ مئی ۱۹۳۹ء تک اپنی رپورٹ مجلس عاملہ جمعیۃ جمعیت علماے ہند کے سامنے پیش کردے۔ اس کمیٹی کو اضافہ ارکان کا حق ہوگا۔ اور اس کے داعی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب ہوں گے۔

۱۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب

۲۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

۳۔ مولوی امین احسن صاحب اصلاحی

محرک: مولانا مفتی محمد نعیم صاحب، مؤید: مولانا بشیر احمد صاحب، تائید مزید مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔

ملّی زندگی کا قیام ودفاع

جمعیت علماے ہند کی دفاعی کوششوں پر ایک نظر

مشتے نمونہ از خروارے

مرتب

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حرفِ چند

ملّی زندگی کے قیام و دفاع میں جمعیت علماے کے اکابر و ارکان اور جمعیت کے بعض مخلصین نے ذاتی اور جماعتی طور پر تقریر و خطابت، تصنیف و تالیف اور صحافت کے ذریعے قانون ساز اور انتظامی اداروں میں اور سیاسی جماعتوں سے بحث و نظر، اہل علم و تدبر سے ملاقاتوں اور مراسلت کے ذریعے انقلاب خیالات کی جو کوششیں کیں ان کی تفصیل جمعیت کی پوری تاریخ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی طرف خاکسار نے اس جلد پر اپنے ''پیش لفظ'' میں بعض اشارات کیے ہیں۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے چند خاص مسایل میں ان کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سیاسی محاذ پر ''میثاق لکھنؤ'' (۱۹۱۶ء)، دستوری محاذ پر ''نہرو رپورٹ'' (۱۹۲۸ء) اور اسلامی زندگی کی خصوصیات کے تحفظ کے محاذ پر ''ساردا بل'' (۱۹۲۹ء) تین اہم مسایل ہیں۔

ساردا بل کے سلسلے میں جمعیت کے صدر حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی کا ایک خط ہے جو انھوں نے اس مسئلے پر وایسراے کو لکھا تھا۔ میثاق لکھنؤ پر حضرت مفتی صاحب کا ایک تنقیدی مضمون ہے جو انھوں نے جمعیت علما کے قیام سے پہلے لکھا تھا اور نہرو رپورٹ کے بارے میں جمعیت علما کی سب کمیٹی کی رپورٹ ہے جس کے کنوینر حضرت مفتی صاحب ہی تھے۔ مجموعے کی تینوں اہم تحریریں حضرت مفتی صاحب کے افکارِ حقہ کی مثال اور اعلا تدبر و بصیرت کی شاہ کار ہیں۔

میثاق لکھنؤ کے ضمن میں پہلی تحریر تاریخ مسلم لیگ سے ماخوذ ہے جو نقد و نظر کی بنیاد ہے اور مولوی سید طفیل احمد منگلوری جمعیت کے ایک مخلص اور ہم خیال بزرگ کی تحریر حضرت مفتی صاحب کے خیالات کی مؤید ہے۔

ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مسایل میں جمعیت علماے ہند کا مؤقف کتنا مدلل اور مستحکم تھا۔

(۱)

میثاق لکھنؤ

(۱۹۱۶ء)

لکھنؤ پیکٹ:

۳۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا نواں سالانہ اجلاس زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقدہ لکھنؤ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار اجلاس تھا۔ کانگریس کا اجلاس بھی لکھنؤ ہی میں اسی ہفتے منعقد ہوا تھا جس کے صدر مسٹر امبیکا چرن موجمدار تھے۔

اس اجلاس میں سب سے زیادہ یادگار چیز یہ تھی کہ لیگ نے اس سمجھوتے کو منظور کیا جو کانگریس اور لیگ کی مشترکہ کمیٹی نے ہندوستان کے آئینی دستور کے متعلق تیار کیا تھا یہ معاہدہ "لکھنؤ پیکٹ" یا "میثاق لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور مسلم لیگ ریفارم کمیٹی کے مشترکہ فیصلے کی کارروائی ۱۷ اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۶ء بمقام کلکتہ ہوئی۔ اس جلسے کی صدارت سر سرندر ناتھ بنرجی نے فرمائی تھی۔ کانگرس کمیٹی کے نمائندوں کی تعداد ۵۲ تھی اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی تعداد ۲۰ تھی۔ حسب ذیل فیصلہ منظور ہوا تھا۔

صوبائی کونسلیں:

بڑے صوبوں میں ۱۲۵ ممبروں کی ہوں اور چھوٹے صوبوں میں ۵۰ سے ۷۵ کی ہوں۔

۴/۵ حصہ ممبروں کا انتخاب کے ذریعے ہو۔ حق رائے دہندگی میں توسیع ہو۔ ہر اقلیت کا انتخاب کے لیے معقول انتظام ہو۔

مسلمانوں کے لیے نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعے ہو۔ جس کی صوبہ وار

تفصیل یہ تھی:

پنجاب	انتخاب	شدہ	ہندوستانی	ممبروں	کا	نصف
بنگال	"	"	"	"	"	چالیس فی صدی
یوپی	"	"	"	"	"	تیس فی صدی
بہار	"	"	"	"	"	پچیس فی صدی
سی پی	"	"	"	"	"	پندرہ فی صدی
مدراس	"	"	"	"	"	پندرہ فی صدی
بمبئی	"	"	"	"	"	ایک تہائی

اور یہ بھی شرط تھی کہ اس کے علاوہ مسلمان کسی دوسرے انتخاب کونسل میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ یہ بھی منظور ہوا کہ کوئی مسودۂ قانون یا مسودے کا کوئی حصہ اس وقت تک کونسل میں پیش نہ ہوسکے گا۔ جب تک متعلقہ فرقے کے ۳/۴ ممبران اس سے متفق نہ ہوں گے۔

مرکزی کونسل:

اس میں ایک تہائی تعداد مسلمان ممبروں کی ہوگی اور صوبہ وار تعداد ممبروں کی اسی تناسب سے ہوگی جیسے صوبائی کونسل میں تعداد منظور ہوئی ہے۔

(تاریخ مسلم لیگ از مرزا اختر حسن، مکتبۂ لیگ، بمبئی: ص ۱۲۸-۱۲۶)

(۲)

مسلم لیگ کا میثاقِ ملی لکھنؤ

(۱۹۱۶ء)

سید طفیل احمد منگلوری

مسلم لیگ نے جو قدم اپنے جدید دور میں ۱۹۱۵ء کے اجلاس میں اٹھایا تھا وہ اپنی انتہائی منزل پر اجلاس لکھنؤ میں پہنچا جو مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں دسمبر ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا۔ اس سال کانگریس کا اجلاس بھی لکھنؤ میں ہوا اور مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کے لیڈر بکثرت شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے صدر استقبالیہ سید نبی اللہ ہوے جو ۱۹۱۰ء کے اجلاس ناگ پور کے صدر تھے اور انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں پہلی بار مسلمانوں کو عام ملکی مفاد کے کاموں کی طرف متوجہ کیا۔ اس اجلاس لکھنؤ میں آپ نے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا:

> ''ہندوستان بھی مثل کینیڈا وغیرہ کے ہے وہ وفاداری کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا مسلمان وفادار رہے جنگ کی وجہ سے سیاسی چل چل ملک میں ملتوی کردی گئی۔ مسلم لیگ اپنی پیدائش سے چھ سال کے اندر اپنے گھونگے سے نکل کر ملک کی ترقی کے منصوبے میں شامل ہوگئی۔''

اوپر لکھا گیا ہے کہ گذشتہ سال ۱۹۱۵ء کے اجلاس بمبئی میں ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ کانگریس کے ساتھ سمجھوتا کرے، وہ سمجھوتا ہوگیا اور اس کی رپورٹ اس اجلاس میں پیش ہوکر منظور ہوگئی اور پھر اس کی بابت مسٹر اے رسول بیرسٹر نے باقاعدہ ریزولیوشن پیش کیا جو منظور ہوا۔ بعد میں یہ اسکیم ''میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ مسٹر رسول وہی ہیں جو ابتدا سے کانگریس میں شریک تھے اس

اجلاس میں سر جیمس مسٹن لیفٹننٹ گورنر بھی تشریف لائے اور آپ نے ایک عمدہ تقریر فرمائی، یہی وہ سال ہے جس میں مسٹر تلک جیل سے رہا ہو کر آئے اور انتہا پسند جماعت میں جو ۱۹۰۷ء کی سورت کانگریس کے اجلاس میں کانگریس سے علاحدہ ہو کر بنی تھی شریک ہو گئے، اسی سال مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کر کے ہر دو فریق کو ملانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مسز بیسنٹ اسی سلسلے میں جیل بھیج دی گئی تھیں۔
اس سال کے ریزولیوشن جو مسلم لیگ میں پاس ہوئے ان میں خاص یہ ہیں:

۱۔ اسکیم اصلاحات جس سے کانگریس متفق ہے، پاس کی جائے۔

۲۔ قانون اسلحہ

۳۔ قانونِ مطابع

۴۔ قوانینِ حفاظت ہند نامناسب ہیں۔ ان کی ترمیم و تنسیخ کی جائے۔

۵۔ مولانا ظفر علی خاں و محمد علی و شوکت علی کی نظر بندی پر اظہار ناراضی کیا جائے۔

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر جو نظر بند ہیں مقدمہ چلایا جائے۔

۷۔ انتظامی اور فوج داری کی عدالتیں جدا جدا کر دی جائیں۔

۸۔ لیفٹننٹ گورنروں کی جگہ گورنر مقرر ہوں۔

۹۔ اضافہ لگان اور بندوبست نامناسب ہیں۔

مندرجہ بالا تجاویز سے اندازہ ہوتا ہے مسلم لیگ فرقہ پرستی کے غار سے نکل کر ملکی سیاست کی کس قدر بلند سطح پر پہنچ گئی تھی اور مولانا شبلی کے معیار کے مطابق اب وہ ایک سیاسی جماعت بن گئی تھی اور اس میں صحیح سیاسی جذبہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس اجلاس میں جو ہندو مسلم سمجھوتا کیا گیا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے؛

میثاقِ ملی:

۱۔ مرکزی اسمبلی میں ۵/۴ منتخب شدہ ممبر ہوں، جن میں سے ۳/۱ مسلمان ہوں۔

۲۔ اگر کسی تجویز کی کسی جماعت کے ممبروں سے ۳/۴ تعداد مخالفت کرے تو وہ تجویز کونسل میں پیش نہ ہو سکے گی۔

۳۔ صوبجاتی کونسلوں میں ۴/۵ منتخب شدہ ممبر ہوں اور ۱/۵ نامزد شدہ ممبر ہوں۔

۴۔ مسلم اقلیت کے لیے جداگانہ انتخاب باقی رہے اور مسلمانوں کی نیابت مختلف صوبوں میں حسب ذیل ہو:

نام صوبہ	مسلمانوں کی فی صد آبادی	کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی فیصد تعداد	آبادی کی نسبت سے مسلمانوں کی کمی یا بیشی
پنجاب	۵۵	۵۰	-۵
بنگال	۵۳	۴۰	-۱۳
بمبئی	۲۰	۳۳	+۱۳
صوبۂ متحدہ	۱۴	۳۰	+۱۶
بہار	۱۰	۲۹	+۱۹
مدراس	۷	۱۵	+۸
صوبہ متوسط	۴	۱۵،	+۱۱

اگر مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں مردم شماری کے مطابق نشستیں مل جاتیں تو ان دونوں صوبوں کی کونسلوں میں ان کی اکثریت ہو جاتی اور اس وقت سے پچیس سال قبل ہی پاکستان کی بنیاد قایم ہو جاتی اور چوں کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوستان کے باقی ماندہ تمام صوبوں کے مسلمانوں سے زیادہ تھی (۱) اس لیے مسلمانوں کی زیادہ آبادی کو کونسلوں میں اکثریت حاصل ہو جاتی۔ مگر سوء اتفاق سے اس وقت مسلمانوں کو یہ اصول پسند آیا کہ ہندوستان کی کونسل میں ان کے ممبروں کی تعداد اتنی ہو کہ اگر وہ برادرانِ وطن کے ساتھ مل جائیں تو حکومت کو شکست دے سکیں اور اگر حکومت کے ساتھ مل جائیں تو برادرانِ وطن کو شکست دے دیں۔ اسی

اصول کو مدنظر رکھ کر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں نے بڑے ایثار سے کام لیا اور باقی ماندہ صوبوں کی خاطر اپنی اکثریت کی جگہ اقلیت میں ہونا قبول کر لیا۔ اس فیصلے کے مطابق آیندہ چل کر جب حکومت نے نئی کونسلیں جاری کیں تو تمام صوبوں میں مسلمانوں کی یہ حالت مثل پاسنگ کے ہوگئی کہ جس طرف وہ جھک جائیں اسی کو کام یاب بنا دیں۔ اس سے مسلم ممبروں کی اہمیت ضرور بڑھ گئی مگر نقصان یہ ہوا کہ ملکی سیاست کے مسئلے میں ان کی کوئی معین پالیسی نہ رہی اور ان کی حالت ڈانواں ڈول ہوگئی۔ البتہ ذاتی اعتبار سے مسلم ممبروں کو یہ فایدہ ہوا کہ ان کے لیے وزارتوں کا دروازہ کھل گیا۔ چوں کہ تمام انتخابی جماعتوں میں منتخب ہونے کے بعد ان کا غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط انتخاب ہے اس لیے غیر مسلموں کے ساتھ ہر امر میں اشتراک عمل ہونے سے انھیں ہر قسم کے فواید حاصل ہوئے۔ برخلاف اس کے جداگانہ انتخاب قایم رہنے کی وجہ سے عام مسلم ووٹروں کی بدستور غیر مسلموں سے علاحدگی رہی اور چوں کہ کوئی غیر مسلم ان سے ووٹ مانگنے پر مجبور نہیں ہوتا اس لیے نہ صرف یہ کہ ان کی بے کسی اور کس مپرسی بڑھتی گئی بلکہ بغض و عناد کی وجہ سے ملک میں بلووں کی تعداد روز افزوں ہوگئی جس کے شکار صرف عوام ہی ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال لکھنؤ کا میثاق ملی مسلم عوام کے لیے کیسا ہی تباہ کن کیوں نہ ثابت ہوا ہو مگر فی الجملہ ہندوستان کے لیے اس اعتبار سے مفید ثابت ہوا کہ کل ملک کے ایک متفقہ فیصلے کی وجہ سے اگلے سال مزید اصلاحات ملنے کا اعلان ملک معظم کی طرف سے ہوگیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جداگانہ انتخاب قایم رہنے کی وجہ سے امن عامہ کے لیے یہ آئین مہلک ثابت ہوا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری، دہلی ۱۹۴۵ء: ص ۳۸۶-۹۱)

(۳)

میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء
پر تنقید و تبصرہ کی ایک نظر

۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا تھا اس وقت مسلمانوں کی ایک ہی سیاسی جماعت تھی مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی نہ تھی۔ حکومت خود اختیاری کا بہت زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ اس لیے اس وقت اس پیکٹ کے متعلق نہ کچھ زیادہ چرچا تھا اور نہ کسی قسم کے جھگڑے تھے۔ لیکن شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس وقت باوجودے کہ علما نے میدان سیاست میں قدم بھی نہ رکھا تھا نہ جمعیت علما کا وجود تھا۔ نہ ان کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم تھا مگر جوں ہی کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتا شائع ہوا فوراً علمائے کرام کی تمام جماعت میں سے صرف ایک ہی شخص اٹھا تھا اور اس نے مسلم لیگ کے سمجھوتے میں وہی خامیاں بیان کی تھیں جن کی بنا پر آج تمام ہندوستان کے مسلمان اس سمجھوتے کو ناپسند اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ وہ دوربین اور غائر النظر اور ہمدردِ اسلام و مسلمین ہستی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند کی ہے۔ حضرت محترم نے اس وقت ایک اعلان بعنوان ''مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت'' شائع کیا اور مسلمانوں کو حکومت خود اختیاری کے حصول میں کوشش کرنے کی تاکید کے ساتھ ہی مسلم لیگ کانگریس کے سمجھوتے کی خامیاں بیان کی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت موصوف کا وہ اعلان تمام وکمال یہاں پر نقل کر دیں تاکہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ جمعیت علمائے ہند کے محترم صدر کے کس وقت سے تحصیل آزادی کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال پیش نظر ہے، (مولانا) احمد سید دہلوی

وہ اعلان یہ ہے:

مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت

صاحب وزیر ہند کی ہندوستان میں تشریف آوری کی تقریب میں تمام اقوام ہند میں سیاسی تحریک موجزن ہے۔ تمام چھوٹی بڑی قومیں اپنی آیندہ بہبودی کے متعلق غور وفکر کر رہی ہیں۔ اس وقت ہر شخص کا فرض ہے کہ جس چیز کو قوم کے لیے مفید سمجھے، بغیر کسی پس وپیش کے ظاہر کردے، اس لیے خاکسار اپنے خیالات کو مسلم پبلک کے سامنے پیش کر کے اپنے فرض سے سبک دوش ہوتا ہے۔

۱۔ کوئی قوم حقیقی ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے افراد میں اپنے اوپر خود حکومت کرنے کی استعداد نہ پیدا ہو جائے اور حقیقی آزادی اور حقیقی ترقی بغیر حکومت خود اختیاری کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ آزادی کی خواہش انسان کی طبیعی اور جبلی خواہش ہے اس لیے کوئی فرد بشر بجا طور پر حکومت خود اختیاری کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

۳۔ دنیا کی متمدن اور مہذب قومیں ہمیشہ انسانی آزادی اور ترقی میں مساعی رہتی ہیں۔ برطانی گورنمنٹ کی رعایا کے مختلف طبقے بھی ہمیشہ اس کے آرزومند رہے کہ گورنمنٹ ان کو حکومت خود اختیاری عطا فرمائے اور برطانی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے کئی طبقوں کی یہ آرزو پوری بھی کر دی۔

۴۔ اس وقت کہ گورنمنٹ نے فراخ دلی سے ہوم رول دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے یا اس کی امید کی جاتی ہے اور صاحب وزیر ہند بہادر اسی کے متعلق ہندوستانیوں کے خیالات معلوم کرنے تشریف لا رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کی قومیں ہوم رول کی خواہش کریں اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ خواہش اور کوشش یقیناً حق بجانب ہوگی۔

۵۔ ہندوستان کی آبادی مختلف العقاید اور متباین الخیالات اقوام سے مرکب ہے

اور ایک قوم کے مذہبی اغراض دوسری قوم کے مذہبی اغراض سے متصادم ہیں، اور اسی بنا پر یہاں ہمیشہ جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہوم رول کی خواہش کرنے سے پہلے مذہبی تصادم اور تمام اقوام کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت کا پورے طور پر خیال کر لیا جائے۔

یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں تمام اقوام اس حد تک متساوی الاقصرام ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے ان وجوہ ستہ کی معقولیت میں کسی کو بھی کلام نہ ہوگا۔ اس کے بعد خاکسار خاص اسلامی طبقے کے متعلق عرض کرتا ہے۔

مسلم پبلک کا اولین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور ''پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی، ایرانی یا چینی وغیرہ'' کے اصول کو لازم سمجھیں، کیوں کہ مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا شیرازہ صرف مذہب اور اسلام سے ہی بندھا ہوا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی اصولی تقسیم کے لحاظ سے دو گروہ ہیں۔

۱۔ ہوم رول کے طالب

۲۔ ہوم رول کے مخالف

دوسرے گروہ میں پھر دو قسم کے لوگ ہیں اول وہ لوگ جن کو ہوم رول کے معنی اور مفہوم کی خبر نہیں (اور انھیں کی تعداد زیادہ ہے)۔ دوسرے وہ جو کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اپنے ذاتی اغراض کی خاطر قومی اغراض اور انسانی فطری خواہش کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں فریق کی متفقہ آواز یہ ہے کہ ہمیں ہوم رول کی ضرورت نہیں، ہم گورنمنٹ انگریزی کی حکومت سے خوش ہیں۔ مسلمان ابھی ہوم رول کے لایق نہیں ہوے۔

لیکن چوں کہ ان کی مخالفت ناواقفیت یا ذاتی غرض پر مبنی ہے اس لیے وہ کسی درجہ میں لائق اعتبار نہیں اور نہ مسلمانوں کو ان کی آواز پر کان لگانا چاہیے اور نہ ان کی آواز قومی آواز سمجھی جا سکتی ہے۔

ہوم رول کے طالب گروہ میں تمام سمجھ دار، ذی علم، متمدن، مہذب افراد شامل ہیں، مگر اس میں بھی دو فریق ہو گئے۔ فریق اول مسلم لیگ کے ارکان اور اس کے حامی فریق دوم جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک معتد بہ حصہ اور تقریباً تمام مذہبی طبقہ اور عامۂ مسلمین کا ایک جم غفیر۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں ہوم رول کے مطالبہ میں شریک اور اصل مقصد میں متفق ہیں۔ پھر وجہ اختلاف کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فریق اول یعنی مسلم لیگ نے ہوم رول کے مطالبہ کا یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے؛

۱۔ کانگریس کے ساتھ اتفاق کر لیا اور لیگ اور کانگریس نے متفقہ اسکیم تیار کی۔

۲۔ اس اسکیم میں مسلمانوں کو جو حق نیابت دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے کسی صوبے کی کونسل میں دس فیصدی کسی میں پندرہ فیصدی کسی میں بیس فیصدی کسی میں تیس فیصدی مسلمان ممبر ہوں گے، صرف صوبہ پنجاب میں پچاس فیصدی مسلمان ہوں گے یعنی ہندوستان کے کسی صوبے میں ان کو اکثریت حاصل نہ ہوگی۔

۳۔ کم تعداد والی قوموں (جن میں سوائے پنجاب کے تمام ہندوستان کے مسلمان داخل ہیں) کے قومی اغراض کی حفاظت اس طرح کی گئی کہ ایک قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ کوئی ایسا ریزولیوشن جو کسی غیر سرکاری ممبر نے پیش کیا ہو اور کسی قوم کے اغراض پر اس کا اثر پہنچتا ہو۔ اگر اسی قوم کے نمایندوں کی ۳/۴ تعداد اس ریزولیوشن کی مخالفت کر دے تو وہ ریزولیوشن پاس نہ ہو سکے گا۔

اس قرارداد پر لیگ اور کانگریس کے ممبروں نے سمجھوتا کر لیا ہے اور ارکان لیگ کا خیال ہے کہ یہ سمجھوتا مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ہے اور اس میں مسلم پبلک کی قومی اغراض کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا نیز بعض حامیان لیگ سے یہ بھی سنا گیا کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دے گی۔ اس کی بنیاد پڑ چکی ہے تو اگر ہم اس سمجھوتا کے موافق ہوم رول لینے پر آمادہ نہ ہو جاتے تو اندیشہ تھا کہ گورنمنٹ ہوم رول دے دیتی اور پھر برادران وطن ہمیں اتنا حصہ بھی نہ دیتے جتنا کہ اس سمجھوتا میں انھوں نے منظور کر لیا۔

ہے۔

فریق دوم کے خیالات:

فریق دوم کہتا ہے کہ مطالبہ ہوم رول ضروری اور ہمارا ابھی مقصد اہم یہی ہے اور ہم کو ارکان مسلم لیگ کی نیت پر بھی حملہ کرنا مقصود نہیں انھوں نے جو کچھ کیا مسلمانوں کی خیر خواہی کی نیت سے ہی کیا لیکن ان کے فیصلے کے متعلق ہمیں حسب ذیل شکایتیں ہیں:

۱۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کرتے وقت عام مسلم راے حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں کی قومی اور مذہبی انجمنوں سے کوئی استصواب نہیں کیا گیا اور اگرچہ ہمیں ان کی نیت پر بدگمانی نہیں تاہم سات آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں وہ معصوم بھی نہیں ہیں اور اپنی اس استبدادی کارروائی کے جوابدہ ہیں۔

۲۔ اس سمجھوتے میں مسلمانوں کے قومی اغراض کو صدمہ پہنچنے کا نہ صرف گمان بلکہ ظن غالب ہے کیوں کہ مسلمانوں کو اس صورت میں کثرت راے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

۳۔ یہ قاعدہ کہ غیر سرکاری ممبر کے پیش کیے ہوئے ریزولیوشن کی اگر کسی قوم کے ۴/۳ ممبر مخالفت کریں تو وہ پاس نہ کیا جائے، پرسنل لا کی حفاظت کے لیے چنداں مفید نہیں! کیوں کہ سرکاری غیر مسلم ممبروں کے ان ریزولیوشنوں کی جو مسلمانوں کے اغراض قومی کے مخالف ہوں اس قاعدے سے کوئی روک نہیں ہوئی۔ وہ برابر کثرت راے سے پاس ہوتے رہیں گے اور غیر سرکاری ممبر اپنے ریزولیوشن کا مقصد سرکاری ممبروں کو سمجھا کر ان کے ذریعے سے پیش کرا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قاعدے کا اثر زیادہ سے زیادہ ان تجاویز پر پڑ سکتا ہے جو غیر مسلم غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے پیش کی جائیں۔ لیکن مسلمان ممبروں کے واسطے اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز پاس کرانے کا کوئی راستہ نہیں۔ بخلاف غیر مسلم ممبروں کے کہ وہ اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز جس قدر چاہیں کثرت راے سے پاس کرا سکتے ہیں۔

۴۔ پنجاب میں ۵۰ فیصدی مسلم نیابت اس اصول کے موافق بھی صحیح نہیں کیوں کہ پنجاب میں مسلم آبادی کا اوسط اس سے زیادہ ہے۔

۵۔ ہندو تعداد مردم شماری میں تمام ان قوموں کو محسوب کرلیا گیا ہے جو ہندو دھرم کے معتقد نہیں بلکہ اس کے مخالف ہیں اور یہ اصولاً خلاف انصاف ہے۔

۶۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے جو سمجھوتا کیا ہے اس کی پختگی کی طرف سے بھی قوم کا کوئی اطمینان نہیں کیا گیا۔

۷۔ مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کا خیال نہیں رکھا گیا۔

۸۔ یہ خیال کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دیتی اور ہم یہ سمجھوتا نہ کرتے تو اس سے زیادہ نقصان میں رہنے کا اندیشہ تھا، صحیح نہیں۔ کیوں کہ ہندوستان کو ہوم رول دینے کے نہ یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں کو ہوم رول دے دیا جائے۔ اور نہ گورنمنٹ کے ہوم رول دینے کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ مسلم قومیت اور مسلم حقوق کو پامال کر کے ایک قوم کو حکمراں بنا دیتی۔ اگر مسلمان استقلال اور خودداری اور وقار سے اپنے حقوق کا مطالبہ آئینی طریقے سے کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ اسے نظرانداز کردیتی۔

اس کے بعد عرض ہے کہ اگرچہ اب وقت نہیں رہا کہ وزیر ہند کی خدمت میں کوئی ایڈریس یا وفد پیش کرنے کی درخواست کی جائے لیکن جن ایڈریسوں اور وفدوں کی اجازت لی جاچکی ہے ان کے اصحاب وارکان کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنے مجمل ایڈریسوں کی تفصیل میں اس تجویز کے مضمون کو بھی شامل کرلیں جو ذیل میں درج ہے اور اب سے بہت پہلے شایع کی جاچکی ہے۔

مسلمانوں کی شدید ترین مذہبی ضرورت

اسلامی عقاید کے بموجب بہت سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے قاضی یا حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ مثلاً ایک عورت کا نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے سوا کسی اور ولی نے نکاح کردیا۔ نکاح تو صحیح ہوگیا لیکن عورت کو بلوغ کے وقت یہ

اختیار ہوتا ہے کہ اس نکاح کو پسند کر کے باقی رکھے یا ناراضی ظاہر کر کے فسخ کر دے۔ مگر اسلامی احکام کی رو سے عورت خود نکاح کو فسخ نہیں کر سکتی بلکہ ضروری ہے کہ مسلمان قاضی سے فسخ کرائے۔

اسی طرح کسی عورت کا خاوند چار پانچ سال سے مفقود الخبر ہو گیا ہے اور عورت کے لیے گزارے کی کوئی صورت نہیں یا اس کے جوان ہونے کی وجہ سے اس کی عصمت محل خطر میں ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ مسلمان قاضی سے خاوند کی موت کا حکم حاصل کیا جائے اور عورت عدت وفات پوری کر کے دوسرا نکاح کر لے۔

اسی طرح عبادات و معاملات بالخصوص نکاح، طلاق، میراث، وقف شفعہ وغیرہ کے ہزاروں مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مسلمان حاکم کے فیصلے اور حکم کی ضرورت ہے غیر مسلم حاکم کا حکم یا فیصلہ شرعی نقطۂ نظر اور اسلامی عقاید کے بموجب کافی نہیں۔

گورنمنٹ انگلشیہ کے شاہی اعلان ۱۸۵۸ء کے بموجب اگرچہ رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور قوانین گورنمنٹ احکام مذہبیہ کے موافق فیصلے کرنے کے مدعی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ناقابل انکار حقیقت بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ گورنمنٹ کی عدالتوں میں مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے حاکم مسند آرائے سریر حکومت ہوتے ہیں بلکہ اعلیٰ عدالتوں میں غیر مسلم عنصر ہی غالب ہے۔ بہت سے شہر اور قصبے ایسے ہیں جہاں ایک بھی منصف یا جج مسلمان نہیں۔

اس لحاظ سے گورنمنٹ کا اعلان مذکور اور موجودہ قوانین ان مقدمات کے متعلق جن میں حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے، بالکل غیر مفید اور ناکافی ہیں اور مسلمانوں کی اس شدید ترین مذہبی ضرورت کے پورے ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتیں ایسی ہوں گی جو اپنے خیار بلوغ کو اس وجہ سے استعمال نہیں کر سکتیں کہ مسلمان حاکم میسر نہیں اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلم حاکم سے فسخ نکاح کا حکم حاصل کر کے دوسرا نکاح کر لیتی ہیں تو وہ اسلامی عقاید

کے بموجب گناہ گار اور مرتکب حرام ہوتی ہیں۔

ہزاروں عورتیں جن کے خاوند مفقود ہیں۔ مسلم عدالت نہ ہونے کے باعث عذاب میں مبتلا ہیں۔ زندگی بے کار ہے۔ رات دن مصیبت جھیلتی ہیں اور اسی طرح بہت سے دینی اور قومی اغراض اسلامی عدالت نہ ہونے کی وجہ سے ملیامیٹ ہو رہے ہیں۔

مجوزہ درخواست یہ ہے: گورنمنٹ مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات اور ان مقدمات کے فیصلے کے لیے جن میں مسلمان قاضی شرط ہے۔ ہر ضلع میں ایک شرعی عدالت قایم کردے اور اس میں ایک مسلمان قاضی (جو علوم شرعیہ کا عالم اور متدین ہو) مقرر کرے اور اس کو ان مقدمات کے متعلق ڈسٹرکٹ جج کے برابر اختیارات عطا کیے جاویں اور ہر صوبے میں ان ماتحت عدالتوں کے احکام کے خلاف اپیل کرنے کے لیے ایک بڑی عدالت قایم کی جائے۔

یہ درخواست کا مجمل خاکہ ہے۔ اس کی اجمالی عام منظوری کے بعد ان احکام کی تعین جو ان شرعی عدالتوں میں طے ہونے ضروری یا مناسب ہیں۔ علماے ہندوستان کی ایک منتخبہ جماعت کردے گی اور اس کے دیگر مراحل پر بھی مفصل بحث کی جاسکے گی۔

کتبہ محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

مدرّسِ اوّل مدرسۂ امینیہ۔ دہلی ۱۹۱۷ء

حاشیہ:

(۱)۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۶،۶۶،۴۷،۲۹۹

بنگال میں مسلمانوں کی تعداد ۲،۳۹،۸۹،۷۱۹

پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد +۱،۰۹،۵۵،۷۲۱ =۳،۴۹،۴۵،۴۴۰

نہرو رپورٹ
(۱۹۲۸ء)

ترتیب

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۱)

نہرو رپورٹ۔ پس منظر اور پیش منظر

حالات وواقعات پر ایک منظر

(۱۹۲۸ء)

سید طفیل احمد منگلوری

سائمن کمیشن کی امداد سے مسلم لیگ میں حرکت:

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا جو ہندوستان میں جدید اصلاحات دیے جانے کی تحقیقات کے لیے آرہا تھا، مگر اس کے کل ممبر انگریز رکھے گئے تھے جس سے اہل ہند میں عام ناراضی کی لہر پیدا ہوگئی۔ اس سال کے دسمبر میں کانگریس کا اجلاس مدراس میں زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا جس میں کانگریس کا منزل مقصود مکمل قومی آزادی قرار پایا اور سائمن کمیشن کو بائیکاٹ کرنا پاس ہوا۔ اسی طرح پشاور میں جمعیت علمائے ہند نے اور کلکتہ میں خلافت کانفرنس نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے ریزولیوشن پاس کیے اس بارے میں مسلم لیگ بھی کسی سے پیچھے نہ رہی اور دسمبر ۱۹۲۷ء میں بمقام کلکتہ جو اس کا اجلاس زیر صدارت (سر) مولوی محمد یعقوب منعقد ہوا اس میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کی قرارداد منظور ہوئی۔ نیز مسٹر سکلتوالا انگلستان کے مشہور سوشلسٹ پارسی کو انگلستان سے ہندوستان آنے کے لیے پاسپورٹ نہ دیے جانے پر اظہار افسوس کیا گیا اور نظر بند قیدیوں کی جو بلا مقدمہ چلائے جیل میں تھے رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ سائمن کمیشن کے تقرر کے سلسلے میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے اہل ہند کو دعوت دی کہ وہ کوئی متحدہ آئین اس کمیشن کے سامنے پیش کریں اور یہ پیشین گوئی کی کہ وہ ہرگز متحدہ آئین پیش نہ کرسکیں گے۔ اس لیے ہندوستان کے مختلف فرقوں کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایک متحدہ آئین بنا کر

لارڈ موصوف کو جواب دیں۔ اسی چیلنج کو پیش نظر رکھ کر مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے جلسے میں قرار دیا کہ کانگریس والوں کے ساتھ مل کر ایک آئین بنایا جائے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہو اور سندھ علاحدہ کیا جائے اور اس حالت میں مخلوط انتخاب کا اجرا منظور کیا جاے۔

اس اجلاس کے ایک ماہ بعد ۳ رفروری ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن نے بمبئی میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے مقاطعہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا اس کے خلاف ہڑتال اور بائیکاٹ کرنے میں امیدوں سے کہیں زیادہ کام یابی ہوئی۔ اسی کام یابی کی نسبت سے حکومت کی طرف سے مظاہرہ کرنے والوں پر زیادتیاں ہوئی۔ بعض جگہ گولیاں چلائی گئیں۔ اور ہندوستان کے بڑے سے بڑے لیڈروں پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ ان حالات سے متاثر ہوکر سر جان سائمن نے گورنمنٹ ہند کی معرفت ہندوستان کے سابق مطالبہ کی اس طرح تلافی کرنی چاہی کہ مرکزی اسمبلی کے چند ہندوستانی ممبر بھی کمیشن کے ساتھ بٹھائے جائیں۔ مگر اسمبلی کے اجلاس نے کثرت رائے سے ممبران کا انتخاب نامنظور کردیا اور کہا کہ وہ کسی طرح بھی کمیشن سے تعاون کرنا نہیں چاہتے۔ اس پر حکومت نے سات ممبران اسمبلی کو بذریعہ نامزدگی مقرر کردیا۔ جنھوں نے سائمن کمیشن کے ساتھ بیٹھ کر کام کیا۔

مسلمانوں کی عرضداشت:

ایک طرف ملک کی طرف سے سائمن کمیشن کا پرزور مقاطعہ کیا جارہا تھا تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کی بعض جماعتیں اپنی اپنی عرضداشتیں سائمن کمیشن کے سامنے پیش کررہی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم اور وقیع عرضداشت صوبہ متحدہ کے مسلم ممبران کونسل کی اکثریت نے جولائی ۱۹۲۸ء میں ممبران کمیشن مذکور کی خدمت میں پیش کی۔ یہ عرضداشت فلسکیپ کاغذ کے پانسو صفحات پر تھی اس میں سب سے زیادہ زور زبان، تمدن اور مذہب کی حفاظت پر ان تعلیم یافتہ اصحاب کی

طرف سے دیا گیا تھا جو بقول مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) اپنی زبان اور اپنا تمدن چھوڑ کر انگریزی زبان اور انگریزی تمدن اختیار کر چکے ہیں۔ اس عرضداشت میں زبان، تمدن اور مذہب کے مطالبہ کے ساتھ یورپ کے ان ممالک کے نظیریں پیش کی گئی تھیں جو یورپ کی مختلف لڑائیوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر از سر نو بنائے گئے تھے اور جس کی وجہ سے بعض اقلیتیں ایسی حکومتوں کے آ گئی تھیں جن کی زبان اور قانون، مذہب اور تمدن سب کے سب مختلف تھے۔ اس لیے یورپ میں ان اقلیتوں کی حفاظت کی ضرورت پیش آئی تھی مگر ہندوستان کی حالت تو بالکل مختلف ہے۔ جہاں ایک ہزار سال سے مختلف قومیں ایک ہی حالت میں چلی آ رہی ہیں اور ایک ہی زبان بولتی ہیں اور اپنے اپنے مذہب پر قایم ہیں اور ملک کی کوئی ایسی بیّن اور نمایاں تقسیم نہیں ہوئی، جس سے عام حالات میں فرق پڑتا۔

مندرجہ بالا عرضداشت میں زبان، مذہب اور تمدن کے بعد مسلمانوں کی تعلیم اور ملازمت اور فرقہ وارانہ انتخاب کی حفاظت کی نسبت مطالبات تھے۔ اس قسم کے مطالبات سے خواہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی یا نہ ہوتی مگر اس حکمراں طبقے کی حفاظت یقینی تھی جو ہندوستان میں اپنا وجود اسی بنا پر ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا حقیقی محافظ ہے، اس قسم کی عرضداشتوں کے ذریعے عام مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا مشتبہ ہونا اس لیے بدیہی ہے کہ اس میں ایک لفظ اہم بنیادی حقوق کی نسبت نہیں لکھا گیا جو چورانوے فی صدی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں مثلاً یہ کہ کروڑوں مسلمان جو افلاس کی وجہ سے بھوکوں مرتے ہیں اور پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے عدالتوں میں چارہ جوئی نہیں کر سکتے اور آئے دن اپنے واجبی حقوق سے محروم رہتے ہیں۔ اپنے جان و مال اور ملک کی حفاظت کے سامان رکھنے سے ممنوع ہیں تحریر اور تقریر کے ذریعے اپنی ضروریات کا اظہار کرنے پر ڈنڈوں سے پیٹے جاتے ہیں، جیلوں میں بند کر دیے جاتے ہیں اور بعض اوقات اپنی جائدادوں اور مملوکہ اشیاء سے محروم کر دیے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی ضروریات کے

بارے میں اس عرضداشت میں اشارۃً بھی کچھ نہیں لکھا گیا۔

اس عرضداشت کی نسبت ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جب کہ وہ نینی تال میں لکھی جارہی تھی تو اس پر دستخط کرنے والے ایک مسلم ممبر نے کہا کہ جب کہ اس سے مسلم حقوق کی حفاظت مقصود ہے تو مسٹر لیمبرٹ چیف سیکرٹری گورنمنٹ کو اس سے ایسی کیوں دل چسپی ہے کہ وہ بار بار شریک مشورہ ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال یہ عرضداشت سائمن صاحب کو دے دی گئی۔

نہرو کمیٹی کی رپورٹ:

مگر غنیمت ہے کہ سائمن کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش ہونے کے علاوہ ہندو مسلمانوں میں سمجھوتے کی کوششیں بھی جاری رہیں اس کی ابتدا کانگریس کے اجلاس گوہاٹی سے ہوئی جو دسمبر ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ اجلاس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے ہندو مسلمان لیڈروں سے اس بارے میں گفتگو شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰/ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسمبلی کے اجلاس کے زمانے میں دہلی میں چند مسلمان لیڈروں کا ایک جلسہ زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا اس میں قرار پایا کہ مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب ماننے کے لیے حسب ذیل شرائط پر تیار ہیں:

۱۔ سندھ کو ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں مثل دیگر صوبوں کے اصلاحات جاری کی جائیں۔ یعنی کونسلیں مقرر کر دی جائیں۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں مختلف قوموں کے ممبرانِ کونسل کی تعداد ان کی آبادی کے مطابق ہو۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث سے کم نہ ہو۔

کانگریس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز پر مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہندوستان کے لیے سوراج کا آئین بنانا تجویز کیا اور سالانہ اجلاس بمبئی میں قرار پایا کہ ان امور کے

طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ مسلم لیگ نے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۷ء بمقام کلکتہ میں مندرجۂ بالا تجاویز میں مذہبی آزادی اور تین چہارم ممبروں کی رائے سے کسی تجویز کے خارج از بحث ہونے کی شرط کا اضافہ کرکے انھیں منظور کرلیا۔

پھر تمام ہندوستان کی مختلف قوموں کی سیاسی جماعتوں کو مدعو کیا گیا اور ۱۲؍ فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس قایم ہوئی۔ اس منزل پر پہنچ کر یہ دقت پیش آئی کہ ایک طرف تو مسلمان فرقہ پرستوں نے اپنے مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور دوسری طرف ہندو مہاسبھا نے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کی جن میں مخصوص طور پر سندھ کی علاحدگی تھی اور دونوں جماعتوں میں رسہ کشی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان معاملات کو طے کرنے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس نے ایک چھوٹی کمیٹی مقرر کی جس میں دو نمایندے مسلمانوں کے، دو ہندو مہاسبھا کے اور ایک ایک نمایندہ ممبر برہمنوں اور سکھوں، لبرلوں اور مزدوروں کا تھا۔ ان سب نے مل کر فرقہ وارانہ امور طے کیے جو نہرو رپورٹ مرتبہ پنڈت موتی لال نہرو میں شامل ہوکر آل پارٹیز کانفرنس کے مشہور جلسہ منعقدہ لکھنؤ مورخہ ۲۸؍ اگست ۱۹۲۸ء میں زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری پیش ہوئے۔ اس وقت سب سے بڑا اختلاف پنجاب کے مسئلے میں تھا مگر بالآخر مولانا ظفر علی خاں، مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی اور چودھری افضل حق کی پارٹی نے اور نیز سکھوں نے اس سمجھوتے کو پنجاب میں مخلوط انتخاب لاتعین نشست کے ساتھ مان لیا البتہ مسلم جماعتوں میں مولانا شوکت علی صدر خلافت کمیٹی نے اور مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علماے ہند نے اپنے اپنے بیانات دیے جن میں بعض امور سے اختلاف کیا اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر سوبھاش چندر بوس نے مشروط طریقے پر نہرو رپورٹ کو منظور کیا۔ شرط یہ تھی کہ وہ اپنے آزادی کامل کے مطالبہ کو نہیں چھوڑتے ہیں، مگر فی الجملہ لکھنؤ کے جلسے میں نہرو رپورٹ منظور ہوگئی اور اس کی خوشیاں جلسے میں اور اس کے بعد تمام ملک میں منائی گئیں اور سمجھا گیا کہ اس کے ذریعے ہندوستان کے لیے ایک متفقہ آئین پیش کرکے لارڈ برکن ہیڈ

کے چیلنج کا جواب دے دیا گیا۔ مگر افسوس کہ پنجاب کے سکھوں کے ایک طبقے نے مخلوط انتخاب بلا تعین نشست کو اپنے لیے مضر سمجھ کر اس فیصلے سے انحراف کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے بھی اختلاف کیا پھر آخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس اور کنونشن کا اجلاس کلکتہ میں ہونا قرار پایا جس میں نہرو رپورٹ پیش ہونے کو تھی۔ مسلم لیگ کا جلسہ بھی کلکتہ ہی میں زیر صدارت مہاراجہ صاحب محمود آباد منعقد ہوا تھا۔ انھیں تاریخوں میں مسلم آل پارٹیز کانفرنس زیر صدارت ہز ہائنس سر آغا خاں دہلی میں منعقد ہو رہی تھی۔ کنونشن کے جلسے میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ۔ کے مطالبات پیش کیے۔ سر تیج بہادر سپرو نے کہا کہ آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز کے مطابق مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کی نسبت سے ان کے ممبروں کی تعداد مقرر کر دی جائے گی اس کے علاوہ مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ وہ عام مخلوط انتخاب میں شریک ہو کر مزید نشستیں حاصل کریں اور پنجاب و بنگال میں دکھایا کہ مخلوط انتخاب کے اجرا سے مسلمانوں کو بقدر سات یا آٹھ نشستوں کے اور زیادہ مل جائیں گی، جس کی وجہ سے ان دونوں صوبوں میں مسلم ممبران کی تعداد پنجاب میں ساٹھ فی صد اور بنگال میں اٹھاون فی صد کے قریب ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں مسٹر جناح نے فرمایا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کی آبادی کی نسبت سے سات یا آٹھ مزید نشستیں دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ جو صوبے پہلے سے امیر ہیں انھیں اور زیادہ امیر بنایا جائے۔ بجائے اس کے اگر مسلم اقلیت کے صوبوں مثلاً مدراس اور بمبئی یا صوبۂ متحدہ کو یہ مزید نشستیں دے دی جائیں تو ان کا کچھ بھلا بھی ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس وقت مسٹر جناح نے بنگال و پنجاب کی کونسلوں اور اسمبلیوں میں مسلم اکثریت ہونے کی صاف الفاظ میں مخالفت کر کے ان صوبوں کو پاکستان بنائے جانے سے روکا۔ بہ ہر حال اس جلسے میں مسلمانوں کے چھ مطالبات میں سے چار خارج ہو گئے اور کانگریس والوں نے مسٹر جناح اور مولانا محمد علی کے ساتھ بے رخی برتی جو ایک طرف مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی اور دوسری طرف کانگریس کے درمیان کشیدگی کی

موجب ہوئی۔ اس وقت صاف معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کے ذمہ دار اصحاب کے نزدیک فرقہ وارانہ فیصلے کی کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ آزادی کامل اور نوآبادیات کے مسائل کے اختلافات میں اس قدر غرق تھے کہ انھوں نے فرقہ وارانہ فیصلہ نہ ہونے کی کوئی پروانہ کی۔ اس وقت وہ سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ فیصلے کو نظر انداز کر کے ملک کو آزاد کرا سکیں گے۔ چناں چہ کنونشن نے نہرو رپورٹ کو حسب ذیل الفاظ میں منظور کیا:

> ''موجودہ حالات کے مدنظر کانگریس، کنونشن کے پاس کردہ دستور اساسی کو قابل قبول سمجھتی ہے بہ شرطے کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک اسے پارلیمنٹ منظور کر لے ورنہ اس تاریخ سے کانگریس پر امن ترک موالات شروع کر دے گی اور لوگوں کو ٹیکس وغیرہ نہ ادا کرنے کا مشورہ دے گی۔''

مندرجۂ بالا صفحات میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر اس کے کچھ مختصر حالات بیان کر دیے جائیں۔

مسلم آل پارٹیز کانفرنس:

۲۹۔۱۹۲۸ء مسلم لیگ کے لیے ایک انتشار کا سال تھا پنجاب کے مسلمانوں نے شفیع لیگ علاحدہ بنالی تھی مسلم لیگ کے آزاد خیال مسلمان نہرو رپورٹ سے اتفاق کر چکے تھے۔ مسٹر جناح اور مولانا محمد علی نے کانگریس آل پارٹیز کنونشن کے جلسے میں ان مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا جو حفاظت حقوق پر اصرار کرتے تھے۔ مگر ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے ان سب سے غیر مطمئن ہو کر مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے ایک جلسہ طلب کیا اس میں قانون ساز جماعتوں کے مسلمان ممبر اور دیگر اسلامی جماعتوں کے نمایندے بلائے گئے اور انگلستان سے ہز ہائی نس سر آغا خاں جنھوں نے ۱۹۱۵ء کے اجلاس بمبئی میں مسلم لیگ کو چھوڑ دیا تھا، حالات کو مناسب پا کر تیرہ سال بعد مسلمانوں کے اس سیاسی جلسے کی صدارت کرنے تشریف لائے۔ یہ

جلسہ دہلی میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو منعقد ہوا۔
ہز ہائی نس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک طرف تو ہندوؤں کی رضامندی کے لیے ذبیحہ گاؤ بند کرنے پر زور دیا۔ دوسری طرف جداگانہ انتخاب قایم رکھنے کو ضروری بتایا اور درآں حالے کہ اس کی موجودگی میں ہندو ممبر غریب مسلمان ووٹروں سے مستغنی ہو کر مسلمانوں کے حقوق پامال کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے اس اجلاس میں صرف ایک طویل قرارداد پاس ہوئی جس میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی مدات کی تعداد ۱۹۲۷ء کے ابتدائی مطالبات سے تین گونہ ہوگئی۔ اس قرارداد کا خلاصہ یہ ہے:

"ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو اور فاضل اختیارات مختلف ریاستوں اور صوبوں کو حاصل ہوں۔ اگر کسی جماعت کے تین چہارم ممبر کسی تجویز یا بل سے اختلاف کریں تو وہ قانون ساز جماعت کے سامنے پیش نہ ہو، مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب اس وقت تک قایم رہے جب تک کہ وہ اسے ضروری سمجھیں۔ مرکزی اور صوبجاتی کابینوں میں ان کی مناسب نیابت ہو، جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کے ممبروں کی موجودہ تعداد میں کمی نہ کی جائے، مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث ہو۔ صوبۂ سندھ علاحدہ کر دیا جائے۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مناسب حصہ ہو۔ مسلمانوں کی تہذیب، زبان، تعلیم، مذہب، پرسنل لا، اوقاف کی حفاظت ہو اور سرکاری تعلیمی امداد میں مناسب حصہ ملے اور آئین ہند میں کوئی تبدیلی بلا رضامندی جملہ ریاستوں اور صوبوں کی حکومتوں کے نہ کی جائے۔"

نہرو رپورٹ کے بارے میں مسلم لیگ میں اختلاف:

اس جلسے کے تین ماہ بعد آخر مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس، کلکتہ کے اجلاس کی تمام کارروائی ختم کرنے کے لیے بمقام دہلی زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پنجاب کی وہ جماعت بھی آئی تھی جو شفیع لیگ کے نام سے مسلم لیگ سے علاحدہ ہو گئی تھی۔ باقاعدہ جلسہ شروع ہونے سے قبل اول مختلف فریقوں میں باہمی مصالحت کے لیے متعدد جلسے ہوئے اور مسٹر جناح کا طویل ریزولیوشن مشتمل بر چودہ نکات زیر بحث رہا۔ اس ریزولیوشن میں تمام وہ امور داخل تھے جو مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی نے جنوری ۱۹۲۹ء کے جلسے میں پاس کیے تھے۔ اور نہرو رپورٹ کو اس بنا پر نامنظور کرنا تجویز کیا گیا تھا کہ:

> سکھ، نان برہمن اور پست اقوام اسے منظور نہیں کرتے۔ کانگریس اسے ایک سال کے لیے ملتوی کر چکی اور مسلمانوں کے لیے وہ غیر مفید ہے۔"

مگر مسلمانوں کی آزاد خیال جماعت چاہتی تھی کہ کچھ ترمیمات کے سات نہرو رپورٹ پاس کر دی جائے چناں چہ بڑی رد و کد کے بعد ۳۰/ مارچ ۱۹۲۹ء کو اول مجلس مضامین زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح شروع ہوئی کچھ دیر بعد مسٹر جناح اراکین مسلم کانفرنس کے پاس حکیم جمیل خان کے مکان پر سمجھوتے کے لیے چلے گئے اور مجلس مضامین کا کام جاری رہا۔ اس میں ایک تجویز کے ذریعے نہرو رپورٹ کی تائید اس شرط پر کی گئی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں، پنجاب اور بنگال میں آبادی کی نسبت سے کونسلوں میں نمایندگی دی جائے۔ صرف جنگ یا بغاوت کے زمانے میں مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ صوبے کی حکومت کے فیصلے کو منسوخ کر سکے، اسلامی قانون میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نہ ہو سکے جب تک کہ مسلمان ممبروں کی اکثریت اسے منظور نہ کر لے وغیرہ وغیرہ۔ بدقسمتی سے علی برادران اس تجویز کے مخالف تھے۔

جس وقت اس تجویز پر بحث ہورہی تھی تو باہر کے لوگ بکثرت پنڈال میں گھس آے جو اس تجویز کی مخالف پارٹی کے لائے ہوئے تھے اور انھوں نے شور کرنا شروع کیا۔ ایسی حالت میں مجلس مضامین میں مندرجۂ بالا تجویز پاس کردی گئی اور چوں کہ مسٹر جناح کے آنے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر محمد عالم کی صدارت میں مسلم لیگ کا جلسۂ عام شروع کیا گیا اور اسی ہنگامے میں یہ تجویز پاس کی گئی۔ فوراً اس کے بعد مسٹر جناح آئے اور انھوں نے یہ شور وشغب دیکھا اور حالات سن کر اعلان کردیا کہ ''جو کارروائی ہوئی ہے وہ کالعدم کی جاتی ہے اور جلسہ غیر معین وقت کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔'' اسی طرح مسلم لیگ کے باہمی اختلافات کی بدولت ایک معرکتہ الآرا تجویز کا یہ حشر ہوا اور اس وقت سے مسلمان تعلیم یافتوں کی آزاد خیال جماعت مسلم لیگ سے علاحدہ ہوگئی اور اس نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت قایم کرلی۔ جس کا تذکرہ آیندہ آے گا۔

حکومت نوآبادیات کا اعلان دوسری بار:

اس سے قبل سائمن کمیشن کے تقرر کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے مقاطعے کی وجہ سے حکومت نے سختی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس سے ملک میں ہیجان بڑھا اور ۱۹۲۹ء میں اس ہیجان کا ظہور بہت سی شکلوں میں ہوا۔ اسمبلی میں پبلک سیفٹی بل خارج ہوا۔ بدیشی کپڑے اور مسکرات کا بائی کاٹ عمل میں آیا۔ مولانا ظفر علی خاں گرفتار ہوئے۔ آرڈی نینسوں یعنی عارضی قوانین کا اجرا ہوا۔ اسی سال لارڈ اروِن وائسراے انگلستان گئے جس کی بابت سمجھا گیا کہ وہ ہندوستان کی بابت مشورہ کرنے گئے ہیں۔ بالآخر موصوف نے ۳۱/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ایک طویل اعلان شایع کیا جس میں خاص طور پر حسب ذیل الفاظ ہندوستانیوں کے لیے نہایت دل خوش کن تھے:

> ''مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ صاف طور پر بیان کرنے کے اختیارات دیے گئے ہیں کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا

قدرتی نتیجہ درجۂ نوآبادیات کا حصول ہے۔"

اسی قسم کا اعلان ۹ رفروری ۱۹۲۱ء کو جب کہ بائی کاٹ کا زور تھا حضور ملک معظم کی طرف سے اسمبلی میں کیا گیا تھا اور وائسرائے اور ڈیوک آف کیناٹ کی تقریروں میں کہا گیا تھا کہ مطلق العنانی کا دور اب ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد جس قسم کی زیادتیاں رعایا پر کی گئیں اور آرڈی نینسوں کے اجرا کے ذریعے مطلق العنانی کا کامل مظاہرہ کیا گیا اور مسٹر لائیڈ جارج نے انگریزی سول سروس کی مداومت کا شاخسانہ لگا کر اس کی تنخواہوں اور الاؤنس میں اضافہ کیا۔ تاہم چوں کہ ایک بار نوآبادیات کی حکومت کی پھر جھلک نظر آئی اس لیے تمام ملک میں اس پر اطمینان ظاہر کیا گیا لیکن انگلستان میں ایک پارٹی نے اس اعلان پر بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ اس طرف کانگریس کمیٹی نے جمع ہو کر وائسرائے کی خدمت میں ایک یاد داشت بھیجی جس پر ۲۳ ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے نے نمایندگان کانگریس سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مہاتما گاندھی چاہتے تھے کہ نوآبادیات کے متعلق حکومت کی طرف سے صاف وعدہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ گول میز کانفرنس میں اس کی بابت کچھ طے کیا جائے گا یا نہیں؟ مگر وائسرائے نے اس سے گریز کیا اور کہا کہ اعلان میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے گورنمنٹ کا نقطۂ نظر وہی ہے اور اعلان کی یہ کیفیت تھی کہ اس میں یہ مبہم الفاظ تھے:

"ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ درجۂ نوآبادیات کا حصول ہے۔"

بس وائسرائے کی طرف سے ان الفاظ کی وضاحت نہ ہونے سے اہلِ ہند کو حد درجہ مایوسی ہوئی اور کیوں نہ ہوتی جب متعدد اعلانوں اور وعدوں کے بعد بار بار رجعت کی جا چکی تھی۔ اس وقت لارڈ ارون بھی بہت گومگو اور چہ کنم میں پڑ گئے تھے جن کی زبان سے نوآبادیات کا اعلان ہوا تھا۔ غالباً پہلا سا زمانہ ہوتا تو لازمی طور پر لارڈ ارون مثل لارڈ الفنسٹن اور لارڈ ناتھ برو ک کے اپنی عزت قائم رکھنے کے لیے استعفا دے کر چلے جاتے مگر لارڈ ارون نے ایسا نہیں کیا۔

آزادی کامل کا اعلان نہرو رپورٹ غرق:

یہ ہر نوع وائسرائے کے مندرجۂ بالا طرزِ عمل سے بالکل واضح ہو گیا کہ یہ اعلان بھی محض دفع الوقتی کے لیے کیا گیا تھا اب کانگریس کے اجلاس میں جو لاہور میں ہونے والا تھا صرف چار روز رہ گئے تھے کانگریس والوں کی یہ دقت تھی کہ اُن کا آزادی کامل کا ریزولیوشن دو سال سے معلق چلا آرہا تھا۔ اور پچھلے سال صاف الفاظ میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اگر گورنمنٹ ''کنونشن'' کی قرارداد جو حکومت نو آبادیات کے بارے میں تھی ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک منظور نہ کرے گی تو کانگریس ترک موالات بشمول عدم ادائیگی ٹیکس شروع کر دے گی۔ چناں چہ لاہور کے اجلاس میں جو زیر صدارت پنڈت جواہر لال نہرو منعقد ہوا۔ یہ تجویز پاس کر دی گئی کہ گول میز کانفرنس کی شرکت بے کار ہے۔ نہرو رپورٹ کی قرارداد کو منسوخ سمجھ کر کامل آزادی کا اعلان کیا جائے اور کانگریس کمیٹی کو سول نافرمانی کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اس وقت کانگریس پر ''جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کی مثل صادق آتی تھی۔ اس نے تمام اپنے منصوبے سرکاری وعدوں پر مبنی کر رکھے تھے۔ مگر اب جب کہ ثابت ہو گا کہ وعدے وفا ہونے کے لیے نہ تھے تو بمصداق ''مرتا کیا نہ کرتا'' اس نے ''آزادی کامل'' کا اعلان کر دیا اور اس بنیاد پر کہ بالخصوص سکھ اور بالعموم مسلمان اور دوسری اقلیتوں نے نہرو رپورٹ کو نامنظور کر دیا تھا کانگریس نے کامل آزادی کا منصوبہ قایم کر لیا تھا، لاہور کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کی شفارشات خارج کر دی گئیں اور کہا گیا کہ اسے دریائے راوی میں غرق کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ نہ ہونے میں خود سکھوں کا قصور ہو یا مسلمانوں کا یا ان اصحاب کا جو آزادی کامل کے طالب تھے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اہل ہند کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور ہندو مسلمانوں نے جو مل کر مالی اور جانی قربانیاں کی تھیں وہ سب اکارت گئیں۔ ہندوستانیوں کے قرنوں کے مطالبات کے بعد اب حکمرانوں کی زبان پر سوراج اور حکومت نو آبادیات کے

الفاظ آنے لگے تھے جو ملک کی آزادی کے مرادف تھے۔ جب کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کی نوآبادیات کی بری اور بحری فوجیں خود ان کی پارلیمنٹ کے تحت ہیں اور وہ لوگ صنعت و تجارت کے مالک ہیں اور مال کی درآمد و برآمد پر محصول قایم کر کے خود اپنے ملک کو خوش حال بنا سکتے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ حکومت نوآبادیات ہونے کی حالت میں وہ آزاد نہیں ہیں۔ مگر ہندوستان کی قسمت اس دن پھوٹ گئی جب کہ ایک فرقہ نے جو آزادی کامل کا مدعی تھا نوآبادیات کی حکومت کو اپنے مرتبہ سے کم سمجھ کر ٹھکرا دیا اور دوسرے فرقہ نے اپنے نام نہاد حقوق پر نوآبادیات کی حکومت کو قربان اور نثار کر دیا۔ اور دونوں نے لارڈ برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو کہ اہل ہند کوئی متفقہ آئین نہ پیش کر سکیں گے اپنے عمل سے یا اپنی بداعمالی سے صحیح ثابت کر کے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کو ذلیل کر دیا۔ کیا کوئی شخص کوئی ایسا قانون پیش کر سکتا ہے جس کی جزئیات پر ۳۰ کروڑ تو کیا ۳۰ لاکھ آدمی بھی متفق ہو جائیں اور کیا کوئی آئین ایسا ہو سکتا ہے جو ابدالآباد تک کے لیے سب قوموں کے نزدیک ناقابل تبدیل ہو؟ مگر بدقسمت ہندوستانیوں نے سمجھ لیا کہ جو قانون نہرو رپورٹ کی رو سے بنایا جائے گا وہ ابدی ہوگا اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ بہ ہر نوع اس وقت دفتری حکومت کی قسمت زوروں پر تھی اس لیے حکومت نوآبادیات کی مسل داخل دفتر کر دی گئی اور ہندوستانیوں کا مدتوں کا کیا دھرا سب ملیامیٹ ہو گیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص ۲۷-۴۲۰)

(۲)

ہندوستان کے دستور کا مسئلہ

''ہندوستان کی موجودہ حالت میں اس کی حکومت اور حکومت کی نوعیت اور اس کی کام یابی کا مسئلہ صرف اقلیتوں کے اطمینان و اعتماد کا مسئلہ ہے اگر ہندوستان کی قلیل التعداد قومیں اپنے حقوق کی طرف سے مطمئن نہ ہوں گی تو نہ آزادی حاصل ہو سکے گی اور نہ کام یاب حکومت قایم ہو سکے گی۔ ہندوؤں کا ایک مذہب ہے اور ان کی جداگانہ تہذیب و تمدن ہے۔ مسلمانوں کا ایک مذہب ہے۔ اور ان کی تہذیب و تمدن جدا ہے باوجود صدیوں کے میل جول اور قرب و ہمسائیگی کے آج بھی ہندوؤں کی اکثریت مسلمانوں سے اتنی دور ہے کہ ان کے ہاتھ کا کھانا کھانے، پانی پینے کو تیار نہیں ہے۔ ہندو مہا سبھا کے نمایندے سندھ کی علاحدگی کے خلاف یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ کسی صوبہ کو فرقہ وارانہ بنیاد پر جدا کرنا اصول قومیت کے منافی ہے لیکن انھوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک ملک، ایک احاطہ، ایک محلے، بلکہ ایک گھر میں رہنے اور ایک دکان پر بحیثیت شریک بیٹھنے اور ایک کارخانہ میں مل کر کام کرنے کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا نہ کھانا اور پانی نہ پینا یہ کس قومیت متحدہ اور کس جمہوری اصول کے موافق ہے اور کیا یہ علاحدگی اور اجنبیت اور یہ دوری اور نفرت سیاسی اتحاد اور ملکی ارتقا پر اثر انداز نہیں ہے۔ ضرور ہے اور اس کا انکار کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔

ہندو مسلم مسئلہ:

پس ہندوستان کے مسئلے کا نچوڑ صرف ایک ہے اور وہ ہندو مسلم مسئلے کے مختصر الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کے علاوہ

ہندوستان میں اور کوئی قوم نہیں ہے۔ یا جو ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں قوموں کو ہندوستان میں طبعی طور پر یہ درجہ حاصل ہے کہ ان کا باہمی تصفیہ ہوجانے کے بعد دوسری اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بعض اقلیتیں مسلمانوں کے ساتھ ہوجائیں گی اور ان پر اعتماد کرلیں گی اور بعض ہندوؤں کے ساتھ ہوجائیں گی اور ان پر اعتماد کرلیں گی اور اگر بالفرض کوئی اقلیت غیر مطمئن بھی رہی تو ہندو مسلمان اپنے باہمی سمجھوتے کے بعد متفق ہوکر اس کو مطمئن کرنے میں زیادہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔

ہندو قومیت کے حقوق:

ہندوؤں کو ہندوستان میں تقریباً ۳/۴ کی اکثریت حاصل ہے اور ان کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان کی کثرت تعداد اور مالی و تعلیمی قوت پوری ضمانت ہے۔ اس لیے ان کو تو کوئی اندیشہ کسی اقلیت سے ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلم قومیت:

مسلم قومیت ہندوستان میں تقریباً ۱/۴ کی اقلیت میں ہے اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے مذہبی مآثر اور گزشتہ دور حکومت کی اسلامی یادگاریں اور مذہبی ادارے ایسے ہیں جن کو مسلمان اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ہیں۔ جن کو آئندہ ہندوستانی سیاست میں بڑا دخل ہے اس لیے وہ بجا طور پر متفکر ہیں کہ ان کے حقوق مذکورہ بالا کی حفاظت کا اگر پورا قابل وثوق انتظام نہ کردیا گیا تو ان کی ۱/۴ کی اقلیت قانونی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت میں ناکام رہے گی۔ اس لیے وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتے جب تک کہ دستور اساسی کی بنیادی دفعات میں ان چیزوں کی حفاظت کی ضمانت نہ کردی جائے۔ تاکہ جیسے ہندو اپنی اکثریت کی وجہ سے اپنے حقوق کی حفاظت پر مطمئن ہیں مسلمان دستور کی بنیادی

دفعات پر اطمینان کر سکیں۔

حل طلب مسائل:

ہندوستان کے قوم پرور رہنماؤں اور زعماء قوم کے سامنے اصولی طور پر دو قسم کے مسائل تھے۔ ایک تو وہ جن کا فرقہ وارانہ مذہبی خیالات و جذبات سے تعلق تھا۔ مثلاً قربانی و ذبیحہ گاؤ اور مساجد کی تعمیر، مساجد کے سامنے باجا بجانا، شدھی و سنگھٹن، تبلیغ وغیرہ۔ اذان اور آرتی، محترم مقامات کی توہین۔

ان مسائل کا حل کرنا زعمائے قوم کے ذمے بہ ہر حال ضروری ہے۔ یعنی خواہ ہندوستان پر برطانوی حکومت ہو۔ خواہ حکومت خود اختیاری۔ کیوں کہ ان جھگڑوں کا اثر یہ ہے کہ فریقین کی جانیں ضایع ہوں، مال کا نقصان ہو، تجارت اور صنعت و حرفت تباہ ہو اور آیندہ سیاسی ارتقاء کی مساعی میں مشکلات پیدا ہوں۔ پس ان اسباب کو دور کرنا بہ ہر حال زعمائے قوم کا فرض ہے جو ان مہلک نتایج کے ذمہ دار ہیں۔

دوسرے وہ مسائل جو اقوام کے سیاسی اور تمدنی حقوق سے متعلق ہیں۔ ان میں اس قسم کے جھگڑے تو پیش نہیں آتے جیسے پہلی قسم کے مسائل میں پیش آتے ہیں مگر ان مسائل کے نتایج بھی اقوام کے قومی نشو و نما اور عروج و زوال میں اثر انداز ہوتے ہیں اور اقوام کی روح قومیت کی بقا یا فنا کے ذمہ دار یہی مسائل ہوتے ہیں۔

مسائل قسم اول:

قسم اول کے مسائل کے حل کرنے کے لیے ملک کے رہنماؤں نے بیسیوں مجلسیں منعقد کیں اور باہمی بحث و مباحثہ اور داد و ستد کے اصول پر مختلف اوقات میں مختلف تجاویز پاس کیں۔ دہلی میں یونیٹی کانفرنس کا انعقاد ہو۔ شملہ اور کلکتہ میں زعمائے قوم جمع ہوئے اور بالآخر مدراس کانگریس نے ان مسائل کے تصفیہ کے لیے

ایک طویل تجویز منظور کی جو بڑی حد تک کلکتہ کی تجویز کے موافق تھی۔

مگر ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا کہ نہرو کمیٹی نے ان اہم اور مقدم مسائل کو نہرو رپورٹ میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ حال آں کہ ان کا تصفیہ بہ ہر حال ضروری ہے اور جب تک یہ پہلا قدم درست نہ ہو جائے دوسرا قدم ہرگز اٹھ نہیں سکتا۔ کیوں کہ دوسرے قدم کے لیے ملک کی اقوام کا اتفاق و اتحاد ضروری ہے۔ اور وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ قسم اول کے مسائل کا قابل اطمینان حل نہ ہو جائے اور ملک کی فضا اتنی درست نہ ہو جائے کہ سیاسی ارتقا کے لیے متفقہ جدوجہد کی امید پیدا ہو سکے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہرو رپورٹ میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور جس کو کافی سمجھا گیا ہے۔ وہ اگر ہتھیار بند صلح کا طریقہ نہیں ہے تو یقیناً "پنچوں کا کہنا سر و آنکھوں پر مگر پرنالہ یہیں رہے گا" کے قبیل سے ہے۔ رپورٹ میں بڑی بلند آہنگی سے کہا گیا ہے کہ:

> "اگر مذہبی مکمل آزادی دے دی جائے اور اپنی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کا ہر فرقہ کو اختیار دے دیا جائے تو گو لوگ اس کو نہ سمجھ سکیں لیکن عملاً فرقہ بندی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔"

اس میں سوال صرف یہ ہے کہ آج انگریزی حکومت اور اس کا قانون بھی مکمل مذہبی آزادی دینے کا دعوے دار ہے یا نہیں؟ ضرور ہے اور فی الحقیقت ان مسائل میں جو قربانی گاؤ، ذبیحہ گاؤ، مساجد کے سامنے باجا، شدھی و تبلیغ سنگھٹن وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مکمل مذہبی آزادی دینے سے انگریزوں کو کوئی مانع بھی نہیں ہے۔ لیکن کیا باوجود اس مکمل آزادی کے ہندوستان میں فرقہ بندی کا مسئلہ حل ہو گیا اور فریقین کے فرقہ وارانہ جھگڑے ختم ہو گئے۔

دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی ذہنیت مذہبی آزادی کے یہ معنی سمجھے کہ مسلمانوں کی گائیں بلکہ بکرے بھی چھین لے اور مسلمان مذہبی آزادی کے یہ معنی سمجھیں کہ

ہندوؤں کو اتنی دور تک باجا نہ بجانے دیں کہ مسجد میں باجے کی آواز کو کوئی سن سکے تو اس کا حل کون کرے گا۔

پھر اگر ان امور کی تصریح نہ کی گئی اور دفعات کے ذریعہ سے حدود نہ بتلا دی گئیں تو کیا آیندہ وہی قوم کامیاب نہ ہوگی جس کی قانون ساز جماعت میں اکثریت ہوگی اور آزادی کا مفہوم بھی وہی ہوگا جو اکثریت معین کرے گی۔ تو اس لفظی مکمل آزادی سے فرقہ وارانہ مناقشات کا عملی حل کس طرح ہو جائے گا۔

نیز اقلیت کا اپنی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا بہت سی سیاسی اور اقتصادی اسباب پر موقوف ہوتا ہے اور وہ تمام اسباب اور ان کی کنجیاں اکثریت کے ہاتھ میں ہوں گی اس لیے یہ الفاظ کہ ہر اقلیت اپنی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے میں مختار ہے محض کاغذ کے پرزے پر ایک خوش کن جملے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

مسائل قسم ثانی:

دوسرے قسم کے مسائل جن کا قومی سیاسی و اقتصادی حقوق سے تعلق ہے اور جن کو لازمی طور پر دستور اساسی کا جزو ہونا چاہیے۔ ایسے تمام مسائل پر پہلے تفصیلی بحث و نظر کا موقع نہیں آیا۔ صرف بعض مسائل ایسے ہیں جن پر تبادلہ خیالات یا کسی قسم کا سمجھوتا ہوا ہے۔ مثلاً انتخاب جداگانہ یا مخلوط نیابت بہ تناسب آبادی نشستوں کا اقلیت و اکثریت دونوں کے لیے تحفظ یا صرف اقلیت کے لیے صوبہ سندھ کی علاحدگی، صوبہ سرحدی و بلوچستان میں باقی صوبوں کے طرز کی حکومت کا قیام۔

مرکزی مجلس قانون ساز میں ۳/۱ مسلم نیابت کسی قانون ساز مجلس میں کوئی بل تجویز یا ترمیم یا اضافہ جس کو کسی اقلیت کے ۴/۳ نمایندے اپنے مذہبی مفاد کے خلاف قرار دیں، غور کے لیے پیش نہ ہو سکے۔ ان مسائل پر وقتاً فوقتاً غور ہوتا رہا ہے۔ اور مسلمانوں نے محض آزادی وطن کی خاطر ہندوستان کی موجودہ کشمکش اور انتہائی فرقہ وارانہ منافرت کو نظر انداز کر کے بڑی حد تک ان اصول کو تسلیم کر لیا جنھیں ہندوؤں

کے زعمانے خود پیش کیا تھا اور جہاں تک ممکن تھا اپنا آخری نقطۂ نظر پیش کر دیا تھا۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہرو رپورٹ میں ان مسائل کے متعلق بھی مدراس کانگریس کے اس فیصلہ کو ٹھکرا دیا گیا ہے جو مدراس کانگریس نے منظور کیا تھا۔ جیسا کہ ہماری تفصیلی بحث سے جو آیندہ آتی ہے معلوم ہوگا۔

مگر ہمیں دکھانا یہ ہے کہ ان چند مسائل کے علاوہ جن پر تبادلہ خیال ہو چکا ہے دستور اساسی چوں کہ مسودۂ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ بھی ایسا قانون جس پر آیندہ قومی موت و حیات کا انحصار ہے۔ اس لیے اس میں سیکڑوں ایسے مسائل بھی آئیں گے جن پر اب تک تبادلۂ خیال نہیں ہوا تھا۔

اور ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم یہ کہیں کہ جن مسائل پر تبادلۂ خیال ہو چکا ہے اور مسلم اقلیت نے اپنے آخری مطالبات پیش کر دیے ہیں اور ان مطالبات کا مبنی برحق و انصاف ہونا کانگریس نے بھی تسلیم کر لیا ہے، ان کے متعلق بھی نہرو کمیٹی نے فراخ دلی کا نمونہ پیش نہیں کیا تو جن مسائل پر اب تک تبادلۂ خیال ہی نہیں ہوا ان میں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ کمیٹی نے مسلم مفاد کی خاطر خواہ حفاظت کر دی ہوگی۔

سفارشات پر بحث:

سفارشات پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ جمعیت علما کا مطمح نظر اور نصب العین مکمل آزادی ہے اور اس کے نمایندے اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز یا قاعدہ یا دفعہ کی تصدیق و تائید نہیں کر سکتے۔

دوسرے یہ کہ ہندوستان میں ایسی حکومت کا قیام جس کی باگ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو اور جس کے ماتحت تمام مذاہب اور اقوام کے حقوق محفوظ ہوں۔ جمعیت کے نزدیک لازمی اور ضروری ہے کہ وہ ہر اس سعی کا نہ صرف خیر مقدم کرنے بلکہ اس میں شریک ہونے کو تیار ہے جو ایسی حکومت کے حصول کے لیے ضروری یا مفید ہو۔

ہم آزادی کے دستورِ اساسی کے مخالف نہیں ہیں مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس میں ایسی ضمانتیں شامل کردی جائیں جن سے حفاظت حقوق کا یقین حاصل ہو جائے۔

جمعیت علماء مسلمانوں کے لیے کوئی ناواجب اور غیر منصفانہ رعایتیں نہیں مانگتی۔ وہ صرف یہی چاہتی ہے کہ بروے قانون، عقل و انصاف مسلمان جتنے حصے کے حق دار ہیں وہ ان کو دیا جاے اور اس کی حفاظت کا اطمینان ہو جائے۔

طرز حکومت:

۱۔ حکومت کا نظام ترکیبی لامرکزی مقرر کیا جائے جس میں صوبے حقیقتاً خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکزی حکومت کو وہی اختیارات تفویض کیے جائیں جن کا تعلق تمام ملک کے ساتھ یکساں ہے۔

۳۔ مرکزی حکومت دوایوانی نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ ریاست ہاے ہند کے تعلق کو مرکزی حکومت کے ساتھ ایسے اصول پر آزاد صوبجات ہند کے موافق منضبط کیا جائے کہ ان کی اندرونی خودمختاری کی حیثیت میں ناواجب دست اندازی نہ ہو۔

۵۔ صوبوں کے گورنروں اور وائسراے کو ویٹو کا جو حق دیا گیا ہے اس میں مزید پابندی کی ضرورت ہے۔

بنیادی حقوق:

دفعہ ۴ ضمن ۳: لفظ امن عامہ حذف کر کے عبارت یوں کردی جاے۔ بشرطیکہ وہ عمل منافی اخلاق نہ ہو۔

دفعہ ۴ ضمن ۱۹: بالکل حذف کردی جاے۔ کیوں کہ ضمن ۶ کافی ہے۔

دفعہ ۴ ضمن ۴: میں لفظ ''اور بلا اسلحہ کے بجاے'' ''بلا آتشیں اسلحہ'' کردیا جائے۔

اسے حذف کردیا جائے۔

ضمن ۹: کو یوں بدل دیا جائے۔ کوئی جسمانی سزا یا ایسی سزا جس میں سخت اذیت ہو نہ دی جائے گی۔

مذہبی حقوق اور ان کی حفاظت:

جمعیت علما کے نزدیک ضروری ہے کہ مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے دستور اساسی میں حسب ذیل دفعات شامل ہوں۔

۱۔ مسلمانوں کے لیے قربانی گاؤ و ذبیحۂ گاؤ کی آزادی اور ہندوؤں کے لیے مساجد کے سامنے باجا بجانے کا مسئلہ۔ اس مسئلے کے متعلق مدراس کانگریس اور مسلم لیگ کلکتہ نے تجاویز پاس کی ہوئی ہیں ان کی روشنی میں تجویز یا دفعہ کے الفاظ بنانے میں جمعیت علما آل پارٹیز کے ساتھ مل کر کام کرسکتی ہے بشرطیکہ اس کا اضافہ اصولاً تسلیم کرلیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کی بہت سی مذہبی ضرورتیں بغیر مسلمان قاضی کے پوری نہیں ہوتیں اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لیے دارالقضا کے قیام کو اصولاً تسلیم کرلیا جائے اور حکومت مشترکہ ہند اس کی کفیل ہو۔ اس قسم کی عملی صورتیں آج بھی موجود ہیں اور جمہوری حکومتیں اس پر عمل کر رہی ہیں۔ جزائر فلپائن میں امریکا کی طرف سے اور روسی حکومت میں اور کئی غیر مسلم ہندوستانی ریاستوں میں آج بھی یہ طریقہ جاری ہے اور سیلون کے مسلمانوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے اور یوپی کونسل میں بھی یہ تجویز پیش کی جاچکی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو آزادی ہو کہ وہ امارۃ شرعیہ کا ادارہ قایم کریں جیسے کہ آج بھی صوبۂ بہار میں اس کا نمونہ قایم ہے۔

۴۔ مذہبی تعلیم، مذہبی تعلیم کی زبان، مذہبی تعلیم کا نصاب، مذہبی ادارے، مذہبی تحریکیں، مساجد، عیدگاہیں، تکیے، امام باڑے، کربلائیں، اوقاف خانقاہیں، مدارس،

مقابر و قبرستان، آثار قدیمۂ اسلامیہ، عمارات اسلامیہ محفوظ رکھی جائیں گی اور آیندہ بھی ان کی تشکیل و تعمیر و قیام و استعمال کے لیے مسلمان آزاد ہوں گے۔

۵۔ حکومت کے مدارس میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ نصابِ تعلیم، طریقۂ تعلیم، اشیائے متعلقۂ تعلیم میں کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو مسلمانوں کی تہذیب یا ان کے مذہب پر برا اثر ڈالتی ہو یا ان کے جذبات کو مجروح کرتی ہو۔

۶۔ مسلمان اپنے مذہبی مدارس اور مذہبی اداروں میں ممالک اسلامیہ کے ماہرین سے خدمات لینے اور اس غرض کے لیے ان کو بلانے اور ان کا تقرر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ حکومت اس کے خلاف پابندی عاید نہ کرے گی۔

۷۔ مسلمانوں کو کسی ایسی چیز پر مجبور نہ کیا جائے گا جو ان کے مذہب کے خلاف ہو۔ اور نماز کے اوقات میں بالخصوص جمعہ کے لیے ادائے نماز کی غرض سے ان کو چھٹی دی جائے گی۔

۸۔ مذہبی تبلیغ آزاد رہے گی۔

۹۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، ولایت، حضانت، بلوغ، تفریق زوجین، خلع، فسخ نکاح، عنین، مفقود، سفر حج و زیارت، اوقاف کے لیے اسلامی احکام کے خلاف قانون نہ بنایا جائے گا۔ نہ کوئی غیر مسلم ایسے قانون بنانے والی کمیٹی میں شریک ہوگا۔ اور نہ کوئی ایسا قانون اسلامی، مذہبی اداروں کی تصدیق کے بغیر قابل قبول ہوگا۔

۱۰۔ ان تمام امور مذکورۂ دفعات بالا کا اہتمام و انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

اقتصادی اور سیاسی حقوق اور ان کی حفاظت:

چوں کہ مسلم قوم قلت تعداد کے ساتھ تمول اور تعلیم میں بھی بہت پیچھے ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اقتصادی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے حسب ذیل دفعات

کی دستور اساسی میں تصریح کردی جائے۔

۱۔ حق راے دہندگی کا ایک ایسا طریقہ قایم کیا جائے کہ ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق راے دہندوں کی تعداد حاصل ہو جائے۔ ہم ہندوستان کی موجودہ حالت میں حق راے دہندگی کی توسیع تمام بالغوں کے لیے ناقابل عمل پاتے ہیں۔ اس لیے ہماری قطعی راے ہے کہ اس حق کو صرف بالغ مردوں تک محدود رکھا جائے۔

۲۔ پنجاب و بنگال کی اکثریت کی پوری حفاظت کردی جائے۔ کیوں کہ وہ بہت تھوڑی تعداد کی اکثریت ہے۔

۳۔ صوبۂ سرحدی و بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ اور دوسرے صوبوں کے طرز حکومت کے موافق ان دونوں کے قیام حکومت کے لیے فوراً متفقہ سعی شروع کر دی جائے اور اس سعی کو کسی دوسری چیز پر معلق و مشروط نہ رکھا جائے کیوں کہ یہ بہ ہر حال باشندگان صوبۂ سرحد و بلوچستان کا واجبی حق ہے۔

۴۔ صوبہ سندھ کی علاحدگی بلاشرط تسلیم کرلی جائے کیوں کہ یہ کانگریس کے دستور اساسی میں مدت سے تسلیم کی جاچکی ہے اور زبان کے لحاظ سے وہ بہ ہر حال مستحق ہے اور وہاں کی اکثریت اس کا پر زور مطالبہ کررہی ہے۔

۵۔ مرکزی مجلس قانون اور قوت عاملہ میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں اس مطالبے کے خلاف کہا جاتا ہے کہ یہ نیابت باعتبار تناسب آبادی کے اصول کے خلاف ہے۔ نیز ایک ثلث نشستیں مل جانے پر بھی مسلم اقلیت اقلیت ہی رہے گی اس لیے اس مطالبے پر اصرار بے کار ہے۔ مگر پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مسلمان قوم کو اس وقت یہ حق حاصل ہے اور وہ اسے قایم رکھنا چاہتے ہیں اور غیر مسلموں پر اس کا کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا نہ ان کو اپنے حقوق کے خطرہ میں پڑنے کا اس سے کوئی اندیشہ پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کو تسلیم کرلینا حب وطنی کے لیے ضروری ہے اور جب کہ نہرو کمیٹی نے مسلم اقلیتوں کے لیے ان کی آبادی کے لحاظ سے نشستیں محفوظ کردینے کے ساتھ بھی یہ موقعہ رکھا ہے کہ وہ مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کرکے

حاصل کر لینے کا جواز تسلیم کر لینے کی صورت میں پہلے سے باہمی سمجھوتے سے اس کے حصول کی کوشش کوئی غیر معقول نہیں ہے۔ اور اگر ہندو مقابلے میں ہار کر مسلمانوں کے لیے مزید نشستیں دے دینے کے لیے تیار ہیں تو ان کو خوش سے اتنی نشستیں دے دینا جس سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا زیادہ قرین عقل ہے۔

دوسرے خیال کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ ۳/۱ بن کر بھی مسلمان اقلیت ہی میں رہیں گے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ بجائے ۲۵ کے ۳۳ ممبر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اکثریت سے زیادہ اپیل کر سکیں گے۔ اور اس صورت میں ان کی کسی قدر زیادہ ڈھارس بندھی رہے گی۔

۶۔ یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے کہ کسی قانون ساز مجلس میں کوئی مسودۂ قانون، تجویز یا ترمیم یا اضافہ پیش نہ ہو سکے گا۔ اگر مسلم یا غیر مسلم جماعتوں کے ۴/۳ ارکان اس کو اپنی ملت کے مفاد کے خلاف قرار دیں۔

۷۔ صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو باہمی سمجھوتے سے اگر اکثریت کوئی رعایت دے تو اسی نسبت سے غیر مسلم اقلیتیں بھی اپنے صوبوں میں رعایت کی مستحق ہوں گی اور اس باہمی مفاہمت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ بشرطے کہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

۸۔ اقلیتوں کی نشستوں کو محفوظ کر دینے کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس کو دس سال کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک اقلیتیں اس کو ضروری سمجھیں۔

۹۔ ملازمتوں کے لیے ایک کم از کم معیار قابلیت معین کر دیا جائے کہ خوش اسلوبی سے کام ہو سکے اور پھر اس معیار کے ماتحت ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کی ملازمتوں میں حصہ دیا جائے۔

۱۰۔ ہر ملت کو اس کی تعلیم و تہذیب کو فروغ دینے کے لیے سرکاری امداد میں اس کی آبادی کے تناسب سے حصہ دیا جائے۔ اور اس کی ملت کی تعلیم کا انتظام اسی ملت

کے افراد کے سپرد کر دیا جائے۔

۱۱۔ خلقہ ہائے انتخاب ایسے طریقے سے قایم کیے جائیں کہ اکثریت کی حیثیت پر کوئی ناگوار اور مضر اثر نہ پڑے۔

۱۲۔ دولت متحدہ کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی۔ جس کا رسم الخط اردو اور ہندی ہوگا۔

۱۳۔ نیابت متناسبہ کے مذکورۂ بالا اصول تمام انتخابی مجالس میں جاری ہوں گے۔

۱۴۔ جب تک یہ تمام ضمانتیں، دستور اساسی میں داخل نہ ہو جائیں گی اس وقت تک مسلمان انتخاب جداگانہ سے دست بردار نہ ہوں گے اور دستور اساسی کو قبول نہ کریں گے۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ، ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ، فقیر حسرت موہانی، ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ، احمد سعید عفی عنہٗ"

(جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہرو کمیٹی کی رپورٹ ۱۶ راگست ۱۹۲۸ء کو شائع ہوئی جمعیۃ العلماء کے دفتر
کو آل پارٹیز کے یا کانگریس کے دفتر سے کوئی نسخہ نہیں بھیجا گیا،

۲۸ راگست ۱۹۲۸ء مقرر کر کے آل پارٹیز کانفرنس کے لکھنؤ میں انعقاد کا
اعلان کر دیا گیا، جمعیۃ علماء کو لکھنؤ کانفرنس کے لیے کوئی دعوت نامہ موصول نہیں ہوا،
مرکزی خلافت کمیٹی نے جمعیۃ مرکزیہ خلافت کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد
کرنے کا اعلان کر دیا، اسی کے ساتھ مولانا شوکت علی صاحب نے زعماء مسلمین اور
اور اسلامی جمعیتوں سے درخواست کی کہ لکھنؤ میں ایک اجتماع خاص مسلمانوں کا
کر لیا جائے تاکہ مسلم مطالبات کی ترتیب میں آسانی ہو، جمعیۃ علماء نے ایک تو
اس مسلم اجتماع کی شرکت کے ارادے اور دوسرے اس خیال سے کہ شاید آل پارٹیز
کے دفتر سے دعوت نامہ موصول ہو جائے، اور پھر مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کرنے
کے لیے کافی وقت نہ ہو مجلس عاملہ کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد کرنے کا اعلان کر دیا،
اور ارکان کے نام دعوت نامے ۱۹ راگست کو جاری کر دیے،

۲۵ راگست ۱۹۲۸ء کو ارکان جمعیۃ علماء لکھنؤ پہنچ گئے، تاکہ خلافت کے
جلسہ میں شریک ہو سکیں، ۲۵، ۲۶، ۲۷ راگست کو وہ جمعیۃ مرکزیہ خلافت کے

جلسوں میں شرکت کرتے رہے،

۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو مجلسِ عاملہ جمعیۃ العلماء کا جلسہ اور اس کی تجاویز

جمعیۃ علماءِ ہند کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ ۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو ۲½ بجے بعد نماز ظہر منعقد ہوا، اس وقت تک جمعیۃ علماء کو آل پارٹیز یا کانگریس کے دفتر کی طرف سے کوئی دعوت نامہ موصول نہیں ہوا، اور نہ نہرو رپورٹ کا مکمل ترجمہ ملک میں شائع ہوا، انگریزی زبان کے سوا اس وقت تک مکمل رپورٹ کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی تھی،

جمعیۃ علماء کی مجلسِ عاملہ کے اس جلسہ میں ارکانِ ذیل شریک تھے:

۱۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماءِ ہند،

۲۔ مولانا حافظ احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماءِ ہند،

۳۔ مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی،

۴۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، نائب امیر الشریعۃ، بہار،

۵۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب، مالک اخبار "زمیندار" لاہور،

۶۔ مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی،

۷۔ مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب، ناظم مالیات جمعیۃ علماءِ ہند،

۸۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء،

۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی،

یہ تمام حضرات مجلسِ عاملہ کے ارکان ہیں،

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی صدارت میں جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی اور حسبِ ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

تجویز نمبر ۱

جمعیۃ علماءِ ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس اس امر پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ آل پارٹیز کمیٹی نے نہرو رپورٹ کا کوئی نسخہ دفتر کو نہیں بھیجا، اور نہ جمعیۃ علماء کو آل پارٹیز کانفرنس کی شرکت کے لیے دعوت دی، اخبارات میں مکمل رپورٹ شائع نہیں ہوئی اور نہ آل پارٹیز کمیٹی نے ہندوستانی زبان میں اس کا ترجمہ شائع کیا،

تاہم باب سفارشات میں جو چیزیں مذکور ہیں ان میں سے چند اہم بنیادی امور پر یہ جلسہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اور حسبِ ذیل ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کرتا ہے کہ وہ رپورٹ کامل طور سے غور کر کے مکمل تبصرہ کرے، اور وہ تبصرہ جمعیۃ مرکزیہ کے ارکان کی خدمت میں بھیج کر ان کی قطعی رائے حاصل کرے،

جن اہم بنیادی امور پر یہ جلسہ اظہارِ خیال کرتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

(الف) نہرو رپورٹ میں ہندوستان کے لیے حکومت بطرز نوآبادیات کے مطالبہ پر قناعت کی گئی ہے، اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اس میں کسی جماعت کے لیے آزادیِ کامل کی جدوجہد کرنے کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے، تاہم مجلسِ عاملہ کے لیے اس کی تصدیق مشکل ہے، کیونکہ جمعیۃ علماء اپنے اجلاسوں میں ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے، اور جمعیۃ عاملہ کے اختیار سے یہ باہر ہے کہ وہ اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز کی تصدیق کرے،

(ب) نہرو رپورٹ میں صوبوں کے گورنروں اور گورنر جنرل کو کونسلوں اور ایوانوں کے منظور کردہ قوانین کو مسترد کر دینے کا اختیار دیدیا گیا ہے، اور بادشاہ کی منظوری کی شرط اس پر مستزاد کی گئی ہے، جو شخصی استبداد کی قبیح صورت ہے،

(ج) رپورٹ میں صوبوں کے اختیارات بہت محدود رکھے گئے ہیں، اور جو اختیارات ان کو تفویض بھی کیے ہیں ان میں بھی صوبوں کی آزادی تسلیم نہیں کی گئی بلکہ گورنر جنرل کے اختیارات میں اس قدر توسیع کر دی گئی ہے کہ صوبوں کی برائے نام خود مختاری محض ایک کھلونا بن گئی ہے،

حالانکہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور قیام توازن کے لیے صوبوں کی آزادی نہایت ضروری ہے،

(د) رپورٹ میں مختلف اقوام بالخصوص ہندو مسلم تنازعات کے مسئلہ کا کوئی صاف اور مکمل حل نہیں پیش کیا گیا، بلکہ اس مسئلہ کے حل کے لیے ملک کی مشترکہ ذمہ دار جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ مدراس میں جو صورتیں پیش کی تھیں اُن کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے،

(ہ) پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں غیر محفوظ رکھ کر ان کی تھوڑی سی اکثریت کو خطرہ میں ڈال دیا گیا ہے،

(و) صوبۂ سندھ کی علیحدگی کو مشروط کر دیا ہے، حالانکہ وہ کانگریس کی منظور کردہ اور دلائل و براہین سے ثابت شدہ اور سندھ کے باشندوں کی اکثریت کا حتمی مطالبہ تھا، اور تعجب ہے کہ آندھرا، کرناٹک، اُتکل وغیرہ کی علیحدگی کی بغیر کسی شرط کے سفارش کی گئی ہے،

(ز) اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء، کانگریس سب نے اس کو تسلیم کر لیا تھا کہ قانون ساز جماعتوں میں کوئی ایسا بل، ریزولیشن، ترمیم زیر بحث نہ آسکے جس کو کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۳/۴ اکثریت اپنے مذہبی مفاد کے خلاف قرار دے، رپورٹ میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اس کے قائم مقام کوئی دوسرا قاعدہ بھی حفاظت کا نہیں بتایا، حالانکہ ہندوستان کی

آزادی کا مسئلہ اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ اور اس کا اطمینان دلانے پر موقوف ہے،

(ح) مرکزی مجالس میں مسلمانوں کی نمائندگی ۱/۴ کردی گئی ہے، حالانکہ اس وقت ان کو ۱/۳ کی نمائندگی حاصل ہے، جس کا قائم رکھنا ضروری ہے،

(ط) حقِ رائے دہندگی کو دفعۃً اس قدر وسعت دیدی گئی ہے جو ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ناقابلِ عمل ہے، ضرورت تھی کہ سرِ دست حقِ رائے دہندگی بالغ مردوں تک محدود رکھا جاتا،

(ی) مرکزی حکومت کی سرکاری زبان اور رسم الخط کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا،

(ک) صوبہ بلوچستان کی علیحدگی اور مساویانہ حقِ حکومت کا فیصلہ نہیں کیا گیا،

ان مجمل اشارات کے ساتھ اس جلسہ کی قطعی رائے ہے کہ ان حالات میں کہ ۱۵ اگست ۱۹۲۸ء کو رپورٹ شائع ہوئی اور آج ۲۷ اگست تک بھی کسی ہندوستانی زبان میں اس کا مکمل ترجمہ شائع نہیں ہوا، اور ملک کی غالب اکثریت اس کے مضامین سے قطعاً ناواقف ہے، آل پارٹیز کانفرنس کے ۲۸، ۲۹ اگست کے اجلاس میں اس پر کافی غور نہ ہو سکے گا، اور نہ اس کانفرنس کا کوئی فیصلہ ہندوستان کی اکثریت کا فیصلہ ہوگا،

رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرنے کے لیے جو سب کمیٹی معین کی گئی اس کے ارکان حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ صدر جمعیۃ علماءِ ہند
۲۔ ناظم جمعیۃ علماءِ ہند
۳۔ مولانا سید حسین احمد صاحب
۴۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب
۵۔ مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی،

تجویز نمبر ۲:

قرار پایا کہ تجویز (۱) کی نقلیں سکریٹری آل پارٹیز کانفرنس اور اخبارات کو بھیج دی جائیں،

۲۷ اگست سنہ ۱۹۲۸ء کو نقل بھیج دی گئی،

چنانچہ تجویز مذکورہ بالا نمبر ا کی نقل پنڈت جواہر لال نہرو کو بھیج دی گئی، اور ان کی رسید حاصل کر لی گئی اور اسی دن اخبارات کو روانہ کر دی گئی، اور روزنامہ ہمدم لکھنؤ مورخہ ۲۹ اگست میں جو ۲۸ کی شام کو شائع ہو گیا تھا، چھپ گئی،

پنڈت جواہر لال نہرو کا مکتوب

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ تجویز نمبر (۱) و نمبر (۲) پاس کر چکا تھا، مگر ابھی جلسہ جاری تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سکریٹری آل پارٹیز کا ایک خط اس مضمون کا موصول ہوا:

قیصر باغ ۲۷ اگست سنہ ۱۹۲۸ء

مخدومی! تسلیم! اس وقت تک جمعیۃ العلماء کے نمائندوں کی کوئی فہرست دفتر میں موصول نہیں ہوئی، جیسا کہ آپ کو علم ہو گا، کل ۱۲ بجے دن سے آل پارٹیز کانفرنس کی نشست قیصر باغ بارہ دری میں شروع ہو گی، مجھ کو امید ہے کہ آپ کی جماعت اپنے نمائندوں کو کانفرنس کی شرکت کے لیے بھیج رہی ہے، مہربانی فرما کر ان اصحاب کے نام جن کو آپ کی جماعت نے اس جلسہ کی شرکت کے لیے منتخب کیا ہو میرے پاس بھیج دیجیے، ممنونِ عنایت ہوں گا،

رقیمۂ نیاز، جواہر لال نہرو
سکریٹری آل پارٹیز کانفرنس

چونکہ جلسہ جاری تھا، اس لیے یہ خط جلسے کے سامنے پیش کر دیا گیا، جلسے کی متفقہ رائے سے اس کا حسب ذیل جواب اسی وقت دیا گیا،

مہمان خانہ فرنگی محل لکھنؤ ۲۷ر اگست ۱۹۲۸ء

مکرمی! تسلیم! ——— عنایت نامہ موصول ہوا، مجھے افسوس ہے کہ اس سے پہلے آل پارٹیز کمیٹی کی طرف سے کوئی دعوت دفتر جمعیۃ علماء میں موصول نہیں ہوئی، بلکہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ بھی دفتر جمعیۃ علماء کو نہیں بھیجی گئی،

اب وقت کے وقت جمعیۃ علماء اپنے نمائندے آل پارٹیز کانفرنس کے لیے منتخب نہیں کر سکتی، جمعیۃ عاملہ کی پاس کردہ تجویز جو ابھی اس نے منظور کی ہے خدمت میں بھیجی جا رہی ہے،

محمد کفایت اللہ

اسی روز یعنی ۲۷ر اگست کو بعد عصر گنگا پرشاد میموریل ہال میں مسلم جماعتوں کا مشترکہ جلسہ تھا، اس جلسہ میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند اور جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، اور ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مولانا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو آل پارٹیز کانفرنس کی جانب سے دعوت نامہ موصول نہ ہونے کی شکایت ہے، اس لیے آپ کانفرنس میں شرکت کا ارادہ نہیں رکھتے،

مفتی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ واقعہ ہے کہ آل پارٹیز کے دفتر سے نہ تو جمعیۃ علماء کو رپورٹ بھیجی گئی اور نہ دعوت نامہ موصول ہوا، ان حالات میں آپ ہی فرمائیے کہ جمعیت کے نمائندے کس حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا، مولانا آپ یقین کیجئے کہ اس کانفرنس کے لیے

کوئی دعوت نامے جاری نہیں ہوتے، صرف اخبارات میں اعلان کر دیا گیا ہے، اور جمعیۃ علماء کو پہلے آل پارٹیز کے اجلاس دہلی کی دعوت دی گئی تھی، اور وہ ان جماعتوں میں داخل ہے جو آل پارٹیز میں مدعو تھیں، اس لیے آپ کانفرنس میں ضرور شریک ہوں،

مفتی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے تو اس وقت یہ بھی یاد نہیں کہ دہلی میں فروری کے جلسہ کی بھی کوئی دعوت دی گئی تھی؛ نیز اگر ایسا ہوتا تو جمعیۃ علماء کا نام اس فہرست میں تو ہوتا جو رپورٹ میں بحیثیت مدعو جماعتوں کے ذکر کی گئی ہیں، مگر ان مدعو شدہ جماعتوں میں جمعیۃ علماء کا نام رپورٹ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے،

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ رپورٹ میں جمعیۃ علماء کے نام کا اندراج دفتری غلطی سے رہ گیا، ورنہ جمعیۃ علماء کو دعوت ضرور دی گئی ہے،

اصل واقعہ

اصل واقعہ یہ ہے کہ گو مجھے لکھنؤ میں یہ یاد نہیں تھا کہ فروری گذشتہ میں کوئی دعوت نامہ موصول ہوا تھا، مگر دفتر جمعیۃ میں دیکھنے سے بعد کو معلوم ہوا کہ ۷ رفروری کا لکھا ہوا ایک خط دفتر جمعیۃ میں ۹ فروری سنہ ۱۹۲۸ء کو وصول ہوا تھا، جس کا مضمون یہ تھا:

دریا گنج، دہلی ۷ رفروری سنہ ۱۹۲۸ء

محترم جناب سکریٹری صاحب جمعیۃ علماءِ ہند دہلی،

السلام علیکم! ڈاکٹر انصاری صاحب صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ

آپ جلد از جلد جمعیۃ علماء کے چند نمائندے منتخب کر کے اس غرض کے
لیے نامزد فرمائیں کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ساتھ ہندوستان
کے لیے ایک قانون ترتیب دینے والی کانفرنس میں شریک ہوں،
کانفرنس مذکورہ ۱۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو ۱۱ر بجے صبح بمقام دریا گنج
میں منعقد ہوگی، نیاز مند محمود علی خاں، پرائیویٹ سکریٹری
ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

اس خط کا دفتر سے یہ جواب دیا گیا تھا کہ:

"آج ۹ر فروری کو جناب کا خط موصول ہوا ہے، اور ۱۲ر فروری کو
کانفرنس کا اجلاس ہونے والا ہے، صرف ۱۰، ۱۱ کے دو روز درمیان
میں ہیں، نمائندے منتخب کرنا جمعیۃ عاملہ یا مرکزیہ کا کام ہے، ان
دونوں میں سے کسی کا اجلاس طلب کرنا اس تنگ وقت میں ناممکن
ہے، اس لیے جمعیۃ علماء کی نیابت اس کانفرنس میں نہیں ہو سکتی"

اس کے بعد نہ تو ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط آیا نہ کسی اور ذریعہ سے کوئی اطلاع ملی؛

۱۲ر فروری کو جب کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا تو مولانا حسین احمد صاحب
ایک نجی ضرورت سے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر گئے، اور ان کے ساتھ مفتی
محمد کفایت اللہ صاحب بھی تھے، وہاں مولانا محمد شفیع صاحب داؤدی نے
دونوں کو بٹھا لیا، تھوڑی دیر بیٹھے اور انگریزی میں تقریریں ہونے کے باعث
دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے ایک گھنٹہ بعد دونوں چلے آئے،

اس کے بعد آل پارٹیز کے مارچ اور مئی کے اجلاسوں میں نہ جمعیۃ کو بلایا گیا،
نہ کوئی اطلاع دی گئی، نہ جمعیۃ کا کوئی ممبر جمعیۃ علماء کی طرف سے شریک ہوا،
پھر جب جولائی کے آخری ہفتہ میں یہ اعلان ہوا کہ ۱۰ر اگست کو نہرو کمیٹی

کی رپورٹ شائع ہو جانے گی تو یکم اگست کو مولانا احمد سعید صاحب نے ڈاکٹر انصاری صاحب کے نام حسب ذیل خط لکھا:

۱۴ر صفر، مطابق یکم اگست ۱۹۲۸ء

محترم بندہ جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم!

آل پارٹیز کانفرنس کا فیصلہ (رپورٹ) ۱۰ر اگست تک شائع ہو رہا ہے، یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ یہ فیصلہ تمام جماعتوں کے پاس بھیجا جائے گا، تاکہ وہ جماعتی حیثیت سے اس پر غور کر سکیں،

مجھے اس سلسلہ میں یہ امر ضروری طور پر گذارش کرنا ہے کہ اس فیصلہ کی اردو نقول بھی کانگریس کی طرف سے شائع کرادی جائیں کیونکہ جو تراجم اخبارات میں شائع ہوتے ہیں وہ باہمی اختلافات کے باعث صحیح مفہوم کو خبط کر دیتے ہیں، میں نہایت ممنون ہوں گا اگر جناب جمعیۃ علماء کے لیے اس فیصلہ کی نقل اردو میں روانہ فرمائیں گے، تاکہ اراکینِ جمعیۃ کو تعیینِ مفہوم میں دقت اور دشواری نہ ہو"

احمد سعید سکریٹری جمعیۃ علماء ہند

اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا، پھر جب ۱۶ر اگست کو رپورٹ شائع ہوئی تو اس کا کوئی نسخہ دفتر میں نہیں آیا، اور نہ اردو ترجمہ شائع ہوا، اور رپورٹ میں جن جمعیتوں اور جماعتوں کو دعوت دینے کا ذکر تھا اور ان کی فہرست دی گئی تھی اس فہرست میں بھی جمعیۃ علماء ہند کا نام نہیں تھا، اس تمام روئیداد کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا ہر شخص کے لیے آسان ہے کہ ۲۷ر اگست ۱۹۲۸ء کو جمعیۃ علماء نے لکھنؤ کانفرنس کے لیے اپنے نمائندے منتخب نہ کرنے کا جو فیصلہ تجویز ۱۱ میں کیا تھا وہ درست تھا، اور اس میں جمعیۃ عاملہ حق بجانب تھی،

مکتوبِ دعوت

اس کے بعد لکھنؤ میں ۲۸ر اگست ۱۹۲۸ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کا حسبِ ذیل خط موصول ہوا:

۲۸ر اگست ۱۹۲۸ء

قیصر باغ، بارہ دری

مکرمی جناب مولانا صاحب!

مجھے معلوم ہوا ہے کہ مختلف جماعتوں کے نام دعوت ناموں کے اجرا میں کچھ غلطیاں ہو گئی ہیں، مجھے آپ کی ذات سے توقع ہے کہ آپ میری اس فرو گذاشت کو معاف فرمائیں گے کہ آپ کی جمعیۃ کو اطلاع دینے میں دیر ہوئی،

آپ کے ٹکٹ مولانا شوکت علی صاحب کو دیدیے گئے ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ کانفرنس میں تشریف لائیں گے،

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

اس خط کے ساتھ دس ٹکٹ بھی موصول ہوئے،

اس خط کے موصول ہونے پر جمعیۃ عاملہ کا جلسہ منعقد ہوا، اور اس میں غور و بحث کے بعد طے ہوا کہ کانفرنس میں شرکت کی جائے، چنانچہ دس نمائندوں کا انتخاب کر دیا گیا، اور ۲۷ر اگست کی منظور کردہ تجویزیں بطور لائحہ کے متعین کر دی گئیں، دس نمائندے حسب ذیل تھے:

۱۔ مفتی کفایت اللہ صاحب
۲۔ مولانا احمد سعید صاحب
۳۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب
۴۔ مولانا عبد الحلیم صاحب

۵۔ مولانا محمد عرفان صاحب ۸۔ مولانا ریاست حسین صاحب رامپوری

۶۔ مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی ۹۔ مولانا سید حسین احمد صاحب

۷۔ مولانا محمد شفیع صاحب انصاری فرنگی محل ۱۰۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی

یہ نمائندے ۲۸ اگست کی کانفرنس میں شریک ہوئے، اور شکریہ کے ساتھ پہلے ریزولیشن کی اس شرط کے ساتھ تائید کی کہ رپورٹ کے قابلِ بحث نکات پر حقِ بحث محفوظ رکھتے ہوئے ہم رپورٹ مرتب کرنے والوں کی محنت و سعی کا شکریہ ادا کرتے ہیں،

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب صدر اجلاس نے اعلان کیا کہ چونکہ اس کانفرنس میں جمعیتوں کے نمائندے اپنی جمعیتوں کی طرف سے فیصلہ کرنے کے اختیارات لے کر نہیں آئے ہیں اس لیے رائے شماری جمعیتوں کی حیثیت سے نہ ہوگی، بلکہ رائے دینے والے اپنی ذاتی حیثیت سے رائے دیں گے، اور کوئی جمعیۃ اس کانفرنس کے فیصلے کی پابند نہ ہوگی،

اس کے بعد دوسرا ریزولیوشن جب پیش ہوا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کانفرنس ڈومینین سٹیٹس کے طرز کی حکومت جس کی رپورٹ میں تائید کی گئی ہے منظور کرتی ہے اس ریزولیوشن پر بحث کے درمیان مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے جمعیۃ علماء کی طرف سے اعلان کیا کہ جمعیۃ علماء کا نصب العین کامل آزادی ہے، اس لیے جمعیۃ علماء کے نمائندے اس تجویز کی تائید کرنے سے معذور ہیں، اور وہ اس تجویز پر رائے نہ دیں گے،

اس کے بعد تجاویز کا جو مسودہ تقسیم ہوا اس میں تجویز یہ بھی تھی کہ یہ کانفرنس نہرو رپورٹ کی سفارشوں کو دفعہ ۱ سے دفعہ ۸۷ تک تسلیم کرتی ہے، اس تجویز کو دیکھ کر نمائندگانِ جمعیۃ علماء نے ڈاکٹر انصاری صدر اجلاس کے نام ایک خط لکھا،

جس کا مضمون یہ تھا:

لکھنؤ، مہمان خانہ فرنگی محل ۲۹ اگست ۲۸ء

بخدمت جناب پریسیڈنٹ صاحب آل پارٹیز کانفرنس!

تسلیم! گذارش ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی اس تجویز سے جو ارسال خدمت ہو چکی ہے جمعیۃ علماء کے نمائندے اس بات کے پابند ہو چکے ہیں کہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق اس وقت تک کوئی رائے ظاہر نہ کریں جب تک جمعیۃ عاملہ کی مقرر کردہ کمیٹی کا مفصل تبصرہ سامنے نہ آجائے،

نیز ہم نے آل پارٹیز کانفرنس میں پیش ہونے والے ریزولیوشنوں کے شائع شدہ مسودہ میں دیکھا کہ تمام سفارشات کو دفعہ ۱ سے دفعہ ۸۷ تک ایک ہی مرتبہ منظور کرانے کی تجویز لکھی گئی ہے، حالانکہ ہمارے خیال میں ضروری تھا کہ سردست اصول کلیہ طے کر لیے جاتے اور باقی مضامین پر غور کرنے کے لیے کافی وقت دیا جاتا، اور دوبارہ آل پارٹیز کانفرنس کو بلا کر دفعہ وار پیش کر کے پاس کرایا جاتا،

ان وجوہ سے ہم جناب والا کو اطلاع دیتے ہیں کہ نمبر ۲ سے بعد کے ریزولیوشنوں کے متعلق جمعیۃ علماء کے نمائندے کوئی رائے نہ دیں گے، براہِ کرم ہماری اطلاع کو ریکارڈ میں لے آئیں،

محمد کفایت اللہ

یہ خط مولانا حسین احمد صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا اور ۳۰ اگست کی صبح کو اکثر نمائندے لکھنؤ سے واپس چلے آئے، اور جمعیۃ علماء کی نمائندگی کانفرنس میں نہ رہی، اگر اس کے بعد کوئی نمائندہ شریک رہا تو وہ ذاتی حیثیت سے شریک رہا، جیسے کہ بہت سے لوگ اسی طرح شریک اجلاس تھے،

تنقید و تبصرہ

نہرو کمیٹی کی آئینی حیثیت

۱۔ نہرو رپورٹ کے باب اول میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ آل پارٹیز کمیٹی کا تقرر مدراس کانگریس کی تجویز کے ماتحت ہوا تھا، اور آل پارٹیز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں منعقد ہو کر ۲۲ر فروری تک ہوتا رہا، اور ۲۲ر فروری کو اس نے ایک کمیٹی مقرر کر دی، جس کو دستور اساسی کا خاکہ تیار کرنے اور اہم ابواب کے متعلق سفارشیں کرنے کی ہدایت کی گئی تھی، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ اور دستور اساسی کا خاکہ پیش کر دیا، مگر اس رپورٹ اور مسودۂ دستور پر آل آل پارٹیز کا وہ جلسہ جو ۸ر لغایت ۱۱ر مارچ دہلی میں منعقد ہوا، اس وجہ سے غور نہیں کر سکا کہ مسلم لیگ نے آل پارٹیز کی تجاویز سے ناپسندیدگی اظہار کر دیا تھا اور آل پارٹیز میں شرکت سے علیحدگی اختیار کی تھی، نہرو رپورٹ کی عبارت یہ ہے:

> "۲۲ر فروری کو جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی رپورٹ پر مسلم لیگ کے نمائندوں کے اس فیصلہ کی وجہ سے کہ وہ مباحثہ میں کوئی حصہ نہ لیں کوئی غور نہ کیا جا سکا، کانفرنس نے رپورٹ کے شائع کرنے اور گشت کرانے کا حکم دیدیا، اور ۱۹ر مئی تک کے لیے ملتوی ہو گئی"

اس عبارت کا صاف مفاد یہ ہے کہ ۲۲ر فروری کو آل پارٹیز کانفرنس نے جو کمیٹی بنائی تھی اور اس کو دستور اساسی کا مسودہ تیار کرنے کا اختیار دیا تھا، اور

اس نے دستور اساسی کا مسودہ اور رپورٹ تیار کر کے پیش بھی کر دی، مگر اسس باقاعدہ اور با اختیار کمیٹی کی تیار شدہ رپورٹ اور مسودہ پر اس وجہ سے غور نہیں ہوسکا کہ مسلم لیگ نے بحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا، تو اس کا نہایت واضح اور صاف نتیجہ یہ ہے کہ کسی ایسی کمیٹی کا تیار کردہ مسودہ آل پارٹیز کے نزدیک ہرگز قابلِ غور نہ ہونا چاہیے جس کمیٹی کی تشکیل میں ہی مسلم لیگ شریک نہ ہو،

اور یہ امر واضح ہے کہ ۱۹ رمئی کے آل پارٹیز کے جلسہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے شرکت نہیں کی، اور نہ وہ اپنی کونسل کی ۵، ۱۶ مارچ ۱۹۲۸ء کی منظور کردہ تجویز کے ہوتے ہوئے یہ شرکت کر سکتی تھی، مسٹر محمد یعقوب صدر اجلاس مسلم لیگ کلکتہ نے پریس میں مسلم لیگ کی عدم شرکت کا اعلان بھی کر دیا تھا، جو ۱۵ رمئی کے "ہمدرد" کے صفحہ ۵ پر شائع ہو چکا ہے، اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اس صورتِ حالات کے ماتحت ان کو (صدر مسلم لیگ کو) بے حد افسوس ہے کہ وہ آئندہ دستورِ اساسی کی ترتیب و تدوین اور اسس کی متعلقہ کارروائی میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتے"۔

پس اس اصولی اعتراف کی بناء پر جو نہرو رپورٹ میں موجود ہے نہرو کمیٹی کی تشکیل ہی صحیح نہیں ہوئی،

۲۔ ۱۱ مارچ کو آل پارٹیز کانفرنس نے دہلی کے اجلاس میں حسب ذیل تجویز منظور کی تھی:

تجویز نمبر ۵:

"کانفرنس نے جو کمیٹی ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء کو مقرر کی تھی اس کی رپورٹ پیش ہوئی اور یہ طے پایا کہ مذکورہ رپوٹ شائع کی جائے، اور اس کو مختلف سیاسی، اقتصادی، لیبر اور فرقہ وارانہ انجمنوں میں

تقسیم کیا جائے، اور اس کے متعلق یکم مئی ۱۹۲۸ء تک رائیں اور
مشورے لیے جائیں، اور تمام معاملے کو کانفرنس کے آئندہ جلسے
میں پیش کیا جائے، جو ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوگا،
مزید طے پایا کہ مذکورہ انجمنوں میں سے ہر ایک سے درخواست
کی جائے کہ کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں اپنے نمائندوں کو ضروری
اور پورے اختیارات دے کر بھیجے تاکہ کانفرنس میں تمام معاملات کے
متعلق صلاح و مشورہ اور مفاہمت کر سکیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان
کی انجمنیں ان مفاہمتوں کی تصدیق کریں"

ہمدرد، صفحہ ۵، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۲۸ء

جہاں تک جمعیۃ علماء کا تعلق ہے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس تجویز پر
عمل درآمد نہیں کیا گیا، یعنی

(۱) کمیٹی کی رپورٹ دفتر جمعیۃ کو نہیں بھیجی گئی،
(۲) جمعیۃ سے بمبئی کے اجلاس میں نمائندوں کو اختیارات دے کر بھیجنے
کی کوئی استدعا تو کجا اجلاس کی اطلاع بھی نہیں دی گئی،

ہمارا خیال ہے کہ اس ریزولیوشن پر عمل نہیں کیا گیا، اور اسی وجہ سے انجمنوں
کی رائیں اور مشورے بمبئی کے جلسے میں پیش نہیں کیے گئے، اس لیے ۱۱ مارچ
کی تجویز اور ۲۲ فروری والی کمیٹی کی رپورٹ بجائے خود قائم ہے، بمبئی کے
جلسے نے اس رپورٹ کے متعلق کوئی تجویز پاس نہیں کی، بلکہ خلاف اصول
ایک اور کمیٹی بنا دی گئی،

لکھنؤ کانفرنس کی اصولی حیثیت

نہرو رپورٹ کے باب اول میں بمبئی کے ۱۹ مئی کے جلسے کی جو تجویز نقل

کی ہے، اس میں ارکانِ نہرو کمیٹی کے ناموں اور ان کے تقرر کا ذکر کرنے کے بعد یہ الفاظ ہیں :

"تاکہ وہ آئندہ یکم جولائی سے پیشتر آئینِ ہند کے اصولوں پر غور کرے، اور انھیں متعین کرے، پھر مسودہ رپورٹ کو مختلف انجمنوں میں اظہار رائے کے لیے بھیجے "

پھر آخری الفاظ یہ ہیں :

"آل پارٹیز کانفرنس دوبارہ اگست ۱۹۲۸ء کے شروع میں کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے جمع ہوگی "

اس بنیادی تجویز میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں :

(۱) مسودہ رپورٹ کو اظہار رائے کے لیے مختلف انجمنوں میں بھیجنا،

(۲) اور اشاعتِ مسودہ کے بعد رپورٹ پر غور و فکر و اظہار رائے کے لیے کم از کم ایک مہینہ کا فاصلہ دے کر کانفرنس منعقد کرنا،

مگر واقعہ یہ ہے کہ نہرو رپورٹ ۱۶ر اگست کو شائع ہوئی، اور جمعیۃ علماء کو تو یقیناً اور ڈاکٹر صاحب کے بیان کے موافق کسی انجمن کو اظہار رائے کے لیے نہیں بھیجی گئی، اور کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا، اور اس تمام کارروائی پر مستزاد یہ کہ بجائے کم از کم ایک ماہ کے فاصلہ کے ۱۲ روز کے بعد کانفرنس بلالی گئی، لہٰذا لکھنؤ کانفرنس بھی اس بنیادی تجویز کے خلاف اور بے قاعدہ ہوئی،

اگر رپورٹ کی تیاری یکم جولائی سے پیشتر معقول وجوہات کی بناء پر نہ ہوسکی تھی تو مضائقہ نہ تھا، مگر جس قدر تاخیر اس کی اشاعت میں ہوئی تھی اسی قدر تاخیر انعقاد کانفرنس میں کر کے غور و فکر و اظہار رائے کے زمانہ کو پورا کرنا ضروری تھا،

اور اس بنیادی تجویز کے ماتحت کانفرنس کا انعقاد ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں ہونا چاہیے تھا،

لکھنؤ کانفرنس ایک محدود پبلک کانفرنس بن گئی تھی،

لکھنؤ کانفرنس میں صدر اجلاس نے شکریہ کے پہلے ریزولیشن کے بعد ہی جب یہ اعلان کر دیا کہ رائے شماری جماعتوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ انفرادی حیثیت سے ہوگی تو وہ کانفرنس آل پارٹیز کانفرنس کی حیثیت سے نکل کر ایک محدود پبلک کانفرنس ہو گئی، اور اس کے فیصلے آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلے نہیں ہو سکتے، اور ابھی تک اس رپورٹ کی صولی حیثیت یہ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کی منظوری اسے حاصل نہیں ہوئی ہے،

نہرو کمیٹی کی رپورٹ اور لکھنؤ کانفرنس کی روئیداد میں جانبداری یا فرقہ وارانہ احساس کی جھلک

ہم دیکھتے ہیں کہ نہرو کمیٹی نے رپورٹ کی ترتیب بھی اس انداز سے کی ہے جس میں فرقہ وارانہ جھلک موجود ہے، اور مسلمانوں کے مطالبات کو کمزور کرنے یا اُن پر تعریض کرنے یا ان کی وقعت گھٹانے یا مسلم قومیت کو فرقہ وارانہ مناقشات کا ذمہ دار ٹھہرانے کی نہایت ہوشیاری سے کوشش کی گئی ہے جو ہمارے لیے تکلیف دہ ہے،

(۱) باب اول میں "مختصر تاریخ" کے عنوان میں گوہاٹی کانگریس سے ابتدا کی گئی، اور فرقہ وارانہ منافرت کا ایک اندوہناک منظر پیش کرنے کے لیے ایسے واقعہ کو ذکر کیا گیا جس کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی جاتی ہے، حالانکہ فرقہ وارانہ منافرت ۱۹۲۳ء سے شروع ہوئی ہے، اور گوہاٹی کانگریس

سے پہلے کتنے ہی واقعے ایسے ہو چکے تھے جن میں بیسیوں جانیں ضائع ہوئیں، اور جائیدادیں جلائی گئیں، اور طرح طرح کی تباہیاں آئیں، اور ان کی وجہ سے دہلی میں یونیٹی کانفرنس بیٹھی، گاندھی جی نے اکیس روز برت رکھا، وغیرہ وغیرہ،

مناسب تو یہ تھا کہ اس وقت سے سعیِ اتحاد کا ذکر کیا جاتا، اور لیڈروں کی مساعی اور مختلف مجالس کی تجویزیں بھی سامنے لائی جاتیں، لیکن اگر گوہاٹی کانگریس سے ہی شروع کرنا کسی وجہ سے ضروری تھا تاہم اس عبارت کے بجائے "نیشنل گوہاٹی کانگریس کا اجلاس دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں ایسے زمانہ میں ہوا جب کہ ایک سخت اندوہناک حادثہ نے فضا کو مکدر کر دیا تھا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات و مناقشات زوروں پر تھے"

یہ عبارت یوں ہونی چاہیے تھی جو ادائے مطلب کے بالکل کافی تھی:

"نیشنل کانگریس گوہاٹی کا اجلاس دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں ایسے زمانہ میں ہوا جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات و مناقشات پورے زوروں پر تھے"

یعنی اوپر کی عبارت میں خط کشیدہ فقرہ بالکل نہ ہونا چاہیے تھا، اور اس کے ساتھ یہ فٹ نوٹ:

"سوامی شردھانند کو ان کے بستر علالت پر ایک مسلمان مذہبی دیوانے نے قتل کر دیا تھا"

بھی بالکل حذف کر دینا چاہیے تھا،

ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایک دستوری دستاویز میں قصداً یا ضمناً بھی ایسی چیز نہ آنی چاہیے تھی جس سے یہ استنباط کیا جا سکے کہ فرقہ وارانہ جذبات اور ان کو انتہائی حد تک پہنچانے کی ذمہ داری کسی ایک فرقہ پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات

اس رپورٹ کے موضوع سے قطعاً بے تعلق ہے،

(۲) رپورٹ کے باب دوم میں (اردو رپورٹ صفحہ ۲۸) پر یہ عبارت درج ہے:

"کُل ہندوستان میں چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لیے انھیں خوف ہے کہ اکثریت انھیں دِق کرے گی، اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے ایک عجیب تجویز پیش کی ہے، یعنی یہ کہ کم ازکم ہندوستان کے بعض حصّوں میں اُن کا غلبہ رہے، ہم اس جگہ پر ان کے اس مطالبہ پر تنقید کرنا نہیں چاہتے، ممکن ہے کہ فرقہ وارانہ فضا پر نگاہ کرتے ہوئے اس میں کوئی جواز کا پہلو ہو"

اوّل تو مسلمانوں کی کسی جماعت نے ان الفاظ میں یہ مطالبہ پیش نہیں کیا، بعض مسلمانوں نے انفرادی طور پر اس عنوان سے ذکر کیا ہو، تو وہ قابلِ ذکر نہیں تھا،

دوم مسلمانوں نے کسی جبری اکثریت یا غلبہ کا مطالبہ نہیں کیا ہے، کہ خواہ مخواہ اُن کو اکثریت دیدی جائے،

سوم یہ مطالبہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے تین مطالبوں کا نتیجہ ہے، وہ تین مطالبے یہ ہیں:-

۱۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی جو اکثریت ہے وہ قائم رکھی جائے،
۲۔ صوبہ سرحدی و بلوچستان میں مسلم اکثریت تو ہے، مگر دونوں صوبوں کا طرزِ حکومت باقی صوبوں کی طرح کر دیا جائے،
۳۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے،

ان تینوں مطالبوں میں سے پہلے دو مطالبے تو رپورٹ میں بھی معقول قرار دیے گئے، ان کے متعلق تو لفظ عجیب تجویز یا فی حدِ ذاتہ ناجائز و غیر معقول

کے الفاظ واضعینِ رپورٹ نے کہے نہیں ہوں گے، تو صرف تیسرا یعنی علیحدگی سندھ کا مطالبہ باقی رہ جاتا ہے، مگر رپورٹ میں اصولاً اس کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، اور علیحدگی کے دلائل کو قوی قرار دیا گیا ہے، پھر حیرت ہے کہ جب کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت طبعی طور پر موجود ہے، اور ان کا مطالبہ اس اکثریت کو قائم رکھنے کا ہے تو یہ مطالبہ عجیب تجویز اور صرف فرقہ وارانہ فضاء کی بناء پر ممکن الجواز ورنہ ناجائز کیسے ہو گیا؟

کیا ہم یہ سمجھیں کہ چونکہ نہرو کمیٹی کو سندھ کی بلا شرط علیحدگی کا فیصلہ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ہندو مہاسبھا سے مرعوب ہو کر کانگریس کمیٹی، کانگریس ورکنگ کمیٹی، کانگریس کی صوبوں کی تقسیم قدیم، مدراس کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء کے فیصلوں کے خلاف سندھ کی علیحدگی کو مشروط کرنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے اس مضمون کو ایسے انداز میں بیان کیا کہ پڑھنے والے ان الفاظ........ سے متاثر ہو کر نہرو کمیٹی کے فیصلے کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیں،

۳۔ ترجمہ نہرو رپورٹ کے ساتھ لکھنؤ کانفرنس کی روئداد کا جو ضمیمہ شائع ہوا ہے اس میں ڈومینین اسٹیٹس کے ریزولیوشن پر بحث کے بیان میں یہ ظاہر نہیں کیا کہ جمعیۃ خلافت کی طرف سے مولانا محمد شفیع داؤدی نے اور جمعیۃ علماء کی طرف سے مولانا محمد کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ علماء حکومت بطرز نو آبادیات کی تائید نہیں کر سکتیں، کیونکہ ان دونوں کا نصب العین مکمل آزادی ہے، تجویز کے مؤیدین کے ساتھ ان دونوں کو ذکر کر کے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ انھوں نے بحث میں حصہ لیا، اور یہ صریح تلبیس ہے، حالانکہ ان دونوں نے تقریر کے ساتھ تحریری

بیان بھی صدر کانفرنس کو دیدیا تھا، اور ریکارڈ میں لانے کی درخواست کی تھی اور وعدہ بھی کر لیا گیا تھا،

۴۔ کانفرنس کی کارروائی میں صدر کانفرنس کا یہ اعلان ذکر نہیں کیا گیا کہ کانفرنس میں رائے شماری جماعتوں کی حیثیت سے نہیں ہوئی، بلکہ شخصی اور انفرادی طور پر ووٹ لیے گئے، حالانکہ کانفرنس کی حیثیت واضح کرنے کے لیے یہ ظاہر کر دینا سخت ضروری تھا،

۵۔ کانفرنس میں شامل ہونے والی جمعیتوں کے نام لکھے گئے ہیں، ان میں جمعیۃ علماء کا نام بھی درج ہے، لیکن روئداد میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ جمعیۃ علماء کے نمائندے ۲۹ راگست کو صدر کانفرنس کو اطلاع دے کر کانفرنس سے چلے گئے، اور ریزولیوشن نمبر ۲ کے بعد کی تمام کارروائی میں جمعیۃ علماء کی بحیثیت جماعت شرکت نہیں رہی،

متحدہ قومیت؛

اس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی ملک کو یہ بات حاصل ہو کہ اس کے تمام باشندے ایک مذہب کے پابند ہوں اور ایسی جماعتیں نہ ہوں جن کی تہذیب، طرزِ معاشرت، اخلاق، عادات، نسل اور زبانیں، جذبات و حسیات متباین و متضاد ہوں تو وہ بڑا خوش قسمت ہوگا،

نیز اگر کسی ملک کے باشندے مختلف مذہب تو رکھتے ہوں لیکن وہ حقیقۃً اپنے اپنے مذہب کے پرستار نہ ہوں اور مذہب کی بناء پر ان میں جنگ و جدل نہ ہو، بلکہ صرف سیاسی خیالات کی بناء پر اختلافات رکھتے ہوں، اور مذہب کو سیاسیات میں دخل نہ دیتے ہوں، تو وہاں بھی سیاسی ارتقاء کے لیے جمہوری اصول کی بنیاد پر قوانین وضع کیے جا سکتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کو یہ دونوں

حیثیتیں حاصل نہیں ہیں، نہ تو یہاں حجاز و نجد کی طرح ایک مذہب رکھنے والی قوم آباد ہے، بلکہ اتنی مختلف العقائد اور متباین و متضاد مذاہب کی ماننے والی قومیں آباد ہیں جن کے مذہبی خیالات، رسم و رواج، تہذیب و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے، اور نہ یہاں کی بڑی اور اہم قومیں اپنے مذہبی عقائد کو کسی حالت میں بھی نظر انداز کرنے اور صرف سیاسی خیالات کے لحاظ سے بحث و نظر کرنے کے لیے تیار ہیں، مسلمان تو اس لیے کہ ان کا مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں نہیں ہیں، اور ہندو اس لیے کہ وہ مذہبی عقائد اور مذہبی رسم و رواج کو اپنی قومیت کا بہترین محافظ خیال کرتے ہیں،

اس موقع پر ہم ہندو مہاسبھا کے ایک ذمہ دار افسر کا قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جس نے مذکورہ بالا نظریہ کی صراحت کر دی ہے، ڈاکٹر مونجے نے آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں ہندو مہاسبھا کی پوزیشن ان الفاظ میں واضح کی تھی:

> "جہاں تک ہندوؤں کے ملی معاملات کا تعلق ہے ہندو مہاسبھا فرقہ وارانہ جماعت ہے، اور جہاں تک ملکی معاملات کا تعلق ہے وہ کانگریس کی ہمخیال ہے"

(ہمدرد مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۲۸ء صفحہ ۵)

پس یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کا اول اور اعلیٰ درجہ کہ تمام باشندے ایک ہی مذہب کے پابند ہوں، قدرۃً اور فطرۃً حاصل نہیں ہے،

اور دوسرا درجہ کہ مختلف مذاہب کے پابند اپنے اپنے مذاہب کو پس پشت ڈال کر اور ملک کے ارتقا میں مذاہب سے بالکل قطع نظر کرکے شریک ہوں، یہ درجہ بھی ہندوستان کو حاصل نہیں ہے، اور ڈاکٹر مونجے کا مذکورہ بالا اعتراف اور ماضی قریب میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ ہنگامے، قربانیٔ گاؤ کے خلاف

بلوے، مساجد کے سامنے باجے بجانے پر لڑائیاں اس کی شاہد عادل ہیں،

ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ فرقہ وارانہ مناقشات سخت مذموم اور وطن کی آزادی کے لیے سمِ قاتل ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان کے دستورِ اساسی بنانے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان حالات کو نظر انداز نہ کریں، اور ایک امرِ واقعہ کو کالعدم فرض کرکے وہ اصول عائد نہ کردیں جو اُن واقعات کے نہ ہونے کی صورت میں عقلی یا جمہوری یا قومیتِ متحدہ کے نام سے عائد کیے جا سکتے تھے،

قومیتِ متحدہ باہمی شفقت و محبت، اطمینان و اعتماد، صُلح و رواداری کی فضاء پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے، دستور اور قانون کی گرفت سے نہیں ہو سکتی، دستور اور قانون کا منصب یہ ہے کہ وہ ہر اقلیت بلکہ ہر ہر فرد کے حقوق کی حفاظت کرے، اور اس کے لیے دفعات بنائے، تاکہ کوئی زبردست زیر دست پر ظلم نہ کر سکے،

ہندوستان کا دستور اس نظریہ کو سامنے رکھ کر بنانا ہے کہ نہ یہاں ایک مذہب کے باشندے آباد ہیں اور نہ مختلف مذاہب کے پابند مذہبی مناقشات اور جنگ و جدل کو چھوڑ چکے ہیں، بلکہ ان میں مذہبی مناقشات کا بازار گرم ہے، اور خدا جانے کب تک گرم رہے گا، لہٰذا دستور میں ایسے دفعات لازمی طور پر رکھے جانے چاہئیں کہ اکثریت اقلیت پر ظلم و زیادتی نہ کر سکے، اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنے حقوق کے حصول پر مطمئن ہو،

سارداایکٹ پر تنقید کی ایک نظر

(۱۹۲۹ء)

اسلامی شریعت کے دفاع

میں

جمعیت علماے ہند کا ایک تاریخی قدم

ازقلم

حضرت مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان

کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد! بزرگانِ ملت و معززین حاضرین! آج آپ حضرات کا اجتماع اس لیے ہوا ہے کہ ایک مرتبہ پھر سارد ا ایکٹ کے خلاف آپ اپنے صحیح جذبات و حسیات کا اظہار کریں، اور یہ عہد کرکے اٹھیں کہ اگر اربابِ حکومت نے اپریل سے پہلے اس ناپاک قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں کیا تو پھر ہم اس قانون کو بھی نافذ نہ ہونے دیں گے، اور حکومت کو ہر ممکن طریقہ سے مجبور کریں گے کہ وہ اس قانون کو بحقِ اہلِ اسلام منسوخ کرے، اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کے مذہبی و شخصی قانون کی حفاظت کے لیے ایک محکم اصول وضع کرے،

اس لیے اس وقت کسی مزید تقریر کی حاجت نہیں ہے، اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے کہ سارد ا ایکٹ کے نقصانات پر مذہبی و اخلاقی حیثیت سے روشنی ڈالی جائے، لیکن ممکن ہے کہ بعض حضرات آج بھی اس امر کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آیا سارد ا ایکٹ مذہب میں مداخلت کرتا ہے یا نہیں یا یہ کہ اس کے کیا نتائج و عواقب ہوں گے؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماءِ ہند کا وہ مکتوب پڑھکر سُنا دیا جائے۔ جو آپنے لارڈ آرون وائسرائے ہند کو اوائل ماہ نومبر ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا، اور جو معلومات و دلائلِ شرعیہ سے مملو ہے، وہو ہٰذا:

(مکتوب اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جناب والا!

مسودۂ قانون جو پہلی منزل میں "سارداابل" کے نام سے مشہور تھا، اب ہزایکسیلینسی وائسرائے ہند کی منظوری کے بعد ایکٹ ۱۹ بابت ۱۹۲۹ء بن چکا ہے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب والا کو ان احساسات اور جذبات سے باخبر کردوں جو مسلمانوں کی طبائع میں اس قانون کے خلاف موجزن ہیں، اور اُن وجوہ کی بھی تصریح کردوں جن کی بناء پر مسلمان اس قانون سے ناراض ہیں، اور کسی طرح اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں،

(سارداایل) ایکٹ بابتہ ۱۹۲۹ء سے مسلمانوں کی بیزاری کی وُجوہ یہ ہیں؛

(الف) گورنمنٹ کے وعدوں اور اعلانوں کے خلاف ہے،

(ب) اس سے مذہبی مداخلت ہوتی ہے،

(ج) مسلمان قوم کی ناراضامندی کے باوجود اس کا اطلاق مسلمانوں پر کیا گیا ہے،

(د) اس کی حیثیت آئینی نہیں بلکہ جبری ہے،

(ہ) اس قانون کے پاس ہوجانے سے ایک ایسا خطرناک اصول قائم ہوگیا جس سے مسلمانوں کے مخصوص شرعی قانون (پرسنل لاء) میں مداخلت کا دروازہ کھل گیا ہے، اور اس کے محفوظ رہنے کا کوئی اطمینان نہیں رہا،

میں ان نمبروں میں سے ہر نمبر پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتا ہوں:

(۱) گورنمنٹ برطانیہ نے ہمیشہ اس وعدہ کا اعلان کیا ہے کہ وہ مذہبی معاملات

میں مداخلت نہیں کرے گی، ملکۂ وکٹوریہ کا ابتدائی اعلان اور ان کے جانشینوں کی پیہم تصدیق وتائید اس دعوے کا کافی ثبوت ہے، اور اُس وقت سے آج تک گورنمنٹ نے مسلمانوں کی شادی (میرج) کو مذہبی امور میں داخل رکھا ہے، اور اسی حیثیت سے اس کے متعلق تمام مقدمات محمڈن لاء کے مطابق فیصل ہوتے رہے ہیں،

پس ایک ایسے امر کے لیے جو اَب تک قانونی طور پر مذہبی امور میں داخل اور قانونی مداخلت کے ناقابل تھا اسمبلی میں قانون بنانا جسکی میجارٹی غیر مسلم اور اسلام سے قطعاً ناواقف ہے، اور گورنمنٹ کی جانب سے اس کی حمایت وتائید ہونا اور سرکاری ارکان کا اس کی موافقت میں ووٹ دینا گورنمنٹ کی قدیم مشہرہ پالیسی کی قطعاً خلاف ورزی ہے،

(۲) اس سے مذہبی مداخلت ہوتی ہے،

اس بات کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ میں مذہبی مداخلت کا مفہوم بھی واضح کردوں، مذہبی مداخلت کے مفہوم کی دو جہتیں ہیں:

مذہبی مداخلت کے مفہوم کی پہلی جہت:

(۱) جن امور کو مذہب نے فرض یا واجب قرار دیا ہو،

(مثال) نماز، روزہ، حج، جب مرد یا عورت بالغ ہو جاتے، اور قوی الشہوت ہونے کی وجہ سے زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ان کے لیے نکاح کرنا وغیرہ،

(۲) جو امور کہ مذہب کے شعار میں داخل ہوں،

(مثال) اذان، ختنہ، بستی سے باہر عید کی نماز کے لیے اجتماع وغیرہ،

(۳) جن امور کو مذہب نے مؤکد یا مستحسن قرار دیا ہو، ان کی ترغیب

دی ہو اور ثواب کا وعدہ کیا ہو،

(مثال) نفل نماز، نفل روزہ، نفل حج ایک سے زیادہ، قربانی، محلّوں اور عام راستوں پر مسجدیں بنانا وغیرہ،

(۴) جن امور کو شریعت نے جائز قرار دیا ہو اور ان پر عمل کرنا ایک مذہبی حق سمجھا جاتا ہو،

(مثال) ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنا، قربانی کے مختلف جانوروں میں سے کسی جانور کو منتخب کرنا وغیرہ،

مذکورہ بالا چاروں قسموں میں جو امور داخل ہیں ان میں سے کسی ایک کو روکنا، یا جرم قرار دینا یا ایسی پابندی عائد کرنا، جس کا نتیجہ فی الجملہ ترکِ فعل پر مجبور کرنا ہو مذہبی مداخلت ہے،

اب میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ اس قانون کے ذریعہ سے جو پابندی عائد کی گئی ہے وہ ان چاروں بیان کردہ صورتوں کے لحاظ سے مذہبی مداخلت ہے'

(۱) مذہبی مداخلت کی پہلی صورت یعنی کسی فرض یا واجب سے روکنا!

جبکہ لڑکا ۱۸ سال سے پہلے بالغ ہو جائے یا لڑکی ۱۴ سال سے پہلے بالغ ہو جائے اور قوئِ جسمانیہ کے قوی اور مستحکم ہونے کی وجہ سے اس کے زنا میں مبتلا ہو جانے یا کسی مرض کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ولی پر اور خود لڑکے اور لڑکی پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ نکاح کرلے،

(الف) احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پیغمبرِ اسلام (ارواحنا فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ وُّلِدَ لَهٗ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنْ اِسْمَهٗ وَاَدَبَهٗ فَاِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ وَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلٰى اَبِيْهِ،

ترجمہ: "جس کسی کو حق تعالیٰ کوئی بچہ (لڑکا یا لڑکی) عطاء کرے تو اسے چاہیے کہ بچے کا اچھا نام رکھے اور اچھی تعلیم دے، اور جب بچہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بچہ بالغ ہوگیا اور باپ نے اس کا نکاح نہ کیا، اور بچے سے گناہ سرزد ہوگیا تو اس کا وبال اس کے باپ پر ہوگا"،

اور پیغمبرِ اسلام (ارواحنا فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ:

فِى التَّوْرٰةِ مَكْتُوْبٌ مَنْ بَلَغَتْ اِبْنَتُهٗ اِثْنَتَىْ عَشَرَةَ سَنَةً وَلَمْ يُزَوِّجْهَا فَاَصَابَتْ اِثْمًا فَاِثْمُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ (رواہ البیہقی کذا فی المشکوٰۃ)

ترجمہ: "توراۃ میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص کی لڑکی بارہ سال کی ہوجائے (بالغ ہوکر نکاح کی حاجتمند ہو) اور باپ اس کا نکاح نہ کرے اور لڑکی سے کوئی گناہ ہوجائے تو اس کا گناہ باپ پر ہوگا"،

اور شریعتِ اسلامیہ کا اصول یہ ہے کہ انجیل یا تورات کا جو حکم پیغمبرِ اسلامؐ نے نقل فرما کر اس کے خلاف کچھ نہ فرمایا ہو تو وہ مسلمانوں کے لیے بھی شرعی حکم ہوجاتا ہے،

(ب) فقہِ اسلامی:

(۱) وَحَالَةِ التَّوَقَانِ وَاجِبٌ (فتاویٰ ہندیہ معروف فتاویٰ عالمگیری)

ترجمہ: "نکاح بوقتِ شدتِ حاجت واجب ہے"،

(۲) وَيَكُوْنُ وَاجِبًا عِنْدَ التَّوَقَانِ وَاِنْ تيقن الزِّنَا اِلَّا بِهٖ

فَرْضٌ (درمختار)

ترجمہ: "اور شدتِ حاجت کے وقت نکاح واجب ہو جاتا ہے، اور اگر بغیر نکاح رہنے میں صدورِ زنا یقینی ہو جائے تو فرض ہو جاتا ہے"۔

(۳) وَيَجِبُ عِنْدَ التَّوَقَانِ (البرھان شرح مواھب الرحمٰن)

ترجمہ: "یعنی شدتِ اشتیاق کے وقت نکاح واجب ہو جاتا ہے"۔

(۴) وَصِفَتُهُ فَرْضٌ وَوَاجِبٌ وَسُنَّةٌ (الیٰ قولہ) اَمَّا الْاَوَّلُ فَبِاَنْ يَّخَافُ الْوُقُوْعَ فِي الزِّنَا لَوْ لَمْ يَتَزَوَّجْ بِحَيْثُ لَا يُمْكِنُهُ الْاِحْتِرَازُ عَنْهُ الایہ لان مالا یتوصل الی ترکِ الحرام الابہ یکونُ فرضاً (بحرالرائق شرح کنزالدقائق)

ترجمہ: "اور احکامِ شرعیہ میں نکاح کی حیثیت یہ ہے کہ وہ بعض حالات میں فرض اور بعض میں واجب اور بعض میں سنت ہوتا ہے، (الیٰ قولہ) فرض ہونے کی حالت میں یہ ہے کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا کا ایسا خوف ہو کہ بدوں نکاح کے زنا سے بچاؤ نہ ہو سکے گا، اس حالت میں فرض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کے بغیر حرام سے بچنا ممکن نہ ہو وہ چیز حرام سے بچنے کے لیے فرض ہو جاتی ہے"۔

(۵) فَاَمَّا فِي حَالِ التَّوَقَانِ قَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ وَاجِبٌ بِالْاِجْمَاعِ لِاَنَّهُ يَغْلِبُ عَلَى الظَّنِّ اَوْ يَخَافُ الْوُقُوْعَ فِي الْحَرَامِ وَفِي النِّهَايَةِ اِنْ كَانَ لَهُ خَوْفُ الْوُقُوْعِ فِي الزِّنَا لَا يَتَمَكَّنُ مِنَ التَّحَرُّزِ اِلَّا بِهٖ كَانَ فَرْضًا، (فتح القدیر شرح ھدایہ)

ترجمہ: "شدتِ احتیاج و شدتِ اشتیاق کی حالت میں بعض علماء نے کہا کہ نکاح کرنا بالاتفاق واجب ہے، کیونکہ ایسی حالت میں نکاح نہ کرنے

سے زنا میں مبتلا ہو جانے کا خوف یا گمان غالب ہوتا ہے، اور نہایہ
میں یہ ہے کہ اگر زنا میں واقع ہونے کا اتنا خوف ہو کہ بدون نکاح کے
بچاؤ نہ ہو سکے تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے"

(۶) اَمَّا مَنِ احْتَاجَ اِلَى النِّكَاحِ وَلَمْ يَقْدِرْ عَلَى الصَّبْرِ دُوْنَ
النِّسَاءِ وَخَشِيَ عَلٰى نَفْسِهٖ العنت اِنْ لَّمْ يَتَزَوَّجْ فَالنِّكَاحُ
عَلَيْهِ وَاجِبٌ، (انتھٰی مختصرًا) (مقدمات ابن رشد)

ترجمہ:" بہرحال جو نکاح کا حاجتمند ہو بغیر عورت کے صبر نہ کر سکے اور زنا میں
مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس پر نکاح واجب ہے"

(۷) وَقَدْ يجب فِيْ نَحْوِ خَائِفُ عنت تعين عَلَيْهِ (القلیوبی
علی شرح منہاج الطالبین فی فقہ الامام الشافعی)

ترجمہ:" نکاح کبھی واجب ہو جاتا ہے، مثلاً اس شخص کے لیے جس کو زنا
میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو"

پس ایسی صحیح الجسم لڑکی جو تیرہ سال کی عمر میں بالغہ ہو جائے، اور ایسا
صحیح القویٰ لڑکا جو پندرہ یا سولہ سال میں بالغ ہو جائے اور ان کی تعداد بہت
زیادہ ہے، اور خوف ہو کہ اگر ان کا نکاح نہ کیا گیا تو یہ فواحش میں مبتلا ہو جائیں گے
(خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو) تو ان کا نکاح کر دینا شرعاً واجب یا فرض ہے،
اور ساردا ایکٹ ان کو اس شرعی فرض یا واجب کی ادائیگی سے روکتا ہے،
اس لیے ان صورتوں میں مذہبی مداخلت کی صُوَرِ چہارگانہ میں سے پہلی صورت
متحقق ہو جائے گی،

(۲) دُوسری صُورت یعنی کسی اسلامی شعار سے روکنا:

نکاح اسلامی شعار ہے، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۱) اَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ، اَلْحَیَاءُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاکُ وَالنِّکَاحُ، (ترمذی)

ترجمہ: "یعنی چار چیزیں انبیاء علیہم السلام کی سنتیں ہیں: حیاء، عطر لگانا، مسواک کرنا، نکاح کرنا،

دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

(۲) اِنَّ سُنَّتَنَا اَلنِّکَاحُ شِرَارُکُمْ عُزَّابُکُمْ (رواہ ابویعلی فی مسندہ کذا فی البرہان)

ترجمہ: "یعنی نکاح ہماری سنت ہے، تم میں سے جو مجرد ہیں وہ تم میں بُرے لوگ ہیں،

تیسری حدیث میں فرمایا ہے:

(۳) اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ، (کذا فی فتح الباری والبرہان)

ترجمہ: "یعنی نکاح میری سنتوں میں سے ہے، تو جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ میرا نہیں"

پس کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کو جب کہ وہ بالغ ہو چکے ہوں (مگر قانونی عمر سے کم عمر رکھتے ہوں) یا ان کے اولیاء کو ایک ایسے امر سے روکنا جو شعارِ اسلامی ہے مذہبی مداخلت کی صُورِ چارگانہ میں سے دوسری صورت میں داخل ہے۔

(۳) مذہبی مداخلت کی تیسری صورت

جن امور کو مذہب نے مؤکد یا مستحسن قرار دیا ہی اُن سے روکنا

(الف) قرآن کریم:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (سورۂ نور)

ترجمہ: "بے شوہر والی عورتوں اور بے بیوی والے مردوں کے نکاح کر دو"

ایامیٰ جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد ایّم ہے جو ایسے مرد کے لیے جس کی بیوی نہ ہو اور ایسی عورت کے لیے جس کا خاوند نہ ہو بولا جاتا ہے، خواہ یہ بالکل بن بیاہے ہوں یا بیاہے ہوں، مگر پھر تنہا رہ گئے ہوں"

مفردات راغب میں ہے:

اَلْاَيِّمُ هِيَ الْمَرْاَةُ الَّتِيْ لَا بَعْلَ لَهَا وَقِيْلَ لِلرَّجُلِ الَّذِيْ لَا زَوْجَ لَهٗ،

ترجمہ: "یعنی جس عورت کا خاوند نہ ہو اور جس مرد کی بیوی نہ ہو دونوں کو ایّم کہا جاتا ہے"

لسان العرب ص ۳۰۵ ج ۱۲ میں ہے:

اَلْاَيَامٰى الَّذِيْنَ لَا اَزْوَاجَ لَهُمْ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَرَجُلٌ اَيِّمٌ سَوَاءٌ كَانَ تَزَوَّجَ قَبْلُ اَوْ لَمْ يَتَزَوَّجْ وَ الْاَيِّمُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِيْ لَا زَوْجَ لَهَا بِكْرًا كَانَتْ اَوْ ثَيِّبًا،

ترجمہ: "ایامیٰ اُن مردوں کو جن کی بیویاں نہ ہوں اور اُن عورتوں کو جن کے شوہر نہ ہوں کہا جاتا ہے، مرد کو خواہ اس نے شادی کی ہو یا نہ کی ہو، مگر بغیر بیوی کے رہ جائے، اسی طرح عورت کو خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ مگر

بے خاوند کی ہو ایم کہا جاتا ہے۔“

اور اَنکِحُوا امر کا صیغہ ہے جو یہاں کم از کم استحباب مؤکد کے لیے بولا جاتا ہے،

تفسیر خازن میں ہے:

وَالْاَمْرُ الْمَذْكُوْرُ فِي الْاٰيَةِ اَمْرُ نَدْبٍ وَاسْتِحْبَابٍ

الْاِجْمَاعُ السَّلَفِ عَلَيْهِ ، ص ۵۹ ج ۵)

ترجمہ: ”صیغہ امر اس آیۃ میں ندب و استحباب کے لیے ہے، کیونکہ سلف کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے۔“

فَهِيَ رَاءٍ صِيْغَةُ الْاَمْرِ فِيْ قَوْلِهٖ وَانْكِحُوْا عَلَى النَّدْبِ لَا عَلَى الْاِبَاحَةِ (مقدمات ابن رشد، ص ۲۲۰ ج ۲)

ترجمہ: ”یعنی اس آیت میں امر کا صیغہ ندب کے لیے ہے نہ اباحت کے لیے“

(ب) احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَزَوَّجَ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الْاِيْمَانِ ،

ترجمہ: ”یعنی جس نے نکاح کر لیا اس نے اپنا آدھا ایمان کامل کر لیا۔“

۲۔ اور فرمایا:

مَنْ تَزَوَّجَ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَاِحْتِسَابًا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعِيْنَهٗ وَاَنْ يُّبَارِكَ لَهٗ (طبرانی کذا فی جمع الفوائد)

ترجمہ: ”یعنی جو شخص خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے بہ نیتِ ثواب نکاح کریگا خدا تعالیٰ ضرور ہی اس کی امداد فرمائے گا اور برکت دے گا۔“

۳۔ اور فرمایا:

يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا الصَّلٰوةُ إِذَا أَتَتْ وَالْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ وَالْأَيِّمُ إِذَا وَجَدَتْ لَهَا كُفُوًا (رواه الترمذی کذا فی المشکوٰة)

ترجمہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علیؓ! تین چیزیں ایسی ہیں جن میں تاخیر اور دیر نہ کرنا، نماز جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب تیار ہو جائے، اور بے خاوند کی عورت جب اس کے لائق رشتہ میسر آجائے"

ان حدیثوں کے علاوہ وہ حدیثیں بھی... ملاحظہ کی جائیں جو دوسری صورت کے بیان میں اوپر لکھی جا چکی ہیں، ان تمام احادیث اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث سے نکاح کی فضیلت اور اس کا مستحب مؤکد ہونا صراحۃً ثابت ہوتا ہے اور حضرت علیؓ کی روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مناسب رشتہ اور کفو میسر ہونے پر نکاح میں تاخیر اور دیر کرنی ناجائز ہے، کیونکہ لڑکیوں کے لیے سب سے زیادہ اہم بات یہی ہے کہ اچھے اور لائق خاوند مل جائیں، اور یہ ہر وقت میسر نہیں ہوتے، اس لیے ایسا رشتہ ملنے کی صورت میں نکاح کر دینے اور تاخیر نہ کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے،

(ج) روایاتِ فقہیہ

(۱) وَيُسَنُّ حَالَةَ الْاِعْتِدَالِ (البرهان شرح مواهب الرحمٰن)

یعنی نکاح حالتِ اعتدال میں بھی یعنی اگرچہ شدتِ حاجت نہ ہو مسنون ہے"

(۲) وَيَكُوْنُ سُنَّةً مُؤَكَّدَةً فِي الْاَصَحِّ فَيَاْثَمُ بِتَرْكِهِ (درمختار)

"یعنی نکاح سنت مؤکدہ ہے، پس اس کے ترک سے گنہگار ہوگا"

(۳) فَهُوَ أَنَّهُ فِي حَالَتِ الْاِعْتِدَالِ سُنَّةٌ مُؤَكَّدَةٌ (فتاویٰ عالمگیری)

"یعنی درمیانی حالت میں نکاح سنت مؤکدہ ہے"

(۴) قَالَ الْحَنَفِيَّةُ هُوَ عِبَادَةٌ (فتح الباری)

"یعنی حنفیہ کہتے ہیں کہ نکاح ایک عبادت ہے"

(۵) لَيْسَ لَنَا عِبَادَةٌ شُرِعَتْ مِنْ عَهْدِ آدَمَ إِلَى الْآنَ ثُمَّ تَسْتَمِرُّ فِي الْجَنَّةِ إِلَّا النِّكَاحُ وَالْإِيمَانُ (درمختار)

"یعنی ہمارے لیے کوئی عبادت ایسی نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہو کر اب تک قائم رہی ہو پھر جنت میں بھی برقرار رہے، مگر نکاح اور ایمان"

پس قرآن پاک اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ اسلامی سے نکاح کا مسنون اور کم از کم مستحب مؤکد ہونا ثابت ہوتا ہے، اور سارda بل کے ذریعہ سے ایک مدت معینہ تک اس کی ممانعت اور بندش ہوتی ہے، اس لیے یہ مذہبی مداخلت کی تیسری صورت میں داخل ہے،

تنبیہ؛

واضح رہے کہ اگر لڑکا اور لڑکی نابالغ اور ناقابلِ مباشرت بھی ہوں جب بھی ان کے عقدِ نکاح کو منع کرنا اور جرم قرار دینا مذہبی مداخلت ہے، اور اگر بالغ ہوں مگر ۱۴ اور ۱۸ سال سے کم عمر رکھتے ہوں تو پھر عقدِ نکاح اور مباشرت دونوں پر بندش عائد کرنا مذہبی مداخلت ہے۔

(۴) مذہبی مداخلت کی چوتھی صورت

یعنی ایسے امور سے روکنا جو صرف جائز ہیں مگر مذہبی حق سمجھے جاتے ہیں

چھوٹے بچوں اور چھوٹی بچیوں کا نکاح کر دینا اگرچہ ضروری اور لازمی نہیں ہے مگر اسلام نے اسے جائز رکھا ہے، اور اس سے منع نہیں کیا، اور یہ حق ایک اسلامی حق قرار دیا گیا ہے، اس کے ثبوت میں دلائل ذیل ملاحظہ ہوں:۔

(الف) قرآن کریم؛

(۱) وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ (سورۃ طلاق)

ترجمہ؛ "تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں کہ حیض سے (بوجہ پیرانہ سالی کے) ناامید ہو جائیں اگر تمہیں ان کے بارے میں شک و شبہہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور ان بچیوں کی بھی جنھیں ابھی تک حیض آنا شروع نہیں ہوا"،

اسلامی قانون نے غیر حاملہ عورت کے لیے طلاق کی عدت تین حیض قرار دی ہے، مگر جن عورتوں کو پیرانہ سالی کی وجہ سے حیض آنا بند ہو گیا ہو یا ایسی منکوحہ لڑکیاں جنھیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا اس آیت میں ان کی عدت بیان کی گئی ہے، کہ یہ دونوں قسم کی عورتیں تین مہینے عدت گذاریں،

اس آیت میں غیر حائضہ نابالغہ لڑکیوں کی عدت کا حکم بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ نابالغہ لڑکیوں کا عقد نکاح جائز ہے، ورنہ طلاق اور اس کی عدت کا حکم بیان کرنے کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے،

یہاں پر کہا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے ایسے نکاح ہوتے تھے، اور اُن کی

وجہ سے کم عمر منکوحہ بچیوں کو طلاق دینے کے واقعات پیش آتے تھے، اس لیے انکی عدت بیان کردی گئی، پس اس آیت سے ایسے نکاح کر دینے کا جواز نہیں نکلتا،

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ طلاق کی عدت بتانا اور نکاح جس پر طلاق مرتب ہوتی ہے اس کے حکم سے سکوت فرمانا نکاح کے جواز کی صریح دلیل ہے، اگر ان بچیوں کا نکاح ناجائز ہوتا تو ضرور اس کی تصریح بھی یہیں پر کردی جاتی، جب اس کے عدم جواز کی تصریح نہیں کی گئی، اور ان کی طلاق کی عدت بتائی گئی تو نکاح کے جواز میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہا،

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (سورۃ النساء ۶)

ترجمہ: "اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیمہ بچیوں کے بارے میں تم انصاف نہ کرسکوگے تو انھیں چھوڑ کر اور جو عورتیں تمھیں اچھی معلوم ہوں ان سے نکاح کرو"

اس آیۃ کا مطلب جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا ہے یہ ہے کہ جن لوگوں کی تربیت میں یتیم بچیاں ہوتی تھیں اور وہ صاحب مال یا جمال ہوتی تھیں تو یہ ولی ان کے ساتھ نکاح کر لیتے تھے، اور تھوڑا سا مہر مقرر کر دیتے تھے، اور اگر وہ صاحب مال و جمال نہ ہوتیں تو پھر خود نکاح نہیں کرتے تھے، اور دوسرے رشتے تلاش کرتے تھے، تو حق تعالیٰ نے ان کو اس ناانصافی سے منع کیا ہے، فرمایا کہ اگر تم ان بچیوں سے انصاف کا معاملہ نہ کرو اور پورا مہر نہ باندھو تو ان کے ساتھ نکاح مت کرو، یعنی اگر ان کے ساتھ انصاف کرو اور پورا مہر باندھو تو نکاح جائز ہے، ممانعت صرف ناانصافی کی صورت میں ہے،

یہ ایسے اولیاء کے لیے حکم تھا جن کے لیے زیر تربیت یتیمہ بچیوں کے ساتھ نکاح کر لینا جائز ہوتا ہے، جیسے چچازاد بھائی وغیرہ، پس اس آیت سے بھی یتیمہ

بچیوں کے ساتھ صغر سنی میں نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے، صرف ناانصافی کی صورت میں نکاح کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ یہ حکم ممانعت اولیار کو اسی حالت میں دیا جا سکتا ہے جب کہ یتیمہ ابھی خود مختار نہ ہوئی ہو، اور ولی اپنے اختیار سے ناانصافی کے ساتھ عقد کرلے،

اور یتیم اور یتیمہ کا اطلاق انہی بچوں پر آتا ہے جن کے باپ کا انتقال ہوگیا ہو اور وہ ابھی نابالغ ہوں،

مفردات راغب میں ہے:

اَلْیَتِیْمُ اِنْقِطَاعُ الصَّبِیِّ عَنْ اَبِیْہِ قَبْلَ بُلُوْغِہٖ (ص ۵۷۲)

ترجمہ: "یعنی بچے کا نابالغی کی حالت میں بن باپ کے رہ جانا یتیمی ہے"

تاج العروس شرح قاموس میں ہے:

وَھُوَ یَتِیْمٌ مَا لَمْ یَبْلُغُ الْحُلُمَ فَاِذَا بَلَغَ زَالَ عَنْہُ اِسْمُ الْیَتِیْمِ، (ص ۱۱۳ ج ۹)

ترجمہ: "یعنی بچہ اس وقت تک یتیم کہلاتا ہے جب تک بالغ نہ ہو، اور جب بالغ ہو جائے تو یتیم کا اطلاق اس پر سے اٹھ جاتا ہے"

ایک حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے:

لَا یَتِیْمَ بَعْدَ الْحُلُمِ (کذا فی فتح القدیر)

ترجمہ: "یعنی بلوغ کے بعد یتیمی نہیں رہتی"

پس جس طرح آیت کے پہلے حصہ سے نابالغہ لڑکیوں کے نکاح کا جواز ثابت ہے اسی طرح دوسرے حصہ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ سے بھی جواز ثابت ہوتا ہے، کہ اس میں بالغہ نابالغہ کی کوئی قید نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ زیر تربیت یتیم بچیوں کو چھوڑ کر دوسری جن عورتوں سے چاہو نکاح کرو خواہ وہ بالغہ ہوں یا نابالغہ،

یہاں پر یہ کہا جاتا ہے کہ نساء کا لفظ بالغہ عورتوں پر ہی بولا جاتا ہے، مگر ایسے ہی شخص کا قول ہو سکتا ہے جسے نہ قرآن مجید کے احکام کی خبر ہے نہ الفاظ کی، نہ وہ عربی زبان سے واقف ہے نہ عربی لغت سے،

قرآن مجید میں آیۂ میراث میں وَاِنْ کُنَّ نِسَآءً موجود ہے، یعنی اگر میت کی اولاد میں دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کا حصہ باپ کے ترکہ میں ⅔ ہے،

یہاں نساء کا لفظ ہے، اور ایک دن کی بچی بھی اس حکم میں داخل ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ نابالغہ لڑکیوں کے لیے باپ یا ماں کے ترکہ میں حصہ نہیں ہے؟ اس لیے کہ وہ لفظ نساء میں داخل نہیں ہیں، اسی طرح بہت سی آیتوں میں لفظ نساء میں بچیاں اور پوری عورتیں شامل رکھی گئی ہیں،

(۳) وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (سورۂ نور) اس آیت میں بھی نابالغہ اور بالغہ سب داخل ہیں، کیونکہ ایّم بن عورت کے مرد اور بن شوہر کی عورت کو کہتے ہیں، خواہ بالغہ ہو یا نابالغہ،

اور جب کہ تیرہ سال کی لڑکی بالغہ ہو جائے یا پندرہ سولہ سال کا لڑکا بالغ ہو جائے تو اس امر استحباب کا اس کے متعلق ہو جانا ظاہر ہے، اور بلوغ سے پہلے بھی جب کہ اچھا رشتہ میسر ہوتا ہو تو صرف عقدِ نکاح کر دینا بھی اسی کے تحت داخل ہے،

(ب) احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں قولی اور فعلی دونوں قسم کی روایتیں موجود ہیں:۔

(۱) اَلْاِنْكَاحُ اِلَى الْعَصَبَاتِ (رواہ سبط ابن الجوزی کذا فی فتح القدیر)

ترجمہ: "یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (بچوں کے) نکاح کر دینے

کا اختیار عصبات کو ہے"۔

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تَزَوَّجَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنْتَ سِتِّ سِنِيْنَ وَبَنٰى بِيْ وَاَنَا بِنْتُ تِسْعِ سِنِيْنَ

(رواہ البخاری)

ترجمہ: "یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ نکاح اس وقت کیا جب میں چھ سال کی تھی، اور زفاف اس وقت کیا جب میں نو سال کی تھی (اور شوہر کے قابل ہو گئی تھیں)"۔

(۳) وَزَوَّجَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنْتَ عَمِّهٖ حَمْزَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ عُمَرَ بْنَ اَبِيْ سَلَمَةَ وَهِيَ صَغِيْرَةٌ (کذا فی فتح القدیر)

ترجمہ: "اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہؓ کا نکاح عمر بن ابی سلمہ کے ساتھ ایسے وقت میں کر دیا کہ وہ صغیرہ تھیں"۔

(ج) افعال صحابہ کرامؓ

تَزَوَّجَ قُدَامَةُ بْنُ مَظْعُوْنٍ بِنْتَ الزُّبَيْرِ يَوْمَ وُلِدَتْ،

(فتح القدیر)

"یعنی قدامۃ بن مظعون صحابی نے حضرت زبیرؓ کی لڑکی سے اس کے یوم ولادت ہی میں نکاح کر لیا"۔

اُمِّ كُلْثُوْمِ بِنْتِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اُمُّهَا فَاطِمَةُ الزَّهْرَاءُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا خَطَبَهَا عُمَرُ بْنُ اَبِي الْخَطَّابِ اِلٰى عَلِيٍّ فَقَالَ اِنَّهَا صَغِيْرَةٌ (الی قولہ) فَاِنْ رَضِيْتَهَا فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا (انتہی مختصرا فی الاستیعاب لابن عبد البر)

"یعنی حضرت عمرؓ نے ام کلثومؓ کے لیے جو حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے صاحبزادی تھیں اپنے نکاح کا پیغام دیا، تو حضرت علیؓ نے عذر کیا کہ وہ ابھی بچی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں خاندانِ نبوت کے ساتھ نسبت پیدا کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اچھا میں اس کے ہاتھ آپ کی خدمت میں ایک چادر بھیجتا ہوں، وہ آپ کے سامنے آئے گی، اگر آپ اس سے نکاح کرنا پسند کریں تو میں نے آپ کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا"

اسی طرح الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ میں ابن حجر عسقلانی نے بھی ذکر کیا ہے،

(۵) روایاتِ فقہیہ

وَیَجُوْزُ نِکَاحُ الصَّغِیْرِ وَالصَّغِیْرَۃِ اِذَا زَوَّجَہُمَا الْوَلِیُّ بِکْرًا کَانَتِ الصَّغِیْرَۃُ اَوْ ثَیِّبًا (ھدایہ)

"یعنی صغیر اور صغیرہ کا نکاح جائز ہے جبکہ ولی ان کا نکاح کرے، صغیرہ خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ"

لقولہ تعالیٰ وَاللَّائِیْ لَمْ یَحِضْنَ فَاثْبَتَ الْعِدَّۃَ لِلصَّغِیْرَۃِ وَھُوَ فَرْعُ تَصَوُّرِ نِکَاحِہَا شَرْعًا وَتَزْوِیْجُ اَبِیْ بَکْرٍ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا وَھِیَ بِنْتُ سِتٍّ نَصٌّ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُتَوَاتِرِ وَتَزَوَّجَ قُدَامَۃُ بْنُ مَظْعُوْنٍ بِنْتَ الزُّبَیْرِ مَعَ عِلْمِ الصَّحَابَۃِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ نَصٌّ فِیْ فَہْمِ الصَّحَابَۃِ عَدَمَ الْخُصُوْصِیَّۃِ فِیْ نِکَاحِ عَائِشَۃَؓ (فتح القدیر)

"یعنی صغیر اور صغیرہ کے نکاح کے جواز کی دلیل یہ آیت ہے وَاللَّائِیْ

لَمْ یَحِضْنَ کہ اس میں صغیرہ مطلقہ کی عدت بیان کی گئی ہے، اور عدت جب ہی ثابت ہو سکتی ہے کہ اس کے نکاح کو شریعت نے معتبر رکھا ہو اور حضرت ابو بکرؓ کی جانب سے حضرت عائشہؓ کی کم عمری (چھ سال کی عمر) میں ان کا نکاح کر دیا جانا ایسی نص ہے جو متواتر کے قریب ہے اور قدامۃ بن مظعون صحابی کا حضرت زبیرؓ کی نوزائیدہ بچی سے صحابہ کرامؓ کے علم و اطلاع میں نکاح کر لینا اور کسی کا انکار نہ کرنا اس بات کی نص ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضرت عائشہؓ کی کم عمری کے نکاح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں سمجھا"۔

وَلَنَا قَوْلُهُ تَعَالٰی وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ الآیۃ مَنَعَ مِنْ نِکَاحِهِنَّ عِنْدَ خَوْفِ عَدَمِ الْعَدْلِ فِیْهِنَّ وَهٰذَا فَرْعُ جَوَازِ نِکَاحِهِنَّ عِنْدَ عَدَمِ الْخَوْفِ (فتح القدیر)

"یعنی صغیرہ کے نکاح کے جواز میں ہماری دلیل یہ آیت ہے فَانْکِحُوْا الخ کہ اس میں ناانصافی کے خوف کی حالت میں یتیمہ بچیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ اس کو مستلزم ہے کہ جب ناانصافی کا خوف نہ ہو تو یتیمہ بچیوں کے ساتھ نکاح جائز ہے، (اور یتیمہ وہی بچی ہے جو نابالغہ ہو"

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی تَزْوِیْجِهٖ بِنْتَ الْبِکْرِ الصَّغِیْرَۃِ (نووی شرح مسلم)

"یعنی مسلمانوں کا اجماع (اتفاق) ہے کہ باپ اپنی چھوٹی بچی باکرہ کا نکاح کر سکتا ہے"

لِوَلِیِّ الصَّغِیْرِ وَالصَّغِیْرَۃِ اَنْ یُّنْکِحَهَا (برجندی کذا فی الفتاوی العالمگیری)

"یعنی صغیر اور صغیرہ کے ولی کو یہ حق ہے کہ اُن دونوں کا نکاح کردے"۔
سَوَاءً کَانَتْ بِکْرًا اَوْ ثَیِّبًا (کذا فی العینی شرح الکنز)
"خواہ لڑکی باکرہ ہو یا ثیبہ"

اسی طرح تمام کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے، ان سب کی عبارتیں نقل کرکے میں اس مکتوب کو طویل کرنا نہیں چاہتا۔

پس قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ اسلامی نے اولیاء کو یہ حق دیا ہے، اور یہ حق ان کا شرعی اسلامی حق ہے، اس کو سلب کرنا ایسی ہی مداخلت ہے جس طرح کہ ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کے شرعی حق کو یا گائے کی قربانی کرنے کے شرعی حق کو یا برلبِ شوارع مسجد تعمیر کرنے کے شرعی حق کو قانون کے ذریعہ سے جرم قرار دینا مذہبی مداخلت ہے۔

میں یہاں پر یہ بھی واضح کردوں کہ تمام مسلمانوں کا مذہبی اعتقاد یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کا قانون ہے کہ اس میں قیامت تک کسی ترمیم، تبدیل، اضافہ یا کمی کی گنجائش نہیں ہے، غیر مسلم تو کجا کسی مسلمان کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں کوئی دوسرا قانون وضع کرے، یا اس کی تائید وحمایت کرے، پس اس اعتقاد و یقین کے ہوتے ہوتے وہ ایک آن کے لیے بھی اس کو برداشت نہیں کرسکتے کہ کوئی ایسی جماعت جس میں مسلم و غیر مسلم شریک ہوں اور غیر مسلموں کی اکثریت ہو مسلمانوں کے لیے کوئی قانون وضع کرکے ان کے اسلامی حقوق میں دست اندازی کرے۔

مذہبی مُداخلت کے مفہُوم کی دُوسری جہت

مذہبی مداخلت کے مفہوم کی دوسری جہت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قانون کے

ذریعہ سے کسی ایسے امر پر مجبور کیا جائے جو اُن کے مذہب میں ناجائز ہے،

میں اوپر بیان کرچکا ہوں کہ بعض حالات میں ۱۸ سال سے کم عمر لڑکے اور ۱۴ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح کرنا شرعاً واجب اور فرض اور ترک نکاح ناجائز اور حرام ہوجاتا ہے، اور یہ قانون ان کو تکمیل عمر قانونی سے پہلے ترک نکاح پر مجبور کرے گا، جو مذہباً ناجائز اور حرام ہوگا، اور اس دوسری جہت سے بھی یہ ممانعت مذہبی مداخلت ہوگی،

(۳) مُسلمان قوم کی نارضامندی کے باوجود اُس کا اِطلاق مُسلمانوں پر کیا گیا ہی

اس کے ثبوت کے لیے مجھے زیادہ تطویل کی حاجت نہیں ہے، ہز ایکسلنسی سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ :-

۱۔ مسلم ممبرانِ اسمبلی کی اکثریت نے ستمبر ۱۹۲۸ء میں ایک یادداشت جس پر ۲۲ مسلمان ارکان کے دستخط تھے ہوم ممبر کی خدمت میں پیش کر دی تھی اور بل سے اپنا اختلاف اس بناء پر ظاہر کیا تھا کہ اس بل سے شریعتِ اسلامیہ میں مداخلت ہوتی ہے،

۲۔ منتخبہ کمیٹی کے دو مسلمان ممبر مسٹر محمد یعقوب و مسٹر محمد رفیق صاحبان نے اپنے اختلافی نوٹ میں یہ ظاہر کیا تھا کہ اس بل سے مسلمانوں کے پرسنل لاء پر اثر پڑتا ہے، اس لیے یہ بل اصول کے خلاف ہے،

۳۔ مسٹر غزنوی نے اسی مرحلہ پر علماءِ اسلام کا ایک فتویٰ بھی ہوم ممبر کو دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بِل مذہبِ اسلام کے اصول و احکام پر اثر ڈالتا ہے، اس لیے شرعاً قابلِ قبول نہیں،

۴۔ فروری ۱۹۲۹ء میں بھی اِس بِل کے پیش ہونے کے وقت مسلمانوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ بِل اسلامی اصول کے خلاف ہے،

۵۔ ستمبر ۱۹۲۹ء میں ۲۲ مسلمان حاضر ارکان میں سے ۱۶ مسلمان ممبروں نے بِل کو مخالف اصول اسلامی بتاتے ہوئے اس سے اپنی بیزاری کا تحریری بیان ہوم ممبر کو دیا،

۶۔ مولانا محمد شفیع داؤدی نے ترمیم پیش کی کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو مسلمان منتخب شدہ ارکان میں سے ۱۲ نے ترمیم کے موافق اور صرف ۵ مسلمان ارکان نے مخالف رائے دی، مسلمان منتخب شدہ ۲۹ ارکان میں سے صرف ۷ نے بِل کی موافقت میں رائے دی،

۷۔ کونسل آف اسٹیٹ کے تمام مسلمان (باستثناءِ گورنمنٹ کے مسلم ارکان کے) ممبروں نے بِل کے خلاف تحریری بیان دیا،

۸۔ ۳؍ مارچ ۱۹۲۸ء کو روزنامہ ہمدرد نے مولانا محمد علی کا ایک بسیط مضمون بل کے خلاف شائع ہوا،

۹۔ ۱۰؍ اپریل ۱۹۲۸ء کے اخبار الجمعیۃ میں اس کے خلاف مضمون لکھا گیا اور اس کو مذہبی مداخلت بتایا گیا،

۱۰۔ میں نے اپریل ۱۹۲۸ء میں ۲۲ ؍ سے پہلے تمام ارکانِ اسمبلی کو تار دیا کہ اس قسم کے قوانین مذہبِ اسلام میں ناجائز مداخلت ہیں، یہ تار ۲۱؍ اپریل ۱۹۲۸ء کے الجمعیۃ میں شائع ہو چکا ہے،

۱۱۔ ۲۶؍ اپریل ۱۹۲۸ء جمعیۃ علماء ہند کے اخبار الجمعیۃ میں اس پر مبسوط لیڈر لکھا گیا، جس کی دوسری قسط ۲۹؍ اپریل ۱۹۲۸ء کے الجمعیۃ میں شائع ہوئی، اس میں پوری وضاحت اور دلائل کے ساتھ بتایا گیا کہ اس قسم کے

بل اسلامی پرسنل لاء پر اثر انداز ہیں اس لیے قابلِ قبول نہیں،

۱۲۔ ۶ ر مئی ۲۸ء الجمعیۃ میں نہایت مبسوط مدلل لیڈر لکھا گیا جس کی دوسری قسط ۱۰ر مئی ۲۸ء کے الجمعیۃ میں شامل ہوئی،

۱۳۔ ۱۸ر مئی ۲۸ء، ۲۲ر مئی ۲۸ء، ۲۶ر مئی ۲۸ء کے الجمعیۃ میں بھی اس کے خلاف مضامین چھپے،

۱۴۔ ۱۶ر اپریل ۲۸ء کے الانصار دیوبند نے اس کے خلاف مضمون لکھا اور اس کو اسلامی شخصی قانون کے خلاف بتایا،

۱۵۔ ۱۱ر اگست ۲۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس مرکزیہ کے اجلاس مراد آباد نے اس کے خلاف تجویز پاس کی اور وائسرائے اور پریزیڈنٹ اسمبلی اور اراکین اسمبلی کو بھیجی گئی،

۱۶۔ ۱۲، ۱۶ر اگست ۲۹ء کے الجمعیۃ میں میرا ایک طویل مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا جس میں قانون کی مخالفت کی گئی،

۱۷۔ اس کے بعد الجمعیۃ میں متواتر یکم ستمبر ۲۹ء، ۵ر ستمبر ۲۹ء ۹ر ستمبر ۲۹ء، ۱۳ر ستمبر ۲۹ء، ۲۰ر ستمبر ۲۹ء، ۲۴ر ستمبر ۲۹ء، ۲۸ر ستمبر ۲۹ء میں اس کے خلاف مضامین لکھے گئے، تار دیئے گئے اور صراحۃً بتایا گیا کہ یہ بل اسلامی پرسنل لاء کے خلاف ہے، اس لیے مسلمان اسے ہرگز قبول نہ کریں گے،

۱۸۔ پھر اکتوبر میں یکم اکتوبر ۲۹ء، ۵ر اکتوبر، ۹ر اکتوبر، ۱۳ر اکتوبر، ۱۶ر اکتوبر، ۲۰ر اکتوبر، ۲۴ر اکتوبر، ۲۶ر اکتوبر کے الجمعیۃ کی اشاعتوں میں برابر اس سے اختلاف اور بیزاری کا اظہار کیا گیا، یہ اگرچہ بل کی منظوری کے بعد کے مضامین ہیں مگر میں نے اس لیے ذکر کر دیئے ہیں کہ جناب والا کو مسلمانوں

کی عام بیزاری کی اطلاع بخوبی ہو جائے،

۱۹۔ ستمبر کے وسط سے تمام مسلم پریس اس کی مخالفت اور اظہار بیزاری میں ہم آہنگ ہی، جن اخباروں کے مضامین میں نے خود دیکھے ہیں اُن کے نام یہ ہیں،۔

ہمدرد دہلی، الجمعیۃ دہلی، ملت دہلی، انقلاب لاہور، زمیندار لاہور، سیاست لاہور، پیج لکھنؤ، صراط (شیعہ اخبار) لکھنؤ، ہمت لکھنؤ، الامان دہلی مہاجر دیوبند، الانصار دیوبند، عصر جدید کلکتہ، خلافت بمبئی، حقیقت لکھنؤ امارت پھلواری شریف، ترجمان سرحد، شہاب راولپنڈی، اتحاد پٹنہ، الخلیل میرٹھ،

۲۰۔ بالعموم رہنمایانِ مذہب اور مقتدایانِ قوم نے اس سے بیزاری کا اعلان کیا، مثلاً مولانا محمد علی جوہر صاحب، مولانا ظفر علی خاں صاحب، ڈاکٹر سر اقبال، مولانا ابو المحاسن سید محمد سجاد صاحب، نائب امیرِ شریعت صوبہ بہار، مولانا محمد عرفان صاحب سکریٹری خلافت کمیٹی، میر غلام بھیک صاحب نیرنگ سکریٹری تبلیغ الاسلام انبالہ، مولانا ابو البرکات عبد الرؤف صاحب مجتہد، شمس العلماء مولانا سبط حسن صاحب، مولانا قطب الدین عبد الولی صاحب، مولانا عبید اللہ صاحب بچرایونی، مولانا عمر دراز بیگ صاحب ناظم جمعیۃ علماء صوبہ متحدہ، مولانا سید ولایت حسین صاحب الہ آبادی وغیرہم،

۲۱۔ مذہبی حلقوں اور مذہبی اداروں نے بھی اس کو مذہب کے خلاف قرار دیا، اور اس سے بیزاری کا اعلان کیا، مثلاً جمعیۃ علماءِ ہند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ، اہلحدیث کانفرنس وغیرہ،

۲۲۔ ہندوستان کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں جلسے ہوئے جن میں

ہزار ہا مسلمانوں نے مجمعِ عام میں بالاتفاق اس بل کے مسلمانوں پر اطلاق سے ناراضگی ظاہر کی اور اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا،

ان مقامات اور جلسوں کی روداد بہت طویل ہے، اخبارات میں یہ اطلاعات پیہم شائع ہوتی رہتی ہیں،

۲۳۔ ابھی حال میں، ۷، ۲ر اکتوبر کو دہلی میں ہندوستان کی متعدد مجالس اسلامیہ اور جمعیۃ ہائے قومیہ کے نمائندوں کا ایک جلسہ ہوا ہے، اس میں بالاتفاق اس ایکٹ سے ناراضی اور بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس سے مسلمانوں کو مستثنےٰ کرانے کے لیے انتہائی قربانی تک کا تہیہ کر لیا گیا ہے، یہ تجویز جناب والا کی خدمت میں بھیجی جا چکی ہے،

ان تمام حقائق و واقعات کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس قانون کا اطلاق مسلمان قوم کی ناراضی اور اظہار بیزاری اور عدم قبول کے اعلان کے باوجود مسلمانوں پر کیا گیا ہے، جو اصول و انصاف کے خلاف ہے،

مسلمانوں کے حق میں اس کی حیثیت آئینی نہیں بلکہ جبری ہے،

اس کا بیان یہ ہے کہ فروری ۲۷ء میں اس بل کو رائے صاحب مسٹر ہربلاس ساردا نے ایسے مسودے کی صورت میں پیش کیا تھا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھا، اس کے بعد جب مجلس منتظمہ نے اس کو عام کر دیا اور دوبارہ یہ اسمبلی میں فروری ۲۹ء میں پیش ہوا تو اس پر یہ بجا اعتراض کیا گیا کہ چونکہ یہ بل مسلمانوں کے (پرسنل لا) پر اثر انداز ہے اس لیے بغیر وائسرائے کی منظوری جدید کے زیر غور نہیں آسکتا، اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۶۷ ضمن (۱) کا

حوالہ دیا گیا، لیکن باوجود اس کے اس پر غور نہیں کیا گیا حتیٰ کہ پاس کر دیا گیا،

میری گذارش یہ ہے کہ یہ کارروائی دفعہ ۶۷ ضمن (۱) کی صریح خلاف ورزی ہے اور جبکہ اصولی طور پر یہ اسمبلی میں وائسرائے کی منظوری کے بغیر پیش نہیں ہو سکتا تھا، تو اس لیۓ بعد کی تمام کارروائی مسلمانوں کے حق میں آئینی نہیں ہو سکتی، اور اگر یہ اُن پر نافذ کیا گیا تو یہ نفاذ آئینی نہیں بلکہ جبری ہو گا،

میں یہ اوپر لکھ چکا ہوں کہ ستمبر ۲۸ء ۲۲ مسلمان ممبروں نے اس کو اپنے تحریری بیان میں اسلامی پرسنل لا کے خلاف قرار دیا تھا، اور مسٹر غزنوی نے نشر علماء کا دستخطی فتویٰ بھی اسی مفاد کے لیے پیش کر دیا تھا، تو اس کے بعد فروری ۲۹ء کی یہ کارروائی کہ اس کو بغیر جدید منظوری کے گورنر جنرل کے اسمبلی میں پیش کیا گیا، کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی ہے،

اگر اسمبلی کی غیر مسلم اکثریت اس امر کا فیصلہ کرنے کی بھی مجاز بنا دی جائے کہ کوئی بل اسلامی پرسنل لا کے خلاف ہے یا نہیں تو مسلمانوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ ہو گا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مذہب کے غیر محفوظ ہو جانے کا یقین کر لیں، اور اس قسم کے یقین تو کیا سرسری خیال کے نتائج بھی جناب والا سے مخفی نہ ہوں گے،

اِس قانون کے پاس ہو جانے سے ایک ایسا خطرناک اصول قائم ہو گیا ہے جس سے مسلمانوں کے پرسنل لاء میں مداخلت کا دروازہ کھل گیا ہے،

میں جناب والا کی توجہ اس گہرے اور عمیق رخنے کی طرف مبذول کرانا

اپنا فرض سمجھتا ہوں جو اس قانون کے پاس ہو جانے سے مذہبی آزادی اور نیز مذہب
کے پرسنل لا کی حفاظت کی مضبوط دیوار میں پڑ گیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ مسلمان اپنے
مذہب اور مذہبی احکام کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور انھیں اس کا
بھی یقین ہے کہ اسلام ایک کامل اور مکمل مذہب ہے، اس کا قانون الٰہی قانون
ہے، جس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اُن کے
لیے اس قانون کی قطعاً ضرورت نہیں، اسلام کے قوانین اور احکام نے ان کو
ایسے امور کی بابت قانون ساز مجالس کے مرہونِ منت ہونے سے ہمیشہ کے لیے
بے نیاز کر دیا ہے،

اگر آج اس رخنہ کو بند نہیں کیا گیا تو پھر جس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر یہ قانون
بنایا گیا ہے، اور حفظانِ صحت اور خیر خواہی بنی نوعِ انسان کا جو شریف جذبہ
اس کا محرک بتایا جاتا ہے اسی نظریہ اور اسی جذبہ کی بناء پر ایسے ایسے بل پیش
ہو سکتے ہیں جن کے تصوّر سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، مثلاً کہا جائے گا کہ ایک
مرد کے لیے ایک سے زیادہ زوجہ کا ہونا صنفِ نازک پر ظلم ہے، اور یہ مرد کی صحت
کے لیے بھی مضر ہے اور سوسائٹی کے لیے تعدّدِ ازواج نہایت خطرناک ہے،
اس لیے اس کو قانوناً جرم قرار دیا جائے،

حالانکہ معلوم ہے کہ اسلام میں تعدّدِ ازواج جائز ہے، اور نصِ قرآن مجید
سے ثابت ہے،

اسی طرح مستورات کے لیے بے حجابی کی بابت کسی بل کا پیش ہونا کوئی
مستبعد نہیں ہے، کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ حجاب اور برقعہ پوشی سے مستورات
کی صحت خراب ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اولاد کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی
مستورات کی خرابیِ صحت کا اثر مرد کے مزاج و صحت پر پڑتا ہے، سوسائٹی اس سے

تباہ ہوتی ہے، اس لیے مستورات کو حجاب اور پردہ میں رکھنے کو جرم قرار دیا جائے، اور
اس کے لیے بھی سزائیں تجویز کی جائیں،

اور کچھ مدید زمانہ کے بعد کسی ایسے بل کا آنا بھی ممکن ہے جس کا منشاء یہ ہو کہ
شہر کی عام گذرگاہوں اور لبِ سڑک کسی قوم کے لیے معابد نہ بنائے جائیں بلکہ جو
تعمیر شدہ ہیں ان کو وہاں سے ہٹا دیا جائے، کیونکہ شہر کی تزیین اور عمدہ عمدہ سڑکوں
کے بنانے میں ان سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، اور شہر کے مکانات جو معابد سے متصل
ہیں ان کے رہنے والوں کو اس آواز سے تکلیف ہوتی ہے جو عبادت کے لیے
اُن معابد سے بلند کی جاتی ہے، بالخصوص علی الصباح نہایت سویرے جو اذان
مسجدوں میں دی جاتی ہے وہ بہتوں کی نیند کو خراب کرتی ہے، اس لیے کوئی وجہ
نہیں کہ شہری آبادی کے آرام و آسائش کے لیے اذان پر قانونی پابندیاں عائد
نہ کی جائیں، اور شہر اور سڑکوں کی تزیین کے لیے اندرونِ شہر مساجد اور معابد
کا بنانا جرم قرار نہ دیا جائے،

اور ختنہ جو ایک شعارِ اسلامی ہے اس کو بھی بچوں پر ظلم قرار دے کیا عجب ہے
کہ قانوناً جرم قرار دیا جائے، روشن خیال اور شریعتِ اسلامیہ سے ناواقف اشخاص
نہایت زور شور سے اس قسم کے تمام بلوں کی تائید کریں گے جیسا کہ اس قانون کی
حمایت بھی اسی قسم کے چند مسلمان کر رہے ہیں، اور اس کے بعد جو فتنہ برپا ہوگا
اس کا تصوّر بھی اس وقت ناممکن ہے،

اور یہ کہ نکاح کو آج تک قانونی طور پر بھی مسلمانوں کے پرسنل لاء میں داخل
رکھا گیا تھا تو اگر آج اس قانون کے اسمبلی میں آنے اور پاس ہو جانے کی موجودہ صورت
کو قبول کر لیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے تمام اسلامی قانون
(پرسنل لاء) کو اسمبلی کی غیر مسلم اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے تیار رہو جائیں

کیونکہ ہندوستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت بظاہر حالات ناممکن ہے، اور اس امر کے تصور سے بھی ایک سچے مسلمان کا دل کانپ جاتا ہے،

میں جناب سے درخواست کروں گا کہ اس معاملہ کو صرف اس نظر سے نہ دیکھیں کہ یہ قانون بچوں کی شادی کے انسداد کے لیے بنایا گیا ہے، بلکہ اس کے عواقب و نتائج پر پورا غور فرما کر اس قانون کے ساتھ اس خطرناک اصول کا بھی آئندہ کے لیے سدِ باب کر دیں کہ مسلمانوں کے پرسنل لا، کے متعلق کوئی قانون بھی اسمبلی میں بغیر مسلمان قوم متفقہ منظوری کے پیش کیا جاسکے،

اس قانون کے لیے فرقۂ شیعہ کی جانب سے کوئی قابلِ اعتبار شہادت ہی نہیں لی گئی، اور سنی فرقہ کی شہادت بھی نہایت کم اور ناقابلِ اعتبار ہے، کیونکہ مذہبی اداروں اور اسلامی آزاد حلقوں کی شہادت کالعدم ہے،

مصر اور بعض دیگر اسلامی حکومتوں کی نظیر پیش کرنی اس لیے فضول ہے کہ اسلامی حکومت اور غیر مسلم اکثریت کے احکام میں تباین ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

اس وقت اس طویل مکتوب کے ملاحظہ کرنے کی جناب کو تکلیف دینے کی مجھے ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ سارڈا بل نے آخری مرحلہ آپ کی غیبت میں طے کیا، اور اُس وقت اِس بل کے خلاف جس قدر آئینی اور قانونی کارروائیاں ہوسکتی ہیں سب اختیار کی گئیں، اور بار بار مختلف طریقوں سے توجہ دلائی گئی، مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، اب جبکہ آپ تشریف لے آئے ہیں تو میرا فرض ہے کہ میں جناب کے علم کے لیے تمام واقعات کو پیش کر دوں، اسی کے ساتھ وہ تمام دلائل و براہین اختصار کے ساتھ درج کر دوں جن کی بنا، پر مسلمان اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں، اور بحقِ اہلِ اسلام اسے منسوخ کرانا چاہتے ہیں، تاکہ

جناب والا ان تمام امور پر غور کر سکیں اور ملاحظہ فرما سکیں، کہ مسلمانوں کی اس قانون سے مخالفت کس قدر مضبوط اور مستحکم اصول و دلائل پر مبنی ہے، اور یہ کہ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس مشاورت نے جو ایک آخری فیصلہ اس قانون کے خلاف کیا ہے وہ کن ناگزیر احوال و اسباب کی بناء پر ہے، اس فیصلہ کی نقل جناب کی خدمت میں روانہ کی جا چکی ہے،

آخر میں اس مکتوب کی طوالت کی بابت معافی چاہتا ہوں، کہ اظہار حقیقت کے لیے اتنی طوالت ناگزیر تھی، اور جناب کی پسندی اور آئین نوازی اور فرامین شاہی کی حرمت پروری سے یہ امید رکھتا ہوں کہ جناب اس قانون کو بحق اہل اسلام منسوخ فرما کر مسلمانوں کو مطمئن فرمائیں گے، اور کسی ایسے ابتلا و آزمائش کا موقع نہ آنے دیں گے جس کی کسی انصاف پسند فرماں روا سے توقع ہی نہیں ہو سکتی ہے،

محمد کفایت اللہ غفرلہ
صدر جمعیۃ علماے ہند

۷ر نومبر سنہ ۱۹۲۹ء

معزز حاضرین و برادران ملت!

آپ نے اس مکتوب گرامی کو بغور سنا، اور اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ سارد اایکٹ کن کن وجوہ سے ہمارے مذہب میں مداخلت کرتا ہے،

و نیز یہ کہ یہ ایکٹ ایسا خطرناک وضع کیا گیا ہے کہ جس کے بعد ہمارے تمام اسلامی و شخصی احکام کا محفوظ رہنا خطرات سے خالی نہیں ہے،

اور اسی مکتوب کے مضمون سے آپ پر یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ اس قانون

کے پاس ہونے سے پہلے بھی جمعیۃ علماء ہند اور دیگر اسلامی انجمنوں و اسلامی اخبارات نے حکومت کو کس قدر متنبہ کیا تھا، پھر اس قانون کے پاس ہو جانے کے بعد سے جمعیۃ علمائے ہند نے اس کے خلاف جس قدر ہندوستان کے طول و عرض میں ہیجان و بیداری پیدا کی وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے، لیکن آج تک حکومت نے کوئی کروٹ نہیں بدلی، اس لیئے آج ہم سب لوگوں کو نہایت عزم کے ساتھ یہ اعلان کرنا ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس تحفظ ناموس شریعت اس قانون کو منسوخ کرانے اور حکومت سے ایک مستحکم اصول تسلیم کرانے کے لیے جس قسم کی قربانی کا حکم دے گی ہم سب دل و جان سے اس پر عمل کریں گے، اور سول نافرمانی کا جو پروگرام مرکزی مجلس تحفظ ناموس شریعت ہمارے سامنے پیش کرے گی اور عمل کرنے کا حکم دیگی تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ اس پر عمل کریں گے،

اب اللہ تعالیٰ سے ہماری دعاء ہے کہ ہم کو اس عزیمت پر قائم رکھے، اور اس راہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں اُن سب کو حل کرنے میں ہمیں توفیق عطاء فرمائے، اللہ تعالیٰ شانہٗ وجلّ مجدہٗ کے فضل و کرم سے ہمیں امید ہے کہ وہ ہمیں اس نیک مقصد میں کامیاب فرمائے گا، کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور اس کے سچے بندے ہیں' اور اس کے اصلی پرستار و نام لیوا ہیں، اے باری عزاسمہٗ تو اپنے گنہگار بندوں کے دلوں کو اس قدر مضبوط فرما کہ وہ اسلام کے ناموس کی حفاظت میں ہر طرح ثابت قدم رہیں، تاکہ ہندوستان کی سرزمین پر دینِ اسلام کا جھنڈا عزت و وقار کے ساتھ ہمیشہ سربلند رہے،

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ
وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۝

جمعیت علمائے ہند کی سیاست

اور

مدنی فارمولا

مؤلف

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاںؒ

جمعیت علماے ہند کی سیاست

اور

مدنی فارمولا

''نواے وقت'' مورخہ ۱۴؍ نومبر ۱۹۸۳ء کے صفحہ نمبر ۱۱ پر سیٹھی صاحب کے مضمون کی اشاعت کی وجہ صرف اتنی ہے کہ وہ ایک اختلافی شوشہ چھوڑ کر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کریں اور ایم آر ڈی میں شامل علما کو اپنی طرف متوجہ کر کے حکومت کی حتی المقدور مدد کریں۔ اسی لیے انھوں نے تلخ زبان استعمال کی۔ لیکن انھیں یہ اندازہ شاید نہ ہوگا کہ حضرت مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ ان کے شاگرد اور متوسلین و معتقدین ایم آر ڈی ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کی ہر جماعت میں موجود ہیں۔ اور پاکستان میں آباد اور بڑے مدارس میں شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہو۔ جہاں ان کے بلا واسطہ یا بالواسطہ تلامیذ موجود نہ ہوں!

سیٹھی صاحب کو تعجب ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا رشید احمد صدیقی صاحب نے بزرگ اور ولی کیوں کر شمار کر لیا۔ حال آں کہ سیٹھی صاحب اگر ان کے حالات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ وہ چشتی، صابری، نقشبندی، مجددی اور طریقۂ قادریہ و سہروردیہ ہر چہار سلسلوں میں مجاز تھے۔ شیخ الطریقۃ تھے۔ اور اپنے تمام خلفا کو منتہاے تصوف یعنی مراقبۂ ذات مقدسہ (احسان) تک تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ انھیں سلوک و تصوف میں اپنے دور میں بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ اسی لیے خداوند کریم نے انھیں وہ مقبولیت عطا کی جو اولیاے کرام میں بہت بڑے بڑے اولیا ہی کو حاصل تھی۔ ان کے گرد بیعت ہونے والوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر پر بیعت فرماتے تھے۔ پانچ ہزار تا آٹھ ہزار بیک وقت بیعت ہونے والوں کا اندازہ تحریر کیا گیا ہے۔ جس کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیک وقت بیعت ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک بتائی

گئی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ تعداد بیعتِ جہاد کرنے والوں کی ہو۔ لیکن حضرت مدنی سے بیعت ہونے والے بیعتِ طریقت کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے پاس حضرت مدنیؒ کی تصوف وسلوک کے موضوع پر چند تقاریر ٹیپ تھیں، جنھیں وہ آخر حیات تک سنتے رہے، کیوں کہ مفتی صاحبؒ خود بھی کامل صوفی تھے۔ انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ میں تکمیل سلوک کی تھی۔ رحمہما اللہ رحمۃً واسعۃً! اور یہ بات شاید سیٹھی صاحب کو معلوم نہ ہو کہ (حمید) نظامی صاحب کے محبوب اور ممدوح مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت مدنیؒ ہی سے بیعت تھے۔

۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) میں آپ برِاعظم ایشیا میں علوم دینیہ کے سب سے بڑے مرکز کے سب سے بڑے درجہ کے مدرس یعنی شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور ۱۳۷۷ھ (دسمبر ۱۹۵۷ء) تک اسی مسند پر درسِ حدیث دیتے رہے۔ جن حضرات نے اب سے ستاون سال قبل دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ اگر زندہ ہیں تو آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

سیٹھی صاحب نے استفسار کیا ہے کہ سلہٹ میں جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ وہاں کون صاحب میزبان تھے۔ اس کے جواب کے لیے پورا واقعہ نقل کر رہا ہوں۔

مولانا رشید احمد صاحب صدیقی (کلکتہ) لکھتے ہیں:

"مختلف مقامات پر حضرتؒ کی تقریروں کے پروگرام بنانا اور آپ کے متعلق سفر کے انتظامات کرنا راقم الحروف سے متعلق تھا۔ بہرکیف ہمارا قافلہ ۲۳ر مارچ کی شام کو گوپال پور تھانہ بیگم گنج پہنچا۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا نافع گل اور دیگر چار پشاوری طالب علم ہمراہ تھے۔

چوہدری رازق الحید رچیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ نواکھالی کے دولت کدہ پر قیام ہوا۔ دوسرے دن ایک عظیم الشان جلسہ میں انتخابی تقریر کرنی تھی۔ نمازِ عشاء کے بعد گیارہ بجے طعام تناول کیا اور تقریباً بارہ بجے سونے کی غرض سے آرام فرمانے لگے۔ راقم الحروف پاؤں دباتا رہا کچھ دیر کے بعد آپ کو

نیند آگئی اور ہم لوگ دوسرے کمرے میں ضروری کام کرنے لگے۔

تقریباً دو بجے شب کو راقم الحروف اور چوہدری محمد مصطفیٰ انسپکٹر مدارس (ریٹائرڈ) کو طلب فرمایا۔ ہم دونوں فوراً حاضر خدمت ہوئے۔ ارشاد فرمایا کہ لو بھئی اصحابِ باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا۔ اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بنگال و پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا۔

راقم الحروف نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں، کیا کریں گے؟ آپ نے جواب دیا ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں اور جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اس کی تبلیغ پوری قوت کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ دوسرے دن گوپال پور کے عظیم الشان جلسہ میں تقسیم کی مضرتوں پر معرکہ آرا تاریخی تقریر ارشاد فرمائی اور ایک سال چار ماہ بعد ۳رجون ۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند کے غیر متوقع اعلان سے اس واقعہ کی حرف بحرف تصدیق ہوگئی۔"

یہ واقعہ اوائل ۱۹۴۶ء میں پیش آیا۔

(ملاحظہ ہو شیخ الاسلام نمبر روزنامہ الجمعیۃ، دہلی۔ خصوصی شمارہ جلد نمبر ۴۳ بروز ہفتہ ۲۵رجب ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۵رفروری ۱۹۵۸ء صفحہ نمبر ۱۶۳ و ۱۶۴)

سیٹھی صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں میزبان کا نام بھی ہے۔ ساتھیوں کے نام بھی ہیں اور راویوں کے بھی۔

سیٹھی صاحب نے لکھا ہے:

"حضرت مولانا مدنی اپنے تبحر علمی کے باوجود علمائے ظواہر میں سے تھے ایک خالص سیاسی شخصیت تھے۔"

سیٹھی صاحب نے اگر تصوف کا مطالعہ کیا ہوگا تو وہ یہ بات بآسانی سمجھ سکیں گے کہ اولیاے کرام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اصحاب ارشاد اور دوسرے اصحاب تکوین اصحاب ارشاد جتنے بھی ہوں۔ قطب الارشاد تک سب کے سب ظاہر شریعت پر ہی

چلنے کے پابند ہوتے ہیں۔ان پر جذب کا قطعاً بھی اثر نہیں ہوتا۔وہ اصحاب صحو ہوتے ہیں۔متیقظ اور بیدار مغز، اور یہ فرق قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔پندرھویں پارہ کا آخری اور سولھویں پارے کا پہلا رکوع دیکھ لیں۔

(۲) سیٹھی صاحب کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خالص سیاسی شخصیت نظر آرہے ہیں۔سیاسی ہونا بھی عیب نہیں ہے۔بنی اسرائیل کی سیاست کے فرائض انبیاے کرام انجام دیا کرتے تھے۔

کانت بنو اسرائیل تسوسھم الا نبیاء۔

(بخاری، جلد ا، صفحہ ۴۹)

سیٹھی صاحب نے لکھا ہے:

"لیکن جہاں تک انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد کے حالات میں مسلمانوں کی پوزیشن کا تعلق تھا وہ اس مسئلہ کو ملتوی رکھنا چاہتے تھے کہ آزادی کے بعد ہندوؤں سے معاملہ کرلیا جائے گا۔"

سیٹھی صاحب جیسے اور بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔جنھیں تاریخ کا پورا علم نہ ہو اس لیے حضرت مدنیؒ کے بارے میں ایسا خیال کرتے ہوں گے۔جب کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔کیوں کہ حضرت مدنیؒ اور ان کی جماعت جمعیت علماے ہند کا موقف یہ تھا کہ تقسیم ہندوستان کے سب مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں ہے۔تقسیم سے ان علاقوں کو فائدہ پہنچے گا۔جہاں مسلمان پہلے ہی سے تعداد میں زیادہ ہیں۔اور وہ فائدہ بھی مکمل نہ ہوگا کیوں کہ ان علاقوں کی مسلم آبادی ۵۵.۵ ہے اور غیر مسلم آبادی ۴۴.۵ ہے۔غیر مسلم آبادی مؤثر ترین اقلیت ہوگی۔(اگر پاکستانی علاقوں سے غیر مسلم نہ جاتے تو یہی تناسب تھا) ادھر جو صوبے ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کی مسلم آبادی بہت دشواریوں میں گھر جائے گی اور وہ ضعیف اقلیت بن کر دوسروں کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے اور تقسیم کے بعد پاکستان ایسا ہی ایک پڑوسی ملک ہو جائے گا۔جیسے

افغانستان اور ایران۔

لیکن قاید اعظم نے ان نظریات کا جواب کانپور اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ دیا تھا:

"میں اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے ڈھائی کروڑ (۱) مسلمانوں کو قربان کر کے ان کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

(سہ روزہ اخبار مدینہ بجنور (یوپی) ۹/ جولائی ۴۴ء بحوالۂ کشفِ حقیقت، ص ۵۸ مصنفہ حضرت مدنیؒ)

اس سے بہت پہلے احمد آباد کی تقریر میں فرمایا تھا:

"اقلیت والے صوبوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو۔ لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کرا دیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں۔ تاکہ شریعت اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کر سکیں۔"

(ایمان۔ لاہور۔ مورخہ ۲۸/ فروری ۱۹۴۰ء پاکستان نمبر، بحوالہ "کشفِ حقیقت" ص ۵۹)

معلوم ہوا کہ یہ نکتہ کہ مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ ان کے لیے کون سا فارمولا مفید رہے گا۔ ۱۹۴۰ سے بھی پہلے سے مدارِ فکر چلا آرہا تھا۔ جمعیت کے حضرات یہ بھی برابر کہتے رہے ہیں کہ سب یکجا مل کر بیٹھیں اور اس مسئلہ پر غور کر کے ایک بات طے کر لیں، ہر پہلو پر بحث و تمحیص کے بعد جو کچھ طے ہو اس پر سب متفق ہو کر چلیں۔

ملاحظہ ہو "کشفِ حقیقت" کا آخری صفحہ

حضرت مدنیؒ جمعیت علماء ہند کے صدر تھے۔ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ (ناظم عمومی) تھے۔ آئیے آپ کو ان کی اس زمانہ کی ایک تحریر دکھلائیں جس سے امید ہے آپ کی تاریخی معلومات میں اضافہ ہوگا اور یہ بھی کھل کر سامنے

آ جائے گا کہ جمعیت کا موقف کیا تھا۔ کیا ان کا موقف وہ تھا جو بقول سیٹھی صاحب کانگریس کہتی تھی یا اپنا جدا فارمولا تھا۔ اور وہ آخر تک چاہتے رہے تھے کہ مسلمان سب مل کر بیٹھیں اور حل نکالیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن تحریر فرماتے ہیں:

صحیح طریقۂ کار:

''آخر میں بصد عجز والحاح پاکستانی اور لیگی حضرات کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ صحیح طریق کار وہ نہیں ہے، جو مسلم لیگ کے قایدِ اعظم نے اختیار کررکھا ہے۔ بلکہ مسلم مفاد کے لیے سب سے بہتر طریق کار یہ ہے کہ تمام مسلم جماعتیں پارٹی بازی یا جماعتی برتری کے غیر اسلامی تصور سے بالاتر ہو کر ایک جگہ بیٹھیں اور پھر دیانت وسنجیدگی کے ساتھ تمام پیش کردہ مسلم اسکیموں پر غور کریں۔ تاکہ سب مسلمان ایک نقطے پر جمع ہو کر متفقہ طور سے ایک مسلم مطالبہ حکومت اور کانگریس کے سامنے پیش کرسکیں اور کسی جماعت اور کسی پارٹی کو اس سے اختلاف نہ ہو۔ چوں کہ جمعیت علمائے ہند بار بار اس اقدام کے لیے مسلم لیگ کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دے چکی ہے۔ اس لیے اب مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے کا اعلان کرے۔ ورنہ تو ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ حالت کا نتیجہ محض یہ ہے کہ صرف حکومت اس سے فائدہ اٹھارہی ہے۔ اور خدا جانے کب تک اٹھاتی رہے گی۔ وہ کبھی پاکستانی حضرات کو طفلِ تسلی دیتی رہے گی۔ اور کبھی کانگریسیوں کو سراہنے لگے گی۔''

''اگر میری اس گذارش کو نیک خواہی پر محمول کر کے اس صحیح طریق کار کو اختیار کرلیا جائے تو اگرچہ آج ہندوستان کو ڈومی نین اسٹیٹس (درجۂ نو آبادیات) سے زیادہ نہ ملے۔ مگر اس کے بعد وہ وقت بھی جلد ہی آجائے

گا۔ جب تھوڑی سی جدوجہد سے ہمارا یہ ملک آزادی کامل کی منزل تک بھی پہنچ جائے گا۔

واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔ ''

جمعیت علمائے ہند کا فیصلہ:

پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے!

ہم ذیل میں جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء کا فیصلہ اور اس کے بعد کی اضافہ کردہ تشریح درج کرتے ہیں۔ تا کہ ہر ایک انصاف پسند طالب حق یہ فیصلہ کر سکے کہ جمعیت علما صرف نفی کے پہلو پر عامل نہیں۔ بلکہ پاکستان اسکیم کے مقابلہ پر ایک ایسا حل بھی پیش کرتی ہے، جس سے مسلمانوں کو وہ تمام فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، جو تحریک پاکستان کے حامی پیش کرتے ہیں۔ مزید برآں پورے ہندوستان میں ان کی قوت اور ان کا رسوخ باقی رہتا ہے (ذیل میں وہ فیصلہ ملاحظہ فرمایئے، جو اجلاس سہارن پور ۱۹۴۵ء میں ہوا):

''جمعیۃ علما ہند کا یہ اجلاس عام اس جمود و تعطل کی حالت کو ملک وقوم کے لیے نہایت مضر اور ملی حیات و ترقی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام معتدبہ جماعتیں اور عام پبلک حصول آزادی کے لیے بے چین و مضطرب ہے اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز کر رہے اور شائع کر رہے ہیں۔ مجلس عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء کی تجویز کر چکی ہے۔ آج پھر اس کی تجدید کرتی ہے اور آخری حصے کی رفع اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کر دینی مناسب سمجھتی ہے۔ یہ بات بدیہی اور مسلمات میں سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا، جب تک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے اور ہندوستان کے متفقہ

مطالبے کی تشکیل اور متحدہ محاذ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائیں گے۔ اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائے گی۔ جمعیت علمائے ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کرلیں۔ اور اسی بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کردیں۔

الف: ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

ب: وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی، وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے۔ جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

ج: ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

د: ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی: مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔"

"تشریح: اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے مگر جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے۔ کیوں کہ اس کے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں

کے لیے بھی مفید ہے۔ مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کرلیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے، باہمی افہام و تفہیم سے مندرجۂ ذیل صورتوں میں کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے ممکن ہے:

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو: ۴۵٪ مسلم: ۴۵٪ دیگر اقلیتیں: ۱۰٪

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳، اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے، یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳، اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

نوٹ نمبر ۱:

مندرجہ بالا تجویز ''الف'' سے بشمول ''د'' تک اجلاس لاہور منعقدہ

۱۹۴۲ء میں پاس ہوچکی تھی۔ اس پر مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری، یکم و دوم فروری ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد یہ پوری تجویز مع تشریح جمعیۃ علما ہند کے چودھویں اجلاس عام بمقام سہارن پور منعقدہ ۴، ۵، ۶، ۷ ر مئی میں منظور کی گئی۔

نوٹ نمبر ۲:

ہر تجویز کے ساتھ اگر مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس سہارن پور منعقدہ ۳ راگست ۱۹۳۱ء کے فارمولے کی مندرجہ ذیل دفعات بھی پیش نظر رہیں، تو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نقشہ ہر مسلمان کے سامنے آسکتا ہے۔ اور وہ بآسانی یقین کرسکتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی تائید و حمایت سے نہ صرف یہ کہ پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ کر رہ جائے، بلکہ پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا ہے۔ جس میں شرعی محکمے اور دارالقضاء قائم ہوں۔ اور پرسنل لا (یعنی شرعی احکام) کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعہ سے پورے ہندوستان میں نافذ ہو۔

مجلس عاملہ اجلاس سہارن پور کے منظور کردہ فارمولے کی چند دفعات:

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی عقاید، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، آزاد ہوں گی۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گا۔ اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی۔ (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع عنین و مفقود، نفقہ، زوجیت، حضانت، ولایت نکاح و مال، وصیت، وقف، وراثت، تکفین و

تدفین، قربانی وغیرہ)

(۴) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے۔ مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ ناظم اعلیٰ جمعیت علماے ہند (دہلی)"

تحریک پاکستان پر ایک نظر۔" از صفحہ نمبر ۵۹ تا ختم مؤلفہ: حضرت علامہ الحاج مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ مرکزیہ جمعیت علماے ہند: ناشر ناظم جمعیت علماے ہند (دہلی) مطبوعہ دتی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی

ان اکابر کے فارمولے کے مطابق معرض وجود میں آنے والی حکومت میں مسلمان مرکز میں بڑی طاقت ہوتے اور آسام، بنگال، پنجاب، کشمیر، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں غالب ہوتے اور مذہبی معاملات میں اور تمام صوبائی امور میں خودمختار ہوتے اور اقلیت والے صوبوں میں انھیں مذہبی امور میں حق استرداد حاصل ہوتا۔

نوٹ:

یہی وہ فارمولا تھا جسے دیکھ کر پہلے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے پرزور تائیدی کلمات لکھے تھے کہ

"مسلمانوں کے اطمینان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی عمدہ تجویز نہیں۔"

اور پہلے اس فارمولے پر مسلم لیگ بھی متفق تھی۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو طویل عرصہ تک ناظم جمعیت علماے ہند رہے۔ پھر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات پر ناظم عمومی (جنرل سیکرٹری) رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی یاد میں الجمعیۃ کے مجاہد ملت نمبر میں

اپنے ایک طویل مضمون میں بہت سے احوال و واقعات قلم بند فرمائے ہیں۔ان میں اس فارمولے کا پورا خاکہ دیا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ہر جماعت کو اختیار تھا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو فارمولا مسلمانوں کے لیے زیادہ فلاحی سمجھے، پیش کرے۔اگر جمعیت علماے ہند نے اپنا فلاحی فارمولا پیش کیا، تو کیا جرم کیا؟

اس بحث کے لیے ان ہی تاثرات کے تحت ایک عنوان بھی قائم فرماتے ہیں کہ ''جرم کیا تھا؟'' اور پھر فارمولا بیان کرتے ہیں۔ہم یہ بیان بعینہٖ نقل کررہے ہیں:

''جرم کیا تھا؟:

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں بڑا ظلم جمعیت علماے ہند پر کیا جاتا رہا۔برطانوی مشنری جمعیت علماے ہند کے خلاف کام کررہی تھی اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔کیوں کہ جمعیت علماے ہند اس کی حریف تھی اور ہندوستان سے اس کا نام ونشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتوں پر صرف کررہی تھی۔اوّل یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا ہے۔مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔یہ کوئی مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔صرف کانگریس کی ہم نوائی، ان کا نصب العین ہے۔

جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی پروپیگنڈے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتے۔خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر

بلکہ مسحور بنادیا تھا۔ لامحالہ جمعیت علماے ہند کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا بن کر ناکام ہوتی رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیت علماے ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی اور ایک ایسا فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کامیاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے، جن کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی حصے کا کامیاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلہ پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا۔ اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بچاؤ پر صرف ہو رہا ہے اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضب ناک اکثریت کے شکنجہ میں کسی ہوئی بے یار و مددگار واویلا کر رہی ہے۔ یہ افسوس ناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمائیے جمعیت علماے ہند کے فارمولے کے اہم اجزا یہ تھے؛

۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو باقی تمام غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو؛

ہندو: ۴۵٪ مسلمان: ۴۵٪ دوسری اقلیتیں: ۱۰٪

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے، وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔''

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا؛

الف۔ اہم پورٹ فولیو (قلم دان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی۔

ب۔ صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعاً خودمختار ہوتے۔

ج۔ پورا صوبہ پنجاب راول پنڈی سے لے کر ضلع سہارن پور کی سرحد تک۔

د۔ پورا صوبہ بنگال، جس کا دارالحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا۔ مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔

ہ۔ صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا تقریباً مساوی حصہ ہوتا۔ کیوں کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۴۴، ۴۵ فی صدی تھے۔

و۔ ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے کیوں کہ۔

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صد ہوتا۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی مؤثر شمولیت ہوتی۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ ورانہ امور میں ان کو حق استرداد حاصل ہوتا۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فی صد ہوتی اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ کیوں کہ اسمبلی، پارلیمنٹ، یا کیبنٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کر سکتی۔

وزارتی مشن کی توجہ کا مرکز:

اس فارمولے کو اس پر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بہر حال ''مضیٰ ما مضیٰ'' اب اس داستان پارینہ سے کیا فائدہ؟ مگر مجاہد ملت'' کے حالات کے تذکرہ میں

اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ تاکہ کل نہیں تو آج اندازہ ہو سکے کہ مخالفت کرنے والے کہاں تک حق پر تھے اور مجاہد ملت کی سرفروشانہ جاں فشانی کس مقصد کے لیے تھی۔

جمعیت علماے ہند کا فارمولا ایک مثبت فارمولا تھا اور جمعیت علماے ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا۔ کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کر سکتے تھے۔ چناں چہ وزارتی مشن آیا تو جمعیت علماے ہند کے نمایندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا۔ بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں واضح کر دیا۔ ہے کہ ان کا پیش کردہ فارمولا ''وزارتی مشن'' نے منظور کر لیا تھا۔

یہی وہ فارمولا ہے۔ جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا۔ مزید تفصیل چند سطر وبا کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

وزارتی مشن کی آمد اور جمعیت علماے ہند کی نمایندگی:

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہنچ گیا لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر وفد کے ارکان تھے۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات کے پورے مطالعہ کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور چوں کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کیے ہوئے تھیں۔ لہٰذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی۔ کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چناں چہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم (صدر آل انڈیا مسلم مجلس) شیخ حسام الدین صاحب صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام، شیخ ظہیر صاحب، صدر آل انڈیا مومن کانفرنس، ان تینوں جماعتوں کے

سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات) ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس نمایندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمائندگانِ پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے، جس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینوں کو خاموش کر سکے اور جس کی پر مغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے۔ ایسی شخصیت جو ان اوصاف کی حامل ہو، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت تھی۔ لہٰذا آپ کو بھی اس نمایندہ وفد میں شریک کیا گیا۔

۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی۔ جمعیت علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زائد ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا تھا۔ اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس کتاب میں اس فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ "جمعیت علماء ہند کا فارمولا تھا۔ جو جمعیت علماء ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا اور اجلاس سہارن پور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی۔

وزارتی مشن پلان کی بنیاد:

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اخبار بین طبقہ کو تقریباً ۱۶ سال پہلے کی یہ بات فراموش نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ٹھیک ایک ماہ بعد ۱۶/مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انھی لائنوں اور انھیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیت علماء ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لیے مضرت رساں قرار دیا تھا۔

عارضی حکومت کا قیام:

انھی سفارشات کی بنیاد پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے۔ یعنی ۱/۳ سے کچھ زیادہ (۲) اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

مگر بخت واژگوں نے پھر پلٹا کھایا۔ لیگ کی طرف سے ردعمل تو لازمی تھا۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دورخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خونریزی بھی شامل کردی، انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اور اس مرتبہ کانگریس کی غیر معمول اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی۔

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پر پیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتائج کسی ایک فیصلے پر متحد کرنے کے بجائے ہر ایک فریق کے لیے متضاد دلائل مہیا کر رہے تھے۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے۔ ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کے لیے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں۔ (جنھوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرا لیا تھا جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔)

اس ایک واقعہ سے قوم پرور مسلمانوں کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانون ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ کہ اکثریت ان کی دست نگر بن جائے۔

اور اسی ایک واقعے نے سردار پٹیل جیسے ہندوازم کے حامیوں کو یہ سبق دے دیا

تھا کہ تقسیم ضروری ہے۔ کیوں کہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندوازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی۔

فرقہ پرستی کہاں کہاں تھی؟

کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھ مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی۔ مگر سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کو ثابت کیا اس کے لیے فرقہ پرستی کے سوا کوئی اور عنوان نہیں ہوسکتا۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لیے ''زہریلی سامپردایکتا'' کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔

بہرحال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا۔ جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پر کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ بے شک وہ ہر لحاظ سے کامیاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اگر کسی بااصول جماعت کی کامیابی کا مدار اصول کی کامیابی پر رکھا جائے، تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی۔ کیوں کہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد اور بلاتفریق مذہب و ملت ہندوستان کی تمام قومیتوں کا اتحاد، یہ دونوں اصول پاش پاش ہو گئے!

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا:

''حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو، اس کو تسلیم کر لے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے، بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے۔ کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جدا نہیں ہوئی، لیکن وہ حق خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا

چاہیں۔ انھیں مجبور بھی نہ کیا جائے۔"

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی؟ یہ وہی فرقہ واریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پر رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوس ناک اثر یہ تھا کہ ۳رجون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی اسکیم کا اعلان ہوا اور ۱۶رجون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کر دی۔"

(الجمعیۃ کا مجاہد ملت نمبر، صفحہ ۵۸ تا ۶۱، خصوصی شمارہ، مطبوعہ دہلی)

آپ نے یہاں تک پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ جمعیت علماے ہند کا اپنا الگ فارمولا اور موقف تھا۔ جیسے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے جدا جدا فارمولے تھے۔ مسلم لیگ اور جمعیت کے فارمولوں کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے کون سا فارمولا بہتر رہے گا اور یہ حضرات اپیلیں کرتے رہے ہیں کہ جمع ہو کر بیٹھیں اور ہر فارمولے کے روشن و تاریک پہلوؤں پر غور کر کے دو میں سے ایک پر اتفاق کر لیں۔ اس میں کانگریس کی ہم نوائی کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ بات بہت ہی غلط مشہور کی جارہی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور تاریخی واقعے کے قطعاً خلاف ہے۔ ایسی بدگمانیوں سے پرہیز کرنا اور غلط بیانیوں سے تائب ہونا از بس ضروری ہے۔ اب ہمیں تاریخ کو تو ہرگز مسخ نہ کرنا چاہیے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور پاکستان:

علامہ عثمانیؒ کے ذہن میں پاکستان کا یہ خاکہ تھا کہ پورا آسام، پورا بنگال، پورا پنجاب اور کشمیر کے کافی حصے پر مشتمل ایک مضبوط مملکت ہوگی۔ جہاں اسلامی نظام نافذ ہوگا۔

لیکن پاکستان جب معرض وجود میں آیا تو وہ علامہ عثمانیؒ کے تصور کردہ خاکے سے بہت چھوٹا بنا۔ تقریباً پورا آسام، نصف بنگال ہندوستان میں رہ گیا۔ پنجاب پورا ہوتا تو دہلی پاکستان میں ہوتی کیوں کہ دہلی جمنا پار نہیں ہے۔ دہلی سے آگے دریائے جمنا ہے

اور بنگال پورا ہوتا تو ٹاٹا کے کارخانہ اور کلکتہ کا عظیم شہر اور بندرگاہ پاکستان میں ہوتیں۔
یہ علامہ عثمانیؒ کا خیال تھا جو پورا نہ ہوسکا۔ علامہ عثمانیؒ اور حضرت مدنیؒ کے مناظرے کا
قصہ فرضی ہے۔ جب یہ قصہ وضع ہوا تو حضرت مدنی نے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ جس
کا نام ''کشف حقیقت'' ہے۔ اس کے کچھ حوالے ابھی آپ نے پڑھے ہیں۔

سیٹھی صاحب نے سوال کیا ہے کہ حضرت مدنیؒ کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ بھائی
وہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے، تنخواہ لیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں تنخواہ اور
اس کے لینے میں احتیاط کہ اگر وہ غیر حاضر ہوتے تھے تو اپنی تنخواہ میں سے غیر حاضری
کے دنوں کی تنخواہ خود دفتر محاسبی دارالعلوم کو واپس کردیتے تھے۔ یہ سب کچھ آپ کو
دارالعلوم کے ریکارڈ میں مل جائے گا۔ وہاں خط لکھ کر دریافت کرلیں (۳)۔

ایک مسلمان جو قرآن پاک پڑھتا ہو، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ رزق رسانی خدا
کا کام ہے۔ بارھواں پارہ اسی آیت سے شروع ہوا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي
الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (سورۂ ہود:۶)۔ اور اٹھائیسویں پارہ میں خدا کا وعدہ
ہے۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (سورۂ طلاق:۳)۔ جو خدا پر بھروسا
کرے، خدا اس کے لیے کافی ہے۔ پھر ایسا سوال اٹھانا ایک مسلمان کی شان سے بعید
ہے۔

تقسیم ہند کے بعد:

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ تقسیم ہند کے بعد ان حضرات نے مشرقی پنجاب
میں لاکھوں مسلمان برآمد کیے، جو وہیں رہ گئے تھے۔ انھوں نے بظاہر ترک اسلام
کرکے ہندوانہ وضع اختیار کرلی تھی۔ ان کو سہارا دیا، حوصلے بلند کیے، ان کے لیے شبینہ
مدارس قائم کیے۔ اسی طرح وہاں جا بجا تبلیغی جماعت پہنچی اور یہ کام سر ہتھیلی پر رکھ کر
انجام دیا۔ جزاھم اللہ خیرا الجزاء

حضرت مدنیؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو بھی اس زمانے میں اپنے

وطن سرگودھا آنے سے روکے رکھا۔ حضرت مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ بھی یو پی، پنجاب سرحد پر واقع شہر سہارن پور ہی میں قیام فرما ہے۔ یہ حضرات مسلمانان ہند اپنی اپنی جگہوں پر جمے رہنے اور مستقل آباد رہنے کا ذریعہ بنے، جو بلاشبہ بڑا جہا ہے۔ دنیائے اسلام کے نامور عالم مولانا السید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان ہی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے۔ میں ان کی اس تحریر پر مضمون ختم کرتا ہوں۔ تحریر فرماتے ہیں:

ایک بہت بڑا کارنامہ:

''مولانا کا ایک بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے، یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمان کی بقاو قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آگئے۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار دور ایسے گزرے ہیں، جب مسلمانوں اور اسلام کی بقا کا سوال آگیا۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا۔ اصل مسئلہ سہارن پور کے مسلمانوں کا تھا اور سارا دارومدار انھی پر تھا۔ اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ دیتے تو یو پی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آجاتے۔ سہارن پور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ پر تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہونا تھا۔ لیکن یہ دو صاحب عزم مجاہد بندے وہاں جمع رہے۔ ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیو بند ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا یہ رائے پور اور دیو بند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے متصل ہیں۔ جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا۔ لیکن یہ اللہ کے بندے

پورے عزم واستقلال کے ساتھ جمے رہے اور انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں اور اگر فتویٰ کی ضرورت ہو تو ہم فتویٰ دینے کو تیار ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جو مسجدیں قائم ہیں۔ اور ان میں جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں۔ اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ انھیں کا طفیل ہے۔ ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور جو فیوض و برکات ان سے صادر ہورہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انھیں کے مرہون منت ہوں گے اور ان سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا۔ اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں بھی کیں اور اپنے ذاتی اثر ورسوخ اپنی تقریروں اور خود اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے اور اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔"

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم ماخوذ از واقعات، صفحہ ۲۱۹)

(مولانا سید) حامد میاں غفرلہٗ

دوشنبہ ۲۹ رصفر ۱۴۰۴ھ

مطابق پیر ۵ ردسمبر ۱۹۸۳ء

جامعۂ مدینہ۔ کریم پارک، راوی روڈ۔ لاہور ۲

حواشی:

(۱) تقریر میں انھوں نے یہی فرمایا تھا۔ ورنہ اس وقت انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے چار کروڑ تھی اور اب کم از کم بارہ کروڑ ہیں۔ (مولانا سید حامد میاں)

(۲) لیکن نہایت افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ مسلم لیگ نے اپنی پانچ سیٹوں میں سے ایک سیٹ پر جوگندر ناتھ منڈل کو نامزد کر دیا! کہاں تو کانگریس کی طرف سے ایک مسلمان کی نامزدگی پر جھگڑا تھا اور کہاں عدم تدبر کا یہ عالم کہ اپنی پانچ سیٹوں میں سے بھی ایک سیٹ ایک غیر مسلم کے حوالے کر دی۔ اگر یہ بے تدبیری نہ کی جاتی تو مرکز میں صورت حال یہ ہوتی: مسلمان: ۶، ہندو: ۵، اقلیتی نمایندے: ۳

اس کے بعد اگر تدبر اور فراخ دلی کا ثبوت دیا جاتا جو ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں سے زیادہ متوقع تھا۔ تو اقلیتی نمایندوں کو اپنے ساتھ ملا کر پوری کیبنٹ کو اپنے قبضۂ اختیار میں لیے سکتے تھے (ا۔س۔ش)

(۳) اب دارالعلوم کے دفتر سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب دہلی کے بعض لیگی اخبارات نے یہ بہتان طرازی کی کہ مولانا مدنی کانگریس کی سیاسی تحریک چلاتے ہیں اور تنخواہ دارالعلوم سے لیتے ہیں۔ کتابیں ختم نہیں ہوتیں، امتحان سر پر آجاتے ہیں تو رات دن الٹا سیدھا پڑھا کے برائے نام ختم کرا دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں لاہور کے اخبار انقلاب نے ان الزامات کو خوب اچھالا اور فتنے کو ہوا دی۔ ان حالات میں حضرت شیخ الاسلام نے خود اپنے قلم سے ملازمت کی شرائط کی صراحت کے ساتھ ملازمت کے آغاز سے اس وقت تک ماہوار ایام کار تعطیلات استحقاقی رخصتوں اور وصول شدہ و وضع کردہ تنخواہوں کا حساب مہتمم دارالعلوم کی تصدیق کے ساتھ پہلے ''الجمعیۃ'' دہلی میں بعدہ ''اظہارِ حقیقت'' کے عنوان سے ایک کتاب کی شکل میں چھپوا دیا تھا۔

یہ کتاب لاہور میوزیم (لاہور) کے مہر کلیکشن میں موجود ہے۔ خاکسار نے میوزیم سے اس کا عکس حاصل کر لیا تھا اور اب اسے حضرت مولانا مدنی کے ''مقالات سیاسیہ'' متعلق حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈایری میں مرتب کر دیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

ضمیمہ:

جمعیت علماے ہند کا فارمولا

مولانا سید حامد میاں" کے رسالے میں جو ابھی آپ کے مطالعے میں آیا ہے۔
جمعیت علماے ہند کے فارمولے کے متعلق مولانا سید محمد میاں کی تحریر و وضاحت کا
مختصر حوالہ آیا ہے۔ یہاں محولہ تحریر کا تمام ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے۔(ا۔س۔ش)

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں ایک بڑا
ظلم جمعیت علماے ہند پر کیا جاتا رہا۔

برطانوی مشنری جمعیت علماے ہند کے خلاف کام کر رہی تھی اور اس کو ایسا ہی
کرنا چاہیے تھا کیوں کہ جمعیت علماے ہند اس کی حریف تھی اور ہندوستان سے اس کا
نام ونشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتیں پر صرف کر رہی تھی:

اول یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا
ہے۔ مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔ یہ کوئی
مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔ صرف کانگریس کی ہم نوائی ان کا نصب العین ہے۔

جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی
پروپیگنڈے کا مقابلہ کام یابی کے ساتھ کر سکتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں
کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور بنا دیا تھا۔ لامحالہ جمعیت
علماے ہند کی آواز "نقار خانے میں طوطی کی صدا" بن کر ناکام ہوتی رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیت علماے ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی
اور ایک ایسا فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کام یاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ
نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے جن کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی حصہ کا

کام یاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلے میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلے پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا، اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بچاؤ پر صرف ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضب ناک اکثرت کے شکنجے میں کسی ہوئی بے یار و مدد گار رو اویلا کر رہی ہے، یہ افسوس ناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے جمعیت علماے ہند کے فارمولے کے اہم اجزا یہ تھے:

"۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو، اور باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، دوسری اقلیتیں ۱۰

۵۔ جس مسئلے کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے، وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔"

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا:

"الف۔ اہم پورٹ فولیو (قلم دان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی۔

ب۔ صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعاً خود مختار ہوتے۔

ج۔ پورا صوبہ پنجاب، راول پنڈی سے لے کر ضلع سہارن پور کی سرحد تک۔

د۔ پورا صوبہ بنگال جس کا دارالحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا، مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔

ہ۔ صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی ہوتا۔ کیوں کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۳۴، ۳۵ فی صدی تھے۔

و۔ ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے۔ کیوں کہ:

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صدی ہوتا۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی موثر شمولیت ہوتی۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد حاصل ہوتا۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فی صدی ہوتی۔ اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ کیوں کہ اسمبلی، پارلیمنٹ یا کیبنٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کرسکتی۔''

اس فارمولے کو اس پر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

جمعیت علماے ہند کا فارمولا ایک مثبت فارمولا تھا اور جمعیت علماے ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کرسکتے تھے۔ چناں چہ وزارتی مشن آیا تو جمعیت علماے ہند کے نمایندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں واضح کردیا ہے کہ ان کا پیش کردہ فارمولا ''وزارتی مشن'' نے منظور کرلیا تھا۔ یہی وہ فارمولا ہے جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا۔ مزید تفصیل چند سطروں کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

وزارتی مشن کی آمد:

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہنچ گیا۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر وفد کے ارکان تھے۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات کے پورے مطالعہ کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور چوں کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کیے ہوئے تھیں لہٰذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چناں چہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم صدر آل انڈیا مسلم مجلس، شیخ حسام الدین صاحب صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام، شیخ ظہیر الدین صاحب صدر آل انڈیا مومن کانفرنس، ان تینوں جماعتوں کے سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات) ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس نمایندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمایندگان پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے۔ اس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینوں کو خاموش کر سکے اور جس کی پرمغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے۔ ایسی شخصیت جو ان اوصاف کی حامل ہو، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت تھی۔ لہٰذا آپ کو بھی اس نمایندہ وفد میں شریک کیا گیا۔

جمعیت کے وفد کی ملاقات:

۱۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی۔ جمعیت علمائے ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا وزارتی مشن نے اس

فارمولے سے یہاں تک دل چسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زاید ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اوراس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا تھا اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا مولانا آزاد نے اس کتاب میں فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمعیت علماے ہند کا فارمولا تھا جو جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا۔ اوراجلاس سہارن پور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی۔

سیاسیات سے دل چسپی رکھنے والے اخبار بین طبقے کو تقریباً سولہ سال پہلے کی یہ بات فراموش نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ایک ماہ بعد ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انھیں لائنوں اور انھیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیت علماے ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لیے مضرت رساں قرار دیا تھا۔

ان سفارشات کی بنیاد پر ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے یعنی ۱/۳، سے کچھ زیادہ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

مگر بخت واژگون نے پھر پلٹا کھایا۔ لیگ کی طرف سے ردِ عمل تو لازمی تھا۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دورخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خون ریزی بھی شامل کردی۔ انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اوراس مرتبہ کانگریس کی غیر معمولی اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی۔

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پُر پیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتایج کسی ایک فیصلے پر متحد کرنے کے بجاے ہر ایک فریق کے لیے متضاد دلائل مہیا

کر رہے تھے۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کے لیے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں۔ (جنھوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرالیا تھا جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا)۔

اس ایک واقعہ سے قوم پرور مسلمانون کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں، بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں کہ اکثریت ان کی دست نگر بن جائے۔

اور اسی ایک واقعہ نے سردار پٹیل جیسے ہندوازم کے حامیوں کو یہ سبق دے دیا تھا کہ تقسیم ضروری ہے۔ کیوں کہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندوازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی۔

فرقہ پرستی کہاں کہاں تھی؟:

کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی۔ مگر سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کا ثبوت پیش کیا اس کے لیے بھی فرقہ پرستی کے علاوہ کوئی اور عنوان نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لیے "زہریلی سامپردایکتا" کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔

بہرحال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پر کام یاب تصور کیا جاتا ہے۔ بے شک وہ اس لحاظ سے کام یاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اگر کسی با اصول جماعت کی کام یابی کا مدار اصول کی کام یابی پر رکھا جائے

تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی۔ کیوں کہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد، اور بلاتفریق مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کی قومیت کا اتحاد، یہ دونوں اصول پاش پاش ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا:

"حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو، اس کو تسلیم کر لے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے۔

کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریے سے جدا نہیں ہوئی لیکن وہ حق خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں، انھیں مجبور کرنے کے وہ خلاف ہے۔"

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی؟ یہ وہی فرقہ واریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پر رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوس ناک اثر یہ تھا کہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی اسکیم کا اعلان ہوا۔ اور ۱٦ر جون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کر دی۔

جمعیت علماے ہند اور مسئلہ تقسیم:

لیکن تاریخی نوشتوں میں یہ صداقت اور اصول پسندی سنہری حرفوں سے درخشاں رہنی چاہیے کہ اس بدترین بحرانی دور میں جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسا سنجیدہ اور دانش مند مدبر بھی ہر ایک دماغ کو مجبور پا رہا تھا، جو پلیٹ فارم اس مجبوری سے مستثنیٰ رہا وہ جمعیت علماے ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اور ممبران کانگریس میں جو رہنما اس مجبوری سے محفوظ رہا، وہ مجاہد ملت حفظ الرحمٰن تھا۔

ابھی تقسیم ہند کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ صرف ارباب بصیرت اراکین جمعیت علماے ہند نے اس کے آثار سیاسی فضا میں محسوس کیے تھے کہ اسی احساس کی جمعیت علماے ہند نے اپنے اجلاس لکھنؤ مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۴۷ء میں تقسیم کی مضرتیں ظاہر کرتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور جب ۳ر جون کو تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تو ۲۴ر جون ۱۹۴۷ء کو جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ نے دوبارہ بیزاری کا اظہار کیا اور سختی سے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ (الجمعیۃ، دہلی۔ مجاہد ملت نمبر ا، ص ٦١۔ ۵۸)

(۲۰)

مجموعۂ سہ رسائل

خانقاہ تھانہ بھون کے دو فتاویٰ

اور

ایک دیگر تحریر کے جواب میں

مرتب

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

فہرست

پیش لفظ

تھانویؒ اور عثمانی جماعت کے بعض حضرات نے کانگریس اور لیگ کے بارے میں غلط مذہبی استدلالات، ناقص مطالعہ و معلومات یا تدلیس و تلبیس اور تصرفات سے کام لے کر جو لٹریچر فراہم کر کے مسلمانوں کی غلط رہ نمائی کی تھی اس کا نہایت مدلل اور مسکت جواب دیا گیا تھا، اس سلسلے میں:

۱۔ فتویٰ تھانہ بھون کا جواب	شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۲۔ مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتوے پر تبصرہ	مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
۳۔ شرکت کانگریس اور شریعت غرا	مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
۴۔ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا جواب	مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ
۵۔ اشراف الافادات	مولوی عبدالاحد سورتی
۶۔ نفع المہتدی	مولانا عبدالحق نافع گل

یہ تمام رسائل میرے پیش نظر ہیں۔

ان کے علاوہ اس موضوع پر اور ان مباحث میں کثیر اور لائق مطالعہ و مفید لٹریچر موجود ہے۔ لیکن مذکورۃ الصدر رسائل دلائل کی پختگی، مضامین کی متانت تحریر کی سنجیدگی، اسلوب کی سادگی، طرز کلام کی شایستگی میں اپنا جواب آپ ہیں، یہ تمام رسائل میرے پیش نظر ہیں۔

پہلا رسالہ حضرت شیخ الاسلام کے ''مجموعہ مقالات سیاسیہ'' (حصہ اول) میں اور دوسرا اور تیسرا رسالہ مورخ اسلام اور ترجمان علمائے حق مولانا سید محمد میاں کے ''مجموعہ مقالات سیاسیہ'' (حصہ دوم) میں شامل ہیں۔ آخر الذکر تینوں رسالے ''مجموعہ رسائل'' کے ٹائٹل کے تحت مرتب کر دیے گئے ہیں اور زیر نظر ''مجموعہ مقالات سیاسیہ'' (حصہ سوم) میں شامل کیے جارہے ہیں۔

تمام رسائل تبصرہ و توصیف سے بلند ہیں، امید ہے کہ تاریخ سیاست کے شائقین اور طالب علموں میں اپنی تاریخی اہمیت اور علمی افادیت کے لحاظ سے ضرور پسند کیے جائیں گے۔

خاکسار

ابوسلمان

۲۸ رجون ۲۰۰۰ء

پہلا رسالہ

خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون

کے سوالوں کا جواب

از قلم

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ

مطبوعہ

مدینہ - بجنور، مورخہ ۱۷ ؍ فروری ۱۹۴۶ء

ناشر

حرف چند

خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کے سوالوں کا یہ جواب جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلویؒ کے قلم سے اس زمانے میں دیا گیا تھا جب یہ سوالات پوچھے گئے تھے، اور ۹ر جولائی ۱۹۳۹ء کے نقیب پھلواری شریف (بہار) میں چھپوا بھی دیے گئے تھے، لیکن افاداتِ اشرفیہ میں سایل صاف مکر گیا کہ سطحِ ارض پر ایسا بھی کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔

۱۹۴۵ء میں الیکشن کمپین شروع ہوئی تو اس بات کا زور شور سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ جمعیت علماے ہند کے اکابر سے ان سوالات کا جواب نہ بن پڑا تھا، حال آں کہ اس وقت بھی یہ صریح جھوٹ تھا اور اب بھی، اُس زمانے میں مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے یہ سوالات اور ان کے جوابات ایک ضروری تمہید و تعارف کے ساتھ روز نامہ الجمعیۃ - دہلی اور سہ روزہ مدینہ - بجنور میں بھی چھپوا دیئے تھے۔

دوسرا فتویٰ جو دو سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ایک خط سے مقتبس ہے، جو مفتی محمد نعیم لدھیانوی نے وقت کی سیاست کے پیشِ نظر اخبارات میں چھپوا دیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے یہ خط مولانا محمد خلیل الرحمٰن دہلوی کے نام تحریر فرمایا تھا، یہ مکتوب سامی بہت اہم اور فکر انگیز مطالب پر مشتمل ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے مولانا سید محمد میاںؒ کی یہ تمہید اور حوالوں کی صراحت کے ساتھ یہ دونوں تحریریں اپنی ڈایری میں درج فرمائی تھیں، یہاں اُن تحریروں کو ان کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

خاکسار

ابو سلمان شاہ جہان پوری

۱۶ر نومبر ۱۹۹۶ء

پیش لفظ

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریکِ خلافت میں شریک نہیں ہوئے تھے، کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کے وہ باضابطہ ممبر نہیں رہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تحریکات کے موقعوں پر واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا تھا، اور اُن کے بموجب حضرت موصوفؒ سے جوابات حاصل کرکے زیادہ سے زیادہ ان کی اشاعت کی کوشش کی جاتی تھی، بہرحال اس حقیقت کا نہ کسی کو انکار ہے نہ انکار کی ضرورت، اسی سلسلہ کے مضامین کا ایک مجموعہ مولانا محمد شفیع صاحب، دیوبندیؒ نے "افاداتِ اشرفیہ" کے نام سے شائع فرمایا ہے،

چونکہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے خیالات کا ہمیں پہلے سے علم تھا، اس لیے اس رسالہ کے حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی، مگر ہم شکرگذار ہیں جناب مولانا عبدالرحیم صاحب راندیری مدظلہٗ و عزیز محترم مولوی سید عبدالحق صاحب کے کہ ان حضرات نے اس غلط الزام کی طرف توجہ دلائی جو اس رسالہ میں جمعیۃ علمائے ہند پر لگایا گیا ہے، اور اس کے ساتھ اخبار "نقیب" کے فائل سے نقل کرکے وہ جوابات بھی بھیج دیئے جس سے اُس بہتان کی تردید ہوجاتی ہے،

"افاداتِ اشرفیہ" کے مقدمہ میں صفحہ ۳ پر درج ہے کہ مولانا رحمہ اللہ نے مسائلِ حاضرہ

کی مکمل تحقیق کے لیے چند سوالات جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ کے پاس بھیجے، لیگ کی طرف سے جوابات آئے مگر جمعیۃ علماء کی طرف سے باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے کوئی جواب نہیں آیا،

پھر صفحہ ۳۷ کے حاشیہ پر اسی الزام کو دہرایا گیا ہے، اس الزام کی تردید کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے (جو اس زمانہ میں کل ہند جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے) جوابات پیش کردیں، جو اخبار "نقیب" مورخہ ۲۶ رجمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ م ۹ر جولائی ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکے ہیں،

ان سوالات کے جوابات زیادہ مفصل بھی ہو سکتے تھے، مگر بظاہر مفاہمت کی اہمیت اور خواہش حضرت مفتی صاحبؒ کے پیش نظر ہے، اس لیے جوابات میں اجمال اور بہت زیادہ نرمی سے کام لیا گیا، ذیل میں اخبار "نقیب" کا مضمون بجنسہ اور بلفظہ نقل کیا جاتا ہے،

(محمد میاں عفی عنہ ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی)

خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون

کے سوالوں کا جواب

سوال۱: جمعیۃ علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے؟ اور کانگریس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے؟

جواب۱: نہ صرف جمعیۃ علماء بلکہ ہندوستان کی تمام معتمد جماعتوں کا نصب العین یہی کہ انگریزی حکومت سے ملک کو آزاد اور خود مختار بنایا جائے، اور اس کے لیے یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر انگریزی حکومت سے آزادی کا مطالبہ نہ کریں گی بظاہر اسباب آزادی حاصل نہ ہو گی، اس لیے جمعیۃ علماء آزادی کی خاطر کانگریس کی شرکت کو ضروری سمجھتی ہے، اور چونکہ اس لیے انگریزی حکومت سے مسلمانوں کی مذہبی مرکزیت اور اسلامی قوت کو ضرر پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ انگریزی اقتدار کو جہاں تک ہو کمزور کرنے کی سعی کریں،

سوال۲: کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی اور غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے، اور مسلم نشست کے لیے کانگریس براہ راست امیدوار کھڑے کرتی ہے اس سے اسلام اور مسلمانانِ ہند کو خطرہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

جوابؔ ۲ ؛ کانگریس ایک مشترکہ جماعت ہے، اپنے مذہب پر پختہ رہتے ہوئے بھی کانگریس میں شریک ہوسکتے ہیں، اسلام سے بے تعلقی غیر کانگریسی مسلمانوں میں جو مغربی تعلیم اور یورپین تہذیب کے دلدادہ ہیں بہت زیادہ ہے، کانگریسی نان کانگریسی ہونے کی جہت سے اس قدر اسلام سے بے تعلق نہیں جس قدر یورپین تہذیب کے دلدادہ غیر کانگریسی مسلمان ہیں،

سوالؔ ۳ ؛ مسلم لیگ سے جمعیۃ علماء کو کیوں اختلاف ہے؟ جب کہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے، اور اس کا مقصد بھی آزادیٔ کامل کی تحصیل ہے، جیساکہ اس سال لکھنؤ میں اس نے اعلان کیا ہے ؟

جوابؔ ۳ ؛ اس لئے کہ مسلم لیگ کی اکثریت انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت کا سایہ سمجھتی ہے، اور انگریزوں کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہے، اور انگریزی شہنشاہیت کی حمایت کرتی ہے، اور انگریزی اقتدار کی بنیاد مضبوط کرتی ہے اور سرمایہ داروں کی نہ صرف حامی ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم رکھنا چاہتی ہے، قوم کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کرتی، بلکہ مسلم لیگ کی رکنیت اور عہدہ داری کو حصولِ مناصب جلیلہ کا ذریعہ سمجھتی ہے، اور اس راستہ سے بڑے عہدے حاصل کرتی ہے، لکھنؤ میں آزادیٔ کامل کا تو اعلان کر دیا اور یہ بھی اقرار ہے کہ تنہا مسلمان آزادیٔ کامل حاصل نہیں کرسکتے، اس کے باوجود آزادیٔ کامل حاصل کرنے کے طریقے (ہندو مسلم) اتحاد کو اختیار نہیں کرتی، ایسی صورت میں ہم آزادیٔ کامل کے محض زبانی اعلان کو ابلہ فریبی نہ سمجھیں تو اور کیا سمجھیں ؟

سوالؔ ۴ ؛ اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکراتِ شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیۃ علماء مسلم لیگ میں شریک ہوکر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے ؟ اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کردے ؟

جوابؔ[۴] ؛ مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو منکرات سے خالی کر دینا تجربہ سے ناممکن ثابت ہوا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو بقول مسلم لیگ ۹۰ فی صد مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہیں، لیکن کیا وہ مسلم لیگ سے کسی ایک منکر کو بھی آج تک ہٹا سکے، کہا جاتا ہے کہ علماء بھی ۸۰ فی صد مسلم لیگ میں شریک ہیں، لیکن کیا ان ۸۰ فی صدی علماء کا مسلم لیگ پر کچھ اثر ہے؟ اگر ہے تو یہ لیگ کے بلیٹ فارم سے علماء کو برباد کرنے اور ان کو خوار کرنے کی پُرزور تلقین کیوں ہو رہی ہے؟ اور حاملینِ افرنجیت کی خالص تقلید اور اتباع اور پیروی کرنے کا کیوں حکم دیا جاتا ہے؟

سوالؔ[۵] ؛ کیا مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کے تصادم سے تشتّت اور افتراق پیدا نہیں ہوتا ہے؟ اور کیا یہ تشتّت مضر نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لیے کوئی صورت اختیار کی ہے؟

جوابؔ[۵] ؛ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے، مگر اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ لیگ پر اور صرف لیگ پر، کہ وہ علماء کے خلاف عموماً اور کانگریسی مسلمانوں کے خلاف خصوصاً عوام کو بھڑکاتی ہے، اور طرح طرح کے فسادات اُٹھاتی ہے، اور آپس میں لڑاتی ہے، ابھی حال میں جمعیۃ علماء کے جلسہ میں شرکت سے مسلم لیگیوں کو منع کرنے کے لیے مسٹر جناح کا بیان اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اس سے آپ لیگ کے قائدِ اعظم کی ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، کہ وہ اتّفاق اور اتحاد بین المسلمین کی آڑ میں کس قدر تفریق و تشتّت پیدا کر رہے ہیں،

سوالؔ[۶] ؛ کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ ہے جس میں عنصرِ کفر غالب اور عنصرِ اسلام مغلوب ہوگا، ایسی حکومت یقیناً اسلامی نہ ہوگی، اس کے لیے جد و جہد کرنا مسلمانوں کے ذمہ کس دلیل سے واجب ہے؟ نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنا چاہتے

ہیں، کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھے، اور مسلمانوں پر بازاروں میں، دیہاتوں میں، ملازمتوں میں اور سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ ہرروز کرنے لگے ہیں، جمعیۃ علماء نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے؟ اور اس کے لیے جمعیۃ علماء نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟

جواب ۶: لیکن کیا مسلم لیگ خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کی سعی کر رہی ہے؟ وہ بھی تو اس مشترکہ حکومت کے اصول کو گول میز کانفرنس میں تسلیم کر چکی ہے،

اگر ہندو انگریز کو نکالنا نہیں چاہتے ہیں تو پھر جمعیۃ علماء ان کے ساتھ اشتراکِ عمل نہیں کرے گی، یہ اشتراک تو صرف انگریزوں کی قوت کمزور کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرنے کے مقصد کے لیے ہے،

سوال ۷: کانگریس وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کو کاشتکاروں کی ملوک بنا دینے کی تجویز سوچی ہے، جو یقیناً ظلم ہے، اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اسی ظلم میں شریک ہیں، پھر اس سے بچنے کی کیا جمعیۃ علماء نے کوئی تدبیر کی؟ اور کونسا عملی قدم اُٹھایا؟

جواب ۷: جو قوانین شریعت کے خلاف وضع کیے جائیں ان کی پوزیشن موجودہ انگریزی قوانین جیسی ہے حکومت کے موجودہ قوانین شریعت کے خلاف ہیں اور آئے دن لیجسلیٹو اسمبلی میں قوانین غیر مشروعہ مسلم لیگ کی تائید وحمایت سے شائع ہو رہے ہیں، ابھی آرمی بل کا معاملہ سامنے ہے، جمعیۃ علماء تو ہر خلافِ شرع قانون کے خلاف انتہائی جدوجہد کرے گی، اور کر چکی ہے اور کر رہی ہے، اس کی بھی اسی سال کے جلسہ کی تجاویز پڑھیے، اور دیکھیے کہ اس نے کانگریسی حکومتوں سے کس قدر احتساب کیا ہے، اور جمعیۃ کے محترم ارکان کا مدحِ صحابہؓ کے قضیہ میں طرزِ عمل سامنے رکھیے، تو آپ کو جمعیۃ کا مطمحِ نظر صاف معلوم ہو جائے گا، اور پھر لیگ کے طرزِ عمل

سے آپ اس کو جانچ سکیں گے،

سوال ۸: کانگریس میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامینِ شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے، جو قریب بہ شرک ہے، کانگریسی مسلمان بھی بندے ماترم کے وقت کھڑے ہوتے ہیں، اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں ہے؟ اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی؟ اور اس پر اور اس قسم کے دیگر مسئلوں پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں؟

جواب ۸: بیشک بندے ماترم کا گیت قابلِ اعتراض تھا، کانگریس نے اس کے قابلِ اعتراض بند اس میں سے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے، جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے، اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے، مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے،

سوال ۹: صدر کانگریس اور ان کے ہم خیال اشتراکیت کے حامی اور مذہب و خدا کے دشمن ہیں، ان کی تقریریں خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہیں، جمعیۃ علماء نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں؟ اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم سے روکا ہے یا نہیں؟

جواب ۹: صدر کانگریس کی شخصی رائے سے کانگریس کو الزام دینا معقول بات نہیں،

سوال ۱۰: کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہو گی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری حفاظت ہو گی، جب کہ کانگریس اور اس کے ذمہ دار ارکان مذہب اور حقوق کا نام لینا حرام سمجھتے ہیں، اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں، نیز جمعیۃ علماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہب اور سیاست کے تحفظ میں اس وقت تک کونسا کام

کیا ہے؟

جواب ۱۰؛ مسلمان اپنے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کر سکتے ہیں، نہ کہ کانگریس کے وعدوں سے اور نہ انگریزوں کے وعدوں سے،

سوال ۱۱؛ جمعیۃ علماء نے اچھوت اقوام میں تبلیغ اسلام کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟ جس کی مذہبًا وسیاستہً سخت ضرورت ہے، اور ان کے اسلام میں داخل ہونے کی بھی قوی امید ہے؟

جواب ۱۱؛ یہ سوال زیادہ تر اس جماعت سے کیا جانا چاہیے جو ۹۰ فی صدی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور اسی جماعت کے علماء سے،

(مفتی) محمد کفایت اللہ کان لہ، دہلی

(مہر دار الافتاء، مدرسہ امینیہ دہلی)

(مدینہ بجنور، ۷ار فروری ۱۹۴۶ء)

دوسرا رسالہ

اشرف الافادات

افاداتِ اشرفیہ و مسایل سیاسیہ کا مدلل و مسکت جواب

مولفہ

مولانا عبدالاحد سورتیؒ

اشرف الافادات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

سخن اولین

مرکزِ اعتماد فقط کتاب اللہ ہے، پھر سنتِ رسول اللہؐ جو کتاب اللہ پر منطبق ہو، ان کے بعد وہ فروعی اور تفصیلی احکام ربانی لازم، جو ان دونوں سے ماخوذ ہوں، جس کو فقہ کہا جاتا ہے،

چنانچہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی:۔

"جب تک تم کتاب و سنت کو مضبوطی سے سنبھالے رہو ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے"

لہٰذا کسی تحریک، کسی عملی یا قولی فیصلہ کی صحت و خطاء کا مدار مذکورۂ بالا اصول ہیں،

لیکن عام مسلمان جو ان اصول کے علم و فہم سے قاصر ہیں ان کو کسی عالم کے قول و رشاد پر ہی اعتماد کرنا پڑتا ہے جس سے اُن کو حُسنِ عقیدت ہو،

حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہ کے تفقہ اور زہد و تقویٰ میں کلام نہیں کیا جا سکتا، مگر آپ علمی اور فکری طور پر ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رہے، حتیٰ کہ اخبار کا مطالعہ بھی آپ تضیعِ اوقات سمجھتے تھے،

اتفاق سے ایک مخصوص مذاق کے حضرات آپ کے حاضر باش تھے، جو واقعات کو اپنے خیالات کی عینک سے دیکھتے اور اپنے مذاق کے بموجب ان کی ترجمانی کرتے،

اہلِ غرض نے حضرت کی گوشہ نشینی اور اس مخصوص ماحول سے بسا اوقات غلط فائدہ اٹھایا، واقعات کو غلط انداز میں پیش کرکے ان کے مطابق فتویٰ لکھوایا، اور اس کی لاتعداد اشاعت سے اپنی اغراض پوری کیں،

بہرحال جبکہ مدارِ فتویٰ کسی بزرگ کے ملفوظات وارشادات نہیں ہیں تو اس بحث میں پڑنا بھی لاحاصل ہے،

مگر گزشتہ الیکشن کے دوران میں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے "افاداتِ اشرفیہ" در "مسائل سیاسیہ" کے عنوان سے ایک رسالہ شائع کیا،

کسی بزرگ کے ملفوظات کی ترتیب کے وقت مصنف کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع سے متعلق جملہ ملفوظات کو جمع کردے، تاکہ پڑھنے والا متکلم کی مراد کو صحیح طور پر سمجھ سکے،

مگر افسوس: "افاداتِ اشرفیہ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "جمعیۃ علماءِ ہند" اور کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت مصنف کے پیش نظر ہے اور وہ اپنی ذہنیت کے آئینہ سے متکلم کی رونمائی کرنا چاہتا ہے،

مولانا محمد شفیع صاحب کے اس طرزِ عمل نے خود حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے انصاف پسند متوسلین اور معتقدین کو مجبور کیا کہ وہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کریں، تاکہ حکیم الامت کی حکمت ودانشمندی کا صحیح اندازہ ہوسکے،

ہم شکر گزار ہیں عزیز محترم مولانا عبدالاحد صاحب سورتی کے کہ آپ نے یہ رسالہ "شعبۂ نشر واشاعت جمعیۃ علماء ہند" کو پیش کیا، جو "اشرف الافادات" کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے،

اس رسالہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الامت کے ان حکیمانہ ارشادات کو جمع کیا گیا ہے جو لیگ کی حقیقت کے پیشِ نظر حکیم الامت کی شانِ حکمت کو نمایاں کرتے ہیں،

ممکن ہے "افاداتِ اشرفیہ" کے مصنف و ناشر ہماری مجبوریوں کو محسوس نہ کریں، مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انصاف پسند اور صداقت طلب متوسلین و مسترشدین سے توقع ہے کہ وہ "اشرف الافادات" کی اشاعت کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیں گے، اور اس اعلانِ حقیقت پر شعبۂ نشر و اشاعت جمعیۃ علماءِ ہند کے شکر گزار ہوں گے،

واللہ ولی التوفیق وھو یھدی السبیل،

خادم علماء

محمد میاں عفی عنہ

۱۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۵ھ، ۲۱ مئی ۱۹۴۶ء

اشرف الافادات

مسلم لیگ خالص اسلامی جماعت اور مسلمانوں کی شرعی و مذہبی تنظیم اور سواد اعظم قرار دی جاسکتی ہے؟ اور اس کی شرکت اور تائید درست ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اپنے اکابر خصوصاً حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مسلک و تعلیمات کے بموجب واضح الفاظ میں تحریر فرما کر عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں،

الجواب ھو الموفق للصواب

حامداً و مصلیاً، امابعد!

موجودہ مسلم لیگ میں قادیانی، مرتدین و کمیونسٹ، ملحدین اور بددین اور باطل فرقے بھی شامل ہیں، اس لیے لیگ خالص اسلامی جماعت قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ اصولِ شرعیہ و قواعد عقلیہ سے یہ جماعت غیر اسلامی جماعت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ مرکّب کامل اور ناقص کا ناقص ہوتا ہے، تو کفار اور مسلم سے جو سلطنت (علیٰ ہذا جو جماعت) مرکب ہوگی وہ بھی غیر اسلامی ہوگی (ملفوظ نمبر ۲۲۴ ملفوظات ص ۲۶۲ ج ۵)

اور زندیق و مرتدین کو سیاسی مصلحت کی بنا پر اسلامی برادری میں شمار کر لینا بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ بوادر النوادر میں ہے (سوال چہارم) بعض ہی خواہان قوم کا خیال ہے کہ گو تاجر مذکور (خوجہ) شرعی نقطۂ نگاہ سے اسلام سے خارج ہو لیکن اس وقت ہم مسلمانوں کو اتحادِ قومی اور ترقی کی ضرورت ہے، لہٰذا ایسے

جھگڑوں بکھیڑوں کو نکالنا مناسب نہیں، یہ وقت نازک ہے، سب مدعیانِ اسلام کو مسلمان کہنا اور سمجھنا چاہیے، ان کو اسلام سے خارج کر کے اپنی تعداد اور مردم شماری کو گھٹانا نہیں چاہیے، بہی خواہانِ قوم اور ہمدردانِ اسلام کا یہ خیال شرعًا کس قدر وقعت رکھتا ہے؟

الجواب: ان کفریات کے ہوتے ہوئے نہ ایسے شخص کا دعوئ اسلام کافی ہے نہ اس کا نمازی اور روزہ دار ہونا کافی ہے، نہ اس پر نمازِ جنازہ جائز ہے نہ مقابرِ مسلمین میں دفن کرنا جائز ہے، اور نہ مصلحت کے سبب کافر کو مسلمان کہنا یا اس کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ کرنا جائز ہے، البتہ بلا ضرورت کسی سے لڑائی جھگڑا کرنا بھی نہ چاہیے اور ایسے مصالح کی بنا پر ایسی رعایت کرنا اُن مصالح سے زیادہ مفاسد کا موجب ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ مصالح تو محض دنیوی ہیں اور مفاسد دینیہ،

اُن مفاسد کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قُبح خفیف ہو جائے گا، اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے، تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے، کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت کر سکے گی؟ ایسے مصالح و مضار کے اجتماع کا یہ فیصلہ فرمایا گیا ہے

قال تعالیٰ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا،

قال تعالیٰ يَدْعُو لَمَن ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِن نَّفْعِهِ ط

"حق تعالیٰ فرماتا ہے آپ فرما دیجیے کہ ان دونوں (شراب و قمار) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں، اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں، اور وہ گناہ کی اُن فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں" (مختصراً، ص ۸۷۶ تا ۸۸۰)

غرض موجودہ لیگ خالص اسلامی جماعت اور مذہبی و شرعی تنظیم سوادِ اعظم تسلیم نہیں کی جا سکتی، حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں "سوادِ اعظم سے مراد بیاضِ اعظم ہے، یعنی نورِ شریعت جس جماعت میں ہو" (ملفوظ نمبر ۵، النور شعبان ۱۳۵۱ھ)

نیز فرمایا کہ "سوادِ اعظم کا مشہور مفہوم یہ ہے کہ ہر زمانہ میں جس طرف کثرت ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ مراد نہیں، بلکہ معنی یہ ہیں کہ خیر القرون میں جس عقیدہ کی طرف کثرت تھی، کیونکہ اس وقت اہلِ باطل کم تھے، اہلِ خیر زیادہ تھے، اس وقت کسی طرف کثرت ہونا علامت تھی اس کے حق ہونے کی، اور اس وقت کا سوادِ اعظم مراد نہیں الخ" (ملفوظ نمبر ۷۰۵، ملفوظات ص ۴۰۴ ج ۵)

نیز ارشاد ہے "یہ کوئی حق کا معیار تھوڑا ہی ہے، ہاں ایک اور معیار ہے کہ جس طرف عوام الناس ایک دم چل پڑیں، سمجھ لو کہ دال میں کالا ہے، کیونکہ خالص حق اور دین پر چلنا نفس پر گراں ہوتا ہے" (ملفوظ نمبر ۱۵۸ ملفوظات ۹۵ ج ۵)

سوادِ اعظم کی مخالفت حدیث اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ سے منہی عنہ ہے اور اس کا حاصل بھی اجماع ہے کہ ظاہراً سوادِ اعظم سے متبادر کثرتِ عددی ہے، مگر ثُمَّ یَفْشُوا الْکَذِب سے یہ مقید ہے خیر القرون کے ساتھ، یعنی خیر القرون میں جس عقیدہ پر اکثر مسلمین متفق ہوں وہ واجب الاتباع ہے؛ کیونکہ اُس وقت زیادہ مسلمان اس عقیدہ پر تھے جو حق تھا، بدعت مغلوب تھی، پس اُس وقت مسلمانوں کا کسی عقیدہ پر متفق ہونا علامت تھی اُس عقیدہ کے حق ہونے کی، اور اہلِ حق کا اتفاق بھی اجماع ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اہلِ باطل اجماع کے ارکان نہیں" (ماخوذ از النور جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۵۱ھ، ص ۲۰)

فرمایا کہ "آجکل جمہوریت کو شخصیت پر ترجیح دی جا رہی ہے، اور کہتے ہیں کہ جس طرف کثرت ہو وہ سوادِ اعظم ہے، اس زمانہ میں میرے ایک دوست نے

اس کے متعلق عجیب اور لطیف بات بیان کی تھی کہ اگر سوادِ اعظم کے معنی یہ بھی مان لیے جائیں کہ جس طرف زیادہ ہوں تو ہر زمانہ کا سواد اعظم مراد نہیں بلکہ خیر القرون کا زمانہ مراد ہے نہ کہ ثم یفشوا الکذب کا زمانہ کہ یہ جملہ ہی بتا رہا ہے کہ بعد خیر القرون کے کثرت شر میں ہوگی، مجھے یہ بات بہت ہی پسند آئی، واقعی کام کی بات ہے"
(ملفوظ نمبر ۲۵، النور ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۱ھ ص ۲۱)

اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ :۔
"سوادِ اعظم اس جماعت کا نام ہے جو حقیقۃً خدا و رسولؐ کے احکام اور ناموسِ شریعت کی محافظ ہے" (مدینہ بجنور، ۹ مارچ سنہ ۴۶ھ)

اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب فاضلِ دیوبند فرماتے ہیں کہ حدیث اتبعوا سواد الاعظم میں سواد اعظم سے مراد سوادِ افضل ہے نہ کہ سواد اکثر، یعنی جو جماعت شرافت اور فضیلت کے اعتبار سے بڑی ہو، اس کی اتباع واجب ہے، یہ مطلب نہیں کہ جو جماعت تعداد کے اعتبار سے بڑی ہو اس کی اتباع ضروری ہے"
(زمزم، ۲۵ر دسمبر سنہ ۴۵ء)

اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری خلیفہ تھانویؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ خالص اسلامی جماعت میرے ناقص خیال میں وہ ہو سکتی ہے جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور سنتِ نبویہ کے موافق عقائد و اعمال، اخلاق و احکام کی ترویج ہو اولاً جماعت کے افراد اعتقاداً و عملاً و اخلاقاً مذکورہ بالا مقصود سے موصوف ہوں اور بعدہٗ دوسروں کو دعوت دینے میں ساعی ہوں، موجودہ لیگ جماعتِ بالا کا مصداق نہیں، اور اس کے ارکان اوصافِ حسنہ مذکورہ سے نہیں، کما ہو المشاہد
(ماخوذ از نقل مکتوب بنام دعوت الحق بمبئی)

اور توضیح میں ہے: السواد الاعظم عامۃ المسلمین ممن ہو امۃ

مطلقة والمراد بالامة المطلقة اهل السنة والجماعة وهم الذين طريقتهم طريقة الرسول علیہ السلام واصحابہ رضی اللہ عنہم دون اهل البدع (ص ۳۵۴)

اس سے معلوم ہوا کہ سوادِ اعظم وہ ہیں کہ ان کا طریق اور عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا سا ہو۔ پس جس جماعت میں زندیقوں اور دہریوں کی بھرمار ہو اور جس کے ارباب بست وکشاد کی سرشت میں مغربی تہذیب اور مغربی تمدن اور مغربی معاشرت طبیعت ثانیہ بن چکی ہو وہ اسلامی جماعت اور سواد اعظم اور شرعی تنظیم کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟ اور اس جماعت سے اصلاحِ قوم اور ترقیِ اسلام کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے؟ چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ لیڈرانِ قوم خود ہی محتاجِ اصلاح ہیں دوسروں کی اصلاح کیا کریں گے ـــــــ آج یہ حالت ہے کہ اظہارِ ہمدردیِ اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، انجمنیں قائم ہوتی ہیں، مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کا خیال، مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی ساتھ لے جاسکیں لیکن محبتِ اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، وضع دیکھیے تو سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف، گفتگو کو دیکھیے وہ مذہب سے بالکل جدا" (اشرف الجواب ص ۱۵۸ ج ۳)

نیز فرماتے ہیں کہ افسوس مسلمانوں کی نکیل اور باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام کے دوست نما دشمن ہیں، وہ علم دین، دینی فہم، عقل سب سے معرا ہیں، اور جب وہ خود گم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے؟ اور آجکل ایسے ہی لوگ لیڈر ہیں، جن میں اکثر ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں، انھوں نے ہی ملک اور مخلوق کو تباہ اور برباد کیا، اور امن تو ان کی بدولت دنیا سے رخصت ہی ہوچکا ہے آئے دن ایک نیا فساد ملک میں کھڑا رہتا ہے، ایسے ہی بد اندیش لوگوں کے متعلق

کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر بمیر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

(اگر بلی حاکم اور کتا وزیر اور چوہا دیوان کر دیا جائے تو یہ ارکانِ دولت ملک کو ویران کر دیں گے) (ملفوظ نمبر ۴۳ ملفوظات ۲۷۶ ج ۵)

فرمایا کہ "یہ نامعقول قوم کے رہبر اور پیشوا بننے کو تیار ہوئے ہیں، اور حالت یہ ہے کہ صورت سے بھی مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اور ڈاڑھی کے تو اس قدر دشمن ہیں جس کا حد و حساب نہیں۔" (ملفوظ نمبر ۳۳، ملفوظات ص ۲۷۱ ج ۳)

فرمایا کہ "آجکل کے لیڈر بیدار مغز اور روشن دماغ کہلاتے ہیں، نہ معلوم ان کے دماغوں میں گیس کے ہنڈے روشن ہیں یا بجلی سما گئی ہے، حالانکہ یہ سب باتیں ظلمانی ہیں الخ" (ص ۲۷۱ ج ۳)

فرمایا کہ "نمازوں کے لیے مسجدوں میں نہ آنا، گھروں پر جانماز بچھی ہیں، یہ متکبروں کی ایک پہچان ہے کہ وہ مسجد میں آنا اور غرباء کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں، اور پھر بھی مسلمانوں کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے، ان کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں، شرم نہیں آتی، اگر مسجد میں آئیں گے بھی تو جمعہ کے روز، وہ بھی پیدل چل کر نہیں، جب دیکھو فٹن میں دھرے ہیں اور دل میں فتن بھرے ہیں" (ملفوظات ص ۲۲۹ ج ۳)

نیز فرمایا کہ "ایک لیڈر نے جس کو تیمم کا طریقہ معلوم نہ تھا اپنی عقل سے یہ سمجھا کہ جن اعضاء پر وضو میں پانی ڈالا جاتا ہے شاید تیمم میں ان سب پر مٹی ڈالی جاتی ہوگی، تو آپ نے اول دونوں ہاتھوں پر اوپر نیچے مٹی ملی، پھر منھ میں کلی کے لیے بھی مٹی دی، اور ایک دفعہ اپنی صاحب نے موٹر ٹھہرا کر اس میں بیٹھے بیٹھے

نماز پڑھ لی، اور پھر بھی وہ قوم کے پیشوا اور لیڈر رہی رہے، ایسے ہی لیڈر کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے ؎

اذا کان الغراب دلیل قوم
سیہدیہم طریق الھالکینا

"یعنی جب کسی قوم کا قائد کوا ہو تو ان کو ہلاکت کا ہی راستہ بتلائے گا۔"

(التبلیغ وعظ ۷، ص ۳۰)

پس جو لیڈر وضو کے مسائل سے بھی ناواقف ہو اور سرے سے نماز ہی نہ پڑھتا ہو اور دین سے قطعاً نابلد اور اسلامی تہذیب سے بالکل ناآشنا اور اسلام سے اتنا ہی دور ہو جتنا کہ ایک غیر مسلم دور ہو سکتا ہے، وہ ہمارے اکابر خصوصاً حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے نزدیک قائدِ ملتِ اسلامیہ کیسے بن سکتا ہے، ایسے ہی قائدین کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا ؎

ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنے ہمارے
بھلا ہمیں ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
غضب ہے یہ مرشدانِ خود بیں خدا تیری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

اور حضرت العلامہ شاہ معین الدین احمد اجمیریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کا (اسلام یا مسلم کا) مفہوم صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک قوم یا مخصوص نسل کا نام یا عنوان

ہے، تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ہر ایک نا آشنائے مذہب کے ہاتھ میں اسلام یا مسلم کی باگ دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اس قوم کا جو مسلمان کہلاتی ہے بحیثیت قوم ہونے کے خیر خواہ اور مخلص ہو، لیکن اگر اسلام کا تعلق عقائد و اعمال سے ہے اور ان کے فقدان سے اسلام پر اثر پڑ سکتا ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کا قائد وہی ہونا چاہیے جس میں یہ مذہبی روح موجود ہو، اور جو غیر ضروری وسیع الخیالیوں کی آمیزش و اختلاط سے کمزور اور رفنانہ ہو گئی ہو، ورنہ اس کی قیادت میں جو ترقی ہو گی وہ درحقیقت اسلام یا مسلمانوں کی ترقی نہ ہو گی بلکہ اس کا تعلق قوم یا ملک سے ہو گا، جس کی پرستش اس عہد میں اعلیٰ درجہ کی روشن خیالی سمجھی جا رہی ہے، ایسی ترقی بعض اوقات اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر بلکہ عذابِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے، اسی ترقی کی فضا میں فروعی اعمال اور جزئی عقائد بجائے خود رہے اسلام کے اصول اور ضروری شعائر تک کے متعلق غیر ضروری ہونے کا فتویٰ قابو یافتہ جماعت کی جانب سے صادر ہونے میں تامل نہیں ہوتا، اور اسی طرح بتدریج تمام اسلامی بندشوں کو توڑ دینے کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا ہے،

(از خطبۂ صدارت اجلاس نہم جمعیۃ علماء ہند ۱۳۴۸ھ)

اور حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی کتاب "السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ" میں ہے کہ "امت کا اتفاق ہے کہ منصبِ قیادت کا اہل وہ مسلمان ہے جو عالم اور متقی ہو، اگر امت کو ایسا جامع شخص نہ ملے تو بحالتِ مجبوری یہ منصب دو شخصوں میں سے کسی ایک کو تفویض کیا جائے، عالم فاسق یعنی عالم بے عمل یا جاہل متقی یعنی جاہل باعمل (مطبوعہ مصر ص۱۷)

بہر حال اقوالِ علماء و صلحاء سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ موجودہ لیگ اسلامی جماعت و شرعی تنظیم اور سوادِ اعظم کہلانے کی ہرگز مستحق نہیں، اور

یہ ایسی جماعت ہے کہ بقول حضرت غوث اعظمؒ اسلام اپنے سر کو تھامے ہوئے اس پر رو رہا ہے اور فریاد مچا رہا ہے الاسلام یبکی ویستغیث یدہ فی رأسہ من هؤلاء الفجار من هؤلاء الفساق من هؤلاء اهل البدع والضلال الخ (الفتح الربانی ص ۶۶۱)

لہٰذا بفرمان باری تعالیٰ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھ، اور اے مسلمانو! ان ظالموں کی طرف مت جھکو کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے) اس ہڑلونگ سے اجتناب ضروری ہے، اور تعاون ناجائز ہے، کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

بے وفا سمجھیں تمھیں اہلِ حرم اس سے بچو
دَیر والے کج ادا کہدیں یہ بدنامی بھلی

اسی قسم کی سر سید احمد خاں مرحوم کی قائم کردہ انجمن کی شرکت کے بارے میں حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے دریافت کیا گیا تھا اس کا جو جواب آپ نے تحریر فرمایا ہے وہ ذیل میں مع سوال درج کیا جاتا ہے:۔

(سوال سوم) ایک جماعت قومی مسمّٰی بہ "نیشنل کانگریس" جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کے واسطے رفعِ تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی، اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہی امور میں ہو جو کُل جماعتہائے ہند پر مؤثر ہوں، اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو، یا خلافِ سرکار ہو، تو ایسی جماعت میں شرکت درست ہے یا نہیں؟

(سوال چہارم) سید احمد خاں نیچری نے جو ایک جماعت "ایسوسی ایشن"

قائم کی ہے، اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸ر اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے
کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس
کے برخلاف ہیں شامل ہیں، ہر شخص جو داخل ہو پانچ پانچ روپے چندہ ماہانہ میرے نام
علیگڑھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ، اور اس کی
مدد کے واسطے جابجا الیسوسی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں
قائم کی ہیں، جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے
ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں، آیا ایسی جماعت
میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں، اور نیچری
لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں ؟

جواب: حضرت گنگوہی قدس سرہٗ :۔

شرکت بیع و شراء تجارت میں کر لیویں، اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا
خلافِ شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصد پیش نہ آئے جائز اور مباح ہے،
مگر سید احمد سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے، اگرچہ وہ خیر خواہیِ اسلام کا نام لیتا ہے، یا
واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام و مسلمانوں کو سمِ قاتل ہے،
ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا، پس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود
سے شرکتِ معاملہ کر لینا، اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلافِ
شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت و اہانت یا ترقیِ ہنود ہوتی ہو وہ کام بھی
حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا اسی طرح ہے اور بس فقط

(بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (نصرۃ الابرار، ص ۱۳)

اور حضرت تھانویؒ سر سید احمد خان کے متعلق فرماتے ہیں کہ: "جب مدرسہ دیوبند
قائم ہوا اور بنیاد پڑی تو سر سید احمد خاں نے کہا تھا کہ کیا ہو گا اور دو چار قُل اَعُوذِیے

بڑھ جائیں گے، یہ معلوم نہ تھا کہ تمھارے جادو کو موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہبَاءً منثورا کرنے والی جماعت بھی ہوگی، واقعی اگر ہندوستان میں حق تعالیٰ اس جماعت کو پیدا نہ فرماتے تو چہار طرف الحاد و دہریت کے چشمے ہندوستان میں اُبل پڑتے اور اب بھی اُبلنے میں کونسی کسر رہ گئی، لیکن قانونِ قدرت کے مطابق "ہر فرعونے راموسیٰ" کا مصداق یہ جماعت ہوگئی، جس کے متعلق مخبرِ صادق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماگئے ہیں کہ لا یزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم (میری امت میں سے ایک جماعت دینِ الٰہی پر ہمیشہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہے گی، اس کی رسوائی کرنے والے اس کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے) ورنہ ان کا مکر اور ان کی چالاکیاں ایسی تھیں جیسے ارشاد ہے وان کان مکرھم لتزول من الجبال (اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں) ان کے تمام مکر اور کید اسلام کی دشمنی پر تُلے ہوئے تھے، فرماتے ہیں اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ الخ (ملفوظ نمبر ۱۸۲ ملفوظات ص ۱۰۶ ج ۵)

اب آپ غور فرمائیں کہ مذکورہ انجمن اور اس کے قائد اور موجودہ لیگ اور اس کے قائدین میں کیا فرق ہے؟ بلکہ بعض حیثیت سے لیگ اور اس کے قائدین کو بدتر ثابت کیا جاسکتا ہے، لہٰذا بقول حضرت گنگوہیؒ "اُس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں کے لیے سمِ قاتل ہے،" اگر کسی کو شبہ ہو کہ لیگ کی شرکت اور اس کی تائید ہمارے اکابر خصوصًا حضرت تھانویؒ کے مسلک اور تعلیمات کے خلاف ہے تو پھر مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی و مولوی شبیر علی صاحب تھانوی نے کیوں شرکت فرمائی؟ اور آئے دن تائیدی بیانات کیوں شائع کیے جارہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً ان حضرات کا عمل حضرت تھانویؒ کے مسلک اور تعلیمات کے برخلاف ہے، اور اس کے ثبوت کے لیے حضرت تھانویؒ کے ملفوظات منقولہ بالا کافی ہیں، اور حضرتؒ کے مشہور خلفاء مولانا

سید سلیمان صاحب و مولانا خیر محمد صاحب و مولانا محمد عبد الجبار صاحب و مولانا محمد طیب صاحب و مولانا محمد کفایت اللہ صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ وغیرہم کی عدم شمولیت اس کی روشن دلیل ہے، تاہم مزید اطمینان کے لیے حضرت اقدسؒ کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہٗ کے مکتوب گرامی و حضرت مولانا عبد الجبار صاحب ابوہری مدظلہٗ کے اعلان کو بطور گواہ پیش کرتا ہوں،

ملاحظہ ہو، اول الذکر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔ "خود قطب العالم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لاہوری حامیانِ لیگ کے ایک دعوت نامہ کے جواب میں ۱۳۵۵ھ میں مفصل اظہارِ خیال فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لیگ کے تعاون کو چار امور پر معلق فرمایا ہے: (۱) مسلم اپنے مقاصد میں نماز کو داخل کرے (۲) مسلم لیگ وضع اسلامی کی پابندی تمام ممبروں پر لازم قرار دیدے، (۳) خاکساروں سے قطع تعلق کر دے (۴) علماءِ اسلام کے خلاف زہر اگلنے کو اور علماء کی توہین کرنے کو چھوڑ دیں۔

امید کہ مذکورہ بالا خلاصہ سے آپ کے خط کا جواب ہو گیا ہوگا"۔

والسلام خیر محمد عفی عنہ

(بنام ناظم جمعیۃ علماء کادی ضلع بھڑوچ)

ثانی الذکر کا اعلان :۔

حضرت والا نے لیگ کی بداعمالیوں اور مذہب دشمنی ملاحظہ فرما کر لیگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، جس مجلس مبارک میں یہ فرمایا تھا، مولانا ظفر احمد صاحب بھی موجود تھے، اسی فرمان کو سن کر مولانا ظفر احمد صاحب نے کہا کہ حضرت والا چند ماہ اور ٹھہر جائیے، حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اب لیگ کی اصلاح کی امید بالکل ختم ہو گئی، میں ان حضرات سے خوب واقف ہوں، حضرت والا بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے ٭ یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

ہاں! یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں لیگ کے حامی تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت حکیم الامت مسلم لیگ جیسی بد دین جماعت کی حمایت کریں، اب تو وہ قادیانیوں، دہریوں اور شیعوں کی مجسم جماعت ہے، لہٰذا تمام متوسلین کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ حضرت والا کا اتباع کرتے ہوئے لیگ سے علیحدگی اختیار کریں" (مدینہ، ۱۷ر نومبر ۴۵ء)

جناب ناظم صاحب جمعیۃ علماء کاڈی ضلع بھڑوچ نے اس بیان کی تصدیق چاہی تو آپ نے جواباً تحریر فرمایا کہ:- "کہ بالآخر لیگ اور خاکسار ایک نظر آنے لگے، اور لیگ کے جلسوں میں بے حجاب عورتیں شامل ہونے لگیں، اور احکام اسلامی سے ان لوگوں کی بے رغبتی ملاحظہ فرمائی گئی، تو آپ اس جماعت کی اصلاح سے بالکل ناامید ہو گئے تھے، یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے، جس مجلس میں حضرت والا نے مایوسی ظاہر فرمائی تھی میں خود موجود تھا، حضرت والا ایک اعلان بھی اپنی مایوسی کا فرمانا چاہتے تھے مگر بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ آپ کچھ عرصہ تک مزید انتظار فرمائیں، اس پر آپ نے یہ شعر پڑھا تھا کہ ؎ نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے الخ۔

اس کے علاوہ جب سکندر حیات خاں نے پنجاب کے ضمنی انتخابات میں لیگ کے امیدوار کی تصویب اور تصدیق کروانی چاہی تھی تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ آپ لوگ مولویوں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں، اس لیے مجھے معاف فرمایا جائے"

فقط والسلام

عبد الجبار عفی عنہ مورخہ ۲۹ $\frac{۱۳}{۴۵}$

فی الواقع حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ موجودہ لیگ کی شرکت اور تائید کسی طرح گوارہ نہیں کر سکتے، آپ بے علموں کا ساتھ دینے کو بھی منع فرماتے تھے، چہ جائیکہ بد دینوں، قادیانیوں، کمیونسٹوں کے ساتھ جو بحکم خدا مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ (صحیح بخاری) (جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو) واجب القتل ہیں، کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغَسَّالِ (مردہ

بدست زندہ) کی طرح شامل ہونا ناپسند فرماتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ اگر علماء بے علموں کے ساتھ ہو جائیں تو کیا نفع ہو! ہاں بے علم لوگ علماء کے تابع ہو جاتے تب کچھ فائدہ ہوتا، دیکھیے ایک موٹی سی بات ہے، اگر کوئی طبیب مریضوں کا اتباع کرنے لگے تو کیا مریضوں کو فائدہ کی امید ہو گی، اور لوگ اس کو کمال سمجھیں گے؟ ہرگز نہیں، اور نہ اس میں کچھ مریضوں کی سعادت، بلکہ مریض اگر طبیب کے تابع ہوں تو اس میں مریضوں کو نفع ہو گا، اور یہ ان کا کمال بھی ہے اور عقلمندی بھی ہے، کیونکہ اپنے آپ کو ایک حکیم اور دانشمند کے سپرد کر دیا، اور اس صورت میں جو طبیب مریض کے تابع ہو جائے یہ یہ سراسر طبیب کا جہل ہے، ایسے طبیب کے بارہ میں وہی کہا جائے گا جو مولانا رُدمؒ فرماتے ہیں ؎

بے خبر بودند از حالِ دروں ؛ استعیذ اللہ مما یفترون

اور یہ ناعاقبت اسی حکم میں ہوں گے جس میں علماء بنی اسرائیل ہیں، چنانچہ بعضے لوگ فخر یہ بیان کرتے ہیں کہ علماء بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔"

(الہادی، محرم سنہ ۱۳۴۰ھ ص ۴۲)

نیز فرماتے ہیں "اسی لیے میں مولویوں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ ان کو چاہیے کہ اِن فضولیات کو چھوڑ دیں اور ان کاموں میں لگیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، فتویٰ دیں، تبلیغ کریں، پڑھیں پڑھائیں، جاہلوں کے ساتھ ہو کر تضییعِ اوقات نہ کریں، پھر وہ بھی تابع بن کر، اگر جاہل ان کو متبوع بناتے تب بھی چنداں مضائقہ نہ تھا، مگر آجکل تو ریزولیوشن پاس کرتے ہیں جاہل اور مولوی ان کا اتباع کرتے ہیں، کیا واہیات ہے، ایسوں ہی کی بدولت ملک اور مخلوق برباد اور خراب ہوئی۔"

(ملفوظ نمبر ۳۴۲، ملفوظات ص ۲۰۷ ج ۵)

اس وقت جو مولوی لیگ کے حامی ہیں وہ قائدینِ لیگ کے متبوع ہیں یا

کالمیت فی یدِ الغسال کی مصداق و تابع محض و آلۂ کار ہیں، ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے ان صاحبان کی حمایت لیگ لَا لِحُبِّ عَلِیٍّ بَلْ لِبُغْضِ مُعَاوِیَہ کے قبیل سے ہے، ورنہ یہ حضرات خود بھی لیگ کی مخالفت کر چکے ہیں، اور اس کی شرکت کو حضرت تھانویؒ کے مسلک کے خلاف قرار دے چکے ہیں، چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب نے زمانۂ قیام ڈابھیل میں مولینا عبدالجبار صاحب استاذ جامعہ سے کہا تھا کہ حضرتؒ کانگریس اور لیگ کو نجس قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ کانگریس گو ہے تو لیگ کی موت، اور جب دعوت الحق بمبئی کی جانب سے شرکتِ لیگ اور اس کی حمایت کی استدعا اور درخواست کی گئی تو علماءِ تھانہ بھون نے بالاتفاق لیگ کی مذمت فرمائی اور مرحوم سکندر حیات خاں کے سکریٹری کے خط کے جواب میں حضرتؒ کا لیگ کے آلۂ کار بننے سے انکار فرمانا نقل کیا گیا، ان خطوط کو حضرتؒ کے مریدین جناب الحاج محمود قاسم مدیر التبلیغ ترکیسر اور جناب عیسیٰ بھائی ابراہیم ناظم جمعیۃ العلماء کا دی ضلع بھڑوچ نے ۲۲ر ستمبر ۴۵ء کو حمیدیہ مسجد بمبئی میں ناظم دعوت الحق کے پاس دیکھا ہے، اور مولانا عبدالعزیز بہاری صدر جمعیۃ العلماء بمبئی کو بھی ان خطوط کا علم ہے، لیکن اس کے بعد بمبئی سے وفد جاتا ہے، وفد کیا تھا گویا آسمانی وحی تھی، دفعۃً ان حضرات کی رائے میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اور محرم ۱۳۶۵ھ کو ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ایک سیاسی رسالہ "افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ" معرضِ وجود میں آجاتا ہے، یہ ایک پُراسرار معمہ ہے، اس رسالہ میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ اس وقت صرف ایک چیز بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں؛

افاداتِ اشرفیہ کے صفحہ ۸۸ پر ارقام ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا اس کا دعوت نامہ حضرتؒ کی خدمتِ عالیہ بھی آیا تھا، اور اسی دعوت نامہ کے ساتھ ناظم صاحب کا ایک خط بھی تھا، حضرتؒ نے اس کا خود جواب عنایت فرمایا تھا، اور اس کی نقل رکھ لینے کو مجھے حکم دیا تھا، چنانچہ ناظم صاحب جمعیۃ

کا اصل خط اور حضرتؒ کے جواب کی نقل میرے پاس محفوظ ہے، جو ذیل میں درج کی جاتی ہے، جس سے حضرتؒ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جائے گا، اور وہی آج تک ہمارا مسلک ہے، والسلام محمد شبیر علی عفی عنہ

الجمعیۃ المرکزیۃ العلماء الہند بازار بلیماران دہلی

حضرت اقدس زاد اللہ مجدکم، السلام علیکم!

دعوت نامہ ارسالِ خدمت ہے، اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو حضرت کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرما دیں، معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے،

من یدکم الاحقر الفقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۶ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء

(جواب) السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا دعوت نامہ آیا، میرا عذرِ سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے، اس لیے خود تو حاضری سے قاصر ہوں، اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا...... کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا، اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے، اس لیے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں، جس کے متعلق مولانا کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے، اور اب تو واقعات نے اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے، بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے، علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیے، تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو، اور مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے، والسلام

اشرف علی

اب میں بزمِ جمشید ملقب بہ اسم تاریخی خمخانۂ باطن (ضبط کردۂ صاحب حسن خلق سامی جناب وصل صاحب بلگرامی) سے ایک ملفوظ پیش کرتا ہوں، اس کے بعد آپ خود فیصلہ کرسکیں گے کہ اس جواب کی نسبت حضرت مولانا کی طرف کرنا اور یہ کہ اُس کی نقل رکھ لینے کو مجھے حکم دیا تھا" کہنا کہاں تک درست ہے، اور حضرتؒ کے مسلک اور ان حضرات کے مسلک اور دعوے میں کس قدر تطابق اور توافق ہے؟

بزم جمشید ضمیمہ ۲ ص ۳۵ ؛ خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون، سہ شنبہ
۸ رمحرم الحرام ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۸ رفروری ۱۹۳۹ء بعد نماز ظہر،

(۶) مجلسِ عام میں جناب مولوی منفعت علی صاحب وکیل سہارنپور، جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ اور بہت سے حضرات حاضر تھے، ایک خاص مقام (دہلی) سے ایک خاص اہم جلسہ میں (جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ دہلی مورخہ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ محرم ۱۳۵۸ھ مطابق ۳، ۴، ۵، ۶ مارچ ۱۹۳۹ء) شرکت کی دعوت کا خط آیا تھا، جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر جناب والا شرکت نہ فرما سکیں تو اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیں، اس سے پہلے اسی جلسہ میں اشاعت کے واسطے ایک خاص مضمون بھیجنے کے لیے جناب مولانا ظفر احمد صاحب اور جناب مولوی شبیر علی صاحب نے اجازت طلب کی تھی، لیکن حضرت والا نے منظور نہیں فرمایا تھا، اب یہ خط آیا تو حضرت والا نے جناب مولوی شبیر علی صاحب کے پاس بھیج دیا، جناب ممدوح نے اس کا جواب لکھ کر ملاحظۂ عالی کے لیے پیش کیا، حضرت والا نے مصالح بیان فرماتے ہوئے جواب بھیجنا نامناسب خیال فرمایا،

بعد عشاء جناب مولوی منفعت علی صاحب اور جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی رائے ہوئی کہ جواب جانا چاہیے، اور اس کے لیے جناب مولوی شبیر علی صاحب کے ذریعہ سے حضرت اقدس کی گرامی خدمت میں عرض کیا جائے، چنانچہ دونوں حضرات

اس خادم (وصل بلگرامی) کو لے کر جناب مولوی شبیر علی صاحب کے پاس گئے، وہاں جناب مولانا ظفر احمد صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، ان دونوں صاحبوں نے واقعات بیان کیے، ضرورت ظاہر کی، اور جواب بھیجنے کے لیے رائے پیش کی، جناب مولانا ظفر احمد صاحب نے بھی جواب بھیجنے کی تائید فرمائی، لیکن جناب مولوی شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ جب مضمون بھیجنا حضرت والا کے خلافِ مزاج ہوا اور جواب بھیجنے کی اجازت نہیں دی تو پھر اصرار کرنا یا مکرر عرض کرنا مناسب نہیں ہے، دوسرے دن صبح کے وقت خادم (وصل بلگرامی) کسی ضرورت سے خدمتِ اقدس میں حاضر تھا، تو کسی سلسلہ میں رات کے واقعہ کا ذکر آگیا، اس ذکر سے حضرت والا پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے، جو کچھ میں کہتا ہوں سمجھ کے کہتا ہوں، غور کرنے کے بعد کہتا ہوں، متعدد بار تجربہ ہو چکا ہے، وہی ہوا جو میں نے کہا تھا، پھر بھی نہیں سمجھتے (الی قولہ) اب لہجہ میں تیزی ہوگئی تھی، بیان میں کوئی دوسری قوت کارفرما تھی، آواز بلند تھی، چہرۂ مبارک اور سرِ اقدس پسینہ سے تر تھا، یہاں تک کہ عمامۂ عالی اتار کر رکھ دیا گیا تھا، اُسی مضمون کے تحت میں عجیب جوش، عجیب کیفیت اور عجیب جذبہ کی حالت میں ایک ایسی تقریر فرما رہے تھے، جو کسی طرح تحریر میں نہیں آسکتی، جناب مولانا ظفر احمد صاحب بھی بیتاب ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگئے تھے، عجیب سماں تھا، عجب منظر تھا، عجیب کیفیت تھی، تمام فضا جوش سے بھری ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا در و دیوار کیا کل کائنات لرزاں تھی (الی قولہ)

(نوٹ) پھر اس جلسۂ مذکورہ کے بعد جس میں حضرت والا کو دعوتِ شرکت دی گئی قریب ہی ایک سخت ناگوار واقعہ (مالک اخبار الامان مولوی مظہرالدین کا قتل) پیش آیا، جس کو عام نظروں میں اسی جلسہ کی تقریروں کا اثر سمجھا گیا، اس وقت عین الیقین کے درجہ میں سب کی سمجھ میں آیا کہ جواب کا نہ جانا اور مضمون

نہ بھیجنا عین مصلحت تھا، ورنہ بعض نگاہوں میں ان تقریروں کو اس مضمون کا اثر سمجھا جاتا کہ اسی مضمون کی مخالفت ان تقریروں کا سبب ہوئی (صفحہ ۳۷) (رسالہ بزم جمشید کے مرتب جناب وصل بلگرامی ہیں، اور ۱۶ر ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو آپ اس کی ترتیب سے فارغ ہوئے ہیں)۔

رسالہ "بزم جمشید" حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں شائع ہوا ہے، اور "افادات اشرفیہ" حضرتؒ کی وفات کے بعد، اور وفات کے بعد کی تصنیفات قابلِ اعتماد نہیں معلوم ہوتیں، چنانچہ تتمۂ اشرف السوانح کے متعلق جناب مولوی عمر احمد صاحب ابن مولانا ظفر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "تتمۂ اشرف السوانح حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مرحوم نے تصنیف فرمایا، اور موصوف کے انتقال کے بعد بصد تحریف و تنسیخ (جس کی داستان طویل ہے) شائع کیا گیا الخ" (منشور ۱۶ر مارچ ۱۹۴۶ء)

؎ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

فقط واللہ اعلم

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ، اٰمین، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۞

کتبہٗ عبد الاحد غفرلہ الصمد (سورتی)

۲۶ ربیع الثانی ۶۵ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۴۶ء

تیسرا رسالہ

نفع المہتدی

مؤلفہ

مولانا محمد عبدالحق نافع گلؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

آجکل علماء اور قوم پرور مسلمانوں کے خلاف لیگ نے جو جہاد شروع کیا ہے اُس کی کامیابی کے واسطے ان کی دولت و ثروت اور حکومت کی ہمدردی و اعانت اگرچہ کافی حد تک اطمینان بخش تھی، مگر باوجود اس کے ان کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس حقیقت پر پردہ ڈالا جائے کہ مسلم لیگ صرف نوابوں، راجاؤں، سرداروں اور خان بہادروں، حکومت کے ملازموں اور نمک خواروں کی جماعت ہی بلکہ عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے کہ ہمارے ساتھ علماء بھی ہیں، اور اُن پر پھر ایسا جاذب نظر خوشنما لیبل لگایا جائے کہ دُور سے ناواقف مسلمان دیکھتے ہی گرویدہ ہو کر پھنس جائیں، اور یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، جمعیۃ علماء ہند کے خلاف پہلے بھی ایک انجمن "جمعیۃ علماء کانپور" کے نام سے قائم کی گئی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر شاید دو وجہ سے توجہ نہ دی گئی:

ایک یہ کہ اس قسم کی جماعتیں ہنگامی ضرورت کے واسطے قائم کی جاتی ہیں، اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد وہ خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، اور عوام کو ان کا نام تک یاد نہیں رہتا،

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا لیبل اتنا جاذب نظر نہیں تھا جتنا کہ موجودہ تجویز شدہ لیبل ہے، کیونکہ پہلے عنوان سے صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ شاید

کانپور کی کوئی انجمن ہو گی اور بس، اب کانپور کے ایک مولوی صاحب نے جن کا رات دن یہی مشغلہ رہتا ہے لیگ کی حمایت اور جمعیۃ علماء ہند کے خلاف کلکتہ میں جمعیۃ علماء اسلام نامی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے، ان کے ساتھ دو چار مولوی صاحبان اور اور کچھ مولوی نما افراد جمع ہو گئے، اور ایک آدھ عالم بھی ہاتھ لگ گیا، پھر کیا تھا لیگی پر . کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی، اگر ایک طرف وہ علماء کو گالی دینے میں جگر لگا رہی تھی تو دوسری طرف ان صاحبوں کے غیر واقعی خطابات آدھ آدھ صفحے کے جلی عنوانات لگا کر صفحات کے صفحات لیگ کی تائید میں ان کے فتاوئ اور مقالات سے سیاہ کر ڈالتی تھی، ان فتووں میں سب سے پہلا فتویٰ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ شرکتِ کانگریس حرام ہے، اور شرکتِ یا اعانتِ لیگ فرض،

چونکہ مولوی صاحب نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سیر کبیر اور اس کی شرح سے اپنا فتویٰ مرتب کیا ہے، اس لیے خیال ہوا کہ کتاب کی پوری عبارت اور اس کے ساتھ ترجمہ اور توضیحی یا تشریحی کچھ جملے تحریر کر کے شائع کر دیا جائے، تاکہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو سکے کہ فتوے کو ترتیب دینے میں کتنی تلبیس اور قطع و برید سے کام لیا گیا ہے، ہم مولوی صاحب سے مایوس ہیں کہ وہ اپنی تحریر یا فتوے سے رجوع کر لیں گے، اس لیے کہ کتاب کی عبارت بالکل واضح ہے، اس میں کوئی ابہام اور اجمال نہیں، تاکہ کسی غلط فہمی کا احتمال ہو، اور اس کے دور ہونے پر اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے، اور مولانا محمد میاں صاحب کے فاضلانہ مقالہ کے بعد تو کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہ رہی، مگر مولوی صاحب نے اس کی بھی قدر نہ کی، اور جواب میں کچھ لکھ ہی دیا،

علاوہ اس کے مصیبت یہ ہے کہ مولوی صاحب کی نیت چاہے کچھ ہو،

مگر جب کبھی دوراہہ پہ پہنچے جہاں پر ایک حکومت کے مخالف گامزن ہوں اور دوسرے پر حکومت کے اعوان و انصار چل رہے ہوں تو آپ کو دوسرا راستہ صراطِ مستقیم دکھائی دیتا ہے، تحریک خلافت میں پانچسو علماء نے ترک موالات کا فتویٰ دیا گویا کہ ایک اجماع تھا، مگر آپ نے اس کے خلاف عدم جواز پہ ایک رسالہ لکھ مارا، اگرچہ اس میں کام کی بات نہ تھی، اور حضرت مولانا مدنی نے اس کا بہترین جواب رسالہ کی صورت میں دیدیا تھا، مگر پھر بھی ان کے رسالہ سے حکومت کا بڑا کام نکلا، اور امن سبھا کو (جو ایک سرکاری جماعت تھی' اور تحریک خلافت و کانگریس کے دبانے کے واسطے قائم کی گئی تھی) کہنے کا موقع مل گیا کہ ہمارے ساتھ بھی علماء ہیں،

اس لیے مولوی صاحب سے اس قسم کی توقع تجربہ سے اغماض کے مرادف ہے' اور شاید اسی وجہ سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بھی اس گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے مایوس ہو کر صرف تمنا کرتے ہیں کہ "کاش! یہ معلوم ہوتا کہ اس سارے جوش و خروش کا باعث کوئی ہنگامی جوش و خروش تو نہیں" چنانچہ معارف کے شذرات میں فرماتے ہیں:

> "پچھلے مہینہ کلکتہ میں ایک نئی جمعیۃ العلماء کی بنیاد پڑی ہے، جہاں تک اس کے نظام نامہ کا تعلق ہے وہ بڑی اہمیت کا مستحق ہے، اور اس سے بہت کچھ توقعات قائم کی جا سکتی ہیں، لیکن کاش! یہ معلوم ہوتا کہ صرف کوئی ہنگامی محرک تو اس ساری گردشِ افکار کا محور نہیں"

اگرچہ سید صاحب کی مایوسی کی ایک اور وجہ بھی ہے، یعنی اس مطبوعہ نظام نامہ پر عمل پیرا ہونے اور اس کو چلانے کے واسطے چند جانباز مخلصوں کی

ضرورت ہے جو یہاں خدا کے فضل سے کالعدم ہے، چنانچہ آگے فرماتے ہیں:

"ان کاموں کے لیے ضرورت ہے چند جانباز مخلصوں کی جو اس کے نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں، اور پیہم سرگرمیوں سے اپنے وجود کا یقین دلائیں، ورنہ سیاسی تماشوں میں ایسے سوانگ بہت دیکھنے میں آتے ہیں"

سید صاحب آگے چل کر تمنا کی بجائے جو توقع اور امید باندھے ہوئے ہیں اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، فرماتے ہیں کہ آجکل مسلمان اہلِ سیاست (لیگ) میں علماء کو بُرا بھلا کہنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اب علماء جمعیۃ علمائے اسلام نے ہمت کر کے (واقعی بڑی ہمت کی ہے) ان کی تائید میں آواز بلند کی ہے، اور اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علماء عموماً مسلمانوں کی (موجودہ اکثری سیاست سے) علیحدگی برت رہے ہیں، تو کیا اب یہ امید کی جائے کہ ہمارے دوستوں کے گزشتہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی ہو گی؟ (نہیں اور ہرگز نہیں، اب تک دارالعلوم کو دار دھل کہتے ہیں، اور علماء کو وہ جو اُن کی زبان پر آتا ہو اور قلم سے نکل سکے)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا ظفر احمد صاحب نے تو ہمیں مایوس ہی کر دیا ہے' ان سے امید مشکل ہے، مگر عام خالی الذہن مسلمانوں کو سمجھانے کے واسطے جن کے دماغ اس مسموم فضاء سے ابھی محفوظ ہیں' یہ سطور لکھے جا رہے ہیں، اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا ظفر احمد صاحب کے دل کو بھی نرم کر دے اور خواہ مخواہ کی سینہ زوری سے باز آجائیں،

مقصد سے پہلے بطور اصولِ موضوعہ یہ ذہن نشین کیا جائے کہ مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ مل کر مشرکین سے لڑنے کی دو صورتیں ہیں:۔

اول یہ کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو،

اور دوسری صورت یہ کہ اپنی حکومت نہ ہو،

پھر صورتِ اُولیٰ میں دو شق ہیں:

ایک یہ کہ مشرکین مسلمانوں سے مل کر لڑتے ہیں مسلمانوں کے جھنڈے تلے،

دوسری شق یہ ہے کہ مسلمانوں سے مل کر لڑتے ہیں مگر مسلمانوں کے جھنڈے تلے نہیں، بلکہ اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں،

دوسری صورت میں بھی دو شق ہیں:

ایک یہ کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت، اگرچہ نہیں ہے مگر مشرکین سے مل کر دوسرے مشرکین سے لڑنے میں مسلمانوں کا فائدہ ہے،

اور دوسری شق یہ ہے کہ مسلمانوں کا مشرکین سے مل کر ان کے فریقِ مخالف سے لڑنے میں کوئی بھی فائدہ نہیں ہے، تو گویا کہ چار صورتیں اس ترتیب سے نکل آئیں،

۱۔ مسلمانوں کی حکومت ہو اور مشرکین مسلمانوں سے مل کر فریقِ مخالف مشرکین کا مقابلہ اسلام کے جھنڈے تلے کر رہے ہوں،

۲۔ مسلمانوں کی حکومت ہو اور مشرکین مسلمانوں سے مل کر فریقِ مخالف مشرکین کا مقابلہ اسلام کے جھنڈے تلے نہ کرتے ہوں بلکہ اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہوں،

۳۔ مسلمانوں کی حکومت نہ ہو، مگر مسلمانوں کا مشرکین سے مل کر فریقِ مخالف مشرکین سے لڑنے میں فائدہ ہو،

۴۔ مسلمانوں کی حکومت نہ ہو، اور نہ مسلمانوں کا اپنا فائدہ مشرکین سے مل کر فریقِ مخالف مشرکین سے لڑنے میں ہو،

اِن چاروں احتمالات میں اوّل اور ثالث جائز ہے اور ثانی و رابع ناجائز، مثلاً صورتِ اُولیٰ جس میں مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو اور مشرکین مسلمانوں کے جھنڈے تلے لڑتے ہوں، جس کو جائز بتایا گیا ہے، اس کے متعلق امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ارشاد فرماتے ہیں :-

ولا باس بان یستعین المسلمون باھل الشرك علی اھل الشرك اذا کان حکم الاسلام ھو الظاھر علیھم لان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استعان بیھود بنی قینقاع علی بنی قریظۃ،

"اُس میں کوئی حرج نہیں اگر مسلمان مشرکین سے مشرکین کے مقابلہ میں امداد لینا چاہیں، جب کہ اسلام کا حکم ہی غالب ہو، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے مقابلہ میں بنی قینقاع کے یہود سے مدد لی تھی"

اس کے علاوہ استعانت بالمشرکین کی چند مثالیں اور دے کر آگے فرماتے ہیں :-

فعرفنا انہ لا بأس بالاستعانۃ بھم وما ذلك الا نظیر الاستعانۃ بالکلاب علی قتال المشرکین والی ذلك اشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقولہ ان اللہ تعالیٰ لیؤید ھذا الدین باقوام لا خلاق لھم فی الآخرۃ،

"تو معلوم کر لیا ہم نے کہ مشرکین سے امداد لینے میں حرج نہیں، اور یہ بالکل مشرکین کے مقابلہ میں کتوں سے امداد لینے کی نظیر ہے، اور اسی کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے، واقعی اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایسے لوگوں سے کراتا ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"

اور اسی بنا پر حضرت مولانا مدنی مدظلہم اپنی تقریروں اور تحریروں میں بارہا فرما چکے ہیں کہ عدم تشدد کے اصول کے تحت جس سے مجھے مدد ملے حاصل کروں گا، حتی کہ کتا بھی اگر میری اعانت کر سکتا ہو تو میں اس کے حاصل کرنے میں دریغ نہ کرونگا،

صورتِ اولیٰ کے واضح ہونے کے بعد صورتِ ثانیہ کو جس میں مسلمانوں کی حکومت کے ہوتے ہوئے مشرکین سے امداد لینا جائز نہیں سوال و جواب کی شکل میں صاف کرنا چاہتے ہیں!

سوال یہ قائم کیا گیا کہ مذکورہ صدر عبارات سے معلوم ہوتا ہو کہ مشرکین سے امداد حاصل کرنا جائز ہے، حالانکہ اس کا معارض موجود ہے، جس سے اس کے خلاف حکم معلوم ہوتا ہے،:

جواب دیا گیا کہ یہ دوسری صورت ہے، یعنی اسلامی حکومت کے ہوتے ہوئے یہ لوگ مسلمانوں کی امداد مستقل حیثیت سے کرنا چاہتے تھے، اور مسلمانوں کے جھنڈے تلے نہیں لڑتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

والذی روی ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم احد رأی کتیبۃ حسناء قال من ھؤلاء فقال یھود بنی فلان حلفاء ابن أبی فقال انا لا نستعین بمن لیس علی دیننا، تاویلہ انھم کانوا اھل منعۃ وکانوا لایقاتلون تحت رایۃ رسول اللہ صلی

"اور یہ جو روایت کی گئی ہو کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم اُحد میں کسی اچھی فوج کو دیکھ کر فرمایا کون ہیں یہ لوگ؟ تو کہا گیا کہ فلاں قبیلہ کے یہود ہیں، عبداللہ بن اُبی منافق کے حلیف ہیں، تو فرمایا کہ ہم ان لوگوں سے جو ہمارے دین کے تابع نہ ہوں امداد نہیں لیتے، تو اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ لوگ طاقت والے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ

اللہ علیہ وآلہ وسلم وعندنا اذا کانوا بھٰذہ الصفۃ فانہ یکرہ الاستعانۃ بھم،

علیہ وسلم کے جھنڈے تلے لڑنا نہیں چاہتے تھے، اور ہمارے مذہب میں جب مشرکین کی حالت یہ ہو تو ان سے امداد لینا مکروہ ہے؛

اب اس عبارت سے دوسری صورت کا حکم واضح ہو گیا، یعنی اسلامی حکومت کے ہوتے ہوئے مشرکین سے امداد لینا درست نہیں، جبکہ وہ اسلام کے جھنڈے کے تلے نہیں لڑتے،

پھر تتمۂ کلام کے طور سے عبداللہ بن اُبی کی واپسی پر بحث کی ہے کہ یوم اُحد میں لشکرِ اسلام سے کیوں لوٹے؟ تو فرماتے ہیں کہ اس میں روایات مختلف ہیں، کسی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود واپس ہوا، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لیا، اور عبداللہ بن اُبی کی یہ رائے تھی کہ ہم مدینہ ہی میں رہیں، مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے مشورہ پر عمل نہ کیا، تو اس کو یہ ناگوار گذرا، اور یہ کہتے ہوئے واپس ہوا کہ ہم نے خیر خواہی کی بات کہی وہ تو نہ مانی، اور لڑکوں کی باتوں میں آ گئے،

اور کسی روایت میں یہ ہے کہ خود واپس نہیں ہوا، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کیا، جب کہ اس نے درخواست کی کہ میں بھی آپ کے ساتھ لڑائی میں شریک رہوں گا، اور واپس کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ساتھ اس کے حلفاء بنی قینقاع کے سات سو یہود تھے، اور یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ میدانِ کارزار میں مسلمانوں کی کمزوری محسوس کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف انکار فرمایا، اور ارشاد فرمایا انا لا نستعین بمشرك،

اس کے بعد امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتے ہیں:۔

وعندنا اذا رأى الامام الصواب فی ان لا یستعین بالمشرکین لخوف الفتنة فله ان یردّهم،

"اور ہمارے یہاں بھی جب کہ بادشاہ فتنہ کے خوف سے یہ مناسب سمجھے کہ مشرکین سے امداد نہ لی جائے تو اس کو حق ہے کہ ان کی امداد ٹھکرا دے"

اس تتمۂ کلام کے بعد تیسری صورت بیان فرماتے ہیں، یعنی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو، مگر مسلمانوں کا مشرکین سے مل کر فریقِ مخالف مشرکین سے لڑنے میں فائدہ ہو، اور اس شق کو بھی سوال و جواب کی شکل میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مذکور الصدر فرمان اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس فعل سے تو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت اور طاقت کے ہوتے ہوئے مشرکین سے امداد لینی مکروہ ہے تاوقتیکہ وہ ہمارے تابع نہ ہوں اور اپنی مستقل حیثیت کی خواہش کو ترک نہ کردیں، جو غلبۂ اسلام کے وقت قابلِ قبول نہیں، حالانکہ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تو یہاں تک ثابت ہے کہ انھوں نے مشرکین کے جھنڈے تلے مشرکین کی امداد کی غرض سے دوسرے مشرکین سے جنگ لڑی، فرماتے ہیں:

ثم ذکر حدیث الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنه حین کان عند النجاشی فنزل به عدوٌّ فابلیٰ یومئذ مع النجاشی بلاءً حسنًا فکان للزبیر عند النجاشی بها منزلةٌ حسنةٌ فبظاهر هذا الحدیث

"پھر زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کی گئی، جب کہ وہ نجاشی بادشاہِ حبشہ کے پاس تھے، تو آپہنچا اس کا دشمن تو زبیرؓ نے نجاشی کی اعانت میں زبردست طاقت آزمائی کی، سو اسی وجہ سے نجاشی کے یہاں زبیرؓ کی بڑی قدر تھی، تو جو لوگ مسلمانوں کا لڑنا مشرکین

یستدل من یجوز قتال المسلمین مع المشرکین تحت رایتھم،

کے ساتھ مل کر ان کے جھنڈے تلے جائز سمجھتے ہیں، اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کرتے ہیں!!

آگے فرماتے ہیں کہ اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں، ایک یہ کہ نجاشی مسلمان ہو چکا تھا (اگرچہ اسلام کو ظاہر نہیں کیا) اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ حالات مختلف ہوتے ہیں، مثلاً غلبۂ[۱] اسلام کے وقت مشرکین سے امداد لینا اس وقت چاہیے جب کہ اسلام کے جھنڈے تلے لڑتے ہوں، اور غلبۂ[۲] اسلام کے ہوتے ہوئے اگر وہ اسلام کے جھنڈے تلے نہ لڑتے ہوں بلکہ ایک مستقل حیثیت میں رہ کر امداد کرنا چاہیں تو یہ امداد ٹھکرائی جائے گی، بلکہ اس میں بھی یہ صورت ہو کہ بادشاہ کی رائے میں اگر یہ درست ہو تو اس کو حق ہے کہ اس پیشکش کو ٹھکرا دے، اور[۳] اگر مشرکین کی امداد کرنے میں ان کے جھنڈے تلے مسلمانوں کا فائدہ ہو اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ان کی امداد کرنی چاہیئے،

تو اب یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس حالت میں مشرکین کی اعانت ان کے جھنڈے تلے کی ہے، تو ام المؤمنین اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہاں یہ تیسری صورت تھی، اور مسلمانوں کو ایسی صورت میں اپنی بہادری کا جوہر دکھانا چاہیے، چنانچہ فرماتے ہیں:

ولکن تاویل ھذا من وجھین عندنا، احدھما[۱] ان النجاشیؓ کان مسلما یؤمن کما روی

"لیکن اس سوال کا دو طریقہ سے جواب دیا جا سکتا ہے، ایک[۱] یہ کہ نجاشی اس وقت مسلمان تھا، اس لیے زبیرؓ نے اس کے

فلهذا استحل الزبير القتال
معه والثاني انه لم يكن
للمسلمين يومئذ ملجأ غيره
على ما روى عن ام سلمة رضي
الله تعالى عنها قالت لما اطمأنا
بارض الحبشة فكنا في خير دار
عند خير جار نعبد ربنا الى
ان سار الى النجاشي عدو له
فما نزل بنا قط امر عظيم منه
قلنا ان ظهر على النجاشي لم يعرف
من حقنا ما كان النجاشي يعرف
فاخلصنا الدعاء الى ان يمكن
النجاشي ثم قلنا من رجل
يعلم لنا علم القوم فقال
الزبير رضؓ بن العوام انا فنفخ
قربة ثم ركبها حتى عبر النهر
والتقى القوم وحضر الزبير رضؓ
معهم وجعلنا نخلص الدعاء
الى طلع الزبير رضؓ في النيل يلبح
بثوبه الا ابشروا فان الله
تعالى قد اظهر النجاشي ومكن

ساتھ مل کر لڑنا جائز سمجھا، دوسرا یہ کہ
مسلمانوں کا اس کے سوا چارہ نہ تھا،
چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی
ہیں کہ جب ہم حبشہ میں رہنے لگے تو بہترین
مقام اور بہترین پڑوس میں تھے، اپنے
خدا کی عبادت میں مشغول تھے کہ نجاشی کا
دشمن آپہنچا، تو اس مصیبت سے بڑھکر کوئی
مصیبت ہم کو کبھی بھی نہیں پہنچی تھی،
اور ہم کہنے لگے کہ اگر یہ غالب آگیا تو نجاشی
برابر ہمارے حق کو نہ مانے گا، تو ہم نے اخلاص
سے دعائیں شروع کیں کہ اللہ تعالیٰ نجاشی
کو غلبہ دے، پھر ہم کہنے لگے کہ کون ہوگا
جو قوم کا پتہ لگائے، تو زبیرؓ نے فرمایا کہ
میں، اور اپنی مشک کو ہوا سے بھر کر
اس پر سوار ہوگئے، اور دریا کو پار کرلیا،
اور قوم ایک دوسرے کے مقابلہ پر آگئی،
اور حضرت زبیرؓ ان کے ساتھ رہے، اور
ہم دعائیں مانگتے رہے، یہاں تک کہ زبیرؓ
دریائے نیل میں نمودار ہوئے، کپڑے سے
اشارہ کرتے ہوئے کہ خوش ہوجاؤ، اللہ تعالیٰ
نے نجاشی کو غلبہ دیا، اور زمین میں مکنت

له فی الارض واهلك عدوله قالت فاقمنا عند خیر جار فبهذا الحدیث تبین صحة التاویل الذی قلنا، والله اعلم،

دی اور اس کے دشمن کو ہلاک کیا، فرمانے لگیں پھر ہم رہے بہترین پڑوس میں، تو اس حدیث سے اس تاویل کی صحت جو ہم نے کی تھی واضح ہوگئی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یعنی یہ کہ اسلامی حکومت کے ہوتے ہوئے مشرکین سے امداد لینی جائز ہے جب کہ وہ اسلام کے جھنڈے تلے لڑتے ہوں، اور جائز نہیں اگر وہ اسلام کے جھنڈے تلے نہیں لڑتے، بلکہ ایک مستقل حیثیت میں رہ کر لڑتے ہوں،

اور یہ پیش کردہ صورت، یعنی مسلمانوں کا مشرکین سے مل کر ان کے فریقِ مخالف مشرکین سے لڑنا جب مسلمانوں کا اس میں فائدہ ہو، یہ اور صورت ہے جس کو ہم نے تیسرا نمبر دیا تھا، یعنی وہ اسلامی حکومت تھی ہی نہیں، اور مسلمانوں کا اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ مشرکین سے مل کر ان کے دشمن کو شکست دیتے، ان کے واسطے دعائیں کرتے، ان کی فتح اور کامرانی پر خوشیاں مناتے، ان کی خیر خواہی اسی میں تھی، اور فائدہ اسی صورت میں پہنچتا تھا،

میں اب مولانا ظفر احمد صاحب سے پوچھتا ہوں، اپنے ضمیر کی آواز سے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں کہ کیا ہندوستان میں یہ تیسری صورت متحقق نہیں بلکہ وہاں سے یہاں بہتر طریقہ پر نہیں؟ وہاں تو دشمن نجاشی کا تھا اور یہاں مشترک ہے، وہاں تو صرف مسلمانوں کا رہنے کا حق تھا اور یہاں حکومت میں رسدی حصہ ملے گا، بعض جگہ ہندوؤں سے زیادہ جیسے پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان بنگال اور بعض جگہ کم، وہاں مہاجرین کے چند افراد کو حبشہ کی فتح سے آرام ملا تھا اور ہندوستان کی آزادی سے جو صرف قوم پرور مسلمان اور کانگریس کی سعی و کوشش سے آنے والی ہے سارے عالمِ اسلام کو آرام ملے گا، جس حکومت سے

کانگریس، جمعیۃ العلماء، احرار وغیرہ نبرد آزما ہیں، اور اس کے ہاتھ سے آئے دن مصیبتیں جھیل رہے ہیں، اس نے عالم اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، سب سے زیادہ مصیبت میں مبتلا کیا ہے، اس کے دفع ہونے پر سب سے پہلے عالم اسلام آرام کا سانس لے گا، تفصیلات اتنی ہیں کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہیں، اور بدیہی اور واضح ایسی ہیں کہ مجھے اتنا لکھنا بھی فضول معلوم ہوتا ہے، ہاں اقرار و اعتراف کے واسطے انصاف کی ضرورت ہے، تو اب صاف واضح ہو گیا کہ مشرکین سے استعانت تو درکنار اعانت بھی جائز ہے، اگر مسلمانوں کا اس میں فائدہ ہو، اور کانگریس کی شرکت میں تو اپنی حکومت لینی ہے، اپنے تناسب سے حصہ دار بننا ہے، یہاں تو اعانت و استعانت کا سوال ہی نہیں، بلکہ مشترکہ جائداد کو واگذار کرنا ہے۔

اور یہی حضرت مولانا مدنی مدظلہم خطبۂ سہارنپور میں ارشاد فرماتے ہیں،

اب چوتھی صورت رہ گئی، یعنی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو، اور نہ مسلمانوں کا مشرکین سے لڑنے میں اپنا فائدہ ہو تو اس صورت میں مشرکین کی اعانت مناسب نہیں، اگر روس و جرمنی آپس میں لڑنے لگے تو مسلمانوں کو دور سے تماشہ دیکھنا چاہیے، دونوں شیطانی طاقتیں ہیں، یا برطانیہ اور امریکہ آپس میں برسر پیکار ہو جائیں، اور مسلمانوں کا کسی فریق سے ملنے میں فائدہ نہ ہو تو بھی تماشائی بنیں، طاغوتی طاقتوں کو آپس میں نبٹنے دیا جائے، چنانچہ صفحہ ۲۴۱ میں فرماتے ہیں:

لا ینبغی للمسلمین ان یقاتلوا اہل الشرک مع اہل الشرک لان الفئتین حزب الشیطٰن وحزب الشیطٰن ھم الخٰسرون فلا تنبغی للمسلم ان ینظم	"مسلمانوں کو یہ مناسب نہیں کہ مشرکین کا ساتھ دے کر دوسرے مشرکین سے لڑیں دونوں شیطانی جماعتیں ہیں اور شیطانی جماعت ہی خاسر رہتی ہے، تو مسلمان کو شایاں نہیں کہ ان دونوں شیطانی جماعتوں

الیٰ احدی الفئتین فیکثر سوادھم ویقاتل دفعاً عنھم وذٰلک لان حکم الشرک ھو الظاھر والمسلم انما یقاتل لنصرۃ اھل الحق لا لاظہار حکم الشرک،

میں سے کسی سے مل کر اس کی جماعت بڑھا دے، کیونکہ شرک کا حکم ہی یہاں غالب ہے اور مسلمان تو لڑتا ہے اہلِ حق کی نصرت کے واسطے، نہ کہ شرک کے حکم کو غالب کرنے کے واسطے۔"

اب ہر منصف مزاج آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ مولوی صاحب نے کس بُری طرح سے عبارت میں قطع و برید کیا ہے، اور اس صورت کو جس میں مسلمانوں کے فائدہ کے واسطے مشرکین کے جھنڈے تلے لڑنے کا ثبوت ہے اس کو حذف کر دیا ہے، کیونکہ اگر اس کو ذکر کریں گے تو پھر کانگریس میں شرکت کے عدمِ جواز پر فتویٰ دینا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، تو جب آپ زبیر بن عوام کی حدیث اور شرح سیر کبیر کی تقریر سے یہ سمجھ گئے کہ مسلمانوں کا مشرکین سے مل اُن کے جھنڈے تلے لڑنا صحیح مقصد کے پیشِ نظر جائز ہے، تو اب آپ ہی فرمائیے کہ اس قوت متسلطہ کو دفع کرنے کی غرض سے کانگریس میں شریک ہونا، جس کے بنیادی اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر فرقہ اپنے مذہب میں آزاد ہوگا، جبکہ اس مصیبتِ عظمیٰ سے گلوخلاصی کا اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو فرض و واجب نہ ہوگا؟ جس نے ہندوستان کی اسلامی حکومت کو تہ و بالا کر کے ہندوستان کی مسلم قوم کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا ہے، جس نے حکومت ترکیہ کو مصائب و آلام میں اس وقت تک پریشان رکھا جب تک ان کی خلافت عظمیٰ ایک مختصر سی ریاست میں تبدیل نہ کر دی گئی، جس نے جزیرۃ العرب کے بیسیوں ٹکڑے کر کے اتنا کمزور اور بے بس کر دیا کہ ان سفید فام خونخواروں سے ہر وقت لرزہ براندام ہیں، جس نے اس ذلیل قوم

کو جو زمین کی کسی سطح پر بھی گوارا نہیں کی جا سکتی ہے، یورپ کی زمین کو ان سے صاف کرتے ہوئے فلسطین کی مقدس سرزمین پر لا بسایا، جس نے فلسطین کے غریب و کمزور اعراب کو دائمی مصائب و آلام میں مبتلا کر کے ان کی زندگی اجیرن کر دی، جس نے افریقہ اور جزائر سماٹرا و جاوا کے کروڑوں مسلمانوں کو اپنی جنگی مشینری کی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر بجبر و اکراہ اپنا اور اپنے ہمسایوں کا غلام بنا رکھا ہے، جس نے صوبہ سرحد کے فاقہ مست غریب قبائل کو تقریباً ستر اسّی سال سے اپنی توپوں کی گولہ باری اور ہوائی جہازوں کی بمباٹ سے پریشان کر رکھا ہے، جس نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول سے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا ہے، جس نے ہندوستان کے اکثر نوجوانوں کو زہریلے نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم سے ملاحدہ و دہریہ میں بدل ڈالا، اور جس نے وہ وہ کیا کہ اس مختصر سی تحریر میں اس کا استقصا ناممکن ہے،

یہی تو وجہ تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرکتِ کانگریس کے جواز کا فتویٰ اس وقت دیا تھا جبکہ کانگریس اتنی طاقتور بھی نہ تھی، اور قوتِ متسلطہ کو اتنا پریشان نہیں کیا تھا، صرف اس بنا پر کہ ظالم کے سامنے درست و صحیح بات پر تنبیہ کر سکتی ہے، یہ وہ حقائق ہیں کہ جب تک آنکھوں پر پٹی نہ باندھی جائے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے،

اس کے بعد مولوی صاحب نے پاکستان کو سراہا ہے، فرماتے ہیں:۔

"رہا مطالبۂ پاکستان تو جبکہ تمام ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا بحالتِ موجودہ کسی طرح ممکن نہیں تو کم از کم اُن صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے اسلامی سلطنت بنا لینا کہ وہاں اسلامی سلطنت اسلامی اصولوں پر قائم کی جا سکے لازم اور ضروری ہے، اور اس کی

نظیر مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت ہے، جبکہ مکہ معظمہ میں اسلامی حکومت اور نظام اسلامی قائم نہ ہو سکا، تو مدینہ منورہ کو مرکز بنایا گیا، اسی طرح کیا عجب ہے کہ پاکستان سے اسلام کی ترقی ہو، الخ "

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان کیا چیز ہے؟ اس کو کون حاصل کرے گا؟ کس طریقہ سے حاصل کرے گا؟ اس میں حکومت کیسی ہوگی؟ تمام ہندوستان کو کیوں اسلامی سلطنت بنانا کسی طرح بھی ممکن نہیں؟ اور ان صوبوں میں جہاں مسلم اکثریت ہے پاکستان بنانا کیوں سہل ہے؟ جس کی بناء پر لازم اور ضروری قرار دیا جاتا ہے، اور یہ کہاں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا باعث اسلامی حکومت کا قیام تھا، غرض یہ کہ کس کس جُز پر بحث کی جائے اور اتنی فرصت کہاں سے لائی جائے؟ ؎

من یک وصد آرزو دل بکہ مدعا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

مگر مثل مشہور ہے لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ " یعنی جب سب ہاتھ نہ آتا ہو تو سب چھوڑا بھی نہیں جاتا"، اس لیے بطور مشت نمونہ خروار ناظرین کی ضیافت طبع کے پیش نظر کچھ عرض کروں گا، باقی ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

نبیرۂ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد عثمان صاحب کے استفسار پر ایک مولوی صاحب استاذ جامعہ ڈابھیل نے دوران گفتگو میں کہا کہ مولانا ظفر احمد صاحب سے میں نے پاکستان کے متعلق دریافت کیا کہ "پاکستان" کیا چیز ہے؟ تو انھوں نے (یعنی مولانا ظفر احمد صاحب نے) کہا کہ مجھے اس کی پوری حقیقت معلوم نہیں، مسٹر جناح سے دریافت کروں گا، اس مجلس میں

مولانا عبدالحق صاحب پشاوری، مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی، مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی اساتذۂ دارالعلوم موجود تھے۔ بعض حاضرین کو اس لاعلمی پر تعجب ہوا، مگر تعجب کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اصل مدعی تو کوئی جامع مانع تعریف بتلا نہ سکے تو مولوی صاحب بیچارے کیا کہتے؟ مسٹر جناح کو اس مطالبہ اور سوال پر غصہ آتا ہے،

مگر غصہ اور بُرا بھلا کہنے سے حقائق نہیں بدلتے، نہ یہ کوئی جواب ہے، جواب وہ ہے جس سے معقول پسند، منصف مزاج انسان کی تسلی ہو جائے رہا دوسرا امر یعنی پاکستان میں حکومت کیسی ہوگی؟ تو زعمائے لیگ اپنا مغربی پالیٹکس کے مطابق جہاں بھی گئے اور لوگوں کے اموال و عواطف جیسے بھی پائے اسی کے مطابق فرماتے رہے، لیگ کے قائدِ اعظم مسٹر جناح احمد آباد جاتے ہیں تو تقریر میں یوں فرماتے ہیں:

"اقلیت کے صوبہ والوں (مسلمانوں) پر جو گذرتی ہے گذر جانے دو لیکن آؤ ہم اپنے اُن بھائیوں کو آزاد کرادیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں، تاکہ وہ شریعتِ اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کرسکیں"۔

(پاکستان نمبر "ایمان" ص ۲۲، ک ۲، لاہور ۲۸ ۲/۱)

مگر نیوز کرانیکل کے نمائندہ کو یہ بیان دیتے ہیں:۔

"پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طریقہ پر ہوگی، ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شماری کی حیثیت سے رائے شماری کرکے فیصلہ صادر کریں گے، وزارتوں اور لیجسلیچروں میں سب حصہ دار ہوں گے"،

پھر ڈان میں یہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"مسٹر جناح نے ہمیشہ پاکستان کو ایک دنیاوی اسٹیٹ قرار دیا ہے، اور اس خیال کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے کہ اس مسلمانوں کی حکومت الٰہیہ قائم ہوگی، جو لوگ پاکستان کو پان اسلام ازم (اتحادِ اسلامی کے مرادف قرار دیتے ہیں وہ اتحاد کے دشمن ہیں" (ڈان ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء بحوالہ زمزم ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء زندہ باد قائدِ اعظم!!)

اور جب ۸ نومبر ۱۹۴۵ء بمبئی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو بیان دیتے ہیں تو یہ گوہر افشانی ہوتی ہے:۔

"پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی، اور مجھے امید ہے کہ پاکستان کی بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلسٹ اصول پر قوم کے قبضہ میں دیدیئے جائیں گے" (منشور ۱۱/۱۱/۴۵ء صفہ ۳ ک ۲) و (انجام ۱۱/۱۱/۴۵ء ص ۱ ک ۴)

.... آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری نواب زادہ لیاقت علیخاں صاحب ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی، اس کا دستور اساسی اس کے باشندے (ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ) خود اپنے دستور ساز ادارہ ل

عہ مولوی صاحب اب میں آپ سے پوچھتا ہوں اپنے ضمیر سے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجیے کہ اسلامی حکومت اسلامی اصول پر یہ ہے، اور یہ بھی ارشاد فرمایئے یہ اتحاد کن لوگوں کے ساتھ ہے جس کے دشمن پر مسٹر جناح کو غصہ ہے، کیا یہ ہندو اور سکھ تو نہیں؟ حافظِ شیراز تو یہ کہہ گئے ہیں: محتسب خُم شکست و من سرِ او ... [illegible] ... گرمے خورد معذور دارد مست را،

کے ذریعہ بنائیں گے، اور ان اداروں کی تشکیل وہ خود کریں گے۔"

(منشور ۲۶ ۹/۴۵ ص ۶)

میاں بشیر احمد صاحب ممبر ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ ۲ نومبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ہمارے قائد اعظم بار بار کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب عوام کی حکومت ہوگی، پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو برابری اور آزادی دی جائے گی"

مگر انہی میاں بشیر احمد صاحب نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ:۔

"پاکستانی طرزِ حکومت خلفائے راشدین کی حکومت کے مطابق ہوگا"

(مدینہ ۱ ۱/۴۳ء)

اب ذرا نواب اسمٰعیل خان صاحب کی بھی سنیئے، ۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو الٰہ آباد کی تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان ہے، اور وہ اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام کی سیاسی بنیادوں پر شریعت مطہرہ کی حکومت قائم کر دے" (منشور ۱۱/۴۵ ص ۶ ک ۱)

اب خدارا بتایا جائے کہ کس کی مانیں، اور جس کی مانیں تو کونسی ہدایت پر یقین رکھیں؟ 'شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا' مسٹر جناح نے اپنے

ع۵ بالکل بجا، سو فی صدی درست، مگر کل ہند جمعیۃ والوں کو سمجھائیے، وہ بیچارے ابھی غافل ہیں، ورنہ وہ مغربی پالیٹکس کے قائل تو نہ ہوں گے، کہ اِدھر کچھ اور اُدھر کچھ۔ منہ

اور اپنے اتباع کے متضاد بیانات سے کچھ گھبرا کر پشاور میں پینترہ بدل کر یہ فرمایا کہ:-

"ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جب پاکستان ملے گا تو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرے گا؟"

اس میں یہ کمال کیا گیا کہ جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا اور مغربی طرز کی جمہوریت قائم ہوگی تو کسی قدیم الخیال راسخ العقیدہ مسلمان کو جواب دے سکیں گے کہ ہم نے وعدہ کب کیا تھا، ہم نے تو کہا تھا ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جب پاکستان ملے گا تو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرے گا، یہ کوئی وعدہ ہے؟ اب مولانا ہی اپنی قوتِ اجتہاد سے فیصلہ کریں کہ پاکستان میں کیسی حکومت ہوگی؟ اور یہ کہ سچ مچ یہ نظیر ہوگی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی!

سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ نہ تو پاکستان کی کسی ذمہ دار لیگی نے ایسی تعریف کی ہے جس سے معقول پسند، منصف مزاج انسان کی تسلی ہو سکے، اور نہ پاکستانی حکومت کو یک زبان ہو کر متعین کیا گیا، بلکہ اِدھر کچھ کہتے ہیں اُدھر کچھ کہتے ہیں، ہندوؤں، سکھوں کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں پاکستان کوئی دینی و مذہبی حکومت نہ ہوگی، خالص ایک دنیوی حکومت ہوگی، اس کا دستور اساسی اس کے باشندے خود اپنے دستور ساز اداروں کے ذریعہ بنائیں گے،

سیدھے سادھے مسلمانوں کے پاس جب ووٹ مانگنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلم لیگ اس بات پر تُلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام کی سیاسی بنیادوں پر شریعتِ مطہرہ کی حکومت قائم ہوگی، اور اگر کوئی منچلا صاحب بہادر یورپین ملا تو اس سے یہ کہہ ڈالتے ہیں کہ پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طریقہ پر ہوگی،

بہرحال اس کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب اس اعتراض کے دفع کرنے پر

متوجہ ہوتے ہیں جو علماء اور قوم پرور مسلمانوں کی طرف سے لیگ پر کیا جاتا ہے اعتراضات تو بہت ہیں مگر مولوی صاحب نے صرف ایک کو لیا ہے، تو ہم بھی اسی پر اکتفاء کرتے ہیں،

اعتراض کا خلاصہ مختصر سے مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ ہمیں تو اقرار ہے کہ کانگریس سب ہندوستانیوں کی مشترک جماعت ہے، اور ہر مذہب کے لوگ اس میں شریک ہیں، اور ہر شخص پر اپنے مذہب کا پابند رہتے ہوئے فرض ہے کہ اس کے اس مبارک مقصد (آزادیٔ وطن) میں ہر ممکن قربانی سے دریغ نہ کرے، مگر تم جو یہ کہتے پھرتے ہو کہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے، اور عوام کو ان نعروں سے مرعوب کرتے ہو کہ ہمارا خدا ایک، ہمارا قرآن ایک، ہمارا مذہب ایک، یہ عوام کو دھوکہ دیتے ہو، کیونکہ تمھاری جماعت میں دہریوں کی بھرمار ہے، جو سرے سے خدا کے منکر ہیں، وہ ہندوؤں سے بدرجہا بدتر ہیں، ہندو خدا کو تو مانتے ہیں، کمیونسٹ خدا کے منکر ہیں، خدا کا مذاق اڑاتے ہیں، پیغمبروں سے استہزاء کرتے ہیں، اسلام کے لیے سب سے زیادہ یہی لوگ خطرناک دشمن ہیں، کیونکہ یہ لوگ مذہب اور بانیانِ مذہب کا جتنا بھی تمسخر کریں اور اسلام کی بنیادوں میں (اگر بس چلے تو) جتنا بھی ڈائنامنٹ رکھیں، پوچھنے والا کوئی نہیں، کیونکہ بدقسمتی سے یہ لوگ مسلمانوں کے یہاں پیدا ہوئے ہیں، اور ان کے نام مسلمانوں کے نام پر رکھے گئے، نیز تمھاری لیگ میں قادیانی بھی بحیثیت مذہب سب کے سب شامل ہیں، ان کو تم بھی کافر کہتے ہو، اور ان کے کفر میں بھی شک کی گنجائش نہیں، انھوں نے جتنے ہندوستانی مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے ہندو لوگ ایک ہزار سال میں بھی نہ بنا سکے، اور کسی ہندو کو قادیانی نہ بنایا ہوگا، صرف مسلمانوں کو مرتد کرتے رہتے ہیں، انھوں نے اور ان کے پیشوا مرزا

غلام احمد قادیانی نے جتنی گستاخیاں انبیاء اور صلحاء کے حق میں کی ہیں، شاید کسی نے کی ہوں، اور خصوصاً سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سیدتنا صدیقہ مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حق میں، ختم نبوت کے منکر، جہاد کے منکر وغیرہ وغیرہ، اور شیعہ بھی اس میں داخل ہیں جن کا پختہ عقیدہ ہے کہ شیخین پر تبرا بلکہ جملہ صحابہ پر تبرا مذہبی فریضہ ہے، قرآن کے ۴۰ پارے ہیں اور دس پارے ان لوگوں نے غائب کر دیئے، وغیرہ وغیرہ، جو کہا جاتا ہے،

ان کے علاوہ لیگ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سرتاپا انگریز بنے پھرتے ہیں، اور جب الیکشن کا زمانہ آیا ترکی ٹوپی اوڑھ کر اسلام کے علمبردار بن گئے، اور اسٹیج پر چڑھ کر علماء کو صلواتیں سنائیں تو مسلم قوم کے لیڈر کہلائے گئے، اور ان کی وہ ذریت جو کالج یونیورسٹی میں غالب اکثریت کا عنصر ہے، ان کے اخلاق چھوڑیئے کہ شرفائے قوم اور علمائے اسلام کے سامنے ننگے ناچتے ہیں، منھ پہ تھوکتے ہیں، شرابوں کی بوتلیں لاکر ان حضرات کے گریبان، ڈاڑھی تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کو فرمانِ خداوندی کے مطابق ان محرمات سے انتہائی نفرت ہے، اور ان کے اعمال سے بھی تھوڑی دیر کے لیئے قطع نظر کیجیے صرف ان کے بنیادی عقائد پر نظر ڈالیے اور ان کے واسطے نام آپ ہی تجویز فرمایئے، اگرچہ آپنے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ملازم ہوکر حالات کا پورا جائزہ لیا ہوگا، مگر پھر بھی اگر میں آپ کی اعانت کی غرض سے ایک صاحب کے خط کے جو علیگڈھ یونیورسٹی کے بی، اے ہیں دو اقتباسات پیش کردوں تو آپ کو تسمیہ میں آسانی ہوگی،

ایک صاحب ”زمزم“ کے مدیر محترم کو لکھتے ہیں:

”مولانا! آپ میرے خیالات سے واقف ہی ہیں کہ میں اور میرا سارا

خاندان پاکستان کا حامی اور لیگ کی پالیسی کا پیرو ہے، مگر چند امور
ایسے ہیں جن کا تصور مجھے گھن کی طرح کھائے جارہا ہے، اگر میری بے چینی
حد سے نہ بڑھ گئی ہوتی تو میں آپ پر ان کا اظہار کبھی نہ کرتا، میں نے
ہمیشہ تعلیم یافتہ حضرات کو جاہل عوام پر ترجیح دی ہے، کیونکہ علم
خواہ وہ کیسا ہی ہو بہرحال جہل پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن جب سے
میں نے یونیورسٹی کے طلبہ کی...... گردی دیکھی ہے علم کے نام سے
میری روح کانپنے لگی ہے، اللہ میری بے چینی دور کرے، اور مسلم
یونیورسٹی کے طلبہ پر رحم فرمائے، ان کی حرکتوں کو دیکھ کر میں اس نتیجہ
پر پہنچا ہوں کہ موجودہ تعلیم انسان کو حیوان اور حیوان کو درندہ بنانے
میں خاص کمال رکھتی ہے، خدا کی قسم! جاہل اِن تعلیم یافتہ حضرات
سے ہزار درجہ بہتر، رامپور کا شہدہ پھر شریف ہے کہ وہ اپنے آپ کو
شریف نہیں سمجھتا، کہاں سے وہ الفاظ لاؤں کہ ان روشن خیالوں
کی سیرت کا ہلکا تصور ہی دماغ میں پیدا ہو جائے، دیکھتا ہوں
اور تعلیم پر ہزار ہزار لعنت بھیجتا ہوں، دنیا کی وہ کونسی بدزبانی ہو
جو اُن کی زبان پر نہ ہو، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت ان کی زبان سے سن لیجیے
"مولوی...... سور کا بچہ، حرام زادہ" جہاں کسی کُتے کو دیکھا
اور ہنس کر بولے "دیکھنا ذرا، مولوی...... تشریف لیجارہے
ہیں" اور جب سے الیکشن کے سلسلہ میں انھوں نے باہر قدم نکالا ہے
زمین تھرّا اٹھی ہے۔"

خدا اور مولویت

ابھی ایک اقتباس اور بھی ملاحظہ ہو:۔

گھٹانا ہوں، میری دعا، ہے کہ پاکستان جلد قائم ہو، مگر میرا خیال ہے
کہ پاکستان قائم ہونے سے پہلے خدا نہ کرے اسلام کا گورستان بننے
والا ہے، مسلم یونیورسٹی میں غالب اکثریت کمیونسٹوں کی ہے، مگر ایسے
کمیونسٹ نہیں جو زبان سے بھی اقرار کریں، بلکہ ایسے دشمنِ خدا جو
آجکل سب سے زیادہ خدا کا نام لے رہے ہیں، گزشتہ ہفتہ یونیورسٹی کے
ایک ہونہار نے میری موجودگی میں ایک صاحب سے کہا مولویت کو ختم
کیے بغیر خدا ختم نہیں ہوگا، دوسرے نے کہا، بھئی خدا بھی بہت سخت
جان نکلا، مگر اب ہمیں اس کے پچھاڑنے کا موقع مل گیا ہے، یہ بھی
کئی بار سُنا کہ ہماری جنگ نہ مولوی سے نہ مالوی سے، ہماری جنگ
تو خدا سے ہے، ایک صاحبان نے یونیورسٹی سے قادیان کو لمبا چوڑا
خط لکھا ہے کہ علماءِ سوء کی مذمت میں اسلامی لٹریچر میں جو کچھ بھی
نظر سے گذرا، خصوصاً حدیثیں اور بزرگوں کے اقوال، وہ سب جمع
کر کے بہت جلد ارسال کر دیجیے، یہ انتخاب کا وقت ہے، مولویوں
کو ختم کرنے کے لیے آپ ہمارا ہاتھ بٹائیے، فلاں احمدی صاحب جو
یہاں تعلیم پا رہے ہیں ان کا سفارش نامہ بھی منسلک ہے، غرض کیا کیا
لکھوں، چاہتا ہوں کہ خودکشی کر لوں، یا ان .... کا نام و نشان
مٹا دوں، آپ کو پاکستان پر غصہ ہے مجھے مسلمان پر کہ خدا نے اس
مخلوق کو کیوں پیدا کیا......"

تو جب مسلم لیگ میں اسلام کے اتنے خطرناک دشمن شریک ہیں تو یہ خالص
مسلمانوں کی جماعت کیسے رہی؟ اس کے متعلق مولوی صاحب فرماتے ہیں،
اور مسلم لیگ پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں شیعہ وغیرہ بھی شامل ہیں، اس کا

جواب بھی شرح سیر کبیر کے اس قول میں موجود ہے جو اس کے بعد ہی مذکور ہے :

ولا باس بان یقاتل المسلمون من اهل العدل مع الخوارج المشرکین من اهل الحرب لانهم یقاتلون الآن لدفع فتنة الکفر واظهار الاسلام فهذا قتال علی الوجه المامور به وهو اعلاء کلمة الله تعالیٰ بخلاف ما سبق فالقتال هناک لاظهار ما هو مائل عن طریق الحق وههنا لاثبات اصل الطریق،

"اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہو کہ اہل سنت مسلمان غیر سنی خوارج مسلمانوں کے ساتھ مل کر حربی مشرکین کے ساتھ لڑے، کیونکہ وہ خارجی مسلمان پھر بھی فتنۂ کفر کے دفع کرنے کے لیے اور اظہارِ اسلام کے لیے لڑتے ہیں، تو یہ جنگ حکمِ الٰہی کے مطابق ہو اور وہ اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے، بخلاف ماسبق لڑائی کے (یعنی مشرکین کے لیے) کیونکہ وہاں کی لڑائی میں اس کا ظاہر کرنا تھا، جو مائل تھا راہِ راست سے، اور یہاں پر اصل طریق کے اثبات کے واسطے ہے"

نہ معلوم مولوی صاحب نے کہاں سے سمجھ لیا کہ اہلِ عدل سے مراد اہلِ سنت والجماعت ہے، اور خوارج سے مراد وہ فرقۂ خارجیہ ہے جس کی تعریف یہ کی گئی :

وقال شیخنا ابو الحسن الذی یجمعها ای الخوارج علی افتراق مذاهبها، اکفار علیؓ وعثمانؓ واصحاب الجمل والحکمین ومن رضی بالتحکیم وصوب الحکمین او احدهما ووجوب الخروج علی السلطان الجائر،

"اور ہمارے شیخ ابو الحسن نے فرمایا کہ باوجود آپس کے اختلاف کے خوارج کا وہ جامع وصف جو ان سب کو حاوی ہو وہ کافر کہنا ہے حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کو، اصحاب جمل کو، حکمین یعنی ابو موسیٰ اشعریؓ، عمر بن عاصؓ کو اور جو لوگ ان کو حکم بنانے پر راضی تھے اور جنھوں نے ان حکمین کی

یا ان میں سے ایک کی تصویب کی ہے ان کو اور ظالم بادشاہ سے بغاوت

کرنے کا وجوب"

ہدایہ میں ہے ومن مر علیٰ عاشر الخوارج فی ارض قد غلبوھا فعشرہ

یثنی علیہ الصدقۃ معناہ اذا مر علیٰ عاشر اھل العدل،

دوسری جگہ ہے واذا اخذ الخوارج الخراج وصدقۃ السوائم

لا یثنی،

دوسرے مقام میں ہے واذا قتل رجل من اھل العدل باغیاً

فانہ یرثہ،

ایک اور مقام میں ہے والباغی اذا قتل العادل لایجب الضمان،

ہدایہ کے یہ چند نقول بطور مثال پیش کیے گئے ہیں، ان میں جو الفاظ عادل

اہل عدل، خوارج کے استعمال کیے گئے ہیں مولوی صاحب ان سے کیا مراد لیتے

ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عادل، اہلِ عدل، باغی، بغاۃ، خوارج کتاب الزکوٰۃ

اور کتاب السیر میں بکثرت مستعمل ہے، جو شخص یا جماعت بادشاہِ اسلام

کی اطاعت سے انکار کر دے وہ باغی ہے، بغاۃ باغی کی جمع ہے، بغاۃ کو خوارج

بھی کہتے ہیں، بادشاہ اور اس کی مطیع رعایا کو اہلِ عدل کہتے ہیں، ہر ہر واحد کو

عادل کہا جاتا ہے، یہ وہ بدیہی اصطلاحات ہیں کہ معمولی عربی پڑھا ہوا بھی جانتا ہے

تو اس کا تصور بھی نہیں کہ مولوی صاحب ان اصطلاحات سے ناواقف ہیں،

پھر نہ معلوم مولوی صاحب نے اہل عدل سے اہلِ سنت والجماعت کیسے مراد

لیا؟ اور خوارج سے فرقۂ خارجیہ کیوں لیا؟ اگر اصل عبارت کو مختصر سی تمہید کے

بعد نقل کیا جائے تو مولوی صاحب کی یہ زبردستی اچھی طرح الم نشرح ہو جائیگی،

جس طرح چار صورتیں مشرکین کے متعلق پہلے معلوم ہو چکی ہیں اسی طرح

یہاں بھی تین صورتیں ذہن نشین کرنا چاہئیں،

ایک یہ کہ بادشاہِ اسلام سے جو لوگ بغاوت کریں اگر ان کے شبہات دفع کرنے میں بھی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں تو ان سے مسلمان بادشاہ کا جہاد ضروری ہے،

دوسری صورت یہ ہے کہ باغیوں کی دو جماعتیں اگر آپس میں لڑیں تو بادشاہ اس میں دخل نہ دے اور ان کو آپس میں نبٹنے دے،

تیسری صورت یہ ہے کہ باغیوں کی لڑائی مشرکین سے ہو رہی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کو مسلمان باغیوں کا ساتھ دینا چاہیے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری اور تیسری صورت کو ماقبل کی چوتھی صورت کے ساتھ متصل بغیر فصل کے ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

ولا ینبغی ان یقاتل احد من اھل العدل احدا من الخوارج مع قوم آخرین من الخوارج اذا کان حکم الخوارج ھو الظاھر لان اباحۃ القتال مع الفئۃ الباغیۃ من المسلمین ان ترجعوا الی امر اللہ ولا یحصل ھذا المقصود بھذا القتال اذا کان حکم الخوارج ھو الظاھر ولا بأس بان یقاتل المسلمون من اھل العدل مع الخوارج المشرکین من اھل الحرب

"اور یہ مناسب نہیں ہے کہ اہلِ عدل میں سے کوئی باغیوں کے کسی گروہ کے ساتھ مل کر باغیوں کے دوسرے گروہ سے لڑے، جبکہ باغیوں کا غلبہ ہو، کیونکہ مسلمان، باغیوں سے لڑنے کا جواز تو اس صورت میں ہے جبکہ خدا کے حکم یعنی اطاعت کی طرف لوٹنے کی امید ہو، اور یہ مطلب تو اس لڑائی سے حاصل نہیں ہوتا، جب کہ باغیوں کا حکم غالب ہو، یہاں تک دوسری صورت ختم ہو گئی، اور اب وہ تیسری صورت شروع ہوتی ہے، اور کوئی حرج نہیں اس میں کہ اہلِ عدل مسلمان باغیوں کے ساتھ مل کر اہلِ حرب

لانهم يقاتلون الامام لا لدفع فتنة
فتنة الكفر واظهار الاسلام
فهذا القتال على الحد المذكور
به وجوبا اعلاء كلمة الله تعالى
بخلاف ما سبق فالقتال هناك
لاظهار ما هو مائل عن طريق
الحق وههنا لاثبات اصل الطريق

مشرکین سے لڑیں، کیونکہ یہ باغی مسلمان
فتنۂ کفر کے دفع اور غلبۂ اسلام کے واسطے
لڑتے ہیں، تو یہ اس نوع کی لڑائی ہے جس کا
امر شارع کی طرف سے ہوا ہے، اور وہ اعلاء
کلمۃ اللہ ہے، بخلاف ماسبق لڑائی کے
(یعنی باغیوں کی باغیوں سے) کیونکہ اس
میں اظہار اور غالب کرنا تھا اس کا (یعنی
بغاوت کا) جو کہ ہٹا ہوا ہے حق راستہ سے) اور یہاں لڑائی اصل طریق کے اثبات
کے لیے ہے۔

اگر مولوی صاحب کے ترجمہ اور ضمیروں کے ظاہر کرنے پر توجہ کی گئی تو حقیقت
اور بھی واضح ہوجائے گی، اور یہ بھی صاف طور پر عیاں ہوجائے گا کہ مولوی ظفر احمد
صاحب نے عبارات میں کتنا توڑ مروڑ کیا ہے،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے طلبگار کو اس سے نفع بخشے، آمین ثم آمین

محمد عبد الحق نافع عفی عنہ

(بَابٌ) [۵]

الاستعانة باهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين

(لا بأس بان يستعين المسلمون باهل الشرك على اهل الشرك اذا كان حكم الاسلام هو الظاهر عليهم) لان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم استعان بيهود بنى قينقاع على بنى قريظة ولان من لم يسلم من اهل مكة كانوا خرجوا مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم ركبانا ومشاةً الى خيبر ينظرون لمن يكون الدبرة فيصيبون من الغنائم حتى خرج ابو سفيان فى اثر العسكر كلما مر بترس ساقط او رمح او متاع من متاع اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم حتى اوقر حملة وخرج صفوان وهو مشرك ومعه امرأة مسلمة ولم يفرق بينهما النبى صلى اللّٰه عليه وآله وسلم حتى شهد مع النبى صلى اللّٰه عليه وآله وسلم حنينا والطائف وهو مشرك وانما لم يفرق بينهما لانهما كانا فى احكام المسلمين والموجب للفرقة تباين الدارين حقيقة وحكما فعرفنا انه لا بأس بالاستعانة بهم وما ذلك الا نظير الاستعانة بالكلاب على قتال المشركين والى ذلك اشار رسول اللّٰه صلى اللّٰه

---

[۵] چونکہ شرح سیر الکبیر کمیاب ہے، اور اس کے اس باب میں سے بعض اقتباسات مختلف مقامات پر دیئے گئے ہیں، اس لیے یہ پورا باب اہل علم کے مطالعہ کے لیے لکھ دینا مناسب سمجھا گیا۔

علیہ وآلہ وسلم بقولہ ان اللہ تعالیٰ لیؤید ھذا الدین باقوام لا خلاق لھم فی الآخرۃ والذی روی ان النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم احد رأی کتیبۃ حسناء قال من ھؤلاء فقیل یہود بنی فلان حلفاء ابن اُبیّ فقال انا لا نستعین بمن لیس علیٰ دیننا،

تاویلہ انھم کانوا اھل منعۃ وکانوا لا یقاتلون تحت رأیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعندنا اذا کانوا بھذہ الصفۃ فانہ یکرہ الاستعانۃ بھم،

واختلف الروایات فی سبب رجوع ابن اُبیّ یوم احد فروی ان النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لما لم یأخذ برایہ حین اشار الیہ بان لا یخرج من المدینۃ غاظہ ذلک فانصرف وقال اطاع الصبیان وخالفنی فیما نصحت لہٗ،

وروی ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ردّہٗ حین عرض علیہ ان یخرج فیقاتل معہٗ فقال لا انا لا نستعین بمشرک وانما کرہ ذلک لانہ کان معہ سبع مائۃٍ من یہود بنی قینقاع من حُلَفَائِہٖ فخشی ان یکونوا علی المسلمین ان احسوا بھم زلۃ قدم فلھذا ردّھم وعندنا اذا رأی امام الصواب فی ان لا یستعین بالمشرکین لخوف الفتنۃ فلہٗ ان یردّھم

ثم ذکر حدیث الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حین کان عند النجاشی فنزل بہ عدوّہٗ فابلیٰ یومئذ مع النجاشی بلاء حسنا فکان للزبیر عند النجاشی بھا منزلۃ حسنۃ، فبظاھر ھذا الحدیث یستدل من یجوز قتال المسلمین مع المشرکین تحت رأیتھم ولکن

تاویل ھٰذا من وجہین (احدھما) ان النجاشی کان مسلماً یومئذ ملجأ غیرہ علی ماروی عن ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت لما اطمأنّا بارض الحبشۃ فکنّا فی خیرجارٍ، عند خیرجار نعبد ربّنا الیٰ ان سار الی النجاشی عدوٌّلہ فما نزل بنا قط امر عظیم منہ قلنا ان ظہر علی النجاشی لم یعرف من حقنا ماکان النجاشی یعرف فاخلصنا الدعاء الیٰ ان یمکن اللہ النجاشی ثم قلنا من رجل یعلم لنا علم القوم فقال الزبیر ابن العوام انا فنفخ قربۃ ثم رکبہا حتی عبر النہر والتقی القوم وحضر الزبیر معہم وجعلنا نخلص الدعاء الیٰ ان طلع الزبیر فی النیل یلیح بثوبہ الا ابشروا فان اللہ تعالیٰ قد اظہر النجاشی ومکن لہ فی الارض واھلک عدوہ قالت فاقمنا عند خیرجار فبھذا الحدیث تبین صحۃ التاویل الذی قلنا، واللہ اعلم۔

(دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

(۳)

افکار و افادات مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

پر

تنقید و تبصرہ کی ایک نظر

اہلِ قلم

مسیح انصاری ٹیا برجی

خواجہ عبدالوحید

مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

فہرست

حرفے چند

اس رسالے میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی دو تحریریں زیر نظر آئی ہیں، پہلی تحریر حضرت علامہ کے ایک بیان پر نقد ہے، یہ نقد اولاً مدینہ بجنور میں چھپا تھا، اور ٹھیک انہی ایام میں ۲۳ر نومبر اور ۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو زمزم لاہور کی دو اشاعتوں میں نکلا تھا۔
دوسری تحریر ایم سعید الدین بہاری کے نام حضرت علامہ کے ایک مکتوب گرامی کے مطالب پر تبصرہ ہے، یہ تبصرہ بھی زمزم لاہور میں ۲۳ر دسمبر اور ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا تھا،

دونوں تحریروں میں فاضل و ناقد و مبصر جناب مسیح انصاری مٹیا برجی نے نقد و نظر میں کوئی تکلف نہ برتنے اور حقائق کے واضح اظہار کے باوجود حضرت علامہ کے علمی مرتبے اور شخصی احترام کا پورا احترام رکھا ہے، اور یہ ناقد کی حقیقت پسندی کے ساتھ اس تبصرے اور تنقید کی بڑی خوبی ہے، ان تحریروں پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، قارئین کرام ان کے مطالعہ سے مصنف کی حقیقت پسندی اور شریفانہ اندازِ بیان کے متعلق نیز حضرت علامہ مرحوم کے افکار کی منطق اور استدلالات کے بارے میں خود اندازہ کر لیں گے،
دونوں تحریریں پیش خدمت ہیں،

ابو سلمان شاہجہانپوری

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا بیان

ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ

از جناب مسیح انصاری مٹیا برجی

چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم ؛ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

"جمعیۃ علمائے اسلام" کے نام سے جو کانفرنس گذشتہ ماہ کلکتہ میں بعض خاص مصالح کی بناء پر بلائی گئی تھی اس میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا نام گرامی گویا اس خیل کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے، اور حضرت علامہ عثمانی کا بیان بھی دیگر علماء کے خطبات کے بیش نظر گلِ سرسبد کا درجہ رکھتا ہے، بہر حال: علامہ عثمانی کی قلبی نیت اس بیان سے کیا تھی؟ اسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، تاہم اس جمعیۃ علماء اسلام کی شرکت کے بارے میں جو بیان خود علامہ عثمانی نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

> "ہم سب کو معلوم ہے کہ قدیم جمعیۃ علمائے ہند بھی اپنی شائع کردہ مقاصد کے لحاظ سے کچھ بری نہ تھی، وہ اپنی خدمات اور قربانیوں کے اعتبار سے اچھی خاصی تاریخ رکھتی ہے، جو کچھ اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ اس کے اخیر کے چند سالہ طرزِ عمل پر ہیں —— اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ جدید "جمعیۃ علمائے اسلام" عملی لحاظ سے تجربہ کی کسوٹی پر کتنی کھری ثابت ہوتی ہے؟"

(روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ ؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اس بیان میں نہایت ہی واضح طور پر علامہ عثمانی نے "جمعیۃ العلماء ہند" کی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف فرمایا ہے، اور خود نہیں بلکہ دوسروں کے اعتراض کا تذکرہ اجمالاً کر دیا ہے، اگر حضرت علامہ عثمانی کو خود اعتراض ہوتا تو ضرور ببانگِ دہل یہ اعلان فرماتے کہ:

"یہ یہ عمل "جمعیۃ العلماء ہند" کے مقاصد کے لحاظ سے غلط ہیں، اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاداتِ عالیہ کے صریح منافی ہیں"

مگر ظاہر ہے بیان میں کہیں بھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے، اور یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضرت علامہ عثمانی تشریف لاتے تو شاید اپنے اس بیان کی تردید بھی فرما دیتے، خصوصاً مولوی آزاد سبحانی کے "آزاد بیان" کے ان الفاظ پر کہ:

(۱) "سنا ہے کہ دلی کی ایک گلی میں جمعیۃ علماءِ ہند موجود ہے، اور اس کی ایک جھلک دیوبند میں بھی ہے، گویا دو کوٹھریوں میں جمعیۃ علماء ہند بند ہے"

(۲) "جمعیۃ العلماء دہلی" ایک دیوالیہ مہاجن کی طرح مضمحل ہو چکی تھی، جب سے لیگ نے سر نکالا اور جب سے جمعیۃ العلماء اسلام نے اس سے ٹکر لی تو اس کا اتنا زیادہ دیوالہ نکل گیا کہ معمولی آدمی بھی فقرے کسنے کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈھتے ہیں"

(۳) "میرے نطفہ سے "جمعیۃ العلماء ہند" کی پیدائش ہوئی تھی... علی برادران مخالف تھے، لیکن بعد میں جھک گئے، میں دس برس تک اسے چلاتا رہا، مولوی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید کو

تجویز مرتب کرنی سکھائیں"!

(۴) "اور جمعیۃ العلماء کے تصور پر لعنتیں بھیج دیں، اور اعلان کر دیں کہ علماء دجال بن چکے ہیں"!

(روزانہ "عصر جدید" کلکتہ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اس آزاد بیان کا یہ اثر ہوا کہ وہ سادہ لوح اور مخلص علماء جو صرف اسلام کی سربلندی کے لیے بڑی بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ شریک ہوئے تھے... "انا للہ وانا الیہ راجعون" اور "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ــــ کہہ کر چلے گئے، کاش! حضرت علامہ عثمانی بھی اس کانفرنس میں شریک ہوتے، اور آزاد سبحانی کی اس شیریں سخنی کو سن کر تجربہ کی کسوٹی پر کستے! تو کیا رائے قائم فرماتے؟ ــــ اور شاید اس حقیقت کے انکشاف کے بعد تو اور ہی کچھ رنگ ہوتا کہ فضلِ خدا سے آزاد سبحانی صاحب ہی اس "جمعیۃ العلماء اسلام" کے بانی ہیں، اللہ اللہ!! ــــ یہ تو تنابزوا بالالقاب کی گویا ایک مثال تھی، ورنہ اس کانفرنس میں شریک ہونے والے اکثر علمائے کرام نے اس قسم کی مہذب اور شائستہ تقریریں فرمائی ہیں: (عصر جدید کے پرچے اس کے شاہد ہیں) ــــ کیا میں حضرت علامہ عثمانی سے دریافت کر سکتا ہوں کہ "قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح راستہ یہی ہے؟ اور کیا اللہ کے راستے میں حکمت اور موعظتِ حسنہ میں سموئی ہوئی دعوتِ حقہ کے انمول جواہر پارے یا شاہکار یہی ہیں؟ ــــ فرمائیے اور انصاف سے فرمائیے انصاف پسند اور حق پرست علماء کیونکر اس قسم کی اخلاق سوز جماعت کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں؟ خیر! یہ تو ابتدائے عشق ہے،

اساسِ اختلاف:

اس کے بعد ہندوستان کی سیاسی کش مکش کے بارے میں حضرت

علامہ عثمانی کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ تنفر بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت کا صاف انکار کر دیا جائے"۔

(روزنامہ عصرِ جدید، کلکتہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

غالباً "متحدہ قومیت" کے اختلاف ہی نے علامہ عثمانی کو دانستہ یا نادانستہ طور پر مجبور کر دیا کہ اس قسم کا پُرشکوہ، پُرہیبت اور مبالغہ آمیز دعویٰ کر دیا جس کی پشت پر صحیح دلائل کی کمک نہ ہو، چنانچہ اس دعویٰ کے بعد ہی جب دلیل کی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا گیا ہے تو بایں انداز خاص کہ:

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط یا صحیح طور پر دنیا میں اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرزِ تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دنیا کی جو تعمیر جدید ہوئی اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیشِ نظر اللہ کے پیدا کیے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبار قومیت کے ایسی ثنائی تقسیم کر دی گئی جس کے احاطہ سے کوئی فرد بشر باہر نہ رہ سکے"۔

(روزنامہ عصر جدید، کلکتہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

ماشاء اللہ! "قومیت" اقرار و انکار کا یہ عجیب گنگا جمنی بیان ہے، مذکور الصدر دعویٰ کی اگر یہی دلیل ہے تو مجھے ذرا بیباکی سے عرض کرنے دیجیے کہ جس آیت کریمہ سے آپ نے زبردستی "کافر و مؤمن" کا دو قوم ہونا ثابت

فرمایا ہے وہ سراسر تفسیر بالرائے ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو خدارا ان مفسرین کے نام بتائیے جنھوں نے اس قسم کا کوئی نظریہ لکھا ہے، ـــــ میں یہ جرأت گستاخانہ صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ نہایت ہی واضح الفاظ میں قرآن کریم ناطق ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا الآیہ (۱۹: ۲۰)

کاش! قرآن کریم کی یہ آیت پیش نظر رہتی تو شاید ایسا زبردست تسامح نہ ہوتا ـــــ اسی طرح صحیح مسلم والی حدیث کا حال ہے، شاید احادیث کے بحر ذخار میں حضرت علامہ عثمانی کو اپنا مفہوم ثابت کرنے میں اس حدیث سے زیادہ واضح اور کوئی حدیث نہیں ملی، ورنہ اسے بھی ضرور اس مفروضہ "اسلامی قومیت" کے ثبوت میں ارقام فرما دیتے ـــــ بہرحال! حقیقت حال سے خود علامہ عثمانی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ سوائے چند احادیث کے تمام کی تمام بالمعنی روایت کی گئی ہیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اور جملہ فرمایا ہو، مگر راوی نے اپنی فہم و فراست سے یہاں اس کو چسپاں کر دیا ہو؟ ـــــ کیونکہ اگر بالفرض اسے صحیح تسلیم کر کے "اسلامی قومیت" کی بنیاد ڈال دی جائے گی تو یہ ارشاد گرامی جو "کفر و اسلام" کے دوسرے معرکہ کے موقع پر ـــــ میدانِ اُحد ـــــ میں فرمایا گیا تھا ـــــ اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ـــــ کی کیا تاویل فرمائی جائے گی؟ اس پر تو یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعائیہ اُرشادِ گرامی "باللفظ" ہم تک نہیں پہنچا ہے، اب فرمائیے آپ "قومیت ثنائی" کی تقسیم تسلیم کی جائے؟ یا "اُحد" کے میدان میں گونجی ہوئی "دعائے مبارک" ـــــ "خدایا! میری قوم کو ہدایت بخش کہ یہ لاعلم ہے"۔

دیکھیے! "کافروں" کو اپنی قوم کہنے اور ماننے کا کتنا صاف اور واضح اعلان

ہے ـــــ اور اس وقت کا اعلان ہے جبکہ کفارِ مکہ جارحانہ اقدام کر چکے تھے،
نبرد آزما ہو چکے تھے، اور بہت سے مسلمان جامِ شہادت بھی نوش کر چکے تھے،
حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اسلام کے سپہ سالارِ اعظم، سید الشہداء
حضرت امیر حمزہؓ بھی شہید کیے جا چکے تھے، ـــــ ایسے نازک وقت میں
"رحمۃ للعالمین" نے ان "کافروں" کو "اپنی ہی قوم" فرمایا تھا ـــــ مگر
وائے افسوس بر حالِ ما، آج تیرہ صدی کے بعد اور دو صد سالہ غلامی میں ہم اپنے آپ
کو اس قدر فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ہندوستان کے اس ہندو سے جس نے ابتک
اسلام تو کجا ـــــ مسلمانوں کو ختم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کیا ہے اور نہ کبھی کر سکتا ہے
بلکہ دوستانہ طریقہ سے صرف "آزادیٔ ملک" کے لیے دعوتِ اتحاد دے رہا ہے،
اور اتحاد بھی صرف "سیاسی اتحاد" ـــــ مگر ہم ہیں کہ اس سے "مسلمان"
رہتے ہوئے بھی انسانی ہمدردی و رواداری برتنے اور صرف "ہم سب ایک قوم ہیں"
کہدینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں، اے جزاک اللہ! ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

○ یہود سے معاہدہ؛

اور ہاں! وہ یہودِ مدینہ کے معاہدہ کا ذکر کرکے تو خود آپ نے اپنی "اسلامی
قومیت" کے بلند و بالا مینارہ کو ڈھا ڈالا ہے ـــــ انصاف فرمائیے گا
"امۃ واحدہ" کا لفظ کیا معنی رکھتا ہے؟ ـــــ شُدبُد عربی داں بلکہ اردو خواں
بھی یہ ضرور جانتا ہوگا کہ "امت" کے معنی "دینی گروہ" کے ہیں ـــــ ظاہر
ہے کہ یہود مذہبًا "اسلام" کے پیرو نہ تھے، پھر بھی "امتِ واحدہ" کا لفظ معاہدہ
میں استعمال کیا گیا، اگر بقول آپ کے "ثنائی قومیت" ہی صحیح ہوتی تو یہاں بھی "یہود
اور مسلمان" کو "ایک گروہ" کی جگہ "دو قوم" کہا جاتا ـــــ مگر حیف ایسا نہیں

کیا گیا، اور "امت واحدہ" کے استعمال سے "وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا الآیہ" کی عملی تشریح، توضیح اور تصدیق فرمائی گئی ہے، فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ!

اب رہ گئی اس "معاہدہ" کی یہ اہم دفعہ کہ:

"اگر کسی معاملہ میں فریقین کے مابین نزاع ہوگا تو آخری فیصلہ وہ ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادر فرمائیں گے"

(روزنامہ عصرِ جدید، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

حضرت علامہ عثمانی نے اسی ایک دفعہ کے نہ ملنے کا عذر پیش فرماتے ہوئے گویا "مصالحت یا معاہدہ" سے معذوری ثابت فرمائی ہے مگر دیکھیے تو سہی اگر "ہندو" صرف ایک دفعہ کا انکار کر رہا ہے تو آپ کونسی تمام دفعات پر عمل فرمانے کے لیے تیار و مستعد ہیں؟ —— افسوس! "ہندو" تو زائد سے زائد صرف ایک ہی دفعہ کا منکر ہوگا، اور آپ تو خدا رکھے اپنی بے عملی سے غالباً ۹۰ یا ۱۲ تمام ہی دفعات کے "منکر" بنے بیٹھے ہیں، اور نہ صرف منکر بنے بیٹھے ہیں بلکہ "اعلان" فرما کر "سادہ لوح مسلمانوں" کو بے عمل بنا کر آزادی کی راہ میں سنگِ گراں حائل کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں —— اور "قومیتِ ثنائی" کا عجیب و غریب نظریہ پیش فرما کر مسلمانوں کو "مذہبی غرور و تنگ نظری" کی دعوت دے رہے ہیں،

کیا اسلام میں اس قسم کی کبر و نخوت کی گنجائش ہے؟ کیا یہ طرزِ عمل "عصبیہ جاہلیہ" کے مرادف نہیں؟ —— ہے، اور ضرور ہے، تو خدارا صرف "ہندو دشمنی" میں اس قسم کی معصیت کی تبلیغ تو نہ فرمائیے، اور اسلام کی دعوتِ وحدت و اخوتِ انسانی کو نہ بھولیے —— کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

پنجگانہ دعاؤں میں سے زید بن ارقمؓ کی روایت کردہ یہ دعا، بھول گئے؟ کہ

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ، اَنَا شَھِیْدٌ اِنَّکَ الرَّبُّ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اَنَا شَھِیْدٌ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اَنَا شَھِیْدٌ اَنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَۃٌ (امام محمدؒ، ابوداؤد)

ترجمہ: "خدایا: ہمارا اور سارا کائنات ہستی کا پروردگار ہے، میں گواہ ہوں کہ صرف تو ہی پروردگارِ عالم ہے، تیرے سوا کوئی نہیں، خدایا ہماری اور ساری کائناتِ ہستی کا پروردگار، میں گواہ ہوں کہ محمدؐ اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں، خدایا! ہمارا اور ساری کائناتِ ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ تیرے سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

ملاحظہ فرمائیے! داعیِ اسلام نے تو "العباد کلھم اخوۃ" کی شہادت کا اعلان فرما کر "وحدت و اخوت انسانی" کے لیے روزانہ دعائیں مانگی ہیں، اور آپ ہیں کہ "قومیتِ ثنائی" کا راگ الاپ رہے ہیں، ظفر علی خاں نے خوب فرمایا ہے ؎

رہنما گم کردہ رہ ہیں ورنہ رہرو جانتے ہیں
آج بھی جبرالٹر جیسی ہزاروں کھائیاں

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ اس وحدت و اخوتِ انسانی میں "وطنیت" بھی تو باقی نہیں رہتی ــــــ بلاشبہ اعتراض صحیح ہے، زمانۂ جاہلیت یا موجودہ "مہذب دور" کی غارتگر اور انسانیت سوز "وطنیت" جس کی بنا عصبیہ جاہلیہ پر ہو اسلام میں معصیت ہے، ــــــ "اُمتِ واحدہ" ــــــ "الارض للّٰہ" ــــــ اور "الحکم للّٰہ" کے منافی ہے ــــــ اگر اسلام میں وطنیت ہے تو محض باہم گر

پہچان (لتعارفوا) کے لیے اور بس ـــــــ جب داعیِ "وحدۃ و اخوۃِ انسانی" ہی کا یہ اعلان ہے کہ "تمام انسان بھائی بھائی ہیں" تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے ہمسایہ اور صدیوں سے بھائی کی طرح ملتے ہوئے "ہندو" کو آج اپنا بھائی ماننے سے انکار کر دیں؟ اور براعظم یورپ کے رہنے والے دوسرے بھائی (انگریز) کے ہمدرد بن کر اس کو ظلم و عدوان اور خدا کی نافرمانی و بغاوت پر تیز سے تیز تر کرتے رہیں؟ کیا یہی انصاف ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی پر حکومت کرے؟ اور اللہ کی بنائی ہوئی زمین کو اس پر تنگ کر دے؟ اور خدا کی بخشی ہوئی دیگر تمام نعمتوں کو اپنے قبضہ میں کر کے بھاری گمراہی میں مبتلا ہو جائے کہ "بس ہم ہیں دنیا میں حکومت کرنے کے لائق" ـــــــ اگر آج بر و بحر میں پھیلے ہوئے اس فساد کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو غلط کوشوں اور غلط فہموں کی ایک بھیڑ پکار اٹھتی ہے کہ: "یہ تو بے دینی ہے، گمرہی ہے، ضلالت ہے۔" ہائے ے

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[1]

اسلام اور وطنیت:

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ "اسلام" میں بھی "وطنیت" کی گنجائش ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو "مکہ" کے مسلمانوں کو "مہاجر" اور "مدینہ" کے مسلمانوں کو "انصار" کے القاب

---

[1] مضمون کی پہلی قسط اس مقام پر ختم ہو جاتی ہے، جو "زمزم" لاہور میں ۲۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو چھپی تھی، اس سے آگے دوسری قسط شروع ہوتی ہے۔

نہ رہ جاتی ـــــ اے کاش! "اسلامی وطنیت" کے مخالف دیکھیں کہ "اسلام" میں جو "وطنیت" ہے وہ محض "تحفظ اور مدافعت" کے لیے ہے، اور اسی "وطنیت" کے "وطن پرور مسلمان" حامی ہیں اور حامی رہیں گے!

اس کے بعد علامہ عثمانی کے بیان کا وہ پُرجلال منظر سامنے آجاتا ہے کہ

"بہرحال ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں، اس قوم کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لیے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی مستقل مرکز ہو، جہاں سے اس کے قومی محرکات اور عزائم فروغ پاسکیں، اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کرسکے، بلکہ اس بے مثال قانونِ عدل وحکمت کا کوئی عملی نمونہ قائم کرکے دنیا کو وہ مشعلِ ہدایت دکھاسکے جس کی آج ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔"

(روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

حضرت علامہ عثمانی نے "مستقل قوم" والے نظریہ کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس کو "آزادی خواہ" یا "وطن پرور مسلمان" اپنا ایمان نہ گردانتا ہو، باور نہ ہو تو "اجلاس لاہور" اور "سہارنپور" کے خطبات ملاحظہ فرمالیں!

اس کے فوراً بعد ہی حضرت علامہ عثمانی نے کمزوریوں اور مایوسیوں میں سمویا ہوا یہ الم انگیز اور افسوسناک ارشاد فرمادیا ہے کہ۔۔

"اس نصب العین کا جتنا حصہ، جس حد تک ہماری قدرت میں آسکے اور آتا جائے اس سے تغافل برتنا نہیں چاہیے۔"

(روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

دیکھا آپ نے بیان کی ہماہمی اور شوراشوری یک لخت بے نمکی میں تبدیل ہوگئی،

اور "اسلام" کے نام پر کڑکنے اور گرجنے والا "مجاہد" یک بیک اپنی "قدرت" کے پر تولنے لگا، یکایک اتنی بھاری تبدیلی کیوں آئی؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے، نہیں نہیں، بلکہ بیان کے اس حصہ میں احساسِ کمزوری کا سبب خود بخود صاف اُبھر آتا ہے کہ

"بہ حالاتِ موجودہ جو اصولِ سیاست دنیا میں رائج ہیں ان کے ماتحت ہم صرف ان صوبوں میں اس مقصد کی کوئی قسط حاصل کر سکتے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔"

(روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اللہ اللہ! ابھی تک تو ہر امر کو "اسلام" کی کسوٹی پر کس کر کھرے کھوٹے ہونے کا فیصلہ صادر کیا جا رہا تھا، اور کہاں اب "دنیا میں رائج شدہ سیاست" کا غیر شرعی سہارا لے کر بے پناہ تاویلیں کی جانے لگیں؟ ؏

ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

کیا میں بکمال ادب دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ "رائج شدہ سیاست" ہے کیا بلا؟ کیا خدانخواستہ "اسلامی سیاست" اس کا دور کا بھی رشتہ ہے؟ —— حضرت مجھے کہنے دیجیے یہ تو وہی سیاست ہے جس کی انگیخت پر "چرچِ اعظم" کی وحشت و بربریت نمودار ہوئی تھی! —— جس کی ریشہ دوانیوں سے "سلطنت" تیموریہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی! —— جس کی شہ پر حضرت "مجاہدِ حریت" سلطان ٹیپو شہیدؒ کو مکر و دجل سے ختم کیا گیا تھا! —— جس کے ایماء سے "سلطنتِ عثمانیہ" کے حصے بخرے کر دیئے گئے تھے! —— جس کے اشارۂ ابرو پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاءِ کارؒ اور متبعینؒ کی جماعت کو نیست و نابود اور ان کے "مراکز" کو ڈھا کر میونسپلٹی اور بازار قائم کیے گئے تھے! —— اور جس کے اشاروں سے "مقاماتِ مقدسہ" پر انسانیت سوز حرکات کی گئیں، اور اب تک کی جا رہی

ہیں! ــــــ "مسلمانوں" کی "اقلیت و اکثریت" کا رونا، تو آپ جیسے جلیل القدر اور متبحر عالم کے شایانِ شان نہ تھا، ہاں! مسٹر جینا ہی اس قسم کے بیان کے لیے مناسب و موزوں تھے، اور ہیں، کیونکہ وہ بیچارے "اسلام" اور "اسلام کی طاقت" کو کیا جانیں؟

غالباً اسی قماش کے مسلمانوں کے لیے علامہ اقبال مرحوم فرما گئے ہیں ؎

"فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہین بخشا ✽ جس میں رکھدی ہے "غلامی" نے نگاہِ خفاش"

کیا حضرت علامہ عثمانی "کتاب و سنت" سے "مسلمانوں" کی "قلت و کثرت" کے حیلے کا جواز ثابت فرما سکتے ہیں؟ مگر آہ! یہ کہاں! وہاں تو ؏

"تو مسلمان ہو تو قلت میں ہے کثرت تیری" (اقبالؒ)

کے نہ جھٹلائے جانے والے احکام و نصوص جگمگاتے نظر آئیں گے! ــــــ اس کے بعد ہی پاکستان کی حمایت و تائید میں جو "عارفانہ رمز" ظاہر فرمایا گیا ہے، واقعی بہت خوب ہے کہ:-

"یہ بھی اللہ کی عجیب قدرت و حکمت کی نشانی ہے کہ باوجودیکہ مسلمان اس ملک میں مجموعی طور پر دوسری اقوام سے تعداد میں کم ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری اس کمی کو ملک کے تمام صوبوں میں مساوی نسبت پر تقسیم نہیں کیا، بلکہ بعض صوبوں میں جو جغرافیائی حیثیت سے اہم بھی ہیں ہم کو دوسروں کے مقابلے میں اکثریت عطاء فرمادی ــــــ یہ گویا قدرت کی طرف سے "پاکستان" قائم کرلینے کے امکان کی طرف ایک غیبی اشارہ ہے" (روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

یہاں بھی علامہ عثمانی نے عارفانہ لب و لہجہ میں صرف اپنی "خطابت" ہی سے کام لیا ہے، "قرآن و سنت" کے مشعل کی ایک مدھم سی شعاع بھی نظر نہ آئی، محض "قدرت کا غیبی اشارہ" ہی کافی سمجھا گیا! ــــــ اے کاش! "قومیت ثنائی" کے پُرزور اعلان

کی طرح یہ بھی فرمادیتے کہ "یہ پاکستان اور اس کا نظامِ حکومت سراسر "قرآن و سنت" کی روشنی میں مرتب ہوگا!" ـــــ تو ممکن ہی نہیں، بلکہ یقین اور حق الیقین تھا کہ "انصاف پسند اور حق پرست علماء" ـــــ اور "مسلمان" جوق در جوق آپ کی آواز پر "لبیک" کہتے، مگر افسوس! آپ کا بیان اس "روحِ اسلامی" سے خالی ہے! ـــــ اب حضرت علامہ عثمانی کا وہ "المیہ بیان" آرہا ہے جو "پاکستان" کی ترہیب و ترغیب۔۔۔ کہ جذبات سے مملو اور "غلامی" پر قانع رہنے کا مؤید ہے، ارشاد ہوتا ہے:

> "اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا، اور یہاں کی اکثریت نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی تنگ نظری، تعصب اور تاریک ترین پست خیالی نہ چھوڑی تو ملک کے لیے آزادیٔ کامل کی توقع رکھنا، اپنے نفس کو فریب دینا ہے، جذباتی لوگ جو چاہیں کہتے رہیں حقیقت پسند جانتے ہیں ایسی صورت میں، ایسی امیدیں باندھنا شیخ چلّی کے منصوبوں سے کم نہیں، الحاصل آج مسلم قوم سے یہ توقع ہرگز نہ رکھیے کہ وہ انگریزی سنگل اور اضطراری غلامی کے مقابلے میں انگریز اور ہندو کی ڈبل اور اختیاری غلامی کو ترجیح دے گی"
>
> (روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اس بیان کا یہی مطلب ہے نا کہ . اگر "ہندو" "سیاست رائجہ" کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" والی تعلیم سے متاثر ہو کر اپنی "تنگ نظری، تعصب اور تاریک ترین پست خیالی" کو نہیں چھوڑتا ـــــ تو جاؤ! ہم بھی "خیر امت" "امت وسطیٰ" ہونے اور "قرآن و سنت" کے نصوص و احکام کی خلاف ورزی کے باوجود بھی "انگریز کی سنگل اور اضطراری غلامی" پر خوش ہیں، ـــــ سبحان اللہ! کیا پیاری "سنگل اور اضطراری غلامی" ہے، قبلہ ام! آنکھیں کھولیے اور دنیا دیکھیے: اسی آپ کی "سنگل اور اضطراری غلامی" ہی کی بدولت

گزشتہ جنگِ عظیم" میں "جزیرۃ العرب" پر نصاریٰ" قابض ہوئے، اور حالیہ "جنگِ عظیم" کے بعد یہود کے لیے "وطن یہود" بھی بنایا جا رہا ہے! اور آپ ہیں کہ "مسلمانوں" کو غلامی پر صابر و شاکر رہنے کا وعظ فرما رہے ہیں، اور "اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب" جیسے مہتم بالشان فرمان کو بھلا بیٹھے ہیں، غالبًا ایسے ہی موقع کے لیے اقبال مرحوم فرما گئے ہیں ؎

شاعر بھی ہیں پیدا، علماء حکماء بھی!
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ!
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو!
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

لیگ اور قائدِ اعظم؛

پھر "مسلم لیگ" اور "قائدِ اعظم" پر یوں گہر افشانی فرمائی گئی ہے:

"بلاشبہ مسلم لیگ اور اس کے قائد میں انسانی کمزوریاں ہیں، اور ان کی بہت سی باتیں ہمارے علماء کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ عوام کو تیار کیا جائے، اور اچھے اچھے پختہ کار علماء و زعماء عوام کی طاقت سے ان کو مجبور کر دیں، کہ وہ امانت داری سے اپنے کو اس منصب کا اہل ثابت کریں، جو جمہور کی طرف سے ان کو تفویض ہوا ہے، جہاں تک میں اپنی بساط کے موافق اندازہ کر سکا ہوں مجھے یقین ہے کہ مسٹر جینا آجکل

کی سیاست کے داؤ پیچ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ واقف ہیں"

(روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ را کتوبر ۱۹۴۵ء)

حضرت! سوال "قائدِ اعظم" کی انسانی کمزوری پر نہیں، بلکہ ان کی "شرعی کمزوری" پر ہے جسے شاید آپ تسلیم نہیں کرتے، جبھی تو خود نہیں بلکہ "ہمارے علماء کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں،" کا ارشاد ہو رہا ہے، ضرورت تھی اور ہے کہ بیباکی اور جرأت سے خود آپ فرمائیں کہ "مسٹر جینا کی قیادت شرعی ہے یا غیر شرعی؟ اور انھیں اپنی روش بدلنی چاہیے یا نہیں؟" ـــــ وہ وقت تو ابھی دور ہے جب "اچھے اچھے پختہ کار علماء، و زعماء" اپنا مستحسن اور خوش آئند اقدام فرمائیں گے، کیونکہ جب آپ ہی جیسا "مردِ مجاہد" اور حضرت شیخ الہند کا جانشیں ہی مسٹر جینا کی "غیر شرعی زندگی" کو بدلنے کے حکم کی جگہ ان کی تعریفیں کرنے لگا تو دوسرے بیچارے "پختہ کار علماء، وزعماء" کیا کرلیں گے؟ ؎

اپنے اشتر کو یہ کہاں لے جائے گا سوئے حجاز!

مست ہی خود بینڈ کی گت پر حُدی خواں ان دنوں

رہی "آجکل کی سیاست آگہی" تو یہ کوئی "قرآن و سنت" کا حکم تو نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا جائے؟ ـــــ "سیاستِ حاضرہ" کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جینا ہی طرح ایک بیرسٹر کی شہادت پیش کر دوں، جو صرف بیرسٹر ہی نہیں بلکہ "کیمبرج" کے "فلاسفر" بھی تھے، اور مسٹر جینا سے کہیں زیادہ "اسلام آگاہ" بھی، جنھیں لوگ "ترجمانِ حقیقت" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، بہرحال! شہادت ملاحظہ ہو: ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ

مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے

بنائے خاک سے اُس نے دو صد ہزار ابلیس

(اقبالؒ)

اس شہادت کے بعد بھی اگر "آجکل کی سیاست کے داؤ پیچ سے آگاہی" کو معیارِ قیادت قرار دیدیا جائے گا؟ تو پھر فارسی کا یہ شعر دُہرانا پڑے گا: ؎

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما
رُو بسُوئے خانۂ خمار دارد پیرِ ما

اب آیئے علامہ عثمانی کے ایک دردناک "ارشاد" کو پڑھیے کہ

"میں زمانہ دراز تک ان مسائل کے اطراف و جوانب پر غور کرتا رہا، فیما بینی و بین اللہ سب اچھے برے پہلوؤں پر نظر کرکے آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس وقت مسلمانوں کو حصولِ پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں حدودِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ حصّہ لینا چاہیے"۔

(روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ راکتوبر ۱۹۴۵ء)

اس دردناک لب و لہجہ میں حضرت علامہ عثمانی اقرار فرمالیا ہے کہ میرے اس بیان کی غرض و غایت کیا ہے؟ صرف "حصولِ پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت"! تو صرف اتنی سی بات کے لیے بیکار اس قدر زحمت فرمائی، اور "کتاب و سنت" کے احکام کی بے پناہ تاویلیں کیں! ____ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو بھی مسلم امراء و رؤساء، نواب، راجہ، مہاراجہ، سر، خان بہادر، نوکر شاہی عملہ اور ان سب کے خوارین و طفیلی "مسلم لیگ" ہی کی حمایت کرتے، کیونکہ ان سب کے مفاد اس "سرمایہ دارانہ نظام" سے وابستہ ہیں اور بس!

____ ہاں، رہا آپ کا یہ گمان کہ :-

"اگر مسلم لیگ اس وقت ناکامیاب ہوگئی تو شاید پھر مدت دراز تک اس ملک میں پنپنے کا موقع نہ ملے گا"۔

(روزانہ "عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ راکتوبر ۱۹۴۵ء)

حضرت والا! اس "الیکشن" کی کامیابی اور ناکامیابی، .... کوئی "تاتاری حملہ"

تو نہیں ہے جو آپ اس درجہ خائف نظر آ رہے ہیں؟ ــــــ خدا کو نہ بھولیے، جب اس نے قیامت نما "تاتاری حملہ" کے بعد بھی "مسلمانوں" کو نہ صرف زندہ بلکہ سرفراز و سربلند رکھا تو کیا وہ اب ختم ہونے دے گا؟ ــــــ دور کیوں جائیے، اسی "ہندوستان" میں دیکھیے، ۱۸۵۷ء کی "جنگِ آزادی" کے بعد کیا کیا نہ مظالم اور ستم کے پہاڑ توڑے گئے، مگر پھر بھی "مسلمان" زندہ رہا، اور رہے، تو پھر ہماری ہی طرح "غلام" "ہندو" کی کیا بساط ہے کہ "انگریز" کے جاتے ہی وہ ہمیں ختم کر دے گا، غلام بنا لے گا وغیرہ وغیرہ! ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، میرا تو عقیدہ ہے کہ ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

آزادی اور مسلمان!

اس کے بعد علامہ عثمانی نے "مسلم لیگ" پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات کا سلسلہ شروع فرمایا ہے، اور گزشتہ "ارشادات" یا غلامی نواز و غلامی ساز حربوں کی طرح "خمخانۂ لیگ" میں یہ مسکن و مخدّر جرعہ بھی بڑھا دیا ہے کہ

> "کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان آزادی کے طلبگار نہ ہوں؟ چنانچہ کانگریس کی طرح مسلم لیگ بھی آزادیِ کامل کو اپنا نصب العین رکھتی ہے، لیکن کچھ تو پہلے سے اور زیادہ تر "شملہ کانفرنس" کے بعد مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ ہندو کانگریسیوں کا مقصد ہی کچھ اور ہے۔ ان کی اکثریت میں ہم مدغم ہو کر آزادیِ کامل تو کیا حاصل کرتے اپنی قومی ہستی ہی کو فنا کر بیٹھیں گے۔" (روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

بلاشبہ "ہندوستان" کا "مسلمان" آزادی کا طلبگار رہا ہے، جبھی تو "کانگریس" کے ماننے سے بہت پہلے "جمعیۃ العلماء ہند" آزادیِ کامل اپنا نصب العین تسلیم کر کے میدان

میدان میں گامزن ہو چکی تھی، جس سے خود آپ بھی واقف ہیں! —— سوال ہے "مسلم لیگ" کے نام پر جمع ہونے والی بھیڑ کا کہ اس نے "کانگریس" کے سالہا سال بعد "آزادیِ کامل" کا نصب العین صرف مانا، پھر کیا گیا؟ اس سے "بہتر اور عمدہ" ایک دوسرا "نصب العین" (پاکستان) تیار کر لیا، اور اسی کی دوادوش جاری وساری ہے حتیٰ کہ خود آپ نے بھی اس کی دعوت دی ہے! —— اور "شملہ کانفرنس" کے بعد "آزادی خواہ مسلمانوں" نے تو نہیں، ہاں "لیگی مسلمانوں" ہی نے اپنی "قومی ہستی" کے فنا ہونے والے مزعومہ وموہومہ خوف کی وجہ سے "آزادیِ کامل" سے نارضامندی ظاہر کر دی ہے! ورنہ دنیا جانتی ہے کہ بڑے بڑے لائق وفائق "علماءِ حق" اور "اسلام" کا دل سے درد رکھنے والے "مسلمانوں" نے حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہی کو اپنا "نمائندہ" اور "معتمد علیہ" مانا، اور اعلان بھی کر دیا تھا، تو پھر کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کا "ارشاد" صحیح ہے؟ جبکہ "راسخون فی العلم" کی جماعت نے "کتاب وسنت" کی صحیح روشنی میں یہ اعلان کیا ہو! یہاں پہنچ کر "سوادِ اعظم"، "جمہور" اور "اجماعِ امت" وغیرہ قسم کے الفاظ سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوئیے! دیکھیے! صدرِ اول میں جب یزید جیسے فاسق وفاجر کی حمایت پر پورا "سوادِ اعظم" "جمہور" اور "اجماعِ امت" امنڈ پڑا تھا، تو وہ صرف ایک حسین بن علیؓ ہی تھے جنھوں نے "آوازۂ حق" بلند کیا، اور کارزارِ کربلا میں "سوادِ اعظم" جمہور اور اجماعِ امت" کی اس سنگین غلطی، ناقابلِ عفو جرم اور مذموم "بدعت" کو ختم کرنے کے لیے اپنے آخری قطرۂ خون تک سے بھی باک نہیں کیا تھا! انظر فتدبر،

آخر میں علامہ عثمانی نے "استعانت بالکفار" پر فقہی موشگافیاں فرمائی ہیں، اور بے حد قیل وقال کے بعد بالآخر "حالتِ اضطرار کا استثناء فرمایا ہے"! ——

چلیے! فیصلہ ہو گیا، "کتاب وسنت" کی کسوٹی پر کسے ہوئے متدین، ثقہ اور جمہور علماء وقت کا یہی فتویٰ ہے کہ "غلامی" کی لعنت کو دور کرنے کے لیے فی الواقع ہم مضطر ہیں،

اور تو اور خود حضرت شیخ الہندؒ جن کے آپ جانشین بھی ہیں "غلامی" دور کرنے میں "ہندو" کی شرکت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنا "اسوۂ حسنہ" بھی چھوڑ گئے ہیں! —— تو پھر آپ کیوں "مسلمانوں" کو "پاکستانی" راہ دکھا دکھا کر افتراق و انشقاق کا دروازہ کھول رہے ہیں!

ان معروضات کے بعد حضرت علامہ عثمانی کے حضور میں گڑگڑا کر استدعا کروں گا کہ خدارا! "مسلمانوں" پر دنیا کو نہ ہنسوائیے! اور ایک دوسرا بیان شائع کر دیجیے، تا کہ "ہندو اور انگریز" دونوں اپنے اپنے اس خیال سے باز آجائیں کہ ؎

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے "مسلماں" کو گداگر[۱]

(اقبال)

("زمزم"، لاہور، ۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳)

---

[۱] یہی مکمل مضمون سہ روزہ "مدینہ" بجنور کی ۵ر نومبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں بھی چھپا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کا مکتوب

ایک دردمند مسلمان کی نظر میں

از: مسیح انصاری مٹیابرجی

۳۰ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء کے عصر جدید کلکتہ میں حضرت علامہ عثمانی کا وہ مکتوب شائع ہوا جو ایم سعید الدین صاحب بہاری کے استفسار کے جواب میں ارقام فرمایا گیا ہے، اس کے مالۂ وما علیہ پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ علامہ عثمانی نے جواب ارقام فرما کر شکوک رفع کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر کیا کیا جائے کہ مشککین کے لیے اس سراسر منطقی طرز استدلال سے اور بھی زیادہ گنجلکیں پیدا ہو کر رہ گئی ہیں، چنانچہ چوتھے جواب سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے،

پاکستان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حمایت ہی یا مخالفت؟ سمجھدار مسلمان ہی اس کا بہتر تصفیہ کر سکتا ہے، بہر حال ارشاد ہے کہ:

"پاکستان ایک اصطلاحی نام ہے، جس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلم قوم کی اکثریت ہے وہاں اس کی آزاد حکومت قائم ہو، آگے وہاں کے دستور و آئین کی تشکیل کس نوعیت کی ہوگی؟ یہ وہاں کے احوال و ظروف کی مناسبت سے اہل حل و عقد کے مشورہ کے بعد وقت پر بروئے کار آئے گی، اور وہاں کی اکثریت اس بارے میں اپنی قدرت کی حد تک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے مکمل ترین قانونِ عدل و حکمت اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے استنارہ و استفادہ کی پوری کوشش کرے گی"

(عصر جدید، کلکتہ، ۳۰ نومبر ۱۹۴۵ء)

دیکھیے! علامہ عثمانی نے "پاکستان" کو صرف ایک "اصطلاحی نام" فرمادیا ہے، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ اسی پاکستان کے لیے کیا کیا نہ کیا گیا؟ ریزولیوشن پاس کیے گئے، کانفرنسیں کی گئیں، لیڈروں میں گفتگوئیں اور ملاقاتیں ہوئیں، جواہر، جینا اور گاندھی خط و کتابت ہوئی "راجہ فارمولا" پر بحثیں کی گئیں، "لیاقت ڈیسائی پیکٹ" ظاہر ہوا، حد ہو گئی، "شملہ کانفرنس" میں اسی پاکستان اور واحد نمائندگی کی بقاء کے لیے ناکامیابی تک ہو گئی، اور آپ نے اسی پاکستان کو صرف ایک "اصطلاحی نام" فرمادیا ہے ——— سوچیے! آپ کے اس ارشاد نے پاکستان کے تمام جلال و جبروت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ اور اس کا صرف "سادہ مطلب" بیان فرماتے ہوئے آزاد حکومت کا تذکرہ کر دیا ہے، اور یہ واضح نہیں فرمایا کہ یہ آزاد حکومت ایران، افغانستان، یا ترکستان کی آزاد حکومتوں سے ملتی جلتی ہو گی یا بعینہ اسی طرح ———

اور پھر تشکیل آئین کو وہاں کے احوال و ظروف اور اہلِ حل و عقد کے مشاورہ پر محمول فرما دیا ہے ـــــــ تو کیا بنگال کے "بنگالی" اور پنجاب کے "ہندو" "سکھ" اور "آریہ" وہاں کے "احوال و ظروف" میں شامل ہوں گے یا نہیں؟ ـــــــ اسی طرح اہلِ حل و عقد میں بنگالی، ہندو، سکھ اور آریہ، سیاسیین و فضلائے وقت بھی شمار کیے جائیں گے یا نہیں؟ ـــــــ غالباً ان سب کا جواب اثبات ہی میں دیا جائے گا ـــــــ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ اکثریت کی قدرت کا دبدبہ بھی ظاہر کیا گیا ہے، ـــــــ مگر یہ امر وضاحت طلب ہی کہ اس اکثریت میں اس قابل حضرات بھی رہیں گے یا نہیں جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے مکمل ترین قانونِ عدل و حکمت اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے استنارہ و استفادہ کر بھی سکیں گے یا نہیں؟ ـــــــ یا موجودہ وقت کے صرف ایسے سیاسی مسلمان ہوں گے جن میں منکرینِ خدا، کمیونسٹ ـــــــ منکرینِ ختمِ رسالتؐ "قادیانی" اور منکرینِ خلافتِ خلفاءِ راشدین، "شیعہ" بھی ہوں گے؟ ـــــــ کاش! علامہ عثمانی جواب میں اسے واضح فرما دیتے تو بہتر ہوتا ـــــــ خیر!

لیگ کا جواہر مُہرہ؛

یہ امر بھی جواب طلب ہے کہ پاکستان کے لیے جو کچھ بھی آپ فرما رہے ہیں یا آپ کے ہمنوا "جمعیۃ العلماء اسلام کلکتہ" کے اربابِ بست و کشاد کے افکار و آراء اسلامیانِ ہند کے روبرو ظاہر کیے گئے ہیں تو کس حد تک اس سلسلہ میں آپ حضرات کو مسٹر جینا یا ان کے سرکار پرست حوارین کی جانب سے اطمینان بخش اعتماد ہے کہ فی الواقع اس موجودہ انتخابات کے بعد بھی مسٹر جینا اور ان کی "مُسلم لیگ" کی طرف سے یہی سب ہوگا جو اس وقت "حصولِ ووٹ" کے لیے حاصل کیا جا رہا ہے؟ ـــــــ یا وہی ۱۹۳۶ء کے "انتخابات" کے بعد کی

طرح ویرانیوں اور تاریکیوں کی چومکھی یلغار ہو جائے گی؟ ـــــ اس وقت بھی تو مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور جمعیۃ العلماء ہند سے کیسے کیسے زبردست اور شاندار وعدے کیے گئے تھے، اور انتخابات کے فوراً بعد ہی بے وفائیاں اور کج ادائیاں برتی گئیں ـــــ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جبکہ خیر سے حضرت علامہ عثمانی بھی "جمعیۃ العلماء ہند" کے ایک سرگرم رکن تھے ـــ ـــ حضرت دَورِ ماضی کے ان عبرتناک واقعات کی روشنی میں ہر سمجھدار اور باہوش مسلمان یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوگا کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب مسلم لیگ ذی فراش ہونے کو تھی تو اس وقت اسی سیاسی داؤ پیچ کے ماہر قائد نے جمعیۃ العلماء ہند کی شرکت کو "جواہر مہرہ" کی طرح تجویز فرمایا تھا، ـــــ اور آج جبکہ پھر مسلم لیگ کی حیات و ممات کا سوال در پیش ہے اور قدیم جمعیۃ العلماء ہند کو اب کی دفعہ شیشہ میں نہیں اتارا جا سکتا، تو کلکتہ میں "جمعیۃ العلماء اسلام" قائم کرائی گئی ہے، اور یہ مسلم لیگ کی خوش قسمتی ہے کہ اس پُرآشوب دور میں حضرت علامہ عثمانی جمعیۃ العلماء ہند سے نہ معلوم کیوں کبیدہ خاطر ہو کر اسی سیاسی داؤ پیچ کے ماہر قائد کے سیاسی دام میں اُلجھے نظر آ رہے ہیں ـــــ خدا کرے کہ حضرت علامہ عثمانی جلد یا بدیر اس فریب خوردہ شاہیں سے یہ کہتے ہوئے جُدا ہو جائیں کہ ع "کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور" ـــــ آمین!

"جمعیۃ العلماء ہند" کا فارمولا؛

اس عقدۂ لاینحل کا حل گویا حضرت علامہ عثمانی نے نہایت ہی سادگی اور بھولے پن سے یوں فرمایا ہے کہ:

"جمعیۃ العلماء کے فارمولا کے موافق مرکز سے جو امور مہمہ متعلق ہوں گے اس میں مسلم قوم محض اکثریت کے رحم و کرم پر رہے گی اور کوئی آزاد

طاقت یہاں ایسی نہ ہوگی جو ان کو عام مسلم مطالبات ماننے پر مجبور کرے"
("عصرِ جدید" کلکتہ، ۳۰ رنومبر ۱۹۴۵ء)

حضرت علامہ عثمانی کا یہ بیان تو درحقیقت نسیان زدگی کی غمازی کر رہا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو ہر وہ شخص جس نے "خطبۂ سہارنپور" سنایا پڑھا ہوگا یہی کہے گا کہ یہ سراسر اتہام اور بہتان ہے، جو نہ معلوم کس مصلحت سے "جمعیۃ العلماء ہند" پر لگایا جا رہا ہے، کیونکہ صدر جمعیۃ العلماء ہند نے سہارنپور میں اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے ذیل کا خلاصہ پیش فرمایا تھا کہ:

۱۔ "ہندوستان کا دستورِ حکومت وفاقی اصول پر مرتب کیا جائے۔
۲۔ تمام صوبے (یا وفاقی وحدتیں) مکمل طور پر آزاد ہوں، اور غیر مصرحہ اختیارات انہی کو حاصل ہوں،
۳۔ وفاقی مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں،
۴۔ وفاقی وحدتوں کے لیے حقِ خود ارادیت تسلیم کیا جائے،
۵۔ وفاق کی تشکیل ایسے اصول پر کی جائے جس میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کا اس طرح تحفظ کیا جائے جو مسلمانوں کے لیے قابلِ اطمینان ہو،

جمعیۃ العلماء کی رائے میں یہ اطمینان ذیل کے کچھ اصول میں سے کسی اصول پر وفاقی حکومت کی تشکیل سے حاصل ہو سکتا ہے:

۱۔ مرکزی ایوان میں نمائندگی کا تناسب یہ ہو:
ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰ ـــــ جمعیۃ العلماء نے اس دفعہ کی روح کو بطور اصول پیش نظر رکھا ہے،

۲۔ اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکانِ مرکزی کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہبی اور ثقافتی آزادی کے خلاف قرار دے تو قانوناً وہ بل ایوان میں زیر بحث نہ آسکے،

۳۔ ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جو مرکزی اور صوبوں کے تنازعات صوبوں کے باہمی نزاع اور ملک کی قوموں کے اختلاف کا آخری فیصلہ کرے، اور مسلم وغیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کا اختیار مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی ایک ایسی کمیٹی کو دیا جائے جس میں مسلم وغیر مسلم ارکان کی تعداد مساوی ہو،

۴۔ یا اس کے علاوہ کوئی اصول جو مسلم وغیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے کیا جائے،، (خطبۂ سہارنپور)

جمعیۃ العلماء ہند کے مذکورہ نقطۂ نگاہ کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، اور دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ اس دن سے بھی زیادہ روشن حقیقت پر خواہ مخواہ حضرت علامہ عثمانی خدا معلوم کیوں؟ محض اپنے تقدس کو بروئے کار لاکر پردے ڈالنا چاہتے ہیں؟ —— مگر سنجیدہ، متین اور باہوش مسلمان کی نگاہ شناسائی یہ سب کچھ دیکھ کر سمجھ لیتی ہے،

دو قوم کا نظریہ :

اس کے بعد پھر وہی "قومیت ثنائی" کا نظریہ دُہرایا گیا ہے —— اور مذہب پر قومیت کی بناء قرار دے کر الفاظ کا خوب صورت قلعہ استوار کر دیا گیا ہے —— حالانکہ حضرت علامہ عثمانی اپنے اس نظریہ کو نہ تو کتاب وسنت کی صحیح روشنی میں ثابت کر سکتے ہیں، اور نہ ہی قدیم وجدید جغرافیہ اور لغت ہی سے دنیا کے

علم کے سامنے پیش فرما سکتے ہیں! ـــــ کیونکہ کتاب و سنت کے احکام و نصوص نے تو دنیا میں ایک "نظام جامع بشری" پیش کیا تھا، اور اب بھی وہ یہی پیش کر رہا ہے ـــــ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی الآیۃ اور وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّۃً وَّاحِدَۃً الآیۃ وغیرہ قرآنی آیات کے مفاہیم و مطالب اور حضرت رحمۃ للعالمین کی مکی و مدنی زندگی کے حقائق و بصائر اور حجۃ الوداع کا خطبۂ گرامی، نیز فلاسفرِ اسلام حضرت سعدیؒ کا یہ شعر

بنی آدم اعضائے یکدیگرند ؎ کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

ـــــ اسی "نظامِ جامع بشری" اور "وحدت و اخوتِ انسانی" کے قیام کا اعلان عمل اور عمل کی مزید تشریح ہے،

پاکستان اور جمعیۃ کا فارمولا؛

اس کے بعد علامہ عثمانی نے اسی عرفی اور اصطلاحی پاکستان اور جمعیۃ العلماء کے فارمولا کے تذکرہ میں یوں خطابت صرف فرمائی ہے کہ

"اب پاکستان اور جمعیۃ العلماء کے فارمولا میں فرق یہ ہے کہ جمعیۃ بزعم خود ایک خاص درجہ میں ملک کی قومی وحدت ایک مخلوط مرکز کے ذریعہ قائم رکھنا چاہتی ہے، جس میں .... اقلیت میں ہونے کے اعتبار سے مسلم قوم کا عمومی نقصان ہے، اور پاکستان کے حامی جو دو قوموں کا صحیح نظریہ رکھتے ہیں ملک کی اہم ضروریات میں مستحکم اور مساویانہ معاہدات کے ذریعے عملی وحدت کو استوار کرنا چاہتے ہیں!" (عصرِ جدید، ۳۰ر نومبر ۱۹۴۵ء)

"جمعیۃ العلماء ہند" کا نقطۂ نگاہ ابھی ابھی میں نے "خطبۂ سہارنپور" سے پیش کیا ہے، اسے اور علامہ عثمانی کے ارشادِ گرامی کو بار بار پڑھیے اور خود ہی فیصلہ کیجیے

کہ علامہ عثمانی کا یہ قول صحیح ہے یا جمعیۃ کا تشفی بخش نقطۂ نگاہ ـــــ اور سنیے!
علامہ عثمانی تو "دو قوم" کے گویا "صحیح نظریہ" کے علمبردار ہیں اور اس کے مخالف کو ہدفِ ملامت بنائے ہوئے ہیں، اور "مسلم لیگ" کی حمایت میں ووٹروں کے نام بیان پر بیان دیئے چلے جا رہے ہیں، اور ذرا انہیں ملاحظہ فرماتے کہ لیگ کے "قائد اعظم" کیا فرما چکے ہیں؟ ـــــ ۸ ر نومبر ۱۹۴۵ء کو پاکستان پر بیان دیتے ہوئے پاکستان کے امام نے فرمایا کہ:

"پاکستان ایک جمہوریت ہوگا اور دو جداگانہ علاقوں پر مشتمل ہوگا، اس کی آبادی دس کروڑ مسلمانوں اور غیر مسلموں پر مشتمل ہوگی، یہ دونوں علاقوں پر مشتمل ایک بلاک ہوگا، صوبے عصرِ حاضر کے فیڈرل دستور کے مطابق خود مختار ہوں گے، پاکستان کی تمام (ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی) آبادی ایک قوم کے اصول پر ترقی حاصل کرے گی"۔ (مدینہ بجنور، ۷ ر نومبر ۱۹۴۵ء)

اللہ اکبر! قائدِ اعظم کے اس بیان نے جہاں اور حقیقتیں بے نقاب کی ہیں وہیں آپ کے "دو قوم والے صحیح نظریہ" کے گلے پر تو بیدردی سے چھری پھیر دی ہے، اور صاف فرما دیا ہے "پاکستان کی تمام آبادی ایک قوم کے اصول پر ترقی حاصل کرے گی" ـــــ ـــــ کیا حضرت علامہ عثمانی فرما سکتے ہیں کہ "ایک قوم کے اصول" اور "قومی وحدت" میں کیا فرق ہے؟ ہائے!!! ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اب تو علامہ عثمانی پر ایک انفعالی ردِّ عمل شروع ہو چکا ہوگا، اور دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ ناحق میں نے ایسے "سست مدعی" کے لیے "چست گواہی" دیدی، اب رہ گئی "جمعیۃ العلماء ہند" کے فارمولا کی منظوری اور عدم منظوری! تو اس کے

لیے صرف اتنی عرض کافی ہے کہ موجودہ "انتخابات" کے سلسلے میں جو اعلان کانگریس کی طرف سے ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کیا گیا ہے وہ جمعیۃ العلماء ہند کے فارمولا کا تقریباً آئینہ دار ہے، خصوصاً یہ اہم دفعات:

۲۔ کانگریس تمام مذہب اور فرقوں میں اتحاد اور ان سب کے مابین خوش اعتقادی کی حامل ہے،

۴۔ کانگریس کی پالیسی یہ ہے کہ وسیع قومی اتحاد کے ماتحت ہر علاقہ کے لوگ اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق اپنی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالیں،

۷۔ کانگریس مرکز کے تحت صوبجات و دیگر علاقہ جات کے لیے پوری آزادی کی حمایت کرتی ہے، (مدینہ بجنور، یکم نومبر ۱۹۴۵ء)

ان تصریحات کے بعد یہ کہے جانا کہ "کانگریس ہندو راج، رام راج اور مسلمان کُش پالیسی کی حامل ہے"، سراسر زیادتی، تعصب اور بے جا ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

قائدِ اعظم کی تقریر!

ایم سعید الدین صاحب سوال نمبر ۶ میں یقیناً بھول گئے اور غلطی سے کوئٹہ کی "تقریر" لکھ گئے، ورنہ مسٹر جناح نے یہ بیان "نیوز کرانیکل" کے نامہ نگار کو دیا تھا کہ:

"ایک مدت تک پاکستان میں انگریزوں کی ضرورت پڑے گی" وغیرہ وغیرہ ——

(رہنما روزانہ، ۵ دسمبر ۱۹۴۵ء)

ایسا کیوں فرمایا تھا؟ شاید اس لیے کہ مخاطب ایک "سفید فام قوم" کا ایک فرد تھا —— اور کیوں نہ ہو "سیاسی داؤ پیچ کے آگاہ جو ٹھہرے —— بھئی موقع و مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں، اسی طرح ان کی سیکڑوں تقریروں کا پس منظر ہے —— میں

دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کانگریس سے مصالحت کے بارے میں ایک عرصہ تک "اگست سنہ ۱۹۴۲ء کے ریزولیوشن" کی واپسی کا اصرار کیا معنی رکھتا ہے؟ ابھی ابھی کوئٹہ میں کانگریسی اور غیر کانگریسی تمام "تحریکات" کو بے عقلی کے مرادف ٹھہرانا کس مصلحت پر مبنی ہے؟ کیا ان سب سے صاف اور صریح طور پر "انگریز" کی خوشامد نہیں ثابت ہو رہی ہے؟ —— ذرا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے کر فیصلہ فرمائیں اور ناحق دیانت کا خون نہ کریں! —— اور ہندوؤں میں سے سر چھوٹو رام کے بیان کا حوالہ دے کر جو "الزامی جواب" دیا گیا ہے، یہ دعویٰ کی صحیح دلیل نہیں بن سکتی، کسی مہا سبھائی یا گورنمنٹی پٹھوؤں کی تقریر سے "آزادی خواہ ہندوؤں" پر قیاس کرنا عقل کی پامالی ہوتی دنیا میں صحیح قیاس نہیں کہلائے گا،

شملہ کانفرنس؛

"شملہ کانفرنس" کے صحیح "مشاہدات" بیان فرماتے ہوئے جو بھیانک الزامات آزادی خواہ مسلمانوں کے سر تھوپے گئے ہیں اس میں تو کمال ہی فرما دیا گیا ہے، حضرت اقدس! اگر برادرانِ یوسفؑ کی طرح مغرب زدہ ذہنیت والے بھائی، جعفرِ صادق اور رنِ علقمی کا پارٹ ادا کر رہے ہوں تو کیا کیا جائے؟ صدق دل سے فرمائیے گا کیا "قائدِ اعظم" کے دعویٰ "واحد نمائندگی" ہی نے "شملہ کانفرنس" کو ناکامیاب نہیں بنایا؟ اور "ہندوستان" کو "منزلِ آزادی" کے قریب تر ہونے سے نہیں روکا؟ —— ردّ و کد تو صرف مسلم نشستوں کے لیے تھی، "قائدِ اعظم" بلا شرکت غیرے تمام مسلم نشستوں کی نامزدگی کا حق "واحد نمائندہ" ہونے کی حیثیت سے اپنے حق میں محفوظ رکھنا چاہتے تھے، اور ادھر مولانا ابو الکلام آزاد کانگریس کی مشترکہ پالیسی اور آزاد خیال مسلمانوں کی نمائندگی کی وجہ سے صرف "۲ سیٹیں" طلب کر رہے تھے، مگر ہمارے "قائد اعظم" نہ مانے، پہلے التوا؛

اور پھر ناکامیابی پر "کانفرنس" ختم ہو گئی، ——— اور اب جب انتخابات کا دور شروع ہوا۔ اور شملہ کی زمہریری کے بجائے "بمبئی" کے معتدل درجۂ حرارت نے اپنا کام کیا تو یہ پکار اٹھے :۔

"میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ مسلم لیگ ۱۰۰ فیصدی ہندی مسلمانوں کی نمائندہ ہے، کوئی سیاسی جماعت اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتی، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی غالب اکثریت کی نمائندہ ہے" (شہباز، لاہور، ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

کاش! قائد اعظم شملہ کانفرنس سے پہلے اس حقیقت کو پا لیتے تو آج "ہندوستان" کم از کم داخلی آزادی سے تو بہرہ یاب ہوتا، اور واحد "نمائندگی" بھی برقرار رہتی، مگر ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ٭ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ممالکِ اسلامیہ اور ہندوستانی مسلمان!

سائل نے اپنے سوال میں جو کچھ ظاہر کیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ہندوؤں سے تو صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی کو خطرہ ہے، اور انگریز نے تو اسی ہندوستان ہی کے قبضہ و تسلط کی بناء پر سارے عالمِ اسلام کو روند ڈالا ہے، اگر آج ہندوستان آزاد ہو جائے تو عالمِ اسلامی ان کے پنجۂ ظلم سے نجات پا جائے، اگر خدانخواستہ ہندوستانی مسلمانوں کو کچھ اپنا نقصان کر کے بھی ہندوستان کو آزاد کرانا پڑے تو کیا ایسا نہ کیا جائے اور اپنے ساتھ ساتھ پورے ممالکِ اسلامی کو غلام رکھا جائے؟"

اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز فرماتے ہوئے نہایت ہی سادگی سے

ہندوستان آزاد نہ کرانے کی ساری ذمہ داری آزاد خیال مسلمانوں اور کانگریس کے سر تھوپ دی گئی ہے، اور "پاکستان" کے صحیح مطالبہ کو مسترد کر کے ہندو قوم ہی ملک کی آزادی میں روڑے "اٹکا رہی ہے" ـــــــ کا زبردست اعلان کر دیا گیا ہے، مگر افسوس! سائل تو یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ اگر خدانخواستہ ہندوستانی مسلمانوں کو کچھ نقصان کر کے بھی ہندوستان آزاد کرانا پڑے، تو کیا ایسا نہ کیا جائے؟ اور جواً میں آپ ممالکِ اسلامیہ کی آزادی کے لیے اتنی بھی قربانی کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہیں، اور دلِ "عشاق" کی طرح اِدھر اُدھر کے حیلے تراش رہے ہیں ـــــــ حضرت آپ نہایت ہی گرم جوشی سے "مسلم لیگ" کی حمایت فرمایئے، مگر خدارا سائل کو تسلی بخش جواب تو دیجیے، اور صاف صاف الفاظ میں یہ فرمایئے کہ "آپ ممالکِ اسلامیہ کی آزادی کے لیے اپنا کچھ نقصان کرنے کو تیار بھی ہیں یا نہیں"؟ تاکہ حقیقتِ حال کا پتہ بھی لگے، اور گفتار کے ساتھ ساتھ کردار کا بھی علم ہو، اور شاید مولانا حسرت موہانی کے اس شعر کی وضاحت بھی ہو جائے ؎

حق سے بعذرِ مصلحتِ وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ رہنما سمجھ، اس کو نہ پیشوا بنا

اسی ضمن میں کانگریس کا جو مضحکہ خیز اور طبع زاد نصب العین حضرت علامہ عثمانی نے ظاہر فرمایا ہے تو وہ تو اس کے دعویٰ "ہندوستان چھوڑ دو" سے ظاہر و باہر ہے، ـــــــ رہا "عرب لیگ" کا "پاکستان" کی حمایت میں تار؟ تو درحقیقت یہ بھی برطانوی استعماریت ہی کی ایک سیاسی چال ہے، کیونکہ "عرب لیگ" میں برطانیہ کے ہوا خواہوں کا عنصر غالب ہے ـــــــ اس کے برخلاف برطانوی سازش کے سب سے بڑے اور ماہر نباضِ وقت نحاس پاشا نے ۷ ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو قاہرہ سے "پاکستان" کے متعلق یہ اعلان فرمایا ہے کہ:

"پاکستان کا مطالبہ آزادی کے راستہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا
اس سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کے بجائے مضبوط ہوں گی"
(مدینہ بجنور، ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اب فرمائیے! اس اعلان کے بعد "پاکستان" کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے؟ اور خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اسلام کا ہندی مفکر اعظم اقبالؒ بھی ہمیں یہ سنا گیا ہو

ع ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

آزادیٔ ہند کا خیر مقدم؛

آخری سوال تھا کہ "اگر بغیر پاکستان دیئے ہوئے برٹش حکومت ہندوستان کو آزادی عطا کرنا چاہے تو مسلمانوں کو خیر مقدم کرنا چاہیے یا ٹھکرا دینا چاہیے؟" ــــــ اس کا دلچسپ جواب ملاحظہ ہو کہ: "اس کا فیصلہ آزادی کی نوعیت معلوم ہونے اور اس وقت کے حالات کا جائزہ لینے پر موقوف ہوگا، ابھی سے کچھ کہنا قبل از وقت اور ناتمام ہوگا" ــــــ دیکھا آپ نے! کس شان اور صفائی کے ساتھ جواب بھی جو دیا تو نہ دینے کے برابر! کاش! علامہ عثمانی آزادی کی بازیافت کے وقت حیلے نہ فرماتے، اور ظاہر فرما دیتے کہ ہم ہندی مسلمان (خصوصاً لیگی بھی) آزادی کے لیے فی الواقع بیتاب ہیں! مگر آہ! یہ مجمل جواب تو موجودہ "غلامی" کی عملاً توصیف ہی کر رہا ہے، اور علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کی یاد تازہ کرا رہا ہے کہ ؎

اس دیس میں پیدا کیا اقبال کو تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

(ختم شد)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ایک تاریخی انٹرویو

اتحادِ اسلامیانِ ہند کی کہانی
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی

(از جناب خواجہ عبدالوحید صاحب)

''راقم السطور ان خوش نصیب مسلمانانِ پنجاب میں سے ہے، جنھیں حال ہی میں لاہور میں متعدد مرتبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہونے کا شرفِ حاصل ہوا۔ ذیل میں آپ کے ارشادات جو ایک ہی مجلس میں سننے کا موقع ملا سپردِ قلم ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ حضرت علامہ کے ارشادات کو کامل دیانت داری کے ساتھ انھیں کے الفاظ میں دہرادیا جائے۔ تاہم ممکن ہے کہ بعض جگہ الفاظ ان کے نہ ہوں۔ ان شاء اللہ خیالات میں کچھ ردّ و بدل نہ ہوگا۔ اور اگر کہیں راقم کے سوءِ فہم نے معمولی سی غلطی بھی پیدا کردی ہو تو حضرت علامہ اس کی تصحیح فرماسکتے ہیں۔''

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ۱۹۳۷ء کے انتخابات گزر چکے تھے اور مسلم لیگ کا لاہور کا ریزولیوشن ابھی پاس نہ ہوا تھا ❶۔ میں اس زمانے میں جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک رکن تھا ❷۔

میرا اُس زمانے میں خیال تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت نہیں ہوسکتی جب تک خود مسلمان جماعتوں میں کامل یک جہتی اور مفاہمت نہ ہوجائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مفاہمت نہ ہو۔ اس زمانے میں اسلامیانِ ہند کی قابل ذکر تین جماعتیں تھیں۔ ایک مسلم لیگ، دوسری جمعیت علماے ہند اور تیسری

مجلس احرارِ اسلام (ہند)۔ ان جماعتوں میں مفاہمت کے لیے ضروری تھا کہ ان تینوں کے قایدین کے درمیان مفاہمت ہو۔ چناں چہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ان جماعتوں کے قایدین کو اکٹھا کرکے اور ان کے درمیان تبادلۂ خیالات کا موقعہ پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

چناں چہ میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند، مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار اسلام اور مسٹر محمد علی جینا صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے گفتگو شروع کی۔ اوّل الذکر دونوں اصحاب ثانی الذکر سے تبادلۂ خیالات پر رضامند ہو گئے۔ ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد میں نے مسٹر جینا سے ملاقات کا ارادہ کیا۔

مسٹر جینا سے ملاقات اور مقصد میں ناکامی:

میں اس کے بعد بمبئی میں مسٹر جینا سے ملا (۳)۔ جب میں نے ان کے سامنے تینوں مسلمان جماعتوں کے قایدین کی ملاقات کی تجویز پیش کی اور یہ بھی کہا کہ دوسری دونوں جماعتوں کے قایدین گفتگو کے لیے آمادگی کا اظہار کر چکے ہیں تو مسٹر جینا نے کہا کہ مولانا یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں تو جمعیت علما، مجلس احرار یا کسی اور جماعت کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اگر میں ان سے ملاقات کروں گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں نے اُن جماعتوں کی ہستی کو تسلیم کرلیا ہے، میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔

مسٹر جینا کا یہ جواب سن کر میں نے کہا کہ صاحب! یہ تو ناممکن ہے، وہ جماعتیں تو اپنی اپنی جگہ قایم رہیں گی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مسلم لیگ میں مدغم ہو جائیں۔ اس لیے آپ کو ان سے علاحدہ جماعتوں کے قایدین کی حیثیت ہی سے گفتگو کرنی پڑے گی۔ جینا صاحب نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ میں کسی دوسری جماعت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس گفتگو کے بعد میں بمبئی سے دیو بند کو لوٹ آیا۔

نئی کوششیں:

ایک زمانہ گزر گیا۔ دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولوی حبیب

الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرارِ اسلام کا ایک خط دہلی سے میرے نام پہنچا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ

"آج کل مجلس احرار کا ایک اجتماع یہاں ہو رہا ہے اور احرار کے سب ارکان موجود ہیں۔ جمعیت کا تو دہلی مرکز ہے۔ اس لیے تمام بزرگانِ جمعیت یہاں موجود ہیں اور مرکزی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے جینا صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اس وقت یہاں پہنچ جائیں اور مفاہمت کی گفتگو کرانے کی کوشش فرمائیں۔"

اس خط کے ملنے پر میں فی الفور دہلی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس وقت میں تانگے میں سوار ہوا سخت طوفان باد و باراں جاری تھا اور ژالہ باری بھی ہو رہی تھی، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اسلامیانِ ہند کو آپس میں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو بہت بڑی سعادت کا موجب ہوگا۔ چناں چہ میں اسٹیشن پر پہنچ کر دہلی کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

مسٹر جینا سے دوبارہ ملاقات:

دہلی پہنچ کر میں ارکانِ جمعیت علمائے ہند اور مجلس احرارِ اسلام سے ملا اور دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ ارکان نے اس تجویز کو منظور کر لیا کہ مسٹر جینا سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کی کوشش کی جائے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ کہا کہ اگر وہ یعنی جینا صاحب چاہیں کہ ہم ان سے ملیں تو وہ ہمیں دعوت نامہ بھیج دیں اور اگر وہ ہمارے پاس تشریف لانا چاہیں تو ہم انھیں دعوت نامہ بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔

چناں چہ میں نے ٹیلی فون پر جینا صاحب سے ملاقات کے لیے وقت مانگا اور وقت معینہ پر ان کے ہاں پہنچ گیا۔ جاتے ہی میں نے انھیں بمبئی کی ملاقات اور اس وقت کی گفتگو کا ماحصل یاد دلایا اور اُس کے بعد کہا کہ آج کل خوش قسمتی سے تینوں جماعتوں کے سربرآوردہ لوگ یہاں موجود ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ لوگ مل بیٹھیں اور

فلاح ملی وملکی کی کوئی تدبیر پیدا ہو جائے۔ مسٹر جینا نے وہی جواب دیا جو وہ بمبئی کی ملاقات میں دے چکے تھے میں نے اس پر پھر یہی کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا۔ جمعیت علماے ہند اور مجلس احرار اسلام دونوں مسلم لیگ سے علاحدہ جماعتیں رہیں گی اور ان کے قایدین آپ سے اپنی جماعتوں کے نمایندوں کی حیثیت ہی سے گفتگو کریں گے۔

جینا صاحب کی گفتگو کے لیے آمادگی:

خاصی ردّ و قدح کے بعد وہ ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس پر میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ جمعیت علما کے دفتر میں چلنا پسند کریں تو ان حضرات کی طرف سے آپ کی خدمت میں دعوت نامہ آجائے گا اور اگر آپ یہ چاہیں کہ وہ یہاں آئیں تو آپ ان کی طرف دعوت نامہ بھیج دیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ میں وہاں نہیں جاسکتا وہ یہاں آجائیں۔ میں نے کہا تو آپ ان کے نام ایک دعوت نامہ لکھ کر مجھے دے دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں تحریری دعوت نامہ نہیں دے سکتا۔ کیا ان لوگوں کو آپ کے زبانی پیغام پر اعتماد نہ ہوگا (۲)؟

قایدین جمعیت و مجلس کی آمادگی:

میں واپس ناکام لوٹ کر پھر جمعیت علماے ہند اور مجلس احرارِ اسلام کے قایدین سے ملا۔ اور ان پر صورت حالات واضح کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو تحریری دعوت دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ تحریری دعوت نامہ کیوں نہیں دیتے؟ میرے اصرار پر وہ لوگ مسٹر جناح کے ہاں بغیر کسی تحریری دعوت نامہ کے جانے پر بالآخر رضا مند ہو گئے۔

میں نے پھر مسٹر جناح سے وقت لیا اور وقت معینہ پر میں، مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مسٹر جناح کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ ملاقات کے شروع میں میں نے کہا کہ میرا منصب صرف آپ تینوں حضرات کو ملا دینا تھا اور الحمد للہ کہ وہ پورا ہو گیا۔ اب میرا کام ختم ہے اور اب میں خاموش بیٹھا رہوں گا

گفتگو آپ حضرات کے درمیان ہوگی۔ میں اس میں کوئی حصہ نہ لوں گا۔

مفاہمت کی گفتگو:

جیناصاحب نے فرمایا کہ میں دو باتیں ابتدائی طور پر کہنا چاہتا ہوں،

ایک یہ کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میرے ساتھ ایک اور شخص گفتگو میں اس لیے شامل کرلیا جائے کہ میں اردو زبان آسانی سے نہیں بول سکتا، وہ صاحب میرا مفہوم آپ پر اچھی طرح واضح کرسکیں گے۔ مفتی صاحب اور مولوی صاحب نے اس کی اجازت دے دی۔ چناں چہ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو ساتھ کے کمرے سے بلالیا گیا اور اب ہم کل پانچ آدمی ہوگئے۔

دوسری بات جیناصاحب نے یہ فرمائی کہ جب تک ہم لوگ کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ جائیں اس گفتگو کے متعلق کوئی اطلاع اخبارات میں شایع نہ کی جائے۔

اس پر بھی سب لوگوں کا اتفاق ہوگیا اور آج تک اس ملاقات کے حالات اور گفتگو کی تفصیل سے ہندوستان کے عوام بےخبر رہے ہیں۔

اتفاق رائے:

گفتگو شروع ہوئی۔ تبادلۂ خیالات، ردّ و قدح، ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ کم و بیش آٹھ بجے رات سے لے کر بارہ بجے رات تک جاری رہا۔ تمام بحث پانچ بنیادی اُمور پر مرتکز رہی اور الحمدللہ کہ بالآخر تینوں حضرات ان پانچوں بنیادی اُمور پر متفق ہوگئے اور وہ کام جو مدتوں کی کوششوں سے طے نہ پاسکا تھا اس عاجز کی کوشش سے بفضلہٖ تعالیٰ انجام پاگیا۔

نئی رکاوٹ:

جب ہم لوگ جیناصاحب سے رخصت لینے لگے تو انھوں نے کہا کہ دیکھیے مولانا آپ دونوں صاحبوں (یعنی مفتی غایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب) کو مسلم لیگ کا دو آنے دینے والا ممبر بننا ہوگا۔ ہم لوگ فیصلہ ہو جانے کے بعد اس نئی تجویز پر حیران ہوئے اور مفتی صاحب اور مولوی صاحب نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ۵۔ نہ جینا صاحب اپنے مطالبے سے دست بردار ہوئے اور نہ دوسرے دونوں اصحاب نے ان کی بات مانی، اور ہم وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔ اور یوں ایک عظیم الشان معاملہ طے ہو جانے کے بعد پھر غیر طے شدہ رہ گیا:

قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ اتحادِ اسلامیانِ ہند ایسا اہم مسئلہ پورے طور پر طے ہو چکنے کے بعد ایک معمولی سی بات کے لیے کیوں ہمیشہ کے لیے کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ ایک طرف میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے دوسرے اہم اختلافات مٹا دینے کے بعد ایک معمولی سی بات ماننے سے کیوں انکار کر دیا اور دوسری طرف یہ بات بھی میرے فہم سے بالا ہے کہ جینا صاحب نے تمام بنیادی اُمور طے پا جانے کے بعد ایک معمولی سی چیز کے لیے اتحادِ اسلامی کی تمام اُمیدوں پر کیوں پانی پھیر دیا؟

(سہ روزہ زمزم- لاہور: ۷؍فروری ۱۹۴۶ء)

حواشی:

۱ گویا کہ ۱۹۳۷ء (جولائی میں الیکشن) کے بعد اور مارچ ۱۹۴۰ء سے پہلے کے زمانے کا واقعہ ہے۔

۲ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا جمعیت علماے ہند سے ۱۹۲۰ء تا اپریل ۱۹۴۵ء تعلق رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ ان کی سرگرمیاں کم ہوگئیں۔ پھر جوں جوں حیدرآباد (دکن) سے ان کا تعلقات بڑھے، جمعیت سے دوری پیدا ہوتی گئی اور لیگ کے رہنماؤں سے ان کی قربت بڑھتی گئی۔ اپریل ۱۹۴۵ء کے بعد انھوں نے جمعیت کی مجلس عامہ کی رکنیت کی تجدید نہیں کی۔ لیکن لیگ کی سیاست کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا۔ الیکشن ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء میں وہ لیگ کے فلسفۂ سیاست کے سب سے بڑے فاضل اور ترجمان تھے۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں جمعیت

علماے اسلام قایم کی گئی اور مولانا عثمانیؒ کو اس کا صدر بنانے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ انھوں نے صدارت قبول نہیں کی تھی اور اس کے پہلے اجلاس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ لیگ کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے۔ لیگ نے انھیں جانشین شیخ الہند بنایا۔ شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کیا۔ انھوں نے لیگ کے جلسوں کو رونق بخشی۔ وہ خود لیگی نہیں تھے۔ جمعیت علماے ہند کے فارمولے کے معترف اور مؤید تھے۔ لیگ نے انھیں اغوا کرلیا تھا۔ ان کی زندگی کے وہ دن بہت گراں گزرے تھے، جب لیگ نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں انھیں اپنے ہی خواجہ تاشوں اور شاگردوں۔ کے سینے چیرنے کے لیے خنجر پکڑایا تھا، ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کو جب مملکت خداداد پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں ایک قاری صاحب قرآن حکیم کی تلاوت کے لیے اجلاس میں بیٹھے ہی رہے اور اجلاس شروع بھی ہوگیا۔ اور ناظم اسمبلی نے اپنی پہلی پالیسی تقریر ہی میں پاکستان کے لیے سیکولر طرز حکومت کا اعلان کر کے ان کے سینے پر خنجر چلایا تھا۔ وہ اگرچہ اس کے بعد بھی تقریباً ڈھائی برس زندہ رہے لیکن اس کا گھاؤ کبھی مُندمل نہ ہوا۔ دم سرد بھرتے اور اسی چھوڑی ہوئی دنیا میں لوٹ جانے کی تمنا کرتے تھے، لیکن اب وہ جس عالم میں تھے، ان کے بال و پر کتر دیے گئے تھے۔ آخر حیات میں وہ صوبہ سرحد میں گوشۂ عافیت تلاش کرنے اور اپنے دوستوں اور شاگردوں میں زندگی گزارنے کی آرزو رکھتے تھے، لیکن ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو وقت موعود آپہنچا اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے اور اعلیٰ علیین کی مبارک صحبتوں میں جا شریک ہوئے۔

❷ ابتدا میں عام اہلِ علم اور خصوصاً علما ''جینا'' استعمال کرتے تھے اور تعریضاً ہرگز نہیں۔ گجراتی زبان کا اصل لفظ ''جینٹر اں'' یا ''جینٹھرا'' تھا جو ''جناح'' بن گیا۔ آیئے

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

مسٹر محمد علی جناح کے والد کا نام جینٹر اں یا جینٹھرا تھا۔ ان کے والد کا نام پونجا اور ان کے والد کا نام میگھ جی ابن ہیر جی تھا۔ ناموں کے ساتھ باپ کے نام کا لاحقہ اور ''بھائی'' کا اضافہ گجرات بمبئی کے علاقے کی عام رسم تھی۔ مثلاً جناح صاحب کا پورا نام یہ تھا محمد علی جینٹر اں بھائی تھا اور ان کے والد کا پورا نام جینٹر اں پونجا بھائی تھا۔ ''بھائی'' کا لاحقہ لندن میں تعلیم کے زمانے میں خود اپنے نام سے نکلوا دیا تھا اور جینٹرا یا ''جینٹھرا'' ''جناح'' بن گیا۔ اس کی سرگزشت یہ ہے:

قاید اعظم کے جدامجد کا نام پونجا تھا۔ ان کے تین صاحب زادے تھے۔ وال جی، جینٹر اں

اور نھو۔ منجھلے صاحب زادے پیدائش کے وقت چوں کہ بہت دبلے پتلے اور کم زور تھے اس لیے دیکھنے والوں نے انھیں ''جھینا'' کہنا شروع کر دیا۔ گجراتی زبان میں جھینا کے معنی کم زور کے ہیں۔ اردو زبان میں بھی جھنا تقریباً انھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً جھنا کپڑا یعنی ایسا کپڑا جو باریک اور جھر جھرا ہو۔ بہ ہر حال لفظ جھینا نے کثرتِ استعمال سے جینا یا اور پھر جناح کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن حال ہی میں رضوان احمد صاحب نے قایداعظم کے والد کی تحریر کا جو عکس شایع کیا ہے اس میں ان کے نام کا املا انگریزی میں ایچ کے اضافے کے ساتھ یعنی Jinnah ہے۔ لیکن قایداعظم کے نام کے ساتھ ابتدا میں ''جنا'' بغیر ''ح'' کے ملتا ہے۔

جی الانا صاحب نے اپنی کتاب قایداعظم جناح۔ ایک قوم کی سرگزشت میں لکھا ہے کہ قائداعظم کے نام میں سندھ مدرستہ الاسلام کے دوران تعلیم مین تین مرتبہ تبدیلی ہوئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ مدرسہ اور کرسچن مشن اسکول کے ریکارڈ میں ان کا نام ''محمد علی جنا'' ملتا ہے۔ لیکن اس وقت تک ان کے نام کے ساتھ ''بھائی'' کا لاحقہ بھی جزو نام تھا۔ سندھ مدرسہ کے رجسٹر کے آخری اندراج میں جنا بھائی کا املا Jinna Bhoy ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جینئراں (جناح) کا لفظ قایداعظم کے والد کے نام میں شامل تھا اور اسی بنا پر ان کے نام کا جزو قرار پایا جیسا کہ شجرات میں عام طریقہ ہے۔

''بھائی'' کا لاحقہ قایداعظم نے اپریل ۱۸۹۶ء میں اس وقت ترک فرمایا جب انھوں نے لندن میں قانون کا امتحان دیا تھا۔ اردو اخبارات ۱۹۱۶ء تک بلا استثنیٰ ان کے نام کے ساتھ جینا استعمال کرتے تھے اور انگریزی اخبارات Jinna لکھتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جب قایداعظم مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے تو اس وقت سید سلیمان ندوی کی روایت کے مطابق حبیب جالب مرحوم ایڈیٹر ''ہمدم'' لکھنؤ کی ذہانت نے ''ح'' کے اضافے سے اسے جناح بنا دیا۔ اس کے بعد وہ اینا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد عام طور پر تو لفظ ''جناح'' استعمال ہوتا رہا لیکن خواص اہل علم کی زبان پر اس کے بعد بھی جینا ہی کا لفظ جاری رہا۔ غالباً اس کی وجہ جناح کا معنوی سقم ہوگا۔ جناح کوئی لفظ نہیں صحیح لفظ جُناح ہے جس کے معنی بازو کے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۶ء میں قایداعظم کی لکھنؤ آمد کے موقع پر جو

نظم لکھی تھی اس میں لفظ جینا استعمال کیا ہے ؎

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید

ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ۱۹۴۶ء کے اس انٹرویو میں ''جینا'' لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ یہ انٹرویو خواجہ عبدالوحید صاحب نے لیا تھا اور اسی زمانے میں لاہور کے ایک اخبار میں شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں قایداعظم کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ میں جو تعزیتی شذرہ لکھا تھا، اس میں بھی انھوں نے لفظ جینا استعمال کیا ہے۔ اس کے عنوان میں بھی یہی لفظ ہے یعنی ''قاید اعظم محمد علی جینا رحمتہ اللہ علیہ'' کسی جگہ نظر سے یہ بھی گزرا ہے کہ ''جنا'' یا ''جینا'' کو سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں نے ''ح'' کا اضافہ کر کے معرب کیا تھا، لیکن یہ حوالہ اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس لیے بالیقین اس امر پر اصرار نہیں کر سکتا۔ ناقابل تردید تاریخی شہادت یہی ہے کہ جنا سے جناح ۱۹۱۶ء میں سید حبیب جالب مرحوم نے بنایا تھا۔ اور اب صحیح اور معروف و مستعمل نام ''محمد علی جناح'' ہے۔ قایداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح انھیں پیار سے ''جن'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

اردو نامہ کراچی قایداعظم نمبر (اپریل ۱۹۷۷ء) کے مضمون نگار اعظم علی خاں نے جن کے دعوے کے مطابق قایداعظم ان ہی کی برادری (راجپوت) سے تعلق رکھتے تھے، پاکستان کے مشہور مورخ عشرت رحمانی کے حوالے سے قایداعظم کا نام اور شجرۂ نسب اس طرح لکھا ہے:

''محمد علی جنیڑاں بھائی ابن جنیڑاں بھائی ابن پونجا بھائی ابن میگھ جی ابن ہیر جی۔ محمد علی اپنے والد جنیڑاں بھائی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔''

عشرت رحمانی نے ایک نہایت مفصل مضمون صحیفہ لاہور کے قایداعظم نمبر میں لکھا ہے:

''قائداعظم کے والد بزرگوار کا نام جنیڑاں بھائی پونجا تھا۔ ''جنیڑان بھائی کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ (قائداعظم) کا خاندانی نام ''محمد علی جینھرا بھائی'' تھا لیکن سن شعور کو پہنچ کر انھوں نے لفظ ''جینھرا'' کو معرب کر کے جناح کر لیا۔''

(ماخذ: قائداعظم محمد علی جناح - حیات، افکار و خدمات، علم و آگہی۔ کراچی کا خصوصی شمارہ ۷۶-۱۹۷۵ء، صفحہ ۵۳-۲۵۱)

④ مولانا عثمانیؒ نے ایک اصولی بات کہی تھی لیکن جناح صاحب نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اُلٹا انھیں سے سوال کر دیا کہ "کیا ان لوگوں کو آپ کے زبانی پیغام پر اعتماد نہ ہوگا؟ بلاشبہ اعتماد تھا لیکن جماعتی کام اور دوسری جماعتوں سے رابطے کے کاموں کو ضابطے میں لانے کے لیے سوال و جواب بحث کے اہم نکات اور فیصلوں کو تحریر میں لانا اور روداد یں مرتب کرنی پڑتی ہیں۔ مولانا نے اصول کی خلاف ورزی پر کوئی تبصرہ نہیں فرمایا اور نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ لیکن جناح صاحب نے اصول پر عمل سے صاف کر کے فریق ثانی کو اطلاع دینے کی ذمے داری بھی انھیں پر ڈال دی۔ اس طرح انھوں نے جتا دیا کہ ان کی نظر میں مولانا کی حیثیت کیا ہے۔ مولانا نے فریق ثانی کو یہ نہ بتایا ہوگا کہ میں نے فریق اول سے کہا تھا کہ وہ خط اسے لکھ دیں، لیکن انھوں نے جواب دیا کہ "میں تحریری دعوت نامہ نہیں دے سکتا" اس میں ان کی شخصیت کی توہین کا پہلو نکلتا تھا! حال آں کہ اگر وہ کہہ بھی دیتے تو حضرت مفتی صاحب اپنے خواجہ تاش کی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے استاد کی لاج رکھنے کے لیے ملاقات سے انکار ہرگز نہ کرتے۔

اور ایک اصول کے مطابق اگر وہ دعوت نامے کے بغیر ملاقات سے انکار کر دیتے تو سوچیے کہ مولانا عثمانیؒ کی کتنی توہین ہوتی کہ اتحاد و اتفاق کے قیام کے لیے جان دینے کو بھی تیار ہیں لیکن افسوس کہ خود ان کے محبوب لیڈر کو بھی ان پر اعتماد نہیں!

⑤ فریق اول نے معاہدے وجود میں آتے ہی ایک غیر طے شدہ بات کو شرط قرار دے دیا۔ مولانا عثمانیؒ کو اس پر حیرانی ہوئی لیکن افسوس ہوتا ہے کہ اس عہد شکنی میں وہ دونوں فریقوں کو یک ساں طور پر ذمے دار قرار دیتے ہیں؟ اور فریق ثانی سے توقع رکھتے ہیں کہ اسی نے عہد شکن کی بات کیوں نہ مان؟ واہ! کیا خوب انصاف ہے حضرت مولانا کا؟

دراصل ہمیں مسٹر جناح کے رویے پر ہرگز تعجب نہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے سوا کسی دوسری جماعت کو خواہ وہ جمعیت علماے ہند ہو خواہ مجلس احرار اسلام ہند ہو، مسلمانوں کی نمایندہ جماعت تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ کسی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا عثمانیؒ کے اصرار سے وہ آمادہ ہو گئے تھے۔ آخر کار انھوں نے وہی کیا وہ چاہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا لدھیانوی کو اس عہد شکنی پر کوئی تعجب نہ ہوا ہوگا لیکن مولانا عثمانیؒ نے پھر بھی نہ سوچا کہ لیگ کے رہنما کی نظر میں ان کی کتنی وقعت ہے؟

۳

مرقعۂ عبرت

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی داستان عزیمت دعوت

ایک

سبق آموز باب

مرتب و مدون

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

فہرست

حرفِ چند

آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ملک کی سیاسی رہنمائی اور مسلمانوں کی تربیت کے لیے، تاکہ وہ اپنی نمایندگی کے لیے صحیح فکر اور پختہ سیرت کے لوگوں کو منتخب کریں، ملک کا طوفانی دورہ شروع کیا، اور سی پی اور بمبئی کے سوا... ملک کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جس کے اہم شہروں سے لے کر قصبوں تک حضرت بنفسِ نفیس تشریف نہ لے گئے ہوں، اور اپنی زبان مبارک سے نصح وہدایت کا فریضۂ شرعی و ملی ادا نہ کیا ہو، جہاں حضرت کی آوازِ حق نہ پہنچ سکتی تھی وہاں کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے حضرت نے متعدد رسائل تحریر فرمائے، اور بعض شخصیات کو مفصل خطوط لکھے، جن کی حیثیت رسائل کی سی تھی اور وہ کتابچوں کی شکل میں شائع بھی ہوئے،

دوسرے حضرات نے بھی حالات کی نزاکت اور وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مختلف مسائل و مباحث کے بارے میں بہت سے چھوٹے بڑے رسالے اور کتابچے لکھے، مقالے تیار کیے، اور اخباروں میں مضامین لکھے، یہ حضرت ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا، لیکن اس سلسلہ میں حضرت شیخ الاسلام کا کام بہت اہم اور جامع الاطراف تھا، اور کام کی اہمیت کے اعتبار سے آپ کے راستہ میں سب سے زیادہ مشکلات پیش آئیں، اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا،

جب کوئی شخص حالات کے دھارے میں بہنے سے انکار کر دیتا ہے، اور اپنے فہم و بصیرت کے مطابق روشِ عام سے الگ اپنی راہ نکالتا ہے تو مشکلات کا

پیش آنا ناگزیر ہے، لیکن یہاں اس کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ مسلم لیگیوں نے اختلاف میں اخلاق و شرافت کے رویہ کو ترک کر دیا تھا، وہ حد سے گذر گئے، کسی ایک جگہ اور کسی ایک شخص سے اگر کوئی نازیبا فعل سرزد ہوتا تو اسے شخصی فعل، وقتی اشتعال، نادانی و نالائقی اور محض اتفاقی کہہ کر نظر انداز کر دیا جا سکتا تھا لیکن یہ اخلاق و تہذیب کا ابتلائے عام تھا، یہ لیگی تربیت کا فساد تھا، جو ملک میں پھوٹ پڑا تھا، اور اخلاق و شرافت کے خلاف واقعات کا ایک سیلابِ عظیم تھا جو بنگال و بہار اور یوپی سے کشمیر و پنجاب تک پھیل گیا تھا، اور جن اخلاقِ شنیعہ کے عام لیگی مرتکب ہو رہے تھے، اُن کے رہنما اُن کے لیے ان کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے، جب وہ کسی بیہودگی کا مظاہرہ کرتے تو اس پر خوشی کا اظہار کرتے، اس سے عام لیگیوں کو مزید شہ ملتی، اور وہ اخلاق و تہذیب و شرافت کی حدود سے گزر جاتے، حکومت ان کی پشت پناہ تھی، وہ لیگیوں کی غنڈہ گردی روکنے کی کوشش نہ کرتی، اور بعض جگہ وہ ان کے طوفانِ بدتمیزی کے سامنے بے بس بھی ہو گئی تھی،

لیگیوں کے اخلاق کا دیوالیہ ہو جانا صرف ۱۹۴۵ء میں انتخاب قریب آجانے کی وجہ سے نہ تھا، ۱۹۴۰ء کے بعد اس کا یہ اندازِ سیاست رفتہ رفتہ عام ہو گیا تھا، چنانچہ جمعیۃ علماء کے اجلاس لاہور سے قبل بھی ان کے اخلاق سے متعدد بار شکایات پیدا ہو چکی تھیں، جمعیۃ علمائے ہند کا تیرھواں اجلاس لاہور میں ہوا تھا، ۲۰ر مارچ ۱۹۴۲ء کو اجلاس شروع ہوا، اجلاس کے موقع پر بجلی کاٹ دی گئی، ہلڑ بازی شروع کر دی گئی، اور ٹھیک حضرت شیخ الاسلام کے خطبۂ صدارت پڑھنے کے دوران ہنگامہ برپا کیا، اس موقع پر حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہمت مردانہ اور اسد اللّٰہی للکارنے اور رضاکارانِ احرارِ اسلام کے جاں فروشانہ جذبہ نے حالات کو پرسکون کیا تھا، مولانا قاضی

زاہد الحسینی نے حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں اپنی بے نظیر تالیف "چراغ محمدؐ" میں اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے، پھر مسلم لیگ جیسے جیسے ہندوستان کے مسلمانوں میں جڑیں پکڑتی گئی اس کے رہنماؤں کی زبان درازیاں اور اس کے کارکنوں کی دراز دستیاں بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ کسی عالم دین کی جس نے مسلم لیگ کی سیاست یا اس کے کسی صغیر و کبیر کے بارے میں زبان کھولنے کی جرأت کی اس کی عزت و آبرو محفوظ نہ رہی، مولانا ابوالکلام آزاد کا شہرہ، ان کے تحمل و بردباری اور ضبط و برداشت میں ضرب المثل سا ہوگیا ہے، لیکن ان کی زبان سے بھی نکل ہی گیا، خواہ اضطرار کے عالم ہی میں کیوں نہ نکلا ہو، کہ "میرے دامن کو تمھاری دراز دستیوں کا گلہ ہے"،

مولانا آزادؒ کی زبان سے اضطرار کے عالم میں جو جملہ نکلا تھا اس سے ان کا مقام عزیمت کم نہیں ہو جاتا، لیکن حضرت شیخ الاسلام کا مقام عزیمت اکابر میں سب سے بلند ہے، حضرت کے مقام عزیمت اور حق سے آپ کے عشق کا عالم نرالا تھا، حضرت نے نہ تو کسی شخص کو دست درازی پر روکا، اور نہ اپنے جاں نثاروں کو اپنے دفاع کی اجازت دی، حالانکہ وہ یہ بازی جیت سکتے تھے، اور اگر نہ جیت سکتے تو سر دے کر حضرت حق پر قربان ہو جانے کی رسم عاشقی تو ادا کر ہی سکتے تھے، لیکن حضرت نے تو جور و ظلم کے تمام تیروں کے لیے اپنے سینۂ مہبط انوار نبوی کو مخصوص کر لیا تھا، انھوں نے ہر جور و زیادتی کو منجانب اللہ اور راہ حق میں آزمائش سمجھ کر بخوشی برداشت کر لیا، اور اپنے جاں نثاروں کو سبق سکھا گئے کہ خدمت حق کی راہ پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بچھونا ہے،

لیگیوں نے سارے ہندوستان میں تمام علمائے حق، اُن کے ہمدردوں اور اپنے تمام مخالفین کے ساتھ یہی ظلم روا رکھا تھا، علیگڑھ اور کشمیر میں

مولانا آزاد کے ساتھ، کلکتہ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ساتھ، بنگال وبہار میں، سید پور اور بھاگل پور میں اور پنجاب میں امرتسر اور جالندھر کے اسٹیشنوں پر حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ، بریلی، شاہجہانپور، لاہور اور بیسیوں جگہوں پر جمعیت کے جلسوں میں، نیز دیگر حریت پرست جماعتوں کے رہنماؤں اور ان کے جلسوں میں بے شرمی اور بے حیائی کے جو مظاہرے اور جو اخلاق سوز حرکتیں انھوں نے کی تھیں اگر ان سب واقعات کو تفصیل کے ساتھ مرتب کر دیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے، لیکن یہاں حضرت شیخ الاسلامؒ کے بہار، بنگال اور پنجاب میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے مرتکبین کے عبرتناک انجام کی بعض تفصیلات کو مرتب کیا جاتا ہے،

اس سلسلہ میں اولاً واقعات وہ ہیں جو ۲۶ ستمبر اور ۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے درمیان بہار و بنگال کے سفر کے موقع پر پیش آئے تھے، یہ واقعات ہم تک مولانا ریاض الدین احمد سید پوری اور مولانا محمد طیب بھاگل پوری کی روایت سے پہنچے ہیں، دونوں راوی مستند ہیں، اور چونکہ دونوں راویوں کے بیان میں بعض واقعات میں ایک دوسرے سے زیادہ تفصیل ملتی ہے، اس لیے اس مجموعہ میں دونوں کو جمع کر دیا ہے،

مولانا ریاض الدین احمد کے بیان کردہ واقعات کو حکیم محمد ظفر احمد خاں ناظم جمعیۃ علماء علاقہ نمبر ۱۱ دہلی، ناظم نشر و اشاعت سینٹرل مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے اسی زمانہ (اواخر ۱۹۴۵ء) میں مرتب کر کے چھپوا لیا تھا، مولانا محمد طیب بھاگلپوری کی روایت میں جو واقعہ اور اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ انھوں نے مولانا محمد میاںؒ کے نام ایک خط میں تحریر کی تھیں، مولانا نے یہ تفصیلات اپنی تالیف لطیف "حیاتِ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ" میں مرتب کر دی تھیں،

اس مجموعہ کے لیے انھیں اخذ کرلیا ہے،

اس کے ساتھ دو مضامین، ایک بیان اور ایک اداریہ بھی ہے،

۱۔ پہلا مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ہے، جو اُن کے اخبار "ہند" میں چھپا تھا، مولانا حکیم محمد ظفر احمد خاں نے اپنے کتابچہ میں شامل کرلیا تھا،

۲۔ دوسرا مضمون مولانا محمد کفیل بجنوری کے قلم سے ہے، جو انھوں نے روزنامہ "حقیقت" میں شائع کرایا تھا، اور مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ نے اسے اپنی تالیف مذکورۃ الصدر میں نقل کیا ہے،

۳۔ تیسرا مضمون مفتی محمد نعیم لدھیانوی کا بیان ہے، جو اخبارات میں چھپا تھا، خاکسار نے اسے ہفت روزہ "زمزم" لاہور مورخہ ۳ر نومبر سنہ ۱۹۴۵ء سے اخذ کیا ہے،

۴۔ مولانا دین محمد وفائی کراچی کے ایک عالم اور صحافی تھے، انھوں نے ان واقعات سے متاثر ہوکر اپنے رسالہ میں ایک اداریہ لکھا تھا، اس مجموعہ میں یہ اداریہ بھی شامل کرلیا ہے،

پنجاب میں پیش آنے والے شرمناک واقعہ کی تفصیل اور اس واقعہ کے کے مرتکبین کے عبرتناک انجام کی تفصیلات میں مضمون حضرت مخدوم ومکرم مولانا سید نفیس شاہ صاحب حسینی کے قلم سے ہے، حضرت شاہ صاحب ہمارے اکابر کی نشانی اور اپنے اخلاق وتقویٰ میں اسلافِ کرام کی یادگار ہیں، انھیں حضرات دیوبند وراۓ پور سے متعدد نسبتیں ہیں، خاکسار گنہگار کو حضرت مدظلہ سے ایک نسبتِ ارادت ہے، اس واقعہ کی صحت اور درجۂ استناد کے لیے یہ بات بس کرتی ہے کہ حضرت موصوف مدظلہ نے اسے مستند راویوں کے حوالہ سے مرتب فرمایا ہے، خاکسار کی نظر سے یہ تحریر ماہنامہ "النصیحت" چارسدہ (بابت ماہ

رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ) میں گذری تھی، ملتان کے ایک اصلاحی و تبلیغی سلسلۂ اشاعت کے ایک کتابچہ کی صورت میں بھی سامنے آئی، اور اب حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی نے حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں اپنی لاجواب تالیف "چراغِ محمدؐ" میں نقل کی ہے، اب یہ سبق آموز تحریر اس مجموعہ میں جگہ پا رہی ہے،

اب بنگال، پنجاب اور بہار میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے مرتکبین کے عبرتناک انجام کو اس مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا جا رہا ہے، میرے پیش نظر اس کے کئی فوائد ہیں؛

۱۔ اس کے مطالعہ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کی اسلامی سیرت کا نقش اجاگر ہوتا ہے، ایک پختہ و پاکیزہ اسلامی سیرت کا مطالعہ فی نفسہ ایک بڑا اور مؤثر ذریعۂ تربیت و تہذیب ہے،

۲۔ تاکہ عظیم دیوبند کے انقلابی سلسلۂ دعوت و عمل سے نسبت رکھنے والے تاریخ کے طالب علم اور سیاست کا ذوق رکھنے والے جان سکیں کہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی جدوجہد میں ہمارے بزرگ مشکلوں اور ابتلاؤں کے مرحلوں سے گذر کر آزادی کی منزل تک پہنچے ہیں،

۳۔ اس کے پڑھنے سے یہ پتہ چلے گا کہ ہمارے بزرگوں نے مصائب کی کٹھنائیوں میں اضطراراً بھی اپنے مخالفین کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جو اسلامی اخلاق و شرافت کے خلاف ہو،

۴۔ ایک فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ ان سبق آموز واقعات اور عبرت خیز انجاموں کو پڑھ کر کوئی گم کردہ راہ آئندہ کسی بزرگ کی شان میں گستاخی اور اس کے عبرتناک انجام سے بچ جائے، اور یہ مجموعہ اس کے لیے عبرت کا مرقع

اور چراغِ ہدایت ثابت ہو، اور

۵۔ اب اگر کوئی جماعت خدمتِ حق کے میدان میں قدم رکھتی ہے تو یہ بات ان سے پوشیدہ نہ رہے کہ انھیں اس میدان میں صعوبتوں اور آزمائشوں کے کون کون سے مشکل مقامات پیش آسکتے ہیں،

امید ہے کہ یہ مجموعہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے عقیدتمندوں، جمعیۃ علماء ہند اور جمعیۃ علماء اسلام (پاکستان) اور تاریخ سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں میں پسند کیا جائے گا،

آخر میں ایک رسالہ "مقامِ مولانا مدنی" شامل ہے امید ہے، ارادت مندانِ استانۂ مدنی اس کے مطالعے سے خاص طور پر لطف اندوز ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان بزرگوں کے مراتب بلند فرمائے، اور ہم کو اُن کے اخلاف اور نام لیواؤں کو ان کے اسوۂ عالیہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین،

ابو سلمان

۱۳ر نومبر ۱۹۹۶ء

پہلا رسالہ

شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

پر لیگیوں کا شرمناک حملہ

اور

قدرت کی جانب سے اس کا عبرتناک انتقام

از قلم

مولانا ریاض الدین احمد

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

پیش لفظ

جب سے ہندوستان کی سات[1] با اقتدار مسلم جماعتوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی زیرِ صدارت آنے والے انتخابات میں اپنے ٹکٹ پر امیدواروں کو کھڑا کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا ہے ہمارے لیگی دوست اپنا دماغی توازن بالکل ہی کھو بیٹھے ہیں، وہ دلائل سے اپنی بات منوانے کے بجائے گالیوں، لاٹھیوں اور چھروں سے ان کے جلسوں میں اور اسلام کے ان مجاہدین پر حملے کر رہے ہیں جن کی پاک زبانیں ان بیچارے لیگیوں کے سامنے تو کیا بڑی سے بڑی ظالم و جابر سلطنتوں کے جاہ و جلال کے سامنے بھی کلمۂ حق کہہ دینے سے آج تک نہیں رُکیں،

سید پور میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کو قتل کر ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور اُن کے ساتھی دس بارہ علماء کو لاٹھیوں، چاقوؤں اور ہنٹروں سے مار مار کر بُری طرح زخمی کر دیا گیا، دہلی اور علی گڑھ میں امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد پر حملے کیے گئے، کلکتہ میں مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی پر چھرے سے حملہ کر کے ان کو زخمی کر دیا گیا، بھاگلپور میں شیخ الاسلام پر جبکہ وہ موٹر میں بیٹھے ہوئے تھے پیچھے سے چاقو کا وار کیا گیا، گیا میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو گھیر کر مارنے کی کوشش کی گئی، ـــــ یہ اور اسی قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جو روزانہ اخبارات میں آتے رہتے ہیں، ـــــ انہی واقعات میں سے ایک عبرت خیز واقعہ وہ ہے جسے آج ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ سانحہ حضرت شیخ الاسلام

---

[1] آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند، آل انڈیا مسلم مجلس، آل انڈیا مومن کانفرنس، انڈیپینڈنٹ پارٹی بہار، کرشک پرجا پارٹی بنگال، انجمن وطن بلوچستان اور خدائی خدمت گار سرحد،

مولانا سید حسین احمد مدنی کے ساتھ سید پور میں پیش آیا ہے، اس سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ ہمارے وہ مسلمان بھائی جو ہمارے مقاصد سے متفق ہیں اور ہمارے کام میں شریک ہیں وہ جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس سچے جانشین کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور اس راہ میں پیش آنے والی سختیوں پر حلم اور صبر وضبط کی مثال مثال کو اپنے سامنے رکھیں، اور ان اشتعال انگیز واقعات سے مشتعل ہونے کے بجائے اس مقدس کام کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں جس کے لیے آج حسین احمد گالیوں، لاٹھیوں اور پتھروں کا نشانہ بنا ہوا تنِ تنہا باطل کے سامنے اپنا سینہ تانے اعلانِ حق کر رہا ہے،

یہی ہے مؤثر جواب اس غنڈہ گردی اور اشتعال انگیزی کا جو لیگ کے ہر چھوٹے بڑے نے اپنی انتہائی بداخلاقی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں رسوا کرنے کے لیے شروع کر دی ہے،

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کو لیگ کے دامِ فریب سے نکالنے کے لیے اپنی ہر اس صلاحیت اور قابلیت کو بروئے کار لے آئے جو خدا نے اس کو دی ہے، اور لیگ کی اسلام کُشی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کے لیے اخلاقی حدود میں رہ کر جو کچھ اس سے بن سکے کر گذرے،

حکیم ظفر احمد خاں

ناظم جمعیۃ العلماء، علاقہ نمبر ۱۱، دہلی

(۱)

مولانا ریاض الدین احمد صاحب جو اس واقعہ کے راوی ہیں سید پور (بنگال) کے ایک بڑے رئیس اور بنگال کے ایک بڑے مصلح ہیں، بنگال میں نام نہاد صوفیوں کی ایک بہت بڑی جماعت "باؤل نیڑا اڑ فقیر" کے نام سے پھیل گئی تھی، اور اسلام کے دعوے کے ساتھ قطعاً لامذہب تھی، یہ لوگ کسی چیز کو بھی حرام نہیں سمجھتے تھے، حتیٰ کہ پیشاب پیتے اور غلیظ نک کھاتے تھے، مولانا ریاض الدین صاحب نے اس جماعت کے ساتھ جہاد کیا، اور اس کا قلع قمع کر ڈالا، اسی جہاد کے لیے مولانا نے ۱۹۲۶ء میں علماء کا ایک بہت بڑا جلسہ سید پور میں کیا جس میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بھی شریک ہوئے، مولانا ہی کی تجویز سے سید پور میں عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا گیا،

مولانا ریاض الدین صاحب نے دارالعلوم کے لیے اپنی زمین دی اور بیشمار روپیہ خرچ کیا، اس کے بعد سے مولانا مدنی برابر سید پور تشریف لے جاتے ہیں اور مولانا ریاض کے مہمان ہوتے ہیں، اس دفعہ بھی تشریف لے گئے تھے،

(روزنامہ ہند، کلکتہ)

اخباروں میں یہ خبر آچکی ہے کہ سید پور (بنگال) میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی پر مسلم لیگیوں نے حملہ کیا تھا، لیکن اخباروں میں جو کچھ چھپا ہے اصلیت سے بہت ہی کم ہے، یہ واقعہ اس قدر بھیانک، اس قدر شرمناک اور اس قدر عبرت انگیز ہے کہ اسے مسلمانوں کے سامنے بغیر کسی کمی بیشی کے لے آنا ضروری ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ مسلم لیگ والے اسلامی اخلاق اور انسانی شرافت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں، میں اس حد درجہ افسوسناک حادثہ کا شاہد،

عینی ہوں، بلکہ اس بپتا کا ایک شکار بھی ہوں، لہٰذا سب مسلمانوں سے درخواست ہے کہ اس درد بھری کہانی کو دل سے سنیں، اور خون کے آنسوؤں کے ساتھ پڑھیں حادثہ حسب ذیل ہے:۔

شمالی بنگال میں ڈومر ریلوے اسٹیشن کے قریب "ہونارآئے" نام کا ایک گاؤں ہے، اس گاؤں کے ایک معزز باشندہ مولوی محمد احسان الحق آفندی سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو نہایت محبت تھی، آفندی موصوف کا کئی ماہ ہوئے انتقال ہوگیا، اور حضرت مولانا نے اُن کی تعزیت کے لیے وہاں تشریف لانا چاہا،

حضرت نے ۲۵ ستمبر کو مجھے تار دیا کہ میں ۲۶ ستمبر کو کٹھیار پہنچوں گا، میں نے اپنے لڑکے مولوی صالح کو ان کی خدمت کے لیے بھیج دیا، لڑکے نے مجھے کٹھیار سے تار دیا کہ مولانا ۲۸ ستمبر کو سید پور رہتے ہوئے ڈومر تشریف لے جائیں گے، مولانا سید پور پہنچے، اور میں ان کے ساتھ ہوگیا، ہم سب ۵ بجے ڈومر اسٹیشن پہنچے، یہاں ہم نے عصر کی نماز پڑھی اور سونار پور پہنچ گئے،

حضرت مولانا کی آمد کی خبر سُن کر بہت آدمی آفندی مرحوم کے مکان پر پہنچ گئے تھے، مرحوم کے بچے حضرت مولانا سے لپٹ کر باپ کی جُدائی پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، نظارہ بڑا ہی دردناک تھا، مولانا کی آنکھیں بھی بہہ نکلیں پھر بچوں کو تسکین دی اور حاضرین سے فرمایا:

میں یہاں صرف آفندی مرحوم کے گھر سے اور سید پور کے دارالعلوم کی دعوت پر آیا ہوں، اس کے سوا میرا کوئی پروگرام نہیں ہے، یہاں اس مجمع میں گوڑ گاؤں کے بھی کئی عزیز آئے ہوئے ہیں، یہ لوگ ایک سال سے مجھے اپنے یہاں بلا رہے ہیں مگر میرے پاس وقت نہیں، میں کسی جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتا، کل میں

سید پور چلا جاؤں گا، اور وہاں کی دعوت میں شریک ہو کر ۳ ستمبر کو دیوبند روانہ ہو جاؤں گا۔"

مگر گوڑگاؤں کے لوگوں نے بہت اصرار کیا، کہ ہمارے یہاں ضرور تشریف لے چلیے، حضرت مولانا اخلاق و مروت کا نمونہ ہیں مجبور ہو گئے، اور مجھ سے فرمایا اچھا تو پھر آج ہی رات کو ٹرین سے سید پور چلیں، اور وہاں سے فارغ ہو کر میں صبح کو گوڑگاؤں چلا جاؤں گا، اور دن بھر وہاں رہ کر شام کی ریل سے دیوبند روانہ ہو جاؤں،

ڈومر کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے پر مولانا کو مجبور کیا گیا، آپ نے ہندو مسلمان اتفاق پر تقریر کی، اس کے بعد سات بجے کی ٹرین سے سید پور روانہ ہوئے، سید پور اسٹیشن کے پلیٹ فارم کے قریب جب گاڑی پہنچی تو بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں، میں نے اپنے ساتھیوں سے انتہائی تعجب سے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی جلسہ جلوس نہیں ہے پھر یہ ہجوم اور شور کیسا ہے؟ جلسہ ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ دار العلوم کی عمارت کو فوج نے چھاؤنی بنا دیا ہے،

پلیٹ فارم پر جب گاڑی رکی تو دیکھا بہت بڑی بھیڑ ہے، اور دیوانہ وار نعرے لگا رہی ہے "قائد اعظم زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان زندہ باد" ہمارے دار العلوم کے کچھ طلباء اور بعض دوسرے آدمی مولانا کو لے جانے کے لیے بیل گاڑی لائے تھے، وہ بھی پلیٹ فارم پر آگئے،

اب مولانا نے جیسے ہی پلیٹ فارم پر پاؤں رکھا، ۶، ۷ سو آدمیوں نے اپنی پوری قوت سے وحشیانہ حملہ اس نائب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کر دیا، اسٹیشن کے پل پر سے ایک شخص نے بھونپو کے ذریعہ سے چلانا شروع کیا، جلدی آؤ، دوڑو آ گیا ہے، وہ غدار مولانا،

اس آواز پر ہر طرف سے نہ جانے کتنے آدمی ٹوٹ پڑے، ہمارے مٹھی بھر آدمیوں نے حضرت مولانا کو اپنے گھیرے میں لے لیا، مگر غنڈوں کا انبوہ ٹوٹ پڑا، سب، چلا رہے تھے "گرا دو بے ایمان کو، اپنے پیروں سے روند ڈالو، بوٹی بوٹی کاٹ لو جہنم میں پہنچا دو"

میں، میرا لڑکا اور چند آدمی مولانا کو اپنے بیچ میں لیے ہوئے تھے، لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مولانا پر کوئی ضرب نہیں پڑی، سب وار ہمارے آدمیوں نے روکے اور بری طرح زخمی ہو گئے،

اس قلیل جماعت پر خدائے تعالیٰ ہی کا فضل تھا کہ غنڈوں کے اتنے بڑے مجمع کو چیرتی پھاڑتی مولانا کو بیل گاڑی تک صحیح سلامت لے آئی، گاڑی پر میں بھی مولانا کے ساتھ بیٹھ گیا، گاڑی چلنے ہی کو تھی کہ پھر ہجوم نے گاڑی پر حملہ کیا، گوبر اور کیچڑ پھینکنے لگے، کچھ نے گاڑی پر چڑھ کر مولانا کے سر پر لاٹھیاں مارنے کی کوشش کی، اور مولانا کے سر کی ٹوپی اتار کر جوتوں کے نیچے رکھ کر کہنے لگے "تم ہندو کے غلام ہو،" پھر ان کی ٹوپی اور ہمارے طلباء کی ٹوپیاں چھین کر جلا دیں،

غنڈوں نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ انھوں نے مولانا کا دامن پکڑ کر گاڑی سے گھسیٹنے کی کوشش کی، ان لوگوں کا ارادہ تو یہ تھا کہ مولانا کو مع گاڑی کے کسی ایسی ویران جگہ لے جا کر ختم کر دیں جہاں پرندہ بھی پر نہ مارتا ہو، لیکن بفضلہ تعالیٰ ہمارے طلباء کی سرفروشی نے مولانا کو آنچ بھی نہ آنے دی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ ہمارے طلباء خون میں نہا گئے،

تھانہ اگرچہ نزدیک تھا، باوجود اس کے کسی نے اس خطرناک صورت کی تھانہ میں اطلاع نہ دی، اس وقت تھانہ میں جو چھوٹے داروغہ صاحب موجود تھے انھوں نے بڑے داروغہ صاحب کو خبر کی، اور بڑے داروغہ ہماری

گاڑی کے پاس آئے، اور ہمیں السلام علیکم کہا، اس کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے ان سے بیان کیا کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی برابر ۳۰ سال سے ہمارے یہاں آتے رہے ہیں، اور آج بھی وہ ہمارے دو لڑکوں کے بلانے پر جو دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں یہاں آئے ہیں، مولانا کا پروگرام کوئی سیاسی جلسہ کرانے کا نہیں ہے بلکہ وہ دعوت کے بعد کل صبح کی ٹرین سے روانہ ہو جائیں گے،

داروغہ صاحب نے ہماری بات مان لی، پھر ہجوم کے درمیان کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے مولوی صاحب: اس وقت صورتِ حال بہت خراب ہے، آپ لوگ ویٹنگ روم میں قیام کیجیے، میں تھانہ جاکر سپاہی لاتا ہوں، ہمارے ساتھی گاڑی کو کھینچ کر ویٹنگ روم تک لائے، اور میں مولانا کو لے کر ویٹنگ روم میں آ گیا،

ابھی ہم لوگ ویٹنگ روم میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ غنڈوں کے ہجوم نے ویٹنگ روم کو گھیر لیا، ہم لوگوں نے فوراً ویٹنگ روم کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں، کہ مبادا دشمن پتھر اور اینٹیں چلائیں،

تھوڑی دیر کے بعد پلیٹ فارم پر داروغہ صاحب تشریف لائے، اور مجھے بلا کر بہت ہی افسردہ لہجہ میں فرمایا کہ اس وقت صورتِ حال ایسی خطرناک ہے کہ میں مولانا کو ویٹنگ روم سے باہر لانے کی اجازت نہیں دوں گا، مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے اور نہ ہی میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ مولانا کو آپ کے گھر تک پہنچا سکوں گا، اگر آپ اپنی ذمہ داری پر مولانا کو اپنے گھر لے جا سکیں تو لے جائیے میں آپ کا ساتھ دوں گا، میں داروغہ صاحب سے ناامید ہو گیا،

اب "نیو ورکشاپ" کے بڑے صاحب کو فون کیا، وہ آ گئے تو میں نے

ان سے تمام واقعات صحیح طور پر شروع سے آخر تک بیان کر دیئے، انھوں نے ہماری مدد کا وعدہ کیا، اور کہا کہ میں ضرور مولانا کو تمھارے گھر تک پہنچا دوں گا، ابھی ہم نے گفتگو ختم بھی نہیں کی تھی کہ پلیٹ فارم کے مغربی جانب سے آدمیوں کا ہجوم لاٹھیاں لیے "اسلام زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا آیا، بڑے صاحب ہجوم میں گھس گئے، اور میں کھڑا ہو کر غنڈوں کا تماشا دیکھ رہا تھا، کہ دوسری جانب سے آواز آئی کہ اس ہندو کتے کو کاٹ لو، ڈاڑھی نوچ ڈالو، اور ناک میں رسی ڈال کر زمین پر گھسیٹو، بڑے صاحب کو غنڈوں کی اس بدتمیزی پر غصہ آگیا، اور آدھ گھنٹہ سے زائد ہجوم کے سامنے تقریر کی، اور کہا: "میں دلی اور لکھنؤ میں کئی برس رہا ہوں، میں مولانا کی شخصیت کو خوب جانتا ہوں، یہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے پیشوا ہیں، تم ان کو تکلیف نہ پہنچاؤ، مولوی صاحب کے گھر دعوت میں جانے دو، تم لوگ پاکستان کی بکار لگاتے ہو، کیا تمہیں پاکستان آپس میں کشت و خون کر کے حاصل ہو جائے گا؟ پاکستان حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے، کہ تم تشدد پر اُتر آؤ، تمھیں چاہیے کہ تم اپنے اخلاق سے مخالف پارٹی کو جیتو، ان کے سامنے پاکستان کے فوائد بیان کرو، اگر تمھارا طریقہ تشدد کا ہی رہا تو ایک نہ ایک دن تمھارے سب بھائی تمھاری جماعت سے علیحدہ ہو جائیں گے، اور تم پاکستان حاصل کرنے میں ناکامیاب ہو جاؤ گے"۔

لیکن باوجود ایسی مؤثر تقریر کے غنڈوں کے دل نرم نہ ہوئے، اور کہنے لگے کہ یہ اسلام کا دشمن ہے، ہم اس کو اسٹیشن سے باہر قدم نکالنے نہ دیں گے، بڑے صاحب نے دیکھا کہ ان باتوں کا غنڈوں پر کوئی اثر نہیں ہے، تو انھوں نے کہا کہ تم لوگ نشہ شراب پی کر مستیاں کرتے ہو تم نے اپنا ادب شیطنت سے بھر رکھا ہے، تم چاہتے ہو کہ ایک شریف آدمی کو جان سے مار ڈالو، اس کے بعد بڑے صاحب ہمارے پاس آئے، اور کہا کہ یہ غنڈوں کی جماعت

ہے، میں بھی داروغہ صاحب کی طرح مولانا کو ایسے غنڈوں کے لیسے بڑے مجمع سے نکال کر آپ کے گھر تک لے جانے کی ہمت نہیں رکھتا، اور یہ کہہ کر اُلٹے پاؤں لوٹ گئے،

میں مایوس ویٹنگ روم میں مولانا کے پاس آیا اور سارا قصہ بیان کر ڈالا، مولانا نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آج جو سانحہ میرے ساتھ پیش آیا ہے اس قسم کا واقعہ ہندوستان کے سورماؤں کے ساتھ برابر ہوتا چلا آرہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا، اب وہ دن بھی دور نہیں کہ اس سے زیادہ خطرناک قسم کا حادثہ ہندوستان کے دیگر مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والا ہے، اس چیز کو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے، اس وقت ایک شخص نے آکر مولانا کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا جو کٹھیار سے آیا تھا، اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد مولانا نے کہا کہ یہ خط کٹھیار سے آیا ہے، اس وقت تم لوگ مجھے کٹھیار اس میل سے جانے دو، انشاء اللہ میں پھر تم لوگوں سے جلد ہی ملاقات کرونگا۔

اس کے بعد فوراً ہی میل آگیا، اور ہم لوگوں نے ہجوم کو چیر کر حضرت مولانا کو گاڑی میں بٹھا دیا، غنڈوں سے جب کچھ نہ ہوسکا تو گالیوں پر اُتر آئے، اور اپنی جوتیاں دکھا کر مولانا کو یہ کہتے رہے کہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو آئندہ پھر اس میں قدم نہ رکھنا، او بے شرم! غنڈے مولانا، دفع ہو، دور ہو یہاں سے،

انہی گالیوں میں مولانا کی گاڑی روانہ ہوگئی، اور مولانا رات کو ۸ بجے سے لے کر ۱۱ بجے تک جارحانہ حملوں کا نہایت ہی سکوت اور تحمل سے مقابلہ کر کے رخصت ہوگئے، میرے دونوں لڑکے اور کئی آدمی مولانا کے ساتھ پاربتی پور تک گئے، اس حال میں بھی غنڈوں نے مولانا کا پیچھا نہ چھوڑا، پاربتی پور کے اسٹیشن پر ان لوگوں نے میرے لڑکوں سے کہا کہ اگر مولانا نے پاربتی پور میں بھی دیر لگائی تو ہمارے ساتھی جو تین ہزار کی تعداد میں یہاں موجود ہیں پہنچ جائیں گے، اور پھر مولانا کو ان سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگا، غنڈوں کی اس دھمکی سے

لڑکوں پر کیا اثر ہوتا، لیکن مولانا کو تو یہاں ٹھہرنا ہی نہ تھا، لہٰذا وہ کٹھیار پہنچ گئے،
اس سازش میں سید پور کے ورکشاپ کے اپ کنٹری کے لوگ اور شہری لوگ
شریک تھے، ان لوگوں کی تعداد کم وبیش تین ہزار تھی،

میں مولانا کو رخصت کرکے پچھلی رات کو اپنے گھر پہنچا، صبح ہوتے ہوتے
سید پور کے شہر اور دیہات میں اس سانحہ کی خبر پھیل گئی، ہندو اور مسلمانوں کا ایک
تانتا صبح سے شام تک میرے گھر پر بندھا رہا، مسلمانوں میں بعض مسلم لیگی بھائی بھی آجاتے
تھے، جب انھیں پورے واقعات سے روشناس کرایا جاتا تھا تو وہ مسلم لیگ سے
تائب ہو کر کہتے تھے کہ جب لیگ کی یہ کیفیت ہے تو ایسی جماعت سے خدا ہمیں
پناہ دے، ہم لوگ دیہانی کاشتکار ہیں، ہم لوگ لیگ اور کانگریس کے اصلی
مسلک اور حقیقت سے واقف نہیں ہیں، لیکن جب ہم موجودہ حالات کی روشنی
میں دیکھ رہے ہیں کہ لیگ والے ایسے علماء اور رہنمایانِ دین کو جن کے سینے اللہ کے
کلام کا مخزن ہیں،،... مٹادینا چاہتے ہیں، تو ایسی صورت میں ہر صادق مسلمان
کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ مذہبی اور دینی علماء کی نگرانی کرے، جو ہمیں منزل کی
سیدھی راہ بتاتے ہیں، —— اس ہنگامہ میں جو آدمی زخمی ہوئے وہ اب تک
بستر پر پڑے ہوئے ہیں،

میں جو برابر حضرت مولانا کے ساتھ جارحانہ حملے کے دوران میں موجود رہا
پرزور طور پر مولانا کے معتقدین و مریدین اور تمام اسلامی درسگاہوں کے طلباء
اور اساتذہ اور دردمندانِ قوم سے اپیل کرتا ہوں کہ حضرت مولانا اور ان
کے جیسے حاملانِ دینِ محمدی کے قتل کرنے والوں کی کوششوں سے محفوظ رکھنے
اور دینِ محمدی کو قائم رکھنے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگادینے میں دریغ نہ کریں۔

---

(۲)

اللہ کی لاٹھی، جس میں آواز نہیں!

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جیسے عالم دین اور ضعیف العمر بزرگ پر کئی ہزار مسلم لیگیوں کا سید پور (بنگال) میں ٹوٹ پڑنا اور قتل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا ایسا واقعہ ہے جسے کوئی شریف آدمی بھی پسند نہیں کر سکتا، بلکہ قدرتی طور پر ہر شائستہ آدمی ایسے واقعہ پر نفرین کرے گا، اور ایسے لوگوں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھے گا،

مولانا کے علم و تقویٰ کا خیال نہیں کیا گیا تھا، نہ سہی، کم سے کم یہی خیال کرنا تھا کہ وہ بوڑھے ہیں، کم زور ہیں، نہتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سید پور میں مہمان ہو کر آئے ہیں، کون شریف آدمی کسی بوڑھے، کمزور نہتے اور مہمان پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے، پھر یہ بھی یاد رہے کہ سید پور میں کوئی جلسہ بھی نہ تھا، مولانا اپنے ایک مرید کے پُرسے کو قریب کے ایک گاؤں گئے تھے، اور مولانا ریاض الدین احمد صاحب بانیِ دارالعلوم کے اصرار سے ان کے گھر دعوت کھانے کے لیے سید پور تشریف لائے تھے اس سب کے ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگی لوگ دیوانے بن کر مولانا پر ٹوٹ پڑے،

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شرمناک اور ذلیل ترین حملہ پر سب نے تھڑی تھڑی کی، لیکن نہ کسی مسلم لیگی لیڈر نے مذمت کا ایک لفظ کہا، نہ کسی مسلم لیگی اخبار نے مذمت میں ایک لفظ لکھا، بلکہ لیگی اخباروں نے اُلٹا یہ ..... کہ سید پور کے غنڈوں کی خوب پیٹھ ٹھونکی، اور ان کے کمینہ حملوں کو جلی سرخیوں سے سراہا،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ والوں کی اس ذہنیت پر تعجب کرنا ہی نہیں چاہیے، مسلم لیگ کے سکریٹری اور مسٹر جناح کے ہمزاد نواب زادہ لیاقت علی خاں لیگیوں کے نام اپنے سرکلر میں لکھ چکے ہیں کہ الیکشن جیتنے کے لیے جائز اور ناجائز سب ہی کچھ کرو، اس اعلیٰ اخلاقی تعلیم کی موجودگی میں مسلم لیگ والے جو بھی کریں کم ہے،

لیکن مولانا مدنی صاحب کے اس حادثہ میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے کئی عبرتیں بھی موجود ہیں، مولانا پر چڑھائی کرنے والوں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی، جن میں بہتیرے نشہ سے عقل کھو چکے تھے، ان سب کی دلی غرض یہی ایک تھی کہ مولانا کو مار ڈالا جائے، مولانا کی حفاظت کرنے والے صرف نو دس آدمی تھے، جو مولانا کو اپنے بیچ میں لیے ہوئے تھے، کہاں تین ہزار آدمی جن پر خون سوار تھا، اور کہاں دس آدمی جو بالکل نہتے تھے، لیکن اللہ کی طاقت ان ہی دس آدمیوں کے ساتھ تھی، بدر جیسا واقعہ دنیا نے سید پور میں بھی دیکھ لیا، قریش کا لشکر جرار جس طرح بدر میں مٹھی بھر اللہ کے سچے بندوں سے ہار گیا تھا، اسی طرح مسلم لیگ کا لشکر جرار سید پور میں اللہ کے دس سچے بندوں سے ہار گیا، اللہ کے ان دس سچے بندوں نے تین ہزار لیگیوں کی یلغار روک دی، ان کے ریلے کا کامیاب مقابلہ کیا، یہ لوگ نہ مولانا کو گرا سکے، نہ اپنی چھریوں، لاٹھیوں، ہنٹروں سے مولانا کے نحیف زار جسم پر کوئی ضرب ہی لگا سکے،

یہ ایک سبق ہے اہل حق کے لیے بھی اور اہل باطل کے لیے بھی، مگر اہل باطل کے دلوں پر تو اللہ تعالیٰ مہر لگا چکا ہے، وہ کسی سبق سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے،

مولانا مدنی کے اس سانحہ میں دوسری عبرت یہ ہے کہ خدا نے ان کی حمایت

میں ایک انگریز کو کھڑا کر دیا، اسی انگریز کو جس کی قوم کا راج مولانا ہندوستان سے ختم کر دینے کے لیے جہاد کر رہے ہیں، اس انگریز نے لیگی مسلمانوں کے سامنے تقریر کی اور کہا کہ جس شخص کو تم قتل کر ڈالنے پر تُلے ہوئے ہو تمھارا بہت بڑا پیشوا ہے، اور تمھاری قوم میں بڑی قدر و منزلت کا مالک ہے، تم کہتے ہو ہم پاکستان بنائیں گے، مگر کیا تم ایسی ہی ذلیل حرکتوں سے اور ایسے ہی وحشیانہ اقدامات قتل سے پاکستان بنا سکتے ہو؟ ہرگز نہیں، تم اپنے اس جنون کے ساتھ پاکستان کبھی بھی نہیں بنا سکتے،

دیکھیے! خود ایک دشمن کو خدا نے کس طرح حق کی حمایت کے لیے کھڑا کر دیا،

ابھی عبرتیں ختم نہیں ہوئیں، خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی، لیکن خدا کی لاٹھی مارتی ہے، اور چپ چپاتے کام تمام کر ڈالتی ہے، حضرت مولانا مدنی جب تین ہزار غنڈوں میں گھرے ہوئے تھے، اور ان کی جان بچ جانے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی، تو کسی کے خبر دینے سے سید پور کا انسپکٹر پولیس واقعہ پر پہنچا، یہ شخص مسلمان ہے، اور نہ جانے مسلم لیگی وزارت اور مسلم لیگی پاکستان میں اپنی ترقیوں کے کیا کیا خواب دیکھ رہا ہوگا، اس نے زبانی جمع خرچ تو بہت کیا، مگر اپنا فرض انجام نہیں دیا، بدمعاشوں کو روکنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی، کیا عجب ہے حضرت مولانا کے قتل ہو جانے کو بھی پاکستان میں اپنی ترقیوں کی ایک سفارش سمجھتا ہو؟ اس پولیس افسر نے اپنے خیال میں بڑی ہی عقل مندی سے کام لیا، مولانا مدنی کو بچانے کی کوئی تدبیر بھی نہ کی، لیکن اس پولیس افسر پر تقدیر ہنس رہی تھی، مولانا پر حملہ رات کو ہوا تھا، پولیس افسر اپنی ہوشیاری پر اکڑتا ہوا گھر لوٹا، اور رات بھر اپنی ترقیوں کے خواب دیکھتا رہا، مگر صبح کو اس پولیس افسر کا لڑکا مر گیا، اور اس افسر کی تمام خیالی خوشیاں خاک میں مل گئیں،

تو کیا بات یہیں پر ختم ہو گئی ؟ جی نہیں، ابھی اللہ و بزرگ و برتر کی لاٹھی ٹھہری نہیں تھی، اللہ کی یہ لاٹھی اس گستاخ کو بھی سزا دینے پر تلی ہوئی تھی جس نے اللہ کے رسولؐ کے نائب مولانا مدنی کے سر پر سے ٹوپی اُچک لی تھی، جس نے اس عالمِ دین کی ٹوپی کو اپنے جوتوں سے روندا تھا، اور پھر جس نے اس پاک ٹوپی کو جو نہ جانے بارگاہِ ایزدی میں کتنے سجدے دیکھ چکی تھی آگ سے جلا دیا تھا،

نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سر سے یہ ٹوپی اُچک لینے والا بدبخت آدمی گبرو جوان تھا، مضبوط اور طاقتور تھا، سمجھتا تھا میرا سامنا کون کر سکتا ہے، مگر تقدیر ہنس رہی تھی، اور اللہ کی لاٹھی جو کبھی بولتی نہیں ہل رہی تھی،

جس رات اس بدبخت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی ٹوپی اُن کے مبارک سر سے اُتار لی، اس کی صبح کو اس شخص کے گھر برات تھی، بڑی چہل پہل تھی، اور یہ طاقتور جوان نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی گستاخیوں اور اپنی بدنی قوتوں کے گھمنڈ میں ایک عجیب حال میں تھا، سمجھتا تھا بس میں ہی تو اس دنیا میں ہوں، اور بس ، میں اس دنیا میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، مگر یہ شخص خدا کی لاٹھی کو بھولے ہوئے تھا، یہ بدخصلت نوجوان براتیوں میں سے اپنے ہم عمروں کو لے کر تالاب گیا، یہ واقعہ حضرت مدنی کے سانحہ والی رات کی صبح کا ہے، سب ہنسی خوشی نہانے لگے، پھر بدنصیب نوجوان نے غوطہ لگایا، اب لوگوں نے دیکھا کہ اس کے دونوں پاؤں تو اوپر ہیں، مگر وہ خود پانی کے اندر رہے، پہلے خیال لیا گیا کہ چہل کر رہا ہے، مگر جب بہت دیر ہو گئی تو لوگ پریشان ہوئے کہ آخر معاملہ کیا ہے ؟

معاملہ جلد ہی معلوم ہو گیا، اللہ کے اس دشمن نے جب غوطہ لگایا تو سینہ تک تالاب کی مٹی میں دھنس گیا، اور کسی طرح بھی نکل نہ سکا، تالاب کی مٹی نے اس شخص کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ براتی بھی نکال نہ سکے، اور کابلیوں نے آکر اسے نکالا،

مگر وہ مرچکا تھا،

دیکھی آپ نے خدا کی لاٹھی کی مار، جو کبھی بولتی نہیں، مگر اپنا کام کرجایا کرتی ہے،
مجھے تو مسلم لیگی لوگ لامذہب اور ملحد کہتے ہی چلے آئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک "لامذہب" اور "ملحد" ایسے واقعات کو مولانا مدنی صاحب کی کرامت قرار دے نہیں سکتا، لیکن خود میں بھی "لامذہب" اور "ملحد" ہونے کے باوجود خود مسلم لیگیوں سے پوچھتا ہوں کہ مولانا مدنی کے واقعہ میں یہ جو کچھ ہوا ہے اس کا سبب کیا ہے؟

میں یقین سے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے حسین احمد کا بدلہ خود اپنے ہاتھ سے لیا ہے، اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ مولانا حسین احمد پر جو کچھ سید پور میں گزرا ہے وہی پورے بنگال میں مسلم لیگ کا بھی قلع قمع کرکے رکھ دے گا:

(روزنامہ "ہند" کلکتہ، ۱۶ را کتوبر ۱۹۴۵ء)

دوسرا رسالہ

سید پور اور بھاگل پور کا واقعہ

از

مولانا محمد طیب بھاگل پوری
مولانا کفیل احمد بجنوری
مولانا مفتی نعیم الدین لدھیانوی
مولانا دین محمد وفائی

پیش لفظ

مولانا سید محمد میاں ؒ

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی نے (آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بعد) جس جانفشانی سے اپنا ملی اور ملکی فرض انجام دیا، وہ اس پیرانہ سالی میں مخصوص طور پر آپ کا حصہ تھا، آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے جس قدر مالی امداد حاصل کی اس کا بیشتر حصہ حضرت مدظلہ العالی کی توجہ کا نتیجہ تھا، قلمی امداد میں بھی حضرت موصوف کی خدمت سب سے زیادہ ہے، حضرت موصوف نے گراں قدر اور پُر از معلومات رسائل تحریر فرما کر آزاد مسلم پالیمنٹری بورڈ کے کارکنوں کے لیے دلائل کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا، ان رسائل نے واضح کر دیا کہ جمعیت علمائے ہند یا آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تمام جد وجہد معقول اور مضبوط بنیاد پر قائم ہے، اور اس کے برخلاف جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ محض جذبات ہیں، جو فہم و بصیرت سے قطعاً محروم ہیں،[1]

---

[1] اس سلسلہ میں حضرت کے مندرجہ ذیل رسائل خاکسار کی نظر سے گزرے ہیں:

۱۔ مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اس کا حل (جس میں مسلم لیگ سے علیحدگی کے وجوہات بیان فرمائے گئے ہیں)

۲ مسلم لیگ کیا ہے؟ (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت مدظلہ العالی نے عام عادت کے بموجب بنگال اور بہار کے چند مدارس کے جلسوں میں شرکت کا وعدہ فرما رکھا تھا، الیکشن کے دورے شروع کرنے سے پہلے حضرت نے ان وعدوں کی تکمیل کا وعدہ فرمایا، اور ستمبر ۴۶ء کی آخری تاریخوں میں بنگال روانہ ہو گئے،

حضرت موصوف کے عزیز مولانا نصیر الدین احمد صاحب فیض آبادی موجود تھے، آپنے معیت کی درخواست کی، احقر نے بھی درخواست کی تائید کی، اور مولانا وحید الدین صاحب انچارج دفتر مرکزیہ جمعیۃ علمائے ہند نے بھی منظوری درخواست کے متعلق اصرار کیا، مگر حضرت موصوف نے اس کو غیر ضروری فرمایا، اور جب اس طویل سفر میں تنہائی کی دشواریوں کا تذکرہ کیا گیا تو ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰہَ مَعِیْ (اللہ میرے ساتھ ہے) میں تنہا نہیں ہوں،

بہر حال حضرت مدظلہ العالی تنہا تشریف لے گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ لیگ کے بہادروں نے اس موقع پر بہت کچھ منصوبے باندھ رکھے تھے، لیکن حضرت کا اعتماد علی اللہ ہر موقع پر کام آیا، اور شرارت پسندوں کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر جناب محترم محمد طیب صاحب بھاگلپوری کا مکتوب اور مولانا محمد کفیل صاحب بجنوری کا ایک مضمون جو اخبارات میں شائع ہوا تھا نقل کر دیں،

۳۔ مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش سیاسی غلطیاں،
۴۔ سول میرج اور لیگ،
۵۔ شریعت بل اور لیگ،
۶۔ پاکستان کیا ہے؟ (دو حصے)،
۷۔ کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کی سیاسی پوزیشن،
۸۔ کشفِ حقیقت
۹۔ ہمارا ہندوستان، ۱۰۔ فتویٰ تھانہ بھون کا جواب (ا۔س۔ش)

مکتوب بنام مولانا سید محمد میاںؒ

از قلم

مولانا محمد طیب بھاگلپوری

۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کی خدمت میں یہ تحریر ارسال کرتے ہوئے کلیجہ مُنہ کو آرہا ہے، جذبات قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں، یعنی لیگی غنڈوں نے اسلام کی دشمنی کے سلسلہ میں حضرت سیدی شیخ الاسلام سیدنا مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کے ساتھ جو شرارتیں اور مظالم کیے ہیں وہ تحریر کرتے ہوئے قلم رُکتا ہے، اور دل رو رہا ہے کہ حضرت شیخ جیسی فنافی الاسلام ہستی کے ساتھ لیگی مسلمانوں کا یہ سلوک بداخلاقی، بدتمیزی، شرارتیں اور مظالم نہ معلوم کن نتائج تک پہنچنے والے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دورِ انقلاب عظیم الشان نتائج کا حامل ہے، لادینی پوری قوت کے ساتھ دینِ اسلام کے مٹانے کے درپے ہے، مصیبت یہ ہے کہ خود حکومتِ وقت پشت پناہی کررہی ہے،

راقم الحروف کو ۲۶ر ستمبر کی شام کو کٹھیار (ضلع پورنیہ) میں حضرت مدنی مدظلہ العالی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اسی وقت حضرت مونگیر سے تشریف لائے تھے، شب کو مدرسہ دارالعلوم لطیفی کٹھیار میں طلبہ اور چند مذہبی لوگوں کے سامنے

حضرت نے مذہبی تقریر فرمائی، جس میں شریعت کی پابندی پر سختی سے زور دیا، اور ساتھ ہی جمعیۃ علماءِ ہند کے اغراض و مقاصد اور موجودہ سیاسی مسلک اور اسلام کی روشنی میں جمعیۃ کی سیاست کو پیش کیا، یہ تقریر بہت اثر انگیز تھی،

دوسرے روز ۲۷ ستمبر کو پورنیہ شہر سے ۸، ۱۰ میل دور ایک گاؤں اسلام پور میں تقریر ہوئی، تقریر یہاں بھی خالص مذہبی تھی، لوگوں کو مذہب اور سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کی طرف خاص توجہ دلائی، اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ موجودہ نظامِ سیاست میں علماءِ اسلام کا گامزن ہونا اور اپنی آواز کو مؤثر بنانا اور موجودہ نظامِ سیاست میں داخل ہو کر بے دینوں اور غیر مسلموں نیز حکومتِ وقت کے حملوں سے اسلام کی مدافعت کرنا کس قدر ضروری ہے اور اس وقت اگر نظامِ سیاست بے دین لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے تو آئندہ اور کس قدر نقصانات پہنچ سکتے ہیں،

بہر کیف وہاں سے حضرت اسی شب روانہ ہو کر ۲۸ کو پاربتی پور (بنگال) پہنچے، پاربتی پور میں حضرت ہی نے جمعہ کی نماز پڑھائی، ۴ بجے روانہ ہو کر شام کو ڈومر (ضلع رنگپور) پہنچے، وہاں سے موضع سوتارائے ایک بڑے جلوس کے ساتھ وارد ہوئے، وہاں ایک گھنٹہ سے زائد تک تقریر ارشاد فرمائی، لوگوں کو اسلام کی پابندی اور تعلیم مذہبی کی طرف توجہ دلائی، اور یہ کہ جمعیۃ کی حمایت کر کے اسلام دوستی کا ثبوت دیں،

مولانا ریاض الدین صاحب نے بعد میں بنگلہ زبان میں ترجمانی کی، کیونکہ بہت سے دیہاتی اردو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے،

دوسرے روز ناشتہ کے بعد علمی مجلس رہی، عصر کے وقت بعد نمازِ عصر ڈومر میں تقریر فرمائی، بعد مغرب سید پور روانہ ہوئے، وہاں لیگی غنڈوں کے ایک جمِ غفیر نے

حضرت اور ان کے رفقاء کو گھیر لیا، اور راستہ روک دیا، بمشکل تمام پلیٹ فارم سے باہر نکلے، لیگی بلوائی حضرت کو کسی صورت سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے، سیاہ جھنڈیاں لیے ہوئے مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، اکثر غنڈے شراب کے نشہ میں مست تھے، ایک لیگی نے حضرت مدنی مدظلہ العالی کے سر سے ٹوپی اتار لی، لیگیوں نے رفقاء سفر کو پوری سرگرمی سے گھونسوں اور مکوں سے زدوکوب کیا، گاڑی بان کو زخمی کر دیا، پولیس کو خبر دی گئی، لیکن منزل مقصد (یعنی اس گاؤں تک پہنچانے کی ذمہ داری نہ لے سکی، اس لیے آگے بڑھنا لیگیوں نے ناممکن کر دیا،

شب بھر اسٹیشن ہی پر دل برداشتہ ہو کر قیام فرمایا، صبح کو واپس کٹھیار تشریف لائے یہاں کا واقعہ اپنی نوعیت میں سب سے زیادہ شرمناک اور افسوسناک ہے، لیگیوں نے (جن میں شہر کے غنڈوں کے علاوہ اسکول کے طلبہ زیادہ تھے) ایک گڑھے میں کیچڑ گھولا، اور ایک ہار بوسیدہ جوتوں کا اور ایک شہد کا چھتہ نالی کی غلاظت میں ڈبو کر لائے، سیاہ جھنڈیاں دکھا کر مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے،

حضرت بھاگل پور جانے والی گاڑی میں سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں تشریف فرما تھے، ڈبے کے پاس آکر نہایت فحش اور گندی گالیاں اور نعرے لگا لگا کر شور مچا رہے تھے، ان کی تعداد بہت کافی تھی،

(اس کے بعد ۶ سطروں میں ان گندہ اور فحش الفاظ کو نقل کر کے تحریر کیا گیا ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" مگر ہمارے خیال میں نقل کفر اگر کفر نہیں تو خلاف تہذیب و متانت ضرور ہے، علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کفر نہ ہو لامحالہ اس پر عمل ہو، لہٰذا ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں،

نقل کفر کے بعد طیب صاحب فرماتے ہیں:

حضرت شیخ کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے، رفقاء کو جواب دینے سے منع

فرما دیا تھا، آخر کار ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد گاڑی چھوٹی، ۹ بجے شب کو بھاگلپور پہنچے، دن کو ناتھ نگر میں پھر چمپا نگر میں عظیم الشان جلسے ہوئے، حاضرین کی تعداد کئی ہزار تھی، انصار اللہ کا دستہ باقاعدہ موجود مصروف نظم تھا، حضرت کی تقریر دو گھنٹہ کے قریب نہایت ہی ولولہ انگیز ہوئی، ہر جگہ کی طرح یہاں بھی شریعت کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین دعوۃ التقوٰی اور جمعیۃ کے احیاء و ترقی کی طرف توجہ دلائی، عوام میں بہت جوش و خروش تھا، اسی روز کانگریسی طلباء کی کانفرنس لاجپت پارک میں ہو رہی تھی، ارباب کانفرنس نیز کانگریس کے ارکان نے حضرت سے درخواست کی کہ کانفرنس میں تقریر سے مستفیض کیا جائے، اصرار کے بعد حضرت نے منظور فرمالیا، سہ پہر کو جلسہ گاہ جاتے وقت لیگیوں نے شور برپا کیا، جو بیان سے باہر ہے، یہاں حضرت کو غنڈوں نے گھیر لیا، یہاں بھی شہر کے غنڈوں کے علاوہ مسلم ہائی اسکول کے طلباء کے ایک جم غفیر نے حضرت کے رفقاء کو گھیر لیا،

اور جلسہ گاہ جانے سے روکنے لگا، تیس چالیس لڑکے سیاہ جھنڈیاں لیے ہوئے تھے، "غدار قوم مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے، گھونسے چلانے لگے، خدا کے فضل سے حضرت کو ضرب نہیں آئی، جب پتھر وغیرہ چلانے لگے تو پولیس کو اطلاع دی گئی پولیس نے مداخلت کی، ایس، پی وغیرہ پہنچے، وہ موٹر میں بٹھا کر حضرت کو جلسہ گاہ میں لے گئے، جہاں تقریباً آٹھ دس ہزار ہندو مسلمانوں کا مجمع تھا، حضرت نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک ہندو مسلم اتحاد پر پُر زور تقریر ارشاد فرمائی، مغرب کی نماز وہیں جلسہ گاہ میں تقریباً سات آٹھ سو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ادا فرمائی، امامت حضرت ہی نے فرمائی، تمام انگریز حکام مثلاً ایس، پی وغیرہ اور ہندوستانی پولیس افسران کے سامنے انگریزی حکومت کے نقصانات و مظالم اور ہندوستان سے انگریزی حکومت کے اخراجات پر

انتہائی بیباکی اور طمانیت کے ساتھ تقریر فرمائی، بعدہ ایس، پی نے جو انگریز تھا حضرت شیخ سے کہا کہ شہر میں آپ کی وجہ سے نقصِ امن کا خطرہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے آپ یہاں سے جہاں جانا چاہتے ہیں تشریف لے جائیں، پولیس آپ کو اپنی نگرانی ہی میں رکھے گی،

چنانچہ حضرت کو رات بھر کو توالی تھانہ میں رکھا گیا، ہم خدام تھانہ میں ہی حضرت کے ساتھ بارہ بجے شب تک رہے، اگرچہ انسپکٹر پولیس صاحب جو وہاں ہر وقت موجود رہتے تھے خدام کو ملنے سے منع فرماتے تھے، صبح کو حضرت مدظلہ العالی کو اسٹیشن پہنچایا گیا، انسپکٹر پولیس اور غالباً ڈی، ایس، پی ساتھ تھے،

ہاں! جلسہ ختم ہونے کے بعد حضرت کو اچانک موٹر میں بٹھا کر پہلے اسٹیشن لایا گیا، کہ رات ہی کو روانہ کر دیا جائے، لیکن اس وقت گاڑی چھوٹ چکی تھی، بعدہ کو توالی لا کر رکھا گیا، اس درمیان میں شہر کے تمام خدام و متوسلین پریشان پھر رہے تھے، ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے تھے، شہر میں عجب غل مچا ہوا تھا کہ حضرت مدنی کو گرفتار کر لیا گیا، خیر جب راقم الحروف کو معلوم ہوا کہ حضرت کو توالی میں، ہیں تو ہم قریب پندرہ بیس خدام وہاں حاضر ہوئے، میں نے دست بستہ اپنی جانب سے نیز کُل محبانِ شیخ مدظلہ العالی کی جانب سے عرض کیا کہ حضرت ہم سب غلاموں کی ایک درخواست ہے، وہ یہ ہے کہ کم از کم الیکشن تک حضور والا سفر موقوف فرما دیں، کیونکہ لیگیوں کی اشتعال انگیزی کو دیکھ کر خطرہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین حضور کی جان لینے کے درپے ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے، علاوہ ازیں حضرت کی بہت زیادہ توہین کرتے ہیں، اور اذیتیں دینے پر تُلے ہوئے ہیں، اس لیے عزت وجان کے خطرہ کے مدِ نظر ہماری درخواست ہے کہ چار پانچ مہینے ضرور سفر بند رکھیں، جواب میں حضرت والا نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"بھائی تم کہتے ہو اس میں بڑی اذیتیں و تکالیف ہیں، لیکن یہ اذیتیں و مصائب جو دی جاتی ہیں یا اٹھانی پڑتی ہیں میرے لیے عین راحت ہیں، باقی رہا عزت تو خدا اور رسولؐ کے راستہ میں جو بھی توہین کی جائے یا اذیت دی جائے میرے لیے عین عزت اسی میں ہے، اگر حق گوئی کی پاداش میں ہماری توہین کی جاتی ہے یا گالیاں دی جاتی ہیں تو میں اس کو عزت تصور کرتا ہوں، باقی رہا مرنا تو مرنا ایک ہی دفعہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے جس وقت اور جس طرح مقدر کر دیا ہے وہ ٹل نہیں سکتا، جمعیۃ مرکزیہ نے جب فیصلہ کر دیا تو میں قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتا، میں جمعیۃ علماء کا ایک معمولی حقیر خادم ہوں، اطاعت ضروری، علاوہ ازیں ہندوستان کے ہر ایک صوبے اور ہر ایک گوشے سے یہی حکم آتا ہے کہ تو ہی آ، تو ہی آ، تیرا آنا ضروری ہے، تو میں کس طرح اعراض کر سکتا ہوں"۔

ہم سب خدام اور پولیس سب انسپکٹر صاحب یہ الفاظ سنکر ششدر تھے، حضرت کی حقانیت، عزم، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور للہیت پر سب حیران تھے، حضور دن بھر تقریریں فرماتے، دن رات سفر میں رہتے، مخالفوں کی ہنگامہ خیزیوں کا مقابلہ سکوت و سکون و عدم تشدد سے فرماتے، ہر جگہ اصلاح، وعظ، تقویٰ کی تلقین، مریدوں کی روحانی تعلیمات، بیعت و ارشاد، تبلیغ، ہر حرکت و سکون پر کمال اتباعِ سنت و تعلیمِ سنت، مخالفت پر گالی و دشنام پر، توہین پر گھبراہٹ کا نام و نشان نہیں، وہی بشاشت، وہی خندہ پیشانی، ٹھیک وقت پر نماز با جماعت کی سختی سے پابندی، ہر جگہ تمام سفر وغیرہ میں تہجد، مراقبہ اور حیران کن شب بیداری، یہ تمام امور ایک انسان کو حیرانی میں ڈالنے والے ہیں، اور ہر شخص انگشت بدنداں ہے کہ حضرت انسان ہیں یا انسان سے بالاتر ما فوق العادۃ کوئی ہستی ہیں، کہیں جائے

نہیں ملی، کہیں روٹی نہیں ملی، کہیں تیل کا سالن ملا، کچھ پرواہ نہیں، جو کچھ سامنے آیا خوشی خوشی شکریہ کے ساتھ تناول فرما لیا، نہیں ملا، بھوکے ہیں، مجال کیا، بیتہ بل جائے، اللہ اللہ! ایسی ہستی کو اسلام کا دشمن، غدارِ قوم، ہندوؤں کا ایجنٹ کا خطاب دیا جا رہا ہے، حضرت شیخ کی مخالفت جمعیت علماء کی مخالفت، حکومت کے اشارہ پر لیگیوں کی منظم پالیسی کے ماتحت عمل میں آرہی ہے، چنانچہ ان تینوں جگہوں میں جو مظاہرے اور دشنام طرازی کی گئی لیگ کے ذمہ دار سکریٹریوں اور صدروں اور تمام کارکنوں کی میٹنگ میں طے شدہ پروگرام کے ماتحت عمل میں آئی، اسکول کے ناسمجھ لونڈوں اور شہر کے غنڈوں کو پیچھے چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے کسی مجنون و پاگل کے پیچھے شور مچاتے گالیاں دیتے ہوئے اینٹ پتھر پھینکتے ہوئے جاتے ہیں۔

اس سفر میں حضرت کو کوتوالی میں دیکھ کر راقم الحروف کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، کہ یا اللہ اس تیرے بندہ کو کونسا نشہ یا جنون سوار ہو گیا ہے، یا کونسی بے چینی پیدا ہو گئی ہے کہ نہ سونے کا ٹھکانا نہ کھانے کا ٹھکانا، نہ نہانے غسل کرنے کا ٹھکانا، آرام نہ راحت، رات دن سفر، مخالفوں وہ بھی مسلمانوں سے انتہائی ناروا سلوک دیکھتا ہے،

اس وقت تھانہ میں مقید ہے، اپنے اعزہ و اقارب کو چھوڑے ہوئے، اپنے وطن و مکان کو خیرباد کہے ہوئے، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں مارا مارا پھر رہا ہے، اور التجا کر کر کے لوگوں سے محبت و پیار کے ساتھ اسلام کی طرف بلا رہا ہے، دل میں خیال پیدا ہوا حضرت والا کیوں نہیں یکطرف ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جاتے، اور بے پناہ مصائب کیوں مول لے رہے ہیں، یا اللہ اس عاشق کو اپنی پناہ میں لے لے، آمین آمین، بہرکیف اصل غرض یہ ہے کہ:

(الف) حضرت والا مدنی صاحب مدظلہ العالی کی جان کو بلاشک خطرہ ہے، میری درخواست ہے کہ آپ سب لوگ حضرت کا سفر الیکشن بھر بند کرا دیں، جیسا کہ "ہند" کلکتہ نے لکھا ہے کہ حضرت دو مرتبہ شہید ہوتے ہوتے بچے، کیونکہ لیگی غنڈوں کی شرارت واشتعال انگیزی کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ہوں، کٹھیار کے اسٹیشن پر لیگی حضرات خوب چلا چلا کر کہہ رہے تھے اب کے الیکشن کے بعد جب ہمارا اقتدار ملک کے اندر ہو جائے گا تو اس وقت ایک ایک ملا کو ہندوستان کے صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے، سب سے پہلا پروگرام ہمارا یہی ہوگا،

(ب) علانیہ لیگی حضرات وارباب لیگ تمام تقریروں وتحریروں میں صاف صاف اعلان کر رہے ہیں کہ "مسلمانو! مولویوں کو اپنے یہاں مت آنے دو، ان کو تقریر مت کرنے دو، ان کی تقریر کو کسی مسلمان کو نہ سننے دو، یہ تمہیں گمراہ کر دیں گے، یہ کانگریس کی طرف سے آتے ہیں جو مسلمانوں کو فنا کرنے پر تلی ہوئی ہے، اگر یہ لوگ کسی صورت سے اچانک پہنچ جائیں تو جس صورت سے ہو اپنے یہاں سے نکال کر دم لو" وغیرہ وغیرہ،

اس قسم کا ایک اشتہار کل بھی یہاں تقسیم ہوا ہے، اور اسی مضمون پر کل لیگیوں کی تقریریں ہوئی ہیں، چنانچہ اس منصوبہ کا عملی مظاہرہ ہر جگہ دیکھنے میں آرہا ہے، اس لیے اب سوال یہ ہے کہ آزاد خیال مسلمانوں یا جمعیت علماء کا الیکشن کے متعلق کام کس طرح ہو سکتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ جمعیت علماء کے افراد واشخاص کی راہ میں بے حد رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں، لیگ والے کثیر تعداد میں آکر مار پیٹ دہڑ بونگ مچانے پر تیار ہو جاتے ہیں، اور صاف کہتے ہیں کہ ہم لوگ تمہیں ہرگز ہرگز جلسہ تقریر نہیں کرنے دیں گے، چاہے اس کے لیے

مار پیٹ کی نوبت کیوں نہ آجائے، چنانچہ اکثر جگہ یہی مشاہدہ میں آرہا ہے، محکمۂ پولیس ہر جگہ لیگیوں کی شرارت وہڑبونگ کو نظرانداز کر دیتا ہے، دیکھیے اس سفر میں بھی بجائے لیگیوں پر سختی کے حضرت ہی کو اپنی نگرانی میں رکھا،

محمد طیب بھاگلپوری

طیب صاحب نے ہمدردانہ اور مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ الیکشن کے سلسلہ ہی کو ختم کر دیا جائے، کچھ مخلص حضرات نے اس کو علمی لطیفہ کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا کہ یہ تو لازمی ہے کہ لَا تَقُوْلُوْا اِلَّا الْحَقَّ کے بموجب جب بھی بات کہی جائے حق بات کہی جائے، مگر "اِعْلَنُوْا بِکُلِّ حَقٍّ" (ہر حق بات کا اعلان کرتے پھرو) کا حکم شریعت میں نہیں وارد ہوا،

بہر حال رخصت کا ایک درجہ یہ بھی تھا، مگر حضرت شیخ جیسا . . . اولوالعزم اگر رخصت پر عمل کرتا تو ایک مرتبہ بھی جیل میں نہ جاتا، جو جماعت رخصت کو ترک کر کے پچیس سال متواتر عزیمت پر عامل رہی، اور ہر موقع پر ملک وملت کی ترقی کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت سے سینہ سپر ہو کر جد وجہد کرتی رہی، اس کے لیے کب ممکن تھا کہ وہ اپنے اس اقدام سے قدم پیچھے ہٹاتی، یا مصائب سے مرعوب ہوتی، جس کو اس نے وقت کا اہم ترین ملی فریضہ تصور کیا تھا،

بالخصوص جبکہ عجیب وغریب روحانی لطیفے بھی موقع بموقع ظہور پذیر ہوتے ہیں، مثلاً اسی موقع پر ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ احقر نے ڈاک دیکھتے ہوئے پہلے طیب صاحب کا مذکورہ بالا خط پڑھا، اس کے بعد دوسرا لفافہ کھولا تو دھامپور ضلع بجنور کے ایک بزرگ کا خط تھا، اور اس میں تحریر تھا کہ:

"یہاں ایک صاحب ہیں صوم وصلوٰۃ کے پابند، بظاہر نیک اور سچے آدمی ہیں انھوں نے خواب میں دیکھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ

علیہ وسلم ایک کمرہ میں تشریف فرما ہیں، دروازہ پر حضرت صدیق اکبر
رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں، برابر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید
حسین احمد صاحب کھڑے ہیں، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی ریشِ
مبارک کے بال پراگندہ ہیں، اور حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی
ان کو درست کر رہے ہیں"

صاحب الشریعۃ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں رفیق خاص،
صاحب الغار، محی السنۃ، خلیفۂ اول حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ریشِ مبارک
کو سنوارنا کس قدر عجیب و غریب بشارت ہے، اہلِ نظر پر پوشیدہ نہیں...
بالخصوص ایسے زمانہ میں جبکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو ایک ایک
کر کے مٹایا جا رہا ہو، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاڑھی کے خلاف تہذیبِ جدید نے
طوفان بپا کر رکھا ہو،

بہرحال طیب صاحب کے مکتوب سے واقعات کے علاوہ حضرت مدظلہ العالی
کے اخلاق، آپ کی ہمت عالی، جرأت، وسعتِ ظرف اور للّٰہیت وغیرہ کا بھی
اندازہ ہوتا ہے، اسی لیے اس طویل خط کو نقل کرنا مفید سمجھا گیا،

محمد میاں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی کی توہین

اور اُس کا عبرت خیز انجام

از قلم

مولانا محمد کفیل بجنوری

سید پور اور بھاگلپور میں جس نوعیت سے حضرت مولانا سید حسین صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند کی ذات بابرکات پر قاتلانہ اور وحشیانہ حملے ہوئے وہ ہر سنجیدہ شخص کے لیے انتہائی رنج و قلق کا موجب ہیں،

حضرت مولانا ریاض الدین صاحب سید پوری جو کہ حضرت الشیخ مدظلہ کے میزبان اور سید پور لانے کے باعث تھے وہ کلکتہ تشریف لائے ہوئے ہیں، موصوف نے راقم الحروف کو نمازِ جمعہ سے قبل نمازیانِ مسجد کولوٹولہ کی موجودگی میں اپنی درد بھری داستان سنائی کہ حضرت مدنی صاحب اپنے خادم احسان الحق صاحب مرحوم کی تعزیت میں قصبہ سونار تشریف لائے ہوئے تھے، اور میری درخواست پر شام کا کھانا تناول فرمانے کے لیے سید پور اسٹیشن پر اترے تھے، اور افسوس کہ ممدوح کو میرے غریب خانہ تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعۃً تقریباً ... ، لوگوں کا انبوہ لیگی نعرے لگاتا ہوا اسٹیشن پر آدھمکا، اور حضرت شیخ کو عریاں دشنام دہی شروع کر دی، ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے اور

چھریاں تھیں، بے تمیزی سے نام لے لے کر قتل کردو، مار ڈالو، ٹکڑے ٹکڑے قتل کر ڈالو
یہ غدار ہے، یہ ایسا ہے ویسا ہے، جو کچھ منہ پر آرہا تھا بکواس کی، ہم بنا بر استقبال
صرف دس پندرہ آدمی تھے، اور ان لوگوں میں برابر ایک شخص کے ناقوس پر
ناقوس بجانے پر زیادتی ہو رہی تھی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین ہزار
غنڈے سید پور ورکشاپ اور مضافات سے جمع ہو گئے، اور پھر کربلا کا منظر حسین احمد
ابن حسینؓ کے سامنے آگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، مار دھاڑ شروع کر دی، اور ہم
چند لوگ جو شیخ مدظلہٗ کو حلقہ میں لیے ہوئے تھے کچھ مجروح اور کچھ مضروب ہو رہے
تھے، اور خدا جانے ہم لوگوں میں آیا فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہا قوت
ہمارے اندر پیدا ہو رہی تھی، اور ہم "کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" بنے ہوئے تھے،
اسی اثناء میں ایک فرعون بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا،
مدنی صاحب کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی، بیدردی سے گریبان اور آخر میں
سخت مدافعت کے باوجود کلاہ سرِ مبارک سے اُتار لی، بیہودہ کلمات بکتے ہوئے
پاؤں کے نیچے روندا اور پھر اس کو جلا دیا،

ہم میں سے بعض اشخاص نے ایک مسلمان سب انسپکٹر کو جو قریب ہی تھا امداد
کے لیے متوجہ کیا، مگر افسوس اس نے لیگی ذہنیت کی وجہ سے ابتداءً لطائف الحیل سے
کام لے کر کچھ دیر بعد صاف و صریح انکار کر دیا، کہ میں اس بڑے مجمع کو قابو میں لانے
سے معذور ہوں، جب اس پولیس افسر نے اپنی شرعی و قانونی ذمہ داری کا قطعی
احساس نہیں کیا تو ہم میں سے بعض مایوسانہ طریقہ پر ورکشاپ کے انگلو انڈین افسر
کے پاس پہنچے، وہ فوراً اسٹیشن پر آیا، اور اس نے فی الواقع امن وامان قائم کرنے
کی بہت کچھ کوشش کی، اپنے ماتحت مزدوروں سے یہاں تک کہا کہ خبردار! یہ
تم کیا کام کرتے ہو؟ ہم جانتے ہیں یہ شخص تمہارا بہت بڑا پوپ ہے، زبردست

بادری ہے، نہایت نیک آدمی ہے، کیا تم اسی طرح غنڈہ پن سے شراب پی پی کر پاکستان لینا چاہتے ہو، دور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، تمھارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے،
غرض اس افسر نے سب کو سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا، اور مدنی صاحب اسی درمیان میں بمشکل تمام ویٹنگ روم میں داخل کیے جانے کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کی طرح مظلومانہ محصور تھے، اس ناکامی کے بعد اسٹیشن افسران وغیرہ کی سعی کے ذریعہ غنڈوں سے یہ طے پایا کہ مولانا کو اس صورت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ یہ اسی شب کی دارجلنگ میل سے واپس ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت شیخ ساڑھے آٹھ بجے شام سے لے کر ڈیڑھ بجے شب تک ۵ گھنٹے اس مصیبت عظمیٰ میں مبتلا رہ کر دارجلنگ میل سے بھاگلپور کے لیے روانہ ہو گئے، پھر بھاگلپور میں پہنچ کر دوبارہ جو مصیبت آئی وہ بھی اخبارات میں مجملاً آچکی ہے،
یہ ہے وہ رقت خیز اور روح فرسا داستان کہ جس سے سوائے لیگی پریس کے ہر شخص مغموم و متاثر ہے، اور ارباب لیگ کی طرف سے واقعہ کی تکذیب کی جا رہی ہے
افسوس صد افسوس:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مولانا ریاض الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اپنے دوستوں کو صبر و سکون کے ساتھ تسلی و تشفی دیتے رہے، اور فرمایا یہ تو کچھ بھی نہیں، آئندہ ملک کی اس سے زیادہ خراب حالت ہونے والی ہے، حملوں اور سب و شتم کے وقت حضرت شیخ کی کیا حالت تھی؟ مولانا ریاض الدین صاحب فرماتے ہیں کہ چہرہ پر قطعاً خوف و ہراس نہ تھا، اور مدنی صاحب اکثر مراقبہ کی حالت میں ہو جاتے تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ممدوح سے دیگر اشخاص نے تحریری

طور پر اجازت طلب کی کہ ہم غنڈوں کے قلع قمع کے لیے حاضر ہیں، مگر مولانا مدظلہٗ نے بلوہ کے اندیشہ اور اپنے اعتماد علی اللہ کی بناء پر اجازت نہیں دی، غالباً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "نام الملک وقع الشیطان" فرمایا تھا ممدوح کے پیش نظر تھا، یہ ہے عمل بالحدیث،

ادام اللہ فضلہٗ وظلہٗ علی المسلمین والمسترشدین،

شیخ الاسلام کی کھلی کرامت؛

اولیاء اللہ سے جو عداوت کرتا ہے وہ دراصل باری تعالیٰ سے جنگ کرتا ہے، حق تعالیٰ کے نیک بندوں کا بحالتِ مظلومیت صبر وضبط رنگ لائے بغیر نہیں رہتا، سیدنا امام حسینؓ کے قاتلوں نے زیادہ عرصہ میں نہیں تھوڑے ہی دنوں میں اپنی ذلت ورسوائی کا جو مہیب نقشہ دیکھا وہ اسلامی تاریخ میں آج بھی روشن ہے، مظلوم حسین احمد بھی غالباً حدودِ بنگال سے باہر نہیں نکلے تھے کہ خداوند تعالیٰ کا قہر وغضب ظالموں کی طرف متوجہ ہو گیا، اور منتقمِ حقیقی کی گرفت شروع ہو گئی، چنانچہ مولانا محمد صالح سید پوری فاضلِ دیوبند خلف رشید مولانا ریاض الدین صاحب کا گرامی نامہ آج ہی اپنے پدر بزرگوار کے نام کلکتہ پہنچا، مکتوب بنگلہ زبان میں ہے، مگر راقم الحروف اس کا ترجمہ اردو میں جناب قاری عتیق الرحمٰن صاحب فرید پوری مدرس اعلیٰ شعبۂ تجوید مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور جناب قاری شریعت اللہ صاحب میمن سنگی مدرس تجوید مدرسہ عالیہ سے کرا کے بعینہٖ درج ذیل کرتا ہے، مقامِ عبرت ہے کہ جس فرعون بے سامان نے زیادہ فرعونیت سے کام لیا تھا وہ تو اگلے ہی دن تالاب میں غرق ہو کر فوت ہو گیا، اور جس پولیس افسر نے اپنی اخلاقی وقانونی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا تھا، اور کھڑے ہوئے کلوخ اندازی وغیرہ کا تماشا دیکھا تھا وہ بھی اپنے نوجوان فرزند کو سپردِ خاک کر کے سراپا تماشہ بن گیا، پھر خدا کی شان کہ جس خیال

سے یہ ہڑبونگ مچائی گئی تھی کہ جمعیۃ علماء کی تبلیغ نہ ہو، آج بڑے اہتمام سے اسی جگہ جمعیۃ قائم کی جارہی ہے، جو لوگ اب تک غنڈے بنے ہوئے تھے وہ اب تائب ہوکر ایک دوسرے کو متہم کر رہے ہیں، اور جس جھنڈے کے تحت یہ سب کچھ خرافات کی گئی تھی اسی جھنڈے کی اب علانیہ مخالفت شروع کردی گئی ہے، اللہ رے قدرت کیا برعکس معاملہ ہے،

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

صالح صاحب لکھتے ہیں:

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابا جان: آپ کا خط موصول ہوا، ہم لوگ خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں، ہم لوگوں کے لیے کسی قسم کی فکر نہ کریں، بے فکر ہوکر کام کاج کریں، اور ہم لوگوں کے لیے دعا کرتے رہیں، جن غنڈوں نے جناب حضرت قبلہ مولانا مدنی کے ساتھ گستاخی کی تھی وہ لوگ ابھی اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں، بڑے داروغہ کا بڑا لڑکا دوسرے ہی دن قضا کر گیا، یہ بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو، اس کے بعد جس شخص نے حضرت کے سر مبارک کی ٹوپی اتاری اور جلادی تھی، دوسرے ہی دن وہ بھی تالاب میں ڈوب کر مر گیا، سید پور میں ہلڑ مچ گیا، شیان ڈاکٹر اور جیتنا سب لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم لوگ ان غنڈوں کے ساتھ نہیں ہیں، ہم لوگوں سے ایسا ذلیل کام نہیں ہوسکتا، اصل بات یہ ہے کہ لیگیوں میں دو فرقے ہوگئے ہیں، بہت سے لوگ افسوس کر رہے ہیں کہ ایسا کام کرنا لیگیوں کی غلطی ہوئی ہے،

اصل بات یہ ہے کہ لوگ لیگ سے ناراض ہو گئے، کل بعد جمعہ قرب وجوار
گاؤں کے سردار لوگ ہمارے گھر میں آئے، اور تبلیغی جماعت قائم کی،
اور جمعیۃ علماء ہند کی ایک شاخ قائم کی، جس کا صدر آپ کو بنایا گیا
ہے، اور مرحوم مظہر اللہ منڈل کے لڑکے عبد الکریم منڈل صاحب کو
اسسٹنٹ سکریٹری بنایا، اور آس پاس کے لوگوں کے نام کی سب فہرست
بھیجی ہے، آپکے گھر آنے پر سردار لوگ آپ کے پاس آئیں گے، فقط
صالح

آپنے دیکھا سچے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح سچا ثابت کرتا ہے، گو تفصیلات کا ابھی
انتظار ہے، مگر تاہم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی یہ
کیسی زبردست اور کھلی ہوئی کرامت ہے،

ممکن ہے کہ کچھ لوگ میری ان سطور کو افسانہ گوئی یا خوش اعتقادی پر محمول
کرنا چاہیں، اس لیے لوگوں سے میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ وہ جمعیۃ علمائے
اسلام کلکتہ کے صدر محترم مولانا عبد الرؤف صاحب دانا پوری اور جناب مولانا
ظفر احمد صاحب تھانوی رکن جمعیت مذکورہ کو آمادہ کریں، کہ یہ دونوں بزرگ
میری معیت میں سید پور تشریف لے جائیں، اور تمام واقعات کی تحقیقات و تفتیش
از خود فرمائیں، مصارف آمد و رفت کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی، اور واقعات مذکورہ
کی تائید یا تردید بذمہ ان ہر دو بزرگان ہو گی، والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ،

خادم العلماء

محمد کفیل بجنوری

رکن جمعیت مرکزیہ و صدر جمعیۃ العلماء کلکتہ

مفسر قرآن مسجد کولوٹولہ

تبصرہ از مولانا محمد میاں :

سید پور اور بھاگلپور کے واقعات مرعوب کرنے کے لیے کافی تھے، مگر جس کو خداوند عالم نے ہمت و استقلال کا غیر متزلزل پہاڑ بنایا ہو اس کے لیے ایسے واقعات بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، چنانچہ اس کے بعد حضرت کا پروگرام مرتب کیا گیا، اور آسام سے پشاور تک پورے شمالی ہندوستان کا دورہ فرمایا[۱] لیگیوں کی طرف سے جگہ جگہ یورش کی گئی، بنگال میں سڑک بھی تقریباً ایک میل تک اکھاڑ دی، اس پر درخت کاٹ کر ڈال دیئے، اور اسکول کے تقریباً دو سو طلبہ اور اس اطراف کے اوباشوں کو سڑک کے قریب چھپا کر بٹھا دیا گیا کہ حضرت کی جب سواری اس طرف سے گذرے تو حملہ کر دیا جائے، مگر اس کی اطلاع حضرت کے خدام کو ہو گئی، اور راستہ تبدیل کرا کر حضرت کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیا گیا،

سلہٹ میں حضرت کے جلوس پر حملہ کیا گیا، بریلی میں حضرت کے جلسہ پر پتھراؤ کیا گیا، پولیس والے کھڑے ہوئے دیکھتے ہی نہیں رہے بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ شہ دیتے رہے، مگر خداوند عالم نے ہر جگہ حضرت کی حفاظت فرمائی، اور حضرت مدظلہ العالی نے اس قسم کے تمام واقعات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، بنگال میں غنڈہ گردی کی یہاں تک انتہا ہو گئی تھی کہ چلتی ٹرین میں قوم پرور مسلمانوں کو زدوکوب کیا جاتا تھا، پروفیسر ہمایوں کبیر سفر کر رہے تھے کچھ آدمیوں نے زنجیر کھینچ دی، اور چند اوباشوں نے گاڑی میں چڑھ کر ان کو زدوکوب کیا، ان شرارتوں کی بنا پر بعض خدام کی رائے تھی کہ حضرت بنگال کا سفر نہ کریں، لیکن حضرت نے فرمایا کہ کامیابی یا ناکامی تو خدا کے اختیار میں ہے، جمعیت کی آواز پہنچانا ہمارا فرض ہے، ہم اپنے فرض میں کیوں کوتاہی کریں،

---

[۱] سی، پی اور بمبئی وغیرہ کی طرف جانے کا حضرت کو موقع نہیں مل سکا، حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اور حضرت مولانا عبد المنان صاحب، مولانا عبد الوحید صاحب صدیقی وغیرہم نے اس خانہ کو پُر کیا،

سفلہ خوئی اور کمینہ پن کا بدترین مظاہرہ
اور حضرت شیخ الاسلام کی بے مثال استقامت
مفتی محمد نعیم الدین لدھیانوی کا فکر انگیز بیان

۳ر نومبر ۱۹۴۵ء

مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی نے سید پور کے واقعہ سے متاثر ہو کر رنج و افسوس کے اظہار کے ساتھ یہ نصیحت آمیز بیان دیا ہے:

"سید پور اسٹیشن پر چند بد طینت مسلم لیگیوں نے شیخ الاسلام حضرت جناب مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند پر حملہ آور ہو کر اپنی بزدلی اور کمینہ پن کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ ہر منصف مزاج اور حق پرست مسلمان کے لیے انتہائی رنج اور تکلیف کا باعث ہوا ہے، حضرت مولانا مدنی سے ایک بار نہیں ہزار بار اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن انھیں بازاری گالیاں دینا اور ان کی شان میں بدمعاشوں اور غنڈوں کی طرح منہ کھولنا، ان کی آبرو اتار کر ان سے دست و گریباں ہونا، اپنی سفلہ خوئی کا بدترین مظاہرہ کرنا ہے، مولانا آزاد کی توہین کے بعد یہ دوسرا واقعہ ہے، لیکن لیگ کے ذمہ دار قائدین کی طرف سے کسی ایک فرد کی بھی آواز ان حرکات کے خلاف نہیں اٹھی،

ہم حضرت مدنی مدظلہ کے جملہ متوسلین اور معتقدین سے پُر زور مگر باادب درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کے واقعات کو اس عظیم الشان مقصد کے پیش نظر جسے حاصل کرنے کے لیے حضرت مدنی اس میدان میں اترے ہیں، قطعاً بھول جائیں، اور اپنے صبر و تحمل اور بردباری کے پیمانہ کو ہرگز لبریز نہ ہونے دیں، ہمیں اس قسم کی بزدلانہ حرکتوں سے ہمیشہ مکمل احتراز کرنا چاہیے، اور آزادی کے قافلہ کی رفتار کو اور تیز کر دینا چاہیے۔"

(ہفت روزہ "زمزم" لاہور، ۳ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۴، کالم ۲)

سیاسی فتنہ

مولانا دین محمد وفائی

مولانا دین محمد وفائی ایڈیٹر د مالک ماہنامہ "توحید" کراچی وسابق ناظم جمعیۃ علماء سندھ نے اپنے ماہنامہ "توحید" میں "سیاسی فتنہ" کے عنوان سے ایک فکر انگیز اداریہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں مسلم لیگ کی شکل میں جو سیاسی فتنہ پیدا ہو گیا ہے اس سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خوفناک فتنہ کا اثر براہ راست مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی تک پہنچے گا، انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کی اکثریت اور اکثر عافیت پسند اور انگریز پرست مسلمان امراء لیگ کے پیچھے ہیں، اور علمائے کرام کا آزادی پسند طبقہ جو جمعیۃ علمائے ہند کے جھنڈے تلے ملک و قوم کی خدمات انجام دے رہا ہے اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے قربانیاں دے رہا ہے، لیگ کے لیڈر انھیں میدان سے ہٹانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں،

مسلم لیگ کے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح نے سنہ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں نے علماء کے وقار کو اور ان کے اثر کو ختم کر دیا ہے۔" یہی سبب ہے کہ آج مولانا سید حسین احمد مدنی

جیسی بڑی شان کے عالم اور صوفی کی ریش مبارک میں لیگی دیوانے غنڈے شراب ڈالنے کی حرکت شنیعہ کرتے ہیں، ان کے مقدس سر سے ٹوپی اتار کر پیروں سے مسلتے ہیں اسی طرح علیگڑھ کے اسٹیشن پر مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے لیگی طلبہ نے نہایت بے شرمی اور بے حیائی کا مظاہرہ کیا، کراچی میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کے آگے ننگے ناچ ناچے، حتیٰ کہ اذان دینے اور نماز پڑھنے میں رکاوٹیں ڈالی گئیں،

یہ تمام واقعات وہی ظاہر ہو رہے ہیں جو لیگ کے رہنماؤں کی زندگی کے واقعات ہیں، شراب خوری، زناکاری اور غیر اسلامی اعمال ان کی زندگی کا حصہ ہیں، مسلمان نوجوانوں کو ان کے اعمال سے شہ ملتی ہے، اور اسی قدر اسلام کے اصول و احکام اور اسلامی اخلاق و تعلیمات کو ٹھیس لگتی ہے،

ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ جہاں کوئی عالم حق وفات پاتا ہے وہاں علم دین و حق بھی ختم ہو جاتا ہے، یعنی علم و حق اور اخلاق و شرافت کی بقا و فروغ کا تعلق علمائے دین و حق کی حیات اور عزت و وقار سے تعلق رکھتا ہے، مسٹر جناح اور ان کے لیگی پیروکار علمائے دین کو بے عزت اور ختم کرنے کا جو ارادہ کر چکے ہیں تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ وہ خود ہندوستان سے اسلام کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں، حقیقت میں یہ ایک بڑا سیاسی فتنہ ہے،

اسلام اور مسلمانوں پر پہلے بھی مصیبتیں اور ابتلائیں آئی ہیں، لیکن اسلام کو فنا کرنے کی جو مصیبت اس وقت لیگی رہنماؤں اور ان نام نہاد بہی خواہوں کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں پر گذر رہی ہے وہ بہت خوفناک اور بھیانک ہے، اگر اس کا پوری قوت اور ہمت سے مقابلہ نہ کیا گیا تو اسلام کا نام باقی نہ رہے گا"

(توحید، کراچی، نومبر، دسمبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۳ تا ۵)

تیسرا رسالہ

شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روداد

اور

عبرت انگیز نتائج

ثقہ راویوں کی زبانی

از

حضرت سید انور حسین نفیس شاہ صاحبؒ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روئیداد، عبرت انگیز نتائج ثقہ راویوں کی زبانی

از امام الخطاطین سید انور حسین نفیس رقم صاحب، لاہور

پندرہ بیس برس پیشتر حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "اسوۂ حسینی" نظر سے گذری، یہ کتاب ریحانۃ النبی حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حالاتِ مبارکہ اور واقعاتِ شہادت پر مشتمل ہے، آخر میں قاتلانِ جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انجامِ نافرجام کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت مفتی صاحبؒ امام زہریؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ "جو لوگ قتلِ حسینؓ میں شریک تھے ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو" چند مثالیں پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"ابن جوزیؒ نے سدی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کی دعوت کی، مجلس میں یہ ذکر چلا کہ (حضرت) حسینؓ کے قتل میں جو بھی شریک ہوا اس کو دنیا میں بھی جلد سزا مل گئی، اس شخص نے کہا، بالکل غلط ہے، میں خود ان کے قتل میں شریک تھا، میرا کچھ بھی نہیں بگڑا، یہ شخص مجلس سے اٹھ کر گھر گیا، جاتے ہی چراغ کی بتی درست

کرتے ہوئے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہیں جل بھن کر
رہ گیا، سدی کہتے ہیں میں نے خود اس کو صبح دیکھا تو کوئلہ ہو چکا تھا"
(اسوۂ حسینی، ص ۱۰۱، ۱۰۲)

اللہ کے جو بندے اپنی تکلیف پر اپنا معاملہ اپنے اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں اللہ تعالے
ان کے دشمنوں سے شدید انتقام لیتا ہے، وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ،
(آل عمران، آیت نمبر ۴)

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

ہمارے عہد کو بھی ایک "حسین" عطا کیا گیا، جس کا نسبی و حسبی رشتہ شہید کربلا
سیدنا حسین اول رضی اللہ عنہ سے پیوستہ ہے، یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید
حسین احمد مدنی قدس سرہٗ .... اس حسین ثانیؒ پر مصیبتوں کے بڑے بڑے
پہاڑ ٹوٹے، لیکن اس کوہِ عزم و استقلال کو جنبش تک نہ ہوئی، مخالفوں نے کیسے
کیسے تیر اُن پر برسائے، لیکن ان کا چہرہ متبسم ہی رہا، حریفوں نے طرح طرح کی تکلیفیں
دیں، لیکن اُن کے لب پر حرفِ شکایت تک نہ آیا،

انھوں نے اپنی عمرِ عزیز استخلاصِ وطن اور سربلندیٔ اسلام کی جدوجہد میں
گذاری، انگریز اور اس کے "رضا کار" ہمیشہ ان کی مخالفت میں زبان دراز رہے،
لیکن اس مجاہدِ دین و ملت اور غازیٔ سربکف نے آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا، کہ
یہ کوتاہ بین و کور باطن کیا کہہ رہے ہیں؟ میدانِ عزیمت کا یہ شہسوار محمدیؐ علم
لہرائے آگے بڑھتا ہی چلا گیا، راستہ کی تاریکی اس کے انوارِ شریعت و طریقت سے چھٹ
گئی، اس کا راستہ روکنے والوں کو غبار کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا، اور کانٹے بچھانے
والوں کو خود اسی راستہ سے گذرنا پڑا ع

چاہ کن را چاہ در پیش

ایک ہندی دوہا جو غالباً عبدالرحیم خانِ خاناں کا ہے حسبِ حال نظر آتا ہے ؎

جو تو کو کانٹا بوئے، تاہی بوئے تو پھول
تو کو پھول ہی پھول ہیں واکو ہیں ترسول

(ترجمہ) "جو تیرے لیے کانٹے بوئے تو اس کے لیے پھول بو، تیرے لیے تو پھول کے پھول ہیں اور اس کے لیے تین تین نوک والے کانٹے"۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ عفو و درگذر کا پیکر تھے، انھوں نے اپنے مخالفوں کے لیے کبھی بد دعا نہیں فرمائی، بلکہ دعائے نیم شبی میں سب کے لیے اپنے مالک سے فضل و انعام اور عفو و مغفرت مانگتے رہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات اکثر و بیشتر سننے میں آتے رہے ہیں، راقم سطور نے جناب عطاء الحق و حافظ عبدالرحمٰن جالندھری (حال مقیم محلہ گورونانک پورہ، فیصل آباد) جو سیدی و مولائی قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء) سے تعلق بیعت رکھتے ہیں، کی زبانی بعض ناخوشگوار واقعات کئی مرتبہ سُنے، ان واقعات کے وہ ثقہ راوی ہیں، نتائج کے بارے میں اُن کی حیثیت عینی گواہوں کی ہے۔

رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ میں ان واقعات کو سپردِ قلم کرنے کی نوبت آگئی، بھائی عطاء الحق بیان کرتے گئے اور میں قلمبند کرتا چلا گیا، یہ واقعات حقیقت ہیں افسانہ نہیں، قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ جگر گوشۂ رسول ؐ کی توہین کرنے والوں کا حشر کیا ہوا؟

تقسیم برصغیر (اگست ۱۹۴۷ء) سے چند ماہ پیشتر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ دیوبند سے پنجاب تشریف لائے، مختلف شہروں میں رونق افروز

ہوئے، مقصدِ سفر پورا کرنے کے بعد لاہور سے کالکا میل میں سوار ہوئے، اسی گاڑی سے مشہور مسلم لیگی لیڈر راجہ غضنفر علی خاں کے سفر کا پروگرام بھی تھا، اس کا سفر ملتوی ہو گیا، لیکن پروگرام کے مطابق ہر اسٹیشن پر مسلم لیگی کارکن استقبال کے لیے موجود تھے،

جب گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو مسلم لیگی کارکن راجہ غضنفر علی خاں کو تلاش کرنے لگے، ریلوے گارڈ نے کارکنوں کو بتایا کہ راجہ صاحب کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے، وہ اس گاڑی سے سفر نہیں کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس نے شرارتاً انھیں بتایا کہ اس گاڑی کے فلاں ڈبے میں مولانا حسین احمد مدنی سفر کر رہے ہیں، اس پر وہ تمام مسلم لیگی کارکن اس ڈبے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور حضرتؒ کے خلاف نعرہ بازی اور ہلڑ بازی شروع کر دی، ٹماٹر وغیرہ ان پر پھینکنے لگے، اتفاقاً امرتسر کا ایک نوجوان عبدالرشید اپنا مال بُک کرانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا، اس نے ایک ڈبے کے پاس ہجوم دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ کے ساتھ یہ لوگ نہایت بدتمیزی کر رہے ہیں، وہ حضرت مدنیؒ کو جانتا بھی نہیں تھا،

بھائی عطاء الحق صاحب کو یہ واقعہ خود عبدالرشید نے راولپنڈی میں سُنایا، وہ امرتسر کے بعد راولپنڈی میں مقیم ہوا، یہاں بھی وہ یہی کاروبار کرتا تھا، عبدالرشید نہایت صحت مند نوجوان تھا، اس نے جان پر کھیل کر حضرت مدنیؒ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا ـــــ مجمع ڈبے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، عبدالرشید ڈبے کے دروازہ میں پائدان پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا، مسلم لیگی مجمع اس پر ٹوٹ پڑا، اور اس کو بے دریغ زدوکوب کیا، حتیٰ کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے، لیکن اس مردِ مجاہد نے حضرت مدنیؒ کی طرف ہجوم کو بڑھنے نہ دیا، حتیٰ کہ گاڑی چل پڑی

اور وہ پلیٹ فارم پار کرنے کے لیے گاڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا،
جب یہ گاڑی جالندھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی یہاں کے مسلم لیگی کارکن بھی راجہ غضنفر علی خاں کے استقبال کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھے، گاڑی رکتے ہی گارڈ نے انھیں راجہ غضنفر علی خاں کے پروگرام کے التوا کی خبر دی اور حضرت مدنی رح کی نشاندہی کی جس پر وہ مجمع حضرت رح کے ڈبے پر جا پہنچا، اور وہی طوفانِ بدتمیزی شروع کر دیا، اس مجمع کے سرغنہ تین مسلم لیگی نوجوان شمس الحق عرف شمی، فضل محمد اور فتح محمد تھے،

فضل محمد اور فتح محمد جالندھر کے محلہ پرانی کچہری اور شمس الحق عرف شمی محلہ عالی کا رہنے والا تھا، انھوں نے حضرت اقدس مدنی رح کی توہین میں کوئی کسر نہ چھوڑی، گالیاں دیں، گندی چیزیں پھینکیں، حضرت کا تکیہ چھینا، ٹوپی بھی اتار کر پھینک دی، ریش مبارک نوچی، اور شمی نے تھپڑ بھی مارا، حضرت مدنی رح صبر جمیل کی مجسم صورت بنے بیٹھے تھے، حضرت رح کے ساتھ ایک خادم بھی تھا وہ اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکا، اس نے مزاحمت کا ارادہ کیا، تو حضرت رح نے اس سے منع فرمایا کہ تم خاموش رہو، اگر تم برداشت نہیں کر سکتے تو دوسرے ڈبہ میں چلے جاؤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اتنے میں گاڑی چل دی، اور مسلم لیگی کارکن اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے،

صبح کو ان مسلم لیگی کارکنوں نے فخریہ انداز میں رات کا واقعہ اپنے محلہ پرانی کچہری میں بیان کیا، اس محلہ میں خانقاہِ عالیہ رائے پور (ضلع سہارنپور) سے تعلق رکھنے والوں کا ایک نہایت بااثر حلقہ تھا، یہاں قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوری اور حضرت منشی رحمت علی صاحب قدس سرہما کی تشریف آوری ہوتی تھی، ان لوگوں نے جب حضرت اقدس مدنی رح کی توہین کا

روح فرسا واقعہ سُنا تو اس پر ان کا نہایت شدید اثر ہوا، عبدالحق چوہدری بن چوہدری فضل محمد (حال مقیم گلی نمبر ۴ محلہ گورو نانک پورہ فیصل آباد) نے فتح محمد کی زبانی گستاخانہ کلمات سُنے تو وہ برداشت نہ کر سکے، انھوں نے موقع پر ہی اس کا گریبان پکڑ لیا، اور کہا کہ اب بتا ورات کا کیا قصّہ ہوا تھا؟ اور ساتھ ہی زوردار تھپڑ بھی اسے رسید کر دیئے، جس پر فتح محمد جو فخریہ اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا ساکت ہو گیا، اور اسے جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کوئی بات کر سکے، اتنے میں چوہدری امام الدین صاحب (والد بھائی عطاء الحق صاحب) بھی آ گئے، انھیں جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے اپنا جُوتہ اُتار لیا، اور فتح محمد کی خوب پٹائی کی، حتٰی کہ فتح محمد نے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگی، چوہدری امام الدین صاحب نے یہ تنبیہ عام کر دی کہ اگر کسی نے ہمارے بزرگوں کے خلاف زبان درازی کی... تو اس کا حشر بُرا ہوگا ہم اسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر چھوڑیں گے،

دوسرے سرغنہ فضل محمد کا حشر یہ ہوا کہ وہ رات کو جب اپنے گھر واپس پہنچا تو اسے بخار ہو گیا، صبح بیدار ہوا تو اس کی پشت پر دو پھوڑے (دنبل) ظاہر ہوئے، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر چارپائی سے اُٹھنے کے قابل نہ رہا، اور سخت تکلیف میں کراہتا تھا، پانچ چھ روز کے بعد چوہدری امام الدین نے اس کی والدہ سے (جو دکان پر سودا خریدنے کے لیے آئی تھی) پوچھا کہ فضل کئی روز سے نظر نہیں آیا، اُس نے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہے، اُس کی پُشت پر پھوڑے نکل آئے ہیں، ـــــ بھائی عطاء الحق صاحب کا بیان ہے کہ پھوڑوں میں کیڑے پڑ گئے، اور انھوں نے جسم کھانا شروع کر دیا، پھوڑے تین اِنچ قطر سے کم نہ تھے، ڈاکٹروں نے تجویز دی کہ ان ناسوروں میں روزانہ قیمہ بھر دیا جائے تاکہ کیڑے جسم کو نہ کھائیں، چنانچہ روزانہ پاؤ پاؤ بھر قیمہ ان دونوں ناسوروں

میں بھرا جاتا تھا، دن بھر میں کیڑے اس کو کھا جاتے تھے، دوسرے روز نئے سرے سے قیمہ بھرا جاتا تھا، چند ماہ بعد ملک تقسیم ہو گیا، اور آبادیوں کا تبادلہ شروع ہوا، محلہ پُرانی کچہری کے سب لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ریفیوجی کیمپ واقع جالندھر چھاؤنی میں منتقل ہو گئے، لیکن خدا کی شان کہ فضل محمد اور فتح محمد اپنے اہل وعیال سمیت وہیں رہے، حالانکہ ان کے رشتہ داروں نے ہر چند اصرار کیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ ساتھ آجاؤ، لیکن انھوں نے کسی کی نہ مانی،

دوسرے دن فضل محمد اور فتح محمد نکلنے پر مجبور ہوئے، فضل محمد ایک ہندو کارخانہ دار بھولا ناتھ کا ملازم تھا، وہ مع اہل وعیال اس کے ہاں چلا گیا، فتح محمد بھی پناہ حاصل کرنے کی غرض سے اپنی بیوی اور چھ سات بچوں کے ساتھ نکلا، لیکن راستہ ہی میں ایک سکھ جتھے کے ہاتھوں ریلوے پھاٹک (نزد اڈہ ہشیارپور) اہل وعیال سمیت بُری طرح سے قتل کر دیا گیا،

فضل محمد چھ سات روز کے بعد اپنے مالک بھولا ناتھ کی مدد سے ریفیوجی کیمپ (واقع جالندھر چھاؤنی) میں اہل وعیال سمیت پہنچ گیا، فضل محمد مرض سے اس قدر تنگ آچکا تھا کہ وہ موت کی دعائیں کرتا تھا، چاہتا تھا کہ کوئی اسے مار ڈالے، لیکن قدرت تو اسے نمونۂ عبرت بنانا چاہتی تھی، وہ زندہ سلامت لاہور پہنچ گیا، محلہ پُرانی کچہری جالندھر کے تقریباً تمام افراد انجینیرنگ کالج کے ہوسٹل نزد ریلوے اسٹیشن عقب آسٹریلیا بلڈنگ میں یکے بعد دیگرے آکر مقیم ہوتے رہے، فضل محمد بھی بیوی بچوں سمیت وہاں آ گیا، اس کی حالت یہ تھی کہ دن رات بے چین و بے قرار رہتا تھا، اور ہر وقت تکلیف سے کراہتا تھا، اس کی نیند حرام ہو چکی تھی، وہ ننگے بدن صرف ایک تہبند باندھے رہتا تھا، اس حالت میں وہ ایک ماہ لاہور میں مقیم رہا، پھر وسط اکتوبر میں وہ فیصل آباد آ گیا، اور محلہ گورونانک پورہ گلی نمبر ۴ جہاں محلہ پرانی کچہری

جالندھر کے رہنے والے بیشتر لوگ آباد ہو چکے تھے، وہیں آ گیا، اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا، یہاں چند ماہ بعد اس کا اسی بیماری کی حالت میں انتقال ہو گیا، اس کی میت کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس کی لاش ایسی متعفن ہو گئی تھی کہ غسل دینے کو کوئی تیار نہیں ہوتا تھا، بڑی مشکل سے لوگوں نے اپنے ناک منھ پر کپڑا باندھ کر یونہی پانی بہا دیا، اور جلد از جلد قبرستان لے جا کر دفن کر دیا،

اب شمس الحق کا حال سنیے! یہ شخص جالندھر سے فیصل آباد آ کر آباد ہوا، یہاں آ کر بھی مسلم لیگی کارکن کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کام کرنا شروع کیا، جلسوں میں بڑے زور شور سے تقریریں کرتا تھا، اس نے ایک اخبار "انصاف" بھی جاری کیا، لیکن اس شخص کو کبھی بھی چین نصیب نہ ہو سکا، راقم سطور نے بھی اس کو اچھی طرح سے دیکھا ہے، وہ بڑا بد مزاج اور زبان دراز شخص تھا،

بھائی عطاء الحق کا بیان ہے کہ میں ڈی، سی آفس میں بطور کلرک ملازم تھا، میرے پاس پریس سے متعلقہ کام بھی تھا، شمس الحق اخبار کے سلسلہ میں اکثر میرے پاس آتا جاتا تھا، سنہ ۱۹۴۹ء کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ اخبار کے ڈیکلریشن کے سلسلے میں وہ میرے پاس آیا، اور تقریباً آدھ گھنٹہ کاغذات کی تکمیل کے سلسلے میں میرے پاس بیٹھا رہا، کاغذات مکمل کرنے کے بعد مجھے دے کر چلا گیا، آخری دفعہ اسے کچہری کے گیٹ پر دیکھا گیا، اس کے بعد آج تک اس کا پتہ نہیں مل سکا، اس کے اغوا کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی، اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے، پاکستان بھر میں پوسٹر لگے، پتہ دینے والے کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا، انجمن مہاجرینِ جالندھر نے ملک گیر تحریک چلائی، کئی وفود وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملے، حکومت کی طرف سے یقین دہانیاں بھی ہوئیں لیکن جگر گوشۂ رسول ؐ کی توہین کرنے والے شقی کا نام و نشان تک نہ مل سکا۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

میاں عبدالغنی قدیم متوطن محلہ عالی جالندھر مسلم لیگ کا سرگرم رکن تھا، تقسیم ملک کے بعد وہ فیصل آباد میں مقیم ہوا، شمس الحق عرف شمسی کے ساتھیوں میں سے تھا، اخبار "انصاف" کا ڈیکلریشن اس کے نام تھا، آخر عمر میں اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا، وہ اکثر دبستر یہ کہا کرتا تھا کہ میری جو یہ حالت ہے یہ محض حضرت مدنیؒ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ہے،

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارْ

از ماھنامہ "النصیحۃ" چارسدہ
(رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۶ھ)

ضمیمہ نمبر ①

شیخ الاسلام
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
سے متعلق

ضمیمہ اوّل:

(۱)

مولانا حسین احمد مدنی پر دوسرا قاتلانہ حملہ

(ڈاک کے ذریعہ) بھاگل پور میں عام جلسہ ہونے والا تھا، جس کے لیے مولانا حسین احمد مدنی صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر مسلم لیگی عوام کے فساد پسند عنصر نے، جن میں مسلم ہائی اسکول کے طلبا بھی شامل ہیں، ان کی شان میں گستاخی کی۔ جب مولانا جلسہ گاہ میں جانے کے لیے موٹر میں بیٹھے، تو غنڈوں نے جمع ہو کر ان پر پتھر اور اینٹیں برسائیں اور پیچھے سے مولانا حسین احمد صاحب پر چھرے سے حملہ کیا، لیکن اتفاق سے وار خالی گیا اور چھرا موٹر کے پچھلے حصے کے پردے پر پڑا، جس پر پردہ چاک ہو گیا اور مولانا بال بال بچ گئے۔ (زمزم، لاہور ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۲)

مولانا مدنی پر حملے کی مذمت

دہلی ۱۹ر اکتوبر (بذریعہ ڈاک) مجلس احرار صوبہ دہلی کی طرف سے جامع مسجد دہلی میں جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت مدنی پر سید پور میں جو حملہ ہوا، اس کی شدت سے مذمت کی

گئی اور مسٹر جناح سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس قسم کی حرکات کو روکیں اور علمائے کرام سے معافی مانگیں۔ (زمزم، لاہور، ۲۷؍اکتوبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۶)

(۳)

مولانا حسین احمد مدنی پر قاتلانہ حملہ

ہندوستان کے گوشے گوشے سے احتجاج

۱۔ مظفر پور (بذریعۂ ڈاک) سید پور کے اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی پر جو حملہ لیگیوں نے کیا، اس کے خلاف ایک جلسے میں مظفر پور کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔

۲۔ عالم گڑھ: جامع مسجد میں جلسۂ احتجاج منعقد ہوا، جس میں مولانا حسین احمد صاحب پر جو حملہ سید پور میں ہوا، اس کی شدید مذمت کی گئی اور اس کے خلاف اظہارِ نفرت کیا گیا۔
(نامہ نگار)

۳۔ آج مورخہ ۱۲؍ذیقعدہ ۱۳۶۴ء مطابق ۱۹؍اکتوبر ۱۹۴۵ء یوم جمعہ کو مولانا محمد انور صاحب ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے قصبہ اپرہ نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کے قاتلانہ حملے کے متعلق جو بیان مولانا ریاض الدین احمد صاحب نے اخبارات میں دیا، پڑھ کر سنایا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پر جو قاتلانہ حملہ مسلم لیگیوں نے کیا ہے علاقے بھر میں غصے اور ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام طرف نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مدنی مدظلہ کی عمر دراز کرے۔

۴۔ میمن سنگھ: (بذریعۂ ڈاک) جمعیت علما کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں سید پور میں مولانا سید حسین احمد مدنی پر جو حملہ کیا گیا ہے، اس کی پرزور مذمت کی گئی اور لیگ

والوں کو اس قسم کی حرکات کے نتائج پر متنبہ کیا گیا۔ (غلام ربانی)

۵۔ مراد آباد: حضرت شیخ الہند پر جو حملہ ہوا، اس کا حال سن کر سخت صدمہ ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان اپنے پیروؤں کو روکیں۔ (بشیر احمد غازی پوری)

۶۔ دربھنگہ: حکیم شمس الحق صاحب انصاری مومن انصار لیڈر نے ایک بیان میں مولانا حسین احمد صاحب پر لیگیوں کے حملے کی سخت مذمت کی ہے اور انصار نوجوانوں کو اس قسم کے حملوں کا سدِباب کرنے کے لیے تنظیم کی دعوت دی ہے۔ (عبدالوحید انصاری)

۷۔ قصبہ کھلہ: ضلع سورت کے ایک جلسے میں بھی مولانا حسین احمد پر گیا اور سید پور میں لیگیوں کے حملے کی مذمت کی گئی۔ (عبدالحمید خان)

۸۔ ڈہری: (بہار) ایک جلسہ میں بھاگلپور اور سید پور کے مخالفینِ حق کی حرکاتِ ناشائستہ پر اظہارِ نفرت کیا گیا۔ (نامہ نگار)

۹۔ راندیر: ضلع سورت میں جامعہ حسینیہ میں جلسہ ہوا، جس میں لیگ والوں کے اس اشتعال انگیز رویے کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ وہ علما پر خصوصاً مولانا حسین احمد مدنی پر متشددانہ حملے کرتے ہیں۔ (نامہ نگار)

۱۰۔ کرت پور میں بھی اشرف صاحب کی صدارت میں احتجاجی جلسہ ہوا۔ (ابوالکلام بہاری)

۱۱۔ سہارن پور میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے میں، جو مولوی عبدالحق ایڈوکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا، مولانا حسین احمد پر حملے کی مذمت کی گئی۔

۱۲۔ جالندھر میں مجلسِ احرار کے زیرِ اہتمام جلسۂ مذمت منعقد ہوا۔ (بایزید احمد)

مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا نیشنل گارڈ

نگینہ ۲۱ر اکتوبر شیخ اسلام حضرت مولانا مدنی کے ساتھ گستاخی کے ردِ عمل اور آیندہ الیکشنوں میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے اُمیدوار کو کامیاب بنانے اور اُنھیں مسلم لیگ کے

شرارت پسند حامیوں کی یورش سے بچانے کے لیے ہم دو ہزار نوجوانوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ (قاضی محمد یوسف علی)

(زمزم، لاہور، ۲۷/ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۴)

مسٹر جینا اور لیگ کے ہائی کمانڈ کو تنبیہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا بیان

میں سفر میں تھا کہ لیگی اخبارات میں اس توہین آمیز سلوک کی تفصیلات پڑھیں، جو صدر جمعیت علما شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مد ظلہ کے ساتھ ذمہ دار لیگیوں نے روا رکھا۔ یہ غیر اسلامی، قابلِ نفرت و حقارت سلوک اور بد اخلاقی کے مظاہرے ناقابل برداشت ہیں اور ہمارے صبر و ضبط کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ سیاسیات سے جدا بھی حضرت مولانا کے لاکھوں عقیدت مندوں میں اس طرزِ عمل کے خلاف نفرت اور بے چینی کے جذبات مشتعل ہو رہے ہیں۔

میں جمعیت العلمائے ہند کی ذمہ دارانہ پوزیشن میں مسٹر جینا اور لیگ کے ہائی کمانڈ کو وارننگ دیتا ہوں کہ وہ جلد از جلد اس مذموم طریقۂ عمل کے خلاف لیگی حلقوں کو تنبیہ کر دیں۔ ورنہ اس کے نتائجِ بد کی تمام تر ذمہ داری مسٹر جینا اور لیگ ہائی کمان پر ہو گی۔

چوں کہ الیکشن کا زمانہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور تمام جماعتیں اپنے نمائندگان کے لیے پروپیگنڈہ کرنے میں مصروفِ عمل ہیں، اس لیے میں حکومتِ ہند اور گورنر جنرل کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی ناپاک غنڈہ گردی کے خلاف

اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کریں، ورنہ منجملہ دیگر امور کے یہ صورتِ حال بھی اس حقیقت کے لیے روشن دلیل سمجھی جائے گی کہ حکومت آزادی خواہ جماعتوں کے خلاف لیگ کی غنڈہ گردی کی حمایت کو اپنے مقصد کے لیے مفید سمجھتی ہے۔

(زمزم۔لاہور، ۲۷/ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۵)

لیگی غنڈوں کی مذمت

۲۶/ اکتوبر بعد نماز جمعہ قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں مسلمانان مبارک پور کا ایک جلسہ ہوا۔ صدارت صدر المدرسین مدرسہ احیاء العلوم نے فرمائی۔ مولانا عبدالباری صاحب قاسمی رکن جمعیت علماے ہند نے لیگ کی غنڈہ نواز پالیسی پر تنقیدی تقریر فرمائی اور ایک تجویز پاس ہوئی جس میں مسلم لیگ کی غنڈہ گردی اور شرارت پسندی کے خلاف، جو مسلم لیگ ہائی کمانڈ کی شہہ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی نیز دوسرے رفقاے کار کے خلاف قاتلانہ حملوں اور سوقیانہ حرکات کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں، زبردست نفرت و غصے کا اظہار کیا گیا ہے اور لیگ کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اب اس قسم کی کوئی غیر انسانی اور وحشیانہ حرکت ہوئی تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے، جس کی ذمہ دار خود لیگ ہوگی۔

(زمزم۔لاہور، ۳/ نومبر ۱۹۴۵ء)

(۶)

اوکاڑہ میں مجلسِ احرار اسلام کا جلسہ

مجلس احرار اسلام اوکاڑہ کی طرف سے مسلمانانِ اوکاڑہ کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں حکیم محمد بخش صاحب کامل جالندھری نے لیگیوں کے رویے کی پرزور مذمت کی اور فرمایا کہ موجودہ اراکین مسلم لیگ شرعی پاکستان میں رہنے کے قابل نہیں۔ ایک قرارداد میں مولانا حسین احمد پر سید پور میں جو حملہ ہوا، اُس کی مذمت کی گئی۔

ہر طرف سے اظہارِ ناراضگی واحتجاج

۱۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اور امام الہند ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیگیوں نے جو سلوک کیا وہ یقینی طور پر ناقابلِ برداشت ہے۔ مسٹر جناح کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو ان حرکتوں سے روک دے۔ (عبدالمجید خان)

۲۔ پانی پت: مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے تقریر کے لیے تشریف لائے، مگر لیگی گروہ نے ان کی تقریر میں شور مچایا، مگر جلسہ درہم برہم نہ کر سکے۔ یہ حرکات نہایت ناشائستہ ہیں۔ شرفا ان سے برا مانتے ہیں۔

۳۔ چونڈہ: ایک جلسے میں لیگ والوں کے خلاف مولانا حسین احمد صاحب پر حملے کی سخت مذمت کی گئی اور فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کو روکنے کا مطالبہ کیا گیا۔ (نامہ نگار)

۴۔ سہگاؤں الٰہ آباد: مولانا مسیح الدین ایک مراسلے میں علمائے کرام پر حملوں کی مثالیں دیتے ہوئے حضرت مولانا حسین احمد پر حملے کی مذمت کرتے ہیں۔

۵۔ الٰہ آباد: جامع مسجد میں احرار کارکنان اور جمعیت الانصار کا مشترکہ اجلاس ہوا، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی پر لیگی کارکنوں کے حملے کی شدید مذمت کی گئی اور فلسطین کو

عربوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور انڈین نیشنل آرمی کے افسروں اور سپاہیوں پر مقدمہ چلانے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ (نامہ نگار)

(زمزم۔ لاہور، ۷؍ نومبر ۱۹۴۵ء)

(۷)

مولانا سید احمد اکبر آبادی کا اظہارِ رنج

سید پور میں حضرت شیخ الاسلام کی توہین کے اندوہناک واقعے پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان کے "نظرات" میں بہ ایں الفاظ اپنے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے:

"پچھلے دنوں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ سید پور وغیرہ بعض مقامات پر جو انتہائی ناروا اور ناشائستہ معاملہ کیا گیا ہے اس کی تفصیلات اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کو پڑھ کر کوئی مسلمان تو کیا، ایک شریف انسان بھی ایسا نہ ہوگا جو رنج و افسوس اور شرم و ندامت سے اپنی گردن جھکانے پر مجبور نہ ہو۔ مولانا کی سیاسی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے، لیکن ورع و تقویٰ، علم و عمل، فداکاری و ایثار پیشگی تو مولانا کی وہ روشن صفات ہیں جن سے ان کے بڑے سے بڑے شدید مخالف کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ وہ بے شبہ ہندوستان کے علمائے اسلام میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس بنا پر جن لوگوں نے مولانا کی توہین اور ایذا رسانی کر کے اپنی وحشت و بربریت کا ثبوت دیا ہے، کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے اس فعل سے پوری قوم کو رسوا اور ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر جماعت اور ہر شخص کو اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کا پورا حق حاصل ہے، لیکن لاٹھیوں سے حملہ کرنا اور ٹوپی سر سے اُتار کر اسے جلا ڈالنا تو ایک ایسی کمینہ حرکت ہے جو کسی معمولی درجے کے انسان کے حق میں بھی روا نہیں رکھی جا سکتی، چہ جائیکہ ایک عالم جلیل القدر اور وارثِ علوم نبویہ کے لیے۔ اگر اخلاقی

جس کی آخری رمق بھی ہندوستان کے تیرہ نصیب مسلمانوں سے سلب نہیں کرلی گئی ہے تو انھیں سوچنا چاہیے کہ جس قوم کو حالتِ غیظ و غضب میں بھی بدگوئی اور زشت کلامی سے منع کیا گیا ہے، اگر وہ اپنے کسی سربرآوردہ رہنما کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور شرافتِ انسانی سے بیزاری کا ہی اعلان نہیں کرتی، بلکہ دوسری قوموں کو اپنے اوپر ہنسنے کی دعوت بھی دیتی ہے اور جب کوئی قوم اخلاقی اعتبار سے اس درجہ پست سطح پر اتر آئے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس کے فوز و فلاح کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے"۔

"آنحضرت ﷺ کا حکم ہے کہ دوسری قوموں کے بڑے آدمیوں کا بھی اعزاز و اکرام کرو، پھر مسلمانوں کے لیے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی قوم کے کسی بزرگ کے حق میں، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، سب و شتم کریں اور اس کی توہین و اذیت رسانی کے درپے ہوں۔ مسلمانوں نے موجودہ بحرانی دور میں اگر اس ارشادِ نبوی کا پاس اور لحاظ رکھا تو وہ دوسروں کے لیے مکارمِ اخلاق کا ایک اچھا نمونہ بن سکتے اور بہت سے آفات و مصائب سے محفوظ رہ سکتے ہیں"۔

(برہان، دہلی، نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳،۴)

(۸)

حضرت مدنی کے خلاف سے

مولانا عبدالرؤف داناپوری کا انکار

جمعیت علماے ہند کے مقابلے میں جمعیت علماے اسلام قائم کرائی گئی تو اس کا اعتماد پیدا کرنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے گئے اور کیا کیا افترا پردازیاں عمل میں لائی گئیں،

اس کا کچھ اندازہ مولانا محمد کفیل اور مولانا عبدالرؤف (داناپوری) کی اس مکاتبت سے ہوتا ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے !

محترم انتقام حضرت مولانا دام اللہ فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج شریف!

باعث تصدیعہ یہ امر ہے کہ مجھے کل ایک صاحب نے جمعیت علماے اسلام کلکتہ کی طرف سے مطبوعہ دوورقہ دکھایا جو کہ آنجناب کے اور مولانا محمد قریش صاحب ناظم جمعیت العلمائے اسلام کلکتہ کے دستخطوں سے شائع کیا گیا ہے۔ اس قرطاس میں عبارتِ ذیل مرقوم ہے :

"افسوس ہے کہ دہلی کی نام نہاد جمعیت علما کچھ عرصے سے امت سے منقطع ہو گئی ہے اور نہ صرف جمہور امت بلکہ علماے حق کے اصول مسلمہ کے خلاف حقیقی اسلامی نصب العین سے منحرف ہو کر ہندو کانگریس کی قومیت متحدہ واشتراکیت کی جاہلیت جدیدہ کی حمایت کر رہی ہے۔

جمعیت علما کانگریس علانیہ روسی دہریت وزندقہ اور کانگریسی الحاد وضلالت کی تبلیغ و تائید کر رہی ہے ایک کافر مشرک ہندو کو اپنا سیاسی لیڈر مان چکی ہے۔ جمعیت کا صدر کانگریسی مہاتما کی قیادت میں کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا رکن بن چکا ہے اور یہ جمعیت دین و ملت کو قربان کر کے ہنود کی سیاست کی پیروی کر رہی ہے"۔

سطور مذکورۃ الصدر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جمعیت علماے ہند، جس کے صدر مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ہیں، وہ معاذاللہ مرتد ہو چکی ہے۔ اس کے صدر اور تمام اراکین مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد طیب صاحب وغیرہ وغیرہ دینِ اسلام سے خارج ہیں۔ آنجناب میرے نزدیک محترم ہستی اور ذی علم شخصیت ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آنجناب نے یہ فتویٰ دیا ہو۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے ؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر بلا خوف لومہ لائم اپنی برأت کا اعلان فرمادیں اور اگر فی الواقع یہ آپ کا فتویٰ ہے تو کیا یہ تمام بزرگانِ دین اور جملہ اراکین اور لاکھوں مسلمان جو جمعیت علماے ہند کی پالیسی

سے اتفاق رکھتے ہیں، ملحد اور زندیق ہیں؟ آپ کی نظر میں امتِ مسلمہ کے اندر اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے؟ (خادم العلما محمد کفیل غفی عنہ)

جواب

مولانا مد ظلہ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

جناب کو معلوم ہے کہ چار پانچ مہینے پر مکان سے آیا ہوں۔ نئی جمعیت کے کاموں کا ابھی مجھے بالکل علم نہیں۔ جناب مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب، جناب مولوی محمد طیب صاحب وغیرہ کی شان میں ہرگز میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔ ان حضرات کی رائے سے مجھے کچھ اختلاف ہے، مگر میں ان حضرات کو علم اور تقویٰ کے اعتبار سے بہت ہی بلند سمجھتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ نعوذ باللہ ان حضرات کے خلاف کفر کا فتویٰ دے سکوں۔ جس مضمون کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، اس کو دیکھ لوں تو کچھ عرض کر سکوں گا۔ (عبد الرؤف عفی عنہ)

(زمزم، لاہور، ۲۳ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۵)

(۱۰)

ایک اتہام کی تردید

دہلی کے ایک گورنمنٹ پرست لیگی اخبار "منشور" ۱۶ / دسمبر ۱۹۴۵ء میں شیخ الاسلام مولانا مدنی کے خلاف زہر اگلا گیا ہے، جو سراسر جھوٹ اور تہمت تراشی پر مبنی ہے۔ طلبائے دارالعلوم آج سے نہیں اور اس تقریر کے بعد سے نہیں، بلکہ جب سے حضرت مولانا آسام سے دیوبند تشریف لائے ہیں ان کے جاں نثار اور وفادار خادم ہیں۔ اس سے پہلے بھی مولانا مدظلہ کو دارالعلوم سے علاحدہ کرنے کی کوششیں کی گئیں، مجلس شوریٰ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ نے اپنی پارٹی کے ساتھ ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ان حضرات کا وہ عبرت ناک انجام جو قدرت کے ہاتھوں ان کے اوپر نازل کیا گیا، دارالعلوم کی مقدس سرزمین کبھی نہ بھولے گی۔ بعینہٖ من حفر بئرً الاخیہ فقد وقع فیہ والی مثال صادق آئی۔ مجھے ارباب مسلم لیگ بتائیں کہ اس وقت بھی طلبہ کا کس قسم کا ہاتھ تھا؟ کیا وہ قدرت کا خاموش انتقام نہ تھا؟

"منشور" لکھتا ہے کہ دارالعلوم کا علمی ماحول مولانا مدنی کی سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ اللہ اکبر! اس قدر جھوٹ، اتنا بڑا افترا۔ الحمد للہ آج جب کہ بڑی بڑی برطانیہ پرست یونیورسٹیوں کے طلبہ الیکشن میں پھنس کر درحقیقت درس و تدریس کو بھول گئے۔ دار لعلوم کی ہر درس گاہ طلبہ سے اتنی بھری ہوئی نظر آتی ہے کہ اکثر طلبہ کو باہر بیٹھنا پڑتا ہے۔ دن رات قال اللہ قال الرسول کی صدا گونجتی رہتی ہے۔

نامہ نگار "منشور" کی مجلس شوریٰ سے حسن ظنی ملاحظہ ہو، لکھتا ہے کہ "مولانا مدنی کو ڈر ہے کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عاید نہ ہو جائے"۔ سبحان اللہ! جس آہنی انسان کے فیصلے کو بڑی بڑی قوتیں نہ رد کر سکیں، برطانیہ اور اس کے وحشیانہ مظالم جس کے جذبۂ

آزادی کو نہ دبا سکے اسے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ پابند کر دے! کیسا معصوم تخیل ہے۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

آخر میں، میں تمام طلبائے دارالعلوم کی طرف سے کہتا ہوں کہ اگر اربابِ شوریٰ مولانا مدنی مدظلہ کو الگ کر سکتے ہیں اور ان کا یہ پروگرام ہے تو الگ کر دیں۔ کیوں کہ آفتاب آسمان کے ہر حصے سے روشنی پہنچاتا ہے۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ مولانا مدنی کو الگ کر کے اربابِ مسلم لیگ یا برطانیہ کے جی حضوریوں کے سنہرے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔ (فرید الوحیدی، دارالعلوم دیوبند)

(زمزم، لاہور۔ ۲۷/دسمبر ۱۹۴۵ء)

(۱۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان

جو بدعنوانیاں میرے ساتھ سید پور، کٹیہار، بھاگلپور (میں اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالوفا، مولانا محمد قاسم شاہجہان پوری اور مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کے ساتھ علی گڑھ، گیا اور کلکتہ میں لیگیوں نے جو خلافِ انسانیت اور اسلامیت سوز بدعنوانیاں کی ہیں، یا دہلی اور کان پور میں آزادی پسند مسلم جماعتوں کے ساتھ عمل میں لائی جا رہی ہیں، وہ یقیناً ملتِ اسلامیہ کے لیے شرمناک ہیں۔ میں ان تمام حضرات کی ہمدردیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے جلسے کر کے یا انفرادی طور پر احتجاجات کیے ہیں۔ مگر میں تمام مسلمانوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ صبر اور استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور ان بدنام کنندگانِ ملتِ اسلامیہ کے جواب میں کسی بدتہذیبی کو عمل میں نہ لائیں۔ حقیقی جواب اس کا

یہ ہے کہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے، امن وسکون کے ساتھ، مہذب طور پر پوری جدوجہ
جائے کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے نامزد کردہ امیدوار کامیاب ہوں۔ اگر آپ ایسا کرنے
فائز المرام ہوگئے تو لیگ اور اس کی مجرمانہ شوخیاں خودبخود مر جائیں گی اور ہندوستان آزا
کے کنارے پر پہنچ جائے گا۔ (دفتر جمعیت علمائے ہند، دہلی)

(زمزم، لاہور۔ ۳؍نومبر ۹۴۵

(۱۲)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ لیگیوں کا گستاخانہ سلوک

حضرت مولانا کا اپنا بیان

(خاص "زمزم" کا اپنا بیان)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے سید پور میں لیگیوں نے جو بدسلوکی کی، اس
متعلق مولانا ریاض الدین صاحب بانیِ دارالعلوم سید پور کا مفصل بیان اخبارات میں شائع
جو "زمزم" کے ۲۷؍اکتوبر کے شیوع میں بھی نکلا ہے۔ اس کے متعلق "زمزم"
حضرت مولانا کی خدمت میں ایک رجسٹری شدہ نیاز نامہ کے ذریعے سے درخواست
آپ ان واقعات کے متعلق اپنا بیان بھی "زمزم" میں اشاعت کی غرض سے بھیجیں۔ چنا
حضرت مولانا نے ازراہِ کرم مکتوب ذیل ارسال فرمایا، جو اپنی تفسیر آپ ہے۔ اس سے
لیگ کے ہائی کمانڈ کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرکے ا

نتائج شائع کرے، ورنہ لیگ کے سربر آوردہ ارکان بالعموم اور مسٹر جینا بالخصوص اس کے ذمے دار قرار پائیں گے۔

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔ مزاج شریف؟

والا نامہ باعثِ سر فرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس ہمدردی کا مزید شکریہ پیش کرتا ہوں، جو لیگیوں کی انسانیت سوز حرکات کے خلاف ظاہر فرمائی ہے۔ واقعہ اصل وہی ہے جو مولانا ریاض الدین صاحب نے ذکر فرمایا ہے۔ مولانائے موصوف کے صاحبزادے مولوی محمد صالح حیات میرے رفیق سفر تھے۔ موصوف سید پور محلہ بنگالی ٹولہ کے باشندے ہیں۔ عرصے سے مجھ کو ان سے شرفِ تعارف حاصل ہے۔ میں سونارائی ایک اپنے دوست آفندی احسان الحق مرحوم کی تعزیت کے لیے ان کے ورثاء (بیوی بچوں اور اعزہ) کے پاس گیا تھا۔ میری آمد کی اطلاع پر یہ حضرات آگئے تھے۔ سید پور کو وہاں سے لوٹتے وقت یہ حضرات ریل میں ساتھ ہی لوٹے تھے۔ احباب اہل سید پور کو پہلے سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ ہم شام کو ۹ بجے وہاں پہنچیں گے اور پھر صبح کو واپس ہو جائیں گے۔ اس اطلاع پر بغیر پوچھے ہوئے ہمارے ایک عنایت فرما حاجی محمد سعید صاحب پنجابی تاجرِ چرم نے شہر میں اعلان تحریر کر دیا کہ حسین احمد آج فلاں گاڑی سے آئے گا اور فلاں جگہ تقریر کرے گا۔ ہم بالکل بے خبر اسٹیشن سید پور پر اترے۔ ہم کو وہم و گمان جلسہ یا اس قسم کے بلوے کا تھا اور نہ اہل سید پور و احباب کو اور نہ ہمارے رفقا کو۔ اترنے کے ساتھ ہی ان بیوقوف لیگیوں نے وہ معاملات کیے۔ مولانا ریاض الدین صاحب موصوف اور ان کے اولاد و اصحاب ڈھال بنے ہوئے حملوں کو روکتے اور دفع کرتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، بلا مبالغہ اور صحیح ہے۔

ہاں میرے بعد کے جو واقعات لکھے ہیں ان کا مجھ کو علم نہیں۔ والسلام۔

ننگ اسلام
حسین احمد غفرلہ
وارد حال بجنور (یو۔پی)
(زمزم، لاہور۔ ۷ر نومبر ۱۹۴۵ء)

(۱۴)

مولانا حسین احمد

"بحث و مذاکرہ" کے کالم میں "زمزم" نے ذیل کا شذرہ شائع کیا ہے:

"موجودہ سیاسی ہنگامے سے پہلے اگر کوئی مسلمان شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مسٹر جناح میں مقابلے کی جرأت کرتا تو اس کے خبطی ہونے میں کسی کو شبہ ہوتا۔ اگر وہ مقابلے میں مسٹر جناح کو ترجیح دیتا تو اس کے الحاد پر تمام مسلمان چلا اٹھتے۔ اگر وہ ایک اور قدم آگے بڑھا کر مسٹر جناح کو امام بر حق قرار دیتا اور شیخ الہند کی اسلام دشمنی کا صور پھونکتا تو تصور کرو مسلمان کی مذہبی غیرت اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی؟ شور برپا ہو جاتا کہ اسلام کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے اور علم و جہل، نور اور تاریکی کا امتیاز مٹایا جا رہا ہے۔ مگر آج؟ اتفاقات ہیں زمانے کے! امت اسلامیہ کو یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ اسیر مالٹا، مسٹر جناح کی جگہ ہیں اور مسٹر جناح اسیر مالٹا کی جگہ! قائد اعظم پہلے کی طرح اب بھی مسٹر جناح ہیں، شکل و صورت، تہذیب و معاشرت میں نہ پہلے اسلام کے پیرو تھے، نہ اب ہیں، اسلامی ارکان و فرائض سے نہ پہلے تعلق تھا نہ اب کوئی تعلق ہے، نہ کبھی پہلے انگریز کے کوڑے کھائے نہ آیندہ کھانے کا ارادہ ہے، وہ ہر اعتبار سے "الآن کما کان" ہیں!

حضرت مدنی کا بھی یہی حال ہے وہ پہلے بھی مسجد نبوی کے شیخ الحدیث تھے اور اب بھی وراثت نبوی کی مسند پر سرفراز ہیں، شکل و صورت، خصلت و سیرت، پہلے بھی اسلامی تھی اور اب بھی اسی کی آئینہ دار ہے، وہ پہلے بھی انگریز کی نظروں میں کانٹا تھے اب بھی اس کی آنکھوں میں خار ہیں۔ مگر ذوق و مزاج کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی، حسین احمد کو گالیاں اور ملاحیاں اور جناح کو تحسین و آفرین! جانشین پیغمبر، شیخ الہند اور مالٹا بارہا کا عافیت کوش، شیخ الاسلام اور امیر المومنین!!!

سنا کرتے تھے کہ ہندی مسلمان کی مذہبیت بڑی پختہ ہے اور علما کی عقیدت اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے، مگر اس انقلاب نے اس خوش فہمی کی بھی پردہ دری کر کے رکھ دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ ایک مسٹر بھی جب چاہے نبوت کی بساط الٹ سکتا ہے،

ایک رند میں بھی یہ طاقت ہے کہ تقویٰ کے حلقوم پر چھری چلا کر روحانی نظام کو درہم برہم کر ڈالے۔

پنجاب کا مسلم پریس، حسین احمد کے نظریات پر تنقید نہیں کرتا، باؤلے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ نثر و نظم کی جولانیاں اس شخص کے خلاف وقف ہیں، جس کے سامنے احترام واطاعت کے لیے تمام سروں کو جھک جانا چاہیے۔ یہاں شیخ الہند اور شیخ الاسلام کا مقابلہ نہیں ہے، یہاں بیت الحرم اور بالا بارلی کا مقابلہ ہے۔ افسوس موجودہ سیاست کی بحرانیت پر کہ اسلام کا امیر المومنین گالیاں کھا رہا ہے اور خاموش ہے اور فرنگی تہذیب کا زائیدہ خراج تحسین وصول کر رہا ہے اور "مولویت" کے خاتمے پر مسرور ہے! خوب اسلام کو رسوا کرو، مگر یہ گمان مت کرو کہ اس کی پاداش سے بچ جاؤ گے اور حق و عدالت کی بارگاہ سے تمھارے خلاف کوئی فیصلہ صادر نہ ہوگا"۔

(زمزم۔ لاہور، ۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۱۴)

ایک نیا فتنہ

علماء دیوبند کے خلاف محاذ

آج کل دار العلوم دیوبند اور علمائے دیوبند کے خلاف ایک نیا محاذ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس "جہاد" کی وجہ یہ قرار دی گئی ہے کہ دیوبند کے صدر مدرس کانگریس کی حمایت کرتے ہیں۔ بعض مسلم لیگی اخباروں نے تو یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دیوبند کی امداد کرنا گویا مسلمانوں کے قتل میں امداد کرنا ہے! ایک لکھنوی معاصر (منشور کی طرف اشارہ ہے۔ مرتب) کے صفحات پر مسلسل مضامین شائع ہو رہے ہیں، جن میں دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ کو برا عظم ہند میں

سب سے سنگین اور عظیم خطرہ بتایا جارہا ہے، دارالسلام کو ایک "دیوتا استھان" قرار دیا جارہا ہے۔ صاف صاف دھمکیاں دی جارہی ہیں کہ "دیوبند کو فنا کر دیا جائے"۔ اور یہ سب اس لیے کہ مولانا حسین احمد صاحب کے سیاسی رجحانات کانگریس کی طرف ہیں۔

ہم ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کے سخت نقاد رہے ہیں اور آج بھی وہاں کے حالات سے مطمئن نہیں ہیں، لیکن عبرت ہوتی ہے مسلمانوں کے ایک گروہ کی اس ذہنیت کو دیکھ کر کہ وہ کس طرح جماعت بندی کے تعصبات سے مغلوب ہو کر خود اپنے قومی اداروں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ سیاست ایک ہنگامی اور وقتی کھیل ہے، لیکن قومی ادارے ہر قوم کی زندگی میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں، ان کو سیاست کا کھلونا نہیں بنایا جاسکتا۔ ہم دیوبند کے حالات سے کبھی بھی مطمئن نہیں رہے، لیکن پھر بھی اس کو مسلمانوں کا ایک مذہبی اور قومی مرکز سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ معاصرین دیوبند کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے مضامین لکھتے تو ہم سب سے پہلے ان کی تائید کرتے، اس لیے کہ ہمارا نقطۂ نظر دیوبند کے متعلق بھی وہی ہے، جو علی گڑھ کے نظم و نسق کے متعلق ہے اور ہم اس نظم و نسق کی خرابیوں کا ذمہ دار علی گڑھ کے وائس چانسلر کو سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے خلاف اپنے قلم کی قوت صرف کرتے ہیں اور اسی بدنظمی کا یہ نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ کا ضبط و نظم بھی برباد ہو گیا ہے۔

صورتِ حال کا اختلاف

اور جب وہ جماعتی سیاست میں اپنے ذہنی انتشار کے عامیانہ اور جارحانہ مظاہرہ کرتے ہیں تو ہم اس صورتِ حال کا الزام براہِ راست وائس چانسلر پر رکھتے ہیں، جنھوں نے طلبہ کو سیاسی میدان میں آلۂ کار بنالیا ہے۔ اگر یہی صورت دیوبند میں ہوتی اور ہم دیوبند کے طلبہ کو بھی اسی شدت اور بے اعتدالی کے ساتھ کسی سیاسی فریق کے خلاف یا موافق ہنگامہ کرتے دیکھتے تو بلاشبہ وہی سب دیوبند کے متعلق بھی کہتے جو علی گڑھ کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ لیکن دیوبند

میں صورتِ حال مختلف ہے اور حضرت مولانا حسین احمد عرلج تحسین کے مستحق ہیں کہ سیاست میں اپنے ذاتی عقائد کے تحت موصوف نے اپنے طلبہ کو آلۂ کار نہیں بنایا اور دار العلوم کے ضبط و نظم کو اپنی سیاست سے بالاتر رکھا۔ اگر ہم یہ سنتے کہ دار العلوم کے طلبہ نے دیوبند کے اسٹیشن پر کسی مسلم لیگی لیڈر کے خلاف اسی طرح بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا جس طرح علی گڑھ کے طلبہ نے اپنی تہذیب و تربیت کو رسوا کیا ہے، تو بلا شبہ ہم اس کا الزام مولانا کے سیاسی مشاغل پر رکھتے، جس طرح کہ ہم علی گڑھ کے ضبط و نظم کی خرابی کا الزام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی سیاسی خود غرضیوں پر رکھتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے میں لیگ کے سیاسی عقائد پر کانگریس کے سیاسی عقائد کو یا کانگریس کے عقائد پر لیگ کے عقائد کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہم صرف تعلیم، تربیت، تہذیب اور اخلاق اسلامی کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے طرزِ عمل کو دیکھ رہے ہیں اور اس حد تک ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مدنی نے اپنے سیاسی عقائد اور اپنے حلقۂ درس کے فرائض میں مناسب توازن قائم رکھا ہے۔

شرمناک حملے

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شرمناک حملے جو دیوبند پر کیے جا رہے ہیں، جماعتی تعصبات کا نتیجہ ہیں۔ اس ادنیٰ درجے کی سیاست نے، جس کو بہت سے مسلمانوں نے اپنا تمغۂ امتیاز بنا لیا ہے، اسلامی اور اخلاقی رواداری کو بالکل ختم کر دیا ہے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے سیاسی عقائد کا احترام کرنے پر آمادہ نہیں۔ ہر اختلاف مخالفت ہے اور مخالفت بھی ایسی کہ اشخاص سے گزر کر اداروں پر بیجا حملوں کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ سیاسی فتنہ دراصل ایک ذہنی فتنہ ہے۔ حضرت مولانا مدنی کے سیاسی عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اس اختلاف کی بنا پر دیوبند کو تباہ کرنے کی کوشش ایک حسرت ناک جہالت ہے۔ کتنا ہی بڑا سیاسی یا مذہبی مسئلہ زیرِ بحث ہو، اختلاف کتنے سخت ہوں، لیکن

کسی مسئلے کی اہمیت یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے لیے زبان اور قلم کی بد تمیزی اور بیہودگی اور غنڈہ پن جائز سمجھا جائے جو لوگ، خواہ وہ لیگی ہوں یا کانگریسی، اس قسم کی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ملک و ملت کے بد ترین دشمن ہیں۔ کسی مہذب اور ذمہ دار سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں اور وہ اس کے مستحق نہیں کہ ان کی بات کو توجہ کے ساتھ سنا جائے۔

الیکشن کے ہنگامے عنقریب برپا ہونے والے ہیں اور بہت سے بد لگام نوجوان لیڈروں کی فوج میں بھرتی کر کے اس میدان میں لائے جائیں گے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ ان لڑکوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں گی اور بد زبانی اور بد تمیزی کے عبرت مناظر دیکھنے میں آئیں گے، لیکن کم از کم ہم اپنے معاصرین سے اس قدر عرض کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ ایک معمولی اخلاقی معیار کو قائم رکھ کر ضبط و نظم کی طرف عوام کی رہنمائی کریں اور دنیا کو ایسی صحافت پر ہنسنے کا موقع نہ دیں جس کی عصبیت، سیاست کے عارضی ہنگاموں میں بے قابو ہو کو خود اپنی ہی قوم کے اخلاق کو بد نام اور رسوا کرنے کی ہمت افزائی کرنے لگے۔

(پیام دکن بہ حوالۂ زمزم۔ لاہور، ۳۰ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۱۵)

نادان دوست

(از جناب اظہر جلیل صاحب بجنوری)

ہندو اخبارات ان مسلمانوں کو جو مولانا آزاد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دوسرے کانگریسی کارکنان و لیڈران کے خلاف مظاہر کرتے ہیں، غنڈے، شہدے اور اسی قسم کے دیگر تلخ القابات سے یاد کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ کی حمایت میں جو لوگ مظاہرہ کرتے

ہیں ان میں سمجھ دار بھی ہوتے ہیں اور ایسے بھی جو سیاست کی ابجد سے معمولی شدھ بدھ بھی نہیں رکھتے، مگر ہندو اخبارات کی نظر میں سب شہدے، غنڈے اور اوباش ہیں۔ مسلم لیگی اخبارات ان کے جواب میں انھیں خطابات سے انھیں نوازتے ہیں۔ جو نائب رسول ہیں، ایثار پیشہ ہیں، قوم و ملت کی خاطر انھوں نے بارہا اپنے وجود کو خطرات میں ڈالا ہے، وہ آزمائشوں کی سخت سے سخت بھٹی سے پاک و صاف ہو کر نکلے ہیں، مگر آج قوم کی نظر میں وہ معتوب ہیں، مغضوب ہیں، کشتنی و گردن زدنی ہیں۔

غور کیجیے دُشنام طرازیوں اور تہمت تراشیوں کی زد میں کون لوگ آرہے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف ہو کر خون کی پیاس کو سب و شتم کے ذریعے بجھانا چاہتے ہیں۔ اب خبریں آرہی ہیں کہ ایک طرف احراریوں کا سر پھوڑنے کے لیے ملک لال خاں صاحب کی سرپرستی میں لٹھ بند فوج تیار ہو رہی ہے۔ یہ فوج کس کا سر پھوڑے گی، کس کا خون بہائے گی؟ کس کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر اپنے بیمانہ جذبات کو ٹھنڈا کرے گی؟ امتِ محمدیہ کے ان نام لیواؤں کا جن کا جرم صرف یہ رائے ہے کہ "کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کراؤ"۔

اسی طرح سننے میں آرہا ہے کہ رضا کارانِ احرار نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اگر کسی جگہ کانگریسی اور لیگی جلسوں، جلوسوں میں آپس میں ٹکر ہو جاتی ہے تو اخبارات میں سرخی آتی ہے کہ فلاں جماعت پٹ گئی، فلاں جماعت میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، فلاں نے اپنی تقریر میں یہ کہا اور وہ کہا۔ شاید اس قسم کی سرخیاں قائم کر کے ان اخبارات کا مقصد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو مرعوب کر سکیں گے۔ مگر اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ لوگوں کی طبیعتوں کا رجحان پہلے جس طرف کو ہو گیا تھا، اب بھی اسی طرف ہے، اس قسم کی سرخیوں سے سوائے اشتعال کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔ جس طرح ہندو اخبارات کی سرخیاں مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا سامان مہیا کرتی ہیں اسی طرح مسلم اخبارات کے نشتر

بھی مسلمانوں ہی کے کلیجوں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ ہندو کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کا کچھ نقصان ہوتا ہے، مگر مسلمانوں کے اندر بغض و عناد اور ایک دوسرے سے نفرت کے جذبات بڑھتے جارہے ہیں۔ اب تک تو اس قسم مظاہرے لیگ ہی کے طرۂ امتیاز بنے ہوئے تھے، مگر اب کلکتہ کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ ان مظاہروں کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ ابھی الیکشن دور ہے مگر فسادات کے خوابیدہ فتنے بیدار ہو کر ہاتھ منہ دھونے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

کاش مسلم اخبارات کے مدیر اب بھی ہوش کریں اور قوم کے سربرآوردہ حضرات اب بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔ مخالف کی آواز اور نعروں کی صداؤں کو تحمل سے برداشت کریں۔ ہر ایک کی تقریر سنیں اور دماغ سے فیصلہ کریں، پھر دماغ جس طرح راستہ دکھائے چلیں اور ووٹ دے کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ یہ ہماہمی بھی الیکشن تک ہے، اس کے بعد خود ہی یہ فتنہ فرو ہو جائے گا۔

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

(زمزم۔ لاہور، ۷/اکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۱۶)

شیطان کا عہدِ شباب

جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف ایک اشتہار شائع کیا گیا ہے۔ اس پر ایڈیٹر زمزم لاہور نے شذرات میں

"شیطان کا عہدِ شباب" کے زیرِ عنوان ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

ہمارے پاس الٰہ آباد سے ایک اشتہار پہنچا ہے، جس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک گفتگو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بارے میں نقل کی گئی ہے۔ یعنی حکیم الامت نے مولانا آزاد کو "پکا غیر مقلد" قرار دے کر فرمایا کہ وہ تو نجات کے لیے اقرارِ رسالت کو بھی ضروری قرار نہیں دیتے۔ بلکہ ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں کہ نجات صرف اسلام پر ہی موقوف نہیں، بلکہ توحید اور نیک اعمال کی برکت سے ہر مذہب والا نجات پانے کا مستحق ہے اور حضرت مولانا مدنی کے متعلق فرمایا کہ وہ "فنافی الکانگرس" ہو کر حدودِ شرعیہ سے متجاوز ہو چکے ہیں۔

جن صاحب نے جواب کے لیے ہمارے پاس اشتہار بھیجا ہے، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ الیکشن اور انتخاب کا زمانہ ہے، جس میں ہر قسم کے شیاطین رسیاں توڑ کر میدان میں آگئے ہیں۔ ابھی تو شیطنت کی ابتدا ہے، دیکھتے رہیے آگے کیا ہوتا ہے۔ یہ انتخاب ہے، انتخاب جو چن، چن کر جرائم پیشہ لوگوں کو میدان میں لاتا اور انگلیوں پر نچاتا ہے۔ مولانا رحمتہ اللہ کے مزاج سے جو لوگ واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ اس قسم کی بودی اور چھچھوری گفتگو مولانا کی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی رائیں تو قائد اعظم مسٹر جناح کے بارے میں بھی نقل کی جا سکتی ہیں۔ علامہ شبلی مرحوم، مولانا محمد علی مغفور اور دیگر اکابر احرار نے مسٹر جناح کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے انھیں پیش کرنا یقیناً دلآزاری کا موجب ہوگا۔

(زمزم، لاہور۔ ۳ر نومبر ۱۹۴۵ء)

(۱۷)

حق پر کون ہے؟

زمزم لاہور نے ایک شذرے میں روزنامہ انجام، دہلی کے ایک مقالہ افتتاحیہ کی زبان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لیگی اخبارات، اسلامی اخلاق تو دور کی بات، عام اخلاق و تہذیب سے بھی کتنے عاری ہو گئے تھے۔ زمزم نے یہ شذرہ "حق پر کون ہے؟" کے عنوان سے ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کے شمارے میں چھاپا تھا۔ ملاحظہ ہو:

"انجام" ہفتہ وار ایڈیشن مورخہ ۱۶ر دسمبر کے مقالۂ افتتاحیہ میں اپنے روزمرہ کے انداز میں لکھتا ہے کہ یہ بزرگ مولوی جو آج ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں، کانگریس کے زرخرید ہیں اور "ریاکار مولوی"۔ "کانگریس کے زرخرید مولوی" نہرو سے خطاب کیا ہے۔ سب سے پیشتر تو ہمیں ایڈیٹر انجام کی شرافت کا ماتم کرنا چاہیے کہ ان مولویوں کے بارے میں جن کی تمام عمر جیل کی چار دیواری میں مادرِ ہند کی آزادی کے لیے کٹی، یہی وہ مولوی ہیں جنھوں نے تفسیر قران لکھی، تمام عمر اسلامی تعلیمات میں صرف کی، آج ان کی قربانیوں اور اسلام کی خدمت کے صلے میں "ریاکار" اور "کانگریس کے زرخرید" وغیرہ کا خطاب دیا جارہا ہے۔ اختلاف صرف سیاسی ہے۔ ان ہی مولویوں کی دیانت داری کی ایک مثال ذیل میں درج ہے:

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں (میرٹھ ڈویژن) کے ایک کانگریسی نے مولانا حسین احمد مدنی کو ایک لاکھ روپیہ دینا چاہا، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ خواہ الیکشن ہار جانا پڑے، لیکن میں روپیہ نہ لوں گا۔ (ریاست، دہلی)

کاش یہ لیگی چند ووٹوں کے حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی بے بنیاد خبریں اور الزامات لگانے سے پرہیز کریں اور لفظ و قلم پر عوام کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کریں۔

ایڈیٹر انجام آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ یہ علما سیاست کو سمجھنے سے محروم

ہیں۔ لیکن مدیر انجام اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام اور سیاست علاحدہ علاحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ کوئی مولوی کانگریسی وزارت میں وزیر نہیں بنایا گیا اور نہ کوئی مولوی کانگریس کی مجلس عاملہ میں ہے۔ کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ جماعت جو مسلمانوں کی "واحد نمایندہ جماعت" کہتی ہے، اس نے اپنی وزارت کے زمانے میں کسی مولوی کو وزیر بنایا تھا؟ جہاں تک مجلسِ عاملہ کا سوال ہے خود مولانا آزاد صدر ہیں۔

(نامہ نگار)

(۱۸)

پاکستانی تہذیب کا نمونہ

زمزم، لاہور نے مذکورہ بالا عنوان سے ایک شذرہ لکھا ہے، جس سے لیگی اخبارات کی زبان اور رویے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زمزم لکھتا ہے:

"ہم نے پنجاب کے لیگی اخبارات کے متعلق بطورِ شکایت نہیں بلکہ بطورِ اظہارِ واقعہ عرض کیا تھا کہ انھیں اپنی زبان پر قابو حاصل نہیں ہے۔ ان کا شیوہ ہے کہ محض اختلافِ رائے کی بنا پر عقل و نقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر برہنہ ہو جاتے ہیں! خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ثبوت کے لیے زیادہ کاوش کرنی نہیں پڑی اور ایک لیگی معاصر نے فوراً ہماری امداد فرما کر ہمارے خیال پر مہر تصدیق ثبت فرما دی، وہ لکھتا ہے:

"ہمارے ان معلمِ اخلاق کی اپنی زبان اور اپنا لب و لہجہ ایسا ہے کہ لکھنؤ کی بھٹیاریاں بھی شرما جائیں، لیکن پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سہارن پور، مظفر نگر اور مراد آباد کی اطراف کے گھسیارے اور بھٹیارے فاقہ کشی سے مجبور ہر کو جب جوتیاں چٹخاتے ہوئے لاہور پہنچتے ہیں تو انھیں اپنے سے جاہل تر مالک اخبار مل جاتا ہے......"۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کے شریفانہ اندازِ تحریر سے کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہوتی تو مسٹر جناح سے ہوتی جو اس نجیب طبقہ کے امام اعظم ہیں اور جن کے آستانے سے شرافت کی یہ قاشیں تقسیم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ پاکستان کے علم برداروں کو عصبیت جاہلیہ کی کافرانہ ادائیں کچھ زیادہ زیب نہیں دیتیں۔ ایک طرف پاکستان کا نعرہ، تمام مسلمانوں کی واحد نمایندگی کا دعویٰ، اسلام اور شریعت کی بے تابانہ دہائی اور دوسری طرف صوبابہ پرستی کی غلاظت میں آلودگی ایک ایسی جاہلانہ منافقت ہے جس کی ایجاد کا فخر ہمارے معزز معاصر کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاید مسٹر جناح نے یونینسٹ پارٹی کے اختلاف کے موقع پر یہ غلط ہی کہا ہوگا کہ "پنجابیوں میں کوئی کریکٹر نہیں ہوتا" مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ قائداعظم کا غصہ "غریب" سہارن پور، مظفر نگر اور مراد آباد کے فاقہ کش گھسیروں اور بھٹیاروں پر اتارا جائے ؟ اور پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال کھڑا کر کے جاہلی تصور کے صنم اکبر کی پوجا شروع کر دی جائے ؟ ہمیں حیرت ہوتی اگر معزز معاصر یہ طرزِ نگارش اختیار نہ کرتا۔ اس نے ہماری توقع کے مطابق وہی کہا جس کا اظہار ہم گذشتہ اشاعتوں میں کر چکے ہیں۔ (زمزم، لاہور۔ ۱۹ر اگست ۱۹۴۵ء)

(۱۹)

تصویر کشی ـــ ایک غلط فہمی کا ازالہ

زمزم، لاہور نے پروین ناکمی صاحب کے خط کے جواب میں حضرت شیخ الاسلام کا ایک مکتوب گرامی شایع کیا ہے۔ پروین قاکمی نے ایڈیٹر زمزم کو جو خط لکھا تھا ایڈیٹر نے وہ خط حضرت کے مکتوب سامی کے ساتھ بہ طورِ تمہید شائع کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

السلام علیکم۔ آپ کی خدمت میں مولانا حسین احمد مدنی کے ایک گرامی نامہ کی نقل روانہ کر رہا ہوں جو کہ حضرت شیخ مدظلہ نے میرے ایک عریضے کے جواب میں ۵/ رمضان المبارک کو بنگال سے ارسال فرمایا تھا۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ لیگ کے صحافتی پلیٹ فارم سے ہر لیگی صحیفہ بالعموم اور "نوائے وقت" بالخصوص علمائے حق کے خلاف جو زہر افشانی کر رہا ہے وہ یقیناً تہذیبِ اسلامی پر ایک بد نما داغ ہے اور یہ فرنگی دماغ رکھنے والے انسان، مولانا حسین احمد مدنی کے فوٹو اور علامہ اقبال مرحوم کے شعر کو لے کر جو گندگی اچھال رہے ہیں، یہ خط ان کے دماغ پر آپریشن کا کام کرے گا۔ (پروین قاسمی)

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مزاج شریف۔ آپ کا والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا تھا۔ مگر اس قدر عدیم الفرصت تھا کہ باوجود ارادہ ارسال عریضہ نہ کر سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ شملہ میں متعدد دفعہ فوٹو گرافروں نے کوشش کی کہ وہ فوٹو کھینچیں مگر میں نے موقعہ نہیں دیا۔ آخری دن میں وہ ورکنگ کمیٹی کے کمرے میں گھس آئے اور تمام ارکینِ کمیٹی کا فوٹو لینے لگے۔ میں فوراً باہر چلا آیا۔ جب وہ بجلی کی روشنی ڈال کر ہر ہر سیٹ کا فوٹو لے کر باہر نکلے تو فوراً میں داخل ہو گیا۔ آزاد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے اور خارج ہوتے ہوئے بھی کئی مرتبہ انھوں نے کوششیں کیں، لیکن میں نہ ٹھہرا اور نہ ان کو موقعہ دیا۔ شملہ سے واپسی پر کالکا میں ایک شخص نے ایک انگریزی اخبار دکھایا جس میں یہ فوٹو تھا اور یہ فرمایا کہ یہ فوٹو کالکا میں لیا گیا ہے۔ یہ خبر دینے والے بابو امام الدین صاحب ریلوے چیکر تھے۔ دیکھ کر میں سخت متحیر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ کی روانگی کے وقت جب کہ موٹر کے متعلق انتظام کیا جا رہا تھا اور تم تینوں اسباب کے قریب کار کے پاس کھڑے تھے، اس وقت میں دور سے ایک شخص نے فوٹو لیا ہے۔ حاشا وکلا مجھ کو اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی اس میں میرے اختیار وارادہ کو بالکل دخل نہیں ہے۔

اس سے پہلے مالٹا جاتے ہوئے جیرہ میں اور دوسری مرتبہ نینی الٰہ آباد جیل میں فوٹو لیا جا چکا ہے۔ وہ اُسارت کا وقت تھا اور یہ بے خبری کا وقت ہے۔ لیگی حضرات کی یہ حرکات

مذبوحانہ ہیں۔ اس پر آپ کو متاثر نہ ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا معافی نامہ کاغذات میں ملنا مشکل ہے۔ عرصۂ دراز گزر گیا۔ اس زمانے میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا جواب میں خود رسالہ "متحدہ قومیت" میں لکھ چکا ہوں۔

"نوائے وقت" وغیرہ کیا کیا زہر افشانی پہلے کر چکے ہیں اور کیا کیا اب کر رہے ہیں، ان کا جواب دینا میرے خیال میں غلطی ہے۔ قدرت کو سونپنا چاہیے۔ منتقم حقیقی دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔ وعلی اللہ التکلان۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیے۔ واقفین مُدرسان حال سے سلام مسنون کہہ دیجیے۔ والسلام۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۵ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ، از مگال

(زمزم، لاہور۔ ۷ ار ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۲۰)

مولانا عبدالرحیم صاحب حوالدار کٹھور ضلع سورت کے نام حضرت شیخ الاسلام نے ایک خط میں یہ تحریر فرمایا ہے۔ لیگیوں کی جانب سے حضرت کے خلاف جو افسوس ناک اور توہین آمیز واقعات پیش آرہے تھے، اس پس منظر میں مولانا عبدالرحیم صاحب نے خط لکھا تھا۔ حضرت نے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا، اس کے بعد حضرت کے مقام فنافی اللہ کے بارے کیا کہا جاسکتا ہے۔

۱۳ ربیع الثانی ۶۵ھ (۱۵ ار فروری ۱۹۴۶ء)

اگر میں حق پر ہوں اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کر رہا ہوں تو غیروں اور اپنوں سے جو کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آرہی ہیں ان کے لیے اسلافِ کرام رحمہم اللہ تعالی کے احوال اور اعمال مشعلِ راہ ہیں، جو جو مصائب انبیاے کرام اور اولیاے عظام اور مقدس علماء کو

پیش آئے ہیں ان کے سامنے ہمارے مصائب تو وہ بھی نسبت نہیں رکھتے جو ذرے کو پہاڑ سے ہے، پھر اس پر کبیدگی اور قلق کیوں ہے۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل سے تو بشارت حاصل ہوتی ہے جس سے قبولیت عنداللہ کا پتہ چلتا ہے۔

اور اگر خدانخواستہ میں غلط راستے پر ہوں اور معاذ اللہ ضلال اور گمراہی میں پھنسا ہوا ہوں تو اس کا مستحق ہی ہوں۔

اللھم انی اعوذبك من ان اضل او اضل او ازل او ازل او اجهل او یجهد علی۔ آمین۔ (الجمعیت، دہلی۔ شیخ الاسلام نمبر ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۷)

(۲۱)

کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ اس پر اظہار ہمدردی اور رنج کے اظہار کے جواب میں حضرت شیخ الاسلام نے مولانا ابو سعید خدابخش ملتان کے نام ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا۔ یہ بیان حضرت کی للّٰہیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۲۴/ ذی الحجہ ۶۵ھ (۱۱/ نومبر ۱۹۴۶ء)

ملتان سے واپسی پر جو کچھ پیش آیا اس پر کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے۔ انبیاء علیہم السلام اور اسلافِ کرام کو کیا کیا نہیں پیش آیا۔ ہم جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے اور قبولیت واخلاص سے نوازے (آمین)۔ جو کہ تکدر فضا میں لیگیوں کی حماقت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور جس قدر عظیم الشان نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے اس سے عبرت حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے اور اپنے اپنے مقام پر امن وامان قایم کرنا اور فتنہ و فسادات کی شعلہ باری کی روک تھام کرنا ازبس ضروری ہے۔ غافل مت ہو جایئے۔ انگریز کی مساعی اور اس کے مقاصد یہ ہی ہیں۔ چرچل کی تقریر اب بھی دیکھ لیجیے۔

(الجمعیت، دہلی۔ شیخ الاسلام نمبر ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۸)

(۲۲)

حسین احمد

(محشر صادقی نظام آبادی اعظمی)

فدائے قوم و ملت ہے اسیر مالٹا تو ہے
ہمارا رہنما تو ہے ہمارا پیشوا تو ہے
نہاں گنجینۂ علم و عمل ہے تیرے سینے میں
دیا ہے درس قال اللہ مدت تک مدینے میں
حسین احمد ترا ایثار عالم آشکارا ہے
ستم گاروں کا دشمن بیکسوں کا تو سہارا ہے
ہے چرچا تیرے استقلال کا ہفت آسمانوں میں
برائے قوم تکلیفیں اٹھائیں قید خانوں میں
مقدس تیری ہستی سب سے اعلیٰ تیری شخصیت
تعال اللہ ترا صبر و تحمل، ہمت و جرأت
فدائے قوم، شیدائے وطن، ملت کا دیوانہ
تجھے کہتی ہے دنیا شمعِ آزادی کا پروانہ
مبارک ہو تجھے اے قوم! ایسا رہبر کامل
دکھائے گا یہی راہیں، بتائے گا یہی منزل

(زمزم، لاہور۔ ۲۷/نومبر ۱۹۴۵ء)

(۴۴)

مسٹر جناح سے خطاب

(سرفراز احمد فراز قریشی)

دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ لیگ نے ان انتخابات کو کفر اور اسلام کا مسئلہ بنا دیا تھا اور نیشنلسٹ مسلمانوں اور خصوصاً جمعیت علمائے ہند اور اس کے صدر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے خلاف الزامات و اتہامات کا ایک سیلاب تھا کہ اُمڈ آیا تھا اور بے ہودہ گوئی اور دشنام طرازی کا ایک طوفان برپا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں جمعیت علمائے ہند کو مقاصد کی عام تبلیغ و اشاعت کے وسائل بھی حاصل نہ تھے، ہوتے تو اسی کے خواص تو در کنار عام کارکن تک وہ زبان، لہجہ اور اسلوب بیان استعمال نہ کر سکتے تھے۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام کے عقیدت کیشوں نے لیگی لٹریچر کے مقابلے میں نظم و نثر دونوں میں نہایت سنجیدہ اور مہذب ادب پیش کیا جو اسلامی تہذیب و اخلاق کا آئینہ دار بھی تھا اور اپنے اندر زبان و بیان و اسلوب کی خوبیاں بھی رکھتا تھا۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اس قسم کا کثیر لٹریچر فراہم ہو گیا۔ "مشتے نمونہ از خروارے" حضرت شیخ الاسلام اور ابوالکلام آزاد کی شان میں چند نظمیں ڈائری میں درج کی ہیں۔ ان میں سے ایک نظم سرفراز احمد فراز قریشی کی درج کی جاتی ہے:

مسٹر جناح سے خطاب

(سرفراز احمد صاحب فرازؔ قریشی)

ناز ہے قانون دانی پر تجھے، لیکن بتا　　با تمیز قرآں کی سناتا ہے حسین احمد کہ تو؟

قوم کی خاطر مسلسل سختیاں سہتا ہے کون — جیل کے در کھٹکھٹاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
مصطفیٰ کی پیروی میں اپنی ناداں قوم سے — روز پتھر کون کھاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
حاکمانِ وقت کے ظلم و ستم کر کے بیاں — کون تکلیفیں اٹھاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
ہند میں انسانیت پر، قوم پر، اسلام پر — نقدِ جان و دل لٹاتا ہے حسین احمد کہ تو؟

قائد اعظم ہمارا ہے تو ہی لیکن سچ بتا
کام آڑے وقت آتا ہے حسین احمد کہ تو؟

(زمزم، لاہور۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۲۴)

اوکاڑہ میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ

مولانا حسین احمد مدنی پر حملے کی مذمت

مجلس احرار اسلام اوکاڑہ کی طرف سے مسلمانانِ اوکاڑہ کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں حکیم محمد بخش صاحب کامل جالندھری نے لیگیوں کے روّیے کی پُر زور مذمت کی اور فرمایا کہ موجودہ اراکین مسلم لیگ شرعی پاکستان میں رہنے کے قابل نہیں۔ ایک قرار داد میں مولانا حسین احمد پر سید پور میں جو حملہ ہوا، اس کی مذمت کی گئی۔

(۲۵)

مولانا سید حسین احمد کی توہین

ہر طرف سے اظہار ناراضگی و احتجاج

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اور امام الہند ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیگیوں نے جو سلوک کیا، وہ یقینی طور پر ناقابلِ برداشت ہے۔ مسٹر جناح کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو ان حرکتوں سے روک دے۔ (عبدالمجید خان)

پانی پت۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے تقریر کے لیے تشریف لائے، مگر لیگی گروہ نے ان کی تقریر میں شور مچایا، مگر جلسہ درہم برہم نہ کر سکے۔ یہ حرکات نہایت ناشائستہ ہیں۔ شرفا ان سے برا مناتے ہیں۔

چونڈہ۔ ایک جلسے میں لیگ والوں کے خلاف مولانا حسین احمد صاحب پر حملے کی سخت مذمت کی گئی اور فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کو روکنے کا مطالبہ کیا گیا۔ (نامہ نگار)

سھگاؤں الہ آباد۔ مولانا مسیح الدین ایک مراسلے میں علمائے کرام پر حملوں کی مثالیں دیتے ہوئے حضرت مولانا حسین احمد پر حملے کی مذمت کرتے ہیں۔

داد آباد۔ جامع مسجد میں احرار کارکنان اور جمعیت انصار کا مشترکہ اجلاس ہوا، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی پر لیگی کارکنوں کے حملے کی شدید مذمت کی گئی اور فلسطین کو عربوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور انڈین نیشنل آرمی کے افسروں اور سپاہیوں پر مقدمہ چلانے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ (نامہ نگار)

(۲۶)

گیا میں لیگی کارکنوں کی افسوس ناک روش

مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ گیا کے سالانہ جلسے میں مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے (یو۔ پی) وغیرہ تقریریں کرنے والے تھے۔ نماز کے بعد مسلم لیگ کے بھیجے ہوئے آدمی مسجد میں گھس آئے اور انھوں نے علما پر آوازیں کسیں۔ ابوالکلام مردہ باد، حسین احمد مردہ باد وغیرہ کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد باقاعدہ حملہ کر دیا۔ اس گڑبڑ میں مقامی جمعیت کے سکریٹری کو پیٹا گیا اور ان کے دانت سے خون بہنے لگا۔ انھیں گھسیٹ کر مسجد سے باہر نکال دیا گیا۔ بڑے بڑے لیگی حضرات مثلاً آنریبل حسین امام وغیرہ موجود تھے۔ انھوں نے ان حرکتوں کو نہیں روکا۔ (نامہ نگار)

(زمزم، لاہور، ۲۹؍اکتوبر ۱۹۴۵ء)

ضمیمہ نمبر ②

امام الہند

مولانا ابوالکلام آزادؒ

سے متعلق

ضمیمۂ دوم:

مولانا آزاد کے خلاف لیگیوں کی غنڈہ گردی اور اس پر ردِ عمل

(۱)

جوش کا غلط استعمال

دہلی کے اسٹیشن پر جو افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا، اس سے متاثر ہو کر ایڈیٹر زمزم لاہور نے "جوش کا غلط استعمال" کے عنوان سے ذیل کا اداریہ لکھا ہے:

"۷ ار جولائی کو شملے سے مولانا ابوالکلام کی واپسی پر مسلم لیگی دوستوں کی طرف سے دہلی اسٹیشن پر مولانا کے خلاف جو مظاہرہ ہوا، وہ لیگ کی سیاست کا ایک نہایت ہی سیاہ باب ہے۔ مولانا کی شخصیت ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں کی نگاہ میں جو محبوبیت رکھتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر یہ بات نہ ہوتی تب بھی کسی کی ذات کے خلاف ایسا دھمکی آمیز رویہ اختیار کرنا جو پولیس کی لاٹھیوں پر ختم ہو، نہایت ہی شرمناک چیز ہے۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن جب جناح صاحب بمبئی جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تو مولانا کے عقیدت مندوں نے لیگ کے غلط کارکنوں کا جواب دینے کے لیے ان کو سیاہ جھنڈیاں دکھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو "قائدِ اعظم" نے خطرے کی نوعیت کو پہلے ہی

بھانپ لیا تھا اور آخر وقت تک اندر سے دروازہ بند کیے خاموش بیٹھے رہے، ورنہ کسی ناگوار صورتِ حالات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام کے خلاف چند لیگیوں کی طرف سے انسانیت سوز قسم کی حرکات نہ ہوتیں تو مولانا کے عقیدت مندوں کی طرف سے بھی ''قائد اعظم'' کے خلاف ہرگز کوئی مظاہرہ نہ ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ لیگ کے پریس اور پلیٹ فارم سے جو زبان استعمال ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ ہی یہ ہے کہ پرجوش قسم کے نوجوانوں میں فساد انگیزی کو شہ ملے۔ اس لیے اگر لیگ کے لیڈروں کی طرف سے اس کی روک تھام ابھی سے نہ کی گئی تو حالات کے بد سے بدتر ہو جانے کا خطرہ یقینی ہے۔ اس موقعہ پر جناح صاحب کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ لیگیوں کی اس حرکت کے خلاف آواز بلند کریں، لیکن اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز عنصر کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں''۔

(زمزم، لاہور۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۴۵ء، ص ۲)

(۲)

سری نگر میں مولانا آزاد کے جلوس پر حملہ

ایک مسلمان جاں بحق اور ۵۰ گرفتار

سری نگر، یکم اگست۔ آج یہاں مولانا آزاد کے جلوس کے سلسلے میں افسوس ناک فساد ہو گیا۔ اس سلسلے میں فریقین کی جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ جانبدارانہ کہی جا سکتی ہیں، اس لیے ہم صرف حکومتِ کشمیر کا وہ اعلان شائع کرتے ہیں جو اس واقعے کے متعلق اس نے شائع کیا ہے:

"کل شام کو نیشنل کانفرنس نے مولانا آزاد صدر کانگریس، خان عبدالغفار خان اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اعزاز میں ایک دریائی جلوس نکالا، جس کی اجازت پہلے سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے حاصل کر لی گئی تھی۔ شہر کے ایک پارک میں مسلم کانفرنس کے حامیوں نے جلوس اور نیشنل کانفرنس کے حامیوں پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے، جس سے دونوں جانب کے کئی اشخاص زخمی ہو گئے۔ نیشنل کانفرنس کا ایک ممبر ہسپتال میں جا کر مر گیا۔ پولیس نے مداخلت کی۔ اگرچہ کئی پولیس مین مع ایک ڈپٹی مجسٹریٹ کے زخمی ہو گئے مگر صورتِ حالات پر قابو پا لیا گیا۔

اس کے بعد دریائی جلوس بغیر کسی حادثے کے اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اب سکون ہے۔ فساد زدہ علاقے میں پبلک جلسوں اور جلوسوں کی ممانعت کر دی گئی۔"

(زمزم۔ لاہور، ۷ راگست ۱۹۴۵ء)

(۴)

کشمیر کا میوہ

صدر کانگریس کے خلاف مظاہرہ

(اداریہ)

ہندوستان کی خوش بختی اور مسلمانوں کی ارجمندی اور بلند اقبالی کا ایک تازہ شاہکار یہ ہے کہ سری نگر میں جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا دریائی جلوس نکالا جارہا تھا، مسلم کانفرنس کے حامیوں نے نہ صرف مخالفانہ مظاہرہ کیے، بلکہ چالیس کروڑ انسانوں کے اس محبوب رہنما پر جو شریعت اور سیاست کا امام اور کتابِ الٰہی کا خادم و مفسر ہے، کلوخ اندازی اور خشت باری کی مشق بھی فرمائی اور جب انھوں نے اس مہمان نوازی کو اپنی شان سے فروتر سمجھا تو دوسرے مسلمانوں پر حملہ بھی کر ڈالا اور ایک مسلمان کی جان عزیز لے کر یہ ثابت کر دیا کہ امت مرحومہ واقعی رحمت الٰہی کی مستحق ہے اور مسلمانوں کی عزت و حرمت کو خاک میں ملانا رحمت و شفقت ہی کا وہ مظاہرہ ہے، جس پر خیر امۃ کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیے۔

مسلم کانفرنس کے حامیوں یا مسلم لیگ کے طرف داروں کی یہ مسلم کشی ممکن ہے کہ کسی فریق کے نزدیک قابل داد اور سزاوار تحسین ہو، لیکن جہاں تک اسلام اور اسلامی شرف کا تعلق ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی بارگاہ میں ان کی یہ حرکت اسلامی اور انسانی اخلاق کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا سنگین اور شرمناک جرم ہے جسے حق و انصاف کی عدالت میں کبھی معافی نہیں مل سکتی۔

مسلم کے معنے ہیں فرماں بردار، امن پسند، وفا شعار، سلامتی اور سلامت روی کا نمونہ، خدادوست اور انسانوں کا ہمدرد۔ یعنی ایک مسلم کی راہ ایک باغی، ایک مفسد، ایک شریر، ایک

قانون شکن کی راہ سے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔ مسلم کبھی مفسد نہیں ہو سکتا اور مفسد کا یہ دعویٰ غلط ہو گا کہ وہ مسلم ہے۔ اگر اسلام، سلامتی اور مسلم کے اجزائے ترکیبی یہی ہیں تو ہمیں کہہ دینا چاہیے کہ مسلم کانفرنس اور اس کے حامی سب کچھ ہو سکتے ہیں، اسلام کے علم بردار اور سلامتی کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ اس طرز کے مسلمانوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا، اسمٰعیل شہیدؒ کی روح پر کیا ستم نہیں توڑا، سر سید احمد خاں مرحوم کو خاک مذلت میں گرانے کے لیے کب ان کے ہاتھوں نے حرکت نہیں کی؟ مولانا محمد علی مرحوم پر اسی لاہور میں جو پھول برسائے گئے اس کی سعادت اس قوم کے سوا اور کس کو حاصل ہو سکتی ہے۔ سیاست کی راہ سے گزر کر ذرا مذہب کی شاہراہ پر قدم رکھو اور خدائے واحد کی خالص توحید کا اعلان اور اولیا پرستی کے خلاف آواز بلند کر کے دیکھو کہ امت مرحومہ کا ہاتھ کس سرعت سے حرکت میں آتا ہے اور مصلحین کی جانوں پر کیسے کیسے ستم توڑے جاتے ہیں۔

یہ اختلاف ہے یا شرارت؟

کس قدر الم ناک حقیقت ہے کہ مسلمان سوچنا اور سمجھنا نہیں چاہتا، وہ اسی میں خوش ہے کہ ہر آندھی کے ساتھ اڑے اور ہر سیلاب کے ساتھ بہے۔ اس کی بارگاہ سے ہر امیر المومنین کو دھکے ملے اور ہر مفسد کو اس نے بڑھ کر آنکھوں پر بٹھایا۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مذہب اور سیاست کا مجمع البحرین، ابوالکلام آزاد، تمھاری کشتی کو غرق کرنے کے درپے ہے تو تم اس کا ساتھ چھوڑ سکتے ہو۔ اگر تمھارا انصاف یہی کہتا ہے کہ قرآن کریم کا مفسر اور الہلال مرحوم کا اسرافیل تمھیں گمراہ کر دے گا تو تمھارے لیے انحراف و اعراض کی راہ کھلی ہے۔ اگر تمھارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ حق پرستوں کی ایک مضبوط جماعت پیدا کرنے والا اور علمائے حق کو میدانِ عمل کی نشان دہی کرنے والا تمھیں پیچھے دھکیل رہا ہے تو تمھیں کانوں میں انگلیاں ڈالنے کا حق بہ وقت حاصل ہے۔ اگر تمھارا خیال یہی ہے کہ جس شخص نے سلطان جابر کی

قوتوں کو پر کاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور کڑی سے کڑی آزمائش کو لبیک کہا وہ تمھیں اور تمھاری متاع کو ہندو کے ہاتھ فروخت کر دے گا، تو تم ہر وقت اس سے بیزاری کا اظہار کر سکتے ہو۔ اگر تمھیں یہی سمجھایا گیا ہے کہ آزاد تمھاری آزادی کے درپے ہے اور اس کا قلب اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ گاندھی کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کس نے کہا ہے کہ اس مذموم حرکت کا نوٹس نہ لو؟ لیکن تمھیں یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ آزاد کی ضد میں اسلام کو رسوا کرو، اسلامی اخلاق کا جنازہ نکالو، گالیاں دو اور قتل و خوں ریزی سے ان ہاتھوں کو رنگو جو فساد و خوں ریزی کو روکنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مبارک ہو!

ہر شخص کا ضمیر ہے، ہر شخص کا ایمان ہے، ہر شخص کا فیصلہ ہے اور اسی کے مطابق آزاد اور جناح سے سلوک کیا جا رہا ہے! ہم خوش ہیں کہ لیگ کے مخلص حامیوں نے اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لی جو اسلام کی حفاظت کرے گا، اگرچہ نہیں جانتا کہ اسلام کے اصول و مبادی کیا ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے شخص کو امام بنایا جو اسلامی کلچر کے گرد حصار تعمیر کرے گا، اگرچہ اسے اسلامی کلچر کے حدود اربعہ کا کوئی علم نہیں اور نہ اس کی زندگی اسلامی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے ایسے بزرگ کی قیادت پر مہر تصدیق ثبت کی جسے روم کی راہ تو معلوم ہے لیکن کعبے کے نشان راہ کا کوئی علم نہیں، چشم ما روشن دل ما شاد! جس کی عیش و آرام کی زندگی میں کبھی خلل نہیں پڑا، ملک و ملت کی خاطر معمولی سی آزمائش بھی پاس نہ بھٹکی۔ کان پور کا ہنگامہ ہو یا تحریکِ خلافت کی دار و گیر، شہیدان سرحد کا واقعہ ہو یا قحطِ بنگال کا قیامت خیز حادثہ، کسی میں بھی شکل مبارک نظر نہ آئی۔ بال تک بیکا نہ ہوا، نکسیر تک نہ پھوٹی، دامن تک نہ الجھا اور ایک ہی جست میں منصب قیادت پر پہنچ گئے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا فیصلہ یہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم چیں بہ چیں ہوں۔ امت کا فیصلہ برحق لیکن اس فیصلے کا تقاضہ یہ تو نہیں کہ اسلام اور ملت، وطن اور آزادی کے لیے جس شخص نے قربانیوں کا سب سے بڑا ریکارڈ

قائم کیا ہو اس پر کیچڑ اچھالی جائے اور وہ بھی اس شخص کی محبت میں جسے نفس کی محبت کبھی امتحان گاہ میں نہ لا سکی، اس شخص کی خاطر جو کبھی امت کے مصالح کو خاطر میں نہ لایا۔

خطرات اور نتائج :

ہم قائد اعظم کی شخصیت اور مسلم لیگ کے مقاصد کو معرضِ بحث میں لانا نہیں چاہتے، صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلم لیگ کے حامیوں کو اختلافِ رائے برداشت کرنے کی ہدایت نہ کی گئی اور ان کی عقلی سطح کو ہموار نہ کیا گیا تو آزاد کیا مسٹر جناح کی عزت بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ سری نگر میں جو کچھ ہوا وہ نہ صرف اسلامی کیریکٹر پر افسوس ناک حملہ ہے، بلکہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کی رسوائی ہے۔ آج آزاد کے خلاف یہ ہنگامہ ہوا، کل یہی عوام قائد اعظم کی عزت کے لاگو نظر آئیں گے۔ ان کا رخ اگر صدر کانگریس کی طرف پھر سکتا ہے تو کیا ضمانت ہے کہ کسی وقت یہی رخ صدر مسلم لیگ کی طرف نہیں پھر سکتا؟ جو لوگ اخلاقی تربیت سے محروم ہیں، ان کی پیروی اور وفاداری پر اعتماد خطرہ سے خالی نہیں۔ جو لوگ آسانی سے اس شخص پر حملہ کر سکتے ہیں جس کے بے پناہ علم و فضل اور بے شمار قربانیوں کے نقشے آنکھوں کے سامنے ہوں ان کے لیے کیا مشکل ہے کہ کانٹا بدلتے ہی ہر لیگی لیڈر کا قافیہ تنگ کر دیں اور قائد اعظم کی قیادت کا نام و نشان تک مٹا ڈالیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ لیگ کی مخالف سمت میں انتقامی جذبہ پیدا نہ ہو جائے اور جہلا کی بد عملی اور بے راہ روی کا خمیازہ قائد اعظم کو نہ بھگتنا پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ امت کی مزید رسوائی ہو گی اور اس کی ذمہ داری سے کوئی لیگی لیڈر اپنے آپ کو نہ بچا سکے گا۔

پس بہتر یہ ہے کہ ہر لیگی لیڈر اور ہر لیگی اخبار اس غنڈہ گردی کی پُر زور الفاظ میں مذمت کرے اور عصبیت جاہلیہ کی گردن مروڑنے میں صلح پسندوں کا ساتھ دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ کسی لیڈر کی عزت محفوظ نہ رہے گی، بلکہ آڑے وقت میں قائد اعظم بھی دوسرے فریق کی ہمدردی حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

(زمزم۔ لاہور، ۷ راگست ۱۹۴۵ء)

(۴)

مولانا ابوالکلام آزاد پر کامل اعتماد کا اظہار

کشمیر کی غنڈہ گردی کے خلاف اظہارِ نفرت و ملامت

آج مورخہ ۵ راگست کو جمعیت علماے پتی (سرحد) کا ایک عام اجلاس حضرت مولانا تاج محمد صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، جس میں مولوی وحید اللہ صاحب فاضلِ دیوبند نے ایک حقائق آگاہ تقریر فرمائی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدماتِ ملی و وطنی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ حضرت مولانا نہ صرف ایک سیاسی مدبر ہیں، بلکہ اسلام اور شریعتِ حقہ کے رمز شناس اور مذہبی امامت و پیشوائی کے ایسے منصبِ عالی پر بھی فائز ہیں جس پر دنیاے اسلام کو بجا طور پر فخر حاصل ہے۔ اس کے بعد جناب غازی خاں صاحب ممبر جمعیت علما نے کشمیر کی غنڈہ گردی کے خلاف ایک تجویز پیش کی، جس میں مسلم کانفرنسیوں کی مفسدہ پردازیوں پر اظہارِ نفرت و ملامت اور مولانا ابوالکلام کی ملی اور ملکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی واحد نمایندگی پر کامل اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ (نامہ نگار)

(زمزم۔ لاہور، ۱۵ راگست ۱۹۴۵ء)

(۵)

مولانا ابوالکلام آزاد

زمزم، لاہور نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مخالفت میں اخبارات کے رویے اور لیگی رہنماؤں کے طرزِ عمل پر ایک فکر انگیز مقالہ لکھا ہے، جس میں مخالفت کے پس منظر اور

مولانا کی سیرت کے بعض خصائص پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مقالہ اخبارات کے ''بحث و مذاکرہ'' کے کالم میں شائع ہوا ہے۔ اخبار لکھتا ہے :

کانگریس کے صدر :

دہلی سے ایک صاحب نے نجی خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھا ہے کہ آج کل مسلم پریس سے ان کی سخت مخالفت ہو رہی ہے۔ حتی کہ پنجاب کے اخبارات تو اس سلسلے میں سوقیت و ابتذال کا بہت ہی افسوس ناک نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ شدید اختلاف رائے کا بھی یہ تقاضا نہیں ہوتا کہ اپنے مخالف پر سب و شتم کی بوچھاڑ کی جائے یا اس کے خلاف غلط اور بے بنیاد الزام لگائے جائیں۔ اس کے بعد لکھا ہے :

"بعض سنجیدہ اور بہت ہی سنجیدہ لوگ بھی کسی نہ کسی پیرائے میں مولانا آزاد پر حملہ کرنے کا موقعہ نکال ہی لیتے ہیں اور انداز تحریر ایسا اختیار کرتے ہیں کہ ہجو ملیح کا پہلو خود بخود نکل آتا ہے۔ مثلاً لکھنو کے ایک اسلامی اخبار نے حال ہی میں مولانا آزاد کے جسمانی انحطاط پر افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'صدر کانگریس کی حیثیت سے جیسے بھی ہوں، یہاں اس سے بحث نہیں، شخصیت جاذب اور دلکش رکھتے ہیں، توحید و رسالت کے کلمہ گو ہیں اور دین و سیاست میں نہ سہی، بہر حال ادب اردو کی تاریخ نے ان کا ایک ممتاز مقام اپنے ہاں مخصوص کر لیا ہے'۔ یعنی شخصیت جاذب اور دلکش رکھتے ہیں اور معنویت صرف اتنی کہ ادب اردو کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا جو امتیازی وصف تھا یعنی دین و سیاست کی امامت یا کم سے کم خدمت اس کی کھلے الفاظ میں نفی ہے اور نفی بھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ، گویا لکھتے ہیں "بے اختیار ایک حقیقت خود بخود سامنے آگئی ہے"۔

پنجاب اور آزاد :

پنجاب کے اخبارات کا گلہ بے سود ہے، اگر انھوں نے اختلاف رائے کے کسی موقع پر اخلاق و انسانیت کا ثبوت دیا ہوتا تو شکایت بجا تھی کہ مولانا آزاد کے معاملے میں انھیں کیا ہو

گیا اور یک بیک اپنی بلند روایات کو بھلا کر ابتذال کی گھناؤنی سطح پر کیوں اتر آئے؟ مگر جب ان کے خمیر ہی میں وہ بات داخل ہے جس کی شکایت کی جا رہی ہے اور ان کی روشن روایات ہی یہ ہیں کہ بڑے سے بڑا لیڈر، محترم سے محترم عالم بھی ان کی گندہ ذہنی اور سفلہ خوئی سے نہ بچ سکا تو شکایت کا وزن خود بخود ہلکا ہو جاتا ہے۔ شکایت کے معنے تو یہ ہیں کہ اخبارات سے بالکل کوئی نئی اور خلافِ توقع حرکت سرزد ہوئی ہے، جس پر مارے شرم کے شرفا کی گردن خمیدہ ہو جانی چاہیے۔ حالاں کہ ان اخبارات کے معاملے میں اس قسم کا تصور یا حسنِ ظن ہی بے بنیاد ہے، ان کی روش جو پہلے تھی وہی اب بھی ہے، وہ نہ پہلے کبھی انسانی اور اسلامی اخلاق کے لیے مشہور ہوئے نہ اب انھیں اس کی ضرورت ہے۔

جس انسان کے خمیر میں شرافت، انصاف اور مردم شناسی کا جوہر ہوگا وہ اختلافِ رائے کے وقت مخالف کی حیثیت کو نہیں، بلکہ اپنی حیثیت اور شان کو ملحوظ رکھے گا اور اظہارِ رائے کرتے ہوئے اُسے محسوس ہوگا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کی سیرت کی بلندی اور عالی ظرفی کی آئینہ دار ہے یا نہیں؟ اگر مخالف معمولی کریکٹر کا انسان ہے اور اس کی پوزیشن کچھ زیادہ بلند نہیں ہے تو نکتہ چینی کرنے والا فوراً متنبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کی معمولی شخصیت ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے اور اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ خود ہماری شرافت اوسط درجے سے گر جائے اور جب مخالف اپنی بلند سیرت، اپنے اعلیٰ اور پاکیزہ کیرکٹر، اپنی بے داغ شہرت، اپنے مسلمہ فضل و کمال اپنی بے مثال عالی ظرفی اور اپنی قابلِ رشک رواداری میں شہرۂ آفاق ہو اور اس کی مخالفت کی ضرورت پیش آئے تو تنقید نگار یا حملہ آور کو ہفتوں پہلے اپنے اخلاق، اپنی سیرت، اپنے خیالات، اپنے اندازِ بیان کے نوک پلک درست کرنے پڑتے ہیں اور اسے بار بار غور کرنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسے شخص کی مخالفت خود ہماری ذلت و رسوائی کا باعث نہ ہو اور حق و انصاف کا ضمیر لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور نہ کر دے کہ آخر شریف، شریف ہوتا ہے اور رذیل، رذیل!

آزاد کی اخلاقی سیرت :

غریب آزاد کی اپنی حالت تو یہ ہے کہ گالیاں سنیں مگر کبھی زبان سے یہ بھی نہ کہا کہ دیکھو مجھ بے گناہ کو گالیاں دی جارہی ہیں۔ پلیٹ فارم پر، اخبارات کے کالموں میں، نجی صحبتوں اور ملاقاتوں میں، کتابوں اور رسالوں میں اس شخص نے اپنے متعلق ہر گندہ ذہنی کو پڑھا اور سنا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آزاد کے چہرے پر شکن تک نہ پڑنی، شکایت اور انتقام تو کجا یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ مولانا کو اس کا احساس ہے۔ حتیٰ کہ اس خدا کے بندے نے اپنی نجی مجلسوں میں بھی شدید سے شدید مخالف کی دیانت، خدمت اور قابلیت پر حرف گیری نہ کی۔ بڑے سے بڑے متقی دیکھے، بڑے بڑے زہاد و عباد کی مجلسوں کا رنگ دیکھا مگر اس معاملے میں جس کو دیکھا فیل دیکھا۔ یہ صرف آزاد ہی کا ظرف ہے کہ بے شمار دشمنوں اور مخالفوں میں سے کسی ایک مخالف کی نسبت بھی ان کی زبان کو آلودہ نہ پایا۔ اگر اتفاق سے کسی نے ذکر چھیڑا تو مسکرا کر فوراً دوسری طرف نکل گئے اور کہنے والا سمجھ گیا کہ مولانا کو اس قسم کی باتیں ناگوار ہیں اور آپ مخالف کے خلاف کوئی تنقید سننا نہیں چاہتے۔

آزاد کی مخالفت :

لیکن لوگوں کا سلوک آزاد کے ساتھ کیا ہے؟ سوقیانہ طرز کے مبتذل اخبارات کو چھوڑیے، اچھے بھلے لوگوں کی جماعت پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص اپنی طبیعت اور پیشے کے اعتبار سے فرض سمجھتا ہے کہ آزاد سے الجھے اور انھیں گرانے کا موقع نکالے۔ کسی نے سوچا، بس آزاد کو گاندھی پرست مشہور کردو، کام بن جائے گا، لہٰذا قلم چلنے لگے کہ دیکھو آزاد نے گاندھی جی کو جھک کر سلام کیا، آزاد پرورد ھا سے الہام نازل ہوا۔ کسی کو یہ سوجھی کہ ہنسی بنانے کے لیے آزاد پر کوئی فقرہ کسو، فوراً آواز آئی، شوبوائے! کسی کو دل کی آگ بجھانے کی یہ ترکیب سوجھی کہ مرحوم "الہلال" اور "تذکرہ" کو سامنے رکھ کر آزاد کو شرم دلاؤ، لوگ خود ہی سمجھ

جائیں گے کہ ابوالکلام نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔ چناں چہ آواز بلند ہوئی آہ ابوالکلام! تیرا روح پرور "تذکرہ" اور تیرا حیات بخش "الہلال"۔ تیرے سحر حلال نے ہمارے ایمانوں کو تازہ کیا۔ یہ کیا ہے جواب ہم دیکھ رہے ہیں؟ جو لوگ زیادہ ہوشیار اور مسلمانوں کے عقلی مزاج سے واقف تھے انھوں نے "ترجمان القرآن" کو خوردبین نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کہ کوئی تو ایسی بات ہاتھ لگ جائے کہ قرآن اور اسلام کی مخالفت کے شور سے اور نہیں تو آزاد کی مقبولیت ہی کم ہو جائے۔ چناں چہ مستقل رسائل اور کتابوں میں وحدۃِ ادیان کی بحث چھیڑ کر آزاد پر الزام لگایا گیا کہ وہ تمام مذاہب کی صداقت کے قائل ہیں، مگر کچھ دنوں کی دردِ سری کے بعد جب محسوس ہوا کہ اثر الٹا پڑا اور آزاد نے کسی ادیب، کسی ناصح اور کسی علامہ کو منہ تک نہ لگایا، تو اپنی اپنی بولیاں بول کر سب بیٹھ رہے اور وحدۃِ ادیان کی شان دار بحث معرض التوا میں ڈال دی گئی۔ حال ہی میں ایک مولوی صاحب نے ایک اخبار میں بڑی مشکل سے یہ راہ نکالی کہ آزاد تو سرے سے نزولِ مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں! غرض آزاد کے خلاف ہر پیشہ، ہر خیال اور ہر قابلیت کے اہلِ کمال اپنے آپ کو زبردستی وقف کر رہے ہیں اور آزاد ہیں کہ ان غریبوں کا نام تک نہیں پوچھتے۔

آزاد کی غلطیاں:

آزاد پیغمبر نہیں ہیں کہ تنقید اور نکتہ چینی سے بالاتر ہوں، نہ معصوم اور بے خطا کہ دین وسیاست میں غلطی کرتے ہی نہ ہوں۔ ہر شخص کا حق ہے کہ آزاد کی غلطیوں پر گرفت کرے اور علم کا جواب علم سے دے، مگر پہلے یہ سوچ لے کہ وہ بزرگانِ دین جو سلفِ صالحین کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اپنی کھلی غلطیوں پر کس سلوک کے مستحق سمجھے گئے ہیں؟ سلف میں سے کون ہے جس نے غلطی نہیں کی؟ محدثین، فقہا، مفسرین، صوفیہ، متکلمین، اربابِ حال وقال کسی کا نام لو، جس کی علمی تحقیقات پر سب لوگ متفق ہو گئے ہوں؟ تاہم ہمارا سلوک یہ ہے کہ ان کی ذات کو اجتہادی غلطی قرار دے کر انھیں ماجور قرار دیتے ہیں کہ غلطی کا اظہار

بھی ہو جائے اور ان کا احترام بھی باقی رہے، ان کی لغزشوں کی گرفت بھی ہو جائے اور قلب ان کو حجتہ الاسلام اور شیخ الاسلام بھی تسلیم کرتا رہے۔ مگر آج یہ روش بدل گئی ہے اب کسی سے اجتہادی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ اب جو کچھ سرزد ہو گا وہ الحاد اور کفر ہو گا۔ گفتگو اس میں تھی کہ آزاد کی مخالفت کا دائرہ زیادہ وسیع کیوں ہے؟ اس کا جواب وہی شخص دے گا جو حکومتِ قاہرہ کی مشنری کا پورا علم رکھتا ہو، غریب آزاد ہی وہ پہلا شخص ہے جو قوتِ قاہرہ کی نظر میں معتوب ہے، باقی اِدھر اُدھر کی مخالفتیں تو اسی مخالفت کے برگ وبار ہیں۔

مخالفت یا احساسِ کمتری؟

اصل بات یہ ہے کہ اکثر مخالفوں کو احساسِ کمتری نے آزاد کی مخالفت پر آمادہ کر رکھا ہے۔ غیر شعوری طور پر اکثر مخالف آزاد سے مرعوب ہیں اور جب یہ رعب طبیعت میں خلجان پیدا کرتا ہے تو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ مخالف کو بہر حال اس بات کا یقین ہے کہ اس کے لیے آزاد کے مقام پر پہنچنا محال ہے، البتہ آسان بات یہ ہے کہ آزاد کو گرا کر اپنی سطح پر لے آؤ اور اسے اتنا مجروح کر دو کہ اس کی بے پناہ مقبولیت کا رنگ پھیکا پڑ جائے۔ رہے پنجاب کے وہ مبتذل اخبارات جو جناح اور لیگ کی محبت میں اسلامی اخلاق کو بھی رسوا کرنے سے نہیں شرماتے، انھیں اہمیت دینا یا ان کی گالیوں سے متاثر ہونا خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی بد اخلاقی ہے۔ ان کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ خوب گالیاں دیں، خوب تمسخر اڑائیں، خوب فقرے کسیں اور انجام کار اخلاقی موت کا شکار ہو کر اپنا انجام اپنی آنکھوں (سے) دیکھ لیں۔

(زمزم۔ لاہور، ۱۱راگست ۱۹۴۵ء)

(۶)

جدید تعلیم کے لازمی اثرات ـــ تعجب کیوں؟

علی گڑھ کے واقعے کے حوالے سے کسی صاحب نے ایڈیٹر زمزم لاہور کو ایک خط لکھا تھا۔ ایڈیٹر نے "بحث و مذاکرہ" کے کالم میں اسے نقل کر کے اس پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں جدید تعلیم کے لازمی اثرات اور علی گڑھ کی سیرت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

علی گڑھ اور مولانا آزاد:

ایک صاحب گیا (بہار) سے تحریر فرماتے ہیں:

"اخباروں میں تو اس بات کا بہت چرچا رہا کہ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مسلم یونیورسٹی کے مہذب اور روشن خیال طلبہ نے مولانا آزاد کے خلاف بہت ہی گندا مظاہرہ کیا اور بد تمیزی اور دناءت کے مظاہرے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ حتی کہ ان شریف زادوں نے گاڑی میں گھس کر آزاد مردہ باد کے نعرے لگائے اور وہ اس قدر قابو سے باہر ہو گئے کہ افسران یونیورسٹی بھی ان کو روک نہ سکے، پوچھنے کی بات یہ ہے کہ جاہل سے جاہل غنڈے بھی اگر کوئی حرکت کرتے تو اس سے زیادہ نہ ہوتی جس کا مظاہرہ شریف زادوں اور روشن خیال مہذبوں نے کیا۔ پھر اس تعلیم کا کیا فائدہ جو مہذب انسان کو اور زیادہ غنڈہ بنا دے"۔

ہمارے خیال میں یہ سوال ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ نے پہلے ہی یہ فرض کر لیا ہے کہ انگریزی نصاب کے ذریعے انگریزی درس گاہوں میں انگریزی سانچوں میں ڈھلے ہوئے دماغوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس پر (۱) تعلیم و تربیت کا اطلاق ہونا چاہیے، (۲) اور اس تربیت کے بعد طلبہ کے اندر اخلاق فاضلہ کی روح، مردم شناسی کا جوہر، نفس و دماغ پر قابو پانے کا ملکہ اور فکری صلاحیتوں کو برمحل اور صحیح استعمال کرنے کا شعور بھی پیدا ہونا چاہیے

اور جب انگریزی درس گاہوں کے ہونہاروں میں یہ اوصاف نظر نہیں آتے تو آپ کو حیرت ہوتی ہے اور حیرت کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ جاہل غنڈوں میں اور مہذب، تعلیم یافتہ شریفوں میں امتیاز کیا ہے؟ اور مولانا آزاد کے خلاف مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طلبہ نے اس قسم کا گھناؤنا مظاہرہ کیوں کیا؟ بجائے اس کے کہ آپ طلبہ کے کیرکٹر پر ماتم کریں آپ کو خود اپنی خوش فہمی اور خوش خیالی پر ماتم کرنا چاہیے۔

تعلیم کے ثمرات:

انگریزی یا غیر اسلامی تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے جس کا مظاہرہ آپ کو بے چین کیے دیتا ہے۔ فرنگی درس گاہوں کے ہونہاروں کے دماغ میں پورا فرنگی دماغ اتارا جا رہا ہے۔ فرنگی اخلاق، فرنگی تہذیب، فرنگی آداب و خصائل، غرض وہ کون سی چیز ہے جو فرنگی درس گاہوں کے ذریعے مہذب اور روشن خیالوں کے کاسۂ سر میں نہیں اتاری جاتی۔ اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو حیرت ہے کہ آپ پھلوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں مگر درخت کو شناخت کرنے میں غلطی کھا رہے ہیں؟ بلاشبہ تعلیم کا اعلیٰ مقصد خود شناسی، مخفی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ان کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن جو کتابیں انسان کو کلکٹر اور بیرسٹر بنائیں، جو نصاب حکومت کی مشین کے لیے موزوں پرزے پیدا کرے اور جو ماحول اپنی روایات اپنی تہذیب، اپنے اخلاق و افکار سے ترمیم دلائے، اسے آپ کہتے ہیں کہ یہ تعلیم ہے جسے حاصل کر کے لازماً انسان کو روشن خیال، نیک سیرت اور شائستہ ہونا چاہیے۔ پہلے آپ اس بنیادی خیال کی اصلاح کیجیے کہ فرنگی عیش گاہوں کی تعلیم و تربیت پر کسی معنے میں بھی تعلیم کا اطلاق ہوتا ہے؟ فرنگی کی سنت یہ ہے کہ قبروں کو اکھاڑ کر ان کی ہڈیاں جلائے، مسولینی کی نعش پر تھوکے، الانتقام! الانتقام! کا شور بلند کر کے، وہ سارے کھیل کھیلے جس کی نظیر جاہلی عہد کے کسی دور میں بھی نہیں مل سکتی۔ پھر بھلا اس سنتِ حسنہ کی نقالی انگریزی درس گاہوں میں کیوں نہ ہو؟ کیا مسلم یونیورسٹی کی مخلوق کوئی علاحدہ مخلوق ہے، جسے مغربی فیشن سے خدا واسطے کا بیر ہو؟ اور ہاں!

یہ تو فرمایئے کہ کیا علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مولانا آزاد کو ہی یہ معاملہ پیش آیا یا مولانا محمد علی اور شوکت علی مرحومین نے بھی یہ تماشا دیکھا تھا؟ بس خاموش ہو جایئے اور مردہ پرست قوم کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیجیے۔ (زمزم۔ لاہور، ۲۳ر اگست ۱۹۴۵ء)

(۷)

مسلم لیگ سے کوئی گفت و شنید نہیں ہو گی!

پنڈت جواہر لال نہرو کا اعلان

بمبئی، ۲۴ر ستمبر پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلم لیگیوں نے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کی توہین کی ہے، اس لیے جب تک وہ معافی نہ مانگ لیں ہم لیگ کے ساتھ کوئی گفت و شنید نہیں کریں گے۔

سردار پٹیل نے بھی اپنی تقریر میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔

(زمزم۔ لاہور، ۲۷ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۸)

مولانا آزاد کی سیرت کی ایک جھلک

علی گڑھ کے اسٹیشن پر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ یونی ورسٹی کے طلبہ نے جو نہایت توہین آمیز برتاؤ کیا تھا، اس پر بعض لیگی رہنماؤں تک نے افسوس کا اظہار کیا ہے، لیکن خود مولانا آزاد نے اس واقعے پر اپنے رد عمل کا جو اظہار کیا ہے وہ ان کی اخلاقی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ مولانا اپنے ایک عقیدت کیش یحیٰ اعظمی صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

نسیم باغ سری نگر، کشمیر

۲۸ر اگست ۱۹۴۵ء

حبی فی اللہ! اللہ تعالیٰ اس اخلاص و محبت کے لیے جزائے خیر دے۔ دعا کرتا ہوں اور شکر گذار ہوں۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر چند طلبا کا جو طرزِ عمل رہا تھا، اسے ان کی نادانی پر محمول کیجیے اور انھیں بخش دیجیے۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے، ان نادانوں پر ہے جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابوالکلام کان اللہ لہ،

(مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابو سلمان شاہ جہان پوری، صفحہ ۵۱-۲۵۰)

(۹)

آزاد کا آئینہ اور یار کی تصویر

آزاد کا آئینہ اور یار کی تصویر

زمیندار لاہور نے مولانا آزاد کے خلاف "بگڑا ہوا عالم" کے عنوان سے ایک نظم شائع کی ہے۔ ایڈیٹر زمزم، لاہور نے اس پر "آزاد کا آئینہ اور یار کی تصویر" کے عنوان سے یہ اداریہ تحریر کیا ہے

معاصر "زمیندار" نے کسی شقی ازلی کی نظم "بگڑا ہوا عالم" کے عنوان سے شائع کی ہے، جس میں مولانا آزاد کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں کہ خود زمیندار بھی اگر انھیں مولانا ظفر علی خان اور مسٹر جناح کی شان میں استعمال کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ زمیندار کو حق ہے کہ وہ جس حد تک چاہیے گرے اور جس قدر چاہے اپنی روایات کو بٹہ لگائے، مگر یہ گرنا بھی صحافت کی حد تک ہی محدود ہونا چاہیے۔ ہم اس نظم کو دیکھ کر حیران ہیں کہ زمیندار کے ذوق سلیم کی داد دیں یا ناظم کی شقاوت اور سیہ بختی پر ماتم سرا ہوں؟

زمیندار کو مولانا آزاد سے ہزار اختلافات سہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس جہنمی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ عقل و نقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر ضروری شائع کر دیا جائے۔ نظم کا پہلا ہی شعر ملاحظہ ہو:

جاہل ہے تو سو مرتبہ بگڑے بھی بنے بھی
بگڑا ہوا عالم ہے کہ بپھرا ہوا خنزیر

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معاصر "زمیندار" کا خاتمہ بالخیر کس صورت میں ہو گا اور وہ اللہ کو کیا جواب دے گا، جو خنزیر سے بھی بدتر شکل بنانے پر قادر ہے۔ رہے شاعر صاحب سواس سیہ بخت کی قیمت بس اتنی ہے کہ اخبار میں نام آگیا، اپنے کلام کو خود سو بار پڑھا، ہزار

بار دوستوں کو سنایا اور نفسِ دنی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہم ایسے اشقیاء کے لیے نہیں، اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ایک ارشاد نقل کرتے ہیں:

لا یرمی رجل رجلا الا ارتدت علیہ (بخاری)۔

جو شخص جس کسی کو جن الفاظ میں یاد کرے گا وہ اسی پر لوٹائے جائیں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد سچا ہے اور ہمیں یقین ہے اور خلقِ صبح کی طرح یقین ہے کہ اگر "مولانا" شقی نے توبہ نہ کی تو تعجب نہیں کہ اس کی موت خنزیر کی موت ہو اور قیامت میں بھی اس کا حشر خنزیر کی شکل میں ہو۔ ہمیں یہ تو منظور ہے کہ یہ بدبخت خنزیر کی موت مرے، مگر یہ منظور نہیں ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد غلط ہو جائے۔

(زمزم۔ لاہور، ۳ر نومبر ۱۹۴۷ء)

(۱۰)

ملتِ اسلام کا مفکرِ عظیم

مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں نذرِ عقیدت

(جناب یحییٰ اعظمی)

کرتا ہے اوجِ سلطنت اس کے قدم کا استلام
آنکھ جو ہو تو دیکھیے مرتبۂ ابوالکلام

صدقے نہیں جو آج خود اس کے علوئے شان پر
کون سا ہے وہ افتخار کون سا ہے وہ احترام

اس کی فراست آج ہے بحث و نظر سے ماوریٰ
ہاتھ میں جس کے ہے سپرد مجلسِ قوم کی زمام

قوم کے میرِ کارواں صدر نشینِ کانگریس
ملتِ حق کے خضرِ راہ، دیں کے مفسّر و امام
عرصۂ کارزارِ حق جس کے قدم سے حشر خیز
معرکۂ جہادِ قوم جس کے قلم کا تشنہ کام
صلح ہو یا کہ جنگ ہو، بزم ہو یا کہ رزم ہو
وقت کے ہر محاذ پر فاتح و فائز المرام
پایا نہ بزمِ عصر نے ایسا مفکّرِ عظیم
دیکھا نہ چشمِ دہر نے ایسا مجاہدِ تمام
خاکِ وطن سے آج تک حق تو یہ ہے نہیں اُٹھا
ایسا ادیبِ حق نگار، ایسا خطیبِ خوش کلام
اس کے قلم کا حرف حرف نشاۃِ نو کی تہنیت
اس کی زباں کا لفظ لفظ نہضتِ تازہ کا پیام
اس کے کمالِ فہم پر قوم کو آج ناز ہے
ملک کو اس کی ذات پر آج ہے اعتمادِ تام
بزمِ ملل میں جس کی شان مایۂ نازشِ سلف
صدرِ شرف میں جس کی ذات زینتِ مسندِ کرام
ہے وہ خواصِ دہر کا ہند میں مرکزِ نگاہ
وجہِ شرف نہیں اسے کور نگاہیٔ عوام
اس کے نقوشِ زندگی ثبت رہیں گے تاابد
صفحۂ دہر پر یہ نام پائے گا خلعتِ دوام
اس کی ہر ایک سانس ہے اسوۂ یوسفی کی نذر
کلمۂ حق کے واسطے وقف ہے زندگی تمام

آئے ہزار مدّ و جزر پھر بھی ہے ایک وضع پر
روزِ ازل سے آج تک اس کی حیات کا نظام

آئیں وہ اور درس لیں عزمِ ابوالکلام سے
قوم کی رہبری کا آج ہے جنہیں ادعائے خام

رہبرِ قوم کے لیے شرط ہے پہلی ابتلا
جادۂ حق و صدق میں صبر ہے اولیں مقام

شعلۂ امتحاں کے بعد دیتے ہیں گلشنِ خلیل
جذبِ شعاعِ مہر سے بنتا ہے لعل سنگِ خام

جس نے سہے نہ ہوں ستم جس نے اٹھائے ہوں نہ زخم
ظلم ہے ایسے ہاتھ میں ملت و قوم کی زمام

بادۂ عیش و سرخوشی جن کا ہے ملیۂ خمیر
کوثرِ الفتِ وطن کیش میں جن کے ہے حرام

وہ ہے زعیم ممتحن جانیں گے اس کی شان کیا
سرخوشیِ نشاط میں گزری ہیں جن کی صبح و شام

نورِ ہدیٰ سے بے نصیب حکمتِ دیں سے بے خبر
جان سکیں گے آہ کیا مرتبۂ ابوالکلام

روزِ ازل سے ہر نفس جس کا ہے حریت نواز
اس کو سمجھ سکے گی خاک پستیِ فطرتِ غلام

(زمزم۔لاہور، ۳/اگست ۱۹۴۵ء)

(۱۱)

ابوالکلام آزاد

(ایم۔ اے رشید شفق سیتائی نائب صدر مسلم لیگ کلٹی بنگال)

ستائش اور مذمت سے اے غلام آباد — بلند تر ہے مقامِ ابوالکلام آزاد
وہ بوالکلام کہ جس کا نہیں حریف کوئی — وہ بوالکلام کہ جس سا نہیں شریف کوئی
وہ بوالکلام کہ ہے نائبِ رسولِ امیں — کہ ایک ہاتھ میں دنیا ہے جس کے ایک میں دیں
مجاہد اور مفسر فقیہ و عرفانی — محقق اور محدث، خطیبِ روحانی
حکیم و عارف و صوفی و کاشفِ اسرار — وہ فلسفی و مفکر، وہ قائدِ احرار
ہیں قوم و ملک پہ احسان جس کے لا تعداد — ہے حرزِ جاں تخدا جس کا آج بھی ارشاد

قیادت اور امامت کو زیب ہے جس سے
سیادت اور سیاست کو زیب ہے جس سے

(زمزم۔ لاہور، ۷، ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء)

(۱۴)

آفریں نوجوانانِ علی گڑھ!

(دردمنداعظمی) (۱)

شملہ کانفرنس سے واپسی پر علی گڑھ کے اسٹیشن پر نوجوانان علی گڑھ نے امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ جو گستاخانہ طرز عمل اختیار کیا تھا، یہ نظم اسی افسوسناک واقعے سے متعلق ہے (شاعر)۔

توہین کی اک وارثِ پیغمبرِ دیں کی — ہیں لائقِ تبریک جوانانِ علی گڑھ
اس واقعۂ فخر سے اطرافِ جہاں کی(۲) — سچ ہے اور بھی اب بڑھ گئی ہے شانِ علی گڑھ
ہے ہند میں اسلام کا یہ مرکزِ تہذیب — لاریب یہی خلق تھا شایانِ علی گڑھ
تعلیم و تمدن کے یہی وہ ہیں نمونے — کرتا ہے جنھیں پیش دبستانِ علی گڑھ
اسلام کے ہیں یہ وہی فرزندِ گرامی — یکسر ہیں جو پروردۂ دامانِ علی گڑھ
ملت کے یہی وہ ہیں جوانانِ خوش اوصاف — جو سیرت و کردار میں ہیں جانِ علی گڑھ
ہیں دانشِ نو کے یہی وہ پیکرِ زیبا — معمور ہے جن سے ادبستانِ علی گڑھ
تہذیب و شرافت کے یہی وہ ہیں مرقعے — دراصل جو ہیں رونقِ ایوانِ علی گڑھ
اخلاق و محاسن کے یہی وہ ہیں مظاہر — نازاں ہیں بہت جن پہ خود اعیانِ علی گڑھ
ہے داعیِ اسلام کی سیرت پہ نظر بھی — مانا کہ ہے اسلام پہ ایمانِ علی گڑھ
تہذیب و شرافت کا پھر اللہ ہی حافظ — مضمر ہے سخافت ہی میں گر شانِ علی گڑھ
اس کے ستمِ دست و زباں سے ہے بچا کون — خود روحِ علی گڑھ ہے دعا خوانِ علی گڑھ
کیا یاد نہیں قافلۂ جوہرِ مرحوم — تھا داعیِ حق جن کے بہ مہمانِ علی گڑھ
ملت کا مجاہد ہو کہ اُمت کا مفسر — ہے کون وہ جس پر نہیں احسانِ علی گڑھ (۳)

پیدا کیے ہیں ایسے جوانانِ خوش اطوار ہے نصف صدی کا یہی فیضان علی گڑھ
کیا تھی یہی سرسیدِ مرحوم کی تعلیم
سوچیں تو ذرا آج بزرگانِ علی گڑھ

(زمزم۔لاہور،۱۵ راگست ۱۹۴۵ء)

حواشی:

(۱) درد مند اعظمی اور یحییٰ اعظمی ایک ہی شخصیت ہیں۔ یحییٰ کے مجموعۂ کلام "نوائے حیات" میں یہ نظم شامل ہے۔

(۲) "نوائے حیات" میں یہ مصرع اس طرح ہے: اس واقعۂ پُر فخر سے اطرافِ جہاں میں

(۳) "نوائے حیات" میں یہ مصرع اس طرح ہے: وہ کون ہے جس پر نہیں احسانِ علی گڑھ

(۱۴)

علی گڑھ میں اخلاقِ اسلامی کا مظاہرہ

اِذَا خَاطَبَھُمُ الجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۝

(دردمند اعظمی)

خود اپنے مایۂ صد ناز دانش گاہِ قومی میں،
مسلمانو! ذرا اخلاقِ اسلامی کا خوں دیکھو!
تمھیں جس خلق کی تعلیم دی تھی سرورِ دیں نے
اسے اس مرکزِ تہذیب میں زار و زبوں دیکھو!
ہزار افسوس وطنِ پاک کے مجد و شرافت کو
وفورِ شرم سے اس سرزمیں پر سرنگوں دیکھو!
علی گڑھ آج طائف بن گیا ہے قبلِ ہجرت کا
"رئیس الطائفہ" کا فیض درسِ واژگوں دیکھو!
جو واہو چشمِ عبرت ہیں تو ملت کے جوانوں پر
مسلط وقت کے اربابِ باطل کا فسوں دیکھو!
علی گڑھ کی روایاتِ کہن پر ناز تھا تم کو
مگر اب دورِ نو کی پستیِ اخلاقِ دُوں دیکھو!
کہاں لے جائے آخر تمھیں یہ فتنۂ حاضر (۲)
میں اس آغاز کا انجام تم سے کیا کہوں دیکھو!
تمھاری غیرتِ دینی کہاں ہے اے مسلمانو!
کہ تم اور ایسی گستاخی پہ ایں صبر و سکوں دیکھو!

اہانت، وہ بھی کس کی! وارثِ پیغمبر ذیشان کی
جو اتمامِ زبانِ ادب آموز ہی کا انجمن جنوں دیکھو!

دیا جاتا ہے اس ہر فخرِ دانش گاہِ قومی میں
سہارے نوجوانوں کو ادب کا درس یوں دیکھو!

مٹانا چاہتے ہیں نازشِ ملت کی عظمت کو
معاذ اللہ یہ اشرار کا خبثِ دروں دیکھو!

دبانے کے لیے آوازِ حق کو عصرِ حاضر کی
وطن کے مرکزِ دانش میں صف بستہ فتنوں دیکھو!

سبب بوالہب کی جنگ تھی حاملِ رسالت سے
اُدھر ہنگامۂ شتم اور اِدھر صبر و سکوں دیکھو!

نمونے پھر اُدھر اخلاقِ عہدِ جاہلیت کے
نظر افروز اِدھر اک اسوۂ خیر القروں دیکھو!

اُدھر سر تا قدم تصویرِ خلقِ بوالہب روشن
اِدھر تفسیرِ نصِّ سابقون الاولون دیکھو!

"عبادِ حق" کا جو اس دور میں ہے مظہرِ کامل
وہ اہلِ حق کا تنہا پیشوا و رہنموں دیکھو!

جو اربابِ جہالت ہوں مخاطب بندۂ حق سے
تو پھر فرقانِ اسلامی تجلی ہوتا ہے یوں دیکھو! (۳)

حواشی:

(۱) نہ: [illegible] یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام "نوائے حیات" میں شامل ہے۔
(۲) "نوائے حیات" میں یہ مصرع اس طرح ہے: "تمھیں لوجانے گا آخر کہیں یہ نقشہ حاضر":
(۳) نہ: سہ روزہ [illegible]، لاہور، ۱۱ ستمبر ۱۹۴۳ء۔

ضمیمہ نمبر ③

مجاہد آزادی

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ

سے متعلق

ضمیمۂ سوم:

(۱)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر قاتلانہ حملہ
کہنی، آنکھ، ماتھے اور بھوؤں پر زخم آئے

کلکتہ ۸ر اکتوبر : مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر روزانہ ہند، کلکتہ نے انکشاف کیا ہے کہ ۲ر اکتوبر کی رات ان پر ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا اور انھیں زخمی کر دیا۔ آپ لکھتے ہیں :

"میں رات کو کوئی نو بجے ٹہلنے کے لیے نکلا۔ بالکل نہتا تھا اور وہم بھی نہ تھا کہ میری تاک میں کوئی ہوگا۔ میں اپنی گلی کی نکڑ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ دفعتاً پیچھے سے کسی نے چھرے سے وار کیا۔ چھرا میری کہنی میں لگا، میں بے اختیار گھوم پڑا۔ جیسے ہی گھوما ایک اور ضرب میرے سر پر پڑی اور بھوؤں پر زخم لگا، میں سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ ایک اور وار ہوا اور ہلکی سی خراش ماتھے پر آئی۔

کہنی کا زخم کوئی دو انچ کا ہے اور تکلیف اتنی زیادہ ہے کہ یہ مضمون میں اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ رہا ہوں۔ بھوؤں کا زخم بھی آدھ انچ کے قریب ہے، مگر اس میں درد نہیں ہے۔ اگرچہ ماتھے اور آنکھ پر ورم بہت ہے"۔

مولانا صاحب پر یہ پہلا حملہ نہیں، اس سے پہلے بھی مسلم لیگی ان پر حملے کر چکے ہیں۔

(زمزم۔ لاہور، ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۶ء)

(۲)

حضرت حکیم الامت تھانوی پر بہتان

اس الیکشن کے دور پر فتن میں طرح طرح کے بہتان حضرات علمائے کرام پر باندھے جا رہے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک بہتان حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ پر لگایا جا رہا ہے۔ وہ بہتان یہ ہے: کہ "حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اور حضور پاک کے ساتھ محمد علی جناح کو بھی دیکھا"۔ لیگی حضرات اس بہتان کو اپنی تحریروں میں بڑے فخر سے بیان کرتے پھرتے ہیں اور اخبار "انقلاب" میں بھی یہ بہتان شائع کیا گیا۔ چاہیے تو یہ تھا اس بہتان کی تردید تھانہ بھون سے شائع ہوتی، مگر ان تمام پر ایک سکوت کا عالم طاری ہے۔ اگر کانگریس کے خلاف کوئی مضمون شائع کرنا ہو تو درجنوں کے درجن فتوی شائع کیے جاتے ہیں۔

(۱) اس فقیر نے اس خواب (بہتان) کے متعلق حضرت مولانا خیر محمد صاحب (مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس، جالندھر شہر) اور صوفیِ کامل حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری (مبلغ دارالعلوم، دیوبند) سے دریافت کیا۔ یہ دونوں حضرات حکیم الامت تھانویؒ کے بڑے خلفاء میں سے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب نے فرمایا کہ میں نے اس خواب کے متعلق حضرت تھانویؒ سے ان کی حیاتِ مبارکہ ہی میں سوال کیا تھا۔ حضرت مرحوم سنتے ہی لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنے لگے۔ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے بھی تردید کی۔

(۲) دوسرا بہتان لیگی اخبار یہ کرتے ہیں کہ مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی کے ساتھ "خلیفہ حضرت حکیم الامت" لکھتے ہیں، حالانکہ حضرت تھانویؒ نے اپنی حیات ہی میں ان سے ان کی بعض حرکات کی بنا پر خلافت چھین لی تھی۔ "تتمہ اشرف السوانح" میں خلفاء کے نام

شائع کیے گئے ہیں اور ان کے اوپر ایک نوٹ بھی تحریر کیا گیا ہے۔ ان شائع کردہ خلفاء کے علاوہ جو کوئی بھی خلافت کا دعویٰ کرے غلط ہے۔ آپ حضرات "تمتہ اشرف السوانح" کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ حال ہی میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے ایک بنگال کے آدمی کے نام خط تحریر کیا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی ظفر احمد صاحب سے حضرت حکیم الامت نے خلافت چھین لی تھی، جو لوگ علماے کرام پر بہتان باندھتے ہیں۔ خداوند کریم ان کو ہدایت فرمادیں۔ (طفیل احمد جالندھری)

(زمزم۔ لاہور، ۲۳ر نومبر ۱۹۴۵ء)

(۳)

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

اخبار "منشور" کی غلط بیانیاں

(از جناب مولانا عبداللطیف صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور)

میں سفر میں تھا۔ آج واپسی پر اخبار "منشور" دہلی ۹ر نومبر ۱۹۴۵ء کا پرچہ مجھے دکھایا گیا۔ اس میں مدرسہ مظاہر علوم کے متعلق محمود صاحب رنگونی کا ایک مراسلہ بعنوان "علماے مظاہر علوم سہارن پور کا قائد اعظم حضرت محمد علی جینا کی ذات پر مکمل اعتماد" اوّل صفحہ پر امتیازی رنگ سے شائع کیا گیا ہے۔ اس مراسلہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علماے مظاہر علوم نے قائد اعظم پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور جمعیت علماے ہند کو من شذ شذ فی النّار کا مصداق بتایا وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنی ذمے داری کا صحیح و کامل احساس کرتے ہوئے مدرسہ مظاہر علوم کی طرف سے یہ اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں جو امور ہماری طرف

منسوب کیے گئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔ ہماری مجلس میں نہ مسٹر جینا پر اعتماد یا عدم اعتماد کا کوئی ذکر آیا اور نہ جمعیت علماے ہند کی شرکت کے مضر و نافع ہونے پر کوئی گفتگو ہوئی۔ جمعیت علماے ہند کے متعلق جو خلافِ شرع دل خراش الفاظ اس مراسلہ میں لکھے ہیں، جیسے ان کی نسبت علماے مظاہر علوم کی جانب سراسر افتراء و بہتان ہے، ویسے ہی وہ واقع میں بھی غلط و باطل ہیں۔ علماے مظاہر علوم ان سے شدید بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ جمعیت علماے ہند اور اس کے مقدس ارکان مقتدر علما کی شان میں اس قسم کے تہذیب و معیارِ مذہب سے گرے ہوئے الفاظ کو بد تمیزی اور گستاخی تصور کرتے ہیں۔ یہ تو علما کی جماعت ہے جس کا احترام من حیث علما ہر کانگریسی و لیگی مسلمان پر ضروری ہے۔ علماے مظاہر علوم تو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ کا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ ہم شرعاً کسی فرد یا جماعت پر قطعی طور سے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے۔ بحمدہ تعالیٰ مدرسہ اپنے قدیم مسلک پر قائم ہے اور اپنی قدیم روایات کا باحسنِ وجوہ محافظ ہے۔ نہ وہ کانگریس میں شریک ہے، نہ مسلم لیگ میں داخل ہے۔ مدرسہ عموماً سیاساتِ حاضرہ سے علاحدہ رہ کر خالص مذہبی خدمات بجالاتا ہے اور بجالا رہا ہے۔ ہاں جو مسائل ایسے ہیں کہ جن کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہے اور وہ بلاواسطہ علما کی راہ نمائی کے محتاج ہیں، ان میں مظاہر علوم پوری آزادی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دیتا ہے، بلکہ ایسے مسائل میں سیاسی جماعتوں کے ساتھ ان کی دعوت پر یا از خود متانت و سنجیدگی سے غور کرتا ہے۔ سمجھنے سمجھانے کی سعی بلیغ کرتا ہے اور وقتِ ضرورت اشتراکِ عمل و تعاون سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مجھے وثوق ہے کہ مولوی محمود صاحب رنگونی نے یہ مضمون نہ بھیجا ہوگا۔ اس "پردۂ زنگاری" میں دوسرے ہی بزرگوں کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ مولوی محمود صاحب رنگونی بھی جلد از جلد اپنی جانب سے اس کی تردید شائع کر دیں۔

میں آخر میں از راہِ ہمدردی اسلام بلا تخصیص تمام مسلمانوں سے اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدارا اس انتخابی کش مکش میں ناجائز حرکات، بہتان طرازی، افترا پردازی اور

یورپین پروپیگنڈے سے کلی اجتناب کریں اور اس امتحانی موقع پر اسلام و اسلامیات کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(زمزم۔ لاہور، ۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء)

(۴)

قائد اعظم سے التجا!

قائد اعظم مسٹر جناح، مسلم لیگ کے صدر ہیں اور ہر طبقے کے نزدیک قابلِ احترام، لیکن ہمیں ندامت ہے کہ موصوف مسلمانوں کی واحد نمائندگی کے ادعا کے ساتھ اپنے کیرکٹر کو اسلام کی سطح پر نہ لا سکے اور کبھی اپنی روش سے یہ ثابت نہ کیا کہ وہ پارلیمنٹری دماغ کے ساتھ اعتدال اور سلامت روی میں بھی کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ آپ نے حال ہی میں بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس اور اس کے لیڈروں کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کی شان کے شایان نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ کانگریس وائسرائے کے بوٹ چاٹنے کے لیے شملے پہنچ گئی اور اس نے ذلت اور رسوائی کے ساتھ وزارتوں کے حصول کی خواہش کی وغیرہ۔ ممکن ہے کانگریس کے متعلق ان کا یہ خیال صحیح ہو لیکن اسی مفہوم کو شریفانہ لب و لہجہ میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ آخر شرافت اور رذالت میں مابہ الامتیاز کیا ہوگا؟ ایک اخلاق سے گرا ہوا انسان بھی اگر کانگریس کے خلاف کچھ کہے گا تو اس کا لب و لہجہ اس سے زیادہ دلخراش نہ ہوگا جو قائد اعظم نے اختیار کیا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ مسٹر جناح کی اپنی سیرت کیسی ہے۔ لیکن جب تک وہ مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت سے بولتے رہیں گے، ہمیں حق ہوگا کہ انھیں اسلامی اور انسانی اخلاق کا واسطہ دیں اور ان سے عرض کریں کہ اپنے

اخلاقی تسفل کا مظاہرہ اسلام کے دائرے سے علاحدہ ہو کر کریں اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ فرمائیں کہ آنجناب کی سیرت کی تشکیل میں اسلام کا بھی کچھ حصہ ہے۔

(زمزم، لاہور ۱۱؍اگست ۱۹۴۵ء)

(۵)

پنجاب کی صحافت

زمزم لاہور (بائی ویکلی) نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۹؍جولائی ۱۹۴۵ء میں "پنجاب کی صحافت" کے عنوان سے اس کے رویے اور زبان وبیان کے بارے میں ذیل کا شذرہ لکھا ہے:

پنڈت جواہر لال نہرو نے شملہ کانفرنس میں پنجاب کے متعلق کہا ہے کہ یہاں عجیب و غریب چیزیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پنڈت جی کا اشارہ کن عجیب و غریب چیزوں کی طرف تھا، لیکن ایک بات ہم نہایت افسوس کے ساتھ عرض کریں گے اور وہ یہ کہ پنجاب میں ہمارے بعض صحافت پیشہ بھائیوں کی طرف سے آج کل صحافت کا جو نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ پنجاب کو رسوا کرنے کے لیے کافی ہے۔ صحافت کے وقار اور ملت کے مفاد کا تقاضا تو اس وقت یہ ہے کہ ہم لیگی اور غیر لیگی مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے بعض صحافی دوستوں نے جو روِیہ اختیار کر رکھا ہے وہ ملت کے مفاد کو کند چھری سے ذبح کر رہا ہے۔ خصوصاً معاصر احسان نے تو کذب و افترا اور غلط بیانی کا ریکارڈ مات کر رکھا ہے۔ اس کے کالموں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان جیسے دوسرے اکابر کے خلاف اتنا صریح جھوٹ بولا جا رہا ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں کہ اگر صحافت یہی رہی تو خدا ایسی صحافت سے ملک کو نجات دے۔ یہ ایک کھلی

ہوئی حقیقت ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ مولانا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد مدنی کی قسم کے لوگ آج تک گاندھی جی کی پرارتھنا میں شامل نہیں ہوئے۔ لیکن ہمارا مذکورہ بالا معاصر نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے کالموں میں یہ لکھ رہا ہے کہ مولانا ان پرارتھنا میں نہ صرف یہ کہ شامل ہوئے ہیں بلکہ تشقہ بھی لگاتے ہیں اور ہاتھ بھی جوڑتے ہیں۔ لاحول ولا قوہ الا باللہ!

لیگ کے ہم نوا اخبار لاہور میں اور بھی ہیں بلکہ "نوائے وقت" تو اس باب میں بڑے دعوے کے ساتھ لیگ کی ترجمانی کا مدعی ہے۔ مگر احسان میں گندہ دہنی کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے اس کا مقابلہ "نوائے وقت" بھی نہیں کر سکتا۔ "معاصر"، "انقلاب" اور "زمیندار" بھی لیگ کے حامیوں کی صفِ اول کے آرگن شمار ہوتے ہیں اور وہ بھی بعض اوقات عوام کو خوش کرنے کے لیے اپنی سطح سے بہت نیچے اتر آتے ہیں، لیکن نہ اتنا جس کا نظارہ آج "احسان" پیش کر رہا ہے۔ اس لیے ہم اپنی صحافی برادری سے اپیل کریں گے کہ نہ صرف صحافت کے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے بلکہ ملت کے مفاد کو محفوظ رکھنے کے خیال سے بھی وہ اس قسم کے اخبارات سے باز پرس کریں اور ان کی گندہ دہنی کو جتنی جلد ہو سکے روکیں۔ ہندو اخبارات کی ضد میں مہاتما کو "مہا طمع" لکھا جاتا ہے، تو "ویر بھارت ملاپ" اس کا ترکی بترکی جواب دے دیتے ہیں، لیکن مولانا ابوالکلام اور مولانا حسین احمد کو گالیاں دے کر اور ان کے خلاف صریح غلط بیانی و کذب و افترا سے کام لے کر کیا ہمارے معاصر یہ چاہتے ہیں کہ ان بزرگوں کے عقیدت مند بھی لیگ کے اربابِ اقتدار کی شان میں جوابی قصیدہ خوانی شروع کر دیں؟

شور اتنا ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ اگر عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

پھر اگر یہ صورت پیدا ہوئی تو کیا مسلمانوں میں انتشار و پراگندگی کی بدترین مثال پیدا نہ ہوگی۔

"احسان کا پندرہ ہزار کا وظیفہ" حکومتِ پنجاب نے ضبط کر لیا ہے، اس لیے ہمیں معلوم

ہوا ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نیز "نوائے وقت"، "انقلاب" اور "زمیندار" کے مقابلے میں اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے گندہ دہنی کا ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ لیکن کیا ہمارے صحافی بھائی اپنے ہم پیشہ کے اس عمل پر اسے نہ ٹوکیں گے؟

اسی کے ساتھ ہم پوری لیگی صحافت سے یہ عرض کریں گے کہ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اختلافات دور ہوں اور سب ایک مرکز پر جمع ہوں تو اختلافات کو ذاتیات کا رنگ دینے کے بجائے سنجیدگی و متانت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کریں اور اس طرح ان مسلمانوں پر لیگ کا دروازہ بند نہ کریں جو ملت کے مفاد میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

(۶۰)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام کے خلاف جو اس زمانے میں توہین و تضحیک اور تنقید و تنقیص کا طوفان بے تمیزی برپا ہے، اس کے جواب میں نظم و نثر میں ان بزرگوں کے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کی طرف سے جو سنجیدہ لٹریچر سامنے آتا رہتا ہے، اس میں "درد مند اعظمی" کے قلم سے ادب پارے آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی تازہ تخلیق یہ ہے:

مِلّت کے امامین ہمامین

گستاخ ناقدین سے دردمند اعظمی کا خطاب

نظم کا خطاب "منشور" کے مقالہ نگاروں سے ہے۔ مگر ہم اس نظم کو بہ نظر عقیدت

حضرت 'حکیم الامت' مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے اسم گرامی سے معنون کرتے ہیں:

اے ناقد گستاخ حسین احمد و آزاد — کب بحث کے قابل ہیں یہ طومارِ خرافات
تو اور یہ ملت کے امانت ہمامین — تو اور مجاہد کے یہ احوال و مقامات
اس دور میں اخلاقِ صحابہ کے نمونے — کہیے جنھیں سرتا قدم اللہ کی آیات
اسلاف کے ایمان کے سرمایۂ نازش — اسلام کے مجد و شرف و فخر و مباہات
وہ جن کی بدولت وطنِ پاک میں اب تک — زندہ سلفِ صالح اُمت کی روایات
انکار تجھے ہے تو ہو، اربابِ نظر کو — تسلیم ہیں ان کے شرف و فضل و کمالات
تو اور منھ آئے علما کے صلحا کے — یہ حوصلۂ فکر و نظر کی ترے اوقات
ہیں بغض کے حامل ترے پُر جوش مضامیں — ہیں جہل پہ مبنی ترے پُرزور مقالات
مظہر ہے تنک مایگیِ ذوقِ ادب کا — اے طبلِ تہی سب یہ ترا دفترِ طامات
ہے عکس حقیقت میں ترے خبث دروں کا — یہ تیری پریشانیٔ افکار و خیالات
فرمادے تو ہی ہے یہ صحافت کہ سخافت — معمور ہیں دشنام سے "منشور" کے صفحات
کس شانِ گرامی کے لیے وقف ہیں ناداں! — یہ تیرے لطائف، یہ ظرائف، یہ فکاہات
معراج ہے بس یہ ترے انشا و ادب کی — کچھ ثقلِ تراکیب، کچھ اغلاقِ عبارات
اس دفترِ اہمال میں ہے اس کے سوا کیا — کچھ مسخ روایات ہیں کچھ کذب محاکات
یہ طول بیانی یہ پریشانیٔ افکار — ہے صفحۂ قرطاس پہ اک دفترِ ہفوات
نے روحِ صداقت، نہ دلائل، نہ براہیں — ہے مغز سے خالی تری لفاظیٔ جذبات
اسلام کا شیخ اور تری دشنام طرازی — ملت کا امام اور ترے بیہودہ قیاسات

غافل تجھے کچھ بھی نہیں کیا خوف خدا کا
ہشیار ہوا اے بے خبر یومِ مکافات

(زمزم، لاہور ۷ راکتوبر ۱۹۴۵ء)

(مدینہ، بجنور ۹ راکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۷ و ۸)

زمزم، لاہور نے "بحث و مذاکرہ" کے کالم میں "ناگوار بحث" اور "خود فیصلہ کرد" کے عنوان سے دو شذرے لکھے ہیں۔ ذیل میں ہم دونوں شذرے نقل کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لیگی اخبارات کیا کیا مسائل چھیڑتے تھے اور کیسی زبان اختیار کرتے تھے، دوسری طرف لیگی رہنماؤں کی سیرت اور ان کی اسلامی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

پہلا شذرہ یہ ہے:

ناگوار بحث

"زمزم" ذہنی کشتی اور مناظرہ بازی کا قائل نہیں ہے۔ وہ اہل علم کو تحقیق کی دعوت دیتا ہے اور دماغ سے اپیل کرتا ہے۔ جو لوگ جذبات کی مخلوق ہیں اور ہر سیلاب میں بہنے اور ہر آندھی میں اڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، "زمزم" کبھی ان سے خطاب نہیں کرتا۔ انھیں چاہیے کہ "زمزم" کے بجائے کوئی اور اکھاڑہ تلاش کریں۔ ہم بہت ممنون ہوں گے، اگر ایسے حضرات "زمزم" کو معاف رکھیں اور اسے خطاب کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

بہت سے حضرات ہم سے دریافت کر رہے ہیں کہ اگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی جماعت میں تفریق ڈالے وہ واجب القتل ہے تو پھر جو لوگ مسلم لیگ اور اس کے قائداعظم کے مخالف ہیں ان کی حمایت کے کیا معنی؟ اور کیوں نہ ایسے حضرات حدیث شریف کی روشنی میں واجب القتل قرار پائیں؟

گویا ان حضرات کو مسٹر جناح سے نہیں ارشادِ رسولؐ سے محبت ہے اور اسی محبت نے انھیں مجبور کیا ہے کہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور مسٹر جناح کی قیادت پر ایمان لائیں۔ جذبہ تو بہت مبارک ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد اسلام اور رسولؐ کی محبت پر ہو۔ لیکن ابھی ظاہر ہو جائے گا کہ ایسے حضرات ارشادِ رسولؐ کو محض اپنے اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں

اور مسٹر جناح کی محبت میں محبت رسول کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بلا شبہ پیغمبر خدا کا ارشاد ہے کہ :

من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ (مسلم)

"اگر تم کسی ایک شخص کے گرد جمع ہو گئے ہو اور کوئی آکر تم میں انتشار پیدا کرنا چاہے یا جماعت میں تفریق ڈالے تو تم اسے قتل کر ڈالو!"

یہ ارشادِ نبوی سر آنکھوں پر اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس پر عمل کریں۔ مگر اتنا ضرور بتا دیں کہ جس پیغمبر کی یہ حدیث ہے اسی پیغمبر کا اگر یہ بھی ارشاد ہو کہ جو قائد نماز کا تارک ہو، وہ نماز جو ہر مسلمان پر دن میں پانچ دفعہ فرض کی گئی ہے، تو مسلمانوں کو اس کے ساتھ قتال کرنا چاہیے، یعنی تارکِ نماز قائد واجب القتل ہے تو کیا حضور کا یہ ارشاد بھی قابلِ تعمیل ہو گا یا قائداعظم کی محبت پر اسے قربان کر دیا جائے گا؟

دوسرا اشذرہ یہ ہے :

خود فیصلہ کرو

سب جانتے ہیں کہ قائدِ اعظم مسٹر جناح نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، حج نہیں کرتے! اب ایسے امام کے بارے میں امام المرسلین و سید الاولین والآخرین کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔ حضور ﷺ نے جبحلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمھارے ایسے قائد مقرر ہوں گے، جن کی اطاعت خطرے سے خالی نہیں ہو گی۔ پس جو شخص اپنے قائد کا انکار کرے گا وہ بری الذمہ ہو جائے گا، لیکن جو اس کی اطاعت کرے گا، اس کی خیر نہیں ہے۔

اس پر لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم ایسے قائدین کے ساتھ قتال نہ کریں؟

فرمایا جب تک وہ نماز پڑھیں ان سے قتال مت کرو۔

یعنی مسلمانوں کا قائد کیسا ہی خراب ہو اس کے ساتھ قتال نہ کرنا چاہیے، البتہ اگر وہ نماز کا تارک ہو تو اس کے ساتھ ضرور قتال کیا جائے گا اور اس کی جان بخشی کی اسلام میں کوئی

صورت نہیں ہے! اب کیا فرماتے ہیں عاشقانِ رسول اس حدیث کے بارے میں؟ جماعت میں تفریق ڈالنے والا واجب القتل، بالکل ٹھیک! مگر جماعت کا جو قائد نماز کا تارک ہو اس سے قتال کرنا لیگ کی شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟ پیغمبر کی شریعت میں تو یہ قتال ضروری ہے، لیکن جن لوگوں کو پیغمبر سے نہیں، قائداعظم سے محبت ہے وہ خود بتائیں کہ جس شخص کے ساتھ قتال واجب ہو اس کی مخالفت کرنے والوں کو واجب القتل بتانا کہاں کی شریعت نوازی ہے؟

ہم مسٹر جناح کی قیادت کے قائل نہیں ہیں، اس لیے ہماری طرف سے ان کو شرعی سزا دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! لیکن جو لوگ انھیں اپنا قائداعظم مانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ نماز کے پاس تک نہیں پھٹکتے، وہ سچائی کے ساتھ بتائیں کہ ان پر رسول ﷺ کی محبت غالب ہے یا قائداعظم کی؟ ہم اس ناگوار بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، مگر جب ہم سے بار بار پوچھا گیا اور اس بات کو عام شہرت دے دی گئی کہ مسلم لیگ اور قائداعظم کے مخالف واجب القتل ہیں تو ہمیں بھی مجبوراً حقیقت ظاہر کرنی پڑی۔ امید ہے کہ آئندہ مسلم لیگی حضرات مجتہد بننے کی حماقت میں مبتلا نہ ہوں گے اور قائداعظم کی شان کو اتنا نہ بڑھائیں گے کہ محض اختلافِ رائے کی بنا پر ہر مخالف کو واجب القتل قرار دے دیا جائے۔

(زمزم، لاہور۔ ۷ ار اکتوبر ۱۹۴۵ء)

چوتھا رسالہ

مقامِ مولانا مدنیؒ

ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

حرفے چند

یہ رسالہ جو "مقام مولانا مدنی" کے عنوان سے قارئین محترم کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے ایک نظم اور دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے تینوں مشمولات اخبار یا کتابچے کی شکل میں مطبوعہ تھے۔ اور ہر کوئی اپنے مآخذ میں اپنی خصوصیت اور افادیت رکھتا تھا۔ لیکن اب ان تینوں مضامین نظم و نثر کو ایک خاص پس منظر میں نمایاں ہونے اور ایک گل دستے کی شکل اختیار کر لیے ہے۔ ان کے حسن و تاثیر میں اضافہ ہوگیا ہے۔
امید ہے قارئین کرام اور ارادت مندان شوق اس سے لطف اندوز ہوں۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

شانِ حسین احمدؒ

(از محمود عالم صاحب حسینی چمپارنی)

حسین احمد کہ جس کو منبعِ لطف و کرم کہیے
جسے فخرِ عرب لکھیے، جسے شانِ عجم کہیے

اسی کے دم سے ہے روشن چراغِ بزمِ آزادی
وہی ہے رہنمائے قوم اور اسلام کا ہادی
اسی کے دل میں ہے احساسِ آبادی و بربادی
دلائے گا وہ انسانوں کو حیوانوں سے آزادی

حسین احمد کہ جس کو منبعِ لطف و کرم کہیے
جسے فخرِ عرب لکھیے، جسے شانِ عجم کہیے

جہاں والوں کو دیتا ہے سبق جو ہوشمندی کا
سکھاتا ہے سلیقہ ہم کو باہم دردمندی کا
اسی کے سر میں سودا ہے وطن کی سربلندی کا
بندھے گا اب اسی کے سر پہ سہرا فتح مندی کا

حسین احمد کہ جس کو منبعِ لطف و کرم کہیے
جسے فخرِ عرب لکھیے، جسے شانِ عجم کہیے

مبشّرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ رُسُلِ اللّٰہِ وَ
عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ حِزْبِ اللّٰہِ وَاَنْصَارِ اللّٰہِ ،

(۱) حدیث شریف میں ہے :- لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ
قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ (بخاری شریف) وزاد مالک
بروایۃ عطاء بن یسار یَرَاھَا الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ اَوْتُرٰی لَہٗ ،

"یعنی نبوت کے آثار میں سے کچھ باقی نہیں رہا ، مگر مبشرات ، حضرات صحابہ نے
عرض کیا ، مبشرات کیا ؟ فرمایا اچھے اور سچے خواب ، امام مالکؒ نے عطاء
بن یسار کے واسطے سے اسی حدیث میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ وہ اچھا
خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے بارے میں دیکھا جائے "

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۹۴)

(۲) بخاری شریف اور مسلم شریف میں ہے :- مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ
رَاٰنِیْ ، فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ لَا یَتَمَثَّلُ بِیْ ،

"یعنی جس شخص نے خواب میں مجھ کو (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو) دیکھا تو
واقعی اس نے مجھ کو ہی (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی) دیکھا ،

اس لیے کہ شیطان میری (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) صورت میں نہیں آسکتا۔"

اِن دُونوں حدیثوں کو ذہن میں رکھ کر سنیے!

(۱) دہلی بازار شہر میرٹھ میں نصر الدین صاحب سوداگر ہیں، خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہو رہا ہے، اور اونچی جگہ پر ہے، سیڑھیوں پر چڑھ کر جاتے ہیں، تو آگے دروازہ ہے، یہ اس دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی، پاکیزہ اور متبرک آدمی آتے ہیں، اور دربار میں حاضر ہوتے ہیں، بعض حضرات سے انھوں نے عرض کیا کہ "حضرت میں بھی آپ کے ساتھ چلوں" ان بزرگ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ "تمھاری صورت تو مسلمانوں کی سی ہے نہیں، تم کیسے دربار میں حاضر ہو سکتے ہو؟" آنے والے حضرات میں سے کوئی بھی اس پر آمادہ نہیں ہوئے کہ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں، آخر میں ایک صاحب تشریف لائے تو ان سے بھی انھوں نے یہی عرض کیا، کہ حضرت مجھے اپنے ساتھ لے چلیے، انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ "تمھاری صورت تو مسلمانوں کی سی ہے نہیں، تم کیسے دربار میں حاضر ہو سکتے ہو؟" انھوں نے بہت عاجزی سے عرض کیا کہ "حضرت مجھے تو بہت اشتیاق ہے" ان بزرگ نے فرمایا کہ "ہماری تو ہمت نہیں کہ تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں، تم یہیں ٹھہرے رہو مولانا حسین احمد صاحب آتے ہوں گے وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، ہماری ہمت نہیں۔"

کچھ دیر کے بعد مولانا حسین احمد صاحب بھی آگئے، ان سے بھی انھوں نے یہی عرض کیا، انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ "تمھاری صورت تو مسلمانوں کی سی ہے نہیں، تم کیسے حاضر ہو سکتے ہو؟" انھوں نے بہت عاجزی سے کہا کہ "مجھے تو بہت اشتیاق ہے، اور بہت دیر سے اسی انتظار میں ہوں کہ آپ کے ساتھ چلوں گا،"

تو مولانا نے فرمایا "اچھا میرے پیچھے چلے آؤ، اور دربار میں ایک طرف بیٹھ جانا"

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو بہت بڑا مجمع متبرک ہستیوں کا ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمدہ مزین تخت پر رونق افروز ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مولوی حسین احمد آگئے؟" عرض کیا، حضرت حاضر ہوں، فرمایا، یہاں آؤ، اور اپنے پاس بٹھا کر دیر تک ان سے باتیں فرماتے رہے، پھر فرمایا اب وہاں (دوسری جگہ) چلنا چاہیے حاضرین سے کہدیجیے کہ وہاں چلیں، چنانچہ مولانا نے کھڑے ہو کر سب سے کہا کہ وہاں چلیں "

وہ صلحاء کا مجمع وہاں سے اٹھا اور دوسری جگہ جاکر بیٹھ گیا، وہ جگہ بھی پہلی جیسی تھی، تخت پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز تھے، اور مولانا حسین احمد صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، ایک باریک نورانی چادر کا پردہ ہے، اس کے اندر یہ دونوں حضرات بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن ان کی طرف متوجہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت دیر ہو گئی، اب جلسہ ختم "۔ مولانا نے اسی تخت پر کھڑے ہو کر کہا " اب جلسہ ختم "

(۲) ایک بخاری[۵۱] طالب علم کو شرف زیارت خواب میں حاصل ہوا، دیکھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک خوبصورت سر سبز باغ میں تشریف فرما ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک جماعت کھڑی ہے، نہایت نورانی چہرے اور بہت نورانی لباس والی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مولانا حسین احمد کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ "یہ محدثین کا گروہ ہے، اور آپ کے واسطے دعائیں کرتا ہے "

اس کے علاوہ ایک دو نہیں سیکڑوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، اور دیکھا کہ مولانا حسین احمد صاحب بھی حاضر ہیں، پاس بیٹھے ہیں یا سامنے کھڑے ہیں، یہ تو "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں،

---

۵۱ مولوی عبدالغفور بخاری،

(۳) مدحِ صحابہ کے ہنگامے میں اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں کوئی شخص مشرف ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ "ایک میرے حسین کو تو کربلا میں شہید کیا، اور اس میرے حسین کو ہندوستان والے ستا رہے ہیں" چنانچہ اس خواب کی وجہ سے بعض وہ حضرات جو لیگ میں تھے لیگ سے علیحدہ ہو کر مدحِ صحابہ میں شریک ہوئے، اور پولیس کے ڈنڈے کھائے، اور جیل میں گئے، میں اس زمانے میں مدینہ منورہ میں تھا، وہاں کے بعض حضرات نے مدینہ اخبار (بجنور) جس میں یہ واقعہ درج تھا مجھ سے پڑھوا کر سُنا، اور بحد زیادہ روتے تھے،

(۴) حال ہی میں کاتبِ حروف نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اور سامنے مولانا حسین احمد کھڑے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مولانا کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ "یہ بہت کام کا آدمی ہے، اور اس وقت اسی کی ضرورت ہے جو یہ کر رہا ہے"، یہ اس لیے فرمایا کہ کاتبِ حروف کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ بخاری شریف کا درس چھوڑ کر کس دھندے میں لگ گئے، تو فرمایا، اس وقت اسی کی ضرورت ہے،

(۵) جب سید پور ضلع رنگپور کا واقعہ پیش آیا تو مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماءِ ہند نے ایک مضمون اخبارات میں شائع کیا تھا، جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا "آج لیگی صاحبان اس شیخ کامل کی توہین و تذلیل پر بغلیں بجا رہے ہیں، مگر حضرت موصوف کی عنداللہ مقبولیت کے متعلق یہ عجیب و غریب لطیفہ اہلِ نظر کو ہمیشہ یاد رہے گا کہ جس وقت احقر نے بھاگلپور کا خط پڑھا جس میں وہاں کے واقعات درج تھے، تو اس کے بعد دوسرا لفافہ جو کھولا تو اس میں ایک خط تھا جس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں":

"دھام پور میں ایک آدمی ہے، نمازی پرہیزگار ہے، جھوٹ نہیں بولتا، اس کی بات قابلِ اطمینان ہے، وہ فرماتے ہیں، رات میں نے دیکھا کہ ایک مکان ہے، اس کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، باہر پہرے پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں، حضور

(حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) کے ڈاڑھی کے بال اِدھر اُدھر کو ہو رہے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب ان بالوں کو درست فرما رہے ہیں"۔ اب یہ شخص مولانا کی خدمت میں حاضری کے لیے بے چین ہے، روتا ہے اور بے قرار ہے، مولانا آجکل دیوبند میں ہیں یا کہیں گئے ہیں؟

(روزنامہ ہند، مورخہ ۱۴ر شوال ۱۳۶۴ھ، ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ یہ خواب سچے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی دربارِ رسالت میں رسائی ہے، نہ صرف رسائی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن پہ شفقت وعنایت ہے، کہ بلا کر اپنے پاس بٹھایا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا جو کام اس وقت کر رہے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسندیدہ ہے،

اب ہر مسلمان سنی ہو یا شیعہ، مقلد ہو یا غیر مقلد سوائے قادیانیوں کے کہ ان کا نبی ہی الگ ہے، اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہونے کا دعویٰ ہو بطور خود اپنے دل میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کو کیا ایسی ہستی کے ساتھ رہنا ہے جس کی رسائی دربارِ رسالت میں ہے، نہ صرف رسائی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر شفقت وعنایت بھی ہے، اور اس کو وہ کام کرنا ہے جس کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ "اس وقت اسی کی ضرورت ہے"۔ یا ایسے کے پیچھے چلنا ہے کہ جس کی دربارِ رسالتؐ میں تو درکنار اس دربار سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں، اور کیا اس کو ایسی سیاست کی ضرورت ہے جو مذہب کے تابع ہو، یا ایسی سیاست کی ضرورت ہے جو بالکل دہریت ہے بلکہ مذہب کی دشمن ہے؟ اور کیا اس کو اپنا حشر ایسی ہستی کے ساتھ کرانا ہے کہ جس کی پرسش دربارِ رسالت میں ہو یا ایسے کے ساتھ کہ جس کو بالکل اس دربار سے لگاؤ ہی نہ ہو، بلکہ قرآنی احکام کو جنجال کہتا ہو، اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کا دلی تعلق ہوگا۔

اس پر بھی اگر آپ کا دل یہ کہے کہ ہم تو اسی کے پیچھے چلیں گے، اگرچہ اس دربار سے اس کو کچھ بھی لگاؤ نہ ہو، اور اگرچہ اس کی سیاست اسلام سے بیگانی ہو اور بُری ہو تو پہلے اس سے کہ آپ اپنے دل کو ملامت کریں اس بات پر توجہ دیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی اتباع سے حالانکہ وہ مسلمان تھا اور اس کو اپنا قائد بنانے سے کیا چیز مانع تھی؟ اور مانع بھی کیسی کہ جان تک دیدی مگر یزید کے اتباع اور اس کے قائد ہونے کو منظور نہ کیا ؂

مرگیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت وہ حسینؑ

وہ چیز یہی اور صرف یہی تھی کہ یزید اگرچہ مسلمان تھا مگر فاسق و فاجر تھا اور حضرت امامؑ کو گوارا نہیں تھا کہ ایسے فاسق و فاجر کو اپنا قائد بنائیں، پھر کتنا ظلم و ستم ہے کہ اس ہستی کو جس کی رسائی سرورِ دو عالمؐ کے دربار میں ہو، مجبور کیا جائے ایسے شخص کے اتباع اور قائد بنانے پر جو نہ ہندو نہ مسلمان، نہ سنی نہ شیعہ، نہ اس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کا لگاؤ، حالانکہ قرآن شریف میں صاف ارشاد ہے وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا،

اگر اس پر بھی آپ کا دل یہی کہے جائے کہ ہم تو ایسے ہی شخص کی قیادت کو تسلیم کریں گے، اگرچہ قرآن شریف بھی اس کی اجازت نہ دیتا ہو، تو آپ تبرکاً ہی یہ آیت پڑھ لیجیے:۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً، اور ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

ہاں ایک بات پر آپ میرے کہنے سے اپنی توجہ مبذول کریں، جن لوگوں نے حضرت امام عالی مقام رضی اللہ عنہ پر تیر برسائے، ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں

صرف اتنی بات پر کہ حضرت امامؓ نے ایک مسلمان مگر فاسق کی قیادت منظور نہ کی،
ان لوگوں کی نسبت آپ کیا کہیں گے؟ کیا ان کو دربارِ رسالتؐ سے کچھ لگاؤ تھا؟ یا
ان کا کنکشن کٹ چکا تھا؟ اور کیا ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل
خوش کیا یا دل دکھایا؟ اور کیا یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے حامی اور خیر خواہ تھے
یا یزیدی سلطنت کے؟ اور کیا ان لوگوں کا وجود مسلمانوں کے واسطے باعثِ ننگ و
عار تھا یا باعثِ فخر؟ اور کیا اسلام ان لوگوں کے دلوں میں بھی تھا یا صرف زبان پر؟
جواب تو ظاہر ہے، مگر یہ تو فرمایئے کہ ایسی مبارک ہستی پر جس کی رسائی
دربارِ رسالتؐ میں ہو اینٹیں اور پتھر پھینکنے والوں کو ایسی بابرکت ہستی کو گندے سے
گندے کلمات بکنے والوں کو ایسی مبارک ہستی کی (جس کو ان مبشرات کے پیش نظر
رکھتے ہوئے فرشتۂ زمین کہنا بے جا نہیں) ہر قسم کی توہین و تذلیل جائز رکھنے
والوں کو بلکہ خود کرنے والوں کو وہ خطابات بھی آپ عنایت کریں گے جو یزیدی
لشکر اور اس کے افسروں کو آپ نے دیئے یا نہیں! نہیں تو کیوں؟ جبکہ واقعہ
بالکل ایک سا ہے،

اور یہ بھی سچے اور انصاف والے دل سے فرمایئے گا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ
کا سچا اور واقعی جانشین کیا وہ شخص ہو سکتا ہے کہ جس کی رسائی دربارِ رسالت میں ہو
اور دشمنانِ اسلام سے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کر رہا ہو، یا وہ شخص جس کو دربارِ
رسالتؐ سے کچھ بھی لگاؤ نہ ہو، اور بجائے تکلیف کے دشمنانِ اسلام کی آغوش
میں راحت سے ہو؟ اور یہ بھی یاد رکھیے کہ اگر مولانا مدنی ہندوؤں کے تابع ہوتے
جیسا کہ لیگی اپنے قائدِ اعظم کے حکم کے تابع ہیں تو اس دربار میں اُن کی رسائی
نہ ہوتی اور نہ پرسش، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہو جیے، ہاں دشمنانِ
اسلام کا وقار اور اقتدار کم کرنے کے لیے ایک ہندو جماعت کے ساتھ اشتراکِ عمل ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جو کام مولانا مدنی اس وقت کر رہے ہیں اس وقت اسی کی ضرورت ہے، اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسندیدہ ہے، آئندہ آپ کو اختیار ہے
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝

یہ بھی خیال میں رکھیے کہ ان الیکشنوں کے بعد ہندوستان کا نیا قانون بننے والا ہے، اس لیے جمعیۃ العلماء اس کوشش میں ہے کہ اسمبلی میں اس کا اقتدار تسلیم کیا جائے، تاکہ مذہبی قوانین و مراسم کی حفاظت ہو سکے۔

دوسری طرف سرمایہ دار دل کا طبقہ ہے، جن سے مذہبی خدمات اور اسلامی قوانین کی حفاظت کی امید گذشتہ واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیکار ہے، اس لیے کہ یہی لوگ تو ہیں جو قرآن شریف کی تعلیم کو بند کرنے والے تھے، پردے کے مخالف تھے، اسلامی احکام کو انگریزی قانون کے مقابلہ میں ٹھکرانے والے تھے، علمائے حق کا وقار کھونے والے تھے، اب ووٹ لینے کے واسطے کیا کیا ڈھونگ رچائے جا رہے ہیں، اس لیے اس وقت کی یہ جنگ اسلام اسلام کی جنگ نہیں، بلکہ اسلام اور دہریت کی جنگ ہے، حق اور باطل کی جنگ ہے، سنت اور بدعت کی جنگ ہے، اس میں خوب غور کر کے اپنا ووٹ اس کو دیجیے جو آپ کے مذہب سے واقفیت رکھتا ہو، اور مذہب کا حامی ہو، وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ فقط،

ہدیۂ تبریک

اتنا مضمون لکھنے پایا تھا کہ حضرت مولانا الحاج الحکیم السید محمد اسحٰق صاحب کٹھوری نے اپنا خواب بیان کیا، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکان میں تشریف فرما ہیں، ایک تخت پر اور اس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کچھ پیچھے ہٹے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب بیٹھے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں ایک کاغذ ہے، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت غور سے دیکھ رہے ہیں، اور تخت کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دارالعلوم دیوبند کے طلبہ بیٹھے ہیں، اس کاغذ میں ان طلبہ کے نام ہیں جن کے دیکھنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ توجہ فرما رہے ہیں، حکیم صاحب ممدوح دروازے میں اس خیال سے رُک گئے کہ ایسا نہ ہو کہ میرے آگے بڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس کاغذ سے ہٹے ادب سے دروازے ہی میں کھڑے تھے، کہ اُن طلبہ میں سے جو سامنے بیٹھے تھے ایک طالب علم اُٹھ کر آئے اور ان سے کہا کہ آپ اندر آجائیے، انھوں نے کہا کہ ادب کے خلاف ہے، کہ میں آگے بڑھوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس کاغذ سے ہٹے،

یہ وہی طلبہ دارالعلوم دیوبند ہیں جو وفد کی صورت میں باہر جارہے ہیں،

ان کو مبارک ہو اور صد ہزار بار مبارک ہو کہ ان کے ناموں کی فہرست دربار رسالت میں پیش ہوئی، جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت غور سے نظر فرما رہے ہیں مبارک ہو یہ خوش قسمتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن پر شفقت وعنایت ہے،

یہ حضرات جس قدر بھی اپنی خوش قسمتی پر فخر کریں بجا ہے، رَبِّ زِدْ فَزِدْ،

ان حضرات کی خدمت میں باادب عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان کی دربارِ رسالتؐ میں رسائی ہو، یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مسلمان کا اس دربار سراپا خیر و برکت و انوار سے کنکشن مجڑا ہوا ہو، اس مبارک سفر میں اور دینی خدمت کی انجام دہی میں آپ حضرات کو ایسے مسلمان بھی ملیں گے جو ظاہر میں مسلمان اور باطن میں انگریز، اور ایسے بھی جو ظاہر میں بھی انگریز اور باطن میں بھی انگریز! ایسے مسلمانوں سے آپ حضرات کو ضرور تکلیفیں پہنچیں گی، اس لیے کہ ان کا کنکشن دربارِ رسالتؐ سے کٹ چکا ہے، یا شروع سے تھا ہی نہیں، اگر ان کا تعلق دربارِ رسالتؐ سے ہوتا تو مجاہدِ اعظم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ پر اینٹیں اور پتھر نہ برساتے جن کی رسائی اور جن کا تقرب اس خواب سے اور اس کے علاوہ اور بہت سے رؤیائے صادقہ سے حسب احادیث صحیحہ ثابت ہے، میں اس کا بہت تجربہ کر چکا ہوں، اور اسی تجربے کی بنا پر یہ عرض کیا ہے، فقط،

وَاللّٰهُ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ط يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

محمد کفایت اللہ گنگوہی غفرلہٗ

سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور تتمہ مقبول احمد صاحب نظامی کا مضمون شائع کر دیا جائے، جو اجمل بمبئی مورخہ ۲۹ جنوری (۱۹۴۶ء) میں شائع ہوا ہے،

دربارِ رسولؐ میں مسٹر جناح کی شکست

(از مقبول احمد صاحب نظامی)

۱۹ دسمبر ۱۹۴۵ء کے "صدق" میں ایک خواب چھپا ہے، یہ خواب ایک صاحب نے دیکھا ہے، جو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دین دار اور ذاکر و شاغل بھی ہیں، اور روحانی تعلق حضرت شیخ سنوسی رحمۃ اللہ علیہ سے رکھتے ہیں،

"بوقت سہ پہر میں نے دیکھا کہ ایک غیر آباد جگہ میں جہاں سبزہ پھیلا ہوا ہے کپڑے کی قنات کے اندر مجمع ہے، چار مسلمان قنات کے باہر ہیں، معلوم ہوا کہ اندر دربارِ رسولؐ آراستہ ہے، مولانا حسین احمد اور مسٹر جناح دونوں دربار میں اپنا اپنا نظریہ پیش کر رہے ہیں، گفتگو کی آواز اگرچہ باہر آ رہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی، بعد میں کسی نے کہا کہ مولانا حسین احمد صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو مسٹر جناح کو قائل کر دیا، میں فوراً بیدار ہو گیا، زبان پر کلمۂ طیب جاری تھا اور دربار دیکھنے کی مسرت تھی، گھڑی میں دو بجے کے قریب وقت تھا، اگرچہ مجھے حضورؐ کی زیارت نصیب نہ ہوئی لیکن کسی طرح یہ امر ذہن میں ہے کہ مجمع بہت کافی ہے، اور آمنے سامنے دو لائن میں کرسیاں بچھی ہیں، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جس لائن میں ہیں مولانا بھی اسی لائن میں ہیں، زرد عبا پہنے ہیں،

سامنے کی لائن میں مسٹر جناح ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا انگریزی لباس پہنے ہیں، (راقم الحروف نے صاحبِ خواب سے مل کر مزید وضاحت چاہی تو معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب، داہنی صف میں دیکھے گئے"

مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں: "تعبیر ایک خاص فن ہے، اور اس خواب

کی تعبیر کوئی صاحبِ فن ہی دے سکتا ہے، ایک عامی کی حیثیت سے صرف اتنی گذارش کی گنجائش ہے کہ خواب مبارک بہرصورت ہے، اور دربارِ رسول کی حاضری گو محض درجے ایک تماشائی کی حیثیت سے سہی بجائے خود ایک نعمت ہے، دربار میں فریقین کی حاضری اور مکالمت اسی اصل حقیقت کی ترجمان ہے، کہ اختلاف جو کچھ ہے وہ اجتہاد و بصیرت کا ہے، ضلالت محض اور بے دینی میں کوئی فریق بھی مبتلا نہیں، باقی یہ ظاہر ہے کہ خواب شریعت میں کوئی حجت نہیں مولانا کا شمار صالحین و ابرار میں ہونا بغیر اس خواب کے بھی ایک امر واقع اور واضح تھا، ان کے سیاسی مسلک کا صحیح ہونا اس خواب کے بعد بھی لازم نہیں آتا، اجتہادی غلطیاں بڑے بڑے صحابہ تک سے ہوئی ہیں (جن سے بزرگ تر ہستی کسی کی ممکن نہیں) لیکن اہلِ سنت کے عقیدے میں ان کے شرفِ صحابیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو جاتا۔"

ایک ایسے بزرگ کا جن کے عارفانہ مضامین کا ملک میں سکہ چل رہا ہو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ "اس خواب کی تعبیر کوئی صاحبِ فن ہی دے سکتا ہے۔" اور یہ فرمانا کہ "مولانا حسین احمد صاحب کے سیاسی مسلک کا صحیح ہونا اس خواب کے بعد بھی لازم نہیں آتا،" قابلِ غور ہے، جب کہ یہ امر مسلّم ہے کہ ذاکرین و صلحاء کے خواب بھی فیضانِ نبوت کا عکس ہوتے ہیں، خصوصاً وہ خواب جس کی نسبت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو،

جس خواب کے دیکھنے والے کو نعمت کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے، اسی خواب کا متن جن امور پر روشنی ڈال رہا ہے اسے مستور نہ رکھنا چاہیے تھا،

مولانا حسین احمد مدنی جس لباس میں نظر آئے ہیں وہ صالحین اور نائبین رسولؐ کا لباس ہے، یا بالفاظ دیگر اسلامی برزخ میں دکھائے گئے ہیں،

مسٹر جناح غیر اسلامی برزخ کے گہرے نیلے لباس میں ہیں' اس رنگ اور لباس سے جس اشارہ کی وضاحت ہوتی ہے اس سے مولانا عبدالماجد مدظلہٗ بے خبر نہ ہوں گے ؛

دیکھنے والے نے یہ دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو مولانا حسین احمد صاحب نے

مسٹر جناح کو قائل کر دیا، لیکن تعبیر میں اسے چھوڑ دیا گیا ہے، حالانکہ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ مولانا کا نظریہ دربارِ رسولؐ میں واضح و ظاہر ہو گیا اور مسٹر جناح کا نظریہ باطل، تعبیر کے آخر کلام میں یہ فرمانا کہ "اجتہادی غلطیاں بڑے بڑے صحابہؓ سے ہوئی ہیں لیکن اہلِ سنت کے عقیدہ میں ان کے شرفِ صحابیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہو جاتا" کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے، اگر دونوں حضرات کی مثال صحابہ سے دینے میں ان کی اجتہادی حیثیت بتانا مقصود ہے تو اس کی جرأت مولانا عبدالماجد صاحب جیسا ادب شناس عارف کر سکے تو کر سکے ہم جیسے کم نگاہ تو ہمت بھی نہیں کر سکتے، اور جناح بیچارے تو کیا ہم مولانا کو بھی جو دربارِ رسولؐ کے اصحاب الیمین ہیں اور برزخ رسالت کے حامل ہیں اور عالمِ اجساد میں جنھوں نے مدتوں جوارِ رسولؐ میں حدیث کی خدمت کی ہے صحابہ کے خاکِ پا کی برابر بھی نہیں سمجھتے، پھر خواب کی تعبیر کا جہاں تک تعلق ہے اگر مدیر "صدق" کے نزدیک دربارِ رسولؐ فی الحقیقت تلبیس نہیں ہے تو یہ کہنے میں بھی کچھ ڈر نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب جس طرح ابرار و صالحین میں ہیں ان کا اجتہاد بھی صالح و خیر ہے، اور دربارِ رسولؐ کا فتح یافتہ کم از کم مجھ جیسے گنہگار کا تو یہ حال ہے کہ جب سے یہ خواب پڑھا ہے جو تذبذب کبھی کبھی قلب محسوس کرتا تھا وہ قطعاً دور ہو گیا، اور اطمینان ہو گیا کہ جو مسلک حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ کا ہے وہی حق و صواب ہے اور ہر مسلمان کو اسی راستے پر چلنا ہے، کیونکہ صراطِ مستقیم کا راستہ یہی ہے،

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَّ
ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ وَّفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ
وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ

(مدینہ، بجنور)

(بہ حوالہ اجمل، بمبئی، مورخہ ۲۹ رجنوری ۱۹۴۶ء)

۵

مجموعۂ رسایل اربعہ

متعلق

مسئلہ قومیت اور اسلام

مرتب و مدون

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

فہرست

متحدہ قومیت اور اسلام

رشحات فکر

مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ناظم اعلا جمعیت علمائے ہند

پیشِ لفظ

از حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ ناظمِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تقریباً ایک سال تک "متحدہ قومیت اور اسلام" اور "معاہدۂ یہود علمی نقطۂ نظر سے" کے عنوان سے شمس العلماء مولانا عبید الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کے درمیان "برہان" کے صفحات میں ایک طویل سلسلۂ بحث جاری رہا، اس بحث کا آغاز چونکہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے رسالہ پر ایک تنقیدی نظر سے ہوا تھا، اس لیے ناظرینِ کرام کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اول اول جب مولانا موصوف نے دہلی کے ایک جلسہ میں "متحدہ قومیت" کا ذکر کیا، اور ایک اخبار میں اس کی غلط سلط رپورٹ شائع ہوئی تو سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے تلخ لہجہ میں کیا کہ جو اُن جیسے شائستہ اور سنجیدہ انسان کے شایانِ شان نہ تھا، اقبال مرحوم کی اس تحریر کا اخبارات میں شائع ہونا تھا کہ دونوں طرف سے مضامینِ نظم ونثر کا تانتا بندھ گیا،

لیکن اسی ہنگامہ میں جب مولانا حسین احمد صاحب نے اپنا ایک بیان شائع کیا اور اس میں یہ واضح کر دیا کہ انھوں نے تقریر میں کیا الفاظ کہے تھے اور ان سے ان کی کیا مراد تھی، تو اگرچہ بعض خود غرض لوگوں نے پھر بھی جناب موصوف پر طعن وتشنیع اور سبّ وشتم میں کوتاہی نہیں کی، مگر جہاں تک مرحوم ڈاکٹر اقبال کی ذات کا تعلق تھا ان کا دل مولانا کی طرف سے صاف ہو گیا، اور اس کا اظہار انھوں نے ایک معذرت نامہ لکھ کر کر دیا،

یہ صحیح ہے کہ "قومیتِ متحدہ" کا لفظ ایک حد تک مغالطہ میں ڈالنے والا ہے، اور خصوصاً اس وقت جب کہ اس کا اعلان ان لوگوں کی طرف سے ہو جو مذہب و ملت کی تفریق کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہوں، اور وطنی اشتراک پر ہی تمام تحریکوں کی بنیاد رکھتے ہوں، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ایک مبہم کلام کی اصل مراد کا تعین متکلم کی خود اپنی تفصیل و تشریح سے اس کی زندگی کے واضح احوال و کوائف سے اور اس کی ذاتی رجحانات و معتقدات کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے تو ایک مؤمنِ صادق کا فرض ہے کہ وہ محض کسی ایک مبہم لفظ کو سُنکر اپنی طرف سے کوئی خاص مفہوم مراد نہ لے، بلکہ خود متکلم کے بیان سے اس کا مطلب متعین کرنے کی کوشش کرے، مولانا حسین احمد صاحب قبلہ "متحدہ قومیت" سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اس کی توضیح وہ متعدد بیانات میں کر چکے ہیں، ہم ذیل میں ایک اقتباس درج کرتے ہیں، جو مولانا کے خطبۂ صدارت سے ماخوذ ہے، آپنے یہ خطبہ جونپور کے اجلاس جمعیۃ العلماء میں پڑھا تھا، فرماتے ہیں:

"ہم باشندگانِ ہندوستان بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو کہ اختلافِ مذاہب اور اختلافِ تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلاف ذاتوں اور صنفوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں، اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے ازالہ کا فکر اور اس کے لیے جد و جہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا، اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی از بس ضروری ہے۔

اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے تو تمام گاؤں برباد ہو جائے گا، اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی،

اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کو دور کرنے کی جدوجہد کریں، اس اشتراک وطنی کے سبب پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ یا کمزوری نہیں ہوتی، ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر ایسے فرائض انجام دے سکتا ہے، یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرک بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب ممبر فرائض شہر، یا ضلع، یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے، اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں، یہی معنی اس جگہ "متحدہ قومیت" کے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے معنی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور ناجائز ہیں، یورپین لوگ قومیت متحدہ کے جو معنی مراد لیتے ہیں، اور جو کانگریسی اشخاص انفرادی طور پر معانی بیان کرتے ہوں ان سے یقیناً جمعیۃ العلماء ہند بیزار اور تبری کرنے والی ہے،، (ص ۴۵ و ۴۶)

اس تفصیل کے بعد کسی مسلمان کو یہ اشتباہ نہ رہنا چاہیے کہ مولانا نے "متحدہ قومیت" سے کوئی ایسا مفہوم مراد لیا ہے جو شریعت اسلام کے منشا، یا مسلمانان سلف کے کسی عمل کے خلاف ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی مراد کو ظاہر کرنے کے لیے مولانا نے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اس میں شائبہ مجاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسامحت ہو گئی ہے، لیکن منطق کا مسلمہ اصول لا مشاحۃ

فی الاصطلاح، اس مسامحت کے لیے وجہ اعتذار ہوسکتا ہے،

"متحدہ قومیت سے مراد" کے متعلق جو بحث تھی اس کا فیصلہ ہوجانے کے بعد اصلاً یا ضمناً جو دوسرے مباحث پیدا ہوگئے تھے، یعنی یہ کہ یہودِ مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہوا تھا یا نہیں؟ اور اگر ہوا تھا تو اس میں کون کون سے قبائل شریک تھے؟ قرآن مجید میں جن کو بنی اسرائیل فرمایا گیا ہے اُن سے کون لوگ مراد ہیں؟ اور نیز یہ کہ ان روایات سے "متحدہ قومیت" کے لیے استدلال درست ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ، یہ سب علمی مباحث تھے، جن کے متعلق قارئینِ برہان کو اعتراف ہوگا کہ دونوں جانب سے بکمال سنجیدگی و متانت دادِ تحقیق دی گئی ہے، البتہ کہیں کہیں کچھ تلخی ضرور پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس کی معذرت میں غالب کا یہ شعر خفیف سے تغیر کے ساتھ بے تکلف پڑھا جاسکتا ہے ؎

مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رہی یہ بات کہ فیصلہ کیا ہوا! محض گفت و شنید سے کسی مسئلہ کا آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو، پس اس بحث کا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ مختلف علمی مباحث بسط و تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آگئے اور اس نوعیت کے ساتھ کہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا،

وَلِلنَّاسِ فِیمَا یَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ

متحدہ قومیت اور اسلام

تصویر کا دوسرا رخ

از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

تمہید! دنیائے اسلام کے ایک مشہور عالم دین نے جن کا تبحر، تقویٰ و تقدس اور جن کی دیانت و امانت موافق و مخالف دونوں کے نزدیک مسلّم ہے، ایک مرتبہ دہلی کے کسی جلسہ میں دورانِ تقریر میں قومیت اور وطنیت کے متعلق کسی انگریز کا قول نقل کر دیا تھا، تقریر چونکہ سیاسی تھی، اور آزادیٔ ہند کے مسئلہ سے متعلق ...... اس لیے مخالف خیالات کے چند مقامی لوگوں اور ایک رسوائے عالم مقامی اخبار نے اس کے ..... غلط معنی پہنا کر اور انگریز کے اس مقولہ کو خود مولانا کا عقیدہ ظاہر کر کے اس کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیا،

اور یہ سب دنیائے اسلام کے ایک مایۂ ناز اسلامی شاعر اور مفکر کو غلط اطلاعات دے کر موجودہ سیاسی کشمکش میں ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اس مقدس اور بزرگ اور رہنمائے ملتِ اسلامیہ سے لڑانے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے، جانبین کے اتباع و مخلصین نے تحریر و تقریر کے ذریعہ تمام ملک میں ایک ہیجان برپا کر دیا، اور سیاسی جرائد، علمی رسائل اور مستقل تصانیف غرض تحریر کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہ رہا جس نے دونوں جانب کی حمایت میں حصہ نہ لیا ہو، مگر خوش قسمتی سے یہ منحوس بحث دونوں رہنماؤں کے باہمی سمجھوتہ سے

سے ختم ہو گئی، جس کا حال "متحدہ قومیت اور اسلام" نامی رسالہ کے صفحہ ۵

اس تمام ہنگامہ سے اگر معترضین کا مقصد اسلامی درد اور مسلمانوں کی جماعتی ہمدردی ہوتا تو یہ بحث اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جانی چاہیے تھی، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا، اور انھوں نے وہ چند اشعار جو شاعر اسلام نے غلط فہمی کی بنا پر مذکورۃ الصدر پیشوائے اسلام کے خلاف کہے تھے اور جس کو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ختم بحث کے نام پر واپس لے لیا تھا، اُن کی آخری یادگار کتاب میں شائع کر دیے، اور اپنی دلی کدورت اور بغض و عداوت کی آگ کو اس طرح سرد کر کے اطمینان حاصل کر لیا، مگر ملک میں اپنے اس تیزاب کو پھیلا کر دوسری مرتبہ افتراق و انشقاق اور مضرت رساں بحث کا دروازہ کھول دیا، اور اس مرتبہ یورپ کے نظریۂ قومیت کی بجائے ہندوستان میں مختلف اقوام کا متحد ہو کر اجنبی طاقت سے نبرد آزما ہونے اور خالص اسلامی طاقت کے اسباب مہیا نہ ہونے کی صورت میں اصل مقصد کے پورا نہ ہونے تک ملک میں مشترک حکومت کے قیام کو اجنبی اقتدار سے "بہتر" بلکہ اسلامیانِ ہند اور عالمِ اسلامی کے مفاد کے پیشِ نظر "ضروری" قرار دینے کو بھی جس کو خالص اسلامی اصطلاح کے ماتحت "متحدہ قومیت" کہا گیا ہے غیر شرعی، غیر اسلامی، کفر و شرک کی حمایت، کفر کا غلبہ جیسے مکروہ عنوانوں سے معنون کر کے سیاسی اور مذہبی دونوں طریقوں سے اس کے خلاف زہر اُگلنے لگے، تب "متحدہ قومیت اور اسلام" زیرِ تصنیف آئی، تاکہ یہ واضح کر دیا جائے کہ موجودہ حالات میں نہ یہ غیر اسلامی ہے اور نہ غیر شرعی، بلکہ ایک مقصدِ شرعی کو قریب لانے کے لیے بطور مقدمہ ضروری ہے،

نیز یہ کہ یورپین نظریۂ قومیت اور ہندوستان کی دفاعی قومیت متحدہ یا ایسے مشترک نظامِ حکومت کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے، جس میں دونوں

کہ مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اور ہر قسم کے ملی امتیازات محفوظ اور جدا جدا قائم رہتے ہوئے خالص سیاسی اور انتظامی امور میں شرکت رکھی گئی ہو،

بہرحال اس کتاب کے شائع ہونے پر موافق و مخالف تقریروں اور تحریروں کے بعد یہ دور بھی ختم ہو گیا، اور سیاسیین اور غیر سیاسیین کے افکار و آراء کا رخ اس معاملہ سے ہٹ کر دوسرے امور کی جانب پھر گیا،

تعجب اور صد حیرت، ہے جناب شمس العلماء پروفیسر صاحب کے اس طرز پر کہ انھوں نے اس بحث کو خواہ مخواہ اب تیسری مرتبہ تازہ کرنے کی سعی فرمائی ہے، جو کسی طرح بھی سعی مشکور نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ گذشتہ دو ڈھائی سال میں اس مسئلہ پر علمی، مذہبی اور سیاسی ہر حیثیت سے جس قدر مضامین شائع ہو چکے ہیں ان میں قریب قریب وہ سب باتیں مختلف طریقوں سے آ چکی ہیں جن کو پروفیسر صاحب کی محققانہ کاوش نے بساطِ کاغذ پر جمع کر دیا، اور اسی طرح ان کے جوابات بھی شرح و بسط کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں، معارف اعظم گڈھ، ترجمان القرآن لاہور، الاصلاح سرائے میر، طلوعِ اسلام دھلی، جیسے مذہبی علمی رسالے بحث کے دونوں گوشوں پر کافی اور سیر حاصل بحث کر چکے ہیں، تو اب اس فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کرنا کس طرح دینی یا علمی خدمت کہلایا جا سکتا ہے؟

نیز پروفیسر صاحب کے مضمون کو پڑھنے سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان کے اس ارادہ کے باوجود کہ وہ اس مسئلہ کو سیاسی الجھنوں سے محفوظ رکھیں گے، وہ اپنے ارادہ میں قطعًا ناکام رہے ہیں، اور بحث کا رُخ معاہدہ کے علمی پہلو سے ہٹ کر زیادہ تر موجودہ سیاسی رجحانات سے متعلق ہو گیا ہے یا متعلق کر دیا گیا ہے،

میں سیاسی مسلک میں اگرچہ حضرت مصنف کے رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا ہمنوا ہوں، تاہم اس بحث کو "متحدہ قومیت" کے نام سے زیر بحث

لانے کا شروع سے اس لیے مؤید نہیں ہوں کہ اس مرکب لفظ کی آڑ میں مخالف خیال حضرات باسانی اس رائے کے مؤیدین کے خلاف عام مسلمانوں کو دھوکہ دیتے اور زیادہ سے زیادہ مشتعل کر دیتے ہیں، اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نظریہ کے حامی مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹا کر اور ہندوستان میں یوروپین نظریہ کے مطابق ایک مستقل قوم بنا کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم کر دینا اور ملی امتیازات کو فنا کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ بناہ بخدا اس تصور کا شائبہ بھی ایک لمحہ کے لیے کسی مسلمان کے دل میں نہیں گذر سکتا، اور نہ اس دفاعی قومیت کے نظریہ سے یہ سب کچھ لازم آتا ہے، بلکہ بلاشبہہ اس کے ذریعہ سے اسلامی اعمال کے اختیار کرنے میں اور زیادہ وسعت پیدا ہونے کی صورت نکلتی ہے،

اس لیے بعض سیاسی اغراض کے ماتحت مخالف خیال مسلمانوں کا ہم پر یہ اتہام بلکہ سخت بہتان ہے، سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ، بلکہ مقصدِ حقیقی وہ ہے جو ابھی مذکور ہوا،

علاوہ ازیں یہ دیکھ کر سخت افسوس اور رنج ہوا کہ محترم پروفیسر صاحب باوجود اس دعوے کے کہ "وہ سیاسی بحث سے الگ ہو کر محض علمی نقطۂ نظر سے معاہدۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالیں گے" اپنے مضمون کی ابتدا اسی سیاسی طعن و تشنیع سے فرماتے ہیں جس کے ذریعہ دوسرے سیاسی بہادروں نے ناانصافی کے ساتھ حضرت مصنفِ رسالہ پر تیر باری کی ہے، ...... اس لیے کہ اگر ہجو ملیح، طعن و تشنیع، بد دیانتی کا الزام اور سیاست سے غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف کسی پر بے جا الزام قائم کرنا، یہ سب امور علمی مباحث میں سنجیدگی شمار کیے جا سکتے ہیں تو پھر ہر عقلمند کے نزدیک پروفیسر صاحب کے اس طریقہ سے بہتر اُن بہادروں کا طریقہ ہی قابلِ ستائش ہے جنہوں نے قائل کے مفہوم میں تحریف

کر کے اپنے مزعومہ اعتقاد کی بنا پر جو کچھ زبان پر آیا کہا اور جو کچھ لکھا جا سکا لکھا،
یہ ہے وہ مُردہ بحث جس میں پروفیسر صاحب پھر ایک بار جان ڈالنے کی سعی فرما رہے ہیں، اور ساتھ ہی یہ اقرار فرماتے جاتے ہیں کہ وہ اُن حالات و مباحث سے اب تک قطعاً بے خبر ہیں جن حالات میں یہ رسالہ زیرِ تصنیف آیا، اور اس لیے ۳۶، ۳۷ صفحے پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آئے، یا للعجب!

مسئلہ کی اصل حقیقت

بہر حال مسئلہ کی زیرِ بحث کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام روحانیت کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی مذہب کا ایک اہم جزء قرار دیتا ہے، اور یہ جزء ہندوستان کے اندر صحیح معنی میں قریباً ڈیڑھ صدی سے ہاتھ سے نکل چکا ہے، اس حالت میں اسلام ہم پر کیا فرض عائد کرتا ہے جہاد بالسیف، ہجرت؟ موجودہ غلامی پر قناعت؟ یا کوئی ایسی راہ جو اصل مقصد سے قریب کر دے؟ یا کم از کم موجودہ حالت سے بہتر اور مفید ہو؟ ——— یہ ایک سوال ہے جس کا جواب اہلِ علم پر فرض ہے،

اسلامی ادلّہ، قرآن عزیز، احادیثِ رسولؐ اور اجماعِ امت اس تعلیم سے پُر ہیں کہ افراد و احاد کی مجبوریوں سے قطع نظر کسی اسلامی جماعت کو جو ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں نفوس پر مشتمل ہو، غیر اسلامی اقتدار کی غلامی پر قانع ہونا ہرگز جائز نہیں ہے، اسی طرح حالات و واقعات کے اعتبار سے نہ اس قدر عظیم الشان آبادی کو ہجرت کا حکم دیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ بھی اسلامی حکم ہے کہ جہاں مسلمانوں کی ثقافت، آثارِ اسلامی، اوقاف، مساجد اور اسلامی ضروریات کے تمام نقوش موجود ہوں اُن کو تباہ و برباد چھوڑ کر ایک بڑے ملک کی زبردست آبادی وہاں سے ہجرت کر جائے یہ کسی طرح جائز و درست نہیں، اور جہاد بالسیف کے لیے نہ تو مناسب حالات ہیں اور

نہ بصورتِ حال موجودہ زندگی میں پیدا کیے جاسکتے ہیں، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ہر مسلمان ادنیٰ توجہ سے معلوم کرسکتا ہے کہ یہ قدرت فی الحال نہ ہم میں موجود ہے، اور نہ غلامی کی موجودہ حالت میں اس کے وجود پذیر ہونے کی کسی حالت میں بھی توقع ہے، تو اب اسلام العیاذ باللہ ہم کو ان مجبوریوں میں چھوڑ کر تاریکی میں رکھتا ہے، یا ان حالات میں بھی کوئی روشنی دیتا ہے؟ ——— اس کے لیے چند علماء اور مفکرینِ اسلام نے اسلامی احکام کی روشنی ہی میں ایک راہ طے کی، اور مسلمانوں کی عملی راہنمائی فرمائی، یہ وہ نامور ہستیاں ہیں جن کی زندگیاں اسلامی گفتار ہی کی نہیں ہیں بلکہ اسلامی کردار کی بھی روشن مثالیں ہیں، اور جنھوں نے عملی طور پر بھی ہندوستان میں اسلامی حکومت کا غلبہ قائم کرنے کی سعی کی ہے، ان میں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہٗ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں،

وہ راہ یہ ہے کہ اوّل ہندوستان کی موجودہ حالت میں انقلاب کرنا ضروری ہے، اور وہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مختلف اقوامِ ہند اجنبی طاقت کے مقابلہ میں یہ طے نہ کرلیں کہ وہ اپنے مذہبی اور دوسرے تمام خصوصی امتیازات میں جُدا جُدا قوم ہوتے ہوئے ملکی انتظام و انصرام میں ایک قوم یعنی ہندوستانی سمجھے جائیں گے، تاکہ متفقہ سعی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو، اور ہم اصل مقصد کے حصول میں جو ابتدائی رکاوٹ پا رہے ہیں وہ آہستہ آہستہ دور ہو کر ہم کو مقصد سے قریب کردے یا کم از کم موجودہ حالت سے زیادہ ہم احکامِ اسلامی کے اختیار ہی میں آزاد ہو جائیں،

جن حضرات کے نزدیک موجودہ حالت پر قناعت شرعاً حرام ہے اور بحالاتِ موجودہ جہاد بالسیف کے لیے راہ مسدود اور ہجرت سے خود شرعی معذوری موجود ہے ان کے نزدیک یہ طریقِ کار ہی اصل مقصد کے لیے ممد و معاون ہو سکتا ہے،

اور جبکہ حصولِ مقصد اسلامی فریضہ ہے، تو عام اصولِ اسلامی مقدمۃ الواجب واجبۃ (جس شے پر کسی فرض کا انحصار ہو وہ شے بھی فرض ہے) کی بنا پر اس طریق کار کو اختیار کرنا بھی ضروری اور واجب ہے،

نیز اگر یہ طریق کار "اَہْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن" دو مصیبتوں میں سے اسلامی نقطۂ نظر سے ہلکی مصیبت ہے تب بھی اس کا اختیار کرنا اسلامی احکام کی رُو سے ازبس ضروری ہے، مقصد کی تکمیل کے لیے اس سیاسی اتحاد کا نام ہی حضرت مصنف کے نزدیک قومیت متحدہ ہے، مگر بعض مسلم سیاست دانوں نے جو اس سے قبل تحریر و تقریر میں خود اس قسم کی قومیتِ متحدہ کا بارہا اعلان کر چکے ہیں اور جنھوں نے سرکاری شہادتوں میں بھی اس کو ہندوستان کے لیے لازمی و ضروری بتایا ہے، اپنی خاص اغراض کی بنا پر اُن باعمل ہستیوں کے اس طریق کار یا نظریہ پر اب مذہبی اعتراضات کے نام سے حملے کرنا اور ان کو موردِ طعن بنانا پسند کر لیا ہے،

منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ہندوؤں کے ساتھ بوجہ مشرک ہونے کے اس قِسم کا اشتراک بھی ناجائز اور حرام ہے، نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے خیر القرون تک کسی وقت بھی غیر مسلم کے ساتھ اس قسم کے اتحاد کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا، اور اس قسم کی سیاسی متحدہ قومیت بھی حرام ہے،

حضرت مصنف "متحدہ قومیت اور اسلام" نے انقلاب کے وجوب کے لیے "ہندوستان کے لیے راہِ عمل" کے عنوان تک بحث فرمائی ہے، اور اس کا حاصل وہی ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان ہو چکا جس کو مقدمۂ واجب سمجھ کر واجب کہا گیا ہے، اور صفحہ ۴۲ کے عنوان "متحدہ قوم اور امتِ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے بنائی" سے صرف اس اعتراض کا

جواب دیا ہے کہ تاریخِ اسلامی میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان کسی قسم کا سیاسی اتحاد یا اشتراک پایا ہی نہیں جاتا جس کو متحدہ قوم یا متحدہ امت کہا گیا ہو، پس اگر یہ ثبوت حسب اتفاق قطعًا نہ پایا جاتا تب بھی مسئلہ کا وجوب اپنی جگہ اسی طرح باقی رہتا اور اس کے دلائل بھی اپنی جگہ اسی طرح صحیح اور مضبوط رہتے، لیکن خوش قسمتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی کٹھن منزل میں عملی طور پر بھی ایک تاریخی ثبوت موجود ہے جو خود زمانۂ نبوت کا ثبوت ہے، اس لیے مجھے سخت حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب مسئلہ کی اصل حقیقت اور اس کے دلائل سے قطع نظر فرما کر ایک اسلامی تاریخی نقل کو مصنف کی جانب سے اس مسئلہ کا خود ہی شرعی محور بتاتے اور قومیتِ متحدہ کے وجوب کی دلیل ظاہر کرتے ہیں، اور پھر خود ہی اس پر تنقید فرما کر یہ ثابت کرنے کی سعی فرماتے ہیں کہ چونکہ اس روایت کی سند منقطع ہے لہٰذا احادیثِ صحیحہ کے اصول پر اس سے استناد نادرست ہے، نہ معلوم علمی دیانت کا یہ کس قسم کا مظاہرہ ہے جو دوسروں کی دیانت پر ناجائز حرف گیری کی اجازت دیتے ہوئے خود کو اس عمل کی اجازت دیتا ہے،

یہ روایت جس کو ابن اسحٰق جیسے امام سیرت نے بیان کیا ہے، اور جس کا سیرت میں وہی مرتبہ ہے جو امام احمدؒ اور امام بخاریؒ کا حدیث میں ہے، بلاشبہ اسی طرح صحیح اور مقبول ہے جس طرح سیرت کی دوسری صحیح اور مقبول روایات مستند سمجھی جاتی ہیں، اور اسی لیے محدثِ یگانہ امام جرح و تعدیل حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں، قاسم بن سلام جیسے محدث نے کتاب الاموال میں، اور ابن ہشام نے اس کو اپنی سیرت میں روایت کیا، اور مشہور ناقد سیرت و تاریخ محدث سہیلی نے روض الانف میں اس کو صحیح تسلیم کیا، اور اس پر حسبِ عادت کسی قسم کی جرح نہیں کی، البتہ اس قسم کی روایاتِ سیرت سے وجوب و حرمت کے احکام نہیں بیان کیے جا سکتے، اور نہ حضرت مصنف "قومیت متحدہ اور اسلام" نے اس کو اس غرض کے لیے

پیش کیا ہے، اور جس غرض کے لیے پیش کیا ہے اس کے لیے پیش کرنا ہر طرح موزوں اور اسلامی اصول کے مطابق ہے، اور جس غرض کے لیے پروفیسر صاحب نے پیش کرنا بتایا ہے وہ حضرت مصنف پر غلط الزام اور بے جا تہمت ہے، اس لیے کہ مصنف علام نے معاہدہ کا ذکر کرنے کے بعد صاف اور صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

"مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو ان کے نفسِ دین میں خلل انداز ہے، اور نہ یہ امر فی نفسہٖ اسلامی قوانینِ اجتماعیہ کے خلاف ہے۔"

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس تحریر کا لب و لہجہ کیا یہ ثابت نہیں کرتا اور اس کی سادہ عبارت کیا اس کو واضح نہیں کرتی کہ مصنف کے نزدیک مسئلہ کا یہ شرعی محور نہیں ہے بلکہ شرعی ضرورت کے لیے اسلامی واقعات کی شہادتوں میں سے ایک شہادت کے طور پر اس کو پیش کیا گیا ہے،

اسی طرح یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ پروفیسر صاحب علمی سنجیدگی کے ادعاء کے باوجود مصنفِ رسالہ پر اس لیے علمی بد دیانتی کا الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے پروفیسر صاحب کی طرح معاہدہ کی تمام عبارت کو کیوں نقل نہیں کیا، اور صرف اپنے مطلب کی دفعات کیوں نقل کیں؟ آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ معاہدہ کو اگر پورا پڑھا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ میں بالفرض اگر قومیت متحدہ بنی تو اس میں اسلام کو غلبہ رہا اور یہودِ مدینہ کو "امۃ من المسلمین" یعنی مسلمانوں ہی کی امت میں شمار ہوں گے" کہا گیا، لہٰذا اس سے کسی ایسی متحدہ قومیت کا ثبوت نہیں نکلتا جو مسلمانوں کو مغلوباً یا مساویانہ حیثیت میں حاصل ہو، اور اس لیے مصنفِ رسالہ نے ان دفعات کو ظاہر نہیں کیا، جو علمی دیانت کے خلاف ہے،

میں سخت حیرت میں ہوں کہ اس رکیک اور دانستہ تہمت تراشی کا جواب

کیا دوں ؟ کیا پروفیسر صاحب علمی استدلال کے اس طریقہ سے بالکل ناواقف ہیں کہ کسی طویل عبارت میں سے ہمیشہ اسی قدر نقل لی جاتی ہے جو اپنے دعوے کے ثبوت میں شہادت بہم پہنچاتی ہو، یہ نہیں ہوتا کہ اگر اس موضوع پر کوئی رسالہ یا کتاب لکھی گئی ہو تو جب تک اس کا ایک ایک لفظ از اول تا آخر نقل نہ کر دیا جائے ناقل بد دیانت ہی کہلائے گا، البتہ باقی ماندہ عبارت میں کوئی ایسا مضمون نہ ہونا چاہیے جو مدعی کی پیش کردہ شہادت کے خلاف ثبوت مہیا کرتا ہو یا اس کو مضمحل کرتا ہو، اور یہاں بحمد اللہ ایسا نہیں ہے،

کیونکہ علامۂ موصوف کا مرکزِ استدلال صرف یہی ہے کہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلم اور غیر مسلم کے لیے بعض حالات میں امتِ واحدہ یا قوم متحدہ کا ثبوت ملتا ہے، باقی جزئیات کا نفسِ مسئلہ کے ثبوت سے ایسا نہیں ہے: کہ اگر نفسِ مسئلہ کو اختیار کیا جائے تو جب تک اس کی تمام جزئیات کو بھی اختیار نہ کیا جائے نفسِ مسئلہ بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا، ایسا تعلق کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ اہلِ علم کی نگاہ سے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہے، وہ یہ کہ جب اسلامی مقصد کے لیے قوت، طاقت، شوکت اور حکومت کے تمام لوازمات کے باوجود حدیبیہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مشہور صلح کی جس کی ظاہری سطح مسلمانوں کے حق میں اس قدر مغلوبانہ تھی کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور صاحبِ تدبیر و سیاست سے بھی برداشت نہ ہو سکا، اور وہ عرض کرنے پر مجبور ہوئے کہ یا رسول اللہؐ! جب ہم حق پر ہیں اور دشمن باطل پر تو ہم ہرگز اپنے دین کو ذلیل نہ ہونے دیں گے، اور انتہائی مغلوبیت کی وہ دفعہ جس پر سب کچھ ہو حسبِ ذیل تھی:

انه لا یاتیک منا احد	"اور یہ شرط کہ تمہارے پاس ہمارا

وان کان علیٰ دینک الا ردد تہ الینا فخلیت بیننا وبینہ ونکرہ المؤمنون ذلک،
(بیہقی جلد ۹ ص ۲۳۲)

جو شخص بھی جائے خواہ وہ تمہارے دین ہی کو قبول کر چکا ہو اس کو ہمارے پاس لوٹا دینا پڑے گا، اور اس کے اور ہمارے درمیان مسلمان حائل نہ ہوں گے، بس یہ شرط مسلمانوں کو بے حد ناگوار ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ہمارے پاس اگر تمہارا آدمی مرتد ہو کر آئے گا تو ہم واپس نہ کریں گے،

یعنی ایک مسلم کو اس معاہدہ کے مطابق مشرکوں کے حوالہ اس لیے کر دینا ضروری تھا کہ وہ اس معاہدہ کے بعد مشرکوں کے گروہ میں سے مسلمان ہو کر کیوں دارالاسلام چلا آیا ہے، نیز اسلام کے اس دور میں جب کہ مکی زندگی میں مسلمان مغلوب تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو امر فرمایا کہ وہ نجاشی کی غیر مسلم حکومت کی پناہ میں چلے جائیں، اس لیے کہ اگرچہ وہ وہاں بھی مغلوبانہ زندگی بسر کریں گے تاہم مکہ کی موجودہ مغلوبانہ زندگی کے مقابلہ میں مذہبی امور اور امن عامہ کے اعتبار سے زیادہ آزاد رہیں گے، اور یہ ظاہر ہے کہ مکہ میں مغلوبانہ زندگی غیر اختیاری تھی اور حبشہ کے غیر مسلم اقتدار میں مغلوبانہ زندگی اختیاری تھی، مگر چونکہ دوسری زندگی سابق سے فی الجملہ بہتر اور اصل مقصد سے قریب تر کرنے والی تھی، اس لیے اس کو پسند فرمایا،

پس حالات وواقعات کی نوعیت کے لحاظ جس زمانہ میں بھی اسلامی مقصد کے لیے ایسی صورت پیش آجائے تو خلیفہ اور امیر کو اجازت ہے کہ وہ مغلوبانہ صلح بھی کر سکتے ہیں، اور فقہ اسلامی کی تمام کتابوں میں یہ بھی مسلّم ہے کہ اگر کسی وقت خلیفہ

یا امیر المسلمین نہ ہو تو علماءِ حق کی جماعت اور اہلِ حل وعقد کا گروہ بھی اسی طرح کر سکتا ہے،
پس اگر اسلامی مفاد کی خاطر شوکت وطاقت کے باوجود مغلوبانہ صلح ہو سکتی ہے تو مساویانہ
دفاعی قومیتِ متحدہ بھی بن سکتی ہے، اور اگر ضرورت کے لیے غیر اسلامی غلبہ کے تحت
چندے باختیار خود رہا جا سکتا ہے تو مساویانہ متحدہ قومیت بھی بنائی جا سکتی ہے،
اور اگر مدینہ کے حالات وواقعات کے اعتبار سے مغلوبانہ یا مساویانہ اتحادِ عمل
کی ضرورت پیش نہ آئی، بلکہ مسلمانوں کے غلبہ کے ساتھ مسلم وکافر کے درمیان
امتِ واحدہ جائز قرار پائی، تو اگر موجودہ حالت میں مسلمانوں کو یہ صورت بھی میسّر
نہ ہو، اور وہ مساویانہ طور پر یہی معاملہ ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کر لیں تو
کیا شرعی اعتراض کا موقع ہو سکتا ہے؟

رہا یہ امر کہ مسلمان مدینہ میں اس وقت مغلوب تھے، تو یہ پروفیسر صاحب کی تاریخی
معلومات کے زیر نظر ہو تو ہو، ورنہ تمام سیر وتاریخِ اسلامی کی کتابیں اور روایات اس
امر کی شہادت دے رہی ہیں کہ جب آپؐ مدینہ میں تشریف لے آئے اور مہاجرین
کی بھی بہت بڑی تعداد آ گئی تو مدینہ میں مسلمان ہی مسلمان تھے اور باقی شرذمۂ
قلیلہ، چنانچہ علامہ خضری بک کہتے ہیں:

ثم تلاحق المهاجرون فلم يبق بمكة منهم احد الا مفتون او اما المدينة فعمّ اهلها الاسلام الا قليلاً منهم[1]	"آپؐ کے بعد مہاجرین بھی آ گئے، اور مکہ میں چند قیدی اور مسلمانوں کے باقی نہ رہا، رہا مدینہ کا معاملہ تو اس کی ہو چکی تھی، البتہ تھوڑے لوگ غیر مسلم تھے۔"

[1] تاریخ الامم الاسلامیہ، ج ۱ ص ۱۴۹،

اور اس پر تمام اربابِ سیر کا اتفاق ہے، نیز اگر مدینہ میں کفار اور مشرکین کا غلبہ ہوگا، کہ جس میں یہود بھی شامل ہیں اور جن کا اسلامی حسد مشہور رہے تو ایسے معاہدہ کو وہ کیسے قبول کر لیتے جس میں ان کی مغلوبیت اور مسلمانوں کا غلبہ واضح اور ظاہر تھا،

علاوہ ازیں اس دفاعی متحدہ قومیت کے متعلق یہ دعویٰ کہ مسلمان اس میں ... ضم ہو کر رہیں گے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کو حقائق و واقعات کی روشنی میں کسی طرح صحیح نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس طریقِ کار کو درست سمجھنے والوں کا یہ یقین ہے کہ یہ طریقہ اصل مقصد سے قریب کرتا اور موجودہ غلامی کے دور کے مقابلہ میں آنے والے انقلابی دور میں اسلامی احکام کی بجا آوری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آنے کے امکانات پیدا کرتا ہے، اس لیے استشہاد اپنی جگہ قطعاً صحیح اور درست ہے

بہر حال اس معاہدہ کی عام دفعات کو قطع نظر کر کے صرف ان دفعات کو پیش کرنا جو زیرِ غور مسئلہ کے متعلق ہیں علمی دیانت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ علمی طریق استدلال کے لیے بہت موزوں اور مبنی بر صداقت ہے، اور بد دیانتی کے غلط الزام لگانے والوں کی دیانت پر ماتم کناں، پس بہتر ہوتا کہ معاہدے کی اس طویل عبارت پیش کرنے میں پروفیسر صاحب علمی تذکار کو اپنا مقصد بناتے، نہ کہ ایک مقدس عالم پر بد دیانتی کے الزام کو، یہاں پہنچ کر اصل مسئلہ کی بحث ختم ہو جاتی ہے لیکن ضروری ہے کہ پروفیسر صاحب کے اُن چند علمی مغالطوں کو رفع کر دیا جائے جو اس ذیل میں آپ کو پیش آگئے ہیں،

محترم پروفیسر صاحب نے ایک یہ اشکال پیش فرمایا ہے کہ بالفرض اگر ایسا معاہدہ ہوا بھی ہے تو وہ آیتِ جہاد سے منسوخ ہو چکا، اور اس کے بعد اس کو دلیل بنانا عام اصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے، تو معلوم نہیں کہ آپ کے اس "عام اصولِ مسلّمہ" سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اصول کا یہ مسئلہ ہے کہ جب نسخ آجائے

نہ وہ دائمی ہوتا ہے اور منسوخ کی کوئی ایسی جزئی باقی نہیں کہ کسی وقت اور کسی حال میں بھی قابلِ عمل قرار دیا جاسکے، اگر یہ مطلب ہو تو پروفیسر صاحب کا یہ علمی مغالطہ ہے، اس لیے کہ علماءِ اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، اصولِ تفسیر میں سے محققین کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی آیت یا حدیث کے منسوخ ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس حکم کی سرے سے جنس ہی منسوخ ہو جاتی ہے، بلکہ احکام کی پانچ قسموں "واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح" میں سے کسی نہ کسی ایک قسم کا حکم ضرور ہی باقی رہتا ہے، اور نسخ صرف اسی قسم پر واقع ہوتا ہے جس کے لیے ناسخ وارد ہوا ہے، مثلاً اگر کوئی شے واجب تھی تو اس کے نسخ کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کا وجوب ختم ہو گیا، مگر کم سے کم درجۂ اباحت وجواز بہر حال باقی رہتا ہے،

نیز احکام میں نسخ اس لیے وارد ہوتا ہے کہ ضروریات وحاجات کا تقاضا بر مصلحت یہی ہے، پس اب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر وحیِ الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور دین کے احکام میں ضروریات حالات کے مصالح کو اسلام نے کامل ومکمل کر دیا، تو اب پیش آنے والے حالات وحاجات کے تغیرات کے پیشِ نظر ناسخ ومنسوخ کے اثرات کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جس وقت بھی اسی قسم کے حالات امت میں پیش آئیں گے وہ حکم اسی طرح اثر انداز ہوگا، البتہ اس حالت میں ناسخ کی فرضیت یا حرمت، استحباب یا کراہت یا اباحت جو بھی وحیِ الٰہی یا ارشادِ نبوی سے قائم ہو چکی ہے وہ اب بحالہٖ قائم رہے گی، اور تبدیلِ حالات کے بعد اس کے استعمال کے لیے جدید حکم کی ضرورت نہ پڑے گی،

مثلاً جہاد سے قبل مکہ کی زندگی میں صبر کا حکم تھا، اور جہاد کی مطلق اجازت نہ تھی، لیکن جب جہاد فرض ہو گیا تو اب ضبط وصبر کی فرضیت منسوخ ہو گئی، اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی بعد کے زمانہ میں مسلمانوں پر ایسا ہی وقت آجائے کہ

شرعی نقطۂ نظر سے جہاد بالسیف نہ کرسکیں تو وہ مکی زندگی کو اختیار کرسکتے ہیں، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان تمام مساعی میں برابر مشغول رہیں جن کی بدولت آگے چل کر یہ حالت بدل جائے، اور ساتھ ہی قیامت تک رہنے والے جہاد کا حکم آج بھی اسی طرح قائم رہے گا جس طرح کل قائم تھا، اور جب بھی اس کے اسباب مہیا ہوجائیں گے اس کا عمل بھی اسی طرح فرض رہے گا جس طرح سابق میں رہا ہے، کسی سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ شراب کے پینے کا حکم منسوخ ہوگیا، اس لیے کہ اس کی عملی اباحت اسلام سے قبل رائج تھی، اور اسلام نے ایک مدت کے بعد اپنے احکام میں اس کے لیے حرمت کو جگہ دی ہے،

اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ ابتدائے اسلام میں نماز میں بات چیت مباح تھی اور اب فلاں حدیث کی رُو سے یہ اباحت منسوخ ہوگئی، اس لیے کہ یہ ابتدائی اباحت کسی شرعی حکم کے ماتحت نہ تھی، بلکہ اسلام کے قبل کی ایک عام حالت کے ماتحت تھی، کچھ عرصہ کے بعد اسلام کا حکم یہ ہوگیا کہ نماز میں بات چیت مفسدِ نماز ہے،

اور جن علماء نے ان جزئیات کو نسخ سے تعبیر کیا ہے علماءِ محققین نے تصریح کردی ہے کہ ان کی مراد نسخ لغوی ہے، اصطلاحی نسخ مراد نہیں ہے، چنانچہ علامہ شاطبی رحمہ اللہ جو حدیث اور اصولِ فقہ کے امام ہیں نسخ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

اَلْقَوَاعِدُ الْکُلِّیَّۃُ مِنَ الضَّرُوْرِیَّاتِ وَالْحَاجَاتِ وَالتَّحْسِیْنَاتِ لَمْ یَقَعْ فِیْھَا نَسْخٌ وَاِنَّمَا وَقَعَ النَّسْخُ فِیْ اُمُوْرٍ جُزْئِیَّۃٍ،	"ضروریات، حاجات اور اخلاقیات کے بارہ میں جو قواعد کلی ہیں ان میں نسخ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی جزئیات کے بارہ میں نسخ واقع ہوتا ہے"!

اور آگے چل کر دلیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَكَذَالِكَ الْحَاجِيَاتِ فَإِنَّا نَعْلَمُ أَنَّهُمْ لَمْ يُكَلَّفُوا بِمَا لَا يُطَاقُ هٰذَا وَإِنْ كَانَ قَدْ كُلِّفُوا بِأُمُورٍ شَاقَّةٍ فَذَالِكَ لَا يَرْفَعُ أَصْلَ اِعْتِبَارَ الْحَاجَات وَمِثْلُ ذَالِكَ التَّحْسِينِيَات[۵]

"اور اسی طرح حاجات ضروریات کا حال ہے، ہم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ انسانوں کو خدا نے امور شاقہ کا تو مکلف بنایا ہے، لیکن ناقابلِ برداشت تکالیف کا مکلف نہیں بنایا، بس اس لیے نسخ حاجات و ضروریات کے لحاظ و اعتبار کی بنیاد کو منسوخ نہیں کرتا اور یہی حال اخلاقیات کا ہے"

علامہ آمدی نے کتاب الاحکام میں اور محدث ابن حزم نے الاحکام فی اصول الاحکام میں بھی نسخ پر مفصل بحث کرتے ہوئے اسی کو اختیار کیا ہے، اس لیے پروفیسر صاحب کا ہجو کے انداز میں اصولِ مسلمہ کا حوالہ دے کر نسخ کے یہ معنی سمجھنا کہ "اس حکم کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ حاجت و ضرورت کے وقت میں بھی اس حکم کی کوئی جزئی معمول بہ نہیں بن سکتی"، خود اصولِ مسلمہ کے خلاف ہے،

علاوہ ازیں اگر ہم پروفیسر صاحب کے اصولِ مسلمہ کو مان بھی لیں تب بھی شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فوز الکبیر میں اور امام شاطبی نے موافقات میں اس کی تصریح کی ہے کہ متقدمین کے یہاں نسخ کے معنیٰ بہت عام ہیں، اور وہ عام حکم کی تخصیص، مجمل کی تفصیل و بیان، متشابہ کی تشریح و توضیح جیسے امور میں بھی ناسخ و

---

[۵] الموافقات فی اصول الشریعۃ جلد ۳ ص ۱۰۸، بحث کے تمام اطراف و جوانب کے لیے ص ۱۰۵ سے ۱۰۸ تک مراجعت کی جائے،

منسوخ کہہ دیتے ہیں، لیکن نسخ کے یہ معنی کہ "سابق حکم کی جگہ جدید حکم مراد شرعی اور معمول بہ قرار پاجائے" احکام میں بہت ہی شاذ و نادر ہیں، اور قرآن عزیز میں سے اُن کی شمار بھی کرائی ہے، جن میں معاہدات جیسے امور کو قطعاً اس میں داخل نہیں کیا،

امام شاطبی مکی اور مدنی احکام میں ناسخ و منسوخ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَإِذَا اجْتَمَعَتْ هٰذِهِ الْأُمُوْرُ وَنَظَرْتَ إِلَى الْأَدِلَّةِ مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ لَمْ يَتَخَلَّصْ فِيْ يَدِكَ مِنْ مَنْسُوْخِهَا إِلَّا مَا هُوَ نَادِرٌ،[۵۱]	"پس جبکہ یہ تمام امور جمع ہوں اور تو کتاب و سنت کے دلائل پر نظر کرے تو تیرے ہاتھ میں منسوخ احکام میں سے شاذ و نادر کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا"

اور شاہ ولی اللہؒ نسخ پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

قُلْتُ وَعَلٰى مَا حَرَّرْنَا لَا يَتَعَيَّنُ النَّسْخُ إِلَّا فِيْ خَمْسِ آيَاتٍ[۵۲]	"میں کہتا ہوں اور جس طریقہ پر ہم نے تحریر کیا ہے اس کے اعتبار سے نسخ صرف پانچ آیتوں کے اندر محدود ہو جاتا ہے"

اور بعض محقق علماءِ اصول نے تصریح کی ہے کہ صاحبِ جلالین یا دوسرے بعض مفسرین اکثر صبر و عفو کی آیات اور معاہدات و مسالمات کی آیات کے بارہ میں جو یہ لکھتے جاتے ہیں "اَنَّهَا نُسِخَتْ بِآيَةِ الْقِتَالِ (اس آیت کا حکم جہاد کی آیت سے منسوخ ہوگیا) یہ اُن کا تسامح ہے، کیونکہ جہاد کی فرضیت کے بعد بھی حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ احکام اپنے مناسب مواقع میں قابلِ عمل

---

۵۱ الموافقات، جلد ۳ ص ۱۰۷، ۱۰۸   ۵۲ فوز الکبیر، ص ۲۰،

ہیں، لہٰذا ابی عُبید کا جو مطلب پروفیسر صاحب نے سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ معاہدہ اپنی خصوصیات کے ساتھ جو ہجرت کے شروع میں مدینہ میں ہوا مصلحتِ وضرورتِ وقت کے ختم ہو جانے پر آیتِ جہاد کے بعد غیر معمول بہ ہو گیا،

پس اگر اس معاہدہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مذہب والوں کی ایک پارٹی مصالح کے بیشِ نظر بنادی تھی تو حالات وواقعات کی مجبوریوں کے بیشِ نظر آج بھی کوئی عالم اس کی اجازت دے "خصوصاً جب کہ اس کی ضرورت و داعی خود اسلامی امور ہوں" تو کیوں قابلِ لعن وطعن قرار دیا جائے؟ اور خواہ مخواہ اُس مسئلہ کو باطل کرنے کے لیے مناظرانہ شقوق پیدا کر کے ذکاوتِ طبع کا ثبوت کس طرح بہم پہنچایا جائے، پروفیسر صاحب کے تمام بیان کردہ درجات وشقوق میں سے حقیقی شق وہی ہے جس کو ہم سابق میں بیان کر چکے، بحث کا محور بھی صرف اسی کو ہونا چاہیے اور بس،

پروفیسر صاحب کو ایک بہت بڑا علمی مغالطہ یہ ہے کہ مدینہ کا یہ معاہدہ "جس میں مسلمانوں اور کافروں کی مدینہ کی حفاظت اور دیگر مصالح کی بناء پر "امتِ واحدہ" بتایا گیا ہے"، اسرائیلی یہودیوں یعنی بنی قریظہ، بنی نضیر، قینقاع کے ساتھ نہیں ہوا، اس لیے اس کو "معاہدۂ مسلمانان بایہود" نہیں کہنا چاہیے، اس کو البتہ یثربی قبائل اوس وخزرج کے مسلمانوں اور انہی کے نسل کے یہودی مذہب رکھنے والے کافروں کا معاہدہ کہنا چاہیے، کاش! کہ پروفیسر صاحب اپنی بحث کے رُخ کو صرف اسی مسئلہ تک محدود رکھتے، اور ایک علمی مذاکرہ کی طرح اس پر تبصرہ فرماتے تو بہت بہتر ہوتا، مگر افسوس! کہ ان کی علمی دیانت کے ادعا نے یہ نہ ہونے دیا، بہر حال اس معاہدہ کی نوعیت اس قدر صاف اور واضح ہے کہ

اس کو دیکھتے ہوئے پروفیسر صاحب کے مغالطہ پر سخت حیرت و تعجب کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔
یہ معاہدہ بلاشبہ یثرب کے تمام یہود سے طے ہوا ہے جن میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع سب ہی شامل ہیں، اور بلاشک وریب پروفیسر صاحب کا ان ہرسہ قبائل کو اسرائیلی بتانا، اوران کو معاہدہ سے جدا سمجھنا یہ دونوں باتیں قطعاً غلط اور حقیقت ثابتہ کے خلاف ہیں،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ عام مورخین کا یہ بیان ہے کہ یثرب کے یہ تین قبائل یہودی النسل تھے، تاہم محققین کی رائے اس کے خلاف ہے، اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ بجز غیر معروف دو تین خاندانوں کے یثرب کے تمام یہود جن میں خصوصیت کے ساتھ بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع بھی شامل ہیں یہودی المذاہب تو ہیں مگر یہودی النسل (اسرائیلی) نہیں ہیں، بلکہ عربی النسل اور قحطانی عرب ہیں، چنانچہ یعقوبی مشہور مورخ لکھتا ہے:

ثُمَّ كَانَتْ وَقْعَةُ بَنِي النَّضِيرِ وَهُمْ فَخِذٌ مِنْ جُذَامٍ إِلَّا أَنَّهُمْ تَهَوَّدُوا وَكَذٰلِكَ قُرَيْظَةُ،[1]	"پھر بنی نضیر کا واقعہ پیش آیا، یہ قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ جذام کی شاخ ہے، مگر انھوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، اور اسی طرح قریظہ کا حال ہے"

اور قبیلہ جذام باتفاق علماء انساب قحطانی عرب ہیں،

اسی طرح مسعودی جیسے مشہور مورخ نے لکھا ہے کہ بنی قریظہ عرب کے قبیلہ بنی جذام کی شاخ ہیں، اور یہ عمالقہ کی بت پرستی سے ناراض ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، اور شام سے نقل مکانی کر کے حجاز میں بس گئے تھے[2]۔

---

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۹، [2] مسعودی مطبوعہ یورپ ص ۲۴ بحوالہ سیرۃ النبیؐ، مولانا شبلی، جلد ا ص ۲۷۴۔

علاوہ ازیں، قریظہ، نضیر، قینقاع خالص عربی نام ہیں، اور اسرائیلی ناموں سے بالکل جدا ہیں، لہٰذا ان کے اجداد کا عربی النسل ہونا یقینی ہے، بس یہ حوالجات تصریح کرتے ہیں کہ یہ تینوں قبائل اسرائیلی نہ تھے بلکہ قحطانی النسل تھے،

لہٰذا اب پروفیسر صاحب کے دعوے کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر ان تاریخی حقائق پر غور کیجیے، "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم" کا مصداق ہے یا نہیں؟ اور پروفیسر صاحب کا متعدد صفحات پر یہود یثرب کے قبائل کی تقسیم و تحقیق کرنا یہاں لاحاصل رہا یا نہیں؟

پروفیسر صاحب کے مغالطہ کا دوسرا جزء یہ ہے کہ ان میں سے کسی قبیلہ کا ذکر معاہدہ میں نہیں ہے، حالانکہ اوس و خزرج کی شاخوں اور نسلوں کے یہودیوں کا تذکرہ ان کے قبائل کے نام سے موجود ہے، سو اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مرجوح اقوال کی بنا پر یہ تینوں قبائل اسرائیلی یہودی تھے، تب بھی یہ مغالطہ علمی تحقیق کے قطعًا خلاف ہے، اور تمام علماء سیر متقدمین و متاخرین کا بلاخلاف اس پر اتفاق ہے کہ یہ معاہدہ یثرب (مدینہ) کے تمام یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے، جن میں یہ تینوں بھی شامل ہیں، چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر جو حدیث، تفسیر اور تاریخ میں بہت ہی بلند پایہ اور محققانہ نظر رکھتے ہیں انھوں نے اس معاہدہ کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے:

فصل فی عقدہ علیہ السلام الالفۃ بین المہاجرین والانصار بالکتاب الذی امر بہ فکتب بینھم، والمواخاۃ التی امرھم بھا وقررھم علیھا و	"یہ فصل اس عقد والفت کے بارہ میں ہے جو مہاجرین وانصار کے درمیان اس تحریر کے ذریعہ سے عمل میں آئی جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے حکم فرمایا، اور اس بھائی چارہ کے ذکر میں ہے

موادعة اليهود الذين كانوا بالمدينة[۵۱]	جس کے لیے آپؐ نے ان کو حکم فرمایا اوران پر لازم کیا اور اس معاہدہ

کے ذکر میں ہے جو آپؐ نے ان یہودیوں سے کیا جو مدینہ میں آباد تھے،،

اور اس عنوان کے بعد اس فصل کی پہلی ہی سطر کو اس طرح شروع فرمایا ہے:

وکان بہا من احیاء الیهود بنو قینقاع وبنو نضیر و بنو قریظة وکان نزولهم بالحجاز قبل الانصار الخ[۵۲]	”اور اس وقت مدینہ میں جو یہودی قبائل تھے اُن میں بنی قینقاع، بنی نضیر، اور بنی قریظہ قبائل بھی شامل ہیں، اور یہ حجاز میں انصار سے پہلے آباد ہو چکے تھے،

اور سہیلی جو سیرت کے نقد و تبصرہ میں امام ہیں، وہ بھی سیرت ابن ہشام کے بیان کردہ اس معاہدہ کا عنوان اس طرح قائم کرتے ہیں:

کتاب رسول الله صلی الله علیه وسلم فیما بینه وبین الیهود[۵۳]	”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تحریر جو آپؐ کے اور یہود کے درمیان لکھی گئی،،

اور اس کے بعد ہی عنوان سے ربط قائم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

شرط لهم وشرط علیهم وامنهم فیه علیٰ انفسهم واهلیهم واموالهم وکانت ارض یثرب لهم قبل	”آپؐ کے اس معاہدہ میں ان کے لیے اور ان کے ذمہ اور شرائط مقرر فرمائیں اور اس میں ان کی جان، مال اور اہل و عیال کی امان کا ذکر کیا،

---

[۵۱] و [۵۲] تاریخ ابن کثیر، البدایة والنہایة جلد ۳ ص ۲۲۴، [۵۳] روض الانف جلد ۱ ص ۱٦،

مُنزولِ الانصار بہا، الخ[۵]	اور سرزمینِ یثرب انصار سے پہلے ان کا وطن بن چکی تھی ۔

اور علامہ ابن اثیر جزری اپنی مشہور تاریخ کامل میں غزوہ بنی قینقاع کے ذکر میں تصریح کرتے ہیں:

لمّا عاد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من بدر اظہرت یہود لہ الحسد بما فتح اللّٰہ علیہ وبغوا ونقضوا العہد وکان قد وادعہم حین قدم المدینۃ مہاجراً فلما بلغہ حسدہم جمعہم بسوق بنی قینقاع فقال لہم احذروا ما نزل بقریش واسلموا،[۵۲]	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے فارغ ہو گئے تو یہودیوں کو آپ کی کامیابی پر بے حد حسد ہوا، اور انھوں نے بغاوت کر دی، اور اس معاہدہ کو توڑ ڈالا جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت کرنے کے فوراً بعد ہی ان کے ساتھ کیا تھا، جب آپ کو ان کے حسد کا علم ہوا تو ان سب کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کیا، اور پھر فرمایا قریش کا جو حشر ہوا اس سے ڈرو اور اسلام لے آؤ ۔

ان عبارتوں میں کس قدر واضح ہے کہ ہجرت کے متصل جو معاہدہ یہود سے ہوا تھا اس میں بنی قینقاع اور ان کے ہمعصر بنی قریظہ و بنی نضیر بھی شامل تھے، یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ غزوہ بدر ہجرت کے دوسرے سال پیش

---

۵۱ روض الانف ج ۱ ص ۱۶ ۵۲ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۵۲

آیا ہے اور بدر اور اس مشہور معاہدہ کے درمیان حدیث و سیرت کی کسی روایت میں بھی کسی اور معاہدہ کا ثبوت نہیں ملتا، اور ان یہودی قبائل کو انصار کا حلیف مان کر اس کو معاہدہ کی تعبیر سمجھنا دلائل اور قرائن دونوں اعتبار سے غلط ہے، اور ابن جریر طبری کی مشہور تاریخ میں بھی غزوۂ بنی قینقاع کے واقعہ میں اسی طرح کی روایت موجود ہے[۵۱]، اور ابو عبید بنی قریظہ کے نقضِ عہد کے متعلق لکھتے ہیں:

قال ابو عبید وانما استحل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دماء بنی قریظۃ لمظاھرتھم الاحزاب علیہ وکانوا فی عھد منہ فرأی ذلک نکثا لعھدھم[۵۲]	"ابو عبید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کا خون حلال کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف مظاہرہ کیا، حالانکہ وہ آپؐ کے معاہدہ میں شامل تھے، پس آپؐ نے ان کے اس عمل کو نقضِ عہد باور کیا"،

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بنی قریظہ نے دو مرتبہ عہد شکنی کی تھی تب ہی ان کے لیے یہ سخت حکم دیا گیا، ایک تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی جو یہاں پر زیرِ بحث ہے، اور دوسرے اس معاہدہ کی جو بطورِ تنبیہ جب کیا گیا کہ بنی نضیر جلاوطن کیے جا رہے تھے، اور بنی قریظہ نے آپؐ کی شرائط منظور کر لی تھیں، مگر جب متصل ہی احزاب میں دوبارہ شیطنت کر بیٹھے تو غزوۂ بنی قریظہ پیش آیا، اور ان کا خاتمہ کر دیا گیا، بنی قریظہ کے اس دوسرے معاہدہ کا ذکر بیہقی نے سنن کبریٰ میں بھی کیا ہے، پس اگر اجلاءِ بنی نضیر کے وقت جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے پہلے زیرِ بحث

---

۵۱ تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۹۷ ۵۲ کتاب الاموال، ص ۱۶۷

معاہدہ کے علاوہ کوئی اور معاہدہ ان تینوں سے کیا گیا ہے تو حدیث و سیرت کی کتابیں تو اس سے بالکل خالی ہیں، ممکن ہے پروفیسر صاحب کے علم میں ہو، ان تمام امور کے علاوہ مفسرین اس آیت کے شانِ نزول میں

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (احزاب)	"اور اگر کسی قوم سے خیانتِ عہد کا آپ کو خوف ہو تو ان پر ان کا عہد برابر سرا پر ڈال دیں"

یہ تصریح کرتے ہیں کہ اس کا مصداق بنی قینقاع اور بنی قریظہ ہیں، اور یہ واضح ہے کہ کہ خیانت نقضِ عہد کے بعد ہی ہوا کرتی ہے، لہٰذا ان واضح اور یقینی ثبوت و قرائن کے بعد پروفیسر صاحب یہ حتمی دعویٰ کہ "اس عہد نامہ میں یہ قبائل شریک نہ تھے بلکہ یہ محض اوس و خزرج قبائل انصار کے حلیف ہونے کی وجہ ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی حلیف تھے"، نہ معلوم کس دلیل پر مبنی ہے؟

اور علامہ خضری بک مصری بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ الامم الاسلامیہ" میں اسی کے مؤید معلوم ہوتے ہیں کہ یہ معاہدہ تمام یہودِ مدینہ کے ساتھ ہوا ہے[1]،

علامہ شبلی مرحوم نے ابن ہشام کے اس معاہدہ کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ اس معاہدہ میں یہود کے یہ تینوں قبائل شامل ہیں، اور وہ اس انداز میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ ان کی نظر میں گویا قدیم و جدید علماءِ سیر و تاریخ کے نزدیک یہ مسئلہ اختلافی نہیں ہے، بلکہ متفقہ ہے، اور انھوں نے تو یہ غضب کیا ہے کہ ابن ہشام سے معاہدہ کی صرف وہی دفعات نقل کی ہیں جو "متحدہ قومیت اور اسلام" کے مصنف علّام نے نقل کی ہیں، اور باقی دفعات کو ترک کر دیا ہے، حالانکہ وہ سیرت لکھ رہے ہیں، اور اس لیے ان کا زیادہ فرض تھا کہ وہ پورے معاہدہ

---

[1] تاریخ الامم الاسلامیہ جلد اول صفحہ ۱۴۹

کو نقل فرمائیں، علامہ شبلیؒ اس معاہدہ کا سبب حسب ذیل بیان فرماتے ہیں:

"انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس و خزرج ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں، ان اسباب کی بناء پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے، خلاصہ یہ ہے[۱] الخ"

خلاصہ میں جن دفعات کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے وہ اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ علماءِ سیر کے نزدیک اس معاہدہ کی دوسری جزئیات وقتی خصوصیات کے ماتحت تھیں، اور اس معاہدہ کا محور یہی دفعات ہیں جن کی رُو سے مفادِ اسلامی کے پیش نظر وقتِ ضرورت مسلم و کافر مذہبی و ملی امتیازات کو جُدا رکھتے ہوئے سیاسی و ملکی امور میں یا حفاظتِ وطن کی خاطر ایک قوم کہلائے جا سکتے ہیں، یہ تمام نقول جو قدیم و جدید علماءِ سیرت و تاریخ سے منقول ہیں، اس بات کی روشن شہادت ہیں کہ معاہدۂ زیر بحث میں بلا شبہہ تمام یہود شامل ہیں، اور اس میں علمی حیثیت سے مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے، اس کی تقویت و تائید کے لیے میرے پاس اور بھی نقول موجود ہیں، مگر خوفِ طوالت سے ان ہی پر اکتفاء کرتا ہوں، اور پھر ایک مرتبہ توجہ دلاتا ہوں کہ یہود کے یہ تینوں مشہور قبائل اسرائیلی نہیں ہیں، بلکہ قحطانی عرب ہیں، اور اگر

---

[۱] سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۲۷۳ تا ۲۷۵

مورخینِ عرب کے ان مرجوح اور غیر مدلل اقوال کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو قطعی سطحی ہیں، مگر پروفیسر صاحب کا مرکزِ استدلال ہیں تو بھی، اور قحطانی مانا جائے تب بھی بلاشبہ یہ معاہدہ زیرِ بحث میں اسی طرح شامل ہیں جس طرح انصار کے بطون کے یہودی شامل ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خیانت والی آیت کا مصداق بنی قینقاع اور بنی قریظہ ہیں، اور مسند احمد وغیرہ کتبِ حدیث میں صحیح روایات کے مطابق جس معاہدہ کا اجمالی پتہ چلتا ہے وہ یہی معاہدہ ہے جو ہجرت کے متصل مہاجرین و انصار کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے، اور سیرت کی مستند کتابوں میں اس کی تفصیل اس طرح درج ہے جو گذشتہ اور موجودہ مہینہ کے برہان میں ذکر ہو چکی، اور معاہدہ کی تفصیلات میں کوئی ایسی چیز بھی مذکور نہیں جو اس پیش آئند صورتِ حال کے اعتبار سے اسلامی اصول کے خلاف ہو تو اس حد پر پہنچ کر اگر کوئی شخص اصولِ استدلال کے مطابق اس معاہدہ کو دلیل شرعی کی حیثیت بھی دیدے تو کیا اس کا یہ فعل غیر صحیح اور نادرست ہے؟ البتہ یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ آخر جس طرح اس معاہدہ میں قبائل انصار کے یہودیوں کا قبائل وار ذکر ہے تو ان تینوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کیوں نہیں؟

سو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اس کی وجہ صاف ہے، جو معمولی غور کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ جس اسلامی مصلحت کی خاطر یہ معاہدہ کیا گیا اور جس کی طرف علامہ شبلیؒ نے بھی سیرۃ النبیؐ میں اشارہ کیا ہے، اس کے لحاظ سے معاہدہ کا حقیقی رُخ ان ہی تینوں قبائل کی جانب ہے جو یثرب میں یہودیت کے امام اور عرب میں نمایاں شہرت کے مالک تھے، اور یہودیت کی مخالفانہ قوت کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں تھی، لہٰذا معاہدہ میں "وانہ من تبعنا من یہود فان لہ النصر" اور "ان الیہود ینفقون مع المؤمنین ماداموا

محاورہ بین، جیسے عام جملے کہے گئے، کیونکہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا تھا کہ اس سے وہی یہودی مراد ہیں، جو یہودیت میں پیش رو ہیں، البتہ جبکہ کچھ ایسے یہودی بھی تھے جو ان کی قربت کی وجہ سے انصار کے قبائل میں سے یہودی المذاہب ہو گئے تھے، تو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید اس معاہدہ کا رُخ براہِ راست ان یہودیوں کی جانب قطعی نہیں ہے، بلکہ انصار کے ہم قبیلہ اور حلیف ہونے کی وجہ سے ضمناً وہ خود بخود شریک ہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا، بلکہ اس کے برعکس آپ کو یہ واضح کرنا تھا کہ اوس وخزرج کے مختلف بطون کے یہ یہود بھی اسی طرح معاہدہ میں براہِ راست شامل ہیں جس طرح مشہور یہودی قبائل، لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ معاہدہ میں قبیلہ کی حیثیت کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ یہودیت کا لحاظ پیش نظر رکھا جائے، اسی لیے ان تینوں قبائل کی تفصیل کی گئی، اور اولیٰ مراد میں یہ تینوں قبائل فقط لفظ یہود کے عموم میں رکھے گئے، اور بیان کردہ شبہہ کو دور کرنے کے لیے انصاری قبائل کے یہود کی قبائل وار تفصیل دی گئی، تاکہ جب معاہدہ میں انصار کا لفظ آئے تو اس سے فقط یثربی مسلمان مراد ہوں، کیونکہ یہ اصطلاح ان ہی کے حق میں اسلام نے رائج کی، اور جب ان کے قبائل میں سے یہود کا ذکر آئے تو قبائل کی تفصیل کے ساتھ آئے، اس کا زبردست قرینہ یہ بھی ہے کہ معاہدہ میں مہاجرین کے قبائل کی تفصیل بجز قریش کے ذکر کے نہیں ہے، لیکن انصار کے قبائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے،

رہا یہ مسئلہ کہ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے مدد لینے کو ناپسند فرمایا، اور جس کے متعلق پروفیسر صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"زہری سے روایت ہے کہ بعض انصار نے حضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہود (بنی نضیر وقریظہ) کو نہ بلائیں وہ آکر ہماری مدد کریں گے، آپؐ نے فرمایا لَا حَاجَةَ لَنَا فِيهِمْ الخ "

سو اس کا جواب تو صاف اور واضح ہے، اور میرے خیال میں کسی طرح بھی اس سے وہ مدعا حاصل نہیں ہوتا، جو پروفیسر صاحب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ آپ کی اس ناپسندیدگی کی وجہ اُحد سے کچھ ہی پہلے کا وہ واقعہ ہے جو یہود بنی قینقاع کی غداری کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا، نیز بدر میں مسلمانوں کی کامیابی پر جو حسد یہود کو پیدا ہو گیا تھا، ان دونوں اہم حالات کا تقاضا تھا کہ یہود کی امداد اس موقع پر ہرگز نہ لی جائے، ورنہ جس طرح منافقین نے نقصان پہنچانے کی سعی کی اس سے زیادہ یہود باعثِ مضرت ثابت ہوں گے، چہ جائیکہ امداد کریں، لہٰذا حقیقی اور تاریخی وجہ یہی ہے نہ کہ پروفیسر صاحب کی قیاسی وجہ،

پروفیسر صاحب کے لیے اس مقام پر دو باتوں کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے، اول یہ کہ سِیَر کی کتابوں میں اس جگہ یہ الفاظ درج ہیں:

اِنَّ الْاَنْصَارَ اِسْتَاْذَنُوْا حِیْنَئِذٍ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْاِسْتِعَانَۃِ بِحُلَفَآئِهِمْ مِنْ یَهُوْدِ الْمَدِیْنَةِ فَقَالَ لَاحَاجَةَ لَنَا فِیْهِمْ،	"جب انصار نے یہ اجازت چاہی کہ ہم اپنے مدنی یہودی حلیفوں سے مدد حاصل کریں، تو آپؐ نے فرمایا ہمیں ان کی حاجت نہیں ہے"

اس میں "یہود المدینۃ" مذکور ہے، پس اگر پروفیسر صاحب کے نزدیک لفظ یہود کے عموم میں بغیر تفصیل کیے بنی نضیر و بنی قریظہ شامل ہی نہیں ہو سکتے تو یہاں انھوں نے اس لفظ سے ان قبائل کی تخصیص بریکٹ میں کیوں فرمائی؟ جبکہ دوسرے یہودی بھی اسی طرح کے حلیف تھے؟

دوسری بات یہ کہ آپ مصنف رسالہ "متحدہ قومیت" پر سخت ناراض ہیں،

کہ یہ دیانت کے خلاف ہے کہ منشاء کے مطابق دفعات کو ذکر کر دیا جائے اور خلاف منشاء کو ترک کر دیا جائے، تو کیا پروفیسر صاحب از راہِ انصاف فرمائیں گے کہ دیانت کی یہ کونسی قسم ہے کہ اگر ایک جگہ عام لفظ مذکور ہو اور اپنی منشاء کے خلاف ہو تو اپنی طرف سے تخصیص کر کے اس میں اضافہ کر دیا جائے، اور اگر ارباب سِیَر کی منشاء پروفیسر صاحب کی منشاء کے عین مطابق ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہو کہ اگر ان تینوں قبائل سے امداد ناپسند تھی تو پھر انصاری قبائل کے یہود المذہب افراد سے مدد کیوں نہ لی گئی؟ حالانکہ نسلی اتحاد اس کا متقاضی تھا، اور اگر دونوں سے مدد نہیں لی گئی جو کہ واقعہ ہے تو پھر جس دعوے کی دلیل میں یہ اضافہ کیا گیا ہے وہ لاحاصل ہے، بلکہ استعانت سے انکار کی اصل وجہ وہی ہے جو ہم نے بیان کی،

اس تفصیلی بحث کے بعد اب پروفیسر صاحب کی اُن نکتہ چینیوں کو ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے رسالہ کے مصنف علاّم پر علمی اصول کے خلاف لفظی گرفت کی شکل میں اس لیے فرمائی ہے تاکہ ان کے ناوکِ تنقید کا صید کسی حال پنپنے نہ پائے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیتِ ایزدی موافق نہیں ہے، تب ہی تو تیر ہدف پر نہیں بیٹھتا، اس ذیل میں آپ کی نکتہ چینی کا خلاصہ یہ ہے؛

(۱) "متحدہ قومیت اور اسلام" میں اس معاہدہ کو تمام یہودِ مدینہ سے متعلق کیا گیا ہے،

(۲) طرہ یہ کہ اوس وخزرج کے ان بطون (شاخوں) کو جنھیں رسول اللہ ﷺ انصار کا خطاب دیتے ہیں یہودیوں کے قبائل مختلفہ قرار دیا ہے،

(۳) اگر یوں کہا جائے کہ جس طرح یہ انصار اور مسلمانوں کے قبائل تھے اسی طرح یہود کے بھی یہ قبائل تھے، تو یہ مناظرانہ نکتہ آفرینی ہے، اور اس رسالہ کے پڑھنے والوں میں سے مصنف کا یہ مطلب میں سمجھ سکا، اور میں نے جن حضرات سے دریافت کیا

انھوں نے بھی یہ نہ سمجھا، یہ خدا جانے یا لکھنے والے کہ لکھنے کے وقت ان کا کیا خیال تھا، کتاب میں مجھے یہ مفہوم کہیں نہ ملا،

(۴) مصنف رسالہ نے عہد نامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ عہد نامہ بہت طویل ہے، جس میں مسلمانوں کے قبائل مہاجرین و انصار کا ذکر کیا گیا ہے"

حالانکہ اس عہدنامہ میں نہ قبائل مہاجرین کا ذکر ہے نہ یہودیوں کے قبائلِ مختلفہ کا،

ان اعتراضات کے متعلق ترتیب وار حسب ذیل گذارش قابلِ لحاظ ہے؛

(۱) پہلے اعتراض کا جواب مفصل ذکر ہو چکا، کہ غلطی پروفیسر صاحب کی ہے، حضرت مصنف کی نہیں ہے، انھوں نے جو کچھ سمجھا تھا تمام علماء سیر و تاریخ یہی سمجھتے آئے ہیں،

(۲) دوسرے کے متعلق گذارش ہے کہ اول انصار کے بیان کردہ قبائل کو عمومی حیثیت سے آپ کا انصار کہنا غلط ہے، اس لیے کہ انصار کی اصطلاح صرف یثربی مسلمان کے لیے مخصوص ہے، قبائلِ یثرب کی صفت نہیں ہے، دوم مصنف علام نے اگر ایسا لکھ دیا تو زیادہ سے زیادہ لفظی لغزش کہی جا سکتی ہے، جس سے معنی و مفہوم میں مطلق فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ قبائلِ انصار کے یہودی بھی بہر حال یہودی ہی تھے، اور زیر بحث مسئلہ کے اعتبار سے اسرائیلی یہودی اور قحطانی یہودی میں کوئی امتیاز نہیں ہے جیسا کہ بیان ہو چکا،

(۳) تیسرے کے متعلق یہ عرض ہے کہ انصار اور یہود کے امتیازی نقطہ کے اعتبار سے ان یہود کو بھی مختلف قبائلِ یہود کہہ دیا جائے تو مناظرانہ نکتہ آفرینی کیوں ہے؟ واقعہ کا اظہار کیوں نہیں؟

(۴) اور چوتھے کے متعلق یہ التماس ہے کہ یہ صحیح ہے کہ عہدنامہ میں مہاجرین

کے قبائل کی تفصیل مذکور نہیں ہے، لیکن جبکہ معاہدہ کے الفاظ میں مہاجرین اور قریش دونوں موجود ہیں اور قریش مہاجرین ہی کے قبیلہ کا نام ہے تو پھر مصنّف علام کے صیغۂ جمع پر اعتراض کرنا محض ایک لفظی گرفت کے مرادف ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے عقلاء کا یہ فیصلہ ہو کہ اگر معنیٰ مفہوم میں فرق نہ آتا ہو تو لفظی گرفت اہلِ علم کا کام نہیں،

الحاصل ان تمام مباحث کے نکھر جانے کے بعد جناب پروفیسر صاحب سے یہ امر بھی قابلِ گذارش ہے کہ حضرت مصنّف کا مقصد جب کہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی امور کو مستثنیٰ کر کے قومیتِ متحدہ بنائی تو بالفرض اگر اس معاہدہ میں مہاجرین کے قبائلِ مختلفہ اور یہود کے قبائلِ مختلفہ کا ذکر یا اسرائیلی یہودیوں کا ذکر قطعاً موجود نہیں، مگر مسلمانوں اور یہودیوں کا ذکر موجود ہے، خواہ ایک ہی قبیلہ کے مسلمان اور یہودی ہوں تو حضرت مصنّف کے مقصد پر اس عدمِ ذکر سے کیا زد پڑتی ہے؟ اور اس مسئلہ کی نوعیت میں کیا فرق آجاتا ہے؟ میں نے خود بھی بہت غور کیا، اور دوسرے اہلِ علم سے بھی دریافت کیا، مگر سب نے یہی کہا کہ مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا،

یہ تسلیم کہ امۃ واحدہ کہنے کے مصالح وہی تھے جو آپ نے ذکر فرمائے تب بھی حاصل یہی نکلتا ہے کہ صحیح علم و دیانت کے ساتھ جو جماعت اہلِ حق اسلامی مصالح کے لیے کسی وقت بھی اس طریقِ کار کو مفید سمجھے اس کو اس سے استشہاد کرنا درست و صحیح ہے، البتہ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ "اس معاہدہ کی روشنی میں راجپوت، ٹھاکر، برہمن وغیرہ ہندی قوموں اور نسلوں کے ہندو اور مسلمان تو امتِ واحدہ اسلامی مصالح کی خاطر بنا سکتے ہیں، لیکن سادات، صدیقی، فاروقی، قریشی، انصاری مسلمانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس قومیتِ متحدہ میں شامل ہو سکیں"، تو یہ امر دیگر ہے، اور اس کے

لیے دلیل کی ضرورت ہے،

پروفیسر صاحب کا ایک قرض ابھی باقی ہے، وہ یہ کہ ان کے بقول قومیت کے دو معنی ایک مطلق جماعت اور دوسرے جماعت بصفاتِ مخصوصہ مثلاً اتحادِ نسل و مذہب، اتحادِ وطن، اتحادِ زبان، اخلاق و اطوار، تمدن و تہذیب کی یک رنگی، رسوم کی مماثلت، موت و زندگی، شادی و غمی، ملنے جلنے، رہنے سہنے میں افرادِ قوم کی باہمی ہم آہنگی وغیرہ اور اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے جو نتیجہ نکالا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے معنی تو رسالہ کے مقصد کے کام ہی کے نہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے اس لیے صحیح نہیں کہ رسالہ کی متحدہ قومیت صرف اتحادِ وطنیت کے لحاظ سے بنائی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی امتِ واحدہ میں باستثناءِ مذہب مذکورہ بالا ساری صفات موجود ہیں، لہٰذا مصنفِ رسالہ کا اس سے استدلال غلط ہے

مگر یہاں بھی گذشتہ باتوں کی طرح غلط کہنے والے ہی غلطی میں مبتلا ہیں، اول تو اس لیے کہ قوم کے جو دوسرے معنی پروفیسر صاحب نے بیان فرماتے ہیں وہ یورپین اصطلاح کے مطابق ہیں، اور اس کا تطابق جو مدینہ کے معاہدہ سے کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے، اس لیے کہ یہود اور مسلمانانِ مدینہ، مذہب، اخلاق و اطوار، رسوم کی مماثلت، تہذیب کی یک رنگی، موت و زندگی اور شادی و غمی کے طرز و طریق میں بھی بہت زیادہ مختلف اور بعض جزئیات کی مماثلت کے سوا ایک دوسرے کی ضد تھے، البتہ اتحادِ نسل و وطن کا انکار نہیں ہو سکتا، نیز جزدی خصوصیات سے معاہدہ کا اصل مسئلہ پر مطلق اثر نہیں پڑتا،

علاوہ ازیں ہندوستان میں جس قومیت کا قیام مصنفِ علام چاہتے ہیں اور جو سابق میں بیان ہو چکی ہے وہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق ایک خاص اصطلاحی قوم ہے، جو مذہب، اخلاق اور دوسرے ملی امتیازات کی

حفاظت کے ساتھ ساتھ صرف ملک و وطن کی مشترک ضروریات، قوانین متحد ہوں گی، اور اس سے زیادہ دوسری کوئی غرض نہیں ہے، اور یہ اسلامی مصالح کی بنا پر ہندوستان کی موجودہ حالت کے مقابلہ میں ازبس ضروری ہے،

آخری گذارش

"اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ مذہبی و سیاسی حیثیت "جو صدیوں کی غفلت کا نتیجہ ہے" ایسی خاص شکل میں متشکل ہو گئی ہے کہ اس کا پورا خاکہ اسلام کے کسی دور خصوصاً خیر القرون میں تلاش کرنا سخت غلطی ہے، اس لیے اسلام کے قوانین کلیہ اور اسلامی سیرت کے عملی جزئیات کی روشنی میں اہل حل و عقد ہی دیانت کے ساتھ کوئی عملی پروگرام طے کر سکتے ہیں،

لہٰذا مسلمانوں کی خدمت کا یہ طریقہ جو عوام کی شورش کے بل پر طعنہ ہائے دلخراش اور تحریر و تقریر میں بے جا الزامات کی شکل میں اختیار کیا جا رہا ہے قطعاً غیر اسلامی اور انتہائی مہلک ہے، اگر صحیح درد اسلامی ہے تو ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے کہ بعد المشرقین خیالات رکھنے کے باوجود خوش اعتمادی، رواداری، لحاظ و مروت کے عام اخلاقی اصول کو عمل میں لاتے ہوئے مل جل کر کوئی راہ پیدا کریں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ سمجھ کر کہ جانبین میں ایمان دار بھی ہیں اور بد دیانت بھی، فرق مراتب کا لحاظ کیے بغیر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی سعی نہ کریں،

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا سَوَاءَ السَّبِیْلِ
وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا رَبَّکَ نَسْتَعِیْنُ ۝

متحدہ قومیت اور اسلام

شیخ الاسلام مدنی اور علامہ اقبال

کے حوالے سے

ایک علمی بحث پر قولِ فیصل

از

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاںؒ

متحدہ قومیت اور اسلام

روزنامہ ''نوائے وقت'' مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں ''متحدہ قومیت اور اسلام'' ایک دیرینہ بحث کے زیر عنوان ایک مضمون کا آغاز ہوا ہے۔ اس میں آپ نے جو ۲۸ سطری تمہید نوٹ دیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ آپ نے مولانا مدنی کی کتاب کا اندر سے مطالعہ نہیں کیا اور فقط اس نام سے ہی ایک سادہ لوح مسلمان کی طرح مشتعل ہو گئے اور آپنے اخبار میں رازی صاحب کا جذباتی اور افسانوی رنگ میں لکھا ہوا مضمون شایع کر دیا۔ ہم نے بھی یہ مضمون پڑھا، حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، صاحب مضمون کا لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور انھیں مشتعل کرنے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر تبصرہ کیا جائے۔

علامہ اقبال اور نظریہ قومیت:

علامہ اقبال مرحوم فرماتے تھے کہ قومیت کے ایک معنی ہیں ہم وطن ہونا، وہ اپنی جگہ درست اور حق ہے۔ اور اسے وہ فطری امر بتلاتے ہیں۔ قومیت کے دوسرے معنی وہ ہیں جو یورپ کی ایجاد تھے، جن کا مطلب یہ تھا کہ ایک ملک میں بسنے والے ایک تہذیب، تمدن اور مذہب اس طرح اپنالیں اور مختلف العقائد مذاہب آپس میں ایسے مل جائیں کہ کوئی تفریق نہ رہے، ظاہر ہے کہ یہ بالکل حرام ہے اور اسلام کے لیے مہلک ہے (جیسے کہ فی زمانہ روس اور چین میں ہے۔ حوالہ کے لیے مارچ ۳۸ء کی علامہ کی حسب ذیل تحریر دیکھیے جو ہم ''نقوش اقبال'' سے دے رہے ہیں:

''قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف

منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں،
کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے
نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس، چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن محض
ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا،
ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر
اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے، مگر زمانہ حال کے
سیاسی لٹریچر میں......'' الخ

(نقوش اقبال: ص ۲۸۱، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: مجلس نشریات اسلام۔ ۱/ کے
۳، ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱، کراچی ۱۸)

مولانا مدنی پر اتہام:

کتاب کے مستند ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ ''نقوش اقبال'' کے سرورق پر
جسٹس جاوید اقبال کی تعارفی تحریر ہے، اس کے صفحہ ۲۷۸ سے خاص طور پر وضاحت
ہوتی ہے کہ وہ کون سی قومیت کے خلاف تھے وہ اسی قومیت کے خلاف تھے، جسے انگریز
نے ہتھیار بنا کر سلطنت عثمانیۂ ترکیہ کو ختم کیا تھا، اس کے خود مولانا حضرت مدنی'' بھی
خلاف تھے اور مولانا محمد علی جوہر'' وغیرہ تحریک خلافت میں اس کے خلاف کام کرتے
رہے۔ کیوں کہ یہی کمیونزم کی بنیاد بنتی ہے، ذرا بھی تامل سے کام لیں، تو دونوں میں
کوئی تضاد نہیں نظر آئے گا۔ مولانا کی مراد بھی ''متحدہ قومیت'' سے خاص حد تک تعاون
ہی تھا، جیسا کہ انھوں نے صفحہ ۲۸ پر اسی کتاب ''متحدہ قومیت'' میں تحریر فرمایا ہے کہ

''اور ان غلطیوں کا ازالہ کردوں جو اس قسم کی متحدہ قومیت سے
ممانعت......'' تا آخر

معلوم ہوا کہ ان کی مراد وہ ہے ہی نہیں، جو از راہِ شرارت و تفرقہ اندازی ان کی
طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

علامہ اقبال نے اس یورپین سیاست کا مطالعہ دور سے کیا تھا اور حضرت مدنیؒ نے بہت نزدیک سے کیا تھا۔ مولانا اسی قسم کی کی لیڈر شپ میں رہ چکے تھے۔ مالٹا میں جنگی قیدی بنا کر ڈال دیے گئے تھے، مولانا کے والد ماجد ترکی کے شہر ایڈریانوپل میں بحالت قید وفات پا گئے اور اہل خانہ سے سات افراد اسی زمانہ میں وفات پا گئے (رحمہم اللہ)

متحدہ قومیت سے مولانا مدنیؒ کی مراد:

آپ غور کریں اور حضرت مولانا مدنی کی کتاب ''متحدہ قومیت'' کی عبارت پڑھیں اس کے صفحہ ۵۰ پر خلاصۂ کلام سے آخر کتاب تک جو کچھ مولانا کی مراد متحدہ قومیت سے ہے وہ وہی ہے جسے خود علامہ اقبال نے اس بیان میں درست اور اسلام کے مطابق کہا ہے، اور فطری امر قرار دیا ہے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا نقطہ نظر بعینہٖ یہی تھا۔ اشتراکیت جیسا ہرگز نہ تھا، علامہ اقبال مرحوم نے کسی اخبار کا مضمون سنا جس میں مولانا مدنی کا بیان ''طلوع اسلام'' کے ایڈیٹر رازی صاحب کے ہم جنس لوگوں نے غلط رنگ میں پیش کیا تھا، جس سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ مولانا نے مسلمانان ملک کو یورپ کی ایجاد کردہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس لیے انھوں نے سخت اشعار کہہ دیے، لیکن خط وکتابت سے جب بات صاف ہوگئی تو انھوں نے صاف دلی سے رجوع بھی فرمالیا۔

معاندین کی شرارت:

ہمیں یہ رسالہ ''رازیہ'' دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سازشی لوگ پھر بھی اپنی مخصوص اغراض کی خاطر اس مسئلے کو اچھالتے رہے، مولانا کی تقریر میں ''اتحاد ملت'' یا ''متحدہ قومیت'' کا لفظ کہیں تھا ہی نہیں، لیکن اخباری نام یہی رکھ دیا گیا تا کہ خوب بدنام کیا جاسکے، مجبوراً کتاب کا نام ''متحدہ قومیت اور اسلام'' رکھ کر مولانا نے معترضین کے

لیے تشریحی مضمون بڑھایا اس مضمون میں بھی بات تو صرف اتنی ہی ہے، جو اوپر درج کی گئی۔ وضاحت کے لیے آیات واحادیث زیادہ بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس زمانے میں زیر بحث مسئلہ یہ تھا، کہ شریعت مطہرہ کی رو سے کسی دشمن کو دفع کرنے کے لیے ہم وطن غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے یا ناجائز؟ جائز ہے تو کس حد تک؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے یا نہیں؟

غرض شرارت پسند لوگ مولانا کی اس مزید وضاحتی تحریر کا باعث بنے، لیکن فایدہ کچھ نہ ہوا، جب ایک شخص عمداً تحریف کرنے پر تلا بیٹھا ہو تو وہ صاف بات کو مغلق اور تفصیل کو الجھن کے روپ میں بدل سکتا ہے۔

''مدیر طلوع اسلام'' نے اس مضمون کو اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے بھی ان سے ہو سکا، انھوں نے یہ کام انجام دیا، اور ایک مقالہ لکھ ڈالا، جس میں مولانا پر اتنی بہتان طرازی کی کہ انھیں معاذ اللہ کفار ہند کا ہم نوا بنا کر کھڑا کر دیا۔

ہم نے اس کتابچے کو دیکھا، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس پورے رسالے پر جو اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے، تبصرہ کر دیا جائے تا کہ غلط فہمی دور ہو۔

یہ مضمون جذباتی اور افسانوی رنگ میں لکھا گیا ہے۔ حقایق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لوگوں کو مشتعل کرنے کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔

صفحہ ۳ پر ایک تحریف یہ کی گئی ہے کہ حضرت مدنی اور علامہ اقبال کے مضامین کی ترتیب میں ردو بدل کر دیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت مدنی نے جب اپنی تقریر دہلی کی تشریح کی تو علامہ اس پر رونے لگے اور اخبارات میں ایسا جامع اور بسیط بیان دیا کہ جس کے بعد حضرت مدنی لاجواب ہو گئے اور مولانا کو کہنا پڑا کہ میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار تھا انشا نہ تھا۔

اصل واقعہ کیا تھا؟:

حقیقتاً واقعہ یہ ہوا کہ وہ تقریر اخبارات میں چھپی، انصاری، تیج، احسان، الامان،

وحدت، انقلاب، اورزمیندار، سب روزناموں میں طبع ہوئی، انقلاب اورزمیندار نے الامان اور وحدت سے لیا تھا، انھوں نے مولانا کے الفاظ بدل کر مسخ کر دیے تھے مدیر ''نوائے وقت'' خوب جانتے ہیں کہ بعض اخبارات کو بیان مسخ کرنے کا مرض ہوتا ہے، جب کہ دوسرے اخبارات میں مولانا کے وہی الفاظ تھے، جو آپ نے تقریر میں کہے تھے اور احسان میں اس کے قریب تھے، یہ اخبارات کا اپنے اپنے نظریے اور غرض کی بنا پر تصرف تھا، علامہ کو تحریف شدہ تحریر پہنچی، تو وہ یہ سمجھے کہ مولانا نے جدید نظریۂ قومیت اپنانے کا مشورہ دیا ہے، اس پر وہ برہم ہوئے اور سخت تنقید کر ڈالی، حضرت مدنی اور علامہ اقبال دونوں ہی کے مخلص علامہ طالوت صاحب نے حضرت مدنی اور علامہ سے خط وکتابت کی وہ حضرت مولانا کا جواب علامہ کو اور علامہ کا جواب حضرت مولانا کو پہنچاتے رہے۔

علامہ اقبال کا رجوع:

حضرت مولانا کی اس خط وکتابت میں وہی دلائل ہیں، جو مولانا کی کتاب میں ہیں اور علامہ اقبال کے اپنی تنقید سے رجوع کے بیان میں صاف طور پر بوضاحت تحریر ہے کہ میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شایع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شایع ہو چکا ہے...... الخ اس بیان کا آخری پیرایہ ہے، ملاحظہ ہو:

''خط کے مندرجۂ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا، لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔''

اس بیان کے آخری جملے یہ ہیں۔

''مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔''

علامہ کے الفاظ سے صاف واضح ہے کہ ان کا بیان مولانا کی خط وکتابت کے بعد کا ہے اور علامہ کی وفات کے بعد پھر وضاحتی تحریر کی ضرورت رازی جیسے جعلی ناموں سے فتنہ برپا کرنے والے لوگوں کی چہ میگوئیوں کی وجہ سے ہی پیش آئی علامہ اقبال مرحوم سے بالذات اس کا کوئی تعلق نہیں۔

علامہ اقبال کی وجہ پریشانی:

حالات اقبال پر مشتمل کتابیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بحث صرف خطرات اور خدشات کے تحت چلی تھی، مولانا کو خدشہ تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرنے سے اسلام کو نقصان پہنچے گا اور ہندوستان آزاد نہ ہو سکے گا، (اور جب تک ہندوستان آزاد نہ ہوگا، اسلامی ممالک بھی استعمار کے پنجوں سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔) اشتراک عمل محدود چیز ہے، شرعاً منع نہیں ہے، ان کا علم دین، سیاسی اور تاریخی بصیرت ہندوستان میں اس اشتراک عمل کو درست قرار دے رہی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھے، جن کی بصیرت اور معلومات میں یورپ کی سیاست، تاریخ اور اس کے جدید نظریات بھی تھے، وہ سیاست میں ساری عمر عملی حصہ بھی لیتے رہے تھے۔ علمی اور روحانی دونوں مشائخ سے شاہ ولی اللہ سے مسلسل اور متواتر بلا انقطاع ایک فکری سلسلہ چلا آرہا تھا۔ اس دور میں جمعیت علماے ہند اور درس گاہ دیو بند دونوں ہی اس کے امین اور صحیح وارث تھے۔

علامہ اقبال مرحوم کا اکابر دیو بند سے انفرادی تعلق رہا تھا، لیکن تحریک ولی الٰہی اور اس طبقے سے گھلنے ملنے اور ساتھ رہنے کا اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔ ان کی اپنی زندگی کی الگ مصروفیات تھیں انھیں حضرت شیخ الہند اور مولانا انور شاہ وغیرہما سے عقیدت تھی مگر تاریخ علماے ہند اور ان کے سیاسی یا اقتصادی نظریات سے تعارف حاصل نہ تھا، اس لیے وہ یہ بھی ڈرتے تھے کہ علما شاید تاریخ سے واقف نہیں، کیوں کہ اسی دوران ایک دن انھوں نے کہا: ''مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ

سے ناواقف ہیں۔" (اقبال کے حضور: ص ۱٦۷)

مولانا مدنی کی دور بینی:

معلوم ہوتا ہے یہی خدشہ انھیں پریشان کیے ہوئے تھا اور ان کی بے چینی کا باعث تھا، حال آں کہ حقیقت اس کے برعکس تھی ان حضرات کی تاریخی بصیرت بہت گہری تھی، چہ جائے کہ تاریخ سے صرف واقفیت ہو۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کی ایک کتاب "کشف حقیقت" دیکھنے کا اتفاق ہوا انھوں نے اس میں تحریر فرمایا ہے کہ صوبہ آسام کے شمال میں پہاڑی علاقہ ہندوستان اور چین کے مابین متنازع چلا آرہا ہے یہاں امکان ہے کہ جھڑپیں ہوتی رہیں اور پوری طرح دفاع کی نوبت آئے، آسام کا پورا صوبہ بدقسمتی سے پاکستان میں نہیں آیا۔

ہندوستان اور چین کی لڑائی ہوئی۔ ان کے پہلے سے تعلقات آج تک کشیدہ چلے آرہے ہیں۔ یہ مولانا مدنی کی روحانی بصیرت وفراست تھی یا سیاسی دقت نظر، ان کی تحریر کے بعد بھی کسی کا دھیان ۱۸۵۷ء سے پہلے کی حالت کی طرف نہیں گیا۔ عام سیاسی اذہان کا یہ خیال تھا اس رسالہ کی تقریباً گیارہ چیزیں تو ویسے ہی پوری ہوئیں جیسے انھوں نے کہی ہیں، بلکہ سب ہی خدشات درست رہے ہیں، وہ دشواریاں ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کو واقعی پیش آئیں۔

اسی طرح ۴۸ء کا ایک رسالہ آنے والے انقلاب کی تصویر، مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کا ہے، اس میں خصوصیت سے اقتصادی اصلاحی پروگرام اور آیندہ پیش آنے والے متوقع حوادث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے حالات کو جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ ان رسائل میں قیمتی مضامین ہیں نامعقول بات کوئی نہیں، البتہ علمی اختلاف رائے الگ بات ہے۔ بات بڑھنے کی صرف یہ وجہ لگتی ہے کہ علامہ کا ان حضرات سے اختلاط نہ تھا پھر بات بھی غلط الفاظ میں پہنچی تھی۔

علامہ اقبال کی ایک گفتگو پر:

ایک دن ان سے کہا گیا کہ مولانا حسین احمد کے طرف دار کہتے ہیں کہ مولانا سے زیادہ '' بہ مصطفیٰ برساں خویش '' پر عمل کس کا ہوگا، انھوں نے یہ تو نہیں کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں، کہا ہے تو یہ کہ جو لوگ کسی وطن میں بسنے والے ہیں اپنے آپ کو ایک قوم ہی کہا کرتے ہیں، '' حضرت علامہ نے فرمایا '' تو یوں ہی سہی ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں، وہ ایک بیان شائع کر دیں اور صاف صاف فرمادیں کہ اسلام کی رو سے وطن بنانے قومیت نہیں، وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأت ایمانی کے اعتراف میں تین کے بجائے ۹ شعر کہہ دیں گے، '' اقبال کے حضور '' ص ۱۶۶۔ آسان لفظوں میں نکتۂ اختلاف تو یہی تھا کہ اگر مولانا کا یہ نظریہ ہے کہ قومیت اسلام پر مقدم ہے، اس طرح کہ پہلے ہم ہندی ہیں، پھر مسلمان، تو یہ بالکل غلط ہے اور اگر مولانا کا یہ نظریہ نہیں، ان کے نزدیک اسلام مقدم ہے، بعد میں قومیت ہے کہ پہلے ہم مسلمان ہیں بعد میں ہندی ہیں، تو یہ ٹھیک ہے۔ اس کا صحیح علاج تو یہ تھا کہ علامہ تنقید سے پہلے مولانا سے رجوع فرمالیتے، تو بات ہی صاف ہو جاتی یا ان کے گرد و پیش کے لوگ صحیح معلومات فراہم کر سکتے تو بھی بہتر ہوتا۔ ان کے حالات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی قوم اور ملت کے لفظوں پر غور نہیں کیا تھا، البتہ طالب علمی کی شان ان میں آخر تک رہی ہے۔

میثاقِ مدینہ کی جستجو:

چناں چہ اس بارے میں اپنے ایک نیازمند سید نذیر نیازی صاحب سے رجوع فرمایا، وہ لکھتے ہیں، پھر جیسے کوئی خیال آیا، اٹھ کر بیٹھ گئے اور تکیے سے ٹیک لگا کر مجھ سے سوال کیا '' قوم اور ملت کے امتیاز پر اصرار کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ '' میں نے عرض کیا یہی کہ اس امتیاز کی کوئی حقیقت ہوتی، تو قرآن پاک سے دو الگ الگ اجتماعی نظامات کی موجودی ثابت ہو جاتی ہے ایک قومی وجود ہوتا۔ '' دوسرا ملی '' ارشاد

ہوا۔ ''یہ بحث کا نہایت اچھا پہلو ہے، پھر فرمایا، تاریخی اعتبار سے کیا اس سلسلے میں تم کوئی مواد جمع کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا: بہت کافی! اجازت ہو تو اس سلسلے میں کچھ حوالے پیش کر دوں۔ فرمایا مثلاً میثاق مدینہ، یعنی اس معاہدے کا جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری پر مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ سے کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں محفوظ ہے، ارشاد ہوا اس میں خاص بات کیا ہے؟ میں نے کہا: یہی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جس ریاست کی بنیاد ڈالی، اس میں یہود کو شریک تو کر لیا، لیکن اس کے باوجود انھیں ایک الگ قوم ٹھہرایا، فرمایا: اس معاہدے کی پوری نقل حاصل کر لو۔'' (اقبال کے حضور: ص ۱۲-۲۱۱)

قوم اور امت کی بحث:

میثاق مدینہ کی پوری نقل حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دی فرمایا: ترجمہ بھی ہو جائے تو اچھا ہے، آدھ پون گھنٹے بعد حضرت علامہ اٹھ کر بیٹھ گئے، علی بخش نے چلم بھری، ترجمہ ہو چکا تھا میں نے کاغذات تپائی پر رکھ دیے، ارشاد ہوا: مولانا حسین احمد یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ میثاق مدینہ ان کی نظر سے نہیں گزرا، تعجب ہے انھوں نے اس پر غور نہیں کیا اور ایک غلط بات کہہ دی، پھر ذرا ستا کر بیان کے بارے میں گفتگو شروع کر دی، اور طرح طرح سے اظہار خیالات کرتے رہے یہی کہ اسلام بنائے قومیت ہے اور اس کا سرچشمہ ہے رسالت، لہٰذا اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے۔ میں نے عرض کیا اس سیاسی اجتماعی معاشرے کو قرآن مجید نے امت سے تعبیر کیا ہے۔

''اقبال کے حضور'' میں تحریر ہے:

انهم امة واحدة من دون الناس.

یعنی مسلمان دوسرے انسانوں سے الگ ایک امت ہیں لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہے، مترجم کو لغزش ہوئی ہے صحیح ترجمہ نہ ہونے کی بناء پر علامہ کا ذہن کیسے صاف ہو سکتا تھا؟ یہ معاہدہ اور اس کا ترجمہ مولانا مدنی کے رسالہ میں آیا ہے اسی معاہدے میں

یہ عبارت آئی ہے۔

وان الیھود بنی عوف وموالیھم و انفسھم امۃ من المومنین، للیھود دینھم وللمومنین دینھم

''اور بنی عوف کے یہودی اور ان کے اعوان و انصار مومنین ہی کی ایک امت شمار ہوں گے، یہود اپنے دین پر، مسلمان اپنے دین پر قایم رہیں گے۔''

حضرت علامہ نے فرمایا:

''مولانا عالم دین ہیں، اصطلاحاتِ دینی سے بے خبر نہیں ہو سکتے، وہ خوب سمجھتے ہیں، امت کے معنی کیا ہیں۔''

پھر فرمایا:

''عجیب بات ہے انھوں نے قوم اور ملت میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے ایک نئی بحث چھیڑ دی۔'' (اقبال کے حضور: ص ۲۱۴)

ایک خاص ضرورت:

ضرورت تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کو جمعیت کے اغراض و مقاصد اس کے نصب العین اور ماضی سے واقف کرا دیا جاتا، ماضی سے تاریخ اور رخ معین ہو جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا، ان کے گرد و پیش کے لوگ معلوم ہوتا ہے، خود بھی واقف نہ تھے تاکہ ان کے خدشات جاتے رہتے، اور پریشانی خاطر رفع ہو جاتی۔ دفتر جمعیت علما ہند سے اس کے اغراض و مقاصد پر مشتمل رسائل طبع ہوتے رہے ہیں مثلاً ''جمعیت علما ہند کی شرعی اہمیت'' ہے اس میں بیان فرماتے ہیں:

''اس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر ہندوستان بھر کے ممتاز علما ہوتے ہیں جن کا علم، تقویٰ، ایثار و صداقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیاے اسلام میں ممتاز شان رکھتا ہے۔

جمعیت علمائے ہند کے صدور:

ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی درج ہیں، جنھوں نے جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت فرمائی؛

۱۔ حضرت علامہ مولانا عبدالباری صاحب ؒفرنگی محل، صدر اجلاس اول، منعقدہ امرتسر ۱۹۱۹ء

۲۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب ؒ(اسیر مالٹا) صدر اجلاس دوئم منعقدہ دہلی ۱۹۲۰ء

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ؒ صدر اجلاس سوم لاہور، منعقدہ ۱۹۲۱ء و اجلاس دہم، کراچی ۱۹۳۱ء

۴۔ فخر العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ؒمہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس چہارم، گیا منعقدہ ۱۹۲۲ء

۵۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب ؒصدر اجلاس پنجم، کوکناڈا، ۱۹۲۳ء و اجلاس دوازدہم جون پور ۱۹۴۰ء و صدر اجلاس سیزدہم، لاہور ۴۲ء، اجلاس چہاردہم، سہارن پور ۱۹۴۵ء

۶۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب ؒنائب امیر شریعت صوبہ بہار صدر اجلاس خصوصی ششم، مرادآباد ۱۹۲۵ء

۷۔ حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ؒصدر اجلاس ہفتم، کلکتہ ۱۹۲۶ء

۸۔ رئیس المحدثین بقیۃ السلف استاذ العلماء حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہٗ، صدر اجلاس ہشتم، پشاور ۱۹۲۷ء

۹۔ حضرت علامہ مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیریؒ، صدر اجلاس نہم، امروہہ ۱۹۳۰ء

۱۰۔ حضرت علامہ الحاج مولانا عبدالحق صاحب مدنی شیخ التفسیر و مہتمم جامعہ

قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، صدر اجلاس یاز دہم، دہلی۔ ۱۹۳۹ء

اس کے بعد جمعیت کے اغراض و مقاصد اس طرح نقل کیے گئے ہیں ذیل میں چند اغراض و مقاصد درج کیے جاتے ہیں، جو ہر ہمدرد ملت کو جمعیت علمائے ہند کے مذہبی احترام پر مجبور کر دیتے ہیں۔

اغراض و مقاصد جمعیت علمائے ہند:

دفعہ ۳: اسلامی نقطۂ نظر سے ملتِ اسلامیہ کی حسبِ ذیل امور میں رہنمائی اور جدو جہد کرنا؛

الف۔ اسلام، مرکزِ اسلام (حجاز جزیرۃ العرب) اور شعائر اسلام کی حفاظت اور اسلامی قومیت کو نقصان پہنچانے والے اثرات کی مدافعت۔

ب۔ مسلمانوں کے مذہبی اور وطنی حقوق اور ضروریات کی تحصیل و حفاظت۔

ج۔ علما کو ایک مرکز پر جمع کرنا۔

د۔ ملت اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکم شرعیہ کا قیام۔

ہ۔ شرعی نصب العین کے موافق قوم اور ملک کی کامل آزادی۔

و۔ مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح اور اندرون ملک حسبِ استطاعت اسلامی تبلیغ و اشاعت۔

ز۔ ممالک اسلامیہ و دیگر ممالک کے مسلمانوں سے اسلامی اخوت و اتحاد کے روابط کا قیام و استحکام۔

ح۔ شرعی حدود کے مطابق غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ ہمدردی و اتفاق کے تعلقات کا قیام۔

(جمعیت علمائے ہند کی شرعی اہمیت: ص:۱۱۔۹، شائع کردہ وحید الدین قاسمی از دفتر مرکزیہ جمعیت علمائے ہند دہلی)

یہ اغراض و مقاصد تو بہت پہلے سے چلے آرہے ہیں، بعد میں جو دستور العمل ۲۷، ۲۸، ۲۹ر مئی ۳۹ء مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس، دہلی مطابق ۷/۸/۹ر ربیع الثانی

۱۳۵۰ھ کو بھی مرادآباد کے اجلاس میں جو دستور العمل تیار کیا گیا اس کے آغاز میں یہی لکھے گئے ہیں۔

دستور العمل کی ایک کاپی ہمارے پاس بھی ہے یہ ۱۳۶۴ھ کی طبع شدہ یعنی ۴۴ء کی، لیکن اس کے اغراض و مقاصد روز اول سے یہی چلے آرہے ہیں۔

یہ اغراض و مقاصد جمعیت کے پرانے دستور العمل میں اور خطبات صدارت میں بیان ہوتے چلے آئے ہیں اور اسی پر مدتوں پیشتر سے ان حضرات کے اسلاف کرام کا اور ان حضرات کا عمل چلا آرہا تھا، چند باتیں اور بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں کہ:

ایک قوی امکان:

الف۔ ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء علامہ اقبال کا تردیدی بیان شائع ہوا ہے اور ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کی وفات ہوگئی، اگر وہ حیات رہتے تو ضرور ان اکابر سے ملاقات ہوجاتی اور قرب بڑھ جاتا، وہ یقیناً ملاقات کے بعد ان کے افکار سے متاثر ہوتے سید سلیمان ندویؒ سے انھیں بہت تعلق تھا اور وہ ان حضرات میں سے تھے جو اجلاس جمعیت کی صدارت بھی کرچکے تھے اور ان کا بیان بھی حضرت مدنیؒ کی تائید میں الجمعیۃ میں آگیا تھا، اگر علامہ کی تشفی نہ ہوئی ہوتی تو وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ سے مکاتبت کرتے جن سے کہ وہ مانوس بھی تھے اور قرب بڑھ جاتا۔(۱)

ب۔ اس مسئلہ قومیت پر مولانا کی تحریر میں قرآن وحدیث سے باہر کی کوئی بات نہیں ہے، ان کی زندگی تبلیغ واشاعتِ دین اور اسلامی تشخص کا نمونہ تھی اور اس کے لیے وہ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

---

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی کا مذکورہ بیان ۱۲ر اپریل کو مدینہ بجنور میں چھپا تھا۔ اس وقت حضرت علامہ اقبال سخت بیمار تھے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ان کے تیماردار یہ بیان ان کے علم و مطالعہ میں لائے ہوں۔ البتہ یہ امکان ضرور تھا کہ لوگ سید صاحب کا بیان ان کے مطالعے میں آتا تو ان کی الجھن اور ذہنی کشمکش ضرور دور ہوجاتی اور انھی افکار پر ان کا ذہن یکسو ہوجاتا۔ (ا-س-ش)

جمعیت علما کی خدمات پر ایک نظر:

ج۔ پاکستان بننے کے بعد مشرقی پنجاب کے تباہ حال مسلمانوں کی اسلام پر ثابت قدمی کی کوشش ان ہی حضرات نے کی اور ان حالات میں کی جب مشرقی پنجاب میں داخل ہونا موت کے منہ میں جانا تھا وہاں انتہائی بے سہارا مسلمانوں سے ملے، حوصلہ افزائی کی، وہ ہندوؤں کے لباس میں رہنے لگے تھے، رفتہ رفتہ وہ ترک کرایا، ان کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا، ان کے لیے سہل نصاب تعلیم دین بنایا، شبینہ مکاتب حتی الامکان قایم کیے، مساجد و مزارات کو واگذار کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہاں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان رہ گئے تھے، خصوصاً جو چھوٹی قومیں کہلاتی تھیں، وہ جہاں نمایاں نہ تھیں وہیں رہ گئی تھیں، مثلاً دھوبی، بڑھئی وغیرہ جنرل سیکرٹری جمعیت علماے ہند مولانا حفظ الرحمٰن، صاحب خود ان اطراف میں آتے جاتے رہے، سب سے پہلے باقاعدہ کھل کر ۴۸، ۴۹ء میں پانی پت حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمہ اللہ کی ایک سالانہ تقریب سے ان حضرات نے کام شروع کیا اور پھر پنجاب کے دور دراز علاقوں میں آتے جاتے رہے۔ یہی حضرات تھے جو اس طرح اور تبلیغی جماعتوں کی شکل میں ان بچے کھچے مسلمانوں کی طرف بلاشبہ سردھڑ کی بازی لگا کر متوجہ ہوئے، ان کے ایمان اور تہذیب کی بقا ہر حال میں بہر قیمت ضروری جانی اور کامیاب رہے خود ان کی زندگیاں اسلامی وضع قطع بلکہ سنت نبوی کا نمونہ تھیں اور تفسیر و حدیث ان کا مشغلہ تھا نہ کہ اس متحدہ قومیت کی کہ جس کا بلاوجہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا۔

طلوع اسلام کی بدگمانی:

د۔ ''طلوع اسلام'' والے صاحب نے جس گمان میں مضمون لکھا تھا، ان حضرات کے عمل نے اس گمان کو فضول کی بدگمانی ثابت کر دکھایا۔ پاکستان آنے والے پاکستان چلے آئے، انھیں ان کارناموں کی خبر نہ ہوئی اس لیے شاید پڑھنے والے آج پھر متحدہ قومیت کے لفظ سے یہی خیال کرتے ہوں گے، اس کے وہی معنی

ہیں جن پر علامہ اقبال نے اعتراض کیا تھا، حال آں کہ علامہ نے تو ان کی تحریرات کے بعد اعتراض سے رجوع کر لیا تھا اور مطلب سمجھ گئے تھے۔ بعد میں پاکستان بن جانے پر جو لوگ یہاں آ گئے، انھیں ان کے کارناموں کا کیا علم؟ اس لیے اس مضمون کو آج بھی ناشر صاحبان اسی طرح صحیح سمجھ رہے ہوں گے، جیسے پہلے دن، جب وہ بدگمانیوں کے دور میں لکھا گیا تھا اور یہ عظیم الزام ہے، جس سے اخلاقاً بھی باز آنا ضروری ہے اور مذہباً بھی کہ سب کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں کی جواب دہی بھی سامنے رکھنی فرض ہے۔ ہم پھر اس بات کی یاد دہانی ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب کا نام ''متحدہ قومیت اور اسلام'' ہے جو اس زمانے میں اس مسئلے کے عنوان کی حیثیت کی بنا پر رکھا گیا تھا اور درحقیقت اس میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے معاملات کی ابحاث ہیں، جن میں معاہدے بھی آتے ہیں کیوں کہ غیر مسلم رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے، پڑوسی بھی اور ہم وطن بھی، اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے اور دنیوی معاشرت میں غیر مسلموں سے تعلق ناگزیر ہے۔

قطعۂ اقبال کے جواب:

ہ۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ کے ان تنقیدی اشعار کی اشاعت کے بعد ہر طرف سے جوابی اشعار کی بھرمار ہو گئی، ان دنوں انھیں کتابی شکل میں بھی شایع کیا گیا۔ ان میں معنویت بھی تھی اور جوابی سختی و تلخی بھی، یہ جوابات سیاسی اور غیر سیاسی معروف وغیر معروف علما و غیر علما سب ہی کی طرف سے لکھے گئے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی تائید فرمائی اگر اختلاف پھر بھی چلتا رہتا تو ان کی شخصیت ایسی تھی کہ علامہ اقبال اور حضرت مدنیؒ دونوں کے نزدیک وہ معتبر اور دونوں کے ممدوح تھے، وہ ضرور مداخلت فرماتے۔

علامہ اقبال سہیل کے اشعار معروف ہیں، ایک اور بزرگ حضرت مولانا شمس

الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی حضرت مدنیؒ کی تائید میں اشعار لکھے، جو اس وقت متعدد اخبارات میں چھپے تھے مولانا کا مختصراً تعارف یہ ہے کہ آپ کا تعلق بیعت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے ہے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے شیخ التفسیر اور جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث رہے ہیں۔ پھر ریاست ہائے متحدہ بلوچستان میں وزیر معارف شرعیہ رہے اور چند سال جامعۂ اسلامیہ بہاوں پور میں شیخ التفسیر رہے، نظر بھی وسیع و دقیق ہے، دیوبند میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ پر نظر ثانی کی اہم ذمہ داری بھی کچھ عرصہ کے لیے آپ کو تفویض کی گئی تھی، تحریر، تقریر، تدریس سب میں اعلا پایہ رکھتے ہیں۔ ادام اللہ برکاتہم

ان اشعار میں سے دو شعر یہ ہیں:

نظام قوم بدو گونہ می شود پیدا
اگر ہو زندانی کمال بولہبی ست

نظام ماتہ واحد باختلاف بلاد
قوام گیر ز جذب محمد عربی ست

نظام دوم کہ قائم میانِ صد ملل ست
نظامِ وحدتِ ملکی است ایں چہ بولہبی ست

مولانا ہی کے الفاظ میں ان کی تشریح یہ ہے کہ قومیت کی دو قسمیں ہیں اول یہ کہ افراد کا دین ایک ہو، اگر چہ اوطان مختلف ہوں، جیسے کہ اسلامی قومیت کے تحت تمام مسلمان ایک قوم ہیں، اگر چہ وطن مختلف ہیں۔ دوم یہ کہ وطن اور وطنی مفاد ایک ہو۔ اگر چہ دین مختلف ہوں جیسے مکہ معظمہ میں، قریش کی قوم ایک تھی، اگر چہ دین مختلف تھا اور مدینہ منورہ میں مہاجرین، انصار اور یہود کا وطن ایک تھا، اگر چہ ان کا دین ایک نہ تھا، اسی بنا پر حضور علیہ السلام نے یہود کے ساتھ وطنی مدافعت کی غرض سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ جب مدینہ پر کوئی حملہ آور ہو تو سب مل کر مقابلہ کریں۔ حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ نے

اگر دہلی والی تقریر میں قسم دوم کا ذکر کیا تو اس سے قسم اول کا انکار لازم نہیں آتا، اور اقبال مرحوم نے اگر اپنے اشعار میں قسم اول کا ذکر کیا تو اس سے قسم دوئم کی تردید لازم نہیں آتی، اس بنا پر انکشاف حقیقت کے بعد اقبال مرحوم نے رجوع کیا۔

علامہ اقبال کا خدشہ یا حقیقت:

و۔ پوری جمعیت علمائے ہند کا موقف بھی یہی تھا جیسے کہ علامہ کی ۸؍ مارچ کی مجلس کی روداد میں نذیر نیازی نے لکھا ہے:

> ''حضرت علامہ نے جیسے رات کی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا'' جمعیۃ العلماء کیا کر رہی ہے؟ جمعیۃ العلماء کی رائے کہاں تک مولانا حسین احمدؒ کے حق میں ہے؟ میں نے عرض کیا بظاہر تو مولانا حسین احمد کو اس کی پوری تائید حاصل ہے لیکن در پردہ اس کی خواہش شاید یہی ہے کہ قوم اور وطن کی بحث آگے نہ بڑھے، مولانا کے طرف دار بات کو نباہ رہے ہیں۔''

(اقبال کے حضور: ص ۲۹۰)

اس سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ سب علما کی بات ایک تھی۔ جمعیت کے ہوں یا دارالعلوم دیوبند کے! کیوں کہ حضرت مدنیؒ کا فرمانا وہ تھا جس کی تشریح گزری وہ نہ تھا جس کا علامہ کو خدشہ تھا، جو شرعاً ممنوع ہے، نیز حقیقت یہ تھی کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے خود بھی لوگوں کو آگے بڑھنے سے منع فرمایا ہے، ایک صاحب نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کا الجمعیۃ میں شائع شدہ مضمون اور دیگر علما کے مضامین کو جو مولانا کی تائید میں تھے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا چاہا تھا۔ مگر آپ نے بالکل منع فرما دیا مولانا قاضی زاہد الحسینی مدظلہم اس کے شاہد ہیں۔

مولانا مدنی اور ان کا خاندان:

ز۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کے اجدادِ کرام

کی فیض آباد کے اس علاقہ میں آمد ۸۰۲ھ تا ۸۰۴ھ ہوئی ہے، آپ کے جد امجد شاہ نور الحق صاحب قدس سرہ کا دسویں صدی ہجری میں رجبہر قوم کے ہندو راجاؤں سے مقابلہ رہا تھا، ضلع فیض آباد ہی میں ''اجودھیا'' ہے جو ہندوؤں کی بڑی تیرتھ گاہ ہے، اس جگہ ایک قبر ہے، جسے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر مبارک کہا جاتا ہے، اور وہاں کے بارے میں ہندوؤں کی اپنی مذہبی روایات الگ ہیں۔ آپ نے انھیں دعوت اسلام دی۔ نہ ماننے پر مقابلہ ہوا، آپ نے ان کو بذریعہ کرامت شکست دی اور اس مقام کا نام الہ داد پور رکھ دیا، ملخصاً، نقش حیات مصنفہ حضرت مدنیؒ

آپ کے خاندان کی جائیداد کافی تھی، کم ہوتے ہوتے ۱۸۵۷ء میں ۱۳ گاؤں رہ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آ رہی تھی، سب پر قبضہ کرلیا اور الہ داد پور لوٹ لیا۔ مکتوبات کی جلد اول میں پہلے ہی مکتوب میں خاندانی حالات میں یہ مزید تحریر ہے کہ ہمارے قدیمی کاغذات وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

بے شمار محل، خزانے اور غلہ اور سامان اس نے لوٹے۔ ان کو وہ ایک مہینہ تک گاڑیوں میں منتقل کرتا رہا، اس کے حصار کے زمانہ میں عورتیں اور بچے بھیس بدل کر رشتہ داروں کے یہاں شہر ٹانڈہ کے بعض محلوں میں جو کہ مامون تھے پناہ گزین ہو گئے تھے اور دوسرے لوگ بھی نوکروں اور رعایا کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے، آگے تحریر فرماتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ والد صاحب مرحوم کا حصہ ایک آنہ آٹھ پائی تھا، جس کو فروخت کر کے والد مرحوم نے حجاز کا قصد کیا تھا۔'' (ملخصاً از مکتوبات شیخ الاسلام: جلد: ۱، ص: ۷)

مولانا مدنیؒ کے یہ خاندانی حالات پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صدیوں سے ہندو قوم اور اس کی طبیعت کے نشیب و فراز سے واقف تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس متحدہ قومیت کی بات بھی کریں جو کفر ہے۔

ایک جوابی رسالہ:

مدیر نوائے وقت نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ جامعۂ مدنیہ لاہور کی طرف سے طبع کر کے ملک میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مفت تقسیم کیا جا رہا ہے۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے نیز وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جوابی مقالہ مکتبۂ حبیبیہ بازار داتا گنج بخش لاہور نے دوبارہ شایع کیا ہے جو ایک روپیہ کی قیمت پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گویا آپ نے ان کے اشتہار کا کام بھی انجام دیا۔

رسالہ میں تحریر ہے کہ علامہ اقبال نے جب یہ بیان پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے الخ، یہ سب قصہ یا تو اس وقت کا ہے جب علامہ نے مولانا مدنی کی پہلی تقریر پڑھی ہوگی جو تحریف شدہ تھی۔ ورنہ یہ قصہ من گھڑت ہے، کیوں کہ علامہ کی خط و کتابت شایع ہوتی رہی ہے، اور علامہ کے قریب رہنے والے معتمد حضرات اور شارحین کلام اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور جناب سید نذیر نیازی سب ہی اس سے واقف ہیں۔ پروفیسر صاحب کا مضمون تو ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا پھر سب سے پہلے میثاق لاہور میں پھر خدام الدین وغیرہ میں چھپ چکا ہے، سید نذیر نیازی صاحب بتلاتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ ''میری طبیعت ناساز ہے ورنہ میں ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ دیتا۔ معاملہ کی کچھ تفصیل ''اقبال کے ممدوح علما'' نامی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

بریلوی مکتبۂ فکر، حزب الاحناف لاہور

اور علامہ اقبال

تجانب اہل السنۃ:

مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ بازار دربار کے اس مکتبہ کو اس کتابچہ کے اشاعت کی دوبارہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی کیوں کہ ان کے بزرگوں نے تو خود علامہ اقبال پر خون کے آنسو بہائے ہیں، بلکہ تاریخی طور پر پہلے ان لوگوں کے حالات جاننے کے لیے وضاحت ضروری ہے، ایک کتاب مقدس "تجانب اہل السنۃ" میں ص ۳۳۶ پر "اللہ عزوجل کی بارگاہِ بے نیاز میں ایسی بدگوئی و دشنام طرازی یا ترجمان ابلیسیت۔"
پھر اسی کتاب میں

"زبان پر ابلیس بول رہا ہے......الخ"

پھر جناب ڈاکٹر اقبال صاحب جن کے نام پر اقبال ڈے جاری کیے جاتے ہیں فرماتے ہیں کہ

"مسلمانان اہل سنت خود ہی انصاف کریں۔"

یہ کتابِ مستطاب علامہ کی وفات کے تقریباً ۴ سال بعد لکھی گئی۔

تجانب اہل السنۃ جس پر بہت سے ضیغم اور شیر بیشہ حضرات کے دستخط ہیں اور یہ کتاب پوری جماعت ہند کی ترجمان مانی گئی ہے، بریلی الیکٹرک پریس بریلی میں طبع ہوئی، اس میں آخری دستخطوں کے ساتھ ۲۴ رجمادی الثانی ۱۳۶۰ھ (مطابق ۱۹ر جولائی ۱۹۴۱ء بروز ہفتہ) تحریر ہے، مولانا مدنی کے آخری گرامی نامہ پر ۲۵رذی الحجہ ۱۳۵۶ھ (۲۶ر فروری ۱۹۳۸ء) تحریر ہے۔

اس حساب سے ظاہر ہے کہ یہ علامہ مرحوم ومغفور کی وفات سے ساڑھے تین سال بعد لکھی گئی ہے اور طباعت ہوتے ہوتے چار سال ہو گئے ہوں گے درباری حضرات کے نزدیک تو معاذ اللہ جس طرح کے مولانا مدنی ہیں، ان سے بہت بدتر علامہ اقبال ہیں، تعجب ہے انھیں علامہ سے کس تاریخ سے ہمدردی ہوئی اور ''تجانب اہل السنۃ'' کب سے ساقط الاعتبار ہوگئی، کیوں کہ اسے صحیح مانا جائے تو علامہ اقبال کو ''ترجمان اہلبیت'' ماننا پڑے گا، اور علامہ کو مانا جائے، تو اس کتاب کو غلط قرار دینا ہوگا۔

اسی عظیم المرتبت خزینۂ تکفیر میں قاید اعظم کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

''بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے اور جو شخص اس کے ان کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر مرتد شر اللئام اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام۔'' (تجانب اہل السنۃ: صفحہ ۱۲۲، سطر ۵ تا ۸)

اگر آپ ان اہل اہواء سے یہ سوال کریں کہ وہ مسٹر جناح اور غالی (پکے) مسلم لیگیوں کو کافر کہتے ہیں یا نہیں؟ وہ یقیناً جواب میں جان چرائیں گے، لہٰذا اس طرح خود بھی کافر کہنے میں توقف کرنے کی بنا پر وہ کافر مرتد اور شر اللئام (بدترین کمینہ) ٹھہریں گے اور امید ہے کہ مریں گے بھی بے توبہ ہی، اس لیے مستحق لعنت بھی بنیں گے (یعنی اپنی کتاب کی رو سے) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس ایک ہی سوال سے یہ لوگ ہوا ہو جائیں گے اور ان کی سب باتیں پادر ہوا ثابت ہوں گی۔

اقبال و مدنی کی ہم فکری:

ح۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے اجلاس جون پور کے خطبۂ صدارت میں بہت زیادہ وضاحت فرمادی تھی۔ کہ یورپین لوگ ''قومیت متحدہ'' کے معنی جو مراد لیتے ہوں

اور جو کانگریسی افراد انفرادی طور پر کانگریس کے فنڈامنٹل کے مفہوم کے خلاف معانی بیان کرتے ہوں، ان سے یقیناً جمعیۃ العلماء بیزار ہے اور تبریٰ کرنے والی ہے۔ دوسرے معانی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور ناجائز ہیں۔ اس معنی کی بنا پر کانگریس نے فنڈامینٹل میں ہر مذہب، ہر تہذیب، ہر زبان، ہر رسم ورواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے۔ (بحوالہ پاکستان کیا ہے؟ حصہ دوم، ص: ۴۰، مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ)

یہی بات علامہ اقبال مرحوم بھی کہتے تھے۔ جیسے کہ ''اقبال کے حضور'' میں صفحہ ۲۱۴ پر ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا:

''مولانا حسین احمد کا فرض ہے کہ اسی اصول کی بنا پر جو میثاقِ مدینہ میں قایم کیا گیا کانگریس سے مفاہمت کا مطالبہ کریں بجائے یہ کہنے کے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔''

''اقبال کے حضور'' میں صفحہ ۲۲۴ پر علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام نے جو شرائط قایم کی ہیں، ان پر غیر مسلم اقوام سے تعاون کیا جائے گا۔

اس اعتبار سے مولانا کے اور اقبال کے نظریے میں صرف آپس میں متعارف نہ ہونے کا حجاب ہی نظر آتا ہے، ورنہ کوئی فرق نہیں، دونوں کا نظریہ ایک ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ جنرل سیکریٹری جمعیت علمائے ہند نے بھی ایک مضمون میں اس مذموم نظریہ کی نفی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''میں سیاسی مسلک میں اگرچہ حضرت مصنف رسالہ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کا ہم نوا ہوں، تاہم اس بحث کو ''متحدہ قومیت'' کے نام سے زیر بحث لانے کا شروع سے اس لیے مؤید نہیں ہوں کہ اس مرکب لفظ کی آڑ میں مخالف خیال حضرات بآسانی اس رائے کے مؤیدین کے خلاف عام مسلمانوں کو دھوکا دیتے اور زیادہ سے زیادہ مشتعل کر دیتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نظریے کے حامی مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹا کر اور ہندوستان میں یورپین نظریے کے مطابق ایک مستقل قوم بنا کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں

میں ضم کر دینا اور ملّی امتیازات کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ حال آں کہ بناہ بخدا اس تصور کا شائبہ بھی ایک لمحے کے لیے کسی مسلمان کے دل میں نہیں گزر سکتا...... تا آخر۔" (متحدہ قومیت اور اسلام از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، ص ۷، ناشر ناظم بستان ادب، دیوبند۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی)

اس تمہید کے بعد کچھ اور ضرور باتیں ملاحظہ ہوں۔ عبدالمجید سالک اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں لکھتے ہیں:

استفتاء بابت علامہ اقبال:

"یہ وہ زمانہ تھا جب ترک موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا جوش وخروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ وتنظیم کے ادارات منظم کر رہے تھے، پھر سلطان ابن سعود کی تحریکِ تطہیر حجاز کے غلغلے نے ہندوستان [کے مسلمان] کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں میں سخت کش مکش ہو رہی تھی، دونوں طرف کے علما نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، علامہ اقبال سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے اور بدعتی علما ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے، اتنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی اس نے ایک استفتاء مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لیے بے حد مشہور تھے، چناں چہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے، اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام "پیرزادہ محمد صدیق سہارن پوری" تجویز کیا اور یہ استفتاء لکھا:

"کیا فرماتے ہیں علما دین اور حامیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے، اور اس سے مرادیں طلب کرے آخرت پر یقین نہ رکھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزاء کرے، علمائے کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے اور انھیں بُرے خطابات

سے یاد کرے، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، امام اور ''چراغ ہدایت'' کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو، کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا وتوجروا! اشعار حسب ذیل ہیں:

آفتاب

(۱)
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو!
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگان نور کا ہے تاج دار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری
(ترجمہ گائتری منتر)

(۲)
کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

(۳)
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

(۴)
غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

''رام'' کی تعریف میں فرماتے ہیں:

(۵) اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند!
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا
(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارن پوری)

فتویٰ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اسم ''پروردگار'' اور ''یزدان'' عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں، اندریں صورت ''یزدان'' اور ''پروردگار'' آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہینِ موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگان دین فسق، لہٰذا جب فکران کفریات سے قایل اشعار مذکور توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے۔

ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خاں المرحوم''(۱)

اس فتویٰ پر ملک بھر میں شور مچ گیا، مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن وملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''زمیندار'' میں اس جاہلانہ فتویٰ کی چتھاڑ کر دی، خود ''زمیندار'' نے فتویٰ پر تبصرہ کیا، ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چودھری محمد حسین ایم اے) نے ایک مدلل مضمون میں اس فتویٰ کا جواب دیا، یعنی اشعار منقولہ

کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ ان سے ہر گز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا مولوی دیدار علی کی اس حرکت نے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا، کیوں کہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، دردمندِ ملت، حامیِ دینِ اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علما کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟

(ذکرِ اقبال: ص ۱۳۰۔۱۲۷، شائع کردہ: بزم اقبال۔ لاہور)

مسلم لیگ کے خلاف فتاویٰ:

اکابر بریلویہ کی ایک اور کتاب ہے ''الجوابات السنیہ علیٰ زہاء السوالات اللیگیہ'' اس میں صفحہ ۷ سطر ۱۲ پر ایک سوال ہے۔

سوال نہم: کیا بایں امید کہ عوام کی شرکت سے کانگریس کو ضرر پہنچے گا، عوام مسلمین کو شرکت لیگ کی ممانعت سے تغافل علما کے لیے جائز ہے؟

فتویٰ حضرت تاج العلماء دامت برکاتہم القدسیہ:

> ''یہ امید باطل ہے اور صحیح بھی ہو تو خود لیگ میں شرکت عوام کی سب سے زیادہ گرانمایہ متاع دین و ایمان کے لیے کانگریس سے زیادہ قوی اور سریع الاثر سم قاتل ہے جس سے علمائے ربانی کو تغافل اب ہر گز جائز نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم!''

اس فتویٰ میں بریلوی حضرات نے مسلم لیگ کو کانگریس سے زیادہ زہریلی قرار دیا ہے، اس رسالہ کے آخر میں فتویٰ مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند، لاہور ہے، جس پر دستخط میں ''فقیر در ماندہ از نفس شریر ابوالبرکات سید احمد غفرلہٗ ناظم دارالعلوم مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند'' اور دو مہریں ثبت ہیں، ایک دارالعلوم کی اور ایک دارالافتاء کی تائیدی ہے۔ فاضل حزب الاحناف محمد طیب صدیقی کی جو تجانب

اہل السنۃ کے مصنف ہیں یہ تحریر صفحہ ۲۹ سے شروع ہوئی ہے صفحہ ۳۲ پر آپ تحریر فرماتے ہیں:

"تو لیگ جو حکومت جمہوریہ ان کفریات ملعونہ کی تبلیغ واشاعت کو ترقی دے گی تبلیغ کفر و شرک کی حفاظت کرے گی وہ اسلامی حکومت ہوگی یا کفری سلطنت والعیاذ باللہ تعالیٰ۔"

اگر آپ اس سے زیادہ مسلم لیگ کی خباثتیں دیکھنا چاہیں تو جماعت مبارکہ اہل سنت مارہرہ ضلع ایٹہ سے "مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری" اور "احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ" منگوا کر ملاحظہ فرمائیں۔

اسی صفحہ کی سطر ۹ پر نمبر ۲ میں فرماتے ہیں:

"لیگ کی حمایت کرنا اور اس میں چندے دینا اس کا ممبر بننا اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا، منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا اور دین اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔"

پھر سطر گیارہ میں نمبر ۳ ملاحظہ ہو:

"لیگی لیڈروں کے افعال واقوال سے ان کی گمراہی مہر نیم روز سے زاید روشن ہے مرتد تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں میں شیخ الاسلام اور حکیم الامت کہا جاتا ہے، اشرف علی زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں، مسٹر محمد علی......الخ"

پھر سطر اکیس نمبر ۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اس شخص پر واجب ہے فوراً توبہ کرکے سچا پکا مسلمان بن جائے اگر رافضی کی تعریف حلال اور جناح کو اس کا اہل سمجھ کر کرتا ہے تو وہ مرتد ہو گیا، اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی، مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس سے کلی مقاطعہ کریں یہاں تک کہ وہ توبہ کرے۔"

(الجوابات السنیہ ... مطبع سلطانی واقعہ پیرولین نمبر ۱۷، بمبئی نمبر ۹)

مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری:

''مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری'' میں صفحہ ۴ سطر ۶ پر مسٹر جناح کی برائیاں ذکر کرنے کے بعد تحریر ہے:

''کیا کوئی سچا ایمان دار مسلمان کسی کتے اور وہ بھی دوزخیوں کے کتے کو اپنا قاید اعظم سب سے بڑا پیشوا اور سردار بنانا پسند کرے گا۔ حاشا وکلا ہرگز نہیں۔''

اسی صفحہ ۴ کے نصف سے صفحہ ۷ تک مسلم لیگ کی بڑی خرابی یہ ذکر کی گئی ہے کہ اس میں دیو بندی اور تھانوی علما ہیں۔ تحریر کی زبان وہی سوقیانہ اور شدید تکفیری ہے جو بریلوی عالم کے مستند ہونے کی دلیل ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ سب ہی کو لگے ہاتھوں لیا ہے۔

(دیکھیے ''مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری'': شایع کردہ دفتر اہل سنت خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ، ضلع ایٹہ)

تجانب اہل السنۃ:

ان رسائل میں سب سے زیادہ پکی پلائی ہٹی کٹی تنومند جلیل القدر کتاب ان ہی مذکور فاضل حزب الاحناف موید الجوابات السنیہ محمد طیب کی تصنیف ''تجانب اہل السنۃ'' ہے جو ۴۷۶ صفحات پر پھیلی پڑی ہے اس میں زبان فیض ترجمان برائے اصلاح وارشاد کا نمونہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۸ پر سطر ۷ سے تحریر ہے:

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمھارے دھرم میں تمھاری جورو اور اماں دونوں، ایک تمھارا باپ اور بیٹا دونوں، ایک گوبر اور حلوا دونوں، ایک فرنی اور پاخانہ دونوں، ایک تمھارا منہ اور پاخانہ پھرنے کی جگہ دونوں، ایک حلوے کے بدلے پاخانہ کھاؤ، شربت کے بدلے پیشاب نوش فرماؤ۔''

پھر کھلی گالیاں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ صفحہ اور اس سے اگلا نصف صفحہ فوٹو ہی کر کے چھاپا جا سکتا ہے نقل نہیں کیا جا سکتا۔

ان کتاب کے مویدین مارہرہ ضلع ایٹہ اور پیلی بھیت، پٹیالہ کے علما ہیں،

کاٹھیاواڑ کے لوگوں کی خواہش پر بریلی سے چھپی ہے۔ اس کتاب میں پورا بریلوی دھرم ہے۔ کتاب کیا ہے، اعلیٰ حضرت کا نقش قدم ہے، صفحہ ۴۵۰ پر لوگوں کے ایمان ناپنے کا پیمانہ بھی دیا ہے، وہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کی وصیت کے یہ جملے ہیں:

"اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اس پر مضبوطی سے قایم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔" (تجانب اہل السنۃ: صفحہ ۴۵۰، سطر ۲ و ۳)

اس سے ان لوگوں کے نام نہاد "حنفی" اور "اہل سنت" ہونے کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نہ یہ لوگ حنفی ہیں نہ اہل سنت بلکہ احمد رضا خاں کے پیروکار ہیں، ورنہ حنفی مسلک کے طے شدہ مسائل میں جھگڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا خود اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بھی برائے نام حنفی تھے، دراصل وہ خود اپنے مسائل ایجاد کر لیتے تھے۔ وہ درحقیقت غیر مقلد تھے، ورنہ اپنے اس دین و مذہب کے ذکر کی کیا ضرورت تھی، جو ان کی کتابوں سے ثابت ہو؟ قابل غور ایک عجیب بات یہ ہے کہ دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کے مدارس میں شروع سے آج تک ابجد سے لے کر آخری سال تک ہر طالب علم دیوبندی اور بریلوی ہر مدرسہ میں عقاید کی کتابیں ہوں یا فقہ اور اصولِ فقہ کی، حدیث و اصولِ حدیث کی ہوں یا تفسیر و اصولِ تفسیر کی، صرف و نحو کی ہوں یا بلاغت، منطق، فلسفہ، ہیئت وغیرہ کی، سب کی سب کتابیں تو بالکل ایک ہیں، فتاویٰ میں قاضی خاں، البحر الرائق، شامی، عالم گیری وغیرہ بھی سب کی مابہ الاتفاق ہیں اور جھگڑا پھر بھی ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ دراصل بقول نورانی صاحب مذکورہ بالا وصیت کا میٹر ہے۔ بریلی کی درس گاہ تو بہت چھوٹی سی ہے، لیکن اس کی شہرت ان ہی ظالمانہ افکار کی بنا پر ہے۔ نورانی صاحب کا ارشاد "صحافت" کے شمارہ ۱۸؍ بابت فروری ۷۸ء میں صفحہ ۲۹ کالم ۳ پر طبع ہوا ہے:

"اللہ کا شکر ہے وہ تھرمامیٹر بیرومیٹر ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا اس پیمانے سے ہم ناپ لیتے ہیں اور الحمد للہ اس دور میں بھی اپنے ایمان کی سلامتی اور تحفظ کا انتظام کر لیتے ہیں۔" (بحوالہ ترجمان اہل سنت: دسمبر ۷۷ء)

یہ لوگ یہی تلقین کرتے ہیں کہ دیوبندیوں کے پاس نہ جانا، کیوں کہ وہاں جانے والا پھر حنفی ہو جاتا ہے، رضا خانی نہیں رہتا، خدا کا شکر ہے کہ ایسے سرپھروں کی تعداد بہت کم ہے شاید ایک لاکھ میں ایک ہوتا ہو، لیکن مجسم شرارت ہوتا ہے، لوگوں کو گمراہ کر کے لطف اندوز ہوتا ہے، کافر بنا کر خوش ہوتا ہے اور لڑا کر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ یہ بھی انگریز کے خود کاشتہ پودے کا ثمر تلخ ہوتا ہے۔ اصولِ فتویٰ تو وہ ہیں، جن پر اکابر دیوبند قایم چلے آرہے ہیں کہ مسلمان کو جس طرح بھی ہو سکے کافر نہ قرار دیا جائے، لیکن یہ دشمنانِ امت محمدیہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی خامی نظر آئے تو اس مسلمان کو جو مقبول ہو کافر کہا جائے یہ امت محمدیہ کا قصائی ہے، اسے امت پر رحم نہیں آتا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لیتا ہے اور کل بروزِ قیامت ان سے ملنے پر ایمان نہیں رکھتا، ورنہ کچھ تو شرم ہوتی کہ وہاں کیا جواب دے گا؟

”الدلائل القاہرہ“ اور ”اجمل انوارِ رضا“:

مزید معلومات مختصر انداز میں ”الدلائل القاہرہ“ کے مقدمہ میں دیکھیں، یہ سارا رسالہ مع مقدمہ اڑتالیس صفحات کا ہے۔

اگر ایسے لوگ زیادہ ہوتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا اور مسلم لیگ کو کوئی ووٹ نہ دیتا۔ کیوں کہ ان لوگوں کے فتویٰ دسمبر ۱۹۴۵ء تک ایسے شایع ہوتے رہے ہیں۔ ”اجمل انوار رضا“ یہ کتاب بھی دسمبر ۱۹۴۵ء میں انتظامی پریس، کان پور سے شایع ہوئی۔ (مقدمہ الدلائل القاہرہ: صفحہ ۷) یہ کتاب اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب کے بڑے خلیفہ کی ہے۔

یہ لوگ عبدالماجد دریا بادی کو ”مرتد بلکہ اخبث الکفار وانجس المرتدین“ لکھتے ہیں۔ (تجانب: صفحہ ۱۳۵) اس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو آنجہانی لکھا گیا ہے۔ کیوں کہ معاذ اللہ وہ بھی مسلمان نہ تھے۔

مولانا مدنی اور پاکستان:

حضرت مدنی رحمہ اللہ نے تو پاکستان بن جانے کے بعد اسے مسجد سے تشبیہ دی انھوں نے فرمایا:

''مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔'' (شیخ الاسلام نمبر الجمعیۃ، صفحہ ۲۱ کالم نمبر ۱، خصوصی شمارہ جلد نمبر ۴۳ و ''واقعات''، صفحہ ۱۷۶ مطبوعہ مکتبۂ دینیہ، دیوبند)۔ ان کے ماننے والے اسے اسی طرح مقدس سرزمین مانتے ہیں، لیکن ''درباری'' حضرات کے اکابر نے قائد اعظم کی مخالفت سے کب رجوع کیا اور کب انھیں اور ڈاکٹر اقبال کو مسلمان کہا اس کا ثبوت آپ کے بعد تیار کرنا شروع کیا جا سکتا ہے۔ اب تک تو کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے، البتہ تکفیر کے شدید ترین فتوے جو متعدد رسائل میں لکھے جاتے رہے ہیں وہ دستاویزی ثبوت کے لیے موجود ہیں اور لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ء تک ''اجمل'' جیسے رسائل چھپتے رہے ہیں۔

حضرت رازی کا مضمون اور مقصدِ اشاعت

بریلوی حضرات نے اس وقت اپنی تاریخ سازی کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس کے یے عجیب وغریب حکایات گھڑی جارہی ہیں اور وہ دوسروں پر کیچڑ اچھالے بغیر نہیں بن سکتی، اس رسالے کی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے اور صحیح حقیقت کا خاکہ آپ کے سامنے آگیا ہے، آمدم برسر مطلب غرض علامہ اقبال اور مولانا مدنی" کی یہ بحث ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء کو ختم ہوگئی تھی اور بالیقین خوبی کے ساتھ ختم ہوئی تھی، اس قصے کو ہر باخبر سوانح نگار اسی طرح بیان کرے گا جیسے ہم نے لکھا ہے۔

عبدالمجید صاحب سالک لکھتے ہیں:

"۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس کی تفصیل جو یوپی کے بعض اخباروں میں شایع ہوئی اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ چوں کہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے، اس لیے انھیں مولانا حسین احمد کے فقرے سے بے حد صدمہ ہوا اور انھوں نے وہ تین اشعار لکھ دیے جو زبان زدعام ہیں، لیکن اس کے بعد جب مولانا حسین احمد نے، ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کردیا تو علامہ نے بھی اس ضرر کی تلافی کردی تھی، جو ان کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔"

(ذکر اقبال: ص ۲۱۷، شایع کردہ بزم اقبال۔ لاہور)

اس سے کافی زیادہ تفصیل "حیات اقبال" میں ہے مصنفہ ایم ایس ناز، مطبوعہ شیخ

غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور (بار اول) ١٩٧٧ء، صفحہ ٢٨۔١٢٢

علامہ رازی کا مضمون۔۔۔ تبصرے کی ایک نظر:

مگر رازی صاحب (صاحبِ مضمون) کی خیانتیں ملاحظہ ہوں، انھوں نے اسے اپنے منشا کی طرف گھمانے کے لیے صفحہ ۵ پر ''متحدہ قومیت کا مفہوم'' کا عنوان قایم کر کے از سرِ نو لکھنا شروع کیا ہے، کہ ''متحدہ قومیت دور حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے'' اس بحث میں مختلف زہریلے عنوانات ''اسلام دشمنی کی انتہا''، ''جداگانہ اسلامی تنظیم سے عداوت'' قایم کیے ہیں حال آں کہ خود ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم کے الفاظ میں اور مولانا کی شایع شدہ تحریرات میں یہ بات بصراحت آ کر صاف ہو چکی تھی، مگر مقالہ نگار اس سے بے خبر رہ کر اپنی بات پھر وہیں سے شروع کر رہے ہیں تاکہ اعتراض تشکیل دیا جا سکے۔

جواہر لال نہرو کی ١٩٢٦ء کی تحریر، گاندھی کی تحریر، ڈاکٹر اشرف کمیونسٹ، ڈاکٹر سید محمود، کے ایم منشی، ڈاکٹر بی پتابی سیتا رامیا، مسٹر بوس، ٹربیون ایک نامعلوم مسلم قومیت پرست کی تقریروں، بیانات یا تحریرات کے حوالے، زمزم، نیشنل ہیرالڈ، پنڈت نہرو کی کتاب ''میری کہانی''، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی تحریرات، حضرت مولانا کے بیان کا ایک تراشہ بحوالہ زمزم، پھر پنڈت نہرو کی ''میری کہانی'' کے اقتباسات لا کر حضرت مدنی'' کو ان کا بالکل ہم خیال ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے اور صفحہ ١۵ پر بعنوان ''خلاصۂ بحث'' ان ہندوؤں کے بیانات کی روشنی میں متحدہ قومیت کے اجزا ترکیبی ذکر کیے ہیں اور اتہامات کا انبار لگا دیا ہے۔

وہ عنوان ''خلاصۂ بحث'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''تفصیلات بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں، چند الفاظ میں یوں سمجھیے کہ متحدہ قومیت میں:
>
> ١۔ مختلف قوموں کی تہذیب کو مٹا کر اسے ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا

جائے گا۔

۲۔ مختلف جماعتوں کے جداگانہ مذاہب کی تحلیل سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہوگا، اس وقت تک مذہب کو ایک پرائیوٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا بلکہ ایک مشترکہ نام بنا بر وطنیت اختیار کیا جائے گا۔

۴۔ مختلف جماعتوں کی زبان بھی جداگانہ نہیں ہوگی، بلکہ اکثریت کی زبان متحدہ زبان قرار پائے گی۔

۵۔ متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مرتب ہوگا جو تمام اقوام کے امتزاج سے قایم ہوگا اور جس کی رو سے اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔" (صفحہ ۱۵)

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

"متحدہ قومیت میں مسلمانوں کو اپنا الگ تشخص قایم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنا بر وطنیت اس طرح آپس میں ملایا جائے کہ ان کی جداگانہ تہذیب، تمدن، نام، زبان، مذہب باقی نہ رہے۔ بلکہ ان کے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب، تمدن، نام، زبان، اور مذہب کا وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب مل کر ایسے دستور العمل کے ماتحت زندگی بسر کریں، جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے۔"

صاحبِ مضمون کی اتہام نگاری:

رازی صاحب نے یہ اتہام نگاری صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۵ تک ذہن کو مولانا کی مخالفت میں پوری شدت سے ابھارنے کے لیے کی ہے، تاکہ حضرت مولانا پر موثر

انداز میں بہتان طرازی کی جا سکے، حال آں کہ ان نظریات کے کفریہ ہونے میں خود حضرت مدنیؒ ہی کو کب کلام تھا۔

اس کے بعد اس متحدہ قومیت کے گھناؤنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیب ''میری کہانی'' سے لے کر لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا کی طرف ان کفریات کی نسبت فقط مقالہ نگار کی اپنی فکری اختراع ہے۔ انھیں یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اسلامی عقیدہ یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے ہر ایک کو پیش ہونا ہے۔ اور کسی کی طرف کفریات کی نسبت کرنا ظلم عظیم ہے اور حقوق العباد میں داخل ہے۔ مقالہ نگار نے ہندوؤں کے بیانات کو اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو مولانا پر الزام لگانے کے لیے ظلماً جان بوجھ کر بے دھڑک استعمال کیا ہے۔ حال آں کہ وہ جانتے تھے کہ مولانا مدنی جمعیت علماے ہند کے سربرآوردہ تھے، علم و عمل کے پیکر اور سنت نبویہ کے عامل، اسلام کے مجاہد، متقی اور عبادت گزار تھے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (سورۂ احزاب:۵۸)

''وہ لوگ جو مومن مردوں یا عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انھوں نے وہ کام کیا ہو انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ سر لیا۔''

ہم نے آیت اس لیے لکھی ہے کہ صاحب مضمون جہاں تک سنا گیا ہے۔ خود غلام احمد پرویز ہیں (جو اس زمانہ مین سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے علامہ رازی کے فرضی نام سے ایڈیٹر طلوع اسلام بنے ہوئے تھے) شاید انھیں قرآنی آیت اپیل کرے۔ وہ آگے چل کر صفحہ ۷ اپر بعنوان ''قرآن فہمی کا یاس انگیز مظاہرہ'' مولانا کے دلائل ذکر کرنے کے بعد یہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاے کرام کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے، مگر کچھ ہی آگے ''فرقہ پرستی کی فضیلت'' یوں بیان کرتے ہیں کہ انبیاء کے ماننے والے اور نہ ماننے والے دو فریق

ہوتے ہیں اور سورۂ ہود میں آیا ہے مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ ۔ یہ دورِ حاضرہ کی سیاست کا ترجمہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے فرقہ پرستی کہا جاتا ہے، جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

دوسرا اتہام:

مقالہ نگار سے ہمارا سوال یہ ہے کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے کہاں فرمایا ہے کہ نبی کی قوم میں مسلمان اور کافر کا فرق نہیں ہوتا اور کافروں کا انجام بد نہیں ہوتا، آپ نے یہ الزام کیوں لگایا اس لیے آپ نے قوم نوح، قوم ہود، قوم لوط، قوم شعیب، قوم موسیٰ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے سزایاب ہونے کا ذکر جو صفحہ ۲۲ تک چلایا ہے زاید بحث کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن وہ مولانا پر اس کے انکار کا الزام لگانے کا بندوبست کر رہے ہیں، جس کا انھوں نے بیڑا اٹھایا ہے اور ایسا ہی لگتا ہے، کیوں کہ اس کے آخر میں پھر یہی بات دہراتے ہیں کہ

> ''اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اور تم کی تفریق سیاست حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے اور متحدہ قومیت کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب ہم اور تم کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ
>
> تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری''

ظاہر ہے کہ حضور مولانا کی کسی تقریر، تحریر یا نجی مجلس میں بھی کبھی یہ بات نہیں کہی گئی۔ مولانا کی زندگی آخری لمحات تک اسلام کا نمونہ رہی، وہ اسلام کے لیے کام کرتے رہے، اس ہندوستان میں جو قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کے لیے یکسر بدل گیا تھا وہاں آپ نے لوگوں کو اسلام پر جمائے رکھا جو یقیناً جہاد اکبر تھا۔

فرقہ اور فریق کا قرآن پاک میں استعمال:

مقالہ نگار نے اس عنوان کے آخر میں سورۂ ہود کی آیت مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ پیش کی ہے اور پھر ''مومنین اور کفار کے دو گروہ'' کا عنوان قایم کیا ہے اور اس کی رو سے

فرقہ پرستی کوواجب قرار دیا ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ آیت میں دوفرقے ذکر کیے گئے ہیں، جوایمان وکفراور نیک و بداعمال کے نتیجے میں خودبخود بن جاتے ہیں، جن کا کسی بھی مسلمان کوانکار نہیں، چہ جاے کہ حضرت مدنی جیسے محدث زمانہ کو، لیکن اس سے آپس میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی ترغیب اخذ کرنا اور اسلامی تعلیم کا نام لیناان کا اپنا اجتہاد ہے کیوں کہ قرآن پاک میں فریق اس گروہ کے معنی میں بھی آیا ہے، جوایک دوسرے کے مقابل نہ ہو۔قرآن کریم میں فریق کا لفظ کئی جگہ آیا ہے، مثلاً ایک جگہ انبیاے کرام ہی کے دوفریق ذکر فرمائے گئے ہیں۔بنی اسرائیل کوخطاب ہے:

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ. (سورۂ بقرہ:۸۷)

''ان انبیاء میں ایک گروہ کوتم جھٹلاتے ہواورایک گروہ کوشہید کرتے ہو۔''

اس آیت میں دوفریق ذکر فرمائے گئے ہیں، دونوں ہی انبیاے کرام کے گروہ ہیں آپ ہی بتائیں کہ انبیاء کے فریقوں میں آپس میں کیا فرقہ بندی تھی؟ ایک اور جگہ کافروں ہی کے دوفریق ذکر فرمائے گئے ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو خطاب ہورہا ہے کہ

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا۝ (سورۂ احزاب:۲۶)

''اوران کافروں کے دلوں میں (تمھارا) رعب ڈالا۔اوران میں ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہواورایک گروہ کوقید۔''

ان کافر گروہوں میں آپس میں کیا فرقہ بندی تھی یہ تو مسلمانوں کے مقابل متحد اورایک جماعت تھے۔

بلکہ قرآن کریم میں فرقہ کالفظ بھی آیا ہےاور بہت اچھے معنی میں آیا ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ. (سورۂ توبہ:۱۲۲)

''یعنی ایسا کیوں نہ ہوکہ ان کے ہرگروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی

سمجھ حاصل کریں۔"

بلکہ فرقہ کا لفظ غیر جان دار پر بھی بولا گیا ہے، حدیث میں معجزۂ شق القمر کے ذکر میں آتا ہے کہ:

انشق القمر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فرقتين فرقة فوق الجبل و فرقة دونه

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہوا ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور دوسرا اس سے نیچے۔"

فائدہ: الجمعیۃ دہلی کے حوالہ سے "الحق" اکوڑہ خٹک کے شمارنمبر ۳، ۴ جلد ۱۳ کے صفحہ ۴۱ پر یہ خبر دی گئی ہے کہ چاند میں جو عظیم دراڑ ہے، اس کا نام سائنس دانوں نے "عرب دراڑ" رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق الباز جنھوں نے اپالو ۱۵ کی منصوبہ بندی کی تھی یہ بیان دیا ہے۔

لہٰذا فریق کے لفظ سے مقالہ نگار کا اس مروجہ فرقہ بندی کی فضیلت کے لیے استدلال کرنا ان کی اپنی رائے ہے جو غلط ہے، بلکہ حضرت سیدنا موسیٰ و ہارون علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ السلام کے واقعہ سے تو ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ فرقہ بندی میں عجلت نہ کی جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو پیچھے قوم مبتلائے شرک ہوگئی۔ واپس آکر آپ حضرت ہارون علیہ السلام پر خفا ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا:

يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ.

(سورۂ طٰہٰ: ۹۴)

"اے میرے ماں جائے نہ میری داڑھی پکڑو اور نہ سر کے بال مجھے یہ ڈر ہوا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور تم نے میری بات کا

انتظار نہ کیا (خیال نہ رکھا)۔"

مقالہ نگار صفحہ ۲۲ پر فرماتے ہیں:

"اور متحدہ قومیت کی تشکیل اس وقت ہوئی ہے جب ہم اور تم کا امتیاز یوں۔ مٹ جائے کہ

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

جناب رازی صاحب فرماتے ہیں:

"ذرا آج ہندوؤں سے کہیے کہ تمھارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت رہے گی، تاوقتے کہ تم ایمان نہ لے آؤ پھر دیکھیے وہ آپ کو کس طرح متحدہ قومیت کا جزو تسلیم کرتے ہیں۔"

مقالہ نگار کا تجاہل:

حال آں کہ آگے کی آیتیں احکام کی وضاحت کے لیے خود موجود ہیں، جن میں کفار معاندین، محاربین اور مصالحین کے احکام میں فرق بیان فرمایا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مضمون کا یہ حصہ اور فریق کی تفسیر پڑھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام ترش روئی سکھاتا ہے، علیحدگی پسندی اور چھوت چھات سکھاتا ہے اور بزور تلوار پھیلا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقالہ نگار صرف ایک چیز پر زور دے رہا ہے جو اس وقت اسے پسند ہے اور مذہبی تعلیم پوری نہیں پیش کر رہا، اگلی آیات سے بھی نظر پھیر رہا ہے جو سامنے موجود ہیں۔

چلیں آپ کو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ اور تفسیر سے یہ آیات اور احکام سنوائے دیتے ہیں۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَّاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (سورۂ ممتحنہ: ۷)

"قریب ہے کہ اللہ تم میں اور ان میں جو ان میں سے تمھارے دشمن ہیں دوستی

کردے اور اللہ قادر ہے، اور بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس کے حاشیہ پر نعیم الدین صاحب مراد آبادی لکھتے ہیں یعنی کفار مکہ میں سے اس طرح کہ انھیں ایمان کی توفیق دے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا اور بعد فتح مکہ ان سے کثیر التعداد لوگ ایمان لے آئے اور مومنین کے دوست اور بھائی بن گئے اور باہمی محبتیں بڑھیں۔ شان نزول جب اوپر کی آیت نازل ہوئی تو مومنین نے اپنے اہل قرابت کی عداوت میں تشدد کیا، ان سے بیزار ہو گئے اور اس معاملے میں بہت سخت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں امید دلائی کہ ان کفار کا حال بدلنے والا ہے۔

پھر ارشاد باری ہے:

لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ○ (سورۂ ممتحنہ: ۸)

"اللہ تمھیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو! بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔"

اِنَّمَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ قٰتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَاَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○

(سورۂ ممتحنہ: ۹)

"اللہ تمھیں انھی سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا یا تمھارے نکالنے پر مدد کی کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ستم گار ہیں۔"

اس کے حاشیہ پر صدر الافاضل نعیم الدین صاحب مراد آبادی لکھتے ہیں:

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت خزاعہ کے حق میں نازل ہوئی، جنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شرط پر صلح کی تھی کہ نہ آپ سے قتال کریں گے، نہ آپ کے مخالف کو مدد دیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کی اجازت دی۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر نے فرمایا کہ یہ آیت ان کی والدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی، ان کی والدہ مدینۂ منورہ میں ان کے لیے تحفے لے کر آئی تھیں۔ مشرکہ تھیں تو حضرت اسماء نے ان کے ہدایا قبول نہ کیے اور انھیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا حکم ہے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجازت دی کہ انھیں گھر مین بلائیں، ان کے ہدایا قبول کریں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

سلوک رفق و مدارابہ جارذی القربیٰ
عمل بحکم الٰہی واتباع نبی ست
(اقبال سہیل)

قوم وملت اور امت
قرآن کی روشنی میں

آیت قرانی میں تحریف:

مقالہ نگار نے ''متحدہ قومیت اور اسوۂ خلیل'' کے زیر عنوان صفحہ ۲۳ پر ایک آیت پیش کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نقل کرنے میں کتنے غیر محتاط ہیں انھوں نے پہلے آیت نقل کی ہے وہ بھی غلط، پھر ترجمے میں آیت کے جملے نقل کیے ہیں، وہ بھی غلط ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ مگر فرضی رازی صاحب نے اسے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کردیا۔

ارشاد باری ہے اِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ (جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا) مگر فرضی راضی صاحب نے اِذْقَالَ لِقَوْمِهٖ کردیا نہ معلوم ایسا کیوں کیا گیا، کیا قرآن بھی تصنیف فرمارہے تھے۔

پھر مقالہ نگار نے آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے وقت اپنی دلی خواہش کے اثبات میں سیاق وسباق سے بے نیاز ہوکر پورا زور صرف کردیا ہے، مگر سورت اور پارے کا حوالہ نہیں دیا، تاکہ کوئی مسلمان قرآن پاک میں پورا مسئلہ نہ دیکھ لے، کیوں کہ اس سے آگے وہ آیات ہیں جن میں تفصیلاً احکام بتلائے ہیں جو ابھی گزری ہیں، اس سے ان کے مبلغ علم یا خیانت وتحریف کا اندازہ کیجیے۔

قوم اور ملت کا قرآن وحدیث میں استعمال:

اب قوم اور ملت کے بارے میں قرآن پاک کی روشنی میں غور فرمائیے، قوم کا لفظ فی الواقع بہت عام ہے، مثلاً سورۃ الروم، پارہ ۲۱، رکوع ۶ میں دیکھیں:

اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ.
اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ
اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ.

''یقیناً اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کے لیے جو دھیان کرتے ہیں۔
یقیناً اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں جو سنتے ہیں۔
یقیناً اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

اور اسی طرح ۲۶ ویں پارہ میں سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع میں دیکھیں، صرف مردوں پر قوم کا لفظ بولا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ. (سورۂ حجرات:۱۱)

''اے ایمان والو! نہ مرد مردوں کا مذاق اڑائیں شاید وہ ان ہنسی اڑانے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔''

مضمون نگار نے کہا ہے کہ قوم نوح نہ کہا جاتا تو کیا کہا جاتا۔ جب اس کا کوئی اور نام ہی نہ تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا تو نام تھا، جو بنی اسرائیل کہلاتی تھی، اس میں کافر اور مسلمانوں سب کو ملا کر ان کی قوم فرمایا گیا ہے:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِھِمْ اَنْ یَّفْتِنَھُمْ. (سورۂ یونس:۸۳)

''یعنی موسیٰ علیہ السلام پر ان کی قوم کے لوگ ایمان نہ لائے سوائے کچھ نوعمر لڑکوں کے۔ فرعون اور ان کے سرداروں کے خوف سے......''

قوم کی نسبت باوجودے کہ اکثریت غیر مسلم تھی آپ ہی کی طرف کی گئی ہے۔
ان سب ہی کے لیے آپ نے فرعون سے مطالبہ بھی فرمایا:

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ ○ (سورۂ شعرا:۱۷)

"کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِی وَ کَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِی.

(سورۂ اعراف:۱۵۰)

"ہارون (علیہ السلام) نے کہا" اے میرے ماں جائے قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھے مار ڈالیں۔"

اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی. (سورۂ قصص:۷۶)

"یقیناً قارون موسیٰ کی قوم سے تھا۔"

واعظوں سے آپ نے یہ واقعہ تو بہت ہی سنا ہوگا کہ اہل طائف نے جب بہت تکلیف دی تھی، تب بھی جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہی دعا دی تھی۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ.

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے کیوں کہ وہ نہیں جانتے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ آپؐ سے دریافت کیا کہ کیا آں جناب پر کوئی وقت احد کے دن سے بھی زیادہ سخت آیا ہے؟ جواب میں ثقیف اور طائف کا ذکر فرمایا ارشاد ہوا۔

فقال لقد لقیت من قومک و کان اشد مالقیت منهم یوم العقبه. (الحدیث)

"مجھے تمھاری قوم سے تکلیف پہنچتی رہی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تکلیف عقبہ والے دن پہنچی ہے۔" (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۲۲ از بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو پیدا ہی مسلمان ہوئی تھیں مگر قوم کی نسبت آں کی طرف کی گئی۔

قال عبدالله کانی انظر الی النبی صلی الله علیه وسلم یحکی نبیا من الانبیاء ضربه قومه فادموه فهو یمسح الدم عن وجهه وهو یقول رب اغفر لقومی

فانهم لایعلمون. (بخاری شریف: ۱۰۲۴)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گویا میں اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر رہا ہوں کہ آپ ایک نبی کی نقل فرمارہے ہیں انھیں ان کی قوم نے مار مار کر لہولہان کر دیا وہ اپنے چہرہ سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دے کیوں کہ یہ نہیں جانتے۔''

یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرمائے بغیر اپنے ہی بارے میں فرمارہے تھے، احد کے موقعہ پر ارشاد فرمایا:

کیف یفلح قوم شجّوا نبیهم. (بخاری شریف، صفحہ: ۵۸۲)

''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلودہ کیا۔''

زقوم خویش شمرد اہل کفر را باحد
رسول پاک کہ نامش محمد (ﷺ) عربی است

(اقبال سہیل)

ایک مرتبہ دسترخوان پر ''سانڈھ'' کا گوشت لایا گیا مگر اسے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تناول نہیں فرمایا:

فقال خالد بن الولید احرام الضب یارسول الله؟ قال لاولكن لم یكن بارض قومی فاجدنی اعافه.

(بخاری شریف: ۸۱۲)

بیہقی میں ہے کہ آں جناب نے ایران میں ملکہ کی تخت نشینی کی خبر سن کر ارشاد فرمایا:

لایفلح قوم تملکهم امرأة (البدایہ: ص۲۷۰، جلد۴)

''وہ قوم کامران نہیں ہوگی جس پر عورت حکومت کرتی ہو۔ (یہاں قوم سے ملک فارس مراد ہے)''

حدیث ہرقل میں بخاری شریف میں ہے کہ ہرقل نے آپ کی باتیں سن کر

تصدیق کرتے ہوئے کہا:

وکذلک الرسل تبعث فی نسبا قومها. (بخاری شریف، ص۴)

''اسی طرح انبیاے کرام اپنی اپنی قوموں کے بہترین خاندانوں میں مبعوث ہوا کرتے ہیں۔''

آقاے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی بار وحی آئی تو حضرت ورقہ ابن نوفل نے جو بوڑھے ہو چکے تھے آرزو کی اور عرض کرنے لگے:

یالیتنی اکون حیا اذیخرجک قومک.

(بخاری شریف: ص۳)

''کیا اچھا ہو کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کو آپ کی قوم نکالے گی۔''

یہ بھی دیکھیں!

مضمون نگار اس عنوان کے آخر میں مزید استدلال کرتے ہیں:

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ.

''اس نے تمھارا نام مسلمان رکھا۔''

اس آیت کا پہلا جملہ ہے مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ. (سورۂ حج:۷۸) یہاں آیت میں ملت کا لفظ آیا ہے، اس لیے اس جز کو انھوں نے حذف کر دیا، اس سے ان کی اٹھائی ہوئی بحث پر اثر پڑتا تھا کیوں کہ وہ قوم اور ملت کو ایک چیز قرار دیتے آئے ہیں۔

حقیقتاً هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں پوچھا جائے تو تم اپنے آپ کو مسلمان کہو تمھارا مذہب اسلام ہے اور اگر قومیت کے بارے میں سوال ہو تو سید، شیخ، صدیقی، راجپوت، پٹھان وغیرہ کہیں گے، قومیت بمعنی نیشنلٹی! یعنی وطنیت کے بارے میں سوال ہوگا تو اس کا ایرانی، پاکستانی وغیرہ جواب ہوگا سرکاری فارموں کی خانہ پری بھی اسی طرح کی جاتی ہے، اسی طرح پاس

پورٹ ، داخلہ فارم وغیرہ بھرے جاتے ہیں اور فرضی رازی سمیت سب دن رات بھرتے ہیں اور کوئی اسے ناجائز یا حرام نہیں کہتا۔

اقبال سہیل مرحوم نے کہا ہے۔

بملت ارچہ براہیمی است سرور (ﷺ) ما
ولے بقومِ حجازی بہ نسل مطلبی ست

غرض اس سے مقالہ نگار کا استدلال بے محل ہے۔ قوم اور ملت میں فرق کی مثال مذکورہ آیت مبارکہ کے ساتھ کچھ اور آیتوں میں ملاحظہ فرمائیں کہ لفظ ملت خاص مذہب کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام نے جیل کے ساتھی سے فرمایا:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآئِیْۤ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ.

(سورۂ یوسف:۳۸)

''میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی اختیار کرلی ہے۔ (علیہم الصلوٰۃ والسلام)''

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا:

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ. (سورۂ بقرہ:۱۳۵)

''کہہ دیں کہ ہم ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو باطل سے ہٹے ہوئے تھے اور شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔''

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا. (سورۂ حج:۷۸)

''تمھارے باپ ابراہیم کا دین اسی (اللہ) نے نام رکھا تمھارا مسلمان، پہلے سے اور اس قرآن میں۔''

حدیث پاک میں آتا ہے کہ:

حتی قال ابو طالب اخر ما کلمهم علی ملة عبدالمطلب و ابی ان یقول لا اله الا الله.

(بخاری شریف:۵۰۳)

"حتیٰ کہ آخری بات جو ابوطالب نے ان کافر ساتھیوں کے جواب میں کہی (یہ تھی) کہ (وہ) عبدالمطلب کی ملت پر (جان دے رہے ہیں) اور لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔"

بلند تر بود از قوم برتبۂ ملت
کہ حبلِ دین قوی تر ز رشتۂ نسبی ست

(اقبال سہیل)

ایک حقیقت:

کفر و اسلام کی ملی جدائی کے باوجود کفار سے مناسب حد تک تعلقات کا قیام بھی ثابت ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی کپڑا عنایت فرمایا، مسلمان مردوں کے لیے ریشم منع ہے مگر خرید و فروخت اور ہبہ جائز ہے

فکسی عمر اخاه بمکة مشر کا. (بخاری شریف:۳۵۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ اپنے ایک بھائی کو پہننے کے لیے دے دیا جو مکہ میں تھے اور مشرک تھے۔ حال آں کہ آپ **اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ** کے مصداق تھے اس کا مطلب آپ نے جو اکھڑپنا اور کندۂ ناتراش بنا سمجھا ہے۔ وہ درست نہیں، اسلام بزورِ تلوار نہیں پھیلا بزور اخلاق پھیلا ہے۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ایک نسبی قرابت دار کے لیے جو ذمی تھا مال کی وصیت فرمائی تھی۔

عن ابن عمر ان صفية وصيت نسيب لها يهودی.

(سنن الدارمی: جلد۲، صفحہ۴۱۷)

"حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ایک یہودی رشتہ دار کے لیے وصیت فرمائی تھی۔"

نیز بہت سے مسائل ہیں جن کا رہن سہن سے تعلق ہے یا ملکی معاملات سے ان کے باقاعدہ احکام حدیث تک کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ترمذی شریف میں مشرکین کا ہدیہ قبول کرنے کا باب ہے کہ کسریٰ اور دوسرے بادشاہوں نے آپ کے پاس تحائف بھیجے۔ آپ نے قبول فرمائے۔ (ترمذی: صفحہ ۱۹۱، باب ماجاء فی قبول ہدایا المشرکین)

جس طرح آج اسٹیشنوں پر اسٹالوں پر چائے وغیرہ ہوتی ہے یا ہمارے وفد یورپ، چین، امریکہ جاتے ہیں وہاں مہمان ہوں یا مشرکوں کے جہازوں میں سفر کریں، کیا ان کے ہاتھ کی وہ چیزیں جو حلال ہیں کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ ترمذی شریف میں ایک باب ہے **"باب ماجا فی طعام المشرکین"** (صفحہ ۱۸۹) جس میں جواز کی روایت دی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے برتنوں کے بارے میں ایک باب ہے کہ وہ دھوکر استعمال کر سکتے ہیں۔ (صفحہ ۱۸۹ ترمذی شریف)

ایسی صورت بھی ہوسکتی ہے کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کی مدد کریں اس کا بھی ایک باب ہے **"باب ماجاء فی اھل الذمة یغزون مع المسلمین ھل لیسھم لھم"** اس باب کی حدیثوں میں یہ مسئلہ بتلایا ہے کہ ایسی صورت میں امام (محاذ کا کمانڈر) انھیں جو کچھ مناسب سمجھے (انعام) دے گا۔ ان کا مجاہدین مسلمین کی طرح حصہ نہیں ہوگا۔

غرض ایسے بہت سے مسائل سے اور دوسری تمام آیات واحادیث سے صرف نظر کر کے یہ کہنا کہ اسلام نے کافروں سے فقط دشمنی اور سختی ہی سکھائی ہے، مدیر طلوع اسلام کی دین سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

شریعت میں لفظ امت کا استعمال:

مضمون نگار نے صفحہ ۲۴ سے "متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور" کے زیر عنوان

معاہدۂ نبویہ سے حضرت مدنی رحمہ اللہ کے استدلال کی تردید کی ہے، لیکن مولانا کی تحریر اور معاہدہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ مبارکہ کے لیے حضرت مدنی کی کتاب کے صفحہ ۶۴ اور ۶۶ کا مطالعہ فرمالیں، اس میں **انهم امة واحدة من دون الناس وان اليهود بني عوف امة مع المؤمنين، لليهود دينهم وللمسلمين دينهم** ان سب دفعات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت فرمایا ہے۔

امت کا لفظ کافروں پر قرآن کریم میں بھی بولا گیا ہے، جیسے اس آیت میں ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اِۨللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (سورۂ اعراف: ۱۶۴)

"اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انھیں سخت عذاب دینے والا ہے، کہنے لگے تمھارے رب کے سامنے الزام اتارنے کے لیے اور اس لیے کہ شاید وہ ڈریں۔"

وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(سورۂ ہود: ۴۸)

"اور کچھ گروہ ہیں جنھیں ہم دنیا کا فایدہ پہنچائیں گے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔"

اس آیت میں حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والے کافر مراد ہیں۔

انسانوں کے سوا اور حیوانات پر بھی قرآن کریم میں امت کا لفظ آیا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ. (سورۂ انعام: ۳۸)

"اور نہیں ہے کوئی زمین میں چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دو بازوؤں پر اڑتا ہے مگر تم جیسی امتیں۔"

مسلسل فریب اور بہتان

خلاصۂ بہتان:

غرض حضرت مولانا نے تو صفحہ ۲۷ پر ''مسلمان اپنے دین پر قایم رہتے ہوئے'' کے الفاظ صاف لکھے ہیں مگر مضمون نگار صاحب نے انھیں پھر بھی شدت سے مطعون کر کے الزام تراشی کا گناہ اپنے سر لیا ہے۔

ایک اور بہتان:

اسی طرح اس سے آگے صفحہ ۲۸ پر غیر مسلمون سے موالات کا عنوان قایم کر کے موالات کے معنی کی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے کافروں کے ساتھ ''قلبی تعلقات، ایک دوسرے پر کامل اعتماد، پورا پورا دلی بھروسا ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں۔ جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غائب دوسرے پر کامل بھروسا کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔

موالات کے یہ معنی مقالہ نگار نے اپنی طرف سے گھڑ لیے ہیں، موالاۃ لفظ ولی سے بنا ہے۔

اس کے معنی ہیں قریب ہونا قاموس میں ہے **القرب والدنو والمطر بعد المطر** ۔ اسی سے لفظ ولی بنا ہے محب، دوست اور مددگار۔ اسی سے لفظ مولیٰ بنا ہے جس کے کم از کم اتنے معنی تو یقیناً ہیں، مالک، غلام، آزاد کردہ، ساتھی، قریبی رشتہ دار، جیسے چچازاد بھائی اور اس جیسا اور کوئی رشتہ دار پڑوسی، حلیف جس سے پکا معاہدہ ہوا ہو، بھانجا، بیٹا، چچا، مہمان، شریک، مربی، مددگار، انعام و احسان کرنے والا اور جس پر انعام و احسان کیا گیا ہو، محب، تابع، سسرال کا رشتہ۔ غرض کہ اس کے ایک دو نہیں بہت سے معنی ہیں اور جتنے معنی مولیٰ کے ہیں اتنے ہی موالاۃ کے ہیں، یہ غلامی

خیانت کے ذریعے بہتان طرازی ہے کہ حضرت مدنی کی طرف اس لفظ کا حرام ہی مطلب لکھ کر منسوب کیا ہے۔

مولانا نے کبھی اسے جائز نہیں سمجھا، بات معاہدے ہی کی حد تک تھی، جو شروع سے آج تک جائز چلا آرہا ہے۔ آپ اس معاہدہ کو جدا قومیت کی بنا پر کہنا چاہتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن جن سے معاہدہ ہوا اُنھیں امت واحدہ فرمایا۔

بس جس قسم کا یہ معاہدہ تھا اور جس حد تک شریعت اجازت دیتی ہے، مولانا مدنیؒ اسی حد تک معاہدہ اور تعلق رکھنے کے قائل تھے اس سے زیادہ نہیں۔

سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دہی:

آگے چل کر صفحہ ۳۲ پر مقالہ نگار نے ''عہد و پیمان کے تعلقات'' کے زیر عنوان خود بھی اسے جائز لکھا ہے پھر صفحہ ۳۶ پر ''اسلامی جماعت سے علیحدگی کفر ہے'' کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لیے کتاب اللہ بحیثیت قانون قیامت تک کے لیے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے امامت کبریٰ کے مرکز اوّلین جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد یہ منصب امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں (صحابہؓ رضی اللہ عنہم اجمعین) کی طرف منتقل ہو گیا، لہٰذا آج مسلمانوں کے لیے اسلامی نظام زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو، اس جماعت کے منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت ہو اور ان میں اتقی (سب سے زیادہ متقی) ان کا امیر ہو اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے ماتحت سرانجام پائیں۔''

اس سے مولانا مدنیؒ کو کب اختلاف ہوا؟ ان کی ساری جدوجہد خود ان کی یا ان کے اکابر کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو اسی نظام اسلامی کے لیے تھی بلکہ وہ تو ساری

دنیا میں یہ نظام چاہتے تھے اور ان کے بعد ان کے متوسلین کی بھی بحمد للہ یہی خواہش ہے اور اسی کے لیے وہ دل و جان سے پاکستان میں کوشاں ہیں۔

مضمون نگار نے صفحہ ۳۷ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے اسلامی اجتماعی زندگی کی اہمیت پر زور دیا ہے، یہ حوالہ ''مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب'' سے ماخوذ ہے۔ دوسرا حوالہ مولانا کے خطبۂ صدارت لاہور کا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''مسلمانوں کی قومیت صادقہ کا مدار صرف شریعت پر ہے۔''

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس حوالہ کے لکھنے سے کیا فایدہ مقصود ہے، کیوں کہ مولانا مرحوم اول سے آخر تک کبھی بھی مسلمانوں میں تفریق کے خواہاں نہیں رہے، مولانا کے دشمن جو مولانا پر الزام تراشی کی حد تک آگے بڑھے ہوئے ہیں، یہی کہتے ہیں کہ ان میں ایک بڑی خامی یہی مذہب پرستی کی تھی، وہ مسلمانوں کے کام جواہر لال سے لیتے ہی رہتے تھے، ان کا عمل ان کے قول کے خلاف نہیں ہوا۔ آپ کی مرضی کے خلاف ضرور ہوا ہوگا، جس کے واقعی وہ پابند نہ تھے۔

پھر دھوکا دہی:

مضمون نگار نے صفحہ ۳۸ پر مذکورہ عنوان کے تحت لکھا ہے:

> ''کانگریس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے، وہ مذہب ایک پرائیوٹ عقیدے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں کے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں، جو انتہائی ''فرقہ پرستی'' پر دلالت کرتی ہیں لہٰذا ''قومیت پرستی'' انھیں کس طرح اپنے دستور العمل میں جگہ دے سکتی ہے۔''

اسی انتہائی فرقہ پرستی کی یہی باتیں کر کے اور پوری قوم نے خدا سے عہد کر کے

پاکستان لیا تھا، لیکن یہ باتیں اوراس رسالہ میں لکھی ہوئی آیات و مسائل اور سارے پر جوش مضامین اُسی ساعت تک کے لیے تھے جب تک پاکستان نہ ملا تھا، اس کے بعد آپ کی لکھی ہوئی کون سی بات یہاں پوری ہوئی۔ کس دن اسلامی قانون نافذ ہوا؟ اب تک کب وہ مبارک ساعت آئی ہے۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ ایک گھنٹہ کے لیے بھی اسلامی نظام نافذ ہوا ہو۔

آخر میں صاحب مضمون نے یہ آیت لکھی ہے اور کہا ہے کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ ''استخلاف فی الارض'' مسلمان کی اپنی حکومت قرار دیتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ. (سورۂ نور:۵۵)

''اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور وہ اعمال صالحہ کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انھیں اس دنیا میں حکومت عطا فرمائے گا۔''

لیکن یہ باتیں صرف ووٹ کے لیے تھیں، عمل صالح نہ انفرادی طور پر کیا، نہ اجتماعی طور پر، نہ حکومتی سطح پر۔ آخر کار یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہماری دعاؤں اور وعدوں پر ہی حکومت بخش دی تو ہم اسے سنبھال بھی نہ سکے (چہ جائے کہ مزید ترقی کرتے) اور ملک دولخت کر کے بیٹھ گئے اور اب بھی یہی شعار بنا رکھا ہے۔ بس باتیں بنانی آسان ہیں اور عمل مشکل کام ہے۔

مقالہ نگار اور ان کے ہم طبع لوگ اس آیت سے غافل ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود اس آیت کے مصداق ہوں:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (سورۂ آل عمران:۱۸۸)

''ہرگز یہ نہ سمجھو کہ جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر کیے ان کی تعریف ہو تو ایسوں کو ہرگز نہ سمجھو کہ عذاب سے چھوٹ گئے، ان کے

لیے دردناک عذاب ہے۔"

مولانا مدنی اور علامہ مرحوم کا معاملہ تو صاف ہو گیا تھا مگر شر پسند پھر ابھارتے رہے۔ یہ رسالہ کیا ہے خدا اور روز قیامت اس کے سامنے پیش ہونے سے بے خوفی کا اعلیٰ مظاہرہ ہے۔ جھوٹ اور اتہام کا ایک پلندہ ہے اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اسے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی، اور سچی بات گرفت کرنے کے لیے نہیں مل سکی تو مجبوراً اتہامات کی بوچھاڑ کر دی۔

متحدہ قومیت کا انتہائی ناپاک خاکہ، جس کے ذیل میں اکبر کے دین الٰہی کا بھی ذکر ہے، اسلام دشمنی کی انتہا، جداگانہ اسلامی تنظیم کی عداوت، قرآن فہمی کا یاس انگیز مظاہرہ، متحدہ قومیت اور اسوۂ خلیل (جس میں مولانا پر اسوۂ خلیل علیہ السلام کی مخالفت کا الزام ہے) متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور، غیر مسلموں سے موالات کے ذیل میں موالات کی ایسی تشریح جو حرام اور کفر ہے، یہ مسموم عنوانات تشریحات سب کی نسبت حضرت مدنی کی طرف کرنا، مقالہ نگار کا کتنا بڑا ظلم ہے! یہ حرام باتیں خود ہی لکھ رہا ہے اور نسبت مولانا مدنی کی طرف کر رہا ہے۔

اس کا یہ عمل اس آیت کی وعید کے بھی قریب ہے:

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۝ (سورۂ نساء:۱۱۲)

"اور جو کوئی خطا کرے یا گناہ پھر کسی بے گناہ پر تہمت لگا دے تو اس نے ضرور بہتان اور کھلا گناہ اٹھایا۔"

درس میں غلط بات سے عظیم نقصان:

حضرت مدنی رحمہ اللہ نے بار بار اس کا انکار کیا ہے۔ اجلاس جون پور کے خطبۂ صدارت میں...... اس سے ایک بہت برا نقصان یہ ہونے کا امکان ہے کہ کل کوئی خود غرض حضرت مدنی رحمہ اللہ کے نام سے اپنی مقصد براری کے لیے اسے شرعی مسئلہ اور

ایک عالم کی رائے بنا کر نفع اٹھا سکتا ہے جیسے کمیونسٹ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کر لیتے ہیں اور اپنے مقصد کی حد تک اس سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک نظیر سامنے ہے اس بات کے انتساب کی نفی ضروری ہے، ورنہ کسی بھی ملک کا خود غرض حکمران اپنے اختیارات کے باعث خصوصاً غلط فایدہ اٹھا سکتا ہے مقالہ نگار کو تو اعتراض سے غرض تھی، عواقب سے نہیں، مگر ہمیں سمجھنا چاہیے، مثلاً جی ایم سید کا تازہ بیان جو روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۳۰ مارچ ۷۸ء میں صفحہ ۳ پر شایع ہوا ہے انھوں نے اسی ناجائز ''متحدہ قومیت'' پر زور دیا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے اکبر کے دین الٰہی کا کسی تقریر و تحریر یا نجی مجلس میں نام نہیں لیا، آپ ان پر الزام لگا رہے ہیں محض اپنے خیال سے، البتہ قائداعظم نے فرمایا ہے اور بہت واضح الفاظ میں آگے بڑھ گئے ہیں، طلوع اسلام والے اور درباری حضرات دیکھیں ''شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جو خیر سگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی، انھوں نے زبان سے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا، ان کے ساتھ رواداری برتی اور ان کے عقاید کا احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے، ایسے ہی رہے ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہوگی، جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے۔ مجلس دستور ساز میں ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے جواب میں نیز انھوں نے اسی تاریخ کو دستور ساز اسمبلی سے خطاب میں کہا:

> ''آپ آزاد ہیں، اپنے مندروں، مسجدوں، اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے! آپ پاکستان کی مملکت میں بالکل آزاد ہیں! آپ کسی مذہب، فرقہ، عقیدہ سے تعلق رکھیں اس کا کاروبار سلطنت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

(خطبات قائداعظم: رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، چوک انارکلی لاہور، صفحہ: ۷۷ ـ ۵۷۶)

قیامِ پاکستان اور قاید اعظم کا طرزِ عمل

اسلامی تعلیمات میں وسعت کہاں تک ہے:

محترما! اسلام کی جامعیت کا تقاضہ ہے کہ اس میں وہ مسائل بھی ہوں، جن میں ایک مسلم اور غیر مسلم کی معاشرت کے بارے میں وضاحت ہو، خود حکومت اسلامیہ میں غیر مسلم ہوں تو ان کے کیا حقوق شریعت نے بتلائے ہیں اور اگر غیر مسلم حکومت سے واسطہ پڑے تو کیا معاہدہ ہوسکتا ہے اور کیا نہیں؟ کیوں کہ دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں، یا تو مختلف النوع کافروں سے معاہدوں کی اجازت ہوگی یا نہیں ہوگی، اگر یہ کہا جائے کہ اجازت نہیں ہے تو برطانیہ، فرانس، امریکہ، چین، اور سری لنکا کسی سے بھی ہمارا کوئی معاہدہ نہیں ہوسکتا۔ فرانس سے ہمارا ایٹمی ری ایکٹر کا معاہدہ ہوا ہے، سری لنکا سے ہم نے مشرقی پاکستان کے لیے راستہ لیا تھا۔ یہ بھی معاہدے ہیں، اگر یہ معاہدے شرعاً جائز ہیں تو وہ کہاں لکھے ہیں، کہاں تک ان میں گنجایش ہے، اور کہاں تک نہیں، یہ چیزیں بھی حضرت مدنی نے تحریر فرمائی ہیں اور ان کی ضرورت و اہمیت ایک مثال سے سمجھ لیجیے، جب آپ ان ملکی مسائل میں اسلام کی طرف رجوع کریں گے تو حضرت مدنی کی تحریر کام آئے گی۔ لیکن آپ سب طرف نظر دوڑائیے کہ کیا ہوتا رہا ہے، پھر آپ مولانا پر معترض نہ رہیں گے، کیوں کہ دوسرے حضرات حدودِ شرعیہ سے بھی آگے بڑھتے رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان اور قاید اعظم کا طرزِ عمل:

مثلاً اگست ۴۵ء سے قاید اعظم کے بیانات اس قسم کے شایع ہوتے رہے ہیں، کہ پاکستان میں جمہوری حکومت ہوگی، کیوں کہ آسام، بنگال اور پنجاب میں غیر مسلم

کم و بیش ۴۵ فی صد تھے۔ انھیں مطمئن کرنا ضروری تھا (ان میں یہ شایع ہوتے رہے ہیں۔

ب: جب انھوں نے پاکستان کی سب سے پہلی کابینہ بنائی تھی تو ایک وزیر اسی ہندو قوم کا رکھا جس سے شدید اختلاف تھا، اس کا نام مسٹر جوگندر ناتھ منڈل تھا، وزیر خارجہ ظفر اللہ کو بنایا گیا جو ایسے متشدد قادیانی تھے کہ انھوں نے قاید اعظم کی نماز جنازہ پڑھنے سے بھی انکار کر دیا، پاکستان کے چیف جسٹس ایک عیسائی ''کارنیلیس'' رہے، نیز فوج تک میں عیسائی کمانڈر انچیف اور ملازم رکھے جاتے رہے ہیں۔

ج: انھوں نے ۱۱/ اگست کے لیے ایک خطاب ترتیب دیا (۱)، جس میں انھوں نے فرمایا:

> ''اب تم سب آزاد ہو اور پاکستان میں تمھیں اس بات کی پوری آزادی ہے کہ اپنے مندروں، مسجدوں، اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرو، ہمارا یہ بنیادی اصول ہے کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ یہ اصول مذہب، معتقدات اور ذات پات کے امتیاز سے بالا تر ہے، اگر ہم سب اس اصول کو اپنا معیار بنالیں تو مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان

---

(۱) ''خطباتِ قایداعظم'' مرتبہ رئیس احمد جعفری کے دو ایڈیشن مطبوعہ، مقبول اکیڈمی لاہور میرے سامنے ہیں۔ دونوں میں مجلس دستور ساز میں ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کے خطاب کے حوالے سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

دیکھیے: بار اول، صفحہ ۶۱۸

بار دوم، صفحہ ۵۷۷

اور یہی بیان ''قایداعظم اور ان کا عہد'' مؤلفہ رئیس احمد جعفری میں مطبوعہ مقبول اکیڈمی، لاہور میں ۱۱/ اگست کے ''پاکستان دستور ساز اسمبلی'' کے اجلاس کے خطاب کے ایک اقتباس کے طور پر دیا گیا ہے۔ صفحہ ۶۷۷ (ا۔س۔ش)

مسلمان! اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے اپنے مذہب پر قایم نہ رہیں گے، مطلب یہ ہے کہ سیاسی اعتبار سے اور پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہوں گے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے یہ ہر فرد کے ذاتی اعتقاد کا معاملہ ہے۔"

(محمد علی جناح۔ صفحہ ۲۹۶، ناشر مرکزی اردو بورڈ لاہور)

رازی کے اس جاہلانہ مضمون کی رو سے تو قایداعظم پر نص قرآنی سے فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ ۱۱ راگست کو ہی فرقہ بندی کا اعلان کرتے اور اسے خوب ہوا دیتے اور جب وہ مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتے تو خلفا کا شکر کرنا چاہیے تھا، مضمون نگار نے اس پر زور دینے کے لیے چار ورق سیاہ کیے ہیں۔

اور اسوۂ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی رو سے بھی بقول مضمون نگار قایداعظم کا فرض تھا، وہ یہ اعلان کرتے "اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔"

مضمون نگار نے جو کچھ حضرت مدنی کے بارے میں لکھا وہ مذکورہ کارروائیوں پر چسپاں ہوتا ہے، مضمون نگار نے اگر قایداعظم کو سمجھایا تھا، تو ہمیں جان کر خوشی ہوگی قایداعظم کی "ب" کی کارروائی اور "ج" کی تقریر کے بارے میں جب آپ شرعی احکام تلاش کرنے چاہیں گے کہ کون سی کارروائی شرعی ہے اور کون سی غیر شرعی؟ تو آپ کو مولانا کے اس رسالہ (متحدہ قومیت اور اسلام) کی قدر و منزلت معلوم ہوگی، اس میں دارالاسلام اور دارالحرب میں کافروں کے ساتھ محدود معاملات کا ذکر کیا گیا ہے، الفاظ وہی استعمال کیے گئے ہیں جو قرآن پاک اور احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اور احکام اسلامی سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا۔

معاہدوں میں زبان کی اہمیت:

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ شریعت مطہرہ کی نظر میں ایک مسلمان اور کافر کی گفتگو

کو بھی ذمہ :ازی سے خالی نہیں جانے دیا گیا ہے، یہ نہیں ہے کہ تحریر و دستخط شرط ہوں۔

بخاری شریف میں آتا ہے کہ **اذا قال مترس**.....الخ یعنی اگر باقاعدہ معاہدے یا فتح یابی سے پہلے کوئی مسلمان کسی کافر حربی سے یہ کہتا ہے کہ ''ڈرومت'' تو وہ امن میں ہوگا، اسے اب قتل کرنا بدعہدی ہوگا۔

آج کل ہمارا تصور فقط اس بات کو معاہدہ کا درجہ دیتا ہے جو تحریرا ہو اور دستخط ہو گئے ہوں۔

اخلاقی اقدار کے انحطاط نے زبان کی پابندی سے بالکل آزاد کر دیا ہے۔ حال آں کہ وہ مذہباً لازمی ہوتی ہے اور عہد کا درجہ رکھتی ہے دراصل ہم علم دین سے اس قدر بے بہرہ رہتے ہیں کہ ہمیں دین کی معلومات بھی جب پہنچائی جائیں تو وہ اجنبی لگتی ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح
(مختصر تعارف)

اس اعتراض برائے اعتراض پر مبنی مضمون کے خدوخال ظاہر کرنے کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود حضرت مدنی رحمہ اللہ کی شخصیت کے بارے میں چند باتیں جاننی ضروری ہیں۔

۱۔ان کا علمی مقام یہ تھا کہ اب سے ۵۴ سال پہلے وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور ۵۷ء تک ۳۲ سال اسی منصب پر فائز رہے۔

۲۔ دارالعلوم دیوبند مذہبی تعلیمات کا ایشیا بھر میں سب سے بڑا ادارہ تھا اور آج تک بھی وہ سب بڑا ادارہ ہے اور اس نقطۂ نظر سے کہ وہاں خالص علم دین ہی کی بصیرت پر دقیق علمی انداز میں تعلیم ہوتی ہے وہ پوری دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور وہاں طلبہ کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور استعداد سب سے اعلا ہوتی ہے، وہاں لایعنی ابحاث سبق مین نہیں آتیں۔ دیوبندی بریلوی کی بحث ہم نے وہاں نہیں دیکھی، اسی لیے بریلوی لوگ بھی وہاں پڑھتے رہے ہیں۔ پیر جماعت علی شاہ کی اولاد نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔

۳۔ حضرت مدنی سے ابتدائی زمانے میں فیض پانے والے حضرات کی عمر اس وقت تقریباً ۷۲ سال ضرور ہوگی اور آخری دور میں پڑھنے والوں کی عمر چالیس سال ضرور ہوگی یہ سب تجربہ کار اساتذہ ہوں گے۔

۴۔ پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش کے بڑے مدارس میں بہت کم ایسے مدرس ہوں گے جو ان سے پڑھے ہوئے نہ ہوں، بریلوی مدارس میں بھی ان کے شاگرد ملیں گے۔(دیکھیے جائزۂ مدارس عربیہ۔حافظ نذر احمد)

۵۔ یہ تو فقط وہ ہیں جنھوں نے ان سے براہ راست اکتساب فیوض کیا اور ان کے شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگرد چپہ چپہ پر ہیں، تینوں ممالک میں یہی حال ہے۔

۶۔ ان کے شاگردوں میں ایسے بھی ہیں جو شروع ہی سے مسلم لیگ میں رہے ہیں، جیسے مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ، لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جو حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اخلاص، للّٰہیت اور تقویٰ کے بارے میں دل سے معترف نہ ہو بلکہ زبان سے بھی اظہار نہ کرتا ہو۔

شیخ الاسلام مولانا مدنی اور حکیم الامت حضرت تھانوی:

آپ کے اس مضمون سے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا، جسے دکھ نہ پہنچا ہو۔

۷۔ وہ اپنی دینی استقامت و مجاہدات کی وجہ سے ہر شخص کو عزیز تھے اور تمام اکابر وقت کو بھی، جن میں حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ بھی ہیں، مثلاً انھوں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو تحریر فرمایا:

الف۔ کوئی مضمون دینی بدوں ملاحظہ مولانا حسین احمد صاحب کے شایع نہ کیا جائے۔ (حکیم الامت: صفحہ ۱۰۲)

ب۔ ایسی تحقیقات کے لیے مولانا حسین احمد صاحب، مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ (حکیم الامت: صفحہ ۱۳۲)

ج۔ اقبال سہیل صاحب نے حضرت مدنی کو خوش آمدید کہنے کے لیے ایک نظم لکھی، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کو پسند فرمایا اور فرمایا ''واقعی نفیس ہے اور لطف یہ کہ سلیس ہے، گویا سہل ممتنع ہے، میں نے نقل کر لی۔'' (حکیم الامت: صفحہ ۲۳۲)

عبدالماجد دریابادی نے لکھا۔ صحیح زبان میں اتنی صحیح مدح، صحیح موقعہ پر، صحیح شخص کے لیے شاعری کے عالم میں بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اللہ مادح کو جزاے خیر دے اور ممدوح کی عمر میں برکت نصیب فرمائے۔ (سچ لکھنؤ: ۲۰ مئی ۱۹۳۲ء)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظم نقل کر دی جائے۔ وہ یہ ہے:

اے سایہ ات بالِ ہما خوش آمدی خوش آمدی
اہلاً و سہلاً مرحبا خوش آمدی خوش آمدی
اے شمعِ ایوانِ حرم، اے سرو بستان حکم
اے خضر ارباب ہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی
اے خازنِ اسرارِ حق، اے مہبط انوارِ حق
اے حق پسند وحق نما خوش آمدی خوش آمدی
سرکردۂ ارباب دیں، سر دفترِ اہلِ یقیں
سرچشمۂ صدق وصفا خوش آمدی خوش آمدی
اے مستشارِ موتمن، اے مقتدائے ممتحن
اے بادل درد آشنا خوش آمدی خوش آمدی
اے قاسمِ فیضِ کہن اے ظلِ محمود الحسن
اے یادگارِ اتقیا خوش آمدی خوش آمدی
اے یوسف کنعانِ ما، بادا فدایت جانِ ما
ہاں اے اسیر مالٹا خوش آمدی خوش آمدی
اے رایتِ فتح مبیں، اے آیت علم و یقین
اے شمع جمعِ اصفیا خوش آمدی خوش آمدی
اے کنزِ اخبار نبی، مقبول سرکارِ نبی
اے پرتو شمعِ حرا خوش آمدی خوش آمدی
اے نازشِ خاکِ وطن، اے مرجع ارباب فن
اے دردِ دلہا را دوا خوش آمدی خوش آمدی
از مقدمت دل شاد شد، ویرانہ ام آباد شد
اے برتو چومن صد فدا خوش آمدی خوش آمدی
دلہا تہِ اقدام تو، وردِ زباں ہا نام تو

آید زہر سو ایں صدا خوش آمدی خوش آمدی
ایں گلشنِ علم و ہنر، شداز قدومت مفتخر
گوید ہمیں نور الہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی
(مکتوباتِ شیخ الاسلامؒ: جلد۲، صفحہ۴۲ حاشیہ)

حضرت مدنی سے حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ کے تعلق کا ان کی وفات تک یہی حال رہا ہے، حضرت کی حیات میں آخری بار جب (۱۹۴۲ء میں) حضرت مدنی جیل گئے تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی طبیعت پر اثر ہوا۔ انھوں نے فرمایا، مجھے خیال نہیں تھا کہ مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے، اور جب حاضرین مجلس میں سے کسی خادم نے عرض کیا کہ مولانا مدنی تو اپنی خوشی سے گرفتار ہوئے ہیں تو حضرت نے فرمایا:

"آپ مجھے اس جملہ سے تسلی دینا چاہتے ہیں، کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کے مقابلہ میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے؟ مگر آج تک کون ایسا شخص ہوگا، جس کو اس حادثہ سے رنج نہ ہوا ہو؟"

(بروایت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ بحوالہ "واقعات......" صفحہ ۳۰-۲۲۹)

ایک دفعہ ارشاد فرمایا "مولانا حسین احمد کی مخالفت کرنے والوں کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔" (بروایت ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب رحمہ اللہ بحوالہ "واقعات......" ص ۲۶۲)

حضرت مدنی رحمہ اللہ تا حیات ان کی اسی قدر تعظیم کرتے رہے ہیں، جس کے وہ اہل تھے۔ (دیکھیں مولانا مدنی کی خودنوشت "نقش حیات": صفحہ ۱۱۶، جلد ۱، اور مکتوبات شیخ الاسلام میں متعدد مکاتیب میں، خصوصاً صفحہ ۳۰۰، مکتوب نمبر ۱۱۹ جلد ۲)

حضرت مدنی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوری:

اشعار پر خیال آیا کہ اس وقت کے سب سے بڑے اور معروف بزرگ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"میرے اکابر، محض خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعہ ہے، اور جو بھی نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات وارشادات کا واقف ہوگا اور چند روز ان اکابر کی مجالس میں شرکت کر چکا ہوگا وہ خود محسوس کرے گا، کہ ان اکابر اعلیٰ اللہ مراتبہم کو اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل وکرم سے اتباع سنت کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ ان کے ارشادات بھی جواہر پارے ہوتے ہیں، اوران کا سکوت موجب ترقیات باطنی ہے۔ ان کے بارے میں جس شخص نے کہا ہے:

یہی ہے جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انھی کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انھی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انھی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزا آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

(موت کی یاد: صفحہ ۳، ناشر: شاہین ٹریڈنگ کمپنی، کمرہ نمبر ۴، شمس چیمبر، فریر روڈ۔ کراچی)

یحییٰ اعظمی کا خراج عقیدت:

یہ نظم مولانا محمد یحییٰ صاحب اعظمی نے حضرت مدنی رحمہ اللہ کے متعلق ''نوائے حیات'' میں ''ایک عالم ربانی کی اسارت'' کے عنوان سے لکھی تھی، اس کے کچھ اشعار یہ ہے ۔

وہ جس کی زندگانی کا شرف ہو اسوۂ یوسف
اسے ہوگی بھلا کیا سجن وزنداں سے پریشانی
پرستاران حق گھبرائیں کیوں اس یوسفستاں سے

یہ زنداں تو رہا ہے جلوہ گاہ ماہِ کنعانی
مبارک سرخوشان عیش کو کاشانۂ راحت
مجاہد کے لیے زیبا نہیں ذوق تن آسانی
وہ جس کی خلوتِ شب کی بدولت اب بھی تازہ ہے
گدازِ بوذر و عشقِ اویس و سوزِ سلمانی
صحابہ کی حیات پاک کو اس نے نہیں جانا
حقیقت میں یہ شانِ زندگی جس نے نہ پہچانی
شعار اس کا بزرگانِ سلف کا زہد و تقویٰ ہے
جہاد اس کا نہیں پابندِ قیدِ سبحہ گردانی
جدا ہے رسم و راہِ خانقاہی سے طریق اس کا
زمانہ سے الگ ہے اس کا آئین خدادانی

اس نظم کے یہ اشعار حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلامؒ جلد اول صفحہ ۳۲۶ میں ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام اور جاہ و مناصب کا آزمائش:

اگر ان میں کسی درجہ میں بھی جاہ طلبی، خود غرضی ہوتی تو اسارات مالٹا ہی کے زمانے میں وہ بڑے مناصب پر لگ سکتے تھے جس زمانے میں لوگوں کی صرف چار پانچ روپے ماہانہ تنخواہ ہوتی تھی، انھیں چالیس ہزار نقد اور پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ کی پیشکش کی گئی۔

۱۹۳۶ء میں سنبھل ضلع مرادآباد میں آپ نے اپنا واقعہ سنایا کہ:

"میں جب کراچی جیل سے رہا ہو کر آیا تو بنگال کونسل کے ایک ممبر نے مجھ سے کہا کہ چالیس ہزار روپے نقد اور ڈھاکہ یونی ورسٹی میں پانچ سو روپے ماہانہ کی پروفیسری آپ کے لیے ہے، آپ اس کو منظور فرمالیں! میں نے کہا کہ کام کیا کرنا ہوگا۔

ممبر صاحب نے فرمایا: کچھ نہیں! صرف تحریکات میں خاموش رہیں۔
میں نے جواب دیا کہ ''حضرت شیخ الہند'' جس راستے پر لگا گئے ہیں، میں اس سے ہٹ نہیں سکتا۔''
نوٹ: یہ ۲۳ء کی بات تھی اس وقت حضرت کے لیے ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا کچھ عرصہ بعد ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مشاہرے پر آپ سلہٹ تشریف لے گئے۔'' (واقعات: ۱۰۰-۹۹)

۸۔ اس سے چند سال بعد انھیں جامعۃ الازہر میں شیخ الحدیث بنانے کی حکومت مصر کی طرف سے پیشکش آئی۔ پندرہ سو روپے تنخواہ رہائش اور کار بذمۂ حکومت ہوگی۔ (واقعات......: صفحہ۱۰۱، مرتبہ: ابوالحسن بارہ بنکی، شائع کردہ، مکتبہ دینیہ، دیوبند)

مگر انھوں نے کوئی پیشکش قبول نہیں کی، ان کے پیش نظر اسلام کی سربلندی تھی، برطانیہ نے تمام مسلم ممالک پر تسلط جما رکھا تھا اور اس کی طاقت کا سرچشمہ سرزمینِ ہند تھی وہ اس جگہ سے اسے ہٹانا ضروری سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ اگر انگریز کے یہاں سے قدم اکھڑ گئے تو سب عرب ممالک بھی آزاد ہو جائیں گے۔ جو سب کے سب مسلم ممالک ہیں، آپ ان کے مکتوبات جو چار جلدوں میں ہیں اور ''نقش حیات'' ملاحظہ فرمائیں، جس میں انھوں نے یہ سب کچھ تحریر فرمایا ہے۔

اسی بنیاد پر انھوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی کی حرمت کا فتویٰ دیا، جو بغاوت پر آمادہ کرنے کا درجہ رکھتا تھا، کراچی میں مقدمہ چلا اور سزایاب ہوئے اور آپ پڑھتے آئے ہوں گے: ''افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر'' کی عملی شکل دنیا کو دکھادی۔

۹۔ برطانیۂ عظمیٰ کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد مولانا کو بھارت کی حکومت نے سب سے بڑا اعزازی خطاب دیا، جسے انھوں نے قبول نہیں کیا، انھوں نے بعد میں نہ وزارت لی، نہ وزراءِ مملکت سے ملاقاتیں جاری رکھیں، اگرچہ دیوبند میں صدر جمہوریہ اور مرکزی وزرا آتے رہے ہیں، لیکن مولانا نے ان سے قطعاً مراسم نہیں بڑھائے۔

یہ سب وہ باتیں ہیں، جو ان کی بے لوثی کے روشن اور دستاویزی ثبوت ہیں اور سب جانتے ہیں۔

۱۰۔ ان کی زندگی ایک کھلا ورق تھی، کثرت عبادت وریاضت سیاست کے شدید اور ہنگامی دور میں بھی قایم رہی اور بعد میں بھی، غرض اس باب میں وہ ہمیشہ عزیمت پر عمل پیرا رہے۔

۱۱۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، شمار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ایسی شخصیت کی طرف لوگوں کا رجوع بے حساب ہوتا ہے۔

تاریخ میں ایسی مثال اگر تلاش کریں کہ بہ یک وقت پانچ ہزار تا آٹھ ہزار لوگ لاوڈ اسپیکر سے کسی سے بیعت ہوئے ہوں تو شاید ان ہی کی مثال ملے گی اور یہ تاریخ تصوف کا سب سے پہلا واقعہ ہوگا۔

(حوالہ کے لیے دیکھیں انفاس قدسیہ: صفحہ ۲۲۸، مؤلفہ: مفتی عزیز الرحمن صاحب شائع کردہ، مدینہ بک ایجنسی بجنور)

ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ ان کی تحریرات کا مطالعہ کریں تو کسی بھی چیز میں غلط نتیجے پر نہیں پہنچیں گے۔

۱۲۔ بایں ہمہ وہ تمام اہم مسائل میں جو موقف اختیار کرتے تھے وہ شوریٰ سے طے کیا جاتا تھا، اس لیے وہ انفرادی غلطیوں سے ہمیشہ ہی بچے رہے ہیں۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ اور مملکت پاکستان:

ان کی بے لوثی کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ پاکستان بن جانے کے بعد انھوں نے اپنے متعلقین کو پاکستان کے استحکام وترقی کے لیے کام کرنے کی تلقین کی ہے، حتیٰ کہ انھوں نے پاکستان کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ ''مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔''

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر: جلد ۴۳، بروز ہفتہ ۲۵ رجب ۱۳۷۷ھ، ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱، کالم ۱)

مدنی کا فارمولا:

لہٰذا اس مسئلہ میں بھی یہ بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ انھوں نے مملکت پاکستان کی نہ مخالفت کی ہے نہ کمزوری چاہی ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت برصغیر آزاد ہورہا تھا تو مسلمانوں کے لیے فلاحی خاکے ہر ایک نے پیش کیے انھوں نے (جمعیت علماے ہند نے) بھی اپنا فارمولا پبلک کے سامنے پیش کیا اور پاکستانی فارمولے پر ان کا صرف اسی قدر اعتراض تھا کہ یہ پورے ہندوستان میں آباد کل مسلمانوں کا حل نہیں ہے، ہندوستان کے باقی صوبوں میں تین کروڑ انتیس لاکھ مسلمان ہندوؤں کی اکثریت کے رحم وکرم پر رہ جائیں گے۔

(یہ تعداد تو اس صورت میں تھی کہ اگر صوبہ آسام پورا بنگال اور کشمیر پاکستان میں آتا، بصورت موجودہ آسام کے چونتیس لاکھ بنگال کے تین کروڑ تیس لاکھ میں سے کم از کم ایک کروڑ اور نصف یا کچھ زاید کشمیر کے مسلمان ملا کر پانچ کروڑ مسلمان بنتے ہیں جو اکثریت کے رحم وکرم پر ہیں)۔

یہ اعداد وشمار سینسز آف انڈیا ۱۹۴۱ء صفحہ ۹۸، ۹۹ حصہ اول، جلد اول مرتبہ: ایم ڈبلیو ایم یائیس (سی آئی اے سی ایس) سینسز کمشنر آف انڈیا سے لے کر انھوں نے تحریر فرمائے ہیں۔

قاید اعظم اور ڈھائی کروڑ مسلمانوں کی قربانی:

مولانا کی تحریر ''کشف حقیقت'' صفحہ ۱۸، ۱۹ ملاحظہ فرمائیں، یہ رسالہ مرکزی دفتر جمعیت علماے ہند دہلی سے شایع ہوا ہے، ان کا موقف یہ تھا کہ ایسا حل تجویز کیا جائے جس میں سب مسلمانوں کو تحفظ حاصل ہو، قاید اعظم نے جولائی ۴۴ء کان پور میں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میں مسلم اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو قربان کر کے ان

کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

اس لیے حضرت مولانا نے قاید اعظم کے سامنے مصدقہ اعداد و شمار رکھے کہ اگر جوش تقریر میں یہ اعداد و شمار زبان سے نکل گئے ہیں، تب تو اور بات ہے لیکن اگر اعداد و شمار پوری توجہ سے جمع نہیں کیے گئے تو اس طرف توجہ دلائی جانی ضروری ہے در حقیقت صحیح اعداد یہی تھے جو مولانا نے پیش کیے کیوں کہ اب ہندوستان میں تعصب کے باوجود حکومت آٹھ کروڑ تسلیم کرتی ہے اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم بارہ کروڑ ہیں(۱)۔

قاید اعظم اور جمہوریت:

نیز قاید اعظم نے ۱۹۴۵ء سے جمہوریت کے حق میں بیان دینا شروع کیا تھا، ماہ نومبر ۴۵ء میں نمایندہ نیوز کرانیکل کو بیان دیا کہ:

"پاکستان ایسی جمہوری حکومت ہوگی کہ اس کی مجلس قانون ساز میں بلا لحاظ مذہب سب شریک ہوں گے۔"

۸؍نومبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمایندہ کو جمہوریت ہی کے بارے میں بیان دیا جو بہت مفصل ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ پاکستان کے تمام ہندو مسلم سکھ عیسائی ایک قوم کے اصول پر ترقی کریں گے

یہ بیان ۷ دفعات پر مشتمل ہے ۱۰؍نومبر ۱۹۴۵ء کو ڈان میں طبع ہوا ہے، اسی حوالہ سے ۱۷؍نومبر ۱۹۴۵ء کو اردو کے معروف اخبار "مدینہ بجنور" میں شایع ہوا۔

مذکورہ صورت میں جمہوریت سے پاکستان میں بھی مسلمانوں کا نفع کلی طور پر مخدوش ہو جاتا تھا، کیوں کہ بنگال، آسام اور پورے پنجاب سمیت عظیم پاکستان میں

---

(۱) ایک اور حوالے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا سولہ کروڑ مسلمانوں کی تعداد کو تسلیم کرتی ہے اور مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بیس کروڑ سے زیادہ اور دنیا میں تمام مسلم اکثریت کے ممالک سے بڑی انڈین اقلیت ہیں۔ (ا-س-ش)

ساڑھے پچپن فی صدی مسلمان تھے اور ساڑھے چوالیس فی صدی غیر مسلم، یہ غیر مسلموں کا اتنا بڑا تناسب بیٹھتا تھا کہ وہ جب چاہتے ''ڈیڈلاک'' کی کیفیت پیدا کر سکتے، ادھر ہندوستان (بھارت) میں مسلمان صرف گیارہ فی صدرہ جاتے تھے، جو بالکل غیر محفوظ، غیر مؤثر نہایت کم اور کمزور اقلیت ہوتے۔

جمعیت علماے ہند کا نقطۂ نظر:

مولانا شاہ محمد الفاروقی سجادہ نشین دایرۂ حضرت شاہ محمد حجۃ اللہ صاحب الہ آباد اپنے خطبۂ صدارت میں جو جمعیت علما صوبۂ آگرہ کے اجلاس میں بمقام مراد آباد ۲۶ تا ۲۹ رمئی ۱۹۳۹ء (ماخوذ از کشف حقیقت) مطابق ۶ تا ۹ رربیع الثانی ۱۳۵۸ء کو شاہی برقی پریس، مراد آباد میں طبع ہو کر پڑھا گیا لکھتے ہیں:

> تحریک پاکستان ہمارے درد کا درماں نہیں یہ تحریک تو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے علاوہ دیگر حصص ہند کو نظر انداز کرتی ہے، حال آں کہ اصل مسئلہ تو ان مسلمانوں کا ہے جو تعداد کے لحاظ سے اپنے صوبوں میں اقلیت میں ہیں۔ اکثریت والے صوبے اگر زندہ اور وفاق ہند کے اجزا رہیں تو ہمارے حق میں مؤثر ہو سکتے ہیں۔ علیحدگی کی صورت میں تو افغانستان و ایران کی طرح بے اثر ہوں گے۔ (خطبۂ صدارت: صفحہ ۱۱)

لہٰذا ان حضرات نے ہندوستان کے کل مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے ان کی فلاح و بہبود دیانتاً اس صورت میں سمجھی تھی کہ صوبائی خودمختاری طے ہو اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں مذہبی امور میں مسلمانوں کو حق استرداد حاصل ہو وغیرہ۔ ان کی سیاست مثبت تھی، مدلل تھی، منفی اور سلبی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی تحریر ''کشف حقیقت'' میں دونوں فارمولوں پر بحث و تمحیص اور موازنہ کرنے کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی صدر جمعیت علماے اسلام کو لکھا کہ:

''اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح طریق کار یہ ہے کہ مسلمانوں اور مسلم جماعتوں

کے نمایاں اصحاب راے اور صائب الراے حضرات مجتمع ہوں اور موجودہ صورت حال کا جایزہ لے کر کھلے دل و دماغ کے ساتھ یہ سوچیں اور غور کریں کہ ہندوستان کے لیے باعزت مقام کس طرح مل سکتا ہے اور اس کے حصول کے لیے کیا طریق کار ہو؟ پس اگر مسلم لیگ اس صورت کے لیے آمادہ ہے تو بسم اللہ ہم سب حاضر ہیں، اگر حضرت مولانا لیگ کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں تو چشم ماروشن دل ماشاد۔" (کشف حقیقت کا آخری صفحہ نمبر ۹۳)

حضرت مدنیؒ کے متوسلین اور پاکستان:

پاکستان بن جانے کے بعد انھوں نے دیا تھا یہی سمجھا اور یہی اپنے متوسلین کو سمجھایا کہ پاکستان کے استحکام میں سب کی بھلائی ہے۔ بحمد اللہ مولانا مرحوم کے متوسلین میں سے آپ کو کوئی بھی بھاشانی، مجیب، اور بھٹو نہیں مل سکتے اور ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں، چاہے وہ سیاسی میدان میں ہوں اور چاہے وہ علمی اور تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہوں۔

میں یہ بھی گذارش کرنی چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں یہ الفاظ عام طور پر بولے جانے لگے ہیں۔ ملک دشمن، عذار، ملک کی سلامتی خطرہ میں ہے، ملک دشمن سرگرمیاں وغیرہ، اور یہ الفاظ حکام بھی استعمال کرتے ہیں اور اخبارات بھی! ان کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے، اور شاید دنیا کے کسی ملک میں ان الفاظ کا عام استعمال نہیں ہے، ہمارے یہاں اتنا عام ہے کہ سننے والوں کے ذہن میں ان کی اہمیت ختم ہوتی جارہی ہے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کا حق

(تاریخی اور شرعی نقطۂ نظر)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا عمل دخل باقی رکھنے کے قائل تھے، وہ پورے ہندوستان پر پنجہ جمائے رکھنا چاہتے تھے، ان کے بہت پرانے مضامین میں بھی یہی کچھ ملتا ہے۔ ان کے ایک مختصر مضمون سے ان کا نقطۂ نظر سمجھا جاسکتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے باشندوں میں صرف مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا قدیمی آبائی وطن کہیں اور وہ اس میں حق بجانب ہیں، ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انسانی نشو ونما فقط حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے، یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ باقی اقوام ہندیہ اس کی قائل نہیں ہیں۔ اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی انھوں نے سکونت کی اور یہاں ہی سے ان کی نسل دنیا میں پھیلی اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے، چناں چہ ''سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان'' میں متعدد روایات اس کے متعلق مذکور ہیں۔ بائبل میں بھی اس کے حصہ ''عہد قدیم'' میں یہی ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول: ص ۸۰ پر ہے:

ونزل آدم بالهند ونزل معه الحجر الاسود وقبضة من ورق الجنة فنشر بالهند فنبتت شجرة الطيب فانما اصل مايجاء به من الطيب من الهند من قبضة الورق التي هبط بها آدم و انما قبضها اسفا على

الجنة حين اخرج منها. وقال عمران ابن عينيه عن عطا بن السائب عن سعید ابن جبیر عن ابن عباس قال اهبط ادم بدحنا الارض الهند...... الخ

''حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں اترے اور ان کے ساتھ حجر اسود اور ایک مٹھی جنت کے پتے تھے انھوں نے انھیں ہندوستان میں بکھیرا تو اس سے خوش بو کا پودا پیدا ہو گیا تو اصل خوش بو جو ہندوستان سے لائی جاتی ہے اسی جنت کے پتوں کی مٹی سے پیدا ہوئی ہے، جسے حضرت آدم لے کر اترے تھے۔ یہ انھوں نے جنت چھوڑنے کے تاسف میں لیے تھے، جس وقت وہ اس سے نکالے گئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین دحنا میں اتارے گئے۔''

سبحۃ المرجان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا یہاں پھیلنا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے، بناء بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے مطابق عہد قدیم سے ہندوستان مسلمانوں ہی کا آبائی وطن ہوگا، جو لوگ انسانی اور اپنی نسل کو ایسا نہیں مانتے وہ اس دعوے کے مستحق نہیں ہیں اور مسلمانوں کے لیے اس کو اپنا وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے۔

بحیثیت مذہب بھی ہندوستان مسلمانوں کا ہی وطن ہے، حسب تعلیمات اسلامیہ اور تصریحات قرآنیہ جتنے پیغمبر اور ان کے جانشین دنیا میں ہوئے ہیں، سب کا مذہب اسلام ہی تھا، حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد بھی اسلام کے پیرو تھے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً. (سورۂ یونس: ۱۹)

''اور لوگ صرف ایک ہی امت تھے۔''

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ. (سورۂ بقرہ: ۲۱۳)

''سب لوگ ایک دین پر تھے۔''

اور اس کے بعد جب تفرقے ہوئے تو جہاں جہاں بھی انسانی نسلیں تھیں، وہاں

پیغمبر اور ان کے سچے جانشین بھیجے گئے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ O (سورۂ رعد: ۷)

"اور ہر قوم کے لیے راہ بتلانے والا ہے۔"

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ O (سورۂ فاطر: ۲۴)

"اور کوئی فرقہ نہیں جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہوا۔"

اور سچے پیغمبر اور ان کے سچے جانشین سب کے سب دین اسلام ہی رکھتے تھے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا۔ (سورۂ شوریٰ: ۱۳)

"تمھارے لیے دین میں وہی راہ مقرر کر دی جس کا نوح کو حکم کیا تھا۔"

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔ (آل عمران: ۱۹)

"اللہ کے یہاں دین یہی مسلمانی حکم برداری ہے۔"

وغیرہ آیات اور احادیث بکثرت اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں بھی قبل زمانۂ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء آئے ہوں چناں چہ اولیاء اللہ ہندوستان میں مختلف مقامات پر انبیاء علیہم السلام کی قبریں بطور کشف و الہام اور روحی ملاقات سے معلوم کی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور مرزا مظہر جان جاناں رحمہم اللہ اور دیگر بزرگوں کی تصانیف میں اس کی تصریحات موجود ہیں مگر جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے تحریف وغیرہ کر کے شرک اور کفر وغیرہ اختیار کر لیا اسی طرح ہندوؤں نے بھی اختیار کیا، چناں چہ مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ اس کی تفصیل اپنے بعض مکتوبات میں پوری طرح فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قدیم زمانے سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ ہے لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بحیثیت مذہب ابتدا سے ہی یہ ملک اسلام کا وطن ہے۔

بحیثیت سکونت جسمانی:

مسلمانوں کے سوا جو قومیں ہندوستان میں سکونت پذیر چلی آتی ہیں وہ عموماً

مردوں کو جلا ڈالتی ہیں اور ان کی راکھ کو دریا میں بہا دیتی ہیں یا پارسی اپنے مردوں کو پرندوں کو کھلا دیتے ہیں بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں بھی مثل دیگر اقوام رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی سکونت یہاں ہی رہی، ان کی قبریں محفوظ رکھی جاتی ہیں، مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت میں ان ہی قبروں سے ان کے مردے اٹھیں گے اور جو اجزا جسم کے قبر میں مٹی ہو گئے تھے انھیں اجزا سے ان کا جسم پھر بنایا جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں قیامت تک کے لیے ہے، بخلاف دوسری اپنے مُردوں کو جلانے والی یا پرندوں کو کھلانے والی قوموں کے کہ ان کی سکونت جسمانی صرف دنیاوی زندگی تک کے لیے ہے اور بس! اسی وجہ سے ان کے اسلاف کا کوئی نام ونشان کسی جگہ پایا نہیں جاتا اور مسلمانوں کے قبرستان، روضے، قبے، زیارت گاہیں وغیرہ وغیرہ ہر جگہ موجود ہیں اور مسلمان ان تاریخی یادگاروں کی حفاظت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

بحیثیت تعلقات روحانی:

غیر مسلموں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روحیں تناسخ (آواگون) کے ذریعے سے جزا اور سزا بھگتتی ہیں، اس لیے وہ کسی دوسرے جون (قالب) میں ڈال دی جاتی ہیں، خواہ وہ انسانی ہو (اگر عمل اچھے تھے)۔ خواہ وہ حیوانی یا نباتی یا حشرات الارض وغیرہ کا ہو (اگر عمل خراب تھے) پھر انسان اگر بنایا گیا تو کوئی خصوصیت نہیں کہ وہ ہندوستان ہی میں پھر پیدا ہو۔ افریقہ، امریکہ، یورپ، آسٹریلیا، وغیرہ جہاں پر ماتما چاہے اس کو اس کے عمل کے مناسب بھیج دے۔ غرض یہ کہ مرنے کے ساتھ ہی اس کی روح کا تعلق جسم اور اس کے اجزا سے بھی بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے، نیز اس کے گاؤں، شہر، دیس، قوم، جاتی وغیرہ سب سے منقطع ہو جاتا ہے، بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک روح کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ صرف

ایک دفعہ ہوتا ہے موت کے بعد وہ برزخ میں محفوظ کردی جاتی ہے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزا کا کچھ حصہ وہاں بھی حاصل کرتی رہتی ہیں، اس کا نہایت ضعیف تعلق اپنے بدن اور اس کے اجزا اور اپنی قبر، وطن، برادری، اولاد وغیرہ سے رہتا ہے، یہ تعلق اگر ایک درجے میں نہیں ہوتا، تاہم کسی نہ کسی درجے میں تفاوت کے ساتھ باقی رہتا ہے اور اسی تعلق سے قیامت میں یہ روح اس قبر پر پہنچے گی اور اس کے اجزاے سابقہ کا جسم بنے گا اور وہ اس میں حلول کر کے پھر زندگی جسمانی حاصل کرلے گی، جس طرح ہم اگر دنیا میں اپنے گھر اور اہل وعیال کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں، تو ہمارا تعلق اپنوں اور اپنے گھروں اور بستیوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ رہتا ہے، ایسا ہی یا اس سے زاید تعلق مرنے کے بعد روحوں کو بھی سب سے رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قبروں کی زیارت کرنے اور اصحاب قبور کو سلام کرنے اور ان کو دعا اور ایصال ثواب وغیرہ کرنے کا حکم ہوا۔ نیز حکم ہوا کہ لوگ اپنے اسلاف اور عام مؤمنین کی قبروں کی زیارت کرتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی پر عبرت کے آنسو بہائیں اور گزرے ہوئے لوگوں کے لیے دعائیں کریں۔

یہ چیز ان مرگھٹوں میں کہاں نصیب ہوسکتی ہے، جہاں کی باقیماندہ راکھ کو بھی دریا بہا کر لے گئے، اور سمندروں کی نذر کر چکے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ علیہ تفسیر عزیزی پارہ عم میں صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں:

"نیز در سوختن بآتش تفریق اجزاے بدن میت است کہ بسبب آن علاقۂ روح از بدن انقطاع کلی می پذیرد و آثار ایں عالم بآں روح کم تر می رسد کیفیات آں بروح بایں عالم کمتر سرایت می کند و در دفن کردن چوں اجزاے بدن بتمامہ یکجا می باشد علاقۂ روح با بدن از راہ نظر وعنایت بحال می ماند وتوجہ روح بزائرین مستانسیں و مستفیدین بسہولت می شود کہ بسبب تعین مکان بدن گویا مکان روح ہم متعین است و آثار ایں عالم از صدقات و فاتحہ ہا و تلاوت

قرآن مجید چوں درآں بقعہ کہ مدفن بدن اوست واقع شود بسہولت نافع می شود۔ پس سوختن گویا روح را بے مکاں کردن است و دفن کردن گویا مسکنے برائے روح ساختن بناء بریں است کہ از اولیاء مدفونین و دیگر صلحاء مؤمنین انتفاع واستفادہ جاری است و آنہارا افادہ و اعانت نیز متصور، بخلاف مردہ ہائے سوختہ کہ ایں چیز ہا اصلا نسبت بآنہا در اہل مذہب آنہا نیز واقع نیست بالجملہ طریق قبر و دفن نعمتے است عظیم در حق آدمی۔"

"نیز آگ میں جلانے میں میت کے اجزا کو منتشر کرنا ہے، اس کی وجہ سے روح کا تعلق بدن سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور اس عالم کے اثرات اس روح تک بہت کم پہنچتے ہیں اور اس روح کی کیفیات اس عالم میں بہت کم سرایت کرتی ہیں اور دفن کرنے میں چون کہ جسم کے اجزا بتمامہ یک جا رہتے ہیں روح کا تعلق بدن سے خبر گیری اور توجہ کا ایک حالت کا رہتا ہے اور روح کی توجہ آنے والوں، مانوس ہونے والوں اور فایدہ حاصل کرنے والوں کی طرف بسہولت ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ بدن کی جگہ کے مقرر ہونے کی وجہ سے گویا روح کی جگہ بھی مقرر ہوتی ہے اور اس عالم کے اثرات فاتحہ، صدقات اور تلاوت قرآن پاک جب اس جگہ کہ جو بدن کا مدفن ہے پہنچتے ہیں تو وہ بسہولت نفع بخش بن جاتے ہیں لہٰذا جلانا ایسا ہے، جیسے روح کو بے جگہ کر دیں اور دفن کرنا ایسا ہے جیسے روح کا مسکن بنا دینا۔ اسی بنا پر اولیا اور دوسرے مؤمنین صالحین سے انتفاع واستفادہ جاری رہتا ہے اور یہ بھی متصور ہے کہ یہ روحیں فایدہ پہنچائیں اور اعانت کریں، بخلاف جلے ہوئے مردوں کے، یہ چیزیں بالکل ان کے مذہب میں بھی واقع نہیں ہوئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قبر بنانے کا طریقہ اور دفن کرنا آدمی کے حق میں بڑی نعمت ہے۔"

پہلے پیرے کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر روحوں اور اہل دنیا کے لیے ریڈیو اور آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے صندوق اور تار، ہوائی لاسکی اور ٹیلی گراف اور ٹیلی فون

کے آفس کی طرح ہے، جس میں ایک درجہ تعلق ہر دو طرف سے رہتا ہے اور اس تعلق ہی کی وجہ سے افادہ و استفادہ ہوتا ہے، اگر چہ وہ تعلق دنیاوی تعلق سے بہت کمزور بھی ہے اور ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے قوی بھی ہو۔

دوسرے پیرے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانون کو مرنے کے بعد بھی اس ملک اور اس کی زمینوں کے ساتھ روحانی تعلق اس قدر قوی اور باقی رہتا ہے کہ دوسری قوموں اور مذاہب میں نہیں پایا جاتا ہے اور وہ قومیں اپنی مذہبی حیثیت سے اس کی قائل بھی نہیں ہیں، لہٰذا یقیناً مسلمانوں کو ہی حق ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن اور سب سے زیادہ اپنا وطن سمجھیں۔

بحیثیت انتفاع اور احتیاج بجانب اجزاے وطن:

اسلامی تعلیم اور عقاید کی حیثیت سے ایک وقت آنے والا ہے جب کہ تمام انسان پھر زندہ کیے جائیں گے اور ان کے اجسام کے جو اجزا متفرق ہو کر مٹی وغیرہ میں مل گئے تھے، جمع کیے جائیں گے اور جسم بن کر اسی روح کو اس میں داخل کیا جائے گا اور اس جسم کے ساتھ وہ محشر میں اور جنت میں جائیں گے۔ اس لیے وہ وطن جس میں وہ پرورش پاتے تھے جیسے کہ دنیاوی زندگی میں نفع اٹھانے اور ہر قسم کی حاجتوں کا مرکز تھا مرنے کے بعد بھی ایک درجہ تک نفع اٹھانے اور احتیاج کا مرکز رہے گا اور اس کی اس مٹی سے جو کہ بعد از دفن قبرستان میں دوسری مٹی سے مل گئی تھی نفع اٹھائے گا، بخلاف دوسرے باشندگان ہند کے کہ وہ ایسا اعتقاد نہیں رکھتے ان کے اعتقاد میں ان کی روحیں دوسری مٹی سے بنے ہوئے جسموں میں داخل ہو کر ان جسموں سے تعلق قایم کرتی ہیں اور ان کی پرورش میں سرگرم ہو کر پہلے اجزاے جسمانیہ سے بالکل بیگانہ ہو جاتی ہیں، کبھی ہندوستان میں ہیں، کبھی چین میں، کبھی جاپان میں، کبھی انگلینڈ میں، کبھی فرانس مین، کبھی انسان میں، کبھی حیوان میں۔

ہندوستان کے دوسرے باشندے اور مسلمان:

جس طرح آرین، شہبین، یونانی، مصری، منگولین وغیرہ قومیں ہندوستان میں آکر بسیں اور انھوں نے یہاں کھیتیاں کیں، باغ لگائے، مکان بنائے، بودو باش اختیار کی، اسی طرح مسلمانوں نے بھی یہاں پہنچ کر یہ اعمال وطنیہ اختیار کر لیے کسی کو ہزار برس، کسی کو نو سو، کسی کو آٹھ سو برس یا کم وبیش ہو گئے۔ پشت ہا پشت یہاں گزر گئیں، اس لیے دنیاوی زندگی اور اس کے لوازم کی حیثیت سے مسلمان کسی قوم کے پیچھے نہیں ہیں، بالخصوص وہ اقوام جو کہ پہلے سے بھی ہندوستان کی باشندہ ہیں، مذہب اسلام کی حقانیت دیکھ کر پہلے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی حلقہ بگوش ہوئی ہیں (اور وہی عنصر آج مسلمانان ہند میں غالب ہے) لہٰذا کسی دوسری قوم کو حق نہیں ہے کہ وہ آج یہ دعوے کرے کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں ہے، صرف ہمارا وطن ہے، ہندوستان کی بہبودی میں جس طرح دوسری قوموں کی بہبودی ہے اسی طرح مسلمانان ہند کی بھی بہبودی ہے، لہٰذا یقیناً اس حیثیت سے بھی ہندوستان مسلمانوں کا یہ وطن عزیز اور پیارا ہے نہ مسلمان اس کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ جائیں گے اور نہ کوئی دوسرا وطن ان کو اپنے آغوش میں لے سکتا ہے، نو کروڑ مسلمانوں سے کیوں تعلقات رکھتے ہیں اور ان کی مصیبتوں پر بلبلا اٹھتے ہیں تو یہ اس روحانی ملی تعلق کی بنا پر ہے جو کہ اتحاد ازم اور توافق مذہب کی بنا پر دوسری جگہ کے مسلمانوں سے پیدا ہوا ہے اور جس کی تعلیم بھی روحانی ترقی کرتی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری قوموں کو ساؤتھ افریقہ، فیجی، ماریشیس، ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ان ہندوستانیوں سے ہوتا ہے جو کہ ان ملکوں میں بودو باش کیے ہوئے ہیں، اگر وہاں پر کسی قسم کے مظالم ان ہندوستانیوں پر ہوتے ہیں، تو ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں بے کلی پیدا ہو جاتی ہے، یہ امر مسلمانان ہند کو ہندوستانی وطنیت اور اس پیار ومحبت سے بیگانہ نہیں بناتا۔

نوٹ: امور مذکورہ بالا کی بنا پر ممکن ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک وطن سے منتقل ہو کر دوسرے وطن میں چلے جائیں مگر مسلمانان ہندوستان کو یہاں سے منتقل

ہونا ازبس مشکل ہے، نہ وہ اپنی مساجد سے بیگانگی اختیار کر سکتے ہیں، نہ اپنے مقابر سے، نہ اپنی زمینوں سے اور نہ اپنے گھر بار سے اور نہ ان میں اس قدر استطاعت ہے۔

اس مضمون سے ان اکابر کا نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے جو پورے ہندوستان کو ایک مورچہ سمجھتے تھے اور آگے ہی بڑھنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل

اس نقطۂ نظر کے ثمرات:

حضرت مدنی کا مسلم لیگ کی تجویز سے اسی ایک اہم نکتہ پر اختلاف تھا کہ پاکستان کا فارمولا کل مسلمانان ہند کی مشکلات کا حل نہیں ہے، مولانا حفظ الرحمن صاحب اپنے رسالہ ''تحریک پاکستان پر ایک نظر'' کے آخر میں ''پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں، جمعیت علماے ہند کے اجلاس ۱۹۴۲ء کا فیصلہ اور مئی ۱۹۴۵ء کا تشریحی اضافہ ایسا فارمولا ہے، جس سے فارمولاے پاکستان کے تمام فایدے حاصل ہو سکتے ہیں، مزید برآں پورے ہندوستان میں ان کا رسوخ اور ان کی قوت باقی رہتی ہے:

جمعیت علماے ہند کا فارمولا:

الف۔ ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

ب۔ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی، وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

ج۔ ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے، اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے، جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالہ کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

د۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق جزوی اور مفید

ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو ایک لحہ بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح: اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے، کیوں کہ اس کے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہے مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کرلیا جائے، اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے باہمی افہام و تفہیم سے مندرجۂ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے ممکن ہے۔

۱۔ مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو، ہندو ۴۵، مسلم ۴۵ دیگر اقلیتیں ۱۰۔

۲۔ مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳، اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

۳۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قایم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد

کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے تحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳، اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

۴۔ یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

مجلس عاملہ اجلاس سہارن پور کے منظور کردہ فارمولا کی چند دفعات:

۱۔ ہندوستان کی مختلف ملتوں کی کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی عقاید، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے، حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

۲۔ دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہوگی، کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی۔ (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین ومفقود وغیرہ، نفقہ، زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح، وصیت، وقف، وراثت، تکفین وتدفین، قربانی وغیرہ۔

۳۔ مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

خادم ملت محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ
ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے ہند۔ دہلی

تحریک پاکستان پر ایک نظر، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، شائع کردہ دفتر جمعیت علمائے ہند۔ دہلی، ص ۶۴۔۶۱

اس فارمولے کے مفادات شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں

الف۔اہم پورٹ فولیو (قلم دان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی۔

ب۔صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعاً خودمختار ہوتے۔

ج۔پورا صوبہ پنجاب راول پنڈی سے لے کر ضلع سہارن پور کی سرحد تک۔

د۔پورا صوبہ بنگال جس کا دارالحکومت کلکتہ عظیم شہر ہے مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا، صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی ہوتا، کیوں کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۳۴، ۳۵ فی صد ہیں۔

و۔ہندوستان کے باقی صوبوں میں بھی مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے کیوں کہ

ا۔ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق تیس یا تینتیس فی صد ہوتا وزارتوں میں ان کی مؤثر شمولیت ہوتی۔

۲۔مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور مین ان کو حق استرداد حاصل ہوگا۔

۳۔وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فی صد ہوتی اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی، کیوں کہ اسمبلی، پارلیمنٹ یا کیبنٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کرسکتی۔

جمعیت کے وفد کی کابینہ مشن سے ملاقات:

۱۶/ اپریل ۱۹۴۶ء کو چار بجے شام سے سواپانچ بجے تک مشن سے ملاقات

ہوئی جمعیت علماء کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی نصف گھنٹہ سے زاید پینتالیس منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کردیئے......

...... ١٦ر مئی ٤٦ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انھیں لائنوں اور انھیں خطوط پر تھیں...... جن کی طرف جمعیت علماء ہند کا فارمولا اشارہ کررہا تھا اور ان ہی سفارشات کی بنیاد پر ٢ر ستمبر ٤٦ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ١٤ ممبروں میں سے پانچ مسلمان تھے، یعنی ٣/١ سے کچھ زیادہ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

(ماخوذ از مجاہد ملت نمبر صفحہ ٦٠۔ ٥٨ مطبوعہ دفتر جمعیت علماء ہند۔ دہلی)

ممکن ہے آپ کو یہ معلومات نئی اور اجنبی لگیں لیکن ایسا نہیں ہے اس دور کے رسائل لوگوں کے پاس موجود ہیں، انھیں دیکھیں گے جو ہم نے لکھا ہے اس سے زیادہ اور بہتر ہی مواد ملے گا۔

یہ معلومات پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں سے جو ذہنوں میں بلاوجہ بدگمانی یا کدورت ہے اور ان کے بارے میں یہ خام خیالی ہے کہ عالمی سیاست پر ان کی نظر نہ تھی اور یہ اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کی بات کرتے تھے، ان کی فکر ہندو ذہن کے تابع تھی، بے سوچے سمجھے اور مسلمانوں کے نفع نقصان سے قطع نظر کرکے کانگریس کا جزو بن گئے تھے یا یہ کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس ملک کی بربادی کے خواہش مند تھے اس قسم کے باطل خیالات کا ازالہ ہوسکے اور ان حضرات کی علمی، فکری اور روحانی حیات کا مختصر سا خاکہ سامنے آجائے۔

مسلم لیگ اور حضرت مدنیؒ

ایک اور معاملہ پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالنی مفید معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مسلم لیگ سے قوی ترین رشتہ رہ چکا تھا، ہوا یوں کہ مسٹر جناح ۱۹۲۸ء میں سیاست سے مایوس ہو کر لندن چلے گئے تھے۔ جیسے کہ ان کے سوانح نگاروں نے بھی لکھا ہے پھر اکتوبر ۳۴ء کے بعد وہ واپس آئے، اس وقت وہ جمعیت علماے ہند کے اجلاس میں بلا دعوت ہی ایک بار شریک ہوئے، پھر انھیں دعوت دی جانے لگی، اس کے بعد آپس میں تعاون اس شرط پر طے ہو گیا کہ انگریز نواز لوگوں کو مسلم لیگ میں نہ رکھا جائے گا۔

مسٹر جناح بھی انھیں رجعت پسند کہتے تھے، انھوں نے کہا میں ان رجعت پسندوں سے عاجز آ گیا ہوں اور ان کو رفتہ رفتہ لیگ سے خارج کر کے آزاد خیال ترقی پسند لوگوں کی جماعت بنانی چاہتا ہوں۔

آپ لوگ اس جماعت مین آجائیں، ان حضرات نے کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو خارج نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟ تو فرمایا کہ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو تم لوگوں میں آجاؤں گا، اور لیگ کو چھوڑ دوں گا۔ مولانا شوکت علی صاحب مرحوم اور دیگر حضرات نے اس شرط پر تعاون کیا۔ مسٹر جناح نے جمعیت کا تیار کیا ہوا منشور قبول کیا اور اسی کو تیج میں شایع کیا جس کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں اگر کوئی خالص مذہبی مسئلہ پیش ہوگا تو جمعیت علماے ہند کی راے کو خاص وقعت اور اہمیت دی جائے گی۔

الیکشن کے لیے جد و جہد کی گئی، حتیٰ کہ مسلم لیگ کے بہت نمایندے کامیاب ہوئے۔

چودھری خلیق الزمان نے حضرت مدنی رحمہ اللہ کو لکھا ہے کہ ''آپ نے تیس برس

کی مردہ لیگ کو زندہ کیا ہے۔" (ملخصاً از مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول، صفحہ: ۶۱۔۳۶۰)

لیکن وہ لوگ مسلم لیگ میں رہے بلکہ جن جماعتوں سے مسلم لیگ کا مقابلہ تھا وہ بھی اس میں آ گئیں، مثلاً ایگریکلچر پارٹی وغیرہ کے لوگ مسلم لیگ میں آ گئے۔

ایک دفعہ راجہ صاحب محمود آباد نے بہت سی باتیں کیں۔ باتوں میں ایک دفعہ لہجہ تلخ ہو گیا انھوں نے کہا: مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا، مسلم لیگ کہاں اتنی منظم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی۔

اس ملک کی تعمیر کے عوامل کچھ اور ہی تھے، ہندوؤں کا زور و ظلم، دفاتر کے مسلم عملے کی طلب جاہ و مرتبہ اور مسلم تاجروں کی حرص و ہوا (آواز دوست صفحہ ۳۷ کالم ۲ و صفحہ ۳۸ کالم ۱، شاہکار شمارہ نمبر ۱۰، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۲ء) راجہ صاحب کے الفاظ کو ۱۹۳۷ء کے مذکورہ ماضی سے ملائیں تو یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی مراد ایسے ہی لوگ ہوں گے، جنھوں نے مسلم لیگ میں اور پھر پاکستان میں آ کر ملک کی کوئی خدمت نہیں کی، صرف ذاتی نفع خوری منتہائے نظر بنا کر وزارتوں پر فائز رہے، ان کا ماضی اباً عن جد (باپ دادا سے) خراب چلا آ رہا تھا، پہلے بھی انگریز کے غلام تھے، بعد میں بھی کسی نہ کسی کو مصنوعی خدا بنائے رکھا ہے اور ان خداؤں (بڑی طاقتوں) کے اشاروں پر چل کر اور ذاتی جاہ طلبی کی خاطر مسلم لیگ کے ٹکڑے کر دیے پھر اور ناموں سے سامنے آئے اور مقصد پاکستان ہی بھلا بیٹھے اور عوام کو بھی اس سے ہٹا دیا حتیٰ کہ ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ملک تباہی سے دوچار ہوا اور بالآخر دولخت ہو گیا۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا بڑا قصور یہی نکلے گا کہ انھوں نے ان کی نشان دہی کی تھی اور ان سے توقعات خیر سے وہ مایوس تھے۔ خدا ان کو ہدایت دے اور ان کی تخریبی صلاحیتوں کو تعمیری اور اسلامی بنا دے۔ آمین!

(مولانا سید) حامد میاں

۲۷ر ربیع الاول ۱۳۹۸ھ ۷ر مارچ ۱۹۷۸ء

مسئلہ قومیت اور اسلام

علامہ اقبال کی تنقید پر ایک سرسری نظر

از قلم

مولانا فرید الوحیدی ایم اے (علیگ)

پیش لفظ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

پیش لفظ

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ایک بیان متعلق قومیت کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کے ایک تنقیدی قطعے کے جواب میں نظم ونثر میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا اور حضرت مولانا مدنیؒ نے خود ''متحدہ قومیت اور اسلام'' نامی رسالہ لکھ کر اس مسئلے کے ہر پہلو کو نہایت واضح فرمادیا تھا۔ اور اس سلسلے میں کوئی اشکال باقی نہ رہا تھا۔ حال آں کہ مسئلہ پہلے ہی صاف اور واضح تھا۔ اور حضرت علامہ مرحوم اپنے خیالات سے رجوع فرما چکے تھے۔ اس سلسلے میں جو تحریرات لکھی گئی تھیں ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مختصر تحریر نہایت مدلل اور فکر انگیز تھی۔ لیکن جب وہ تحریر شایع ہوئی تو علامہ اقبال شدید بیمار تھے۔ یقین ہے کہ اگر حضرت مرحوم کا وقت موعود نہ آ پہنچا ہوتا اور حضرت سید صاحب کی تحریر مرحوم کی نظر سے گزرتی تو اگر قلب میں کوئی ادنیٰ خلش باقی ہوتی تو وہ بھی دور ہو جاتی۔ اور یہ تو محض مفروضہ ہے۔ حضرت مرحوم ایسی شخصیت نہ تھے کہ قلب کے کامل اطمینان کے بغیر کوئی کلمۂ معذرت ان کی زبان پر آتا۔

مولانا فرید الوحیدی ایم اے (علیگ) نے جو نہ صرف دارالعلوم دیو بند کے فارغ التحصیل ہیں اور حضرت شیخ الاسلام سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں، ''حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ'' کے عنوان سے ایک ضخیم، جامع اور محققانہ کتاب حضرت کی شخصیت، سوانح، افکار اور خدمات دینی و سیاسی اور سلوک و معرفت میں حضرت کے مقام کے تذکرے میں لکھی ہے۔ اس میں ایک بحث حضرت شیخ الاسلام پر علامہ مرحوم کی تنقید کے جواب میں ہے۔ انھوں نے باوجود حضرت شیخ الاسلام سے نہایت عقیدت اور نسبت قریبہ کے حضرت علامہ مرحوم کے قومی رتبے اور شاعرانہ مقام کے کمال درجے احترام کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے

اگر چہ اپنے بزرگ و ممدوح کے خیالات کی تائید کی ہے لیکن حضرت علامہ کے احترام کے خلاف کوئی جملہ استعمال نہیں کیا۔ یہی ان کے اسلاف کا طریقہ تھا اور یہی اس خانوادۂ علم و تہذیب کی روایت اور اس کے دینی مرتبے کی شان بھی تھی کہ بحث و نظر میں ''احسن'' طریق پر عمل کیا جاے۔ یہ بحث چوں کہ مختصر ہونے کے باوجود جامع و نافع بھی ہے اس لیے ہم قارئین کرام کو اس کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس تالیف کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کی ایک تحریر شامل ہے۔ جو انھوں نے حضرت مولانا کے خیالات کی تائید میں لکھی تھی اور ۱۳/اپریل ۱۹۳۸ء کو سہ روزہ مدینہ، بجنور میں چھپی تھی۔ حضرت اقبال کا انتقال اگر چہ اس تحریر کی اشاعت کے ایک ہفتہ بعد ۲۱/اپریل کو ہوا تھا۔ لیکن آخری ایام میں مرحوم کی جو حالت رہی، اس لیے خیال ہے کہ شاید مرحوم کے علم میں نہ آئی ہو۔ یہ ایک اہم مسئلے پر ایک نایاب و کم یاب تحریر ہے اور بہت سے اہل علم و اصحابِ ذوق کی نظر سے نہ گزری ہوگی۔ اس تحریر کی شمولیت سے فرید الوحیدی صاحب کے اس تالیف کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

بعض بزرگ اور اہل قلم نے شکایت کی ہے کہ جب علامہ مرحوم نے اپنے قطعے سے رجوع فرمالیا تھا تو اسے ''ارمغان حجاز'' میں شامل نہ کیا جانا چاہیے تھے۔ بعض حضرات تو اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ گویا علامہ مرحوم ہی اس کے ذمہ دار ہیں یا حضرت مرحوم کے ایما پر ارمغانِ حجاز میں اس کی شمولیت عمل میں آئی تھی۔

☆ اولاً تو یہ غلط فہمی رفع ہو جانی چاہیے کہ علامہ مرحوم اس کے ذمہ دار ہیں یا ان کا اشارہ و ایما اس کی شمولیت میں پایا جاتا تھا۔ ارمغان حجاز کی تدوین مرحوم کے انتقال پر مدت گزرنے کے بعد عمل میں آئی تھی اور اس کے جامع و مرتب دوسرے لوگ تھے۔

☆ ثانیاً اس قطعے کا چھپ جانا ہرگز برا نہ ہوا۔ اگر اس وقت نہ چھپتا اور ارمغان حجاز میں شامل نہ ہوتا تو بعد میں اسے تلاش کر کے ضرور چھاپ دیا جاتا جیسا کہ حضرت

علامہ کا رد کردہ اور منسوخ شدہ کلام بھی تلاش کر کے کسی نہ کسی عنوان سے چھاپ دیا گیا ہے۔ اگر اس وقت وہ لکھنے والے اور مرتب کرنے والے حضرات موجود نہ ہوتے تو یہ کام دوسرے انجام دیتے۔

☆ ثالثاً حضرت علامہ مرحوم کے قطعے کی اشاعت اور آں مرحوم کی تنقید کا ایک خوش گوار پہلو اور بھی ہے۔ یہ اسی کی تحریک تھی کہ حضرت شیخ الاسلام کے قلم سے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے ایک لاجواب رسالہ نقش پذیر ہوا۔ جو اس مسئلے میں فیصلۂ ناطق اور حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ حضرت کی تحریرات، خطبات، خطوط میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر نہایت معلومات افزا اور فکر انگیز بحثیں موجود ہیں، لیکن مطالب کی تفصیل و وضاحت، مباحث کی جامعیت اور دلائل قاطعہ کی تالیف کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر کی جو ترجمانی اس رسالے میں ہوئی ہے۔ وہ اپنی مثال ہے۔ بہ ظاہر اسلامی تعلیمات اور ان کی ترجمانی میں جوش و جذبات کا اظہار حضرت شیخ الاسلام کے جواب میں ہونا چاہیے تھا لیکن دیکھتے ہیں کہ حضرت کا رویہ حقیقت پسندانہ اور اس کی عملی قدر و قیمت حضرت مرحوم کے پر جوش رویے اور جذبات سے زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود پاکستان میں جو تصور قومیت اختیار کیا گیا ہے اور جس پر پاکستان کی فکری تنظیم کا دارو مدار ہے اور پاکستان کے آئین و دستور میں جس تصور نے جگہ پائی ہے اس قومیت در قومیت کے تصور سے حضرت علامہ کے تصور قومیت کا کوئی تعلق ہی نہیں! پاکستان میں نہ مذہب کی بنیاد پر ایک قوم ہے اور نہ ملکی بنیاد پر! قانون کی تعبیر کے مطابق پاکستان کے تمام صوبوں اور علاقوں میں الگ الگ قومیں بستی ہیں ان کی الگ الگ تاریخیں، تہذیبیں اور زبانیں ہیں۔ ان کے متباین رسوم و رواج اور ہر لحاظ سے ان کی جدا جدا خصوصیات ہیں ان کی بقا، ان کی حفاظت، ان کی ترقی اور فروغ و اشاعت کی ضمانت دی گئی ہے۔ بجٹ میں ان سب کے لیے الگ الگ فنڈ مختص کیے جاتے ہیں۔ پنجاب اکادمی، پشتو اکیڈمی، سندھی ادبی بورڈ، بلوچی، بروہی، سرائیکی، گجراتی، کشمیری، ہندکو، وغیرہ

اکیڈمیاں اس کی مثال ہیں۔ حضرت علامہ اقبال تو قومیت کا ایک مضبوط تصور اور اسلامی تہذیب کا ایک جامع نظریہ رکھتے تھے۔ پچپن برس گزرنے کے بعد پاکستان میں ابھی ''اسلامی تہذیب'' کی تعریف پر بھی اتفاق نہیں ہوسکا ہے۔

اور اب تک جمہوریت، مارشل لا، بنیادی جمہوریت کے تجربات کے بعد ۱۹۷۳ء کے جس دستور کو ایک مسلمہ اور حقیقت سمجھا جانے لگا تھا اب معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک موہومے سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل نہیں۔ جب تک دستور کا آخری فیصلہ نہ ہو جائے نظام حکومت کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ فی الحال دستور کے مسئلے کو نظر انداز کر کے بلدیاتی نظام (سٹی گورنمنٹوں) کے قیام سے ایک تجربہ کیا جارہا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو دستور اور اس کی نوعیت کا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔

ارباب بست و کشاد کا خیال ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایک آدھ صدی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ نصف صدی (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۱ء) تجربات کی صدی ہے۔ گذشتہ نصف صدی (پچپن برس) پلک جھپکتے میں گزری ہے۔ خواب غفلت کی ایک دو کروٹوں میں نصف صدی اور گزر جائے گی اور امید ہے کہ اکیسویں کے نصف اول کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے جدید تجربے کے بعد ملک کے دستور اور نظام مملکت کے لیے ہم علم و بصیرت اور حکمت و دانش کی ایک حقیقی اور پختہ و مستحکم بنیاد کو ضرور تلاش کر لیں گے۔

امید ہے کہ قارئین کرام اس رسالے کو مطالب کی اہمیت، تحریر کے حسن، اسلوب کی شگفتگی اور شایستگی کلام کے لحاظ سے ہر طرح نافع اور لایق مطالعہ پائیں گے۔

(ڈاکٹر) ابوسلمان شاہ جہان پوری

مسئلہ قومیت اور اسلام

علامہ اقبال کی تنقید پر ایک سرسری نظر

مولانا فرید الوحیدی ایم اے (علیگ)

مدرسۂ دیوبند اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے اختلاف و انتشار کا واقعہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے۔ اس موقع پر ملک کے بہت سے علما اور مقتدر حضرات شاہ صاحب کے مؤید تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاہ صاحب مدرسے سے قطع تعلق کرلیں گے تو دارالعلوم دیوبند کی وہ مقبولیت اور حیثیت باقی نہ رہے گی جو شاہ صاحب کی موجودگی میں ہے۔ مگر مدرسے میں حضرت کی تشریف آوری سے مدرسے کے فیض، مقبولیت اور شہرت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا تو شاہ صاحب کے مؤیدین کو ایک عرصے تک حضرتؒ سے گرانی رہی۔ اگرچہ مرور وقت کے ساتھ اس قضیہ کی تلخیاں دلوں سے محو ہوتی گئیں۔ پھر بھی معدودے چند حضرات ایسے تھے جن کو یہ واقعہ بھولا نہیں تھا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کو بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب سے ان کی علمیت، للّٰہیت، تقویٰ و بزرگی کی بنا پر بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے حضرت علامہ کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں کہ مدرسۂ دیوبند سے قطع تعلق کے بعد شاہ صاحب لاہور تشریف فرما ہو کر یہیں سے اپنے تبحر علمی اور محدثانہ فیوض و برکات کے چشمے جاری کریں۔

ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا تصور سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں تازہ رہنی چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم محمد علی جناح صاحب سے بہت متاثر تھے اور ان کی قیادت سے

انھیں بہت کچھ امیدیں تھیں۔

ان عوامل کے ساتھ بعض حقایق اور بھی تھے جن کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کو حضرت کے سیاسی نظریات، خصوصاً متحدہ قومیت اور کانگریس میں شمولیت سے اختلاف و اعتراض تھا۔

ڈاکٹر سر اقبال صاحب شاعر بھی تھے، فلسفی اور بیرسٹر بھی تھے۔ اپنی فکر و نظر میں اسلام کا درد بھی رکھتے تھے اور ساتھ ہی اپنے وطن سے وسیع المشربی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری کو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی قبولیت اور شہرت نصیب ہوئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کی سبھی اقوام کے لیے ان کے دل میں وہی عزت اور وقعت تھی جس کو اتحاد قومیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ بچے بچے کی زبان پر ان کے یہ اشعار جاری تھے۔ آج بھی ''ترانۂ ہندی'' بیشتر تعلیم یافتہ حضرات کے لیے اجنبی نہ ہوگا۔ پوری نظم گذشتہ صفحات میں نقل ہو چکی ہے۔ دو تین شعر دوبارہ بھی پڑھ لیجیے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

غور فرمائیے! اتفاق، اتحاد، حب وطن اور متحدہ قومیت کا اس سے اچھا ترانہ اور اس سے زیادہ موثر پیغام اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اسی پر بس نہیں ہے۔ ہندوستان کی تعریف و توصیف اور وطن پروری کے اس سے کہیں بڑھ کر جذبات بھی دیکھیے، عنوان ہے ''ہندوستانی بچوں کا گیت''، نظم اس کی مستحق ہے کہ پوری نقل کی جائے۔ مگر اس وقت تو دو تین بندوں پر اکتفا کیجیے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا — نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا — جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

انصاف سے بتلایئے کوئی بڑے سے بڑا محب وطن اتفاق و اتحاد کا علم بردار اور متحدہ قومیت کا دعوے دار بھی اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وسیع المشرب بھی تھے۔ غیروں کے لیے بھی ان کے دل میں وہی عزت، وقعت اور احترام تھا جو اپنوں کے لیے تھا۔ رام چندر جی کی شان میں قصیدۂ مدحیہ فرماتے ہوئے تو قلم ہی توڑ دیا ہے:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جام ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے مقام — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

گاندھی جی کی منقبت میں بھی ان کے اشعار بہت بلند پایہ تھے۔ ہمیں وہ اشعار دست یاب نہیں ہو سکے، صرف مندرجۂ ذیل حوالہ ملا ہے جو پیش ہے:

"علامہ اقبال نے گاندھی جی کی تعریف میں چھ اشعار لکھے جس میں انھیں مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا۔ یہ اشعار ۱۳/...۱۹۲۱ء کے "زمیندار (لاہور)" میں چھپ چکے ہیں۔"

(الرشید، مدنی و اقبال نمبر، ساہیوال پاکستان: ص ۳۲۴)

"آفتاب عالم تاب" کے حضور ڈاکٹر صاحب نے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ گائتری منتر کا ترجمہ ہیں۔ اس منتر کو ترجمے کے لیے منتخب کرنا اور پھر اس کو اپنے مجموعہ

''بانگ درا'' میں شامل کرنا ان کی وسعت قلب ونظر کی دلیل ہے اس کے دو اشعار آپ بھی پڑھ لیجیے:

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہر محفل وجود کا ساماں طراز تو — یزدان ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگان نور کا ہے تاج دار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری — آزاد قیدِ اول و آخر ضیا تری

بہتر ہے کہ اس موقع پر آفتاب کی رفعت کے بارے میں مسلمان، اسلام اور قرآن پاک کا فیصلہ بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے:

والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الالہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العلمین.

''سورج، چاند اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع دار ہیں۔
تخلیق اور فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہیں، اس کی بڑی شان ہے۔''

اپنے ان خیالات و افکار کے باوجود ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے تین اشعار کی ایک تنقید میں حضرت رحمہ اللہ کو وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ان کے معاندین، حاسدین، مخالفین، اور معترضین نے جلسوں، نعروں اور اخباروں میں غدار، زرخرید، ملت فروش، بے دین وغیرہ وغیرہ عنوانات سے پندرہ سولہ برس کے عرصے میں پورا کیا۔ واقعہ یوں پیش آیا کہ:

''۸رجنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیر صدارت مولانا نور الدین صاحب جلسہ کیا گیا۔ اس میں میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرونِ ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں۔ اگلے روز ''الامان'' میں چھپا کہ حسین احمد نے تقریر میں یہ کہا

کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے مذہب سے نہیں ہوتی اوراس پر شور و غوغا ہوا اس کے بعد الامان میں اور دیگر اخبارات میں سب وشتم چھاپا گیا۔" (مکتوبات شیخ الاسلام)

ڈاکٹر صاحب نے حضرت کی اس تقریر کے بارے میں مسلم لیگی اخبارات الامان، احسان، زمیندار وغیرہ کی خبروں پر اعتماد کیا۔ دلّی ہی کے دوسرے اخبارات انصاری، تیج، وغیرہ میں تقریر کی جو رپورٹیں شایع ہوئی تھیں وہ صحیح حقایق پر مبنی تھیں مگر جلدی میں موصوف پوری تحقیق نہ کر سکے اور تین شعروں کی ایک ہجو تحریر فرمادی:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار کی بنیاد ڈاکٹر صاحب نے خواجہ حافظ شیراز کی غزل پر رکھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ۔۔۔ زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

ناظرین یہ غزل دیوان حافظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ تنقید و اعتراض کا انداز، الفاظ، زمین، بحر و قوافی اور مزاج وہی ہے جو حافظ کے اس شعر کا ہے۔

معاندین و مخالفین تو پہلے ہی سے حضرت کو ہر قسم کی گفتنی ناگفتنی، سب وشتم، طعنہ و دشنام کا نشانہ بناتے رہتے تھے اب ان کو ایک ادبی، علمی اور فلسفیانہ گالی ہاتھ آگئی۔ پہلے تو شاید کچھ لحاظ ملاحظہ بھی کر لیتے ہوں گے مگر اب تو پکارنے لگے صاف چلا چلا کر جو چاہتے تھے کہتے تھے اور شاعر اسلام، حکیم الامت اور دانائے راز کی یہ گوہر افشانی جھوم جھوم کر اور مست ہو ہو کر سنتے اور سناتے تھے۔ حضرت کے معتقدین، مسترشدین، مریدین اور تلامذہ نے یہ ہجو سنی تو ان کے قلوب غم و غصہ سے بھر گئے اور انھوں نے چاروں طرف سے انفرادی اور اجتماعی طور پر اظہار ناراضگی اور ناپسندیدگی کیا۔ بے شمار شعرا نے اسی بحر اور انھی ردیف و قوافی میں ڈاکٹر صاحب کے اشعار کے

جوابات لکھے۔ حضرت سے عقیدت اور محبت رکھنے والے لاکھوں سے متجاوز تھے جو آپ کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ان جوابات مین رطب ویابس، تلخ وترش اور نرم وگرم سبھی قسم کے اشعار شامل ہو گئے تھے۔ حضرت کے ایک جاں نثار خادم اور مرید مولانا سید عزیز احمد صاحب قاسمی رحمہ اللہ تھے جن کا ابھی پہلی رمضان ۱۴۰۹ھ میں بمقام دیوبند وصال ہوا ہے ان کی جوابی نظم ترکی بہ ترکی نہایت پُرزور فی البدیہہ جواب تھا۔ اس کا ایک شعر راقم الحروف کو آج تک یاد ہے:

خموش شاعرِ گستاخ قدرِ خود بشناس | زحدِ خویش گذشتن کمال بےادبی است

غرض یہ کہ اتنی جوابی نظمیں کہی گئیں کہ عامی، معمولی اور تند وتیز قسم کے اشعار الگ کر دیے جائیں تو بھی معقول ومدلل جوابی قطعات وقصاید کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ کچھ خدام نے ان کو مجموعہ کی شکل میں طبع کرنے کا ارادہ کیا مگر حضرت کو علم ہو گیا اور آپ نے سختی کے ساتھ ممانعت ومخالفت کی۔ آج تو اگر مکمل تحقیق وتفتیش کی جائے تو مشتے نمونہ از خروارے بھی مشکل ہی سے ہاتھ لگے گا۔ ایک جوابی نظم مولانا اقبال سہیل مرحوم کی دست یاب ہوئی ہے۔ وہ ملاحظہ ہو:

معاندے کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت | سبک بچشم فروز ایں سحاب بے سببی است
بیان او ہمہ تخییل و بحث در تفسیر | زبان او عجمی و کلام در عربی است
کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است | دروغ گوئی وافرا ایں چہ بوالعجبی است
درست گفت محدث کہ قوم از وطن است | کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است
زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی | کہ فرق ملت وقوم از لطائفِ ادبی است
تفاوتے است فراواں میان ملت وقوم | یکے ز کیش دگر کیشست یا نسبی است
بملت ارچہ براہیمی است سرورِ ما | ولے بہ قوم حجازی نسل مطلبی است
ز قوم خویش شمر واہل کفر را بہ احد | رسول پاک کہ نامش محمد عربی است
خدائے گفت بقرآں لکل قوم ہاد | ولے بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر | پراز حکایت ''یا قوم'' مصحف عربی است

بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت — کہ حبلِ دین قوی تر ز رشتۂ نسبی است
کسے کہ ملت اسلام نور سینۂ اوست — برادر است اگر زنگی است در حلبی است
ولے بہ ہم وطناں در مصاف آزادی — مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است
سلوک رفق و مداوا بہ جار ذی القربیٰ — عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است
محبتِ وطن است از شعارِ ایماں — ہمیں حدیث پیمبر فدتہٗ بابی است
نظر نہ بودن و بادیدہ در در افتادن — دو گونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است
رموز حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن — تلاشِ لذتِ عرفاں ز بادۂ عنبی است
خموشی از سخن ناسزا گزیدہ تر است — کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بےادبی است
بہ دیوبند گذر، گر نجات می طلبی — کہ دیوِ نفس سلح شور و دانشِ تو صبی است

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبی است

اصحابِ فکر ونظر وارباب علم وفن اس کا اعتراف کریں گے کہ الفاظ وتراکیب اسالیب وفن شاعری قرآنی وشرعی دلائل واقتباسات تاریخی وعرفی شواہد اور براہین کے اعتبار سے علامہ اقبال سہیل مرحوم کی مذکورہ نظم ڈاکٹر اقبال صاحب کا مسکت جواب ہے۔ سب سے بڑا جواب یہ ہے۔ جس نبیاد پر سر اقبال نے ہجو فرمائی ہے وہ بات حضرت رحمہ اللہ نے کہی ہی نہیں تھی۔

کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است۔ دروغ گوئی.....

حضرت رحمہ اللہ نے جو مفصل جواب خود تحریر فرمایا اس کے کچھ اجزا حاضر ہیں.

"کیا یہ انتہائی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دے کر ملت کو وطنیت کی بنا پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو کیا ہے۔ زبان عربی اور مقام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے کون بےخبر ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے، ملت کا نہیں کہا ہے۔ دونوں لفظوں

میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملت کے معنی شریعت اور دین کے
ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں۔ قاموس
میں ہے: الملة. بالكسر. الشريعة او الدين. القوم
الجماعة من الرجال و النساء معاً او الرجال خاصة
او تدخلهٗ النساء تبعيةً۔'' (مکتوبات: جلد ۳، ص ۱۲۵)

اس باب میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا مقالہ و محاکمہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخی اور علمی حیثیت سے مقالہ اس اہمیت کا حامل ہے کہ پورا ہی نقل کیا جائے مگر اپنی گنجایش اور موضوع کی رعایت سے ہم اس کی تلخیص پر اکتفا کرتے ہیں:

''جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی شخصی عزت و احترام، علمی فضل و کمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جا سکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرے کو جس طرح سیاق و سباق سے قطع کر کے اچھالا گیا ہے، اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے۔ وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے ان کا اعتبار کر کے شاعرِ اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بنا پر تھی۔ صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لیے بہت اندوہ ناک تھا، میں بے چین ہو گیا۔''

(اخبار مدینہ۔ بجنور، ۱۳؍ اپریل ۱۹۳۸ء)

''صحیح و فصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں ''ملت'' کے ایک ہی معنی، اور وہ مذہب کے ہیں، ملت ابیکم

ابراھیم (حج: ۳)۔'' (اخبار مدینہ۔ بجنور، ۱۳/ اپریل ۱۹۳۸ء)

''قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں۔ یہ قرآن پاک اور عربی محاورہ مین تین معنوں میں آیا ہے، مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے:

ذالک بانھم قوم لایعقلون (مائدہ) یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

بانھم قوم لا یفقھون (توبہ) اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

انکم قوم منکرون (حجر) تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔'' (اخبار مدینہ۔ بجنور، ۱۳/ اپریل ۱۹۳۸ء)

''ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کہ وفوق کل ذی علم علیم۔''

''اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں، اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطہ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنھوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنھوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے:

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انھی کا بخشا ہوا ہے:

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ ''قوم اوطان سے بنتی ہیں'' قابلِ اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں، جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا...... ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔''

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی ''ملت'' ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔''

(اخبار مدینہ۔ بجنور، اپریل ۱۹۳۸ء)

"آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بہ شانہ رہتے ہیں، اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہ ہر حال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے۔ ملت و امت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں۔ اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے۔ تو کیا اس کے لیے "جنسیت" کا لفظ بول سکتے ہیں؟ مگر بولنے سے پہلے قوم کے مفتیوں اور مفتیوں کی قوم سے بہ ہر حال پوچھ لینا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا اور ملت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بنا پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائے گا۔"

(اخبار مدینہ۔ بجنور، ۱۲؍اپریل ۱۹۳۸ء)

یہ بحث جاری ہی تھی اور اللہ ہی جانے کہاں تک جاری رہتی مگر اچانک ان ارشادات کے فرمانے کے تین چار ماہ بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے بعد کچھ خوش فہم حضرات نے یہ مشہور کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا اور حضرت سے معافی مانگ لی تھی۔ دل چاہتا ہے کہ خدا کرے یہ بات صحیح ہو اور ظاہراً اعلاناً و بیاناً نہ سہی ڈاکٹر صاحب نے دل ہی دل میں اعتراف کرلیا ہو اور حضرت سے نہ سہی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی ہو تاکہ **انما الا عمال بالنیات**، اللہ کے دربار میں بری الذمہ ہوگئے ہوں۔ اس لیے کہ تاریخی اور ظاہری طور پر اعتراف قصور اور رجوع کا جو معاملہ پیش آیا وہ اتنا صاف نہیں تھا جسے معافی کہا جاسکے، واقعہ یہ ہوا کہ دیوبند کے ایک فاضل و عالم مولانا عبدالرشید نسیم طالوت نے اس ناگوار قضیے سے متاثر ہوکر حضرت رحمہ اللہ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور ڈاکٹر صاحب کو بھی توجہ دلائی۔ (ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں لکھا) ملاحظہ

فرمایئے:

''۱۶رفروری ۱۹۳۸ء

جناب من! مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے۔ ان میں سے بعض میں تو اصل معاملے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے مگر بعض نے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔ چناں چہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں۔ اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے۔ جواب ان شاء اللہ اخبار ''احسان' میں شایع ہوگا۔ میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔ فقط

مخلص اقبال''

اس خط کے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب نے روز نامہ ''احسان' لاہور میں ایک خط بغرض اشاعت روانہ کیا جس کو اخبار نے اپنی طرف سے سرخی لگا کر مندرجۂ ذیل انداز میں ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء کو شایع کیا:

''میں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت قبول کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔''

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان۔

''مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔'' علامہ اقبال کا مکتوب۔

قومیت و وطنیت کے سلسلے میں ایک علمی بحث کا خوش گوار خاتمہ

جناب ایڈیٹر صاحب احسان لاہور!

السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے بیان پر شایع کیا

ہے اور جو آپ کے اخبار میں شایع ہو چکا ہے، اس میں اس امر کی
تصریح کر دی گئی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد کہ ''زمانہ حال میں اقوام
اوطان سے بنتی ہیں'' محض برسبیل تذکرہ ہے تو اس پر مجھے کوئی
اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر مولانا نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے
کہ وہ جدید نظریہ وطنیت کا اختیار کریں، تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو
اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار انصاری
میں شایع ہوا مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

''لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو
ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کام یابی کے میدان میں گامزن بنایا
جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے بجز رشتۂ
اتحاد کے اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے اس
کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانان
ہند کو مشورہ دیا ہے۔ اس بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار احسان
میں شایع ہوا ہے۔ لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت
صاحب کے نام آیا جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال
کر دی۔ اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں
کوئی کلام نہیں اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے۔ اس
لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کر لیا جائے اور اس
کے ساتھ ساتھ تقریر کے سیاق و سباق پر نظر ڈالی جائے۔ میں یہ
عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ
اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے،

یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے۔ خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجۂ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لٰہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اس پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔

محمد اقبال"

(مکتوبات شیخ الاسلام: جلد ۳، ص ۱۴۰)

مذکورۂ بالا اقتباسات اور توضیحات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کس درجے میں معافی تلافی کی ہے اور کہاں تک قال اقول کی بحث کی ہے۔ بہ ہر حال اب تو دونوں ہی حضرات اس دربار میں پہنچ چکے ہیں جہاں قول و عمل اور نیتوں کے ذرے ذرے کا حساب دینا ہوگا اور اس میں کسی منطقی اور فلسفی بحث کی گنجائش نہ ہوگی۔ اس لیے اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ مجموعۂ اقبال میں یہ نظم جب تک چھپتی رہے گی حضرت کے اجر و ثواب و درجات میں لاکھوں گنا اضافہ ہوتا رہے گا۔ آخر میں عظمت و عزیمت اور اخلاق حسنہ کی ایک مثال بطور عبرت و

نصیحت سن لیجیے:

''ہماری انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ تھا جس رات مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کی تقریر تھی اسی دن مولانا کو جامع مسجد میرٹھ کے باہر کار سے اترتے وقت اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کا انتقال ہوگیا، حضرت نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رات کو جلسے میں تقریر سے پہلے حادثے کا دلدوز انداز میں تذکرہ فرمایا اور حاضرین سے کہا کہ سب ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ چناں چہ مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعائے مغفرت کی۔ یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولانا کے خلاف قومیت کے مسئلے پر اتنے سخت الفاظ استعمال نہ کیے ہوتے۔''

(رشید الوحیدی: ''مولانا حسین احمد --حیات و کارنامے'' مطبوعہ جمعیۃ بک ڈپو۔ دہلی۔ مقالہ مسعود حسن صدیقی، انڈین فارن سروس، ص ۲۵۲)

لاکھوں درود اور سلام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے امت کو عفو و درگذر اور خلاق عالیہ کے راستے پر چلایا۔ **انی بعثت لا تمم مکارم اخلاقکم** اور صد ہزار رحمتیں ہوں ان امتیوں پر جنھوں نے اپنی زندگیاں سنت نبوی کے اتباع میں وقف کردیں۔

سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں

(''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' از مولانا فرید الوحیدی، صفحہ ۴۹-۴۳۶)

متحدہ قومیت کا مدنی تصور

اور

حضرت علامہ اقبال

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

پیش لفظ:

متحدہ قومیت کا مدنی تصور

اس سے انکار اور تاریخ کا فیصلہ

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کے باشندے پچاسوں مذاہب میں تقسیم ہیں، ان کے اتحاد کی بنیاد مذہب نہیں بن سکتا۔ ان کے لیے ملک و وطن سے رشتہ ہی قدر مشترک اور بنائے اتحاد ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا کی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ مذہبی طور پر سب الگ الگ اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں اور اپنے اپنے طریقے پر خالق کائنات اور مالک الملک کی عبادت کرتے ہیں اور ملک کی آزادی، دفاع اور ترقی کے کاموں میں متحد و شانہ بہ شانہ ہو کر اپنا وطنی و قومی فرض ادا کرتے ہیں اور اپنا اپنا حق وصول کر کے اپنے مخصوص تہذیبی، تمدنی دایروں میں اطمینان و سکون اور عیش و مسرت کی زندگی گزارتے ہیں۔

ایک ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ملکی اور وطنی کاموں میں اتحاد و اشتراک کے لیے ایک قومیت یا متحدہ قومیت سے اچھی اصطلاح ابھی وضع نہیں ہوئی۔ اس کی بنیاد نہ دین داری پر ہے نہ اس میں بے دینی کا کوئی عنصر چھپا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی چاہے تو کوشش کر دیکھے! شاید اس سے اچھی کوئی اصطلاح بن جائے اور رواج پا جائے۔ یہ ایک ناقابل تردید اور ایسی سچائی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ حضرت علامہ اقبال اور مسٹر جناح دونوں نے انکار کیا اور پھر ماننے پر مجبور ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے ''متحدہ قومیت'' کے نظریے کا اس کے سوا نہ کوئی فلسفہ تھا اور نہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم! پاکستان کے دستور کی بنیاد متحدہ قومیت کے اسی تصور پر ہے۔

یہ مسئلہ پیدا ہوا۔ پھر سب اس کے ایک حل پر متفق ہو گئے۔ اور تاریخ میں اس

واقعے کا صرف تذکرہ باقی رہ گیا۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال برِاعظم ہند پاکستان کی تاریخ سیاسیات میں دو اہم اور یادگار کردار تھے۔ آیئے تاریخ کے اس باب کا مطالعہ کریں۔ علامہ اقبال نے مولانا مدنی کے تصورِ متحدہ قومیت کو جھٹلایا، شدید طنز کیا پھر اس کی حقیقت کو تسلیم کرلیا۔ دوسرے رہنما بھی راہِ راست پر آگئے۔ اہل پاکستان نے اجتماعی طور پر اس تصور کو اختیار کیا اور اپنے نوزائیدہ وطن کے دستور کی بنیاد اسی تصورِ قومیت کو بنالیا۔

ذیل میں جو تحریر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں دعویٰ ہے، اس سے انکار ہے، پھر اس پر ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے پھر اس پر سب کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں ''ارمغانِ حجاز'' کے مرتبین کی زیادتی کے شکوے پر یہ تالیف قصیر مکمل کر دی جاتی ہے۔

ابوسلمان

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پور)

(۱)

شیخ الاسلام کا ایک اور تاریخی خط

۲۶ر فروری ۱۹۳۸ء: ۹ر فروری کو حضرت شیخ الاسلام نے جو مکتوب لکھا تھا، وہ جب حضرت کے بعض احباب کی نظر سے گزرا اور اس کی اہمیت اور مسئلۂ زیرِ بحث میں اس کی قطعیت کا اندازہ ہوا اور چوں کہ مدینہ اخبار کی طرف سے بھی حضرت سے اس مسئلے پر اظہار خیال کی درخواست کی گئی تھی، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ یہ مکتوب اخبارات کو اشاعت کے لیے دے دیا جائے۔ اگر چہ ضروری تھا کہ اس فیصلے سے طالوت صاحب کو اطلاع دی جائے، لیکن حضرت کے اخلاق کریمانہ نے ضروری نہ سمجھا کہ اس فیصلے کی انھیں بھی اطلاع دے دی جائے۔

اس مسئلے کے بارے میں اس مکتوب میں چند نئی باتیں آئی ہیں، اس لیے حضرت کا یہ مکتوب بھی قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لیے درج کیا جاتا ہے۔

(ا۔س۔ش)

حضرت فرماتے ہیں:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف

والا نامہ مجھ کو کلکتہ میں ۲۴ر ذی الحجہ کو ملا۔ میں دیو بند سے ۱۱ر ذی الحجہ کو ہری پور کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ ادھر سے بمبئی ہوتا ہوا کلکتہ آیا ہوں۔ اس وقت مجھ کو بنگال آسام کے متعدد جلسوں میں شریک ہونا ہے۔ ان شاء اللہ ہفتہ عشرے کے بعد دیو بند پہنچوں گا۔ میں نے جب عریضہ لکھا، تو بعض احباب نے اصرار کیا تھا کہ چوں کہ جگہ

جگہ پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اور ہر طرف سے خطوط آرہے ہیں، نیز بہ ذریعہ ''مدینہ'' (بجنور) وغیرہ نے مجھ سے استفسار کیا ہے۔ بنا بریں لازم ہے کہ اس خط کی نقل شایع کردی جائے۔ میں نے ان کے اصرار پر اجازت دے دی تھی۔ چناں چہ آپ کے پاس عریضہ روانہ کردینے کے بعد انھوں نے اس کی نقلیں ''مدینہ، الجمعیۃ، انصاری، ہند جدید، ترجمان سرحد، پاسبان، اجمل'' وغیرہ کو بھیج دیں، وہ شایع ہوگئی ہیں۔ بنا بریں عرض ہے کہ جناب کا اس عریضہ کو سر اقبال صاحب کی خدمت میں بھیجنے کے متعلق استفسار فرمانا اب غیر ضروری ہے اور اس میں کوئی پرائیوٹ مضمون تھا بھی نہیں۔ اگر ان کو ان اخباروں کے مضامین نہ پہنچے ہوں اور غالباً نہ پہنچے ہوں گے کیوں کہ بڑے حضرات اردو کے اخبار اور بالخصوص قومی اخبار ملاحظہ نہیں فرماتے، تو بھیج دیجیے۔

میرے محترم سر موصوف کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے، اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے میں جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیے، خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا، نہ امر و انشا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے اور واقعہ اصلی یہ تھا کہ میں تقریر میں ان امور کو گنوا رہا تھا جو کہ ہندوستانیوں کو اور بالخصوص مسلمانوں کو انگریزوں سے پہنچے ہیں۔ ان میں،

پہلی چیز ذکر میں ذلت آئی تھی کہ تمام دنیا میں اس زمانے میں ہم ذلیل شمار کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا کا خیال ہے کہ ہندوستانی (ہندوستان کے باشندے) ایک قوم ہیں اور وہ سب کے سب غلام ہیں اور غلام ذلیل و خوار ہوتا ہی ہے۔ اس لیے ہم بیرون ممالک میں نہایت ذلیل دیکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مسلمان، ہندو،

سکھ، پارسی، یہودی وغیرہ کا مذہبی یا نسلی یا صنفی فرق نہیں دیکھتے ہیں اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متعلق نٹال، ٹرانسوال، کیپ کالونی، ماریشیس، زنجبار، نیروبی، کینیا، فیجی، آسٹریلیا، کنیڈا، امریکا وغیرہ نہایت شرم ناک اور ذلیل ترین قوانین اپنے یہاں بناتے ہیں اور ہندوستانی باشندوں کو شہری حقوق سے محروم کرتے ہیں اور ہم کوئی امداد وہاں کے ہندوستانی باشندوں کی نہیں کر سکتے۔ کیا ایسا وہ جاپان یا چین یا اطالین یا انگلینڈ یا ڈچ وغیرہ آزاد قوموں کے ساتھ کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق جو کہ فلسطین یا سیریا یا مصر یا عراق، طرابلس یا الجیریا وغیرہ میں موجود ہیں۔ آوازیں اٹھاتے ہیں مگر کوئی یورپین طاقت ہماری آواز کی طرف رخ نہیں کرتی اور نہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ذلت ہے۔ خود برطانیہ کے مقابل ہم اس کے کھلے ہوئے مظالم پر جو کہ ہندوستان اور سرحد وغیرہ میں ہو رہے ہیں پروٹسٹ کرتے ہیں، مگر وہ کان بھی نہیں دھرتی، ہم بیرون ممالک میں دیگر اقوام کے سامنے اسی غلامی کی وجہ سے ہندوستانی قوم کو ذلیل کرتے ہوئے بارہا مشاہدہ کر چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دوسری چیز میں نے ذکر کی تھی ''بزدلی اور جبن'' امور جنگ سے ناواقفیت اور اس کو واضح طور پر ثابت کیا تھا۔

تیسری چیز نفاق، چوتھی چیز فقر و فاقہ، پانچویں چیز جہل، چھٹی چیز کسل اور سستی، ساتویں چیز بدعقلی، آٹھویں بیکاری وغیرہ۔

مسلمانوں کے لیے خصوصاً دارالاسلام کا دارالحرب ہو جانا، عالم اسلامی کا اس غلامی کی وجہ سے برباد ہونا، مذہبی امور کا غارت ہونا وغیرہ یہاں کوئی مشورہ بجز اس کے ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ۔

اشد ضروری ہے کہ جلد از جلد کوشش کر کے ہندوستان کو آزاد کرائیں اگر اس مشورے کو خلاف دین وامانت شمار کیا جاتا ہے تو باعلان کہتا ہوں کہ میں اسی کو فرض سمجھتا ہوں۔ فذالك ذنب لست منه اتوب. ''یہ ایسا گناہ ہے جس سے توبہ نہیں کر سکتا۔''

دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے اس کو مشورہ دوں گا اور میرا اعتقاد ہے کہ اس میں تقصیر کرنا مسلمان کے لیے حرام ہے، اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لینا ضروری ہے۔

باقی رہا ملت اسلامی کا بلا انساب، بلا الوان، بلا اوطان، بلا صنائع وغیرہ متحد ہونا اور کرنا تو یہ دوسرا امر ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں، ہماری گھٹی میں پڑا ہے، اس کی بنا پر ہم مالٹا میں قید رہے۔ ہم نے کراچی کا جیل کاٹا اور سیکڑوں مصائب اٹھائے اور بچپن سے اس کی تعلیم پائی۔ قرآن کی آیات واحادیث صحیحہ اور روایات آج نہ سطور میں بلکہ صدور میں موجود ہیں، جن کو بارہا منابر پر مجامع میں ہم پڑھتے اور اس کا وعظ سناتے ہیں۔ کوئی تو صرف اس کا قوال ہی ہوگا، ہم قوال اور فعال دونوں ہیں۔ قوم کی بے حسی اور کمزوری کی وجہ سے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں پھر کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو ایک قرار دیا گیا۔ میں فرق کو نقل کر چکا ہوں۔ اگر خلاف لغت سر صاحب موصوف کا نظریہ دونوں کے اتحاد وغیرہ کا ہے تو ان کو اپنے نظریے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق ہے۔ بہر حال

بدم گفتی و خر سندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

میرے محترم! ہم تو ایسے سب و شتم کے عادی ہو گئے ہیں، سن کر کچھ تغیر نہیں ہوتا:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے میں علاحدہ ہوا ہوں، ہر قسم کے سب و شتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوا ہوں، وہ کون سے الفاظ اور معاملات ہیں جو نہیں کیے گیے۔ سر موصوف صاحب تو جب بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے ہی کیا کمی کر رہے ہیں۔ والسلام۔

دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔اس وقت میں نے یہ عریضہ اسٹیمر میں گوالندو اور چاندپور کے درمیان لکھا ہے، تاخیر پر مواخذہ نہ فرمائیں۔اگر مناسب سمجھیں تو میرے عریضہ کی نقل ''احسان'' کو بھیج دیں شاید وہ شائع کردے اور جب کہ اس نے سر موصوف کا مقالہ ابتدا میں شائع کیا ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ اس کو بھی شائع کردے۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس عریضہ کو بھی شائع فرمادیں یا سر موصوف کی خدمت میں بھیج دیں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ/۲۶ر فروری ۱۹۳۸ء

(حوالہ: شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری (جلد۳)، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۵۹-۶۲)۔ یہ خط علامہ طالوت کے نام ہے۔

(۲)

علامہ اقبال کا اپنی رائے سے رجوع

۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء: مولانا عبدالرشید نسیم طالوت صاحب نے حضرت شیخ الاسلام اور علامہ اقبال کے مابین غلط فہمی دور کرنے کے لیے جو سعی کی تھی الحمدللہ وہ مشکور ہوئی۔علامہ اقبال کی غلط فہمی دور ہوگئی اور انھوں نے ایک بیان میں اپنے خیالات سے جو انھوں نے اپنے قطعے میں ظاہر کیے تھے رجوع فرمالیا۔یہ بیان ایک خط کی صورت میں ہے جو انھوں نے ایڈیٹر احسان لاہور کے نام لکھا ہے اور ۲۸ر مارچ کے شمارے میں ''قومیت اور وطنیت کے سلسلے میں ایک علمی بحث کا ''خوش گوار خاتمہ'' علامہ اقبال کا تردیدی بیان'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔علامہ نے لکھا ہے:

جناب ایڈیٹر صاحب ''احسان'' لاہور

السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ

کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے، اس میں اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد کہ ''زمانہ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ محض بر سبیل تذکرہ ہے، تو مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں اور اگر مولانا نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریۂ وطنیت کا اختیار کریں تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو اعتراض ہے، مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار انصاری میں شائع ہوا، مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

''لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے ، ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز قومیت اور کوئی رشتہ نہیں، جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانان ہندوستان کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار ''احسان'' میں شائع ہوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط ''طالوت'' صاحب کے نام آیا، جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے، اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

> ''میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا، تو اس میں کوئی کلام نہیں، اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سباق پر نظر ڈالی جائے ، میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔'' یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے، خبر ہے، منشا نہیں ہے کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں۔ پھر اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔''

''خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا

مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا، میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں، خدا ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے، نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔

محمد اقبال"

حضرت علامہ کے قطعے پر ردعمل:

مارچ ۱۹۳۸ء: علامہ اقبال مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام کے رد میں جو ایک جذباتی قطعہ لکھا تھا۔ ایک طرف تو اس کا اثر لیگی حلقوں میں یہ ہوا کہ انھیں حضرت کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک بہت گھٹیا ہتھیار ہاتھ لگا۔ لیکن سنجیدہ علمی حلقے اور حضرت کے معتقدین و منتسبین کے حلقے میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ ان میں سے بعض حضرات جو شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے، انھوں نے علامہ اقبال کے رد میں کئی پرزور نظمیں لکھیں جن میں خیالات اور جذبات صادقہ کا اظہار کیا اور عام طور پر فارسی میں اور اسی وزن و بحر میں لکھی گئیں تھیں۔ ان میں سے مولانا اقبال سہیل (ایڈوکیٹ اعظم گڑھ) کے اشعار زبان کی سلاست، بیان کے جوش، فکر کی بلندی، دلائل کی فراوانی جواب کی بداہت اور شاعرانہ خصایص میں بلند پایہ تھے جو بہت پسند کیے گئے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

معاندے کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت — سبک بچشم فروز ایں سحاب بے سببی است
بیان او ہمہ تخییل و بحث در تفسیر — زبان او عجمی و کلام در عربی است
کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است — دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است
درست گفت محدث کہ قوم از وطن است — کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است
زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی — کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی است

تفاوتے است فراواں میان ملت و قوم — یکے زکیش دگر کشوریست یا نسبی است
بملت ارچہ براہیمی است سرور ما — ولے بہ قوم حجازی و نسل مطلبی است
زقوم خویش شمرد اہل کفر را بہ احد — رسول پاک کہ نامش محمد عربی است
خدائے گفت بقرآن ''لکل قوم ہاد'' — ولے بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر — پراز حکایت یا قوم مصحف عربی است
بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت — کہ حبل دین قوی تر زرشتۂ نسبی است
کسے کہ ملت اسلام نور سینۂ اوست — برادر است اگر زنگی است یا حلبی است
ولے بہ ہم وطناں در مصاف آزادی — مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است
سلوک رفق و مدارا بہ جار وذی القربیٰ — عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است
محبت وطن است از شعائرِ ایماں — ہمیں حدیث پیمبر فدیتہ ، بابی است
نظر نہ بودن وبادیدہ ور در افتادن — دوگونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است
رموزِ حکمتِ ایماں زفلسفی جستن — تلاشِ لذت عرفاں زبادۂ عنبی است
خموشی از سخن ناسزا گزیدہ تر است — کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بےادبی است
بہ دیو بند گذر، گر نجات می طلبی — کہ دیو نفس سلح شور ودانش توصبی است

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را وہم ز آل نبی است

دوسرے شعرا میں مولانا سید محمد اصلح الحسینی، مولانا محمد سلیمان آسی قاسمی، محمد کفیل، پروفیسر محبوب الٰہی، حامد الانصاری غازی، ارشد تھانوی، مولانا زاہد الحسینی شمس آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا قاضی زاہد الحسینی نے وہ تمام منظومات جو علامہ اقبال کے قطعے کے جواب میں کہی گئی تھیں، ایک کتابچہ بہ عنوان ''اذانِ حجاز'' میں جمع کر کے ''ملٹری پریس کیمبل پور'' سے چھپوادی تھیں۔

(۳)

علامہ اقبال کے ردّ میں

سید سلیمان ندوی کا استدلال

۱۳ر اپریل ۱۹۳۸ء: نثر میں علامہ اقبال کے قطعے کے جو جواب تحریر کیے گئے ہیں، ان میں علامہ سید سلیمان ندوی کا مضمون نہ صرف اپنے دلائل کی محکمی، بیان کی قاطعیت، علمی متانت اور سنجیدہ اسلوب کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے اور اس لیے بھی کہ وہ علامہ اقبال سے قریبی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور علامہ اقبال کے ان کے بارے میں بہت بلند خیالات تھے اور انھیں مامور من اللہ، امت کے خاص افراد اور ان لوگوں میں سے خیال کرتے تھے جن میں امر الٰہی ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ سید صاحب مرحوم کو ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' سمجھتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے قلم سے حضرت شیخ الاسلام کے دفاع اور علامہ اقبال کے خیالات کے رد کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ سید صاحب اس زمانے میں تھانہ بھون کے بزرگ سے جوش عقیدت میں مسلم لیگ کے انداز سیاست سے متاثر ہو چکے تھے اور اس سے کچھ عرصہ قبل مسٹر محمد علی جناح کی مدح میں ایک زوردار نظم لکھ چکے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ مضمون سہ روزہ مدینہ، بجنور کی اشاعت مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا فرید الوحیدی نے اپنی تالیف لطیف ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' میں علامہ ندوی کے اس مضمون کے خاص حصے نقل کیے ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں:

''جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی شخصی عزت واحترام، علمی فضل وکمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جا سکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرہ کو جس طرح سیاق و سباق سے قطع کر کے اچھالا گیا ہے، اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے، وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے ان کا اعتبار کر کے شاعر اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بنا پر تھی۔ صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لیے بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہو گیا۔"

....

"صحیح و فصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں "ملت" کے ایک ہی معنی اور وہ مذہب کے ہیں: "ملت ابیکم ابراهیم" (حج)

"قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں۔ یہ قرآن پاک اور عربی محاورہ میں تین معنوں میں آیا ہے۔

مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے:

ذالك بانهم قوم لا يعقلون. (مائدہ)

"یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔"

بانهم قوم لا يفقهون. (توبہ)

"اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔"

انكم قوم منكرون. (حجر)

"تم انجان لوگ ہو۔"

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔"

....

"ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے "لفظوں میں میرے

خیال میں صحیح نہیں، لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کہ "وفوق کل ذی علم علیم."

....

"اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں، اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطے میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا "ہندی ترانہ" جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں، جنھوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں۔ کیا وہ ڈاکٹر اقبال ہی نہیں جنھوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے؟

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انھی کا بخشا ہوا ہے:

ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

....

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" قابل اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بودوباش رکھتے ہیں، جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول

میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا......ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی ''ملت'' ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔''

....

''آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بہ شانہ رہتے ہیں۔ اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہرحال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے۔ ملت و امت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں۔ اور اب اگر قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے۔ تو کیا اس کے لیے ''جنسیت'' کا لفظ بول سکتے ہیں؟ مگر بولنے سے پہلے قوم کے مفتیوں اور مفتیوں کی قوم سے بہرحال پوچھ لینا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا۔ اور امت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بنا پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائے گا۔''

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی)

(۴)

استدلال مزید

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون میں علامہ اقبال کی جن تین نظموں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے، یہ مصرع ''نیا شوالہ'' کا ہے۔ پوری نظم یہ ہے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(۲) میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے، یہ مصرع ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا ہے۔ پورا گیت یہ ہے:

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے آسماں سے

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

(۳) ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا، یہ مصرع ''ترانۂ ہندی'' کا ہے۔ پورا ترانہ یہ ہے:

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

یہ تینوں نظمیں علامہ اقبال کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں شامل ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ فرمانا کہ ''مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہوسکتا ہے۔'' اور یہ کہ ''مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں۔''

ان منظومات میں جو کیف ولذت خیال، جوشِ فکر اور حقیقت آشنائی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ پر جوش اور والہانہ انداز میں ہندو مسلم اتحاد و اخوت اور لذت قرب و وصل کی آرزو کا نغمہ اور دونوں قوموں کی نفاق

انگیزی، فراق، نا آشنائی، جدائی، چمن کے پھولوں میں اخوت کی خوشبو نہ ہونے کی وجہ سے لطف نغمہ پیرائی سے بے کیفی، لذتِ قربِ حقیقی کی آرزو، آتشِ پیکار سے چمن کی تباہی وغیرہ کے مضامین کو انھوں نے جس درد و الم کے ساتھ ذیل کی نظم میں بیان کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں شاید ہی ملے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنے دل دردمند کے ٹکڑے کاغذ پر بچھا دیے ہیں۔ اور شاید اسی لیے اس نظم کا عنوان انھوں نے ''صدائے درد'' رکھا ہے نظم یہ ہے:

صدائے درد

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے	ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے	وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب	ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں	اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں	اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں	ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں
حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مائل ہی نہ ہو	شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو
ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں	میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

علامہ اقبال مرحوم کی ایک اور نظم ''تصویرِ درد'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' ہی میں شامل ہے، اس میں ان کی یہ ''صدائے درد'' اور زیادہ الم انگیز و دردناک ہو جاتی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری	خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا	وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

رلاتا ہے ، ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ، اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہو دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا!

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟

سکوت آمیز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم

ان منظومات کے علاوہ بھی نظمیں، اشعار اور نثر پارے ہیں، جن میں علامہ اقبال نے متحدہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد، اخوت، بھائی چارے کے بارے میں اور نفرت، تعصب، افتراق وغیرہ کے بارے میں اپنے دلی جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بانگ درا ہی میں یہ منظومات ہیں جن کا مطالعہ اس باب میں بہت اہمیت رکھتا ہے:

ہمالہ، آفتاب (ترجمہ گایتری)، سوامی تیرتھ رام، شری رام چندر جی، گرونانک اور اسی نظم کے ایک شعر میں گوتم بدھ کی مدح ہے اور انھیں پیغمبر قرار دیا ہے۔ ان منظومات میں افکار کی بلندی، جذبات کی فراوانی ادبیت اور جوش و تاثیر کی لامتناہی ہے مولانا مدنی کے بیان کی فکری صداقت، تاثیر، بیان کی سادگی اور ادبیت کا کوئی مقابلہ ہی نہیں! علامہ مرحوم کی یہ تمام منظومات ''بانگ درا'' میں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ انھوں نے خود مرتب کیا تھا اور پہلی بار ۱۹۲۴ء میں اور دوسری بار ۱۹۲۶ء میں علامہ مرحوم نے خود ہی شائع کیا تھا اور تیسرا ایڈیشن اگرچہ علامہ مرحوم نے اپنی زندگی میں تیار کر دیا تھا لیکن اس کی اشاعت علامہ کی وفات کے بعد ۱۹۳۹ء میں عمل میں آئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ مرحوم اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ان خیالات پر قائم تھے۔ ان کے قوم پرستانہ اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا مدنی کے تو ان خیالات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ خیالات ہیں جن کا جواب پاکستان میں علامہ اقبال کا کوئی بڑے سے بڑا اور نامور شعر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ علامہ مرحوم کے خیالات نہیں یا انھوں نے ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا؟ حضرت علامہ کے یہ خیالات متحدہ قومیت کے مدنی تصور سے بہت بلند ہیں۔

''جاوید نامہ'' کی فکری اور فنی سطح بانگ درا سے بھی بلند ہے۔ اسے بھی علامہ اقبال نے خود مرتب کیا اور ۱۹۳۲ء میں خود ہی شائع کیا تھا۔ اس میں بھارت ماتا کو ''حور پاک زاد'' کی شکل میں پیش کیا ہے اور جن خیالات اور جذبات عقیدت کا اظہار کیا

ہے۔اس کی مثال اردو، ہندی ادب میں نادر اور شاذ کے درجے میں ہوگی۔ ''جاوید نامہ'' میں وشوامتر، ایک ہندو بزرگ جسے علامہ نے ''عارف ہندی'' قرار دیا ہے، کے حضور اپنی عقیدت کا نذرانہ اور بھرتری ہری ایک فلسفی کے بلند افکار کو خراج تحسین پیش کیا ہے، نہرو خاندان سے اپنے تعلق خاطر کا بیان نہایت جوشِ محبت سے کیا ہے اور انھیں ''برہمن زادگانِ زندہ دل'' کے لقب سے ملقب کیا ہے۔

''ضرب کلیم'' کے نام سے علامہ اقبال کا مشہور مجموعۂ کلام ۱۹۳۶ء میں خود علامہ نے مرتب کر کے شایع کیا تھا۔اس میں ''شعاعِ امید'' کے نام سے جو نظم ہے۔اس میں بھی علامہ مرحوم نے انھیں قوم پرستانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس میں روح اقبال اہل ہند کو یہ پیغام دیتی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی جن کے لیے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ چند حوالے تاریخی ترتیب سے بانگِ درا (۱۹۲۴ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) سے پیش کیے گئے۔اس ترتیب کے خلاف بھی دو حوالوں پر نظر ڈال لیجیے،

پہلا حوالہ علامہ کے ایک خط کا ہے جو انھوں نے لندن جاتے ہوئے مولوی انشاء اللہ خان مالک و ایڈیٹر وطن لاہور کے نام ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے لکھا تھا۔وہ ایک یونانی سے چینیوں کی قومی سیرت اور وطن دوستی کا تذکرہ سن کر بے قابو ہو کر لکھتے ہیں:

''......ہاں! ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو
ازسرنو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں
جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو
پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال
کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور
مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں کاش! خلیج بنگالہ کی موجیں
ہمیں غرق کر ڈالیں۔

مولوی صاحب! میں بے اختیار ہوں، لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا
ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں؟ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے
دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے۔''

کیا علامہ اقبال کے یہ خیالات بعد میں بدل گئے تھے یا انھوں نے ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا؟ اس بات کا کوئی سراغ ہمیں نہیں ملتا۔ کیا علامہ مرحوم کا کوئی دوست یا دشمن ان کے اِن بلند خیالات اور عزائم کی تغلیط و تردید کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور حقیقت یہی ہے تو مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست سے ان کا رشتہ کون ثابت کر سکتا ہے اور کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ سیاسی اصلاح میں پکے نیشنلسٹ اور سب سے بڑھ کر قوم پرور نہیں تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ قومیت کی حقیقت سے وہ سب سے زیادہ آشنا، سب سے بڑھ کر اس کے ترجمان اور سب سے زیادہ پُرتاثیر ان کا کلام تھا۔

(۲) ۱۹۲۱ء میں انھوں نے زمیندار (لاہور) میں ایک نظم چھپوائی پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی کے خیالات کو پیش کیا ہے اور تحریک ترک موالات کے پس منظر میں پنڈت مالویہ کے مقابلے میں گاندھی جی کو پُروقار شخصیت کا مالک اور مرد پختہ کار، حق اندیش اور باصفا قرار دیا ہے اور ان کے جواب کو جو انھوں نے پنڈت جی کو دیا تھا''قول حق وسدید'' قرار دیا ہے:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کم زور کی کمند ہے دنیا میں نارسا

نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا

گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض تو تیا

پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما

بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و با صفا

خارا حریف سعی ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست در بن دنداں خلال را

(زمیندار۔لاہور،۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء)

اگر گاندھی جی، نہرو خاندان، یا کسی اور رہنما کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات میں کوئی تبدیلی آ گئی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ ترک موالات کے پروگرام کے خاتمے کے اعلان سے کتنے ہی کانگریسیوں اور قومی خیالات رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کو گاندھی جی سے اختلاف تھا اور اس کے بعد گاندھی جی کی چھبیس سالہ زندگی میں اور پنڈت نہرو کی تقریباً چوالیس سالہ زندگی میں ان کے قریبی دوستوں اور ہم سفروں میں سے کئی رہنماؤں کو اختلافات پیدا ہوئے۔ خود حضرت مدنی نے کانگریس کے بیسیوں منصوبوں اور تجویزوں سے اور گاندھی جی اور نہرو کے خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن جب وہ ان فیصلوں اور خیالوں میں ان سے متفق تھے تب بھی انھیں "مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا" نہیں کہا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں علامہ اقبال نے قوم پرستانہ خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ یہ بات بھی حقیقت سے بعید ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مجموعہ ہائے کلام بانگ درا (۱۹۲۴ء)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) خود ہی مرتب کیے اور چھپوائے تھے، کسی اور نے نہیں! ان میں خیالات کی تبدیلی کا کہیں کوئی اشارہ نہیں، پھر یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم یہاں علامہ اقبال کے ایک عقیدت کیش اور ان کے افکار پر محققانہ نظر رکھنے والے خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی فاضلانہ رائے پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں کا یہ خیال کہ آخری دور میں وطن کی محبت اقبال کے دل سے
نکل گئی تھی، بالکل باطل ہے۔ ہندوستان اور اس کے رہنے والوں کے
ساتھ اس کا قلبی رشتہ آخر تک نہیں ٹوٹا۔ اقبال ہندوستان کی زبوں حالی اور
غلامی پر آخر تک آنسو بہاتا رہا......''

یہ اقبال کی شاعری کا ایک اور اہم اور دل چسپ پہلو ہے جس کی طرف خلیفہ عبدالحکیم نے اشارہ کیا ہے، جسے بہ قول عتیق صدیقی اقبال کو اسلامی شاعر کہنے والے یکسر نظر انداز کرتے رہے ہیں (اقبال.... جادوگرِ ہندی نژاد۔ ص ۱۲۲-۱۲۱)

خلیفہ مرحوم لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی روحانیت نے جو برگزیدہ انسان پیدا کیے ہیں، اقبال نے
ان پر نہایت خلوص، فراخ دلی اور وسیع المشربی سے نظمیں لکھی ہیں.....
''باباگرونانک پر اقبال کی ایک مستقل نظم ہے۔ جو اس وقت لکھی گئی تھی،
جب وہ زیادہ تر اسلامی نظمیں لکھ رہے تھے۔ اس نظم کے پہلے شعر میں گوتم
بدھ کو بھی پیغمبر قرار دیا ہے۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی | قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

......بانگ درا میں بڑے خلوص کے ساتھ شری رام چندر جی کی توصیف میں
کچھ اشعار لکھے ہیں۔ اقبال ان کو ہندوستان کا امام یا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں......

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز | اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی | روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند''

(فکرِ اقبال۔ از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۴۸، ۵۲، ۵۳)

اقبال نہایت ذہین، بلند فکر، وطن پرست اور صاحب اخلاص شخص تھے۔ لیکن وہ ایک غریب باپ کے بیٹے اور معمولی خاندان کے فرد تھے اور ان کے اپنے بیان کے سوا کوئی دوسری شہادت موجود نہیں کہ ان کا تعلق کشمیر کے کسی برہمن خاندان سے تھا۔ ان کے اپنے بیان کی صحت پر بھی شبہ کیا گیا ہے۔ یہ احساس انھیں زندگی بھر رہا اور اپنی

غربت کو دور کرنے اور سوسایٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے خیال سے وہ اپنے ذہن کو کبھی آزاد نہیں کر سکے تھے، ان کی عملی زندگی میں کمزوریوں اور حقیقی خیالات کے برخلاف بعض منظومات کی تخلیق کا واقعی پس منظر یہی ہے۔ ان میں ایثار وعزیمت کی کمی بھی تھی۔ اسی وجہ سے وہ سیاسیات میں کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کے ذوق وطن پرستی اور استعمار کے خلاف ان کے واقعی افکار کو ان کے بعض ہندوستانی اور برطانوی استعمار پسند دوست خوب سمجھتے تھے۔ وطن پرستی سے اسلام کی طرف ان کے سفر کا تعلق فکری ارتقا سے زیادہ ان کے دوستوں میں آرنلڈ، براؤن، نکلسن، سرسید امیر علی، میجر حسن بلگرامی کی معلوم رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقبال کو اس کا احساس تھا۔ عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی تالیف ''اقبال...... جادوگر ہندی نژاد'' میں بعض اہم اشارے کیے ہیں۔

اقبال نے ایک بار ترکِ شاعری کا ارادہ کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی عملی میدان میں کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

لیکن مدیر مخزن شیخ عبدالقادر اور آرنلڈ نے اقبال کے اس خیال سے اختلاف کیا اور انھیں اس سے باز رکھا۔ آرنلڈ نے انھیں مشورہ دیا کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سیاسی میدان میں جانے سے اقبال کو روکنے کے لیے پیش بندی تھی اور یہ کہ جب مسلمان ہندوؤں میں تبلیغ کو زندگی کا مشن بنائیں گے تو ان میں مسلمانوں کے خلاف ردعمل پیدا ہوگا اور اختلاف کوئی اور کسی درجے میں بھی ہو، برٹش استعمار کے لیے بہر صورت مفید تھا۔ اقبال کے بقول آرنلڈ کو اسلام سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ صرف خاکِ انگلستان کا وفادار اور شہنشاہیت پسندوں کا دست و بازو تھا۔ تبلیغ اسلام کے مشورے میں اس کی اسلام دوستی کو تلاش نہ کرنا چاہیے۔ یہ مشورہ اس کی استعمار پسندی، وطن (برطانیہ) دوستی اور برٹش قوم کے ہندوستان میں

مفاد کے تحفظ کے جذبۂ صادق کا لازمی اقتضا تھا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد لاہور میں بھی ان کا تعلق ایسے ہی لوگوں سے زیادہ رہا یا وہ ایسے لوگوں میں گھرے رہے جو برطانوی مفادات کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ پنجاب میں مسلم لیگ سے ان کی وابستگی بھی لندن مسلم لیگ سے تعلق کے تسلسل میں تھی۔ تفصیلی مطالعے کے لیے عتیق صدیقی کی تالیف ''اقبال...... جادوگر ہندی نژاد'' (صفحہ ۵۱ تا ۵۲) سے رجوع کرنا چاہیے۔

نہرو خاندان سے علامہ کی عقیدت:

مرزا غلام نبی خانباز نے ''کاروان احرار'' میں علامہ اقبال کی ''کشمیری عصبیت'' کے عنوان سے لکھا ہے:

''اب علامہ اگرچہ قوم پرستی سے شدید متنفر نظر آتے ہیں اور اسے اسلام اور مسلم قومیت کے لیے مہلک تصور کرتے ہیں لیکن ''جاوید نامہ'' میں انھوں نے نہرو خاندان کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جو بنیاد تلاش کی ہے وہ حد درجہ حیران کن اور استعجاب انگیز ہے۔ وہ مسلم قومیت اور قوم پرستی کو یکسر فراموش کر کے علاقہ پرستی میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں۔ کہاں وہ وسعت نظر اور کہاں یہ عصبیت کی تنگ دامانی؟ علامہ موصوف نے اس خاندان کی استخلاص وطن کے لیے جدو جہد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اہل ہند کو ذوق آزادی سے آشنا کرنے کا سہرا ان کے سر پر باندھا ہے جنھوں نے اپنی ذہانت، فطانت، دور رس نگاہ اور سخت محنت سے برطانوی استعمار کو متزلزل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر ان کی اصل خوبی (حسن) یہ ٹھہرا کہ ان کا خمیر سرزمین کشمیر دل پذیر کی مردم خیز خاک سے اٹھایا گیا اور نسلی اعتبار سے وہ کشمیر کے برہمن زادے ہیں۔ ان مشترک اقدار کے سبب وہ معزز، معظم اور محبوب قرار پائے۔ جاوید نامہ میں تذکرہ کے باعث ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے:

هندرا این ذوق آزادی که داد　　　صیدرا سودای صیادی که داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل　　　لالۂ احمر ز روے شاں خجل

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش　　از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامن گیر ماست　　مطلع ایں اختراں کشمیر ماست
خاک مارا بے شرر دانی اگر　　بر درون خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست　　ایں دم باد بہاری از کجاست
ایں ہماں باد است کز تاثیر او　　کوہسار ما بگیرد رنگ و بو

(جاوید نامہ: لاہور، ۱۹۷۰ء (ساتواں ایڈیشن)، صفحہ ۱۹۳)

علامہ اقبال نے یہ اشعار ''غنی'' (کشمیری) کی زبان سے کہلائے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

وہ کون ہے جس نے ہندوستان میں آزادی کا ذوق پیدا کر دیا ہے اور جو خود شکار ہو رہا تھا اسے شکار کرنا سکھا دیا ہے؟ یہ کارنامہ اُن زندہ دل برہمن زادوں کا ہے جن کے سرخ چہروں کو دیکھ کر لالۂ سرخ بھی شرما جائیں۔ ان کی نگاہیں تیز ہیں، وہ پختہ کار، سخت کوش اور صاحب ہمت ہیں۔ ان کی سخت نگاہوں نے فرنگیوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ ان کا تعلق اسی مٹی سے ہے جو میرے دامن سے چمٹی ہوئی ہے۔ آزادی کے یہ پیکر اور حریت کے یہ ستارے میرے (وطن مالوف) کشمیر کے مطلع پر نمودار ہوئے ہیں۔

اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میری خاک میں آزادی کی کوئی جنگاری اور حریت طلبی کی کوئی حرارت باقی نہیں ہے تو ذرا اپنے اندر جھانک کر دیکھ۔ یہ تیرے اندر جو سوز و تپش ہے، وہ کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے اور یہ باد بہاری جو چمن میں ذوق آزادی کے پھول کھلا رہی ہے، کیوں کر پیدا ہوئی؟

یہ سب انھیں برہمن زادگان کی صحبت کا فیضان اور انھیں کے ذوق حریت پرستی سے چلنے والی باد بہاری کی تاثیر ہے کہ کشمیر کے کوہساروں میں رنگ و بو پیدا ہو گیا ہے۔''

۱۰اسی کے باوجود کہ علامہ اقبال کے قطعے میں نہایت سنگین اور توہین آمیز الفاظ

تھے۔ لیکن حضرت مدنی نے ان کا اثر نہیں لیا۔ علامہ اقبال کے انتقال کی خبر سنی تو نہایت وسیع القلبی اور بلند اخلاقی کا ثبوت دیا۔ اس کا اندازہ اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء: آج حضرت شیخ الاسلام میرٹھ میں انجمن اصلاح المسلمین کے جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے۔ انھیں اطلاع دی گئی کہ لاہور میں علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ حضرت نے یہ خبر سنتے ہی انا للہ۔ پڑھا اور رات کے جلسے میں تعزیت کی اور دعاے مغفرت فرمائی۔ مسعود حسین صدیقی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

> ''ہماری انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ تھا رات مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ، کی تقریر تھی اسی دن مولانا کو جامع مسجد میرٹھ کے باہر کار سے اترتے وقت اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حضرت نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رات کو جلسے میں تقریر سے پہلے اس حادثے کا دلدوز انداز میں تذکرہ فرمایا اور حاضرین سے کہا کہ سب ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ چناں چہ مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعاے مغفرت کی۔ یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولانا کے خلاف قومیت کے مسئلے پر اتنے سخت الفاظ استعمال نہ کیے ہوتے۔''

(''مولانا حسین احمد مدنی۔ حیات اور کارنامے'' از ڈاکٹر فرید الوحیدی، ص ۲۵۶)

(۵)

صحافتی بددیانتی

خواجہ عبدالوحید (لاہور)

علامہ سر محمد اقبال اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی:

''مولانا سید حسین احمد مدنی کے بیان پر جب علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا تھا تو ''ارمغانِ حجاز'' کے مرتب اور ناشر کو علامہ

مرحوم کی وہ رباعی مجموعۂ کلام میں شایع نہیں کرنی چاہیے تھی، یا اس پر نوٹ
لکھ دیا جاتا کہ مرحوم نے اس سے رجوع کرلیا تھا۔ لیکن مرتب اور ناشر
نے ایسا نہیں کیا۔ یہ اصولِ تدوین کے صریح خلاف اور قطعی بددیانتی ہے۔
حال آں کہ مسٹر محمد علی جناح کے بارے میں جو تیز و تند کلام ان کی زبان
فیض ترجمان سے نکلا تھا، اسے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔
خواجہ عبدالوحید مرحوم جو علامہ اقبال مرحوم سے نہایت درجے عقیدت
رکھتے تھے اور خاندان کے تعلقات تھے اور انھوں نے علامہ مرحوم کے
احوال و افکار پر بہت لکھا ہے اور علامہ کی پہلی جامع ببلیوگرافی انھیں نے
مرتب کی اور ان کی ڈائری کے اندراجات علامہ اقبال سے ان کے قریبی
تعلق و عقیدت کے غماز ہیں۔ اس کے باوجود وہ مرتب ''ارمغان حجاز''
کے رویے سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور یہ مضمون لکھا۔'' (ا۔س۔ش)

آج کل مسلمان اخبارات مغربی اصولِ پروپیگنڈا کا جس قدر گندا استعمال
کررہے ہیں، اس کی ایک نہایت ہی شرم ناک مثال حضرت مولانا حسین احمد صاحب
مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے خلاف علامہ سر محمد اقبالؒ کے ان اشعار کی متعدد
بار اشاعت ہے جو مرحوم نے ''ملت اور وطن'' کی بحث کی ابتدا میں کہے تھے۔ قارئین
کو یاد ہوگا کہ آج سے آٹھ سال پیشتر (یعنی ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء میں) حضرت مولانا
مدنی مدظلہ العالی نے صدر بازار دہلی کے ایک جلسے میں تقریر فرماتے ہوئے یہ کہا تھا کہ
''موجودہ زمانے میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔''
حضرت علامہ سر محمد اقبال، حضرت مولانا کے بدخواہوں کے پروپیگنڈے سے متاثر
ہوگئے، اور انھوں نے جذباتی لمحات میں یہ فرض کرتے ہوئے کہ مولانا نے یہ کہا تھا
کہ ''ملت کا دار و مدار وطن پر ہے۔'' چند نہایت ہی افسوس ناک شعر کہہ دیے۔ علامہ
مرحوم نے جس جذبے کے ماتحت وہ اشعار کہے وہ یقیناً بہت قابل قدر تھا، اگرچہ حقیقتاً
ان کے متاثر ہونے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی، ایک غلط اطلاع سے ان کے جذبات

مجروح ہوئے تھے۔ اگر اظہار جذبات سے پہلے تحقیق حال کر لی جاتی تو شرارت پسند عناصر کو کیچڑ اُچھالنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ بہر حال علامہ مرحوم کے قلم سے شعر نکل گئے اور چوں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آیا کرتا، حضرت علامہ کے اس معاملے کو اپنی زندگی میں با حسن وجوہ ختم کر دینے کے باوجود آج تک دشمنانِ دین ان اشعار کو اُچھالتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علامہ سر محمد اقبال کا وہ آخری خط جو مرحوم نے اس سلسلے میں لکھا تھا، روزنامہ ''احسان'' کے فائل سے نقل کر دیا جائے۔ وہو ہذا:

قومیت و وطنیت کی بحث کا خاتمہ:

مدیر روزنامہ احسان کے نام علامہ اقبال کا خط

جناب ایڈیٹر صاحب ''احسان'' لاہور

السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد کے بیان پر کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شایع ہو چکا ہے، اس میں اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا ارشاد کہ ''زمانۂ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔'' محض برسبیل تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریۂ وطنیت کو اختیار کریں تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار ''انصاری'' میں شایع ہوا ہے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

> ''لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے اور کوئی نہیں، جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ دیا ہے، اور اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار ''احسان'' میں شائع ہوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا، جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو ارسال کی ہے اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

''میرے محترم سر صاحب موصوف کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کرلیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ لاحق و سابق پر نظر ڈال لی جائے۔ میں عرض کررہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو اپنا کرنا چاہیے۔ خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا، نہ امر اور انشا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ پھر اس سے مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔''

خط کے مندرجۂ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا، میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں، خدا تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے، نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔

محمد اقبال''

قارئین علامہ مرحوم کے مندرجہ بالا خط کو پڑھیں اور دیکھیں کہ مرحوم نے کس

اخلاص اور دیانت کے ساتھ یہ ''اعتراف'' کرلیا تھا کہ اس کے بعد انھیں ''کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔'' اور مرحوم کے ان الفاظ کے بعد کیا دوسروں کو لازم نہ تھا کہ وہ ان اشعار کے تذکرے سے باز آجاتے جو مرحوم نے عالم جوش میں فرمائے تھے۔ لیکن دشمنانِ دین کے ترکش کا آخری تیر بھی استعمال میں آیا اور علامہ محترم کی وفات کے بعد جب ان کا اردو مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' چھپا تو اس میں وہ اشعار بھی شامل تھے، جو لوگ مرحوم کی طبیعت سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ''ارمغان حجاز'' کی اشاعت مرحوم کی زندگی میں ہوتی تو یہ اشعار بھی شایع نہ ہوتے، لیکن مرحوم کے کلام کی اشاعت اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ علمائے کرام کے خلاف کیچڑ اُچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس لیے وہ اشعار ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل کردیے گئے۔

اس سلسلے میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان چند اصحاب میں سے جو مرحوم کے آخری ایام حیات میں ان کے رفیق کار تھے، بعض اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علامہ مرحوم کا ارادہ ان اشعار کو اپنے مجموعہ کلام میں شایع کرنے کا ہرگز نہ تھا۔ ''ارمغان حجاز'' کو مرتب کرنے والوں میں سے کسی شخص کی شرارت پسندی سے ایسا ہوا۔ (۱) (زمزم-لاہور: ۷راگست ۱۹۴۵ء)

(۱) خواجہ عبدالوحید علیہ الرحمہ نے مجھے اور بعض دیگر حضرات کے بہت سے مضامین کے تراشے دیے تھے، ان میں ایک یہ مضمون بھی تھا جو ابھی آپ نے مطالعہ فرمایا ہے۔ اس مضمون میں اور خاص طور پر اس کے آخری پیراگراف کو میں نے ان کے ٹھنڈے مزاج اور تحمل کے خلاف پایا۔ مضمون کے بعد جو بات دریافت کی اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہ چودھری محمد حسین تھے جنھوں نے یہ قطعہ ارمغانِ حجاز میں شامل کیا تھا۔ اس وقت مجھے اصل واقعے کا علم نہ تھا۔ اس لیے مجھے کوئی خاص دل چسپی پیدا نہ ہوئی۔ لیکن یہ بات ذہن میں محفوظ رہی۔ زیرنظر رسالہ مرتب کیا تو اصل واقعہ علم میں آیا اور خواجہ صاحب مرحوم کے مضمون کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوا۔ اور مضمون کے پس پردہ ان کے اشتعال کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ (ا۔س۔ش)

استدراک

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے دہلی میں جو تقریر کی تھی روزنامہ الامان - دہلی کی غلط رپورٹنگ نے ایک فتنہ پیدا کر دیا۔ یہ روداد لاہور کے اخبارات میں پہنچ کر اور زہریلی بن گئی۔ علامہ اقبال اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ مولانا مدنیؒ کی شان میں ایک توہین آمیز قطعہ لکھ دیا۔ لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ اس باب میں ان سے زیادتی ہوئی ہے تو انھیں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور اس عزم کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ اس قطعے کو اپنے کلام میں شامل نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالرشید نسیم طالوت نے مولانا مدنیؒ سے مراسلت کر کے علامہ اقبال کو صحیح صورت حال سے مطلع کر کے بڑا کام کیا لیکن علامہ کی غلط فہمی دور کرنے، رائے سے رجوع کرنے، قطعے کے واپس لینے اور آیندہ کسی مجموعے میں شامل نہ کرنے کے عزم کا اظہار کرانے میں مولانا احمد علی لاہوریؒ کا حصہ مولانا طالوت سے زیادہ تھا۔ اس میں پس پردہ اشرار کی بہت بڑی شکست تھی۔ لیکن آخری اور تیسری بات پر عمل درآمد رہ گیا تھا کہ حضرت علامہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور اشرار کو موقع مل گیا کہ وہ علامہ مرحوم کا قطعہ "ارمغانِ حجاز" میں شامل کر کے چھپوا دیں۔

علامہ اقبال کے قریبی حلقے جانتے تھے کہ یہ کس نے اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا ہے لیکن عام طور پر اس کی شہرت نہیں تھی۔ مجھے حضرت خواجہ عبدالوحید علیہ الرحمہ سے ایک صحبت میں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ چودھری محمد حسین تھے۔ لیکن اس وقت اصل واقعے کا چوں کہ مجھے کوئی خاص علم نہ تھا، اس لیے اس معاملے سے مجھے کوئی دل چسپی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب جب کہ زیر نظر رسالہ مرتب کر رہا تھا تو اس معاملے کی مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے مولانا اسحاق بھٹی سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی راز کی بات کبھی نہ تھی۔ متعدد لوگوں سے مختلف مجلسوں میں بارہا اس کا تذکرہ آیا، اس پر اظہار تاسف ہوا لیکن

استعجاب کسی نے نہیں کیا۔ ایک روز پروفیسر سلیم چشتی کے ایک شاگردِ رشید جناب محمد زین العابدین صاحب سے ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ ان کے نظر سے ''ارمغانِ حجاز'' کا ایک نسخہ گذرا ہے جس کے حاشیے پر چشتی مرحوم کے قلم سے یہ جملہ تحریر تھا: ''یہ چودھری محمد حسین کی شرارت ہے۔'' لیکن انھوں نے حالات سے مزید واقفیت کے لیے مولانا اصلح الحسینی صاحب سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ مولانا سے ملاقات میں اس بات کی توثیق ہوگئی۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی جس کارگزاری کا ذکر آیا ہے وہ انھی کی روایت کا حصہ ہے۔ مولانا اصلح الحسینی ایک زمانے میں صحافت سے وابستہ اور لاہور میں مقیم تھے۔ یہ جنگ عظیم ثانی کا زمانہ تھا، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے مسلک و مشرب کے علاوہ قربت کے تعلقات اور یوسف سلیم چشتی سے دوستی کا رشتہ تھا۔ اور چوں کہ زمزم اخبار کے نایب مدیر تھے اس لیے اخبار کو سنسر کروانے کے لیے ہفتے میں تین بار چودھری محمد حسین کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ فرض شناس آفیسر تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی روزانہ ملاقات ان کے ادبی ذوق اور علامہ اقبال سے دوستی کا نتیجہ نہیں ان کے فرایض کا حصہ بھی تھا۔ (ا۔س۔ش)

۶

مطالعۂ تحریک پاکستان

تحریک پاکستان کا سیاسی، مذہبی، معاشی، اقتصادی

اور

دیگر پہلوؤں سے مطالعہ

نقد و تبصرہ کی نگاہ سے

مبصرین و ناقدین

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری

مولانا ابرار احمد صدیق سیوہاروی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

مرتب

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

فہرست

تحریک پاکستان پر ایک نظر

از قلم

مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ناظم اعلا جمعیت علما ہند

ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ النبی الاُمی الکریم

پاکستان سیاستِ حاضرہ کا اہم ترین نقطۂ بحث ہے، اور ایک بے پناہ منظم پروپیگنڈہ نے اس کو جذباتِ مسلم کا محور بنا دیا ہے، اس کے خلاف کچھ لکھنا یا کہنا گویا طوفان کی لہروں سے کھیلنا ہے،

لیکن حق و انصاف، دیانت و صداقت،، استقلال و ثبات کبھی بھی طوفانِ باطل سے مرعوب نہیں ہو سکتے، اس کا تقاضا ہمیشہ یکساں رہتا ہے، اور بااحساس صاحبِ دیانت انسان کو حق گوئی اور صاف گوئی پر مجبور کرتا رہتا ہے، لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ حقیقتِ حال کی وضاحت کے لیے پارٹی فیلنگ سے بالاتر ہو کر محض اس لیے کچھ لکھا جائے کہ مسئلہ زیرِ بحث ہندوستان میں مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لیے کیا واقعی نسخۂ کیمیا ہے؟ یا سیاسی کیمیا گروں کا محض ایک کیمیاوی فریب ہے؟ جو محض ذاتی اقتدار یا پارٹی سے اقتدار کی خاطر ایک جماعت کو شکست دینے کے لیے حکومت کے اشارہ سے عالمِ وجود میں آیا ہے، اس لیے اسلام اور مسلم مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم کو کسی جماعت کی مخالفت یا موافقت کو نظر انداز کر کے صرف اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرنی چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لیے مفید ہے یا مُضر؟ کیونکہ یہ ایک مسلّمہ عقلی نظریہ ہے کہ جب کسی مسئلہ کی

اصل حقیقت اور اس کی حقیقی حیثیت سے قطع نظر کرکے اس کو دوسروں کی مخالفت کے جذبہ کے ساتھ سوچا جاتا ہے، تو اکثر و بیشتر اس کے نتائج و ثمرات بجائے بہتر ثابت ہونے کے بدتر ظاہر ہوتے ہیں، اور اس میں افادیت کی جگہ ضرر ہاتھ آتا ہے، اور اس کا نتیجہ برائے شگون میں اپنی ناک کٹانا ہو جاتا ہے، جو مضامین اس مسئلہ کے متعلق اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے، افسوس کہ ان میں دلائل کی جگہ بیشتر جذبات کی فراوانی، اپنے خیال کے مخالفوں پر طعن و تشنیع، غلط حوالوں سے غلط نتائج کا اختراع اور ان تمام باتوں کے علاوہ دانستہ یا نادانستہ غلط بیانی بکثرت پائی جاتی ہے،

بتقاضائے حسن ظن مضمون نگاروں کے صدق نیت اور اخلاص کے باوجود اُن کی یہ لغزشیں غالباً اسی پارٹی فیلنگ کی رہین منت ہیں جس نے اصل حقیقت کے فہم و ادراک سے بے نیاز کرکے آجکل دماغوں کو مفلوج بنا رکھا ہے،

پاکستان کے حامیوں کے مضامین میں سب سے بڑی خامی جو مسئلہ کو کسی طرح صاف نہیں ہونے دیتی، یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک اہم قانونی اور کانسٹی ٹیوشنل مسئلہ کو ہندوؤں کی تنگ نظری اور ان کی فرقہ پرستانہ ذہنیت کی پیداوار کہہ کر مخالفانہ جذبات کی رَد میں گم ہو جاتے ہیں، اور اس مسئلہ کے مفید ہونے کے دلائل سے نظر بچا کر محض دفاعی سوال و جواب پر بحث کرکے مسئلہ کو ختم کر دیتے ہیں، اور اس کی بنیادی تفاصیل کی تشریح کے جواب میں بھی صرف اسی قسم کا جواب دے کر سبکدوش ہو جاتے ہیں، جیسا کہ پادری فنڈر نے تثلیث کے اعتقاد پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ” ایک کس طرح تین اور تین کس طرح ایک ہو سکتے ہیں ،، میزان الحق میں یہ کہدیا کہ ” یہ مسئلہ اگرچہ بنیادی ہے مگر اس کی تشریح اس دنیا میں ناممکن ہے، مگر اس پر اعتقاد ضروری ہے ،، عام طور پر قوم پرور مسلمانوں کے

خلاف غم و غصہ کے اظہار کے لیے اس مسئلہ کو صرف عنوان بنا لیا جاتا ہے، اس مسئلہ کی اصل حقیقت پر بحث کرنا مقصد نہیں ہوتا، ورنہ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں کہ:
"ہندوؤں کی عام ذہنیت ہمیشہ سے تنگ نظری سے ملوث ہے، اور روہ ناپ تول کی زندگی کے عادی ہونے کی وجہ سے سیاسیات میں بھی سخت تنگدل واقع ہوئے ہیں"
قوم پرور مسلمانوں اور فرقہ پرست مسلمانوں یا پاکستانی اور غیر پاکستانی مسلمانوں کے درمیان کبھی بھی دو رائیں نہیں رہیں، ہمیشہ اختلاف اس بارے میں رہا ہے کہ ان کے خصائل کے باوجود اس ملک میں اپنی آزاد حیاتِ اجتماعی کو واپس لانے، اس کو برقرار رکھنے اور ملک کی غلامی کی لعنت کو دُور کرنے کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟ اس لیے کہ ہندوؤں کی پیدائشی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے یقین کے باوجود بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا صحیح علاج پاکستان ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ دو باتیں لازم و ملزوم نہیں ہیں، ہو سکتا ہے (اور ہے) کہ اس کا علاج پاکستان کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ پر کیا جائے! اور یہی وہ دوسرا طریقہ ہے جس کو آزاد مسلم کانفرنس اور جمعیۃ علمائے ہند اپنے مختلف اجلاسوں میں واضح کر چکی ہیں کہ وہ باہم جمع ہو کر اس اسکیم اور پاکستانی اسکیم دونوں پر غور کر کے ایک متحدہ آواز بنا لیں، مگر اس کا جواب مسلم لیگ کی جانب سے بجز نفی کے اور کچھ نہیں دیا گیا، ممکن ہے جذباتی نوجوانوں کے نزدیک الہامی اور اسلامی طریقۂ کار وہی ہو جو مسلم لیگ نے اختیار کیا ہے،
غرض ضرورت اس کی ہے کہ مسئلہ پاکستان اور اس کی نعم البدل اسکیم پر سیر حاصل بحث کی جائے، تاکہ لوگوں کی توجہ اتہامی طعن و تشنیع سے الگ ہو سکے، اور اسلام کے قدیم اصولِ بحث پر حقیقتِ حال منکشف ہو سکے،

مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی ضرورت

مسلم لیگ پاکستان کیوں چاہتی ہے؟ اس کے جواب میں حامیانہ نقطۂ نظر

سے آجتک جس قدر کہا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ملک میں جہاں مسلمان ایک مستقل قوم کی حیثیت میں موجود ہوں اور وہاں مختلف اقوام میں سے ایک دوسری قوم ایسی بھی آباد ہو جو ملک کے مجموعہ کے لحاظ سے اکثریت میں کہی جا سکتی ہے تو ایسی حالت میں آزاد ہندوستان میں مسلمان ہرگز ایسی پوزیشن میں رہنا نہیں چاہتے کہ وہ ملک کی اقلیت کہلائیں، کیونکہ وہ درحقیقت اقلیت نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل قوم ہیں، اور چونکہ آبادی کے لحاظ سے بعض حصص ملک ایسے موجود ہیں جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں لہٰذا ان حصّوں کو ملک کے اُن حصّوں سے جدا کر دیا جائے جن میں ہندو اکثریت ہے، تاکہ اپنے حصص ملک میں مسلمان اپنی مرضی سے آزادی کا فائدہ اٹھا سکیں، کیونکہ وہ اگر کسی صورت میں بھی مجموعۂ ہندوستان کا جزء یا حصہ رہیں گے تو وہ اکثریت کے ماتحت ہوں گے، اور مستقل حیثیت نہ حاصل کر سکیں گے، اور ہمیشہ اقلیت اور اکثریت کی جنگ رہے گی، اور ملک میں کبھی بھی اطمینان اور امن پیدا نہ ہو سکے گا،

یہی وہ نظریہ ہے جو مسٹر جناح سے لے کر اُن کے تمام معتقدین کی زبان و قلم کے ذریعہ یکساں طور پر ظاہر کیا جا رہا ہے، اور اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہترین طریق کار "پاکستان" تجویز کیا گیا ہے،

پاکستان ؟

"پاکستان" کس نظامِ حکومت یا طرزِ حکومت کا نام ہے، اس کے لیے لاہور ریزولیوشن کی رُو سے اس وقت تک مسلم لیگ کے قائدِ اعظم اور ان کے پیرووں نے "بذریعہ الہام" ابتک جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ "دو قوم کی تھیوری" مان کر ایک چوتھائی ہندوستان اس طرح مسلمانوں کو دیدیا جائے کہ وہ "برٹش

کامن ویلتھ" کے زیر سایہ پنجاب، سرحد، سندھ، اور بلوچستان کو ملا کر ایک مسلم منطقہ حکومت قائم کر لیں، اور بنگال اور آسام کے مسلم اکثریت رکھنے والے چند اضلاع کو ملا کر دوسرا منطقہ حکومت بنالیں، اور پھر ان دونوں کا ایک فیڈریشن ہو جو اپنے تمام معاملات میں باقی ہندوستان کی حکومت سے قطعاً آزاد ہو، اور اپنی مرضی سے تین چوتھائی ہندوستان کا حلیف رہے یا حریف رہے ہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے کہ آزاد ہندوستان میں مسلم لیگ کے ناخداؤں نے جو "الہامی اسکیم" تجویز فرمائی ہے وہ کہاں تک اس مقصد کو پورا کر سکتی ہے؟ جس غرض سے یہ تجویز بقول قائد اعظم مسلمانوں کا "دین وایمان" بن چکی ہے،

"پاکستان کی حقیقت"

جس پاکستان کا مطالبہ مسلم لیگ کر رہی ہے ظاہر ہے کہ وہ "اسلامی حکومت" کا دوسرا نام نہیں ہے، جیسا کہ خود مسٹر جناح اور دوسرے حامیانِ پاکستان نے اس کو صاف صاف تسلیم کر لیا ہے، اگرچہ قوم پرور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے مسلم لیگ کے ذمہ دار قائدین آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسولؐ پڑھ پڑھ کر اس افترا سے بھی نہیں چوکتے، کہ وہ پاکستان کہہ کر خالص اسلامی حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں، "پاکستان" کس طرح اسلامی حکومت کہا جا سکتا ہے جبکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس نظامِ حکومت میں غیر مسلم اقوام کو تناسبِ آبادی کے لحاظ سے حکومت کے ہر شعبہ میں خصوصاً مجلس قانون ساز اور کیبنٹ (وزارت) میں حصہ دار بنایا جائے گا، جیسا کہ یورپین جمہوری نظام کا تقاضہ ہے، حالانکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم صرف ایک ذمی کی حیثیت میں امن واطمینان اور عدل وانصاف کے ساتھ رہ سکتے ہیں، لیکن نظامِ حکومت کے کارفرما شعبوں میں مطلق اُن کا

کوئی دخل نہیں ہو سکتا، اور مجلس وضع قوانین کا تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،

اسی طرح مسلم لیگ کے قائدِ اعظم نے یہ بھی صراحت کردی ہے کہ "پاکستان" ایسے طرزِ حکومت کا نام نہیں ہوگا جس میں یہ شرط ہو کہ مسلم حکومت میں ایک بھی غیر مسلم آباد نہ رہے، اور ہندو ہندوستان میں کوئی مسلمان سکونت پذیر نہ رہے، اور دونوں قوموں کے درمیان تبادلۂ آبادی کے اصول پر "ہجرت" کا اصول کار فرما ہو، اور عملاً یہ کیسے ممکن ہے جبکہ مسلم قومیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے مشاہد، مقابر، مساجد، آثارِ قدیمہ اور ثقافت و تمدّن مسلم اکثریت کے صوبوں سے کم نہیں، بلکہ زائد ہیں، اور مسلمان کسی حال میں بھی ان کو نہیں چھوڑ سکتے،

تو اب تیسری صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ "پاکستان" ایسی حکومت کا نام ہوگا جو مسلم اکثریت کی پوزیشن کے ساتھ یورپین جمہوری نظام کے قالب میں ڈھلا ہوا ہو، یعنی قانون ساز جماعتوں (اسمبلیوں اور کونسلوں) اور کیبنٹ (وزارت) میں اقلیت بھی بہ حصۂ تناسبِ آبادی حقدار ہوگی، اور مسلم غیر مسلم نمائندوں کے اجتماع اور یک جہتی کے اصول پر اس کی ترتیب قرار پائے گی،

پس اگرچہ اس اصول پر "پاکستان" عمل میں آئے گا تو قوم پرور مسلمانوں کو شکست دینے اور شخصی یا پارٹی اقتدار حاصل کرنے کے لیے "پاکستان" کو یہ کہنا کہ ہم "اسلامی حکومت" بنا رہے ہیں بہت بڑا سیاسی فریب ہے جو ایسے نازک وقت میں اور زیادہ قابلِ نفرت ہو جاتا ہے جب کہ مسلمانوں کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ مسلم مفکرین اور اربابِ سیاست ان مختلف اسکیموں پر غور و خوض کریں جو ہندوستان میں مسلمانوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے ہندوؤں کے مساوی آزاد رہنے کا حق دیتی ہوں، اور پھر تبادلۂ خیالات کے بعد کسی ایسی اسکیم اور فارمولے کو وضع کر کے حکومت اور کانگریس دونوں کے سامنے متحدہ آواز

کے ساتھ پیش کر سکیں، ایسے وقت میں کسی ایک سیاسی نظریہ یا اسکیم کو مذہب اور ایمان بنا کر عوام فریبی سے کام لینا معلوم نہیں ایمانیات کا کونسا درجہ رکھتا ہے، اور "الہام سیاسی" کی کونسی قسم میں داخل ہے؟ —— خصوصاً جبکہ دوسری مقتدر اسلامی جماعتیں اور ان کے معزز رہنما مسلم لیگ کے ناخداؤں کو بار بار دعوت دیتے ہوں کہ متحدہ آواز پیدا کرنے کے لیئے ایک مرتبہ تم کو —— یا ہم کو اس اسکیم پر اس لیے غور کر لینا ضروری ہے کہ ہم سب اس بارے میں متفق ہیں کہ مستقبل کے آئین میں مسلمان ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مساوی قوم کی حیثیت میں ہوں،

الحاصل "پاکستان" کی اس آخری صورت میں کہ جو مسٹر جناح کی نظر میں "صحیح پاکستان" ہے ہم کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے اجزاء کی تحلیل کر کے یہ معلوم کریں کہ جس غرض اور جس مقصد کی خاطر یہ "الہامی اسکیم" منصۂ شہود پر آئی ہے کیا وہ واقعی اس مقصد کو پورا کرتی ہے یا نہیں کرتی؟

باب اول:

پاکستان اسکیم - ایک مطالعہ

مسائل اور اندیشہ

پاکستان سیاسی نقطہ نظر سے

ہندوستان میں صوبوں کی جو تقسیم آج موجود ہے اور جن کی نئے سرے سے تقسیم کو اربابِ لیگ بھی پسند نہیں فرماتے ان میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، شمال مغرب میں اور بنگال مشرق میں متعین ہیں، اور بنگال میں آسام کے ان چند اضلاع کو بھی شمار کر لینا چاہیے جن میں مسلمانوں کی خاص اکثریت پائی جاتی ہے،

ان صوبوں میں مسلم لیگ کے پاکستانی اسکیم کے مطابق شمال مغرب کے صوبوں کا ایک منطقہ ہوگا، یا یوں کہیے کہ مسلم حکومت ہوگی اور بنگال اور چند اضلاع آسام کا دوسرا منطقہ بنے گا، اور دوسری مسلم حکومت قرار پائے گی، ہندو ہندوستان کے دو صوبوں، یو، پی اور بہار پرسے جست کر کے دونوں حکومتوں کا ایک فیڈریشن بنایا جائے گا، اور دونوں کو ملا کر ایک مستقل اور آزاد حکومت قائم کی جائے گی، تو اب ہم اس اسکیم کو پیشِ نظر رکھ کر جب غور سے کام لیتے اور جذبات سے بالاتر ہو کر عقل سلیم اور فکرِ قویم کو راہنما بناتے ہیں تو ان دونوں منطقوں کی سیاسی پوزیشن جن اجزاءِ ترکیبی سے مرکب ہوتی ہے ان کی کل آبادی اور مسلم آبادی کے اعداد و شمار اور تناسب فیصدی حسب ذیل ہے، یہ اعداد و شمار اور تناسب فی صدی لیگ کے اردو ترجمان روزنامہ منشور مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہو چکے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ منشور میں غلطی سے

آسام کی مسلم آبادی بجائے ۳۴ لاکھ ۴۲ ہزار ۴ سو ۷۹ کے ۳ لاکھ ۴۴ ہزار ۴ سو اُناسی شائع ہوئی ہے، اور صوبہ سندھ کا فی صدی تناسب نہیں بیان کیا، نیز صوبہ بل کی کُل آبادی منشور میں شائع نہیں کی گئی، ہم نے کُل آبادی کے اعداد چودھری رحمت علی صاحب کے تبصرہ سے اخذ کیے ہیں، جس کو انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر ایک جامع تبصرہ کے عنوان سے شائع کیا ہے:۔

پنجاب:۔ کُل آبادی ۲ کروڑ ۸۴ لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو انیس۔

مسلمان: ایک کروڑ باسٹھ لاکھ ستر ہزار دو سو بیالیس:

فی صدی تناسب: ۵۷،

سرحد:۔ کُل آبادی تیس لاکھ اڑتیس ہزار سر سٹھ،

مسلمان: ستائیس لاکھ اٹھاسی ہزار سات سو ستانوے،

فی صدی تناسب: ۹۱٫۸

سندھ:۔ کُل آبادی پینتالیس لاکھ پینتیس ہزار آٹھ

مسلمان پینتیس لاکھ آٹھ ہزار تین سو پچیس

فی صدی تناسب: ۷۳

بلوچستان:۔ کُل آبادی: پانچ لاکھ ایک ہزار چھ سو اکتیس

مسلمان: چار لاکھ اڑتیس ہزار نو سو تین

فی صدی تناسب: ۸۷٫۵

بنگال:۔ کُل آبادی: چھ کروڑ تین لاکھ چھ ہزار پانچ سو پچیس

مسلمان: تین کروڑ تیس لاکھ پانچ ہزار چار سو چونتیس

فی صدی تناسب: ۵۴٫۷

آسام:۔ کُل آبادی ایک کروڑ دو لاکھ چار ہزار سات سو سینتیس

مسلمان ؛ چونتیس لاکھ بیالیس ہزار چار سو اُناسی
فی صدی تناسب ؛ ۷ ، ۳۳

پاکستانی صوبوں کی کُل مردم شماری :۔ دس کروڑ ستّر لاکھ چار ہزار سات سو تراسی ،

کل مسلمان ؛ پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ ایک لاکھ دو سو ستانوے ،
غیر مسلم ؛ چار کروڑ اُناسی لاکھ تین ہزار چار سو چھیاسی ،

یعنی دس کروڑ ستر لاکھ کے مجموعہ میں مسلمان غیر مسلم سے صرف ایک کروڑ گیارہ لاکھ ستانوے ہزار آٹھ سو گیارہ زائد ہیں ، یعنی دس فی صدی ، مجموعی حیثیت سے ، ساٹھ فی صدی مسلمان اور چالیس فی صدی غیر مسلم ، جن میں سکھ پنجاب میں اور عیسائی بنگال میں ، دو اقلیتیں ہیں ، جو ہمیشہ اپنی تناسبِ آبادی سے زیادہ نمائندگی حاصل کرتی رہیں ،
اس کے برخلاف ہندو ہندوستان میں صوبہ مدراس میں مسلمان ۹ ، ۷ فیصدی ، بمبئی میں ۲ ، ۹ فی صدی ، یو ، پی میں ۳ ، ۱۵ فی صدی ، بہار میں ۱۳ فی صدی ، سی ، پی ۷ ، ۴ فی صدی اور اُڑیسہ میں ۷ ، ۱ فی صدی ،
مختصر یہ کہ ہندو ہندوستان کی مجموعی آبادی تقریبًا تیس کروڑ ہے ، جس میں مسلمان ، تقریبًا پونے تین کروڑ یعنی دس فی صدی سے بھی کم ،
اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک جانب ہم نے تقریبًا دس فی صدی مسلمانوں کو ہندو ہندوستان میں ایک غیر مؤثر اقلیت بنا کر مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کو تسلیم کردہ اصول کے مطابق ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا منظور کر لیا ،
اور دوسری جانب مسلم اکثریت کے صوبوں میں دو ایسی پاکستانی حکومتیں ، اور ایک پاکستانی فیڈرل حکومت قائم کی جس میں غیر مسلم اقلیت اڑتیس سے لے کر چالیس فی صدی تک بے حد مؤثر اور طاقتور اقلیت موجود رہی ، اور یہ ظاہر ہے کہ یورپین

جمہوری نظام کے اصول پر جو بہر حال دونوں قسم کے ہندوستان میں جاری ہو گا، کسی حکومت کا اس وقت تک چلنا ناممکن ہے، جب تک وہ اس قدر مؤثر اقلیت کو کلی طور پر مطمئن اور راضی کر کے حکومت نہ کرے، خصوصاً جبکہ وہ اقلیت سیاسی اور اقتصادی دونوں حیثیت سے مسلمہ طور پر مسلمانوں سے زیادہ قوی ہو،

اس کے برعکس ہندوستان میں بارہ فی صدی یا مختلف صوبوں میں بارہ چودہ فی صدی اور کم ہو کر چار اور تین فی صدی وہ اقلیت ہے جو غیر مؤثر اور ہر وقت قابلِ نظر انداز ہو سکتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ اقلیت مالی اور سیاسی دونوں حیثیت میں غیر مسلم اقوام سے پیچھے ہو،

پاکستان کا یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے کہ تقریباً دس کروڑ مسلمان جو ایک ہی ملک میں اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ جس مقصد اور غرض کے لیے ایسا کیا جا رہا ہے وہ بھی پورا نہیں ہوتا، اور تقریباً ⅓ مسلم آبادی مسلم لیگ کے اصول کے مطابق ہندوؤں کی اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی ہے، اور ⅔ کے لیے ایسی حکومت وضع کی جاتی ہے جس میں اگرچہ عددی تناسب کے لحاظ سے وہ اکثریت میں رہتے ہیں، مگر ایسی اکثریت میں جو یورپین جمہوری نظام کے پیشِ نظر مؤثر اور معتدبہ غیر مسلم اقلیت کی رضا کی ہر وقت محتاج رہے گی،

اور اس کے برعکس ہندو ہندوستان میں ہندوؤں کو ایسی مضبوط حکومت بنا دینے پر اصرار ہے جس میں مسلمان غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جاتے ہیں، لیکن اس مقام پر پہنچ کر ہر ایک پاکستانی دلائل اور اسباب سے جدا ہو کر محض جذباتی بن جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ ہماری حکومت قائم ہو جائے پھر ہم مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی اپنی حکومت کا دباؤ ڈال کر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کریں گے، اور اپنی معمولی

سی اکثریت کے باوجود مؤثر اور معتدبہ اقلیت کو قابو میں رکھ سکیں گے،

مگر یہ حضرات ایسا کہہ کر خود فریبی یا ابلہ فریبی میں مبتلا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، یا بقول شخصے "بیوقوفوں کی جنت کا خواب دیکھتے ہیں" کیا کوئی عاقل اور ذی ہوش انسان یہ مان سکتا ہے کہ اگر ایک حکومت میں دوسری قوم کے حقوق کو پامال کیا جارہا ہو تو اس کا صحیح مداوی یہ ہو سکتا ہے کہ اس حکمران قوم کے جو افراد دوسری قوم کی حکومت میں آباد ہوں ان کا انتقام ان سے لے؟

کیا یو، پی اور بہار کے مظلوم مسلمانوں کا انتقام پنجاب اور بنگال کے ہندوؤں سے لینا مذہب یا اخلاق یا قانون و آئین کسی نظریہ سے بھی صحیح ہو سکتا ہے؟ اور اگر صحیح بھی ہو تو کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟

بیشک جو حضرات آئینی حکومتوں اور ان کی ذمہ داریوں سے ناآشنا محض "براتِ عاشقاں برشاخِ آہو" کی طرح خیالی دنیا میں بسر کرنے کے عادی ہیں وہی صرف ایسا کہہ سکتے ہیں، ورنہ اس سے زیادہ طفلانہ خیال دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، خصوصاً پاکستانی حکومت میں تو یہ قطعاً ناممکن ہے، اس لیے کہ اس کا تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک جانب یو، پی اور بہار میں مسلم اقلیت ستائی جارہی ہو گی اور دوسری جانب مسلم حکومت جب ان کے انتقام کے لیے اپنی معتدبہ اور مؤثر اقلیت کو ستائے گی تو ان کے احتجاج اور پروٹسٹ بلکہ ڈیڈلاک کی بدولت خود اپنی حکومت میں اضمحلال پیدا کررہی ہو گی، یا ہندو حکومت پر کسی مفروضہ پیکٹ کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر بیکسی کا اظہار کرتی نظر آئے گی، اور یا جنگ کا الٹی میٹم دینے پر مجبور ہو گی،

-اور اگر اس پر اصرار کیا جائے تو ان حضرات کو ٹرکی اور فلسطین کی حالیہ واقعات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے: ٹرکی ایک مضبوط اور آزاد حکومت ہے، فلسطین جنگِ عظیم سے پہلے اسی کا صوبہ تھا، مگر اس کے ہاتھ سے نکل جانے اور برطانیہ کے انتداب

کے نیچے آجانے کے بعد جو کچھ اس پر گذرا اور ٹرکی میں اس کے خلاف غم و غصہ کے باوجود جو کچھ عمل میں آیا وہ سب ہمارے لیے قابلِ عبرت ہے، اور یہ اس لیے نہیں ہوا کہ ٹرکی کو فلسطین کے مسلمانوں سے محبت نہیں اور ہم کو ہندو ہندوستان کے مسلمانوں سے محبت رہے گی، بلکہ یہ طاقت اور آئین کا مسئلہ ہے جس نے ٹرکی کو کچھ نہ کرنے پر مجبور کیا، اور اس سے بھی زیادہ ایران، عراق، مصر، ٹرکی کے "میثاق سعد آباد" کو اور پھر موجودہ حالات میں ٹرکی کی بے بسی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، اور جو حضرات ان معاملات سے صحیح نتیجہ نکال کر عبرت حاصل کرنے کی بجائے بے جا بحث کرنے کے لیے آمادہ ہوں ان کو کسی حقیقت تک پہنچانا بلاشبہہ مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے، اور یہ پوزیشن کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ مسٹر جناح نے علیگڈھ کی تقریر میں جس خدشہ کی خاطر سے ۲/۳ مسلمانوں کا پاکستان بنانے کے لیے ۱/۳ مسلمانوں کی رسمِ قربانی ادا فرمائی تھی اقلیت اور اکثریت کا وہ خدشہ اور مناقشہ جوں کا توں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان دونوں میں موجود رہا، اور انگریزوں کے لیے پاکستان کے نام سے ایک "بفر اسٹیٹ" رجحانی حکومت بن جانے کے سوا غریب مسلمانوں کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا،

معلوم نہیں پاکستانی مسلمانوں میں وہ کون سے شجاعانہ اور تہورانہ عزائم ہیں جو آج کے ہندوستان میں تو ہندو کے غلبہ کے خوف سے بزدلی، جبن، خود اعتمادی کے فقدان کی راکھ سے ڈھکے ہوئے ہیں، لیکن ایک معمولی سی آئینی اکثریت کے حاصل ہوتے ہی سلگتی ہوئی چنگاری کی طرح نکل کر شعلۂ جوالہ بن جائیں گے، اور ۱/۳ مسلم اقلیت کو بھی سنبھال لیں گے، اور "مسلمان علاقوں" میں بھی معتد بہ غیر مسلم اقلیت کو نظر انداز کر کے "فردوس بریں" بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے،

اس بات سے میرا یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ یورپین جمہوری نظام کے پیش نظر کسی قوم کی آئینی اکثریت خواہ کتنی ہی معمولی ہو بے معنی ہے، بلکہ میرا مطلب تو یہ ہے کہ توحی

اور مذہبی منافرت پیدا کر کے جس طرح "پاکستان" کے نام سے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرانے کی سعی جاری ہے اور جس کی بدولت خود مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے یہ طریقہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سربلندی کے لیے مفید ہے یا وہ طریقۂ کار جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور و سہارنپور میں ظاہر کیا گیا، اور جس کو ہم عنقریب تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے،

کیا ہمارے سامنے ہندوستان میں کانگریسی حکومت کے زمانہ کا نقشہ نہیں ہے جبکہ کانگریس نے وزارتوں کی ترتیب کو لیشن گورنمنٹ کے اصول کو ترک کر کے ..... پارٹی گورنمنٹ کے اصول پر بنائی تھی، تو اس کے خلاف ایک عرصہ تک مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم کانگریس کے سامنے بھیک کا ہاتھ اس طرح پھیلائے رہے کہ مدت دراز تک کسی نے ان ہاتھوں کو گرتے اور تھکتے نہیں دیکھا، کہ کسی طرح کانگریس ہائی کمانڈ اُن پر رحم کھا کر ان کو بھی شامل وزارت کر لیں، حتیٰ کہ مجبور ہو کر اس ہاتھ کا رُخ حکومت کی طرف پھیر دیا، اور اُن داتا کی جانب دستِ سوال دراز کیا کہ وہی رحم فرمائیں، مگر اڑیسہ کے مسلم لیگی وفد کو گورنر اڑیسہ نے یہ کہہ کر کچھ دیئے بغیر ناکام واپس کر دیا، کہ جہاں تک مسلم حقوق کی حفاظت کا تعلق ہے میں اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ محفوظ ہیں، اور جہاں تک وزارت کا تعلق ہے تو وہ پریمیر کے ہاتھ میں ہے، جو قلمدانِ وزارت کا مالک ہے،

اور اس سے بھی زیادہ قابلِ صد ہزار عبرت کانگریس منسٹری کا وہ پورا دور ہے جس میں مسلم لیگرس کے اقوال کے مطابق مسلمانوں پر مظالم کیے گئے، مگر مسلم لیگ اور اس کے قائدِ اعظم کو بجز کوسنے اور برا بھلا کہنے کے اور رونے بسورنے کے یہ جرأت نہ ہو سکی کہ کانگریس حکومتوں میں ڈیڈلاک اور جمود پیدا کر دیتے، یا اس درجہ ایجی ٹیشن کرتے کہ وہ مجبور ہو کر استعفےٰ دیدیتے، بلکہ اسمبلی اور کونسل کے ان بھکاریوں سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ پروٹسٹ

کے طور پر ان کا بائیکاٹ ہی کر دیتے تا کہ انگریز کو آئین معطل کر دینے کا بہانہ ہاتھ آجاتا اور مسلم لیگ کانگریس کو اس متکبرانہ رویّہ کا مزہ چکھا دیتی،

مگر یہ کیسے ہوتا جبکہ کانگریس کے مقرر کردہ آنریری مجسٹریٹ گرام سدھار کے معین کردہ چیرمینوں اور مسلم ملازمتوں پر مقرر کردہ افراد کے لیے سب سے زیادہ پیش پیش یہی بھکاری تھے، یہ مسلمان پبلک میں ہندو مسلم اتحاد کے خلاف اور کانگریس کے خلاف زہر چکانی کرتے تھے، اور کانگریسی وزیروں کے پاس حاضر ہو کر مجسٹریٹی، چیرمینی اور ملازمتوں کی بھیک مانگتے تھے، اور ان میں مسلم لیگ کے نمایاں اور باعظمت لیڈرس تک شامل ہیں، چنانچہ آنریری مجسٹریٹوں، عہدوں اور چند ملازمتوں میں قوم پرور مسلمانوں کے بجائے بیشتر خان بہادروں، سروں اور خانصاحبوں اور مسلم لیگی ممبران اسمبلی و کونسل کے عزیزوں اور رشتہ داروں کا تقرر اس کی زندہ شہادت ہے،

میرٹھ میں جناب اسمٰعیل خاں صاحب اور بلند شہر میں نواب احمد سعید خانصاحب آف چھتاری کانگریس دَورِ حکومت میں کانگریس کی جانب سے گرام سُدھار کے چیرمین تھے،

بہرحال قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کا تمام ادارہ سوا ہائے واے کے اور کچھ نہ کر سکا، لیکن جب کانگریس نے ۱۹۳۹ء میں جنگ کے مسئلہ پر وزارتوں سے استعفے دیدیے اور تمام کانگریسی وزیر بیک جنبشِ قلم ان کو ٹھوکر مار کر الگ کھڑے ہو گئے تو فطری اور طبعی بہادر اور شجیع مسلمان کو بزدل، خائف بنا دینے کے بعد قائدِ اعظم نے اس بہادری کا مطالبہ فرمایا کہ وہ کانگریس حکومتوں کے ختم ہو جانے پر "یومِ نجات" منائیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،

کیا اُس وقت پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کی حکومتیں موجود نہیں تھیں؟ اور کیا بار بار بہادرانِ لیگ کے انتقام لینے کے نعروں میں سے کوئی نعرہ بھی شرمندۂ

معنیٰ ہوا؟ ——— کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانانِ اقلیت کے صوبوں میں غیر مؤثر اقلیت تھے، اور اکثریت کے صوبوں میں معمولی اکثریت کے مالک اور معتد بہ اور مؤثر اقلیت سے دو چار، اور اگر یہ کہا جائے کہ آئین ناقص تھا اور آزادی کامل نصیب نہ تھی، تو یہ تو خود مسٹر جناح نیوز کرانیکل کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے تسلیم کر چکے ہیں کہ آزادیٔ پاکستان کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ مصر جیسی خود مختار حکومت مل جائے گی، جو ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی رُو سے اندرونی طور پر اس کو حاصل ہوئی ہے،

(مدینہ، ۵ مارچ ۱۹۴۲ء، ہندوستان ٹائمز ۱۰ نومبر ۱۹۴۵ء بضمن بیان ڈاکٹر عبداللطیف)۔

بہرحال اس نیم آزادی کی بنا پر یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ اس قسم کی اسکیم جو مسلمانانِ ہند کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک جگہ غیر مؤثر اقلیت بنائی ہو، اور دوسری جگہ غیر مؤثر اکثریت" مسلمانوں کے لیے ہلاکت اور قعرِ مذلت میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور اگر ذاتی پارٹی اقتدار یا کسی جماعت کے مقابلہ میں غم و غصہ سے انتقام لینے کے لیے بنائی گئی ہے جیسا کہ قائدِ اعظم کے متعلق ہمارا یقین ہے تو یہ مسلمانوں کے ساتھ کھلی ہوئی غداری ہے، کیا مسلمان اس وقت کو فراموش کر دیں جبکہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس مسلم لیگ پیکٹ میں ان ہی مسٹر جناح اور ان کی طرح کے دوسرے مسلمان لیڈروں نے یو، پی اور دوسرے مسلم اقلیت کے صوبوں میں اپنے لیڈر شپ کے اقتدار کو قائم رکھنے اور اپنی لیڈرانہ اغراض کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پنجاب اور بنگال کی آئینی اکثریت مسلم اقلیت کے صوبوں میں ویٹج (پاسنگ) کے بدلہ میں فروخت کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں گول میز کانفرنس میں پورا زور لگانے کے باوجود بھی وزیرِ اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلہ میں ہم اس آئینی اکثریت کو حاصل نہ کر سکے، اور آج اس کے لیے پریشان اور حیران ہیں، اُس وقت بھی قوم پرور مسلمانوں میں سے

اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی، اور علماء حق سے علامہ مفتی کفایت اللہ اور علامہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا، جو اخبارات کے کالموں میں آج تک محفوظ ہے، مگر مسلم لیگ سے خوش اعتقاد حضرات نے اس وقت بھی اس کو "سیاسی الہام" سمجھ کر اور احتجاج کی آواز کو سیاست سے نا آشنا "قل اعوذی" مولویوں کی آواز قرار دے کر لیگ کے فیصلہ کو "ربانی فیصلہ" باور کیا تھا،

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے کو دُہراتی ہے، چنانچہ آج بھی پھر وہی نازک وقت ہے، اور جس طرح حکومتِ برطانیہ کے ہندوستان میں قدم جمانے کے وقت میں علماءِ حق کے خلاف ایک مستقل محاذ مسلمانوں اور اسلام ہی کے نام پر قائم کر دیا گیا تھا، اور تعلیم و ترقی کے نام سے ان کو تنگ نظر قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و بغاوت کے جذبات انگریزوں کی برتری کے لیے عام کر کے وفادارانِ حکومت کی سیاست کو مسلمانوں کے لیے تریاق ظاہر کیا گیا تھا، اسی طرح آج ہندوستان میں انگریزی اقتدار پر ضرب کاری لگتے دیکھ کر اس کے اشارہ سے وہی حربہ دوبارہ استعمال کیا جا رہا ہے، اور مسلم لیگ کی سیاست کی اساس علماءِ حق کو علماءِ سوء کہہ کر ان کی حقارت و تذلیل پر قائم کی جا رہی ہے، اور جس طرح اُس وقت بھی بہت سے حضرات اس بڑھتے ہوئے سیلاب سے مرعوب ہو کر اُس سیاست کی ہمنوائی کرتے نظر آتے تھے اسی طرح آج بھی بہت سے جذباتی حضرات اس بڑھتے ہوئے سیلاب سے مرعوب ہو کر اس وقت بھی اسی سیاست کی ہمنوائی کر رہے ہیں، اور اس کو "الہامی" اور "ربانی" کہہ کہہ کر صحافتی ادبیت کی داد دے رہے ہیں،

مگر جس طرح لارڈ کرزن کی معرفت تقسیمِ بنگالہ کی اسکیم کے اعلان نے نواب وقار الملک مرحوم اور نواب سمیع اللہ خاں آف ڈھاکہ مرحوم کی آنکھیں کھول دی تھیں، اور ان کے سامنے اصل حقیقت آشکارا ہو گئی تھی، اسی طرح جب انگریز اپنی مرضی کے مطابق "پاکستان" بنا کر ہندوستان سے الگ اس کو اپنی مرضی کا آلۂ کار بنائے گا اس وقت

ان نیک نیت حضرات کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی، جو اپنی سادہ لوحی سے سیاست کے عملی اقدامات سے دور گوشۂ عافیت میں بیٹھے "پاکستان" کی داد دے رہے ہیں، اور اس کو ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مسٹر جناح کا "سیاسی الہام" سمجھ رہے ہیں،

بلاشبہہ "پاکستان" کا یہ تخیل "سیاسی الہام" ہے، مگر "ربانی الہام" نہیں ہے، بلکہ "قصرِ بکنگھم کا الہام ہے، جو ڈاکٹر اقبال کو بھی جب ہی ہوا تھا جب وہ لندن سے قریب ہی زمانہ میں تشریف لائے تھے، اور وہ الہام دوبارہ اس وقت پھر ہوا جب کہ مسلم لیگ کا وفد جو زیر سرکردگی چودھری خلیق الزماں مصر اور لندن کا حج کرنے گیا تھا، اس نے ہندوستان واپس آکر بمبئی اترنے کے ساتھ ہی پہلے انٹرویو میں اس چیز کو ظاہر کر دیا تھا اور جس کو عرصہ کے بعد مسٹر جناح نے اپنایا اور لاہور میں پیش کرنے کی اجازت دی،

بہت سے لیگی حضرات اپنی سادہ لوحی سے جذبات کے جوش میں بڑے زور سے فرماتے ہیں کہ پاکستان بن کر رہے گا، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے دل کی آواز ہے، اور یہ کہکر شاید وہ قوم پرور مسلمانوں کا مضحکہ اڑانا چاہتے ہیں،

مگر ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ ضرور بن کر رہے گا، اس لیے نہیں کہ وہ مسلمانوں کی آواز ہے، بلکہ بقول حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس لیے کہ حکومت طے کر چکی ہے کہ اب جبکہ ہندوستان میں آزادی کا جذبہ آخری حدود تک پہنچ چکا ہے، اور اس کے لیے کانگریس جان و مال کی بازی لگا چکی ہے تو سخت ضرورت ہے کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرا دیا جائے، تاکہ برما کی طرح جب جب جیسا موقع ہو ایک حصہ کو دوسرے کا مقابل بنا کر اپنا اقتدار بہر نوع مضبوط اور مستحکم بنایا جاسکے،

باب دوم:

پاکستان اقتصادی نقطۂ نظر سے

"پاکستان" کا یہ وہ پہلو تھا جو سیاسی کہا جاتا ہے، اب مناسب ہے کہ تھوڑا سا وقت اس کے "اقتصادی" پہلو پر بھی صرف کریں،

یہ حقیقت مسلم بلکہ مشاہدہ ہے کہ حکومتوں کی ترقی کا مدار آج کی دنیا میں صرف اقتصادیات کی برتری پر قائم ہے، اور اقتصادی برتری میں جس قدر معدنیات "کانیں" اثر انداز ہیں اس قدر اور کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ تجارت، صنعت و حرفت اور حکومت کی مشینری کا قیام دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں اس ذریعہ پر بڑی حد تک قائم ہے، اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ جن صوبوں میں "پاکستان" بننے والا ہے ان میں "کانیں" جو باہر نکلی ہوئی ہیں بہت ہی کم ہیں، پنجاب میں نمک اور لوہے کی ایک ایک کان ہے' اور بنگال میں کوئلہ کی چند کانیں اور لوہے کی غالباً ایک کان ہے، باقی صفر ہے

اور جواہرات، سونا، چاندی، تانبہ: المونیم، فولاد، ابرق، کوئلہ اور پیٹرول کی بڑی بڑی کانیں سب ہندوستان میں ہیں، جن کا اکثر حصہ بہار، مدراس، اور سی پی میں ہے۔

اب اگر "پاکستان" اس طریقہ پر بنایا جائے گا جو مسلم لیگ اور اس کے قائدِ اعظم کا تجویز کردہ ہے، اور جس کی بنیاد ہی قومی اور مذہبی منافرت پر قائم کی جارہی ہے تو ہندو، ہندوستان کہ جس میں ہندو سرمایہ دار خود بہت کافی ہیں جس درجہ عجلت کے ساتھ ترقی کرکے "پاکستان" کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اس کو کونسی طاقت روک دے گی؟ نیز نظام حکومت کے تمام شعبوں میں جس قدر زبردست ترقی اُن کو حاصل ہو گی، اور سرمایہ سے محروم مسلم اقلیت کو اگر ہندو سرمایہ دار قوانین اقتصادیات کے پردہ میں ان سے محروم کردے تو وہ کونسی قوت ہے جو اُن کا حق دلائے گی؟ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ

"پاکستان" میں اس کے مقابلہ کا قانون بنا کر پاکستانی ہندوؤں کو اس سے محروم کر دیں گے تو یہ جواب جیسا رکیک ہے وہ ہر ایک عاقل جانتا ہے، اور اگر آپ پاکستانی حکومت کے ان پوشیدہ معدنیات کے نکالنے کے لیے پیش قدمی کریں گے جو سرحد، سندھ اور بنگال وغیرہ میں موجود ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ ایک ایک "کان" کھودنے اور برآمد کرنے میں کروڑوں روپے صرف آتے ہیں، وہ کہاں سے آئیں گے؟ جبکہ ان "مسلم منطقوں" میں اپنے نظام حکومت کے شعبوں کے چلانے ہی میں بمشکل حکومت کی آمدنی کفایت کر سکے گی، کیونکہ آج سندھ اور سرحد مرکزی حکومت کے بل پر چل رہے ہیں، اور بلوچستان کا بھی یہی حال ہے، اور ان تینوں کا بار پنجاب پر پڑ جائے گا، اور اسی طرح آسام کے اضلاع کا بار بنگال کی حکومت پر جہاں ذرائع آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے،

ایک لیگی فاضل نے اس جگہ بڑی کاوش کے ساتھ ادیبانہ انداز میں یہ اقتصادی حل تجویز فرمایا ہے کہ "کانگریسی حکومت کی طرح پاکستان میں بھی تنخواہیں کم کر دی جائیں گی، اور اس سے حاصل شدہ روپیہ اس پر صرف کیا جائے گا، اور دوسری ترکیب یہ ہوگی کہ ہندو ہندوستان کے ہندو سرمایہ داروں کو دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنا روپیہ لگا کر کمپنیاں قائم کریں اور معدنیات کو نکالیں تاکہ حکومت کا مالیہ وافر ہو اور اس کی اقتصادی پوزیشن مضبوط ہو"۔

مگر یہ حل محض بے خبری اور اقتصادی مسائل سے ناآشنا ہونے کی بنا پر ہے، ورنہ ان پر یہ واضح رہنا چاہیے تھا کہ اگر "پاکستان" کے صوبوں میں اور فیڈرل حکومت میں مشاہروں اور تنخواہوں کو کم کیا گیا، اور جنگی فضول اخراجات سے بھی روپیہ محفوظ رہ کر پس انداز کیا گیا تب ہی جا کر کہیں ان دونوں منطقوں کے نظام حکومت کے شعبے چل سکیں گے، ورنہ تو ان کا چلنا ہی دشوار ہے، اور ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ سرحد پر جو جنگی اخراجات عمل میں آتے ہیں ان کا بار حکومتِ سرحد کے بجٹ پر نہیں ہے، بلکہ مرکزی بجٹ پر ہے، جس کے متعلق متعدد

مرتبہ اسمبلی میں قوم پرور مسلمان اور ہندو اعتراض کر چکے ہیں، اور بعض مہابھائی ہندو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے بھی اعتراض کر چکے ہیں، کہ مرکزی حکومت کا روپیہ کیوں اس قدر تعداد میں سرحد پر خرچ ہوتا ہے ——— اور اگر کچھ پس انداز بھی ہو جائے گا تو وہ ایک "کان" کی معقول برآمد کے لیے بھی کافی نہ ہوگا، بلکہ جس وقت اور جس زمانہ میں ہندو ہندوستان ان مستقل شدہ اور برآمد شدہ "کانوں" کے فائدہ سے دنیا کی طاقتور حکومت میں رہ رہا ہوگا، اس وقت ہم بمشکل رینگتے ہوئے ایک دو "کان" برآمد کر سکیں گے، اور موجودہ ضروریات حکومت کے اہم فوائد سے بڑی حد تک محروم ہوں گے،

رہا ہندو سرمایہ دار کمپنیوں کا معاملہ تو یہ بات فرما کر تو فاضل محترم نے افسوسناک حد تک موجودہ مسائل سے بے خبری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اس لیے ان کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ موجودہ دَور میں کسی حکومت کو مفلوج کرنے اور اس کو آہستہ آہستہ غلام بنانے کا کوئی بہترین طریقہ ہے تو وہ یہی ہے کہ ملک اپنی اقتصادی حالت کو ترقی دینے کے لیے دوسرے ملکوں کی سرمایہ دار کمپنیوں کو دعوت دے، خواہ اس میں تھوڑے بہت سرمایہ سے خود بھی شریک کیوں نہ ہو،

موصل کے چشموں کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اجنبی سرمایہ دار کمپنیوں ہی نے زمین ہموار کی تھی، ایران کے اس حصہ پر تسلط جو تیل کے چشموں کا ذخیرہ ہے رضا شاہ کی حکومت سے آہستہ آہستہ برطانیہ کی سرمایہ دار کمپنیوں ہی کے ذریعہ سے ہوا تھا،

جدہ پر ترکی نے اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آہستہ آہستہ دوسرے ممالک کی کمپنیوں سے نجات حاصل کی ہے اور کر رہی ہے، حجاز میں ابن سعود کے اٹلی اور امریکہ کی کمپنیوں سے ہی اول معدنیات نکالنے کا کام لیا تھا، مگر اس کو بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ اور اس لیے اس نے ان سے معاہدہ فسخ کر دیا اور

اس طرح بروقت نجات حاصل کرلی،

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم سرمایہ دار کمپنیوں سے ایسے معاہدات کریں گے جن کے بعد اس قسم کے خطرات پیدا نہ ہوں، تو ایسے معاہدات تو ہر ایک حکومت کرتی ہے مگر نتیجہ وہی نکلتا ہے جو مسطورہ بالا حکومتوں میں نکلا، اسی بناء پر آج کوئی طاقتور اور بیدار حکومت اس کو گوارا نہیں کرتی کہ اس کے ملک میں دوسرے ممالک کے سرمایہ دار اپنا روپیہ لگا کر آہستہ آہستہ اقتصادی اور معاشی غلبہ حاصل کرسکیں، مشینی طاقت کا یہ معاملہ خوف اور دہشت کے لیے نہیں ہے، بلکہ واقعات اور حقائق کو پیش نظر لانے کے لیے ہے، تاکہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کے لیے جو کچھ کریں غور وخوض کے بعد کریں،

پاکستان کی معاشی واقتصادی حالت کو بہتر ثابت کرنے کے سلسلے میں بلوچستان میں معدنیات کے ذخائر کا ذکر بڑے پُرجوش اور جذباتی الفاظ میں کیا جاتا ہے، یہ بات بسروچشم، لیکن افسوس ہے کہ ان حضرات نے ان اقتصادی مشکلات پر توجہ کرنے کی بجائے جن کی وجہ سے آج تک سندھ میں وہ ذخائر برآمد نہیں ہوسکے، اور پھر ان معاشی مشکلات کو اس بات کے ذریعہ حل کرنے کی بجائے جذبات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اگر جذبات سے ہی ایسے مسائل حل ہوجاسکتے ہیں تو میرے خیال میں مسلمانوں کے لیے تمام عالم میں "اسلامی" حکومت کے قیام کے فوری وقوع پذیر ہونے سے بہتر کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہے، خواہ ظاہری اسباب مساعد ہوں یا نامساعد،

افسوس: یہ حضرات افغانستان، ایران، حجاز، یمن وغیرہ کی موجودہ مثالوں سے قطعاً چشم پوشی کرلیتے ہیں، کیا ان ممالک میں بے شمار قیمتی معادن موجود نہیں؟ مگر افسوس! وہ سب بیکار ہیں، کیونکہ موجودہ آمدنی ان کی ضروریات کا تحمل ہی بہت مشکل سے کرتی ہے، رضا شاہ پہلوی نے کچھ ترقی کی تھی، مگر برطانیہ کے ایک اشارۂ ابرو نے سب کچھ ختم کردیا،

امان اللہ خان کی درد بھری داستان ابھی مسلمانوں کے حافظہ سے محو نہ ہوئی ہوئی ہوگی،

الحاصل پاکستانی اسکیم ایک جانب ہندو ہندوستان کے عظیم الشان رقبہ میں مسلمانوں کو ہندوستان کے طبعی وسائل و ذخائرِ معاشی سے محروم کرنے کے سامان مہیا کرتی ہے، اور دوسری جانب مسلم ہندوستان میں انہی سرمایہ دار ہندوؤں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ بقول فاضل مذکور پیدائشی تنگ نظری اور موقع پرستی کو دل میں لیے ہوئے کمپنیوں کی صورت میں مسلم ہندوستان کے معاشی اور طبعی ذخائر پر بھی قابض ہو جائیں اور یورپ کے یہودی سرمایہ داروں کی طرح حکومت کے صلح و جنگ کے بالواسطہ مالک بن جائیں، اور یا پھر انگریزوں ہی سے رجوع کریں کہ وہ اس معاشی و اقتصادی گتھی کو اپنے سرمایہ سے حل کرنے کے لیے ہمارے اسی طرح آقا اور حاکم بنے رہیں جس طرح آج ہیں،

اور اس کے برعکس ہندو ہندوستان بلا شرکت غیرے تہی مایہ مسلم اقلیت کو نظر انداز کر کے جاپان کی طرح ایشیا میں امریکہ اور برطانیہ اور جرمنی کا مقابلہ کرنے لگے، اور صنعت و حرفت اور تجارت کی راہ سے استحکامِ حکومت کے ذرائع کی من مانی طاقت بنا سکے،

باب سوم:

پاکستان ملکی اور قومی نقطۂ نظر سے

بقول مولانا ابوالکلام آزاد اس مسئلہ میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ مسلمان اور ہندو بلحاظ مذہب، کلچر، ثقافت دو جدا جدا قومیں ہیں، اور رہیں گی، لیکن اپنے ملک کو آزاد کرانے اور اجنبی حکومت کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو ڈیفنس یا دفاع انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے بصورت "پُرامن جنگ" جاری ہے، اس نقطۂ نظر سے بلاشبہ ملک کی مختلف المذاہب اقوام سب ایک قوم ہیں، اور اس "دفاعی قومیت متحدہ" کو کانگریس قوم کہتی ہے، اور اگر وہ نہ بھی کہے تو بھی آزادی خواہ مسلمان اس مسئلہ کو صرف اتنی ہی حقیقت سمجھتے ہیں، اور یہی وہ حاصل تھا کلکتہ کی اس تقریر کا جو جواہر لعل نہرو نے کی تھی، اور کہا تھا کہ "ہندوستان میں دو ہی جماعتیں ہیں ایک حکومت اور دوسری کانگریس، یعنی ایک جانب اجنبی حکمران اور اس کے وہ تمام وفادار عناصر ہیں جو مذہبی اور قومی اعتبار سے خواہ مختلف ہوں مگر انگریز کی غلامی ہی کو سعادت سمجھتے ہیں، اور دوسری جانب کانگریس ہے جس میں ہندو، مسلمان اور دوسری اقوام کے وہ تمام افراد شامل ہیں جو انگریز کی غلامی کو لعنت سمجھ کر اپنے ملک کی آزادی کے لیے برسرپیکار ہیں،

جواہر لال صاحب دھرمی اور لامذہب ہوں یا کٹر ہندو وہ اپنے ذاتی خیالات کے اعتبار سے ہندوستان کے تمام باشندوں کو لامذہب دیکھنا چاہتے ہوں یا کسی نئے تمدن میں ڈھال کر ایک قوم دیکھنا چاہتے ہوں، لیکن اگر اسلام کی تعلیم ہر حال میں سچائی اور صداقت کے اقرار کا حکم دیتی اور افترا، اور بہتان کو مشرک دکافر کے

حق میں بھی گناہ بتاتی ہے تو میں بلاخوف لومۃ لائم یہ کہنے کو تیار ہوں کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ذمہ دار رکن ہونے کی حیثیت سے کلکتہ کی جواہر لال کی یہ تقریر جو انگریزوں کی سامراجیت کے خلاف ہو رہی تھی نہ ہندوستان کی مختلف المذاہب اقوام کے باہمی تقابل کے سلسلہ میں" یقیناً مسطورہ بالا معنی ہی میں تھی، مگر قائدِ اعظم مسٹر جناح نے سیاسی حربہ کے طور پر یا کسی اشارہ سے اس کو اُچک لیا، اور جواہر لال کی تقریر کی اسپرٹ کو انگریزوں کے مقابلہ سے ہٹا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا، اور مسلم لیگ کے لیے ایک مستقل موضوعِ بحث ہاتھ آ گیا، اور بالواسطہ اور بلاواسطہ اس طرح حکومتِ برطانیہ کے چیلنج کو مسلمانوں کے لیے چیلنج قرار دے کر حکومت کے مقصد کو کامیاب بنایا اور اس کو بروقت قوت پہنچادی،

اور پھر اس مسئلہ کو اپنی مذموم اغراض کے لیے اس طرح استعمال کیا کہ محدثِ عصر اور مجاہدِ یگانہ حسین احمد مدنی مدظلہٗ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے درمیان مغالطہ آمیز بحث برپا کر دی، اور جب اصل حقیقت معلوم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مولانائے موصوف کے مقابلہ میں اپنے اختلاف کو واپس لے لیا، اور غلط فہمی دور ہونے پر اس کو اخبارات میں بھی شائع کر دیا، تب بھی پنجاب کے بعض فتنہ جو مفسدوں نے اس بحث کو ختم نہ ہونے دیا، اور بسترِ مرگ پر مفتریانہ خبریں دے کر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے خلاف جو رباعی ڈاکٹر صاحب سے لکھوائی تھی اور جس کو انھوں نے غلط فہمی دور ہونے کے بعد شائع کرنے سے منع فرمایا تھا اس کو ان کے انتقال کے بعد شائع کر کے افتراق بین المسلمین کا پورا پورا حق ادا کیا، اور اس کے باوجود کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے رسالہ "متحدہ قومیت" میں زیرِ عنوان "قومیتِ متحدہ کے مجوزہ معنی" یہ تصریح فرما چکے تھے کہ ہماری مراد قومیتِ متحدہ سے وہی قومیتِ متحدہ ہے جس کی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ میں ڈالی تھی، یعنی ہندوستان

کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں، اور اُس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے سب کو محروم کرتی ہوئی فنا کر رہی ہے جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں، کوئی مذہب والا کسی دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے، بلکہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد رہیں، اپنے مذہب، رسم ورواج مذہبی اعمال واخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں، اور جہاں تک اُن کا مذہب اجازت دیتا ہو امن وامان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر واشاعت بھی کرتے رہیں اپنے اپنے پرسنل لاء اور کلچر، تہذیب کو محفوظ رکھیں، نہ کوئی اقلیت کسی دوسری اقلیت یا اکثریت سے ان امور میں دست وگریباں نہ ہوا ور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرے،

(متحدہ قومیت، مطبوعہ کمال پریس، ص ۵۳، ۵۴)

اس کے بعد جونپور کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر کی حیثیت سے حضرت مولانا نے تصریح فرمادی تھی کہ :۔

"ہم باشندگانِ ہندوستان کی بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو اختلافِ مذاہب اور اختلافِ تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلاف، ذاتوں اور صنفوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے ازالہ کا فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ

ہی جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا، اس کے لیے سب کچھ
مل کر پوری طرح کوشش کرنا ازبس ضروری ہے، اگر آگ لگتے وقت
گاؤں کے تمام بسنے والے مل کر آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت
گاؤں کے تمام باشندے بند نہ باندھیں گے تو تمام گاؤں برباد ہو جائے گا،
اور سب ہی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی،

اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا
مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے
تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں، اس اشتراکِ
وطنی کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف
سے اس میں کوئی رکاوٹ یا کمزوری نہیں ہونی چاہیے: ہر ایک اپنے
مذہب پر پوری طرح پابند رہ کر ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے، یہی
اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور
اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب ممبر فرائض شہر یا ضلع
یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے ہیں، اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں،

یہی معنی اس جگہ قومیت متحدہ کے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے
معانی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور ناجائز ہیں، اس معنی کی بناء پر
کانگریس نے فنڈامینٹل میں ہر مذہب اور تہذیب اور ہر زبان اور
رسم و رواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے، دھوکہ نہ کھانا چاہیے، اور
بیوقوفوں کی بات پر نہ جانا چاہیے، اس کے خلاف جو یورپین لوگ۔۔۔
قومیت متحدہ کے جو معنی مراد لیتے ہوں اور جو کانگریسی افراد انفرادی
طور پر کانگریس کے فنڈامینٹل کے مفہوم کے خلاف معانی بیان کرتے ہوں

ان سے یقیناً جمعیۃ العلماء بیزار ہے اور تبرّی کرنے والی ہے"

بہرحال "متحدہ قومیت" کا مسئلہ برابر جمعیۃ العلماء ہند کے پلیٹ فارم پر اپنے اصل خدوخال کے ساتھ پیش ہوتا، اور مفتریوں کا جواب دیا جاتا رہا ہے، اور اگر قوم پرور مسلمان بھی آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک مستقل قوم نہ سمجھتے، تو آزاد مسلم کانفرنس میں یہ تجاویز متفقہ طور پر کیوں پاس کی جاتیں کہ نمائندہ اسمبلی کا جو مطالبہ کانگریس کر رہی ہے اس کے انتخاب میں مسلمان جداگانہ انتخاب سے منتخب ہو کر آئیں گے، تاکہ کسی فرقہ پرست مسلمان کو بھی یہ خطرہ نہ ہو کہ مشترکہ انتخاب سے آنے والے مسلمان ہندوؤں کے نقطۂ نظر کے حامی ہوں گے، نیز یہ بھی طے ہوا کہ آئین سے متعلق جو رائے بھی مسلمانوں کی اکثریت کی ہوگی خواہ وہ پاکستان ہی کیوں نہ ہو وہی مطالبہ سمجھا جائے گا، پس یہ باتیں تب ہی صحیح ہو سکتی ہیں کہ ان تجاویز کو پاس کرنے والی جماعت آزاد ہندوستان میں (خواہ دو ڈومینین اسٹیٹس کے درجہ کی آزادی ہی کیوں نہ ہو) مسلمانوں کو مستقل قوم سمجھتی ہو،

مگر افسوس کہ مسٹر جناح نے اس معاملہ میں بھی حکومت کا ہی ساتھ دیا، اور آزاد مسلم کانفرنس کی اُن تجاویز کو کانگریس کے تسلیم کر لینے اور اعلان کر دینے کے باوجود بھی آزادیٔ ہند کے لیے نمائندہ اسمبلی سے اختلاف کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طرح اگرچہ مسلمان اپنے معاملات میں ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کی دستبرد سے محفوظ رہ کر آزاد ہندوستان کا آئین بنانے میں حصہ دار ہو جائے گا، مگر ہندو مسلم منافرت اور برٹش حکومت کی حمایت پر ان کی لیڈرشپ اور ذاتی اقتدار کا جو مستحکم قلعہ تعمیر ہوا ہے وہ منہدم ہو کر رہ جائے گا،

لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ "دو قوم کی تھیوری سے" جو نتیجہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے ارکان نکالتے ہیں" یعنی "پاکستان" یہ نہ جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک صحیح نتیجہ ہے اور نہ قوم پرور مسلمانوں کے نزدیک اور نہ اُن غیر جانبدار

مسلم سیاست دانوں کے نزدیک جو کسی جماعت سے متعلق نہیں،
اس لیے کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ملکی اور قومی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کے لیے یہ نتیجہ سخت مضر اور نقصان رساں ہے، کیونکہ ان کے سامنے سابق جنگِ عظیم کا وہ نقشہ موجود ہے جبکہ انگریزوں اور اتحادیوں نے جنگ جیتنے کے لیے "عربوں" کو یہ حکم دے کر ترکوں کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا تھا کہ "عرب ایک مستقل قوم ہیں جو صدیوں سے ترکوں کی غلامی میں گرفتار ہیں، اور بدقسمتی سے خود بعض عرب لیڈروں میں بھی عرصہ سے یہ فلسفہ کام کر رہا تھا۔ اور وہ ترکوں سے نفرت کرنے اور اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کے خواہشمند تھے، چنانچہ میکوہن نے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے وہ وعدے کیے جو جنگِ عظیم کے بعد نذرِ تغافل ہو گئے، اور "عرب" ترکوں کی غلامی سے نجات پا کر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی "پاک غلامی" میں داخل ہو گئے،
میری اس پیش کردہ نظیر میں اس بحث کو کوئی دخل نہیں ہے کہ عربوں کے اتحادِ مذہب کے باوجود ترکوں کے مقابلہ میں مستقل قوم ہونے کا دعویٰ غلط تھا، اور مسلمانوں کا ہندوؤں کے مقابلہ میں دعویٰ صحیح ہے، بلکہ میں پاکستانی حضرات کے سامنے سیاسی دنیا کے اسٹیج کا وہ نقشہ لانا چاہتا ہوں جو ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ کسی ملک خصوصاً وسیع اور مضبوط ملک کو غلام بنانے یا مستقل طور پر چنگل میں دبائے رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس میں آباد مختلف اقوام کے درمیان جذباتِ منافرت پیدا کر کے اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ وہ آزادی کی تڑپ اور آزادی کے عشق کے باوجود اس ملک کی تقسیم کو اپنا دین و ایمان بنا لیں، اور اسی کے اندر سیاسی اور معاشی نجات تصور کرنے لگیں، چنانچہ عرب لیڈروں نے اس سے کم دلائل ترکوں سے الگ آزاد عرب اسٹیٹ بنانے میں پیش نہیں کیے جس قدر آج ہندوستان میں "پاکستان" کے حق میں پیش کیے جا رہے ہیں، آخر جو نتیجہ نکلا وہ اظہر من الشمس ہے،

یونان، ہنگری، زیکوسلوویکیا اور ریاستہائے بلقان وغیرہ نے یورپین حکومتوں کے اشارہ پر قومیت کے نام پر علمِ بغاوت بلند کرکے اگرچہ خود کو بظاہر آزاد کرالیا مگر ترکی کو نقصان پہنچا دینے کے ساتھ ساتھ ان کا بھی جو کچھ حشر ہوا وہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور "مرد بیمار ترکی" آج بھی "بہادر مرد" کی طرح زندہ ہے،

کیا پاکستانی حضرات کے لیے یہ مسئلہ باعثِ صد ہزار عبرت نہیں ہے کہ آج مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی حیثیت برٹش حکومت کی نگاہ میں صرف یہ ہے کہ جن جن مواقع میں اس کو کانگریس کی تحریکِ آزادی کو شکست دینا ہے ان میں وزیراعظم اور پارلیمنٹ سے لے کر وائسرائے تک کی زبان و قلم پر مسلم لیگ کا بار بار نام آتا اور اس کی اہمیت اور نمائندگی کو سراہا جاتا ہے، لیکن جب وہی مسٹر جناح کانگریس سے خفا ہو کر کاسۂ گدائی کو حکومت کی جانب پھیر دیتے ہیں اور بار بار بھی پیار و محبت اور دعائیہ کلمات کے ساتھ اور کبھی خفگی آمیز ناز و ادا، کے ساتھ اس سے الحاح و زاری کرتے ہیں کہ وہ کانگریس کو نظر انداز کرکے حکومت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں دیدے تو وہی حکومت پیچھے پھر کر بھی بھکاری کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھتی،

کیا جو حکومت آٹھ صوبوں میں ہر قسم کی ناراضیوں اور ایجی ٹیشنوں کے باوجود مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے کانگریس کو حکومت کی مشین حوالہ کرسکتی ہے کو جس کو ٹھوکر مارنے پر "یومِ نجات" جیسا عظیم الشان کارنامہ کیا گیا وہ حکومت کانگریس کو ذلیل کرنے کے لیے یا مسلم لیگ کو عزت بخشنے کے لیے مسٹر جناح کے سوال کو پورا نہیں کرسکتی؟

ضرور کرسکتی ہے، مگر کرتی کیوں نہیں؟ صرف اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ مسلم لیگ اور اس کا قائدِ اعظم اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے کہ وہ ہماری اغراض کا آلۂ کار بنتے رہیں، اور ان کی وہ دھمکیاں جو کبھی کبھی زبانی طور پر حکومت کو دی جاتی رہتی ہیں اس کا آلۂ کار بننے میں اور زیادہ ممد و معاون ثابت ہوں کہ موجودہ پروپیگنڈا کے زمانہ میں یہ

بھی ایک مفید طریقہ ہے،

میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ حق و انصاف کے نام پر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قائد اعظم کی اس الہامی سیاست کا نتیجہ عملاً حکومت کی ہمنوائی کے سوا اب تک کیا نکلا؟

کیا کرپس مشن کے زمانہ میں جو حضرات دہلی کے حالات سے باخبر ہیں وہ اس حقیقت کو فراموش کر سکتے ہیں کہ اس بات کے ماسوا کہ حکومت، "پاکستان" کو جس طرح اپنے آئندہ اقتدار ہند کے لیے مفید سمجھتی ہے اس کے اصول کو اسکیم میں درج کر کے مسٹر جناح کو کانگریس کے مقابلہ میں تبسم فرمانے کا موقع مرحمت فرمایا، اور کسی مسئلہ میں بھی اُن کو کوئی حیثیت نہیں دی، اور اپنے پورے قیام کے زمانہ میں کرپس مشن صرف اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح کانگریس کو راضی کر کے ایک مفلوج گورنمنٹ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے، اور اسی لیے غریب مسلم لیگ کو الٰہ آباد میں ایک ایسا ریزولیوشن بنانا پڑا جو بقول اسٹیٹسمین اجلاس ختم ہونے پر بھی اس وقت تک شائع نہ ہو سکا کہ نہ معلوم حکومت اور کانگریس کے درمیان کس قسم کا سمجھوتہ ہو یا قطعًانہ ہو تو صدر اس وقت مختار کل ہوں گے کہ جس طرح چاہیں اس تجویز کی شکل بدل کر شائع فرما دیں، اور بالآخر جب کرپس اور کانگریس کی بات چیت ٹوٹ گئی تو اب وقت آیا کہ مسلم لیگ کو استعمال کیا جائے، چنانچہ فوراً ہی وہ مسٹر جناح سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، اور اس وقت مسلم لیگ کا وہ ریزولیوشن بھی شائع ہو گیا جس میں کرپس مشن سے بظاہر ناراضی کا اظہار تھا، مگر "پاکستان" کے اصول کو منظور کر لینے کے نام سے حکومت کا شکریہ بھی ساتھ میں منسلک تھا، تاکہ بے عملی کی شکل میں جو ہاتھ حکومت کی جانب بھیک کے لیے پھیلا ہوا ہے، اس کے جواز کی صورت باقی رہے، پھر کرپس نے بمبئی میں جا کر وہ تاریخی تقریر کی جو مسلم لیگ کو بہت پسند آئی، اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اس کو

خوب سراہا،

حالانکہ جو کرپس صاحب بمبئی میں ہندو مسلم منافرت کی تقریر کرکے اپنے مشن کی ناکامی سے متعلق مفتریانہ بیان دے کر گئے، ان ہی کرپس صاحب نے جب یہ دیکھا کہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے مخالفانہ رویئے نے وار کیبینٹ کو میرے خلاف ہموار کر لیا ہے، اور مجھ کو اس لیے ناکام جانا پڑے گا کہ ایک طرف گورنر جنرل اپنے اختیارات خصوصی اور اپنی ویٹو پاور ترک کرنے پر آمادہ نہیں، اور دوسری طرف کانگریس کا یہ اصرار ہے کہ نیشنل گورنمنٹ صحیح معنی میں نیشنل گورنمنٹ ہو، اور ڈیفنس کے متعلق کانگریس کے سب مطالبات پورے ہوں، تو مسٹر کرپس نے مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے آخری پیش کش یہ کی کہ اگر وہ اس وقت گورنر جنرل کے مقابلہ میں اختیارات کی آزادی اور ڈیفنس کے مسئلہ سے متعلق مختلف چند مطالبات پر نہ اڑیں تو میں اس مسئلہ کے لیے آمادہ ہوں کہ تقسیم ہند سے متعلق جو حصہ میری اسکیم میں ہے اس کو حذف کر دوں، اور یقیناً میں وار کیبینٹ اور وائسرائے دونوں کو اس پر آمادہ کر سکتا ہوں، اور ساتھ ہی یہ بھی اطمینان دلاتا ہوں کہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی آپ اس اسٹیج کو بھی حاصل کر لیں گے، بشرطیکہ اس وقت آپ میرے مشن کو کامیاب بنا دیں،

مگر پنڈت نہرو کی موجودگی میں صدر کانگریس حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص انداز بیان کے ساتھ پرجوش الفاظ میں یہ فرمایا کہ ہمیں اس کی ضرورت مطلق نہیں ہے کہ آپ سے تقسیم ہند کے حصہ کو کہ جس کو آپ ہندو مسلم منافرت کے لیے اپنی اسکیم میں شامل کر لائے ہیں "خارج کرائیں" آپ ہمارے مطالبات کو مکمل طور پر مان لیجیے، اور حکومت ہند اور برٹش حکومت سے منوا دیجیے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ نہ کرا دوں اور مسٹر جناح اور مسلم لیگ کو راضی نہ کر لوں تو پھر بلاشبہہ کانگریس نااہل ثابت ہو گی، اور یقیناً

اس کو کوئی حق نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق ایک لفظ بھی آئندہ زبان سے نکالے،

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ آزاد صاحب کی صدارت میں کانگریس کا رویہ مسلمانوں کے حقوق کے متعلق کیا ہے؟ مگر وہ مسٹر جناح کے نزدیک قابلِ گردن زدنی ہیں، اور نام نہاد غمخوارانِ اسلام کے نزدیک سخت مجرم،

کانگریس اور مسلم لیگ کے موجودہ اختلافات کے درمیان مسلم لیگ کے قائد اعظم کا حضرت مولانا آزاد کے ساتھ جو غیر اسلامی اور غیر شریفانہ رویہ رہا ہے اور اس پر مولانا آزاد صاحب نے جس صبر و ضبط و تحمل کا ثبوت دے کر مسلسل یہ کوشش جاری رکھی ہے کہ کسی طرح مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی معقول سمجھوتہ ہو جائے، اس سے ایک انصاف پسند نگاہ میں دو رہنماؤں کے باہم پستیِ اخلاق و بلندیِ اخلاق اور فساد و صلح کے دو متضاد نقشے سامنے آجاتے ہیں،

غرض حکومت نے مسلم لیگ کی یہ پوزیشن طے کرلی ہے کہ وہ کانگریس کی جنگِ آزادی کی بساط پر ایک ایسا مہرہ ہے جو شہ دینے کے لیے تیار کیا گیا ہے، یعنی جس حد تک حکومت کانگریس کی جد و جہد سے مجبور ہو کر اس کو راضی رکھنا چاہتی ہے اُس حد تک مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیتی ہے، اور جن حدود میں اس کی جد و جہد اور مطالبات کو رد کرنا ضروری سمجھتی ہے ان میں مسلم لیگ کو آگے کر دیتی ہے، اور کانگریس کو حتی الامکان شکست دینے کے لیے جس طرح اس نے مسٹر بیگ کے ذریعہ شملہ کی چوٹی پر بعض مسلمان لیڈروں کو بلا کر جداگانہ انتخاب کا "الہام" کیا تھا جس کی تفصیلات ایک باخبر لیگی نے کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں واضح کر دی ہیں، اور وہ آج لیگی مسلمانوں کا جزوِ ایمان بنا ہوا ہے، اسی طرح آج کی سیاست میں اس نے "پاکستان کا الہام" کیا ہے، جس کو وہ جب اور جس طرح اپنے لیے مفید سمجھے گی سامنے لاتی رہے گی،

رہا قائدِ اعظم کے جھنڈے کے نیچے مسلم لیگی سورماؤں کا اس "الہام" پر کانگریس کی برابر حکومت کے مقابلہ میں جنگ کرنا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شیر قالین کو شیر نیستاں یقین کر لینا، جو رہنما صاف الفاظ میں لکھنؤ کے سالانہ اجلاس میں یہ کہہ چکا ہو کہ حکومت کے مقابلہ میں کسی قسم کی بھی سول نافرمانی کرنا خودکشی کرنے کے مرادف ہے، اس کے اقدامات کا حکومت کو خود مسلمانوں سے زیادہ صحیح اندازہ ہے،

جو حضرات لارڈ ولنگڈن کے پرانے اختلاف کی بنا پر اس کی وائسرائیلٹی کی پوری مدت میں خوف کی وجہ سے لندن کو ہجرت کر چکے ہوں اور اس کی ختم مدت تک ہی رونق دہ ہندوستان ہوئے ہوں، اور جو بزرگ خلافتِ عظمیٰ کی تباہی اور مسلمانوں کی اجتماعی تباہی و بربادی کے زمانہ میں اور اسی طرح کے دوسرے اہم مصائبِ اسلامی میں پلیٹ فارم سے راہِ فرار اختیار کر چکے ہوں وہ آج اگر خوش فہم اور سادہ لوح مسلمانوں کی نگاہ میں مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد سے زیادہ "اسلامی درد" کے حامل اور "الہامی سیاست" کے قائد ہیں تو اُس قوم کا خدا ہی نگہبان ہے،

مجھے یہ حالات دیکھ کر مجاہدِ اکبر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ یاد آتا ہے، کسی شخص کے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی پستی اور انگریز دوستی کا ذکر کیا تو فرمانے لگے "ابھی کیا ہے وہ وقت بھی آنے والا ہے جب مسلمان انگریز دوستی کی بدولت اس سے بھی زیادہ ذلیل اور رسوا ہوں گے، اور اس کے بعد پھر خدا ان کو سمجھ دے گا، اور وہ اپنی اس روش سے متنفر ہو کر اپنی اجتماعی عزت کے لیے کوشاں ہوں گے"،

بہرحال ملکی اور قومی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانوں کے لیے "پاکستانی اسکیم" مہلک نتائج رکھتی ہے، اور جب کہ موجودہ دور میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس جیسی حکومتیں یہ غور کر رہی ہیں کہ اگر وہ چند بڑی بڑی حکومتوں کو ایک فیڈرل حکومت میں تبدیل

کر کے زندگی بسر نہیں کریں گی، تو ان کا دشمنوں کے مقابلہ میں زندہ رہنا مشکل ہے، اور جب کہ ایران، افغانستان اور ترکی کا میثاقِ سعد آباد جو ۱۹۳۸ء میں خلافتِ عظمیٰ کا نمونہ کہا جا رہا تھا، ۱۹۳۹ء کی جنگ شروع ہوتے ہی گاؤ خورد ہو گیا حتیٰ کہ کوئی ایک دوسرے کی امداد کا نام بھی نہ لے سکا، اس وقت ہمارے ہمدرد و غمخوار ہندوؤں کی تنگ نظری سے خفا ہو کر ہندوستان کے حصے بخرے کرنے ہی میں مسلمانوں کی عزت و ترقی سمجھتے ہیں اور اس کو "الہامی اسکیم" یقین فرماتے ہیں، اِنَّ ہٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ،

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ جب اپنی انقلابی اسکیم لے کر حجاز پہنچے اور عرصہ کے بعد ان کے اور انور پاشا مرحوم اور جمال پاشا مرحوم کے درمیان مدینہ طیبہ میں راز دارانہ گفتگو ہوئی تو طویل گفت و شنید کے بعد انور پاشا نے حضرت شیخؒ سے فرمایا کہ مولانا! اب وہ وقت گیا جب ترکی یا کسی مسلم حکومت سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ہندوستان پر چڑھائی کر کے اس کو آزاد کرا دے گی، اب اگر آپ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تو ہندوستان ہی واپس تشریف لے جائیں، اور بڑی مصیبت سے بچنے کی خاطر چھوٹی مصیبت اختیار کر لیں، اور وہ یہ کہ وہاں کے مختلف المذاہب لوگوں کو اجنبی حکومت کی غلامی سے آزاد کرانے اور ایک مشترک حکومت قائم کر کے غلامی سے نجات پانے کا تصور پیدا کریں، اور اسی کے لیے ہر قسم کی جدوجہد سے کام لیں، اگر آپ ایسا کریں گے اور برٹش حکومت کی موجودہ طاقت کو نیشنل گورنمنٹ میں منتقل کر کے کمزور بنائیں گے تو یہ نہ صرف خود اپنے اوپر احسان ہو گا بلکہ دنیائے اسلام کی غلامی اور نیم غلامی بھی صحیح آزادی سے دوچار ہو سکے گی،

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عملی انسانوں کی نگاہ میں اجنبی اقتدار کی کیا حیثیت ہے؟ اور بے عملی کو شاہراہ بنا کر اور منفی پہلوؤں پر زندگی کی اساس قائم

کرنے والے حضرات کے نزدیک کیا ہے؟

درحقیقت یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو قوم پرور مسلمانوں اور جمعیۃ علماء اور دوسری ترقی پسند مسلم جماعتوں کے اور پاکستانی اور مسلم لیگی مسلمانوں کے درمیان اختلافی ہے، باقی سب اس کی شاخیں اور برگ و بار ہیں، قوم پرور مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کی ہمہ قسم کی تنگ نظری اور تعصب کے باوجود ان کے مقابلہ میں انگریزی حکومت کا شاہنشاہانہ اقتدار ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی اور دنیائے اسلام کی غلام اور نیم غلام بلکہ آزاد حکومتوں کے لیے بھی زیادہ خطرناک اور ہلاکت آفریں ہے، اس لیے کسی حال میں بھی ہندو اور دوسری غیر مسلم اقوام ہند کو نظر انداز کر کے انگریزوں کی جانب نظر اٹھائے رکھنا اور مختلف مقدس عنوانوں کے ساتھ ان کے اقتدار کے استحکام کا آلۂ کار بننا ہلاکت مول لینا اور مسلمانوں کی عظمت کو خاک میں ملانا ہے۔ اس کے برعکس پاکستانی اور لیگی مسلمان یہ یقین کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی یہ مصیبت انگریزوں کے اقتدار کے مقابلہ میں بہت زیادہ خطرناک ہے، اور انگریزوں کی غلامی ہزار درجہ قابلِ ترجیح اور قابلِ قبول ہے،

اور جب وہ اس نظریہ کو آزادی کے خلاف سمجھ کر اور اس کی غیر معقولیت سے شرما کر اس جذبہ کو معقول بنانا چاہتے ہیں تو یہ فرمایا کرتے ہیں کہ اگر آزادیِ کامل فوراً ہی مل جاتی تو دوسری بات تھی ہم بھی اس پر غور کرتے، مگر جس طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھ رہے ہیں اس سے تو ہم دوسری غلامی میں آجائیں گے، اس لیے یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہیں،

حقوقِ مسلم

رہا مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ تو اس کے لیے قوم پرور مسلمان اور جمعیۃ علماء ہند کبھی بھی ان کمیونل مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہی، اور جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا سب سے پہلے انھوں نے ایسی تجاویز مرتب کیں جن میں مسلمانوں کی بہتر سے بہتر طریق

پر حفاظت ہوتی ہے، اور وہ ہندوؤں کے مساوی ہو کر ہندوستان کی حکومت
میں مساوی حصہ دار ہو سکتے ہیں،

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے سہارنپور کے ۱۹۳۱ء والے فارمولے میں اس وقت کے
پیش کردہ مسٹر جناح کے مطالبات سے زیادہ بہتر طریقہ پر مسلمانوں کا معاملہ حل کیا تھا،
اور آج بھی جیسا کہ عنقریب نقل کیا جائے گا جمعیۃ علماء ہند کا لاہور ریزولیوشن مسلم لیگ
کے لاہور ریزولیوشن سے مسلمانوں کے لیے کمیونل اور فرقہ وارانہ حقوق کے نقطۂ نظر سے
بھی مفید اور بہتر ہے، اور اقوام ملک کے درمیان مذہبی اور قومی منافرت بھی نہیں پیدا
کرتا، اور اجنبی اقتدار کو بھی موقع نہیں دیتا کہ وہ ملک کے حصے بخرے کر کے مسلمانوں کو
اپنے تحفظ اور استحکام کا آلۂ کار بنا سکے، مگر اس کے باوجود ہواخواہانِ لیگ کی نظر میں
جمعیۃ کی وہ سب کوششیں جو وہ مسلم حقوق کے سلسلہ میں کرتی رہی ہے صرف اس لیے
ہیچ در ہیچ ہیں کہ اس کے صدر محترم نے انگریزی حکومت سے ہندوستان کو آزاد
کرانے کے جذبہ میں یہ کیوں فرمایا کہ وہ اس غرض کی خاطر کتوں اور سوروں سے بھی
اشتراک کر سکتے ہیں،

باب چہارم:

پاکستان تبلیغی نقطۂ نظر سے

جو حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان میں برٹش حکومت سے قبل بلکہ ہندو حکومتوں کے راج میں اسلام نے کس طرح اپنا پیغام پہنچایا اور یہاں کے باشندوں نے کس رح اس کو قبول کیا، نیز برٹش حکومت کے قیام کے بعد کس طرح یہاں کی آبادی ایک صدی میں دو چند ہو گئی، اور جو حضرات اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ اسلام کی اس روز افزوں ترقی کے پیش نظر کس طرح سیاسی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے ہندوؤں میں "آریہ سماج تحریک" نے نشو ونما پائی وہ بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی ترقی اور برتری کا علاج "پاکستان" کے ذریعہ سے کیا گیا تو اس سے اسلامی تبلیغ کو بہت بڑا دھکا لگے گا، اور عظیم الشان نقصان پہنچے گا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فرض کیجیے کہ ہندو ہندوستان نے اپنے مذہبی اور قومی مفاد کی خاطر یہ اعلان کر دیا کہ ان کے ملک میں کسی مذہب کی تبلیغ نہیں کی جا سکتی، اور نہ ایسی انجمنیں قائم ہو سکتی ہیں حتیٰ کہ انھوں نے خود اپنے مذہب کے متعلق بھی یہی طے کر دیا، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا مفاد بھی انہی کو پہنچتا ہے تو "مسلم ہندوستان" اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ردِ عمل کے طور پر اپنے یہاں بھی اس قسم کے احکام نافذ کر دے اور قانون پاس کر دے، مگر پاکستانی بھائیوں کو یہ کون بتلائے کہ اس شکل میں خسارہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کو رہے گا،

ہمارے سامنے جاپان اور چین کی مثالیں موجود ہیں، دونوں ممالک بُدھ مذہب کے

پیرو تھے، مگر چین میں اسلام نے تلوار اور حکومت کے بغیر وہ ترقی کی کہ آج دنیا کی حکومتوں میں ہندوستان کے بعد چین ہی میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں، مگر جاپان کے اس حکم اور قانون نے کہ جاپانی حکومت اسلام کی مذہبی حیثیت تسلیم نہیں کرتی جاپان کو اسلام سے بیگانہ رکھا، اور اب جبکہ حالیہ زمانہ میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تو اسلام نے وہاں بھی اپنی صداقت کا اثر دکھانا شروع کر دیا،

اور اس کے آگے ملکانہ راجپوتوں اور دوسرے لاکھوں نومسلم بے علم جماعتوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہوگا، اور وہ اس وقت جبکہ تین چوتھائی ہندوستان میں وہ ہندو ہندوستان کا تصور کرکے رہیں گے، تو ظاہری جبر و اکراہ کے بغیر ہی اُن کا رُخ کس جانب ہوگا، جب کہ آج بھی ان کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے، اور اس کے برعکس ہندو جاہل دہقانیوں تک میں اقلیت اور اکثریت کے جھگڑوں نے جو سیاسی بیداری پیدا کر دی ہے اس کے پیش نظر مسلم ہندوستان میں "نعم البدل" کی تلاش العیاذ باللہ نہ ارتداد کا توازن پورا کر سکتی ہے اور نہ اضافہ و ازدیاد ہی میں صحیح توازن باقی رہ سکتا ہے،

اگر اس پہلو کو جو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا......

وہ انگریزی داں طبقہ نظر انداز کر دے تو کر دے جس نے اپنی سیاست کا مرکزی نقطہ "انگریزوں کی غلامی اور ان کے سہارے زندہ رہنا" بنا لیا ہے، کیونکہ وہاں تو قائد سے لے کر مقلد تک سب ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح مذہب اسلام کو بھی مخصوص عقائد اور اعمال کا مذہب نہیں سمجھتے، بلکہ صرف "سوسائٹی کے مذہب" کی حیثیت سے اس کو اپناتے ہیں، تاکہ وزارتوں، اسمبلیوں میں ملازمتوں میں ایک خاص نام سے جگہ حاصل کر سکیں، خواہ وہ نام نہاد مسلمان خدا کا منکر ہو یا مذہب کا منکر اور خواہ وہ رسالت، ختمِ نبوت، حشر و نشر، معاد و آخرت وغیرہ کا قطعاً منکر ہو، لیکن ایک

ہمدردِ اسلام سے تو ممکن نہیں کہ وہ نظر انداز کردے،

دو قوم (ٹو نیشن) کا نظریہ جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے اسلام کو سوسائٹی کے مذہب کی حیثیت دے کر یا بالفاظِ دیگر اسلام کو قوم کا مرادف قرار دے کر ایک عظیم الشان خطرہ یہ پیدا کردیتا ہے کہ اس صورت میں مسلمان، جرمن، فرنچ، انگریز وغیرہ کی طرح ایک علاقہ میں رہنے والے کا نام ہوجائے گا، یعنی جس طرح جرمنی وہ ہے جو سرزمین جرمن میں ہے، فرنچ وہ ہے جو فرانس میں رہے، اسی طرح مسلمان وہ ہے جو پاکستان میں رہے،

اسلام کو ایک اخلاقی، تہذیبی اور روحانی پروگرام کی حقیقت سے اتار کر نقط جغرافیائی حدود میں محدود ہو کر دینے سے جو مذہبی، تہذیبی اور تبلیغی نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں وہ مزید توضیح کے محتاج نہیں، جس طرح ایک جرمنی جرمنی ہی خواہ عمل کچھ رکھتا ہو، کیونکہ وہ جرمن نیشن سے تعلق رکھتا ہے، ایک برہمن برہمن ہے، کیونکہ وہ برہمن قوم سے تعلق رکھتا ہے، عمل اور عقیدہ خواہ کچھ ہو، اسی طرح ایک مسلمان مسلمان ہوگا خواہ اس کا عقیدہ اور عمل کچھ ہو، کیونکہ وہ اسلام نیشن سے تعلق رکھتا ہے، اور جس طرح ایک برطانوی کو جرمنی بننے کی دعوت دینا ایک سیاسی چیز ہے، مذہب سے اس کا تعلق نہیں، اسی طرح ایک ہندو، عیسائی یا سکھ کو اسلام کی دعوت دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اس نیشن کا جزو بن جائے جس کا مرکز پاکستان ہی،

آج مسٹر جناح بیرسٹر کی بجائے مفتی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، اور سر ظفر اللہ قادیانی، راجہ محمود آباد شیعہ کو جو پاکستان کے حامی ہیں مسلمان دیانتدار قرار دیتے ہیں، اور مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے عمائدینِ ملت کو بددیانت، بے ایمان کہہ دیتے ہیں، اور لیگی اخبارات ان جملوں کو نہایت آب و تاب

سے شائع کرتے ہیں، اور لیگی نوجوان مسٹر جناح کے فتوے پر ..... اعتقاد رکھتے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ مولانا آزاد صاحب مدظلہٗ کے ساتھ اس سے بھی بُرا سلوک کرتے ہیں جو ایک کافر مرتد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے،

غور کرو، اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے، آخر ان بزرگوں کی (معاذ اللہ) بے ایمانی اور بے دینی اس کے سوا کیا ہے کہ یہ حضرات پاکستان کے حامی نہیں ہیں؟

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو یہ شور اشوری کہ متحدہ قومیت کا لفظ بھی صدر جمعیۃ علماء کی زبان پر کیوں آیا؟ دوسری جانب یہ پستی کہ اسلام کو جغرافیائی حدود میں محدود کر دیا، ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آخر اس وارفتگی کا باعث اس کے سوا کیا ہے کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بہرحال تبلیغی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بھی "پاکستان" مسلمانانِ ہند کے لیے ہرگز مطمئن حل نہیں ہے،

باب پنجم:

پاکستان خارجہ پالیسی کے نقطہ نظر سے

یہ صحیح ہے کہ صوبہ سرحد اور بنگال (کلکتہ) اور ساحل سندھ (کراچی) ایسی اہم پوزیشن میں ہیں کہ ہندوستان کے بیرونِ ممالک سے جنگ و صلح اور تجارتی و صنعتی تعلقات کے لیے گویا کنجی ہیں، جو پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ میں بلاواسطہ ہوگی، مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ یہی کنجی اس وقت دوسروں کے ہاتھ بآسانی چلی جاتی ہے جبکہ کنجی بردار سیاسی، اقتصادی اور تجارتی اعتبار سے اس قدر مضبوط نہ ہو کہ وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھانے میں اس کے محتاج رہیں۔[1]

---

[1] محمد ظفر احمد صاحب انصاری اپنے رسالہ "پاکستان اور مسلمان" میں تحریر فرماتے ہیں "پاکستان کی پیداوار کا بہترین خریدار کم از کم ایک مدت تک یورپ ہی ہوگا، جہاں سے اُن خام اشیاء کے عوض میں اس کو مصنوعی اشیاء مل سکیں گی، آزاد تجارت کی پالیسی بائع اور مشتری دونوں کے لیے سودمند ہوگی، اور کم از کم اس وقت تک یہ صورت ضرور رہے گی جب تک کہ پاکستان خود صنعتی کاروبار نہ کر سکے،، آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:
"انہی وجوہ کی بنا پر مسٹر کامورٹ نے اپنی کتاب "دولت و خوش حالی" میں لکھا ہے کہ پاکستان کا مرکزی وفاق میں شامل ہونا اس کی خودکشی کے مرادف ہوگا،، (صفحہ ۳۱، ۳۲) غور فرمائیے کہ پاکستان جب جنس خام کی منڈی بن کر برطانیہ سے متعلق رہے گا تو پاکستان کی حیثیت کیا ہوگی؟ اور وہ بندرگاہیں کس کے قبضہ میں ہوں گی؟ جو قوم آزاد جین پر تجارتی مفاد کی خاطر اس طرح چھا سکتی ہے کہ اس کی بندرگاہوں پر قابض اس کے اقتصادی وسائل کی مالک، وہ اپنے ماتحت پاکستان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ جو اس کے

قبضہ میں ڈیڑھ سو برس سے ہے، خیر باعتراف ظفر صاحب مسٹر کامورٹ کے بیان سے اندازہ لگائیے کہ نعرۂ پاکستان کوئی حقیقی نعرہ ہے یا گراموفون کی آواز، ہم پھر وہی کہتے ہیں ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

لیکن گذشتہ تفصیلات کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہو چکی کہ مسلم پاکستان رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کا ⅓ حصہ ہوگا، اور سیاسی، اقتصادی اور تجارتی اعتبار سے بہت کمزور اور نحیف ہوگا، اِن حالات میں اسباب سے قطع نظر کرکے محض جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے یہ کہدینا کہ کمزور اکثریت کے اور مضبوط اقلیت کے باوجود ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور ہم ہندوستان کے مقابلہ میں مساوی مضبوط ہو سکتے ہیں، حسنِ نیت تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت کے مطابق نہیں کہا جا سکتا،

دنیا میں دوسری حکومتیں اسی حکومت سے خوف زدہ ہو سکتی ہیں جو خود اپنے تمام حالات میں مضبوط ہو، اور اس سے ہر قسم کی سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو وابستہ رکھنا ضروری سمجھتی ہیں، اور کمزور حکومت ہمیشہ دوسروں ہی کے رحم و کرم پر "آزادی" کے نام سے زندہ رہا کرتی ہے،

آج چھوٹی حکومتوں میں ترکی جیسی زبردست طاقت بھی جنگ میں اس لیے اپنی غیر جانبداری محفوظ رکھ سکی کہ وہ دو مضبوط طاقتوں کی بوالہوسی کے درمیان سانس لے رہی تھی، اور دونوں طاقتیں اپنی اپنی مصالح کی بناء پر اس سے الجھنا نہیں چاہتیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی خوش اعتقادی کی بنا پر اس معاملہ کو اُن کی بے نظیر شجاعانہ زندگی اور ذرائع و ذخائر جنگ کی فراوانی پر محمول کرکے یہ کہدیں کہ اُلجھنے کی خواہش کے باوجود ترکی کی طاقت کے خوف سے الجھنا نہیں چاہتیں، لیکن دردِ دانیال کے بارے میں آج ترکی کی بے بسی اس خوش اعتقادی کا بھی پول کھو دیتی ہے،

مضبوط حکومتیں سیاسی اور تجارتی تعلقات کس کے ساتھ زیادہ مستحکم رکھتی ہیں اس کی روشن مثال حکومتِ چین ہے، کہ جب وہ جنگِ عظیم سے پہلے جاپان کے ہاتھوں پٹ رہا تھا تو اس غریب کا کوئی بھی حامی نہ تھا، اور پھر وہ ابوقتِ ضرورت بہت سے ہوگئے،

لہٰذا ہندوستان سے تعلقات رکھنے کے لیے یورپین اور ایشیائی طاقتیں ہندوستان کی جانب جھکیں گی یا ان کی جانب، اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہوسکتا ہے، میں صرف ایک مثال پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں،

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کانگریس نے عام سول نافرمانی شروع کی جس میں بدیشی کپڑے پر پکٹنگ اور اس کا مقاطعہ بھی شامل تھا تو مانچسٹر اور لنکا شائر کی کمپنیوں نے یہ طے کیا کہ ہندوستان میں کپڑے کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، اور یہ بڑا ظلم ہے کہ مسلمان اس سے قطعًا محروم ہیں، لہٰذا حاجی عبداللہ ہارون مرحوم کے ذریعہ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بذریعہ اشتہارات یہ پروپیگنڈا کرایا گیا کہ ان کمپنیوں نے مسلمانوں کو کپڑے کی تجارت میں مضبوط کرنے کے لیے یہ طے کیا ہے کہ وہ دو کروڑ روپیہ کی قیمت کا کپڑا مسلم کمپنی قائم شدہ ہندوستان کو اُدھار دیتے رہیں گے، اور یہ رقم اس کمپنی پر اُس عرصہ تک برابر قائم رہے گی جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوجائے، لہٰذا مسلمانوں کو بدیشی کپڑے کا مقاطعہ نہیں کرنا چاہیے، اور بمبئی میں ایک فرم بھی قائم کی گئی، لیکن جوں ہی تحریک کامیابی کے ساتھ ختم ہوگئی مسلمانوں کو نظرانداز کردیا گیا، اور وہ ساری اسکیم خاک میں مل گئی، یہ ہے کمزور اور طاقتور حکومت کا تقابل، طاقتور کو چھوڑ کر کمزور سے کون معاملہ کرے،

باب ششم:

پاکستان لِسانی نقطۂ نظر سے

میں یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ مسئلہ "زبان" کا جہاں تک تعلق ہے اس کے بارے میں گاندھی جی سے لے کر ایک معمولی ہندو کانگریس مین تک کا "اردو" کے متعلق ذہن صاف نہیں ہے، اور اگرچہ کانگریس کا ریزولیوشن اس بارے میں بہت صاف، واضح اور صحیح اصول پر وضع کیا گیا ہے، لیکن اکثر ہندو کانگریس مینوں کا عمل اس کے خلاف ہی، لیکن اس حقیقت کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ "اردو" اور "ہندوستانی" کو ہندوؤں میں غیر دلچسپ بنانے کے لیے اور ان کے قلوب میں نفرت پیدا کرنے کے سامان مسلمانوں نے بھی کم مہیا نہیں کیے، اور پنجاب کے مسلم اخبارات اور اہلِ زبان نے تو اردو کے بہتر سے بہتر ہندو انشا پرداز کی اردو نویسی کے متعلق "بوئے کچوری می آید" کی پھبتیاں کس کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ بھڑکانے کی کوشش کی، اور "اردو زبان" کے مسئلہ کو ملک کی مشترکہ زبان بنانے اور ظاہر کرنے کی بجائے لیے دلائل پر اُس بحث کو چلایا کہ جن سے ہندوؤں کے اس دعوئی کی تصدیق ہوتی رہی کہ "اردو" مسلمانوں کی "مذہبی میراث" ہے، نہ کہ "ملک کی مشترکہ وراثت" اور غیظ و غضب میں حالاک حریف کے دام میں آکر وہی کہنے لگے جو اُس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی میراث ہے،

پھر یہ حقیقت بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ کانگریس گورنمنٹوں میں جس درجہ بھی اردو یا ہندوستانی ترقی کے لیے قدم اٹھائے گئے اس کے مقابلہ میں بنگال کی مسلم لیگی وزارت نے اس سے آدھا قدم بھی اس کے فروغ دینے کے لیے نہیں اٹھایا، بلکہ اس کے برعکس بنگالی زبان کو اپنے ہاتھوں "اردو" کا حریف بنا دیا گیا، اور اس حقیقت کا انکشاف کسی فرقہ پرور مسلمان کے قلم و زبان سے نہیں ہوا، بلکہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی اس رپورٹ سے ظاہر ہوا جو انھوں نے "کل ہند اردو کانفرنس" کے

اجلاس دہلی میں پڑھ کر سُنائی تھی،

بہرحال اگر ہم ہندوستان کے ایک حصّہ کو پاکستان بناکر ¾ ہندوستان سے جُدا کرلیں گے تو اگرچہ ¼ ہندوستان کی سرکاری زبان اردو یا ہندوستانی قرار پائے گی، لیکن ¾ ہندوستان کی سرکاری زبان خالص ہندی اور رسم الخط خالص دیوناگری ہوکر رہے گا، اور اس طرح آہستہ آہستہ ہندو ریاستوں کے مسلمانوں کی طرح تقریباً تین کروڑ مسلمان جو ہند و ہندوستان کے باشندے ہوں گے اردو زبان سے بڑی حد تک بیگانہ ہوجائیں گے، اور چند خاص علمی حلقوں کے علاوہ یہ زبان ہندوؤں میں تو کیا مسلمانوں میں بھی مذہبی زبان "عربی" کی طرح متبرک سمجھ کر بولی اور دیکھی جانے لگے گی، اور اس کا جو اثر ہمارے تمدن اور ہماری معاشرت پر جس طرح پڑے گا وہ ظاہر ہے،

اس کے برعکس ہم مشترک ہندوستان کی وحدت کو نہ مٹائیں تو واقعات اور تجربات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو یا ہندوستانی کو متعصب ہندوؤں کے ہندی اور سنسکرت کے قالب میں ڈھالنے کی کوششوں کے باوجود کانگریس کے صحیح ریزولیوشن اور کانگریس گورنمنٹوں کے مدراس، بہار وغیرہ میں اقدامات کی وجہ سے ہندوستان بھر کے لیے اردو یا ہندوستانی "لنگورفرنیکا" بنتی جارہی ہے، اور یہ سیلاب نہ ساہتیہ سمیلن سے رُک سکتا ہے، اور نہ متعصب ہندوؤں کی سنسکرت نوازی سے، البتہ اپنی دوسری غلط روشوں کی طرح ہم اگر خود ہی اس کے محدود ہوجانے پر راضی برضا ہوجائیں تو یہ اور بات ہے،

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں کانگریس گورنمنٹوں کے آٹھ صوبوں کی تفصیلات سے یہ واضح کرتا کہ سمپورنانند جیسے کانگریس وزیر اور ٹنڈن جی جیسے اسپیکر کے باوجود اردو کی ہندوستانی کے نام سے ہندوؤں میں دس گنا ترقی ہوئی، اور ہزارہا ایسے اردو پڑھنے اور لکھنے اور سیکھنے پر مجبور ہوئے جو ٹوٹی پھوٹی اردو بھی نہیں جانتے تھے،

حصہ دوم:
باب اول:

پاکستان کی متبادل تجویز

جمعیت علماے ہند کا منصوبہ

پاکستان کا نعم البدل

مسطورہ بالا تفصیلی نزاکتوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد جب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد جماعتی زندگی کی تشکیل "پاکستان اسکیم" نہیں ہو سکتی تو اس کا نعم البدل وہ کونسی اسکیم ہے جو اس مقصد کو تو پورا کرتی ہو جس کے لیے پاکستان کی تجویز سامنے لائی جا رہی ہے، اور مسطورہ بالا بیان کردہ نقصانات اور مضرتوں سے بھی حفاظت ہو جائے، تو میں اس کے لیے علیٰ وجہِ البصیرۃ کہوں گا کہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور کی تجویز ہی اس مقصد کی تکمیل کے لیے صحیح علاج ہے، یہ تجویز نیز آزاد مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی تجاویز اس اصول پر مبنی ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن ان مختلف جماعتوں کی طرح نہیں ہیں جو اقلیت کے نام سے موسوم ہیں، اس لیے کہ وہ بعض صوبوں میں اگر اقلیت میں ہیں تو بعض میں اکثریت میں بھی ہیں، اور اصطلاح میں خواہ ان کو نیشن (قوم) کہا جائے یا نہ کہا جائے،

لیکن مسطورہ بالا حقیقت کا جو ایک مشاہدِ حقیقت ہے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا، لہٰذا مسلمانان ہندوستان کی مرکزی وحدت کو تسلیم کرتے ہوئے اس حق کو اپنا

فطری حق سمجھتے ہیں، کہ سیاساتِ ہند میں ان کی جگہ اُن اقلیتوں کی سی نہیں رہی گی
جو اکثریت کی حکومت مان کر اس سے اپنے لیے "سیلف گارڈ" "تحفظات" حاصل
کر کے اپنا حق پالیں، بلکہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت مساویانہ ہوگی،
چنانچہ تجویز مذکورۃ الصدر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر ایک صوبہ خود مختار اور مکمل طور
پر آزاد ہوگا، اور مرکزی وحدت کے لیے مرکز کو صرف وہی حقوق دیئے جائیں گے
جو باتفاقِ آراء تمام صوبے اس کے سپرد کر دیں، اور پولٹیکل زبان میں جن حقوق کو
ریزروڈ ری پاور (اختیارات آزاد) کہا جاتا ہے وہ بھی صوبوں کو ہی حاصل ہوں گے،
چنانچہ تجویز کی دفعہ (ج) کے الفاظ یہ ہیں:-

"ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل آزادی اور خود مختاری کے حامی
ہیں، غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے، اور مرکز کو صرف
وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالہ کریں، اور جن کا
تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو"،

تجویز کا ایک اہم جزو یہ ہے:

کہ مذہبی معاملات کُل کے کُل فنڈامنٹل رائٹس (بنیادی حقوق) سمجھے
جائیں گے، اور اس کا فیصلہ اس کمیونٹی کے ہی ہاتھ میں ہوگا جس کے وہ
حقوق ہیں، اور وہ کسی حال میں بھی لیجسلیچر کے اندر زیر بحث نہیں آسکتے،
اور اسی طرح صوبوں کی حکومتوں میں بھی یہی ہوگا،

چنانچہ آزادی کامل کو نصب العین قرار دیتے ہوئے یہ تصریح کردی ہے کہ:

"وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم
کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی"،

اس تجویز میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ:

"مسلمان کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو"

مرکز میں اگرچہ آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید قرار دیا گیا ہے لیکن یہ بھی تصریح کردی گئی ہے کہ:

"ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی، یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں"

پھر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سہارنپور مئی ۱۹۴۵ء میں ایک تشریح کا اضافہ کرکے ان صورتوں کو بھی بیان کردیا ہے جن سے مرکز کی تشکیل اطمینان بخش طریقہ پر ہوسکتی ہے، چنانچہ تشریح کے الفاظ درج ذیل ہیں:

تشریح:

"اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بیشک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز کو پسند کرتی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ مجموعۂ ہندوستان خصوصًا مسلمانوں کے لیے مفید ہے، مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کرلیا جائے، اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کرسکے، مرکز

کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے ہو جائے ممکن ہے،

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو؛

ہندو ۴۵ ، مسلم ۴۵ ، دیگر اقلیتیں ۱۰

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گا،

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے، یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کے آخری فیصلے کرے گا، نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت کے فیصلہ سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا،

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں،

بہرحال مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ بعض اور بھی ایسی شکلیں ہیں جو زیر بحث آسکتی ہیں، اور مسلمانوں کے مقصد کو پورا کر سکتی ہیں، جن کو زیر بحث لانا تب ہی مفید ہوگا کہ یا تمام مسلمان جماعتیں اپنے اختلافی نقطۂ خیال کے باوجود جمع ہو کر مسلمانوں

کی اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے لیے ایک جا بیٹھیں اور یا پھر کسی عملی شکل پیدا ہونے کے وقت زیر بحث لائی جا سکتی ہیں،

یہ وہ صورتیں ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں جب ایک غیر جانبدار محب وطن کے توسط سے جمعیۃ علماء ہند کے بعض رہنماؤں اور مسلم لیگ صوبہ یو، پی کے بعض لیڈروں کے درمیان زیر بحث آئیں تو لکھنؤ کے ایک مشہور مسلم لیگی لیڈر نے ان کے متعلق فرمایا کہ بلاشبہہ مسلمانوں کا صحیح تحفظ انہی تجاویز میں ہے، نہ کہ "پاکستان" میں، مگر قائد اعظم کی ضد اور ہٹ کب ہم سب کو جمع ہو کر ایک فیصلہ پر متفق ہونے دے سکتی ہے' اور اس لیے اب ہم مجبور ہیں کہ بجز "پاکستان" کے اور کسی چیز کا ذکر نہ کریں،

بہر حال اس طرح ہندوستان کی مرکزی وحدت بھی قائم رہتی ہے اور مسلمانوں کے خوف وخطرات کا بھی صحیح علاج ہو جاتا ہے، اور مرکزی وحدت میں منسلک ہو جانے سے ان سب مضرتوں اور نقصانات کی بھی تلافی ہو جاتی ہے، جو سیاسی، اقتصادی، قومی اور طبعی (جغرافیائی) اعتبار سے تقسیم ہند کی شکل میں مسلمانوں کو پہنچ جانے والے تھے، اس لیے کہ وہ سب باتیں صرف اسی لیے وقوع پذیر ہو سکتی ہیں کہ تقسیم ہند سے جو قومی اور مذہبی منافرت پیدا ہو جائے گی وہ ہندوستان کے ہر دو حصص کو ہر معاملہ میں ایک دوسرے سے نہ صرف جدا کر دے گی بلکہ دونوں کے درمیان کھلی ہوئی رقابت کی صورت پیدا ہو جائے گی، اور زبانی بھائی چارہ ہر گز ان زخموں کا اندمال نہیں کر سکتا جو تقسیم ہند کی عملی شکل میں آنے سے پیدا ہو جائیں گے، مرکز کی وحدت ہندو دل کی تنگ نظری کے باوجود ایک دوسرے کے لازمی تعاون واشتراک کا ایسا اہم سلسلہ باقی رکھے گی کہ بلاشبہہ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی اعتماد کی اسپرٹ کو ترقی حاصل ہو گی، اور ملک میں خانہ جنگی کے اشتباہات ختم ہو جائیں گے،

مگر حقیقت جب ہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ محض صحافتی مضامین ہی کا تجربہ نہ ہو، بلکہ ان مسائل پر بحث کرنے والوں کی ملکی سیاسیات کے علل و اسباب پر صحیح نظر ہو، اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے دماغ جماعتی پروپیگنڈہ سے آزاد رہ کر صرف اس طرح مسائل پر غور کرنے کا عادی ہو کہ مسلمانوں کی حقیقی فلاح کے ساتھ ساتھ اجنبی حکومت کے اقتدار کو کمزور بنا کر یا شکست دے کر ملک کی فلاح کی صورت کس طرح بن سکتی ہے؟

اس حالت میں مسلمان اقلیتیں بھی مجموعۂ ہندوستان کے اُن تمام فوائد سے متمتع ہو سکتی ہیں، اور اکثریت کے صوبوں کے مسلمان بھی باہمی تعاون کے ساتھ اس کے فائدہ سے مستفید ہو سکتے ہیں، اور خود مسلمان بھی دو حصوں اقلیت اور اکثریت میں تقسیم ہو کر جدا جدا سیاسی مصالح کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں،

باب دوم:

چند شکوک اور اُن کا جواب

وحدتِ مرکز اور صوبجاتی خود مختاری نے اصول تسلیم کرنے والوں پر چند اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے مثلاً یہ کہ اگر تمام صوبہ بجات خود مختار اور آزاد ہوں گے تو کیا ان کو اپنی فوج رکھنے کا بھی حق حاصل ہوگا! اور اگر نہ ہوگا تو صوبہ سرحد جیسے صوبہ کا مرکزی فوج کے تحت رہنا کیا مسلمانوں کے لیے خطرناک نہیں ہے؟

یہ سوال اپنی جگہ پر بلاشبہ اہم ہے، لیکن جس قدر اہم ہے اسی قدر اپنے حل ہوجانے میں بہت آسان ہے، اس لیے کہ اگر پولیٹکل قانونی صورتیں ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہیں کہ ہر ایک صوبہ اپنی اپنی جُدا فوج بھی رکھ سکتا ہے تو قوم پرور مسلمانوں اور فرقہ پرست مسلمانوں کی اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوں گی، اور یہ مسئلہ متفقہ آواز سے تسلیم کرایا جائے گا، اور اگر ایسا کرنے میں خود اقوام ملک کے باہم خانہ جنگی اور پولٹیکل آئین کے لحاظ سے لاینحل پیچیدگیاں پیدا ہونے کا یقین ہو تو پھر بھی مسلمانوں کے لیے ہماری بیان کردہ وحدت مرکز میں اس لیے خطرہ نہیں ہے کہ ہم سب مسلمان جماعتوں اور قوم پرور مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ رہے گا کہ خواہ کچھ ہی ہو آج برٹش حکومت کے زیرِ اثر فوجوں میں مسلمانوں کا جو بھی تناسب ہو مرکزی حکومت میں نہ صرف تناسب ہی باقی رہے گا بلکہ اس کے اضافہ کی مزید سعی کی جائے گی، تب اس مسئلہ کو فیصلہ کن قرار دیا جائے گا، لہٰذا ایسی صورت میں مسلمانوں کو پھر بھی

کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، اور ان کی فوجی پوزیشن پاکستان کی فوجی پوزیشن کے مقابلہ میں بہر حال بہتر رہے گی، جہاں چالیس فیصدی غیر مسلم اقلیت اپنے تناسب کلو فوج میں بھی مطالبہ کرے گی اور وہ تسلیم کرنا پڑے گا، بلکہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ مسطورہ بالا وحدت مرکز اور صوبجاتی آزادی کی اسکیم مسلمانوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ صوبہ سرحد میں فوجی بھرتی کی نوعیت بحق مسلمان پاکستانی اسکیم سے بدرجہا بہتر ہوگی،

بہر حال قوم پرور مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل نہیں رہے اور نہ غافل رہیں گے کہ مسلمانوں کی فوجی پوزیشن کسی حال میں بھی دوسرے کے رحم وکرم پر رہ جائے، اگرچہ لیگی صاحبان کی نظر میں قوم پرور ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ معاذ اللہ کفر والحاد بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے، چنانچہ خدا کا خوف کیے بغیر غلط طریقہ سے جو کچھ کسی کے جی میں آتا ہے اُن پر الزام لگا دیتا ہے، مگر کاش: ان کو معلوم ہوتا کہ جب کانگریسی لیڈروں کی مساعی سے الٰہ آباد میں یونٹی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو اکیس روز تک مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے مسلمانوں نے مشترک اجتماع کے باوجود خالص فرقہ وارانہ حقوق کے پیش کرنے اور ان کو صحیح پوزیشن میں تسلیم کرانے میں سب سے زیادہ پیش پیش مسٹر آصف علی صاحب اور جمعیۃ علماء ہند کے محترم ارکان حضرت مولانا محمد سجاد بہاری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور یہ خادم اور اس کے ساتھی تھے، اور مسٹر آصف علی صاحب کی جدوجہد کا تو یہ عالم تھا کہ نواب اسمٰعیل خاں صاحب اور حاجی محمد حسین صاحب ارکان مسلم کانفرنس و مسلم لیگ کو بھرے اجلاس میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے حقوق کے مسئلہ کو جس خوبی اور جرأت کے ساتھ انھوں نے پیش کیا ہم بھی اس حد تک پیش نہ کر سکتے تھے، اور اسی وجہ سے بعض قوم پرور ہندوؤں کی زبان سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

تک کے لیے یہ نکل گیا کہ "ہم کو اب معلوم ہوا کہ مسلمان قوم پرور ہونے کے باوجود بھی اندر سے "کمیونل مسلمان" ہی نکلتا ہے،، اور کاش! کہ اُن کو معلوم ہوتا کہ جب کبھی بھی حقوق کی بحث ملک میں چھڑ گئی ہے قوم پرور مسلمان مسلمانوں کے مقصد کی تکمیل میں پیچھے نہیں رہے، شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب کانگریس وزارتوں کے زمانہ میں ایک طرف پنجاب کے ایک مشہور لیڈر چند مسلم اور ہندو کانگریسی ممبرانِ اسمبلی کے ساتھ مل کر یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ مسلم ممبرانِ اسمبلی کی اقلیت اور ہندو ممبرانِ اسمبلی کی اکثریت کے اجتماع سے اسمبلی میں اکثریت حاصل کر کے یونینسٹ وزارت کو ختم کر کے کانگریس کولیشن وزارت بنالی جائے اور اس جدوجہد میں یہی لیڈر موصوف بہت زیادہ سرگرم تھے، اور دوسری جانب مسٹر سوباش چندر بوس اپنی صدارت سے فائدہ اٹھا کر بنگال میں اس قسم کی وزارت بنا کر اپنے بھائی سرت چندر بوس کی وزارت کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے اُس وقت اُن دونوں کی جدوجہد کے خلاف کس نے جرأت کے ساتھ قدم اٹھایا، تو وہ مسلم لیگیوں کی نگاہ کی سب سے بڑی گنہگار ہستی مولانا ابوالکلام مدظلہ کی ذاتِ گرامی تھی جس نے مسٹر پٹیل اور راجندر بابو کو نیم راضی دیکھ کر صاف صاف یہ متنبہ کر دیا تھا کہ اگر آپ حضرات نے ان مسلم صوبوں میں جہاں کے لیجسلیچر میں مسلم ممبران کی اکثریت کانگریس کے ساتھ ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت سے نیز اشد اکثریت سے کوئی وزارت ترتیب دی تو میں اسی وقت کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا، جب تک مسلم اکثریت کے کسی صوبہ میں لیجسلیچر کے اندر مسلم ممبران کی اکثریت کانگریس کی حامی نہ ہو جائے اس وقت تک ناممکن ہے کہ کانگریس کولیشن وزارت مرتب کر سکے، چنانچہ مولانا آزاد کا یہ رنگ دیکھ کر گاندھی جی اور جواہرلال اور پورے ہائی کمانڈ کو ان کی حمایت کرنا پڑی اور تب یہ مسئلہ ختم ہوا،

اور شاید آپ کو یہ خبر نہیں کہ قوم پرور مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ کانگریس میں بھی ہمیشہ بایاں بازو کہلاتا ہے، اور کانگریس ہائی کمانڈ کے خلاف ہی اکثر بولتا رہتا ہے، ہاں اُن کا یہ قصور ضرور ہے کہ وہ ہندوؤں کے خلاف اس قسم کی آگ بھڑکانا مسلمانوں اور ملک دونوں کے لیے سخت مضر سمجھتے ہیں، جس سے اجنبی اقتدار کے استحکام کو قوت پہنچے اور وہ اس کو اپنا آلۂ کار بنالے، قوم پرور مسلمانوں کے مسلم کاز کے تحفظ کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جبکہ ناسمجھی یا ذاتی اقتدار کی خاطر دانستگی سے پاکستان کا نام لے کر مسلمانوں کی سیاست کو اجنبی اقتدار کے ہاتھ میں کھلونا اور آلۂ کار بنایا جارہا ہے، اس وقت بھی محض اس لیے کہ غلط یا صحیح جب مسلمانوں کی سب سے بڑی کمیونل جماعت مسلم لیگ "حقِ خود اختیاری" کا مطالبہ کر کے تقسیمِ ہند کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے، تو ہم خواہ مسلمانوں میں جاکر اور جان کی بازی لگا کر... پاکستان کی مضرت کو ظاہر کر کے اس اسکیم کو فیل کرادیں، لیکن کانگریس کو اس حق کے لیے جمہوری اصول پر اعلان کر دینا چاہیے، ہر قسم کی جدوجہد کر کے کانگریس سے اس کا اعلان کرایا، اور اس کی موافقت میں خان عبدالغفار خاں، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری جیسے قوم پرور حضرات نے بیانات شائع کیے، اور کاتب الحروف نے اجلاس آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ بمبئی سنہ ۱۹۴۲ء میں اس مضمون کا ریزولیوشن بھیجا جس کے متعلق صدر کانگریس نے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں بحیثیت صدر یہ رولنگ دی کہ کانگریس اس حق کا اعلان کر چکی ہے اور پھر کرتی ہے، اور الہ آباد ریزولیوشن سے اس قبولِ حق پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ تمام کارروائی سنہ ۱۹۴۲ء کے اس اجلاس بمبئی میں ہو چکی تھی جس کے بعد ان کی گرفتاری سنہ ۴۲ء کی عظیم الشان تحریک کا باعث بنی، اور کیا کسی معقول آدمی کے نزدیک کانگریس کا یہ اعلان ایسی جماعت کے لیے جو ملک کی آزادی کا واقعی درد رکھتی ہو

سمجھوتہ اور مصالحت کے اقدام کے لیے کافی نہیں تھا؟ مگر بقول قدیم مثل "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"، مسٹر جناح نے برطانیہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے اُلٹا مسٹر مسٹر گاندھی اور کانگریسی مسلمانوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا، تین سال کی گرفتاریوں اور نظر بندیوں کے بعد جب رہائی ہوئی تو بھی قوم پرور مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لیے حقِ خود ارادیت کا دوبارہ اعلان کرایا، حتّٰی کہ صوبجاتی حکومتوں کے لیے مرکز سے علیحدگی کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا، لیکن اس تمام جد وجہد کے باوجود لیگی حضرات کے نزدیک کانگریسی اور قوم پرور ہی گردن زدنی ہیں،

یہی دو امور ہیں جن کی بنا پر ہم یہ تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم مسلمانوں کو کچھ دلانے میں تو "مجبور اور ہیچ" ہیں، مگر کانگریس یا آزادی خواہ جماعتوں کی جد وجہد کو شکست دے کر اجنبی شاہنشاہانہ اقتدار کے استحکام کے لیے اُن کی آوازوں کی خفگی بڑی حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے اور ہوتی رہی ہے،

عموماً پاکستان کے حامیوں کی طرف سے یہ سوال کیا جایا کرتا ہو کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی میں اس کی کیا گارنٹی ہوگی کہ جب جنگ وصلح اور دیگر معاملات میں مسلمان حکومتوں کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے اتحادِ اسلامی کا لحاظ رکھا جائے گا؟ سو اس کے متعلق بھی کانسٹی ٹیوشن بنانے وقت طے کیا جا سکتا ہے اور اس سے متعلق تفصیلات کو تسلیم کرایا جا سکتا ہے، اور میرے خیال میں یہ مسئلہ ویسا پیچیدہ نہیں ہی، خصوصاً جبکہ ہندوستان کی حکومت اس اصول پر قائم کی جائے گی کہ وہ استعمارانہ ہوس میں خود کسی پر بھی جارحانہ حملہ نہیں کرے گی،

ہاں اس سلسلہ میں اگر کوئی پیچیدگی آسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دنیا کی مختلف حکومتوں کی باہمی جنگ میں اگر جمہوریت کی حمایت میں ہندوستان کو ایسی حکومت کا ساتھ دینا پڑے جس کے برعکس کوئی مسلمان حکومت کسی سرمایہ پرست

جمہوریت کے مخالف یورپین یا کسی ایشیائی حکومت کے ساتھ ہو تو اس صورت میں مسلمانانِ ہند کیا رویہ اختیار کریں گے ؟

تو ظاہر ہے کہ جب ہم ہندوستان میں صاحبِ حکومت ہوں گے تو جس طرح ہمارا فرض ہے کہ مسلمان حکومتوں کے ساتھ اتحاد کرنا ضروری سمجھیں اسی طرح اس مسلمان حکومت کا بھی یہی فرض ہوگا ——— اور اگر وہ خدانخواستہ اس فرض کو قصداً نظر انداز کر دے تو مسلمانانِ ہند بھی مجبور ہوں گے کہ اپنے ملک اور خود اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے جو مناسب صورت سمجھیں اختیار کریں، جس طرح آج ترکی، ایران، افغانستان، عراق، شام اور مصر میں ہو رہا ہے، اور اگر یہ بات دل میں کھٹکتی ہو تو ترکی اور دوسری مسلمان حکومتوں کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اور جذبات سے الگ ہو کر بعینہٖ اس پوزیشن کو اس حالت میں بھی سوچیے اور حل کیجیے، کہ جب پاکستان کو اپنی حفاظت کے لیے کسی دوسری مسلمان حکومت کے خلاف جنگ آزما ہونا پڑ جائے اور جو حل آپ اس کے لیے تجویز فرمائیں وہی حل وحدتِ ہند کی صورت میں بھی اختیار کرنے کے لیے تجویز فرمائیں، قوم پرور مسلمان انشاء اللہ ہمنوا اور ساتھ رہیں گے،

پاکستان کے حامیوں کی ایک عجیب وغریب دلیل یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ ——— اگر پاکستان مسلمانوں کے حق میں واقعی ایسی ہی غلط چیز ہے تو ہندو اس کے اتنے مخالف کیوں ہیں ——— ؟ لیکن ایسا کہنا سب سے بڑی سیاسی نادانی ہے، یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو قوموں کے سیاسی رجحانات سے ناواقف ہیں، اصل یہ ہے کہ جو ہندو نیشنلزم یعنی قومیت کے صحیح معنی میں قائل ہیں وہ تو خالص قومی یکجہتی کے اصول پر دیانتداری سے پاکستان کو ملک کے لیے مضر سمجھتے ہیں، البتہ ان کے علاوہ مہاسبھائی قسم کے ہندو دل

کی جماعت پاکستان کے تصور میں پان اسلام ازم (عالمگیر اسلامی برادری) کا ہوّا دیکھتی ہے، اس سلسلہ میں مسلمان خود غور کریں بحالاتِ حاضرہ کہ ایک اسلامی ملک یورپ کے پنجۂ استبداد میں پھنسا ہوا ہے، یہ ہوّا کہاں تک درست ہے) ان دو جماعتوں کے علاوہ ہندوؤں کی تیسری جماعت وہ ہے جو راجگوپال اچاریہ کی ہم آواز ہو کر یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح کانگریس ¼ ہندوستان مسلمانوں کو دیدے تا کہ بقیہ ¾ میں وہ من مانا راج کر سکے، پھر اس جماعت میں بھی دو گروہ ہیں ایک تو وہ جو یہ کہتا ہے کہ پاکستان کی مخالفت میں شور مچاؤ تا کہ مسلمان ضد میں آکر اور زیادہ شدت سے اس مطالبہ پر اڑ جائیں، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہندو مسلم اختلاف کی گتھی سلجھے تا کہ ہندوستان کی آزادی کی راہ میں جو رکاوٹ آگئی ہے وہ ختم ہو،

تحریکِ پاکستان کا پسِ منظر

باایں ہمہ این و آں ہر ایک تحریک کے متعلق بنیادی چیز یہ ہے کہ اس کے محرک اور اس کے سرچشمہ کو دیکھا جائے کہ اس کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کیوں شروع ہوتا ہے؟ تحقیق طلب یہ ہے کہ یہ تحریک خود مسلمانوں کے جذبات و رجحانات کی ایجاد ہے یا اس کا سرچشمہ کوئی سیاسی الہام ہے؟ جیسا کہ جداگانہ انتخاب کی تحریک کے آغاز میں ایک سیاسی الہام نے جو شملہ کی چوٹیوں سے ہوا تھا مخصوص اور خودساختہ رہنمایانِ قوم کو شملہ ڈیپوٹیشن پر آمادہ کر دیا تھا جس کے متعلق علامہ شبلی مرحوم نے فرمایا تھا کہ یہ عجیب و غریب تماشہ تھا جو سیاسی اسٹیج پر کھیلا گیا،

ہم ذیل میں اخبار مدینہ کا ایک شذرہ نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا الہام بھی مخصوص سیاسی مدعیانِ قیادت کسی معراجِ جسمانی کا نتیجہ ہے جو عرشِ معلّٰی کی جانب سے نہیں بلکہ شملہ یا لندن کی جانب ہوئی تھی،

مدینہ بجنور اپنی اشاعت مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۳۱ء نمبر ۵۹ جلد ۲۰ کے صفحہ ۴ پر تحریر کرتا ہے:

"گذشتہ اخبار میں ہم نے یہ خبر لکھی تھی کہ ہز ہائنس سر آغا خان ایک کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے بدیشی پارچہ کو فروغ دینے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کرنے والے ہیں، اخبار الامان سے اب معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف ہز ہائنس آغا خان نے بلکہ ملا سیف الدین طاہر بوہرہ قوم کے مقتدیٰ اور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اکثر ممبروں نے دس کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے ایک کمپنی قائم کی ہے جس کا صدر دفتر دہلی ہوگا، اس کمپنی کے قیام کا اصل محرک کون ہے اور اس کے اصلی مقاصد کیا ہیں؟ اس کے صحیح حالات اب تک صیغۂ راز میں ہیں، تاہم اس کے قیام پر اُس خط سے کسی قدر روشنی پڑتی ہے جو مسٹر بلوڈن جج ممالک متحدہ نے کسی مستفسر کے جواب میں لندن بھیجا تھا، اور اتفاقاً سنڈے گرافک کے ہاتھ پڑ جانے سے شائع ہو گیا، اور اسی غرض سے ہم اس خط کا متن ذیل میں درج کرتے ہیں":

"مدت سے ہندوستان کی صورتِ حالات قابو سے باہر ہو رہی ہے، ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں، جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی، برطانوی افسر زیادہ عرصہ تک نہیں رہیں گے سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیئے گئے ہیں یا بھرے جا رہے ہیں کہ آئندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈھے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے گا، میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلہ کا ایک حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے، آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی

کرنا پڑا تھا، ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے، اب ہمیں مالیہ معاف کر دینا پڑا ہے، تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں، یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورت حالات ہے، اور اس کا ایک ہی علاج ہے، کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روکا جائے، اور اسے قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیئے جائیں، اگر ہندو کاروبار تجارت نہیں کریں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر تجارتی بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزید ۲۵ یا ۳۰ سال کے لیے ہندوستان پر ہمارا اثر و اقتدار قائم رہے، اب برطانوی حکومت کے پرانے طریق کار کی طرف عود کرنا ناممکن ہے، ہمارے پاس اب کارکن اصحاب موجود نہیں ہیں، اب ہم دَورِ ماضی کو قائم نہیں کر سکتے،

نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا ہے، کیونکہ ہندوستان میں ریلیں اور نہریں وغیرہ قائم کی جا رہی ہیں، اب اسے ایسا طرزِ حکومت دیدو جو اس کے لیے موزوں اور قدرتی ہو، لیکن جب تک ہندوستان میں ہمارا اثر و اقتدار قائم ہے ہمیں تحریکِ مقاطعہ کو پورے زور سے روکنا چاہیے خوں ریزی کو روکنے اور دقیانوسی ہندو سسٹم کا سدِ باب کرنے کے لیے ہمیں کراچی اور دہلی سے کام شروع کرنا چاہیے، جہاں دنیا کی ایک بڑی مسلم طاقت قائم ہوگی، ہم خواہ کچھ کریں یہ ہو کر رہے گا، پھر کیا وجہ ہو کہ ہم اسے جلد از جلد معرضِ عمل میں نہ لائیں، اور اس کے ساتھ سب سے پہلے تاجرانہ تعلقات کیوں نہ قائم کریں، جب بحرِ قزوین اور بحیرۂ روم کی طرف وسیع ملکوں کا خیال جائے تو بڑے بڑے امکانات نظر آتے ہیں،

صحیح طریقۂ کار

آخر میں بصد عجز والحاح پاکستانی اور لیگی حضرات کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ صحیح طریقۂ کار وہ نہیں ہے جو مسلم لیگ کے قائدِ اعظم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ مسلم مفاد کے لیے سب سے بہتر طریقِ کار یہ ہے کہ تمام مسلم جماعتیں پارٹی بازی یا جماعتی برتری کے غیر اسلامی تصور سے بالاتر ہو کر ایک جگہ بیٹھیں، اور پھر دیانت و سنجیدگی کے ساتھ تمام پیش کردہ مسلم اسکیموں پر غور کریں، تاکہ سب مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو کر متفقہ طور سے ایک مسلم مطالبہ حکومت اور کانگریس کے سامنے پیش کر سکیں، اور کسی جماعت اور کسی پارٹی کو اس سے اختلاف نہ ہو ——— چونکہ جمعیۃ علماء ہند بار بار اس اقدام کے لیے مسلم لیگ کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دے چکی ہے، اس لیے اب مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے کا اعلان کرے، ورنہ تو ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ حالت کا نتیجہ محض یہ ہے کہ صرف حکومت اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور خدا جانے کب تک اٹھاتی رہے گی، وہ کبھی پاکستانی حضرات کو طفل تسلی دیتی رہے گی اور کبھی کانگریسیوں کو سراہنے لگے گی،

اگر میری اس گذارش کو نیک خواہی پر محمول کر کے اس صحیح طریقۂ کار کو اختیار کر لیا جائے تو اگرچہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نوآبادیات) سے زیادہ نہ ملے مگر اس کے بعد وہ وقت بھی جلد ہی آجائے گا جب تھوڑی سی جدوجہد سے ہمارا یہ ملک آزادیٔ کامل کی منزل تک بھی پہنچ جائے گا و اللّٰہ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ؁

ضمیمہ نمبر:۱

جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ

پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہی

ہم ذیل میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء کا فیصلہ اور اس کے بعد کی اضافہ کردہ تشریح درج کرتے ہیں، تاکہ ہر انصاف پسند طالبِ حق یہ فیصلہ کر سکے کہ جمعیۃ علماء ہند صرف نفی کے پہلو پر عامل نہیں، بلکہ پاکستان کے مقابلہ پر ایک ایسا حل بھی پیش کرتی ہے جس سے مسلمانوں کو وہ تمام فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو تحریکِ پاکستان کے حامی پیش کرتے ہیں، مزید براں پورے ہندوستان میں ان کی قوت اور ان کا رسوخ باقی رہتا ہے، ذیل میں فیصلہ ملاحظہ فرمائیے:

"جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاسِ عام اس جمود و تعطّل کی حالت کو ملک و قوم کے لیے نہایت مضر اور ملّی حیات و ترقی کے لیے مہلک سمجھتا ہے وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام معتدلہ جماعتیں اور عام پبلک حصولِ آزادی کے لیے بے چین و مضطرب ہیں، اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز کر رہے ہیں اور شائع کر رہے ہیں، مجلسِ عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء کی تجویز میں ظاہر کر چکی ہے، آج پھر اس کی تجدید کرتی ہے، اور اس کے آخری حصہ کی رفعِ اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کر دینی مناسب سمجھتی ہے،

یہ بات بدیہی اور مسلمات میں سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے، اور ہندوستانی کسی متفقہ مطالبہ کی تشکیل اور متحدہ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائیں گے اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائے گی، جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ حسبِ ذیل نکات پر اتفاق کرلیں، اور اسی بنیاد پر حکومتِ برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کردیں،

(الف): ہمارا نصب العین آزادیِ کامل ہے،

(ب):۔ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی، وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو،

(ج): ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں، غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے، اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے، اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہوگا،

(د): ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی، یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی

کی طرف سے مطمئن ہوں،

تشریح؛ اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اوران کا مقصد واضح کرکے کہ جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بیشک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں مجموعۂ ہندوستان خصوصًا مسلمانوں کے لیے یہی مفید ہے، مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حقِ خود ارادیت تسلیم کرلیا جائے، اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدّی نہ کرسکے، مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدّی کا خوف نہ رہے، باہمی افہام وتفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم وغیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہوجائے ممکن ہے؛

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو:-

ہندو ۴۵ مسلم ۴۵ دیگر اقلیتیں ۱۰

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخالفانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہوسکے گی،

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم وغیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم وغیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے، یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا،

نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا،

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں،

نوٹ (۱) مندرجہ بالا تجویز الف سے بشمول د تک اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس ہو چکی تھی، اس پر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری (و یکم و دوم فروری) ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا، اس کے بعد یہ پوری تجویز مع تشریح جمعیۃ علماء ہند کے چودھویں اجلاس عام بمقام سہارنپور منعقدہ ۴، ۵، ۶، ۷ مئی میں منظور کی گئی،

نوٹ (۲) اس تجویز کے ساتھ اگر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سہارنپور منعقدہ ۳ اگست ۱۹۳۱ء کے فارمولا کی مندرجہ ذیل دفعات بھی پیش نظر رہیں تو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نقشہ ہر مسلمان کے سامنے آسکتا ہے، اور وہ بآسانی یقین کرسکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی تائید و حمایت سے نہ صرف یہ کہ پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ کر رہ جائے بلکہ پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا ہے جس میں شرعی محکمے اور دار القضاء قائم ہوں، اور پرسنل لاء (شرعی احکام) کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعہ سے پورے ہندوستان میں نافذ ہو،

ضمیمہ نمبر:۲

مجلس عاملہ اجلاس سہارنپور کے منظور کردہ فارمولا کی چند دفعات

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے، حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی،

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہو گی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی، اور پرسنل لاء کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار، بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین ومفقود، نفقہ، زوجیت، حضانت، ولایت نکاح و بال، وصیت، وقف، وراثت، تکفین وتدفین، قربانی وغیرہ

(۳) مسلمانوں کے لیے ایسے مقدمات فیصلہ کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا، اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے،

خادم ملت

محمد حفظ الرحمن کان اللہ لہ

ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند

(دھلی)

مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا

پاکستان کے ایک تاریخی منصوبے پر ایک معروضی تبصرہ

ازقلم

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ

حرفے چند

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نایب امیر شریعت صوبہ بہار و سابق ناظم اعلا مرکزیہ جمعیت علماے ہند کا یہ مقالہ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور (مارچ ۱۹۴۰ء) کے فوراً بعد لکھا گیا تھا اور پہلی بار امارتِ شرعیہ صوبہ بہار کے ترجمان میں شایع ہوا۔ یہ ایک معلومات افزا، فکرانگیز، بصیرت افروز، تنقیدی و تجزیاتی مقالہ تھا۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر تیسری بار اسے ۱۹۴۶ء کے آغاز میں شایع کیا گیا۔

اس کی تیسری اشاعت کا عنوان ''پاکستان کی چیستان'' تھا جب کہ اس سے پہلے نقیب میں یہ مقالہ ''مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا پر ایک اہم تبصرہ'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملک کی تقسیم کی اسکیم پر ایک عملی تبصرہ اور مدبرانہ اظہار راے ہے۔ اب یہ مقالہ چوں کہ ہندوستان کی سیاسیات کے مطالعے کی ایک تاریخی دستاویز کے طور پر شایع کیا جارہا ہے اور جمعیت علماے ہند کے سیاسی نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا پہلا نام ہی زیادہ موزوں معلوم ہوا اور اسی نام سے شایع کیا جارہا ہے۔

ابوسلمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں دو ڈھائی سال کے غور و فکر کے بعد ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کا آخری حل اپنے نقطۂ نگاہ سے پیش کر دیا، اور جس کے متعلق مسٹر جناح صاحب کا اعلان ہے کہ اب وہی ان کی لیگ کا نصب العین ہے، اور ہندو مسلم اختلافات کا صرف یہی ایک حل ہے،

میں ابھی مسٹر جناح کے اس نصب العین اور تجویز کے متعلق تنقید اور اظہار خیال کو غیر ضروری سمجھتا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح اس نصب العین کی پوری تفصیلی اسکیم حسب ہدایت مسلم لیگ جب شائع کر دیں تو اس وقت اس اسکیم پر تنقید اور جرح اور اس کے نفع و نقصان کے ظاہر کرنے کا بہترین موقع ہوگا، لیکن جب اس اسکیم پر ہر چہار طرف سے جرح و تنقید شروع ہو گئیں تو مجھ سے بھی مسلم احباب نے اظہارِ خیال کی باصرار خواہش کی کہ لیگ کے مجوزہ نصب العین یا اسکیم کے متعلق میں اپنی رائے ظاہر کر دوں، تا کہ ہندو اور مسلمانوں میں غور و فکر کرنے والے اصحاب کے سامنے میرا نقطۂ نگاہ بھی سامنے آجائے،

لاہور سے پہلے

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ دو ڈھائی

سال سے کانگریس اور ہندو اکثریت کی اصلی یا فرضی مظالم پر ماتم کر رہی ہے، اور اس کے علاج کی کوئی تجویز آج تک پیش نہیں کر سکی تھی، حالانکہ ان سے کانگریسی لیڈروں نے بار بار پوچھا کہ آخر لیگ چاہتی کیا ہے؟ یوپی، سی پی، بہار میں جو شکایتیں مسلم لیگ کو تھیں اگران کو کلیۃً صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو وہ ان صوبوں کے مسلمانوں کی فرحت بخش زندگی کے لیے کن اصولوں کے وضع و اختیار کو پسند کرتی ہے؟ مگر لیگ کوئی ایک بات مسلم اقلیت والے صوبوں یا یوں کہیے کہ ہندو اکثریت والے صوبوں کی بابت لاہور کے اجلاس تک نہیں بتا سکی،

میں بہت خوش ہوں اور مسٹر جناح کا شکر گذار ہوں کہ لیگ نے اپنے اجلاس میں دو ڈھال سال کے سوچ بچار کے بعد ایک بات تو کہہ دی جو مسٹر جناح کے خیال کے مطابق ایک آخری حل ہے،

لاہور کے بعد

اب مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو خصوصیت سے غور و فکر کا موقع مل گیا ہے کہ وہ لیگ کی مجوزہ اسکیم پر مسٹر جناح اور لیگ کے دیگر لیڈروں کے توضیحی بیانات کی روشنی میں غور کریں کہ دو ڈھائی سال سے جن امور پر ماتم کیا جارہا تھا کیا اس اسکیم میں اس کے انسداد و اصلاح کا کوئی امکان بھی موجود ہے؟

ہر معمولی سمجھ کا انسان لیگ کی مجوزہ اسکیم اور مسٹر جناح کے توضیحی اعلان کو سامنے رکھ کر صاف طور سے دیکھ سکتا ہے کہ اس اسکیم میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مزید تسکین کا کوئی ایسا ذریعہ تجویز نہیں کیا گیا ہے جو اُن کے لیے قابلِ اطمینان ہو،

اسکیم کا تعلق،

بلکہ مسلم لیگ کی اسکیم کو جو کچھ تعلق ہے وہ مسلم اکثریت کے صوبوں سے ہے، اور یہ معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں ان صوبوں کے مسلمانوں کے متعلق کوئی شکایت بھی نہیں کی، گویا موجودہ ناقص صوبجاتی خود مختاری اور مرکزی وحدانی حکومت کے ماتحت بھی مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ مسلم لیگ کے نزدیک پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحد کے مسلمان بھی موجودہ ناقص دستورِ حکومت کے عمل درآمد میں کچھ بھی مظلوم ہوتے تو لیگ واحد نمائندگی کی بنا پر کچھ نہ کچھ ضرور شکایت کرتی، مگر عدمِ شکایت کے باوجود مسٹر جناح جو اسکیم تجویز کرتے ہیں اس کا مفاد یہ بتاتے ہیں کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے مسلمان ہندو اکثریت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، مگر یہ نہیں فرماتے کہ اس اسکیم کے ماتحت برطانیہ کی غلامی سے بھی آزاد ہوں گے،

مسلم اقلیت کے حقوق کی ضمانت

باقی رہے مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمان جن کو وہ صرف دو کروڑ فرماتے ہیں (حالانکہ وہ تقریباً تین کروڑ ہیں) اُن کو ہندو اکثریت کی غلامی پر رضامند ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ جو بات کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کی مجموعی طاقت اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی ضمانت ہو گی،

دو فرضی نظریے

اور اس ضمانت کی عملی شکل صرف دو نظریوں پر مبنی ہے،
اول یہ کہ مسلم اقلیت پر جب ہندو اکثریت ظلم کرے گی تو مسلم اکثریت والے صوبوں میں وہاں کے ہندوؤں سے ان کا بدلہ لینا ممکن ہوگا، اور اسی بدلہ کے خوف سے ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر ظلم نہیں کرے گی،
مگر یہ نظریہ محض خیالی اور وہمی ہے، جس کا وجود کبھی نہیں ہوگا، ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی حکومت اپنی پُر امن اور وفادار رعایا پر محض اس لیے ظلم نہیں کر سکتی ہے کہ دوسری حکومت میں اس کے ہم مذہبوں پر ظلم ہو رہا ہے، اس اس دنیا کے موجودہ عہد میں ایسا خیال صرف کوئی احمق و مجنون ہی کر سکتا ہے،

نظریۂ اول کی بے مائگی؛

دنیا جانتی ہے کہ ترکوں نے ترکی عیسائیوں پر آج تک محض اس لیے کبھی ظلم نہیں کیا کہ برطانوی حکومت یا دوسری عیسائی حکومتیں اپنی حکومت میں مسلمانوں پر ظلم کرتی رہی ہیں، اس کے علاوہ اسلامی احکام کی رُو سے مسلم حکمران مجبور ہیں کہ اپنے محکوم غیر مسلموں سے ہمیشہ بہتر سلوک کریں، جب تک وہ وفادار ہیں، اور شرعاً یہ امر کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو وہ اس کا انتقام اپنی ان محکوم اور اُن وفادار غیر مسلموں سے لیں جو مسلمانوں پر ظلم کرنے میں کسی طرح شریک نہیں تھے،
دوسرا فرضی نظریہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے اپنی مجموعی طاقت سے ہندو اکثریت والے صوبوں پر یلغار کر دیں گے، اگر اِن صوبوں کے مسلمانوں پر ظلم ہوگا، یا ان کے مجوزہ مفاد کو کوئی نقصان پہنچے گا، اور اس فرضی حملہ کے خوف

سے مسلم اقلیت کی حفاظت ہو جائے گی،

میں یقین اور بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں اس دنیا کے موجودہ ماحول میں یہ فرضی نظریہ بھی کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا، کیا مسلمانانِ ہند ناواقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوئی ہیں؟ مگر مسلمانوں کی آزاد طاقتور حکومتوں خاص کر خلافتِ اسلامیہ نے اس ظلم سے بچانے کے لیے کبھی ہندوستان پر حملہ نہیں کیا، حملہ تو بڑی چیز ہے کبھی انھوں نے اس کے متعلق کوئی نوٹس بھی نہیں دیا، دور کیوں جائیے ابھی ابھی کے تازہ واقعات ہیں البانیہ کی اسلامی ریاست پر جابرانہ قبضہ کر لیا گیا، مگر تمام آزاد اور نیم آزاد اسلامی حکومتیں تماشہ دیکھتی رہیں، کسی نے کوئی حرکت تک نہیں کی، مسلمانانِ فلسطین نے اپنی داستانِ غم تمام دنیا کے مسلمانوں کو بار بار سنائی، اسلامی حکومتوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا، جہاد بالسیف کے لیے اعلان کیا، مگر دنیا جانتی ہے کہ لفظی ہمدردی جس طرح ہندوستان کے محکوم مسلمان کرتے رہتے ہیں اسی طرح آزاد مسلم حکمرانوں نے بھی کی، اور اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں کیا، کیا ان واقعات کے بعد بھی کسی شخص کو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ اس فرضی نظریہ کا کبھی وجود بھی ہوگا؟

مسلم اسٹیٹ کے اجزاءِ ترکیبی اور اس کی طاقت

ان کے علاوہ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ مسٹر جناح کی اسکیم کے ماتحت ان کے مفروضہ مسلم اسٹیٹ کے باشندے صرف مسلم ہی نہیں ہوں گے بلکہ غیر مسلم بھی ہوں گے، جیسا کہ مسٹر جناح نے اپنے بیان میں خود اس کا اعتراف کیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ غیر مسلم باشندے بھی

حکومت کے شریک کار ہوں گے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قسم کا مشترک سٹیٹ
جس کو مسٹر جناح غلط طور پر مسلم ریاست کہہ رہے ہیں دوسرے مشترک اسٹیٹ
پر جس کو مسٹر جناح ہندو اسٹیٹ کہتے ہیں حملہ کر دے، یا اپنے ہی اسٹیٹ کے اندر
بے قصور ہندوؤں سے کوئی انتقام لے، الغرض اس قسم کے وہمی تصورات
اس دنیا میں مجنون یا بد ترین احمق کے سوا کوئی نہیں کر سکتا،

میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح ان حقائق سے ناواقف نہیں ہیں، اور وہ
یقین کرتے ہیں کہ ان کی مجوزہ اسکیم کے ماتحت بھی اگر وہ بروئے کار آئے تو بھی
ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی کوئی
ضمانت بعض مسلم ریاستوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی ہے،

مسلم اقلیت کے حقوق سے دست برداری

اسی لیے وہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلم اقلیت والے صوبوں کے دو کروڑ
مسلمانوں کو مسلم اکثریت والے صوبوں کے چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی میں
رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہیے، دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے
کہ دو کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی غلامی پر قناعت کر کے چھ کروڑ
مسلمانوں کو ان کے مفروضہ اسٹیٹ کے قیام کا موقع دینا چاہیے، چاہے ان
دو کروڑ مسلمانوں کو اپنے مذہب، تمدن، معاشرت، جان و مال کو خواہ کسی قدر
خطرات پیش آئیں، خواہ وہ تباہ ہو جائیں، مگر چونکہ چھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد
دو کروڑ کی تعداد سے زیادہ ہے اس لیے مسلم اقلیت کی مذہبی، جانی، مالی،
قربانی مسلم اکثریت کے لیے عقلاً و شرعاً جائز ہے،

مسٹر جناح سے ایک سوال

بلاشبہہ یہ نظریہ اور دلیل صحیح ہے، مگر کیا اس صورت میں دو کروڑ مسلمان
مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتے ہیں؟ کہ جب یہ
بات ٹھہری تو آخر دو ڈھائی سال تک ہم دو کروڑ مسلمانوں کی مظلومیت کا کیوں
ماتم کیا گیا؟ اور ہم غریبوں کے لاکھوں روپیہ جلسوں اور جلوسوں پر برباد کیا گیا،

لیگ کی جدید اسکیم کی تاریخ؛

کیونکہ ان کی یہ اختیار کردہ اسکیم کچھ آج کی پیداوار نہیں ہے، سب سے پہلے
سنہ ۲۲ء میں جبکہ کانگریس، جمعیۃ العلماء، خلافت کانفرنس کے اجلاس گیا میں
ہو رہے تھے، بیرونِ ہند سے یہ اسکیم آئی تھی جس کو خود مسلمان لیڈروں نے ناقابلِ
التفات سمجھا، پھر سنہ ۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس اسکیم کو اپنا کر مسلم لیگ
کے پلیٹ فارم سے آواز بلند کی، بھائی پرمانند بھی جیل سے رہائی کے وقت
اس اسکیم کو ساتھ لائے، خدا جانے اپنی فکر سے لائے یا کسی اور نے دی تھی، مگر جب
لندن میں گول میز ہوئی تو ہندو مسلم حل کے لیے یہ اسکیم نہ مسٹر جناح کو یاد آئی
اور ڈاکٹر اقبال مرحوم اور دیگر مسلم لیگی اور مسلم کانفرنسی لیڈروں کو، جو گول میز
کانفرنس میں شریک ہوتے رہے، حالانکہ اس اسکیم کے پیش کرنے کا بہترین موقع
وہی تھا، اگر یہ اسکیم مسلم لیگ کے نزدیک اہلِ ملک اور مسلمانوں کے لیے تسلی بخش
تھی تو عین اُس وقت کیوں خاموش رہے، اور وہاں یورپین طرز کی مشترکہ جمہوری
حکومت اور ۱۴ نکات پر زور دیتے رہے،

عُذرِ لنگ؛

کہا جاتا ہے کہ اُس وقت تک ہندوؤں پر مسٹر جناح کے ہم خیالوں کو اعتماد

دبھروسہ تھا، اس لیے اس اسکیم کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی، مگر ہر شخص
جانتا ہے کہ اعتماد و بھروسہ تو اس وقت بھی نہیں تھا، اس وقت بھی دستوری
جنگ جاری تھی، اور فرقہ وارانہ فسادات ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک بہت
زیادہ پورے ملک میں ہو چکے تھے، ان فسادات اور مظالم سے کہیں سخت اور
زیادہ ہوئے تھے جو ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ہوئے، ان حالات میں یہ کہنا کہ
ہندوؤں پر اعتماد و بھروسہ تھا اس لیے یہ اسکیم بھول گئے کوئی احمق ہی تسلیم کر سکتا ہے۔
پھر جب مسٹر جناح کے خیال میں ہندو مسلم مسئلہ کا بہترین واحد حل یہی ہے
تو اعتماد اور بھروسہ کی صورت میں تو اس اسکیم کے منوانے کا بہترین وقت وہی تھا،
کیونکہ وہ تو صرف اپنے لاجواب زبانی دلائل ہی کی قوت سے اس اسکیم کے منوانے
کے متمنی ہیں، اس لیے لندن گول میز کانفرنس میں اس کا بہترین وقت تھا، مگر
جب اس وقت یہ اسکیم مسٹر جناح اور کسی لیڈر نے عین موقع پر پیش نہیں کی تو
کیا اس سے کسی شخص کا یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ یہ اسکیم خود ان کے نزدیک بھی
ناقابلِ عمل اور قطعاً غیر مفید ہے ؟ اس لیے وہاں پیش نہیں کی، شاید یہ کہا جائے
کہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت چوک ہو گئی، اور بلاشبہ
مسٹر جناح اور ان کے تمام لیگی لیڈروں سے اس وقت سخت غلطی ہو گئی۔ ہم
تین کروڑ مسلمان ان کی اس عظیم الشان غلطی کو معاف کرتے ہوئے پھر یہ دریافت
کرتے ہیں کہ اچھا اس وقت غلطی ہوئی، مگر یہ تو فرمائیے کہ لاہور کے اجلاس سے
تقریباً ۱۸ ماہ پہلے سندھ کے پراونشل اجلاس میں اصولاً یہی اسکیم منظور ہو چکی تھی
اس اٹھارہ ماہ کی طویل مدت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے بیسیوں
اجلاس ہوئے، کونسل کے بہت اجلاس ہوئے، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے عام
اجلاس بھی ہوئے، مگر ان اجلاسوں میں ہمیشہ مسلم اقلیت کا رونا تو بہت رویا گیا،

مگر نہ یہ اسکیم منظور ہوئی اور نہ اس کا خاکہ تیار ہوا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اور اسی کے ساتھ یہ امر بھی جب سامنے رکھا جائے کہ مسلم لیگ کی ایک دستوری کمیٹی بھی پندرہ ماہ سے بنی ہوئی ہے مگر اس نے آج تک کوئی دستوری خاکہ نہیں بنایا تو معاملہ اور بھی نہایت ہو جاتا ہے، اور تین کروڑ مسلمان جو کہ اقلیت کے حلقوں میں رہتے ہیں، صرف وہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے سمجھدار مسلمان اس یقین پر مجبور ہوں گے کہ مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ اپنی مجوزہ اسکیم پر خود کوئی اعتماد نہیں رکھتے، اگر انھیں اس پر اعتماد ہوتا تو اس پندرہ ماہ کے طویل عرصہ میں اپنی اسکیم کے ماتحت دستورِ ہند کا مفصل خاکہ تیار کر کے لاہور کے اجلاس میں پیش کرتے اور منظور کر کے شائع کر دیتے،

کیونکہ مسٹر جناح اور ان کے رفقاءِ کار کے متعلق یہ تو خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کوئی دستور بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے اور باوجود اہلیت اور کافی وقت اور مدت ملنے کے نہ بنا سکے، تو اس کی توجیہہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ انھیں خود اس اسکیم پر کوئی اعتماد نہیں ہے، اور وہ خود اس کو ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں،

لیگ کی جدید اسکیم کا پس منظر

مگر چونکہ لیگ کی نئی زندگی صرف کانگریسی حکومتوں کے اصلی یا فرضی مظالم کی داستان پر مبنی تھی اور انہی مظالم کو بار بار بیان کر کے لیگ کے جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوشش جاری تھی، حُسنِ اتفاق سے یورپین جنگ کے بعد مکمل آزادی کے سوال پر کانگریسی حکومتیں از خود مستعفی ہو گئیں تو عوام مسلمانوں کو کانگریسی مظالم سے نفرت دلا کر لیگ کی طرف مائل کرنے کا بہانہ ہی

ختم ہو گیا اور عوام الناس کے جذبات کو مشتعل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو مسلم لیگ کے لیے سرِدست کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کا پُرفریب لفظ بول کر نا سمجھ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر کے لیگ کے جھنڈے کو گرنے سے بچایا جائے،

کیونکہ غریب جاہل مسلمان جو برطانوی حکومت میں بالکل مفلس ہو گیا اور خود دانہ دانہ کا محتاج ہے، وہ بھی یہ تصور کر کے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے ایک بڑے رقبہ میں اسلامی راج قائم کر رہی ہے، جس کے ذریعہ مذہب کی حفاظت ہو گی، اپنی تمام جسمانی و روحانی تکلیفوں کو بھول کر مسلم لیگ کے جھنڈے کے جمع رہے گا، تا آنکہ اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخابات کا زمانہ آئے تو اسلامی حکومت کی اقامت کے نظریہ پر الیکشن میں کامیابی ہو، اور اسی تخیل پر عوام کو لیگ کے جھنڈے میں پھنسائے رکھا جائے، اور اسی ترکیب سے عرصۂ دراز تک غریبوں کو گمراہ رکھا جا سکتا ہے،

ایک ضروری تنبیہ

لیگ کے ہائی کمانڈ کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ ترکیب اور پالیسی بھی زیادہ دنوں تک کام نہیں دے گی، اور ایک دن اس تدبیر باطل کا پردہ چاک ہو کر رہے گا، بہر حال اگر لیگ کے ہائی کمانڈ اس اسکیم پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ تو تین کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کا یہ مذکور الصدر سوال بدستور قائم ہے کہ آخر ہمارا ماتم کیوں ختم کیا گیا، ہم پر تو آج بھی مظالم اسی طرح ہو رہے ہیں جس طرح کانگریسی حکومتوں کے زمانہ میں تھے، فسادات بھی ہو رہے ہیں، مسلمان شہید اور زخمی بھی ہو رہے ہیں، قربانیِ گاؤ پر پابندیاں بھی عائد ہوتی رہتی ہیں،

اب ہم پر کیوں رحم نہیں کیا جاتا اور پہلے کیوں کیا جاتا تھا؟ بلکہ اب ہم سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے چھ کروڑ بھائیوں کے لیے اپنے کو قربان کر دو، یہ بات تو پہلے بھی کہی جا سکتی تھی، ڈھائی سال تک ہمیں خواہ مخواہ کیوں پریشان کیا گیا؟

مسٹر جناح سے دوسرا سوال؛

اسی کے ساتھ یہ تین کروڑ مسلمان لیگ کے ہائی کمانڈ سے یہ بھی سوال کر سکتے ہیں کہ جب چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کے مقصد سے دو کروڑ مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی جا سکتی ہے تو اسلامی ممالک کے تقریباً ۲۰۔۲۵ کروڑ مسلمانوں کی کامل آزادی اور برطانوی شہنشاہیت کی ہوسِ جہانگیری سے نجات دلانے کے لیے پورے آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہندو اکثریت کی غلامی کیوں نہیں گوارا کی جا سکتی؟

عقلی اور شرعی نقطۂ نظر سے اس صورت میں اور مسٹر جناح کی تجویز کردہ صورت میں کیا فرق ہے، اس کو واضح کریں؟ اس وقت لیگ اور مسٹر جناح سے مسلم اقلیت والے صوبوں کے تین کروڑ مسلمان اس سوال کا جواب دریافت کرنے میں اس لیے حق بجانب ہیں کہ تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے کے لیے ہمیشہ یہی دلیل بیان کرتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے، اور ان کی اس دلیل کا جواب آزادی پسند اور سرفروش جماعتوں اور افراد کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ ہم اولاً اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہم ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہوگا جب بھی ہندوستان کی آزادی سے اسلامی ممالک کے ۲۰۔۲۵ کروڑ مسلمان تو برطانوی شہنشاہیت کے تسلط سے ہمیشہ

کے لیے آزاد ہو جائیں گے،

مگر اس جواب سے مسٹر جناح کی ٹائپ کے لوگ جو اس وقت لیگ کے رہنما ہیں کبھی مطمئن نہیں ہوئے، اور اسی وجہ سے یہ لوگ تحریکِ آزادی کے مخالف رہے اور علیحدہ رہے،

مکمل آزادی اور فرقہ وارانہ مسائل

پس آج اگر بنیس برس کے بعد مسٹر جناح اور ان کے ہمخیالوں کو آزادی پسند مسلمانوں کی دلیل کی سچائی پر یقین ہو گیا ہے تو پھر وہ کیوں تحریکِ آزادی میں بلا چون وچرا حصہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اور کیوں کانگریس اور ہندوؤں سے صدق دل سے نہیں کہتے کہ ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد شروع کرو، ہم ساتھ ہیں، یا یہ کہیں کہ ہم شروع کرتے ہیں تم ساتھ دو، اور خواہ مخواہ کے لیے کیوں وہ فرقہ وارانہ مسائل کے عدمِ انفصال کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں، اگر برطانوی حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہو سکتا ہے مگر مسٹر جناح جیسے لوگوں کے لیے تو اب خود ان کی دلیل کی روشنی میں فرقہ وارانہ مسائل کے عدمِ انفصال کو رکاوٹ قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی،

بہرحال مسلم اقلیت والے مسلمانوں کو جن کی تعداد بقول مسٹر جناح دو کروڑ ہے یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ڈھائی سال سے جن کے لیے مسلم لیگ ماتم کر رہی تھی اب لیگ انھیں ہمیشہ کے لیے فراموش کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی ہے، بشرطیکہ ان کی مجوزہ اسکیم بروئے کار آئے، اور ان سوالوں کا مسٹر جناح یا ان کے ہمخیال تشفی بخش جواب نہیں دے سکے جس کی طرف اس مضمون میں اشارات کیے گئے ہیں، اور سمجھدار لوگوں کے لیے لیگ کی مجوزہ اسکیم میں دل خوش کن الفاظ کے سوا

کوئی معنی نہیں ہیں،

تاہم اس اسکیم کی لغویت کو سمجھنے اور اسلامی ضرر رسانی کا یقین کرنے کے لیے حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہیے؛

مُسلم اسٹیٹ کے پُرفریب لفظ کی حقیقت

۱۔ اگر ہندوستان کے ان حصّوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں غیر مسلموں کی بھی آبادی رکھی گئی ہے اور ان غیر مسلم آبادیوں کو بھی وہاں کے نظامِ حکومت میں حصّہ دیا گیا، جیساکہ مسٹر جناح کے توضیحی بیان سے ظاہر ہے (خاصکر اس حصّہ سے جہاں انھوں نے سکھوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے) تو اس صورت میں ان منطقوں اور حصّوں کو مسلم انڈیا اور وہاں کی حکومت کو اسلامی حکومت قرار دینا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟

اگر اس قسم کے قطعات کا نام مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت ہے تو وہ آج بھی موجود ہے، اگر ان لفظوں سے اپنے دل کو یا جاہل مسلمانوں کو خوش کرنا ہے تو وہ آج بھی پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحد کو مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت کہہ سکتے ہیں،

ہاں اگر ان کی اسکیم یہ ہو کہ وہ ان حلقوں سے ایک ایک غیر مسلم کو نکال دیں گے یا یہ کہ ان حلقوں میں غیر مسلم باشندوں کو نظامِ حکومت میں کوئی حصہ بھی نہیں دیں گے اور ان کو محکوم محض بن کر رہنے کی اجازت دیں گے تو بلاشبہ وہ ان حلقوں کو مسلم انڈیا اور مسلم اسٹیٹ یا مسلم ریاست کہہ سکتے ہیں، مگر ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایسی صورت نہیں ہوگی، اور نہ لیگ کے ہائی کمانڈ کے دماغ کے کسی گوشہ میں یہ تصور موجود ہے، تو پھر مسلم انڈیا اور مسلم ریاست کے بے معنی الفاظ بول کر غریب

مسلمانوں کو کیوں پریشان کیا جارہا ہے؟

دفاع، کسٹم اور خارجہ پالیسی فیڈریشن کے اختیار میں ہونگے یا اُس کے اجزائے ترکیبی کے؟

۲۔ مسٹر جناح مسلم اکثریت والے صوبوں یا حصّوں کو علیحدہ مستقل خود مختار ریاست تجویز کرتے ہوئے ان سب کا ایک فیڈریشن تجویز کرتے ہیں یعنی ایک مرکزی اسلامی حکومت بھی ان کے خیال میں ہونی چاہیے، اسی طرح ہندو اکثریت کے صوبوں یا حصّوں میں ہندو خود مختار حکومت تسلیم کرتے ہوئے ان کا ایک فیڈریشن اور فیڈرل حکومت تجویز کرتے ہیں،

اسی طرح خود مختار دیسی ریاستوں کا فیڈریشن ہوگا یا ریاستیں اپنی خود مختاری قائم رکھتے ہوئے انہی مذکورالصدر اسلامی فیڈریشن یا ہندو فیڈر میں شریک ہوجائیں گی؟

اسی کے ساتھ جناح صاحب ہر دو یا ہر سہ فیڈریشن کی خود مختار ریاستوں کے لیے دفاع، خارجہ پالیسی اور کسٹم کے حقوق و اختیارات دینا چاہتے ہیں جیساکہ مسلم لیگ کی تجویز کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے، مگر ہر معمولی سمجھ کا آدمی جان سکتا ہے کہ کسی فیڈریشن کے اجزائے ترکیبیہ اور خود مختار ریاستوں کو یہ حقوق براہِ راست نہیں دیئے جاسکتے،

یہ بات تو شاید بالکل جاہل اور احمق بھی سمجھ سکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں فیڈریشن اور فیڈرل حکومت کا کوئی وجود ہی نہیں ہوسکتا ہے، اسی لیے مسلم لیگ کی تجویز کا مطلب صرف یہی لیا جاسکتا ہے کہ مسلم فیڈریشن، ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کی فیڈریشن کے ہاتھ میں دفاع، خارجہ پالیسی،

اور کسٹم کے کامل اختیارات دیے جائیں گے، لیکن ان امور میں ہر دو یا ہر سہ فیڈریشن کے استقلال یا مطلق العنانی کی صورت میں کوئی فیڈریشن خاص کر مسلم فیڈریشن اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا ہے،

فرض کیجیے کہ ہندو فیڈریشن جاپان وچین یا برطانیہ سے اپنے روابط دوستانہ قائم کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے، اور مسلمان فیڈریشن اپنے اندرونی و بیرونی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر افغانستان، ایران، مصر، حجاز، ترکوں کے ساتھ روابط کو ترجیح دیتا ہے، اور برطانیہ کے روابط کو مضر سمجھتا ہے، ایسی صورت میں تمام ہندوستانیوں خاص کر مسلم فیڈریشن والوں کو جن مشکلات کا سامنا ہوگا اس کے تصور سے ہر سمجھدار انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے،

مرکزی فیڈریشن اور اس کی نوعیت

لامحالہ ایک مرکزی فیڈریشن کی صورت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہندو فیڈریشن مسلم فیڈریشن اور دیسی اسٹیٹ فیڈریشن برابر کے شریک ہوں اور اسی کے ہاتھ میں دفاع، خارجہ پالیسی اور کسٹم وغیرہ کے معاملات ہوں تاکہ ہندوستان پر خارجی حملوں کی صورت میں مرکزی فیڈرل حکومت کی رہنمائی میں ہندوستان متحدہ طور پر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکے،

اسی طرح بیرونی حکومت سے تجارتی معاملات وغیرہ تمام ہندوستان کے لیے اسی ایک مرکز سے متعلق ہوں، ورنہ ہندوستان خاص کر مسلم فیڈریشن کے حصے اقتصادی حیثیت سے گھاٹے میں رہیں گے،

جب خود مسلمانوں کے مفاد اور ہندوستان کی ترقی و امن کے لیے ایک اور مرکزی فیڈرل حکومت کی ضرورت ہو جائے گی، تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مسلم

انڈیا پر کس قدر کافی بار بڑھ جائے گا، صوبجاتی خود مختاری کے اخراجات کے علاوہ ایک بارِ عظیم مسلم فیڈرل حکومت پر ہوگا، پھر حصہ رسدی ایک بڑی رقم مرکزی فیڈرل کو ادا کرنی پڑے گی،

اسی کے ساتھ مسلم صوبجات کے حلقوں کی وسعت اور ان کے مالی وسائل پر بھی غور کیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلم حلقوں کو اپنی موجودہ بدحالی کو قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا، چہ جائیکہ تعلیمی، اقتصادی اور تمدنی ترقی کرنا،

اگر کراچی بندر اور خلیج بنگال کا ہندو مسلم حلقوں میں پڑے گا تو بمبئی اور مدراس کے سواحل ہندو حلقوں میں جائیں گے، اس لیے کسی شخص کو یہ دھوکا نہیں ہو سکتا کہ بیرونی تجارت اور کسٹم میں مسلم فیڈریشن کا حصہ زیادہ رہے گا، الغرض اس صورت میں مسلمانوں کی ترقی کا راستہ بہت حد تک مسدود ہو جاتا ہے،

پھر یہ امر قابلِ غور ہے کہ جب بیرونی دفاع اور خارجہ پالیسی و کسٹم کے لیے بہرحال ایک مرکزی فیڈرل حکومت کی ضرورت ہوگی، اور جس حکومت میں ہر فیڈریشن کے نمائندے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شریک ہوں گے، اور جس میں ریاستیں بھی شریک ہوں گی تو اس کا آخری نتیجہ کیا ہوا کہ اس مرکزی فیڈرل حکومت میں قدرتی طور پر اکثریت غیر مسلموں کی ہو جائے گی، جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جاتا ہے، اس ساری دردسری کا نتیجہ کیا نکلے گا کہ مسلم صوبے گھاٹے میں رہیں گے اور ہندو کی اکثریت کا خوف بقول مسٹر جناح بدستور مسلط ہے، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بخشوانے گئے نماز گلے پڑ گیا روزہ، یا یوں کہیے کہ پانی کے قطروں سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو گئے،

مرکزی فیڈریشن اگر نہ ہو!

اگر مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کے فیڈریشن کا

کوئی مرکزی فیڈریشن نہ ہو تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان تمام فیڈریشنوں پر ایک بالادست طاقت مسلط ہو، اور وہ برطانیہ ہوگی، گویا برطانیہ کی غلامی بدستور مسلط رہے گی، اور مسٹر جناح کے بیان میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اور وہ یہ کہ وہ برما اور سیلون سے ہندوستان کے تعلقات کو بیان کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح برطانیہ کی طاقت برما اور سیلون اور ہندوستان کو باہم وابستہ رکھے ہوئے ہے اسی طرح مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن کو بھی وہ وابستہ رکھے گا، گویا مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو برطانیہ کی غلامی بہرحال منظور ہے،

ان حالات میں مسلمانوں کو اچھی طرح سوچنا چاہیے کہ مسٹر جناح انھیں کدھر لیے جا رہے ہیں؟

اصلی چارۂ کار

باقی رہا ہندو مسلم مسئلہ کا حل یا یہ کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی.... ترقی و بہبود اور مذہب و کلچر کی حفاظت کس اصول سے ہو سکتی ہے، تو اس کے لیے مسلمانوں کو جمعیۃ علماء ہند کی تجاویز[1] اور اسکیم پر غور کرنا چاہیے، جن پر کہ بعض اُردو

---

[1] پاکستان کے مقابلہ میں جمعیۃ علماء ہند کا وہ متبادل فیصلہ ....

جو مصنف مقالہ حضرت مولانا سجاد صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں منظور کیا گیا، اس موقع پر غالباً اس فارمولے کی طرف اشارہ ہے جو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۳۱ء میں اجلاس سہارنپور میں منظور کیا تھا،

نہرو کمیٹی پر تنقید کرتے ہوئے بھی جمعیۃ علماء ہند نے ایک فارمولا پیش کیا تھا ممکن ہے اس فارمولے کی طرف اشارہ ہو۔ محمد میاں عفی عنہ

اخبارات میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں، اس وقت صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ پورے ہندوستان میں ایک مرکزی وحدانی (مونیٹری) حکومت جیسا کہ برطانیہ نے قائم کر رکھی ہے جمعیۃ علماء ہند اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی درست نہیں سمجھتی، اور ۱۹۳۵ء والا مجوزہ فیڈریشن بھی درحقیقت وحدانی ہی حکومت ہے، جس کا نام غلط طور پر فیڈرل حکومت رکھا گیا ہے،

موجودہ دورِ جمہوریت میں ہندوستان کے کسی ایک گوشہ میں کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس کو صحیح معنی میں ہندو ریاست یا مسلم ریاست کہا جا سکے، حکومت بہرحال اس عہد میں مشترکہ ہوگی، مسلم اقلیت والے صوبوں میں بھی مسلمان ہندو کے محکوم نہیں ہو سکتے، بلکہ ہر صوبہ کی حکومت میں چاہے وہ مسلم اقلیت کے ہوں یا مسلم اکثریت کے، مسلمانوں کے مخصوص تمدنی و معاشرتی احکام کے نفاذ کے لیے مستقل محکمہ قائم ہوگا، اور کسی مشترکہ جمہوری حکومت کو ان معاملات میں مداخلت کا حق نہ ہوگا، مرکزی فیڈرل حکومت کو صوبجات کے تمام اندرونی معاملات اور مسلمانوں کے مذہبی و کلچرل امور میں یا ان کے مخصوص نظام میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوگا، اس کا تعلق صرف دفاع، خارجہ پالیسی اور کسٹم سے ہوگا،

از نقیب، پٹنہ
۱۴ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

مسلم لیگ کی تحریک پاکستان

اسلام کے نام پر اسلام دشمنی، علما سے انتقام

اور

لیگ کے غلط طرزِ سیاست پر ایک نظر

تالیف

مولوی ابرار احمد صدیقی

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان

کراچی

مبارک لیگیوں کو مائلِ جور و ستم ہونا
طریقِ حق پہ لازم ہے ہمیں ثابت قدم رہنا

مسٹر جناح جو آجکل مسلم لیگ کے مستقل صدر ہیں، اور لیگ کے سرکار پرستوں نے آپ کو "قائد اعظم" کا خطاب عطار فرمایا ہے، اس جماعت میں غریبوں، مزدوروں، کاشتکاروں کے خون سے پل پل کر عیاشیاں کرنے والے راجے، نواب، تعلقدار، زمیندار، سرمایہ دار، ٹھیکیدار، خطاب یافتہ، سر، خان بہادر، خان صاحب اور تمام سرکاری ملازم اور عہدیدار اور کالج اور یونیورسٹیوں کے بے عمل، اور عیش پرست، بے ادب اور غنڈہ قسم کے طالب علم شامل ہیں، جو قرآن مجید کے نظامِ حکومت کو فرسودہ اور ناقابلِ عمل بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس ترقی کے زمانہ میں جس کی روشنی یورپ سے آرہی ہے، اس فرسودہ نظام کو سیاست سے ناواقف مولوی مسلمانوں کے سر تھوپنے کی بیکار کوشش کر رہے ہیں، جو اب ناممکن ہے،

علمائے حق سے دشمنی:

یہ مذہب کے دشمن علمارِ حق کے خلاف اور خصوصاً شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مفتیِ اعظم محمد کفایت اللہ، بیشوائے اعظم مولانا ابوالکلام آزاد، اور مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن وغیرہ جو ہندوستان کے آفتاب اور ماہتاب ہیں وہ وہ ناقابلِ برداشت الزام تراشتے ہیں جس کے سننے سے ایک سچے اور دیندار مسلمان کا خون کھول جاتا ہے۔۔۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مسلم لیگ نے محض مسلمانوں کو بے عمل بنانے، فریب دینے اور کانگریس سے علیحدہ رکھنے کی غرض سے لکھنؤ کے اجلاس منعقدہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

میں فل انڈی پنڈنس (آزادیِ کامل) کی تجویز پاس کی تھی جس پر مسلسل ایک سال تک کوئی عمل نہیں کیا گیا، البتہ جلسوں اور جلوسوں میں سوائے کانگریس اور ہندوؤں کو گالیاں دینے اور علماء پر سبّ و شتم کرنے کے انگریزی حکومت (برطانیہ) کے خلاف ایک لفظ نہیں نکالا، ایک سال کے اس شغل کے بعد لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں فل انڈپینڈنس کو ختم کر کے پاکستان کی تجویز پاس کی گئی جس نے اہلِ ہند کو تعجب اور حیرت میں ڈال دیا، اس روز سے آج کی تاریخ تک وہی مرغ کی ایک ٹانگ (پاکستان) کی رَٹ لگی ہوئی ہے، اور برابر "پاکستان لے کے رہیں گے" کا نعرہ لگا رہے ہیں،

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی تمام قوموں کی متحدہ جماعت ہے، اس نے ہندوستان کو آزاد کرانے کا عزم بالجزم کر لیا ہے، اور اس کے حصول کی خاطر وہ بڑی بڑی قربانیاں دے رہی ہے،

حکومتِ برطانیہ نے اس جماعت کے خلاف کوئی حربہ ایسا نہیں چھوڑا جو استعمال نہیں کیا ہو، ہندوستانی پولیس نے بھی اپنے اختیارِ خصوصی کے استعمال میں کمی نہیں کی، اور بیچارے نہتے عدمِ تشدد کے حامیوں کی اتنی لمبی لمبی لوہے کی شاندار لاٹھیوں سے خوب تواضع کی، اور خوب مار کر لہولہان کر ڈالا، بہت سوں کے ہاتھ پیر توڑ دیے، جیلوں میں ٹھونسا گیا، وہاں بھی خوب مرمت کی گئی، اور جیل کا کوئی قانون ایسا نہ تھا جو ان غریبوں کے خلاف استعمال نہ کیا گیا ہو، لیکن واہ رے کانگریس کے بہادر سپوتو! تم نے اپنے ملک کی آزادی اور اپنی جماعت کی عزت کو بلند کرنے کی خاطر یہ تمام مصیبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں، زندہ باد قوم کے جانباز بہادرو! پائندہ باد اولوالعزم نوجوانوں! "یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتارتی"

حکومتِ برطانیہ جب اپنے تمام حربے استعمال کر کے تھک گئی تو اس نے

فرقہ پرستوں کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کو مختلف بہانوں سے آپس میں لڑا لڑا کر منافرت پھیلانی شروع کی۔

کانگریس کے خلاف پروپیگنڈا:

حکومت کی ہمنوائی میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنے کی غرض سے یہ کہنا شروع کیا کہ کانگریس خالص ہندو جماعت ہے، اس لیے مسلمانوں کا اس کے ساتھ اتفاق و اتحاد رکھنا ناممکن ہے، اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے تلے جمع ہو جانے کی دعوت دینے لگی، لیگ کا مقصد کانگریس کے اس دعوے کی تردید کرنا ہے کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے، یہی حکومت کا عین منشار ہے، یہی وجہ ہے کہ مسٹر جناح بار بار اعلان فرماتے ہیں کہ لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، اور کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس میں کوئی مسلمان شامل نہیں، مسلمان آزادی کامل نہیں چاہتے، کیونکہ وہ ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، اور ان کی اقتصادی حالت بھی خراب ہے، اس لیے وہ برطانیہ کے زیر سایہ رہنا چاہتے ہیں، ہندو کا غلام بننا منظور نہیں،

یہ کس قدر خطرناک ارادہ ہے اور یہ کس قدر قابلِ نفرت فعل ہے مسلم لیگ اور ملوکیت کا، یہ ذلیل ارادہ اور ناپاک منصوبہ پورا نہ ہوگا، اور انشاء اللہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا، ہندوستان کی آزادی کو اب دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، آپ حکومت کے بل بوتے پر واحد نمائندگی کا ڈھول پیٹتے رہیے اور پاکستان کی بین بجائے جائیے،

مسلمان حکومت اور فرقہ پرستوں کی چالوں سے اب خوب واقف ہو گئے ہیں، اور جو ہندو مسلمانوں کو مذہب کے نام پر لڑانے کی ناپاک اور مجرمانہ حرکتیں

کر رہے ہیں ان کی عیارانہ اور شاطرانہ چالوں کو بغور دیکھ رہے ہیں، ہندو مسلمان بیدار ہو چکے ہیں، اور ان فرقہ پرستوں کی چالوں میں آ کر ان کی بات ہرگز ہرگز نہیں مانیں گے، اور نہ اُن کا ساتھ دیں گے، وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ فرقہ پرست ہندو ہوں یا مسلمان ملک کی آزادی کے دشمن ہیں، وہ علمائے حق اور آزاد خیال اور قوم پرور مسلمانوں کی بے لوث قربانیوں کو بھی دیکھ رہے ہیں، اور وہ یقیناً ان مجاہدین اور جاں فروشوں کا ساتھ دیں گے، تاکہ حکومت برطانیہ کی غلامی کی لعنت کے طوق کو ہندوستانیوں کی گردنوں سے نکال کر ان کو آزاد کرائیں،

نیز وہ یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ عالمِ اسلام کی غلامی اس ہندوستان کی غلامی کا سبب ہے اور ہندوستان کی آزادی عالمِ اسلام کی آزادی ہے، جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کا پاکستان ہو سکتا ہے،

مسٹر جناح، علمائے حق کے خلاف محض اس لیے ہیں کہ وہ کانگریس میں ہندوستان کی آزادی کی خاطر شامل ہیں، اور انھوں نے اس جدوجہد میں سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے، جناح صاحب بار بار اعلان فرما چکے ہیں کہ "ہم نے علمار کے وقار کو ختم کر دیا ہے،، چنانچہ کلکتہ کے ایک جلسہ کے موقع پر بڑی مسرت اور شادمانی کے ساتھ سینہ تان کر اور گردن اونچی کر کے گرجدار لہجہ میں ناک کے نتھنے پھلا کر ارشاد فرمایا تھا، "علمار ہمارے شکنجہ میں ہیں، ہم نے ہندوستان میں علمار کرام کو ختم کر دیا ہے،، دل کے خوش کرنے کو صاحب یہ خیال اچھا ہے،

بچشمِ غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ اسپیچیں دیا کرتا ہے اور وہ جان دیتا ہے

جناح صاحب کو یہ خبر نہیں کہ ہندوستان کے سچے مسلمان سوائے اُن نام نہاد مسلمانوں کے جو نام کے مسلمان ہیں اور درپردہ اسلام کی بنیادیں

کھو کھلی کر رہے ہیں، اور حکومت سے ساز باز کر کے ہندوستان کی آزادی کے راستہ میں سنگ راہ بنے ہوئے ہیں علماء حق کے ساتھ ہیں، اور ہمیشہ ساتھ رہیں گے علماء حق محمد رسول اللہ ؐ کے جانشین ہیں، اور ان کے وقار کو دنیا کی کوئی طاقت اس وقت تک ختم نہیں کر سکتی جب تک دنیا میں اسلام کے ماننے مسلمان باقی ہیں،

غالباً جناح صاحب اپنے لمبے لمبے جلوس اور بڑے بڑے جلسے دیکھ کر یہ غلط رائے قائم کر بیٹھے کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ہیں، اور انھوں نے ان کو اپنا قائد اعظم تسلیم کر لیا ہے،

جناح صاحب! مسلمانوں نے بڑے بڑے شاہانہ جلوس دیکھے ہیں اور جلسے سُنے ہیں، آپ اس قدر مغرور کیوں ہو گئے؟ مسلمان قوم کا آپ کو ابھی تجربہ نہیں ہے، یہ وہ قوم ہے جس نے مولانا محمد علی جوہر کے گلے میں بجائے پھولوں کے ہار کے جوتوں کا ہار پہنایا تھا، جن کی اعلیٰ قابلیت اور سیاست دانی کو تو شاید آپ بھی مانتے ہوں گے، یہ وہ قوم ہے جس نے کامل الحیاء والایمان امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بے گناہ شہید کر ڈالا تھا، وہ عثمان غنی رضؓ تھے جن کی ساری دولت، جن کا سارا وقت، جن کا دل، جن کا دماغ، غرض سب کچھ مسلمان قوم کے واسطے وقف تھا، یہ وہی سوادِ اعظم ہے جس نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کر کے محمد رسول اللہ ؐ کے نواسے حضرت حسینؓ اور ان کے ننھے بچوں اور عورتوں کو کربلا کے میدان میں فرات کے کنارے بھوک اور پیاس سے تڑپایا تھا، اور آپ کے جسم کو تیروں سے شہید کر کے شہید کیا تھا، اور آپ کے سر مبارک کو تن سے جدا کر کے طشت میں رکھ کر بطور تحفہ یزید کی خدمت میں پیش کیا تھا، یہ وہ قوم ہے جو چند ٹکوں کی خاطر خلیفۃ المسلمین کے خلاف حکومتِ برطانیہ کی طرف سے لڑنے گئی تھی، اور حرم پاک (مکہ معظمہ) میں پرستارانِ کعبہ کے سینوں کو حرم میں سرکاری گولیوں سے چھلنی کر کے شہید کیا تھا،

جس جگہ جان دار کو مارنا تو درکنار گھاس اکھاڑنا بھی منع ہے،

یہ وہ قوم ہے جو اپنے خادموں کو ذلیل کرتی ہے اور ملک وملت کے غدارو کو سر پہ بٹھاتی ہے، آج آپ ان سے علمائِ حق کی پگڑیاں اُچھلوا کر خوش نہ ہوجیے، جس کھیل کی مشق آپ جاہل مسلمانوں اور مذہب سے نا آشنا انگریزی تعلیم یافتہ خصوصًا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نوجوان طالب علم سے کرا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو "کس ظلم تیراز من ؛ کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد" کا مضمون ہوجائے،

آزاد خیال مسلمان اور علمائِ حق کڑے سے کڑے امتحانات سے گذر چکے ہیں، علماء نے ہمیشہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا اعلان کیا ہے، اور کبھی اور کسی وقت حق بات کہنے میں نہیں رُکے، چاہے ان کو کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہو،

محمد رسول اللہؐ کی پاک زندگی ہمارے سامنے موجود ہے، علاوہ مشرکینِ مکہ کے خود آپؐ کے خاندان والوں اور عزیزوں نے حق بات کہنے کے صلہ میں کیسی کیسی تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچائیں، کیا سرکارِ دو عالمؐ ان کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کر کے مدینہ تشریف نہیں لے گئے تھے؟ کیا آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاکر یہود اور نصاریٰ سے سیاسی معاہدہ نہیں کیا گیا تھا؟ اور کیا آپؐ پھر مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل نہیں ہوئے تھے؟ اور کیا مکہ کے مشرکین نے رسول اللہؐ کے قدموں پر سر اطاعت نہیں جھکایا تھا؟

علمائِ حق اور آزاد خیال مسلمانوں نے محمد رسول اللہؐ کی سنت پر عمل کر کے ہندوستان کی متحدہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی آزادی کی خاطر جس آزادی سے عالم اسلام کی آزادی وابستہ ہے شامل ہوئے تو کیا غضب ہوگیا؟

لیگی حضرات ذرا اپنے گریبانوں میں تو منھ ڈال کر دیکھیں کہ تم کیا کر رہے ہو؟

یاد رکھو: علماء کے وقار کا ختم کر دینا تمام مسلم قوم کے وقار اور عزت کو ختم کر دینا ہی نہیں بلکہ مذہب کو ختم کر دینا ہے،

کانگریس کے خلاف محاذ قائم کرنا خود اپنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنا اور اسلامی ممالک کی غلامی کے پنجے کو سخت کر دینا ہے، اگر علماء حق کا وجود نہ ہوتا تو مسلمان مسلمان نہ رہتے، یا تو عیسائی ہو جاتے یا مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے، یا لامذہب دھریئے ہو جاتے،

مسلمان بھائیو! کانگریس کے خلاف مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا مورچہ لگا رہی ہیں، لیگ کا جنگی نعرہ "پاکستان زندہ باد" اور ہندو مہا سبھا کا نعرہ "اکھنڈ ہندوستان زندہ باد" ذرا سوچو تو اور غور کرو، "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" ورنہ اس رسہ کشی کی ضرورت کیا ہے،

یہ بات غلط! کہ ملک اسلام ہے ہند ⁂ یہ جھوٹ! کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں غلام اور مطیع انگلش ⁂ یورپ کے لیے گودام ہے ہند

مسلمانو! اس فرضی پاکستان کے چکر میں نہ آو، جس کی تشریح آج تک خود مسٹر جناح بھی نہیں کر سکے اور نہ وہ کر سکتے ہیں، ہم ہندوستانی ہیں، ہندوستان ہمارا ہے، ہم ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور اسی کی آب و ہوا میں پرورش پائی، یہیں رہنا ہے یہیں مرنا ہے، اس کی پیداوار سے ہم بھی ایسا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جس طرح یہاں کی رہنے والی دوسری قومیں اٹھاتی ہیں، اس کی سرزمین پر ہمارے آباء و اجداد کی یادگاریں موجود ہیں، جنھوں نے ہندو مسلمانوں کو آپس میں ملا کر ایک قوم بنائی تھی، اور ایک دوسرے کو بھائی کہتا تھا، اور آپس میں دو بھائیوں کی طرح رہتے تھے، شادی اور غمی میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے،

اردو یا ہندوستانی زبان پر آپس کے میل جول کا بہت بڑا ثبوت ہی، ان فرقہ پرستوں کی مخالفت کے باوجود پھل پھول رہی ہے، اور تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس کے بولنے اور سمجھنے والے ہندوستان پار یعنی دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ملیں گے، تمام دنیا کے ممالک اپنے اپنے ملک کی خبریں اسی اردو یا ہندوستانی میں نشر کرتی ہیں۔

انگریزی حکومت کا استحصال:

ہندوستان جنت نشان پر جب سے انگریزی حکومت (برطانیہ) کا قبضہ ہوا ہے اس کی تمام پیداوار اور عام دولت کھنچ کھنچ کر لندن چلی جا رہی ہے، اور ہندوستانی دن بدن مفلس اور فقیر ہوتے جاتے ہیں، اور سارے ملک کی دولت سے لندن والے شاہان زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، دور کیوں جاتے ہو اپنے ملک میں انگریزوں کی عیش پرستیاں دیکھ لو، انگریز کا ایک کتا دودھ ڈبل روٹی اور بکری کا گوشت کھاتا ہے، اور اس کی خدمت کے واسطے ایک ہندوستانی ملازم رہتا ہے، جو اس کو صابن سے نہلاتا اور دھلاتا ہے، اور تولیہ سے اس کا بدن صاف کرتا ہے، جس ملک کی پیداوار سے یہ عیاشیاں ہو رہی ہیں غریب ہندوستانی کو نہ پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی ملتی ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا ہے، سنہ ۱۹۴۲ء کی جنگ عظیم میں ہندوستان جس دور سے گزرا ہے وہ کسی ہندوستانی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی، ضروریات زندگی کا ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے، یہ جنگ ختم ہو گئی لیکن ہندوستان کی مشکلات جوں کی توں اپنی جگہ پر ہیں، اور فی الحال ان کے دور ہونے کی کوئی امید بھی نہیں معلوم ہوتی، کیا مسلمان دیکھ نہیں رہے کہ فرقہ پرست جماعتوں کے لیڈروں کو

سوائے ہندو مسلمانوں کو لڑانے کے اور کوئی مشغلہ نہیں، ان کی بلا سے ہندوستانی مریں یا جییں ان کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے،

بتاؤ اور خدا کے لیے بتاؤ: تم کو ان جھگڑوں اور خون خرابوں سے اب تک کیا ملا اور کتنا فائدہ ہوا؟ سوچو! اور خدا کے لیے سمجھو! سمجھو اور غور کرو، ان فرقہ پرست جماعتوں کے رہزنوں اور غداروں کے دھوکہ اور فریب میں نہ آؤ، یہ تم کو اور ہندوستان کو حکومت برطانیہ کے ہاتھ چند ممبریوں اور وزارتوں اور عہدوں کی خاطر فروخت کرنے کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں، ان خود غرضوں کے کہنے میں نہ آؤ، یہ تمہارے اور ملک کے دشمن ہیں، لڑائی جھگڑے ختم کرو، اور آپس میں میل جول سے رہنا سیکھو، اور متحد ہو کر اس غلامی کے طوق کو اتار پھینکو، یاد رکھو! ہماری غلامی ہماری مصیبتوں کا سرچشمہ ہے، اور یہ مصیبت اُس وقت تک دور نہ ہوگی جب تک ہندو مسلم اتحاد نہیں ہوتا،

برطانیہ کی اسلام دشمنی:

بھائی مسلمانو: تمہیں یاد ہوگا کہ اس جنگ سے پہلے جو جنگ جنگ عظیم کے نام سے پکاری جاتی تھی حکومتِ برطانیہ کے ایجنٹ کرنل لارنس نے شریف حسین کو جو سلطنت ٹرکی کا ملازم تھا اور مکہ معظمہ کا گورنر تھا، اس کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا، اور کہا کہ تم عرب ہو، ترکوں کے غلام کیوں ہو؟ عرب تمہارا ہے، یہ اچھا موقع ہے بغاوت کردو، ہم تمہاری ہر طرح مدد کریں گے، اور جب جنگ ختم ہو جائیگی تو ہم تمہاری حکومت قائم کردیں گے، اس وقت تم ہمارے شریک جنگ ہو جاؤ،

شریف حسین انگریزوں کے جھانسے اور دھوکہ میں آگیا اور خلیفۃ المسلمین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا، ترکوں کو شکست ہوئی، جنگ ختم ہونے کے بعد ہوا کیا، برطانیہ نے عربوں کو اپنے ہم مذہب مسلمان بھائی (ترکوں) سے غداری کا

جو صلہ دیا وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہ تھی، سب مسلمان جانتے ہیں کہ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا، اور ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی، فلسطین جو مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے اُس پر خود قبضہ اس لیے جما لیا تاکہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر دیا جائے، شام جو نہایت سرسبز و شاداب اور زرخیز ملک ہے فرانس کے قبضہ میں دیدیا گیا، اور اس طرح حکومتِ برطانیہ نے اپنا دیرینہ منصوبہ پورا کیا، حکومتِ برطانیہ جس کو غدار مسلمان مسلمانوں کا دوست بتاتے ہیں اس کو یہ گوارا نہ تھا کہ مسلمان قوم ایک مرکز پر جمع ہو سکیں، اس لیے ترکوں اور عربوں کو آپس میں لڑا کر جُدا جُدا کر دیا، اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا، اب عرب ریاستیں مفلوج ہیں ان کی مجال نہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے خلاف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں، آج عربوں سے پوچھو کہ وہ کن مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہیں، اور وہ اپنی غداری کی سزا بھگت رہے ہیں یا نہیں، اور خدا جانے اپنے اس کیے کی ان کو کب تک سزا بھگتنی پڑے گی، اور برطانیہ کے انتداب کے عذاب کے نیچے کب تک دبے رہیں گے!

ہندوستان کی موجودہ صورت حال:

مسلمانو! ذرا سوچو اور عقل سے کام لو،

یقین مانو! آج ہندوستان میں بھی وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے جو خلیفۃ المسلمین کے خلاف شریف حسین کے ذریعہ عرب میں کھیلا گیا تھا،

انگریز مسٹر جناح مسلم لیگ کے قائد اعظم کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اور خیالی پاکستان (اسلامی حکومت) کا سبز باغ دکھا کر ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرا کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرانے کی کوشش میں ہے،

چنانچہ آج وہی پاکستان کے نام پر مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر کے الیکشن لڑنے کی تیاریاں کراتی جارہی ہیں، اور مسلمانوں ہی سے چاندی کی گولیاں جمع کرا کے علماء حق اور آزاد خیال قوم پرور مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوں گی، (ووٹروں کو رشوت دے کر ووٹ لیے جائیں)

خدا کی شان ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی سرمایہ دار اور خدا پرست آج مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں ؎

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

مسلمان ان فرقہ پرست بدعملوں کے کارناموں سے ناواقف نہیں، وہ سب سمجھ رہے ہیں کہ یہ واحد نمائندگی محض اپنے ہم خیال یعنی حکومت پرستوں کی ٹولی کو... مسلمانوں کی واحد نمائندگی اور پاکستان کے نام سے دھوکہ دے کر ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور چالیس چور علی بابا والا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں، تاکہ صوبہ کی کونسلوں اور مرکز میں یہ سرمایہ دار اور خان بہادر، اور سروں کو بھیجیں، اور وہاں جا کر حکومت کے منشاء کو پورا کریں، اور کانگریس کو ناکام بنا کر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو روک دیں،

مسلمان بھائیو! اگر تمہاری غفلت اور بے شعوری سے خدانخواستہ یہ ملک وملت کے دشمن، فرقہ پرست اور حکومت کے ایجنٹ کامیاب ہوگئے تو یاد رکھنا کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں اور مضبوط ہو جائیں گی اور ہندوستان کی اقتصادی بدحالی بد سے بدتر ہو جائے گی،

سوچو اور غور کرو کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلم لیگ کے مفروضہ قائدِ اعظم اور تمام لیگی فرقہ پرست جو ہندو مسلمانوں کو لڑانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں

اور تمام لیگی اخبار جمعیۃ العلماء ہند اور تمام قوم پرور مسلمانوں اور خصوصاً کانگریس کے خلاف ہیں؟

کیا کوئی دیندار اور سمجھدار مسلمان ایک منٹ کے واسطے یہ سمجھ سکتا ہے کہ علماءِ حق اور سرفروش مسلمان ملک و ملت سے کسی وقت بھی غداری کر سکتے ہیں،

ہم پاکستان کے خلاف نہیں

یہ تہمت ہے، جھوٹ ہے، فریب ہے، اگر جناح صاحب سچے ہیں اور واقعی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو وہ اعلان کر دیں کہ ہم اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، اور پاکستان (اسلامی حکومت) میں اسلامی (قرآنی) قانون کا نفاذ ہوگا، امیر، قاضی اور مفتی جو عالم باعمل ہوں گے مقرر ہوں گے، وغیرہ، اور اگر اس کے خلاف پاکستان بنانا ہے جس کا نمونہ جناح صاحب کی لیگی وزارتوں نے بنگال، آسام، سندھ وغیرہ میں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ تو ہمیں ہرگز ہرگز منظور نہیں،

جناح صاحب اور لیگی بھائیو! خدا کے لیے غریب مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائیے، اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے، مسلمان ہندوستان کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے، اور اس کی باگ ڈور آپ حضرات کی معرفت انگریزوں کے ہاتھوں میں رکھنا نہیں چاہتے، مسلمان بہت کچھ پامال ہو چکے ہیں، ان کی جہالت اور سیاسی ناواقفیت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے،

ہم کو حکومت کے سوا کسی نے پامال نہیں کیا، ہم جانتے ہیں کہ اس نے ہندوستان پر جو جو مظالم توڑے ہیں اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے، ہندوستان کی تاریخ جب لکھی جائے گی اس وقت اس کی تفصیل ہوگی، ہم بنگال اور سندھ کے قیامت خیز اور ہلاکت خیز حالات اور واقعات کو بھول نہیں سکتے،

آج بڑی بڑی طاقتیں دنیا کی ایک وحدت بنانا چاہتی ہیں، لیکن جناح صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر مچل رہے ہیں، اور کسی طرح رضامند نہیں ہوتے، جناح صاحب صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم ہندوستان پر انگریزی راج قائم رکھنا چاہتے ہیں، یہ ایچ پیچ کی باتیں کرکے ناواقف مسلمانوں کو دھوکہ کیوں دے رہے ہیں، اور اپنے دل کے چور کو چھپا کیوں رکھا ہے، تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں، علماء حق اور قوم پرور مسلمان آپ کے ارادوں سے واقف ہیں، لیگ کے وجود سے مسلمانوں کو اور ہندوستان کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں، ان کے سامنے ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے اور کوئی اسکیم نہیں، اور یہ وہی اسکیم ہے جو انگریزی حکومت (برطانیہ) کی ہے، "لڑاؤ اور حکومت کرو"

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کو اس وقت تک جو تھوڑے بہت حقوق ملے ہیں وہ انڈین نیشنل کانگریس کی قربانیوں کا ریکارڈ ہے، اور سنہ ۱۹۴۲ء میں جو قربانیاں پیش کیں وہ قابل مبارکباد ہیں، یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ فرقہ پرست جماعتیں یعنی مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا ہندوستانیوں کو مذہب کی آڑ لے کر کبھی محرم پر، کبھی قربانی گاؤ پر، کبھی باجے اور کبھی ہولی پر لڑاتی ہیں، اور آجکل "پاکستان" اور "اکھنڈ ہندوستان" پر لڑایا جارہا ہے، اور ہنگامے کرائے جارہے ہیں،

ہندو قوم تو ہندو مہاسبھا کو سمجھ گئی، اور مہاسبھا کو زندہ درگور کردیا، یعنی الیکشن کے موقع پر ہندو مہاسبھا کے امیدواروں کو کانگریس کے امیدواروں کے مقابلہ میں ووٹ نہ دے کر شکست دیدی، افسوس کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پاکستانی نعرہ کو نہ سمجھا، اور آنکھیں بند کرکے بے سوچے سمجھے اندھا دھند

پیچھے لگ گئے، اور قوم پرور مسلمانوں اور علماءِ حق کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے،

عیش پرست امرا کی سیاست:

یہ عیش پرست اور راحت طلب جنگِ آزادی کی راہ میں ہمیشہ مختلف طریقوں سے رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں، اور قوم پروروں کو حکومت سے مل کر طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرتے رہتے ہیں، ان کو ملک کی آزادی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، ان کی زندگی کا مقصد کاشتکاروں، مزدوروں کا خون چُوس چوس کر اپنے سرمایہ کو بڑھانا یا کونسل کی ممبریاں، وزارتیں اور سرکاری عہدے حاصل کرنا ہیں، ان کو غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جہاں الیکشن کا زمانہ آیا، یہ رجعت پسندوں، عیش پرستوں اور سرکار پرستوں کا طائفہ اپنے اپنے عیش خانوں اور عشرت کدوں سے نکل نکل کر اسلام خطرہ میں، مسلمان خطرہ میں، تمدن اور کلچر خطرہ میں کے نعرے لگاتے ہوئے، قوم پروروں کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر نکل آتے ہیں، مگر ان جھوٹے نعرے لگانے والوں کی صورت، سیرت اور تمدن وغیرہ کا کوئی جائزہ نہیں لیتا جن کی صورت، سیرت اور تمدن وغیرہ اسلام کے بالکل خلاف ہوتے ہیں، مسلمانوں کے سامنے ہندوؤں کے مظالم کی داستانیں سُنا سُنا کر مسلمانوں کو لڑاتے ہیں، کبھی مسجد اور باجے پر جھگڑا، کبھی محرم اور گائے کی قربانی پر جھگڑا اور خون خرابہ کراتے ہیں، اور اس طرح دونوں قوموں میں نفرت اور حقارت کے جذبات کو بھڑکا بھڑکا کر ووٹ لیتے ہیں، اور کامیاب ہونے کے بعد میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جا کر ہندو مسلمان ایک ساتھ بیٹھ کر ٹی پارٹیاں اور کاک ٹیل اڑاتے ہیں، اور دونوں مل جُل کر قوم اور ملک کے خلاف تجویزیں پاس کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مسلمان یہ نہیں سمجھتے

یہ ملک وملت کے غدار ہیں، ان کو ووٹ نہیں دینا چاہیے،

جن مسلمانوں نے لیگ کے پہلے الیکشن کے مظاہرے اور نظارے دیکھے ہیں ان سے پوچھو کہ "مسلمان اور اسلام خطرہ میں" کا نعرہ لگانے والے پاکستانیوں نے اپنی پاکستانی شرافت اور اخلاق کے جو مظاہرے کیے تھے وہ کس قدر قابلِ نفرت اور حقارت تھے، جو ایک سچے مسلمان کی شان کے شایان نہ تھے، ان "اسلام زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے جھوٹے نعرے لگانے والوں نے کوئی ایسی غیر شریفانہ حرکت نہ تھی جو نہ کی ہو، اس قسم کا مظاہرہ کرنیوالوں میں زیادہ تر ملازمت کے آرزومند، یورپ زدہ انگریزی تعلیمیافتہ لڑکے اور غنڈہ قسم کے جاہل مسلمان شریک تھے،

اب پھر الیکشن آرہا ہے، لیگی حضرات اور خصوصًا ننگِ صحافت لیگی اخباروں نے پھر وہی سرگرمیاں اور حرکتیں شروع کر دیں، اور آزاد خیال قوم پرور مسلمانوں اور خصوصًا علماءِ حق کے خلاف طرح طرح کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات تراشنا شروع کر دیئے، جن سے مسلمانوں میں ان لیگیوں اور لیگی اخباروں کے خلاف غم وغصہ کے جذبات بھڑک رہے ہیں، خدا خیر کرے، دیکھیے! ان کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا کیا انجام ہوتا ہے، مسلمانوں کو صبر وسکون سے کام لینا چاہیے، اور اُن کی غیر شریفانہ حرکتوں سے مشتعل نہ ہونا چاہیے، ان سرکار پرستوں کا مقصد آپس میں لڑانا اور نفرت پیدا کرنا ہے، مسلمان ان کے اس ناپاک ارادہ کو پورا نہ ہونے دیں، جو لوگ تم کو مذہب کے نام پر لڑاتے ہیں وہ تمھارے دوست نہیں، ان کی شرارت آمیز باتیں نہ سنو، اور ان کے کہنے پر عمل نہ کرو، اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دو، ان کی یہ ساری حرکتیں ووٹ لینے کی خاطر ہوتی ہیں، یہ تم کو آپس میں لڑا کر خود اپنے اپنے گھروں کو بھاگ جائیں گے، سر تمھارے پھوٹیں گے، جیلوں میں تم جاؤ گے

مقدمے تم پر چلیں گے، روپیہ تمہارا برباد ہوگا، بیوی بچے تمہارے پریشان اور خستہ وخراب ہوں گے، غرض مصیبتوں اور پریشانیوں میں تم مبتلا ہوگے، اور تم کو کچھ فائدہ نہ ہوگا،

مقامِ غور وفکر:

خدا کے لیے ٹھنڈے دل سے سوچو اور سمجھو، اور سرکار پرستوں او سرمایہ داروں کی خاطر تم اپنے آپ کو کیوں بیٹھے بٹھائے پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہو،

لیگیوں سے کہو کہ تمہارا تو دعویٰ ہے کہ ہم دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے نمائندہ ہیں، پھر ہم غریب مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر خون خرابہ کیوں کراتے ہو؟ خدا کے لیے ہمارے حال پر رحم کھاؤ، الیکشن لڑو لیکن آپس میں لڑا کر یا ایکدوسرے کی پگڑیاں اچھال اچھال کر الیکشن نہ لڑو، یہ افعال انسانیت اور شرافت کے خلاف ہیں،

جمعیۃ العلماء ہند اور آزاد خیال مسلمانوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر بے پناہ قربانیاں دے کر ایک قابلِ فخر ریکارڈ قائم کرکے اپنی قوم اور اپنے وطن کی عزت کو چار چاند لگا دیے ہیں، اور ان کے درخشندہ کارنامے تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے، اور آنے والی نسلیں ان کی قبروں پر اپنے عقیدت کے پھول چڑھائیں گی، اور ان کی یادگاریں قائم کرکے فخر کریں گی،

ملک وملت فروش اور غدار یاد رکھیں کہ ہندوستان تو ایک نہ ایک دن آزاد ہوکر ہی رہے گا، لیکن تمہارا نام میر جعفر اور میر صادق کی فہرست کے ساتھ موٹے موٹے سیاہ حروف میں لکھا جائے گا،

مرزا الٰہی بخش کے نام سے کون ہے جو واقف نہیں، یہ وہی مرزا الٰہی بخش

ہیں جو بہادر شاہ دہلی کے بادشاہ کے سمدھی تھے، جنھوں نے بادشاہ (بہادر شاہ) کو انگریزوں کے کہنے سے دھوکا اور فریب دیا، اور مقبرۂ ہمایوں میں لے جاکر وہاں سے ان کو انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کرادیا تھا،

دلّی والے مرزا الٰہی بخش کی حویلی کو آج تک حویلی نمک حرام کہہ کر پکارتے ہیں، اور ان کی قبر پر جاکر تھوکتے ہیں، اور قوم و ملک کا غدّار کہہ کر لعنت بھیجتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر سچے مسلمان کو ملک و ملت کی غداری سے محفوظ رکھے،

مسلمان بھائیو! یہ مسلم لیگ غریب مسلمانوں، مزدوروں اور کاشتکاروں کی نمائندگی نہیں کرتی، بلکہ سرمایہ داروں، راجاؤں، تعلقہ داروں، نوابوں، زمینداروں، سرکاری ٹھیکہ داروں، خطاب یافتوں اور سرکاری ملازموں عہدیداروں بے عمل عیش پرستوں کی نمائندہ جماعت ہے، بیچارے غریب کی تو وہاں پہنچ ہی مشکل ہے،

مسلم لیگ اپنی مفروضہ واحد نمائندگی اور پاکستان کا جھوٹا ڈھول پیٹ پیٹ کر عوام کو دھوکا اور فریب دے کر عمرت و ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہے، اور اس کے سوا اس کا اور کچھ مدعا نہیں ہے،

پاکستان میں اسلامی حکومت کا نعرہ ایک فریب ہے،

مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں اسلامی سلطنت قائم ہوگی، پاکستان میں قرآن کریم اور شریعتِ الٰہی کا نفاذ ہوگا، پاکستان میں مسلمان غیر مسلموں پر حکومت کریں گے، اور یہ وہ یقین ہے جس کے بعد کوئی مسلمان پاکستان کی مخالفت نہیں کرسکتا، ایسے پاکستان کی مخالفت یقیناً اسلام کی مخالفت ہوگی، فرض کرو اگر ہمیں بھی یقین ہوجائے کہ پاکستان میں خالص اسلامی

حکومت، خالص قرآنی قانون اور خالص اسلامی سطوت اور اقتدار قائم ہوگا تو کیا ہم اس کی مخالفت کرنے کی جرأت کریں گے؟ پھر تو ہمارے لیے بھی لیگ کا ساتھ دینا ضروری ہوگا، اور ہم اس کی کامیابی کو اسلام کی کامیابی تصور کریں گے، اگر مسلمانوں کی اکثریت کو اس بات کا یقین دلایا گیا ہے، اور اسے یقین بھی آگیا ہے کہ واقعی پاکستان میں اسلامی اور قرآنی نظام قائم ہوگا تو لیگ کی کامیابی پر حیرت اور فخر کی کونسی بات ہے، یہ تو یقین کا کمال ہے جو ہم سے بھی یہی خدمت لے سکتا ہے، لیکن ہم میں اور مسلم اکثریت میں فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کو یقین آگیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی اور قرآنی حکومت قائم ہوگی، مگر ہمیں یقین نہیں آیا کہ مسٹر جناح پاکستان قائم کریں گے، پاکستان میں اسلامی اور قرآنی حکومت ہوگی، اور پاکستان میں مسلمان غیر مسلموں پر حکومت کریں گے، اب آیئے دیکھیں کہ ہمیں اس بات پر یقین کیوں نہیں آتا اور ہمارے عدم تیقن کی بنیاد کیا ہے؟

مسٹر جناح کا اعلان:

تم کہتے ہو کہ جس پاکستان میں اسلامی حکومت اور قرآنی قانون کا نفاذ ہو اسے ضرور قائم کرنا چاہیے، ہم کہتے ہیں کہ ایسے پاکستان کو نہ صرف قائم کرنا چاہیے بلکہ ہر مسلمان پر اس کا قائم کرنا فرض ہے، اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ غدار اور مفسد ہے، مگر ہم اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسٹر جناح اور ان کی مسلم لیگ پاکستان میں اسلامی اور قرآنی حکومت ہرگز قائم نہیں کرے گی؛ اور ہم نہیں کہتے، مسٹر جناح کہتے ہیں، آل انڈیا لیگ کے سکریٹری صاحب کہتے ہیں، لیگی اخبارات کہتے ہیں، لیگ کا سرکاری آرگن "ڈان" کہتا ہے، پہلے لیگ کے سرکاری اخبار "ڈان" کو لیجیے، وہ مسٹر جینا کی طرف سے اعلان کرتا ہے کہ:

"مسٹر جناح نے پاکستان کو دنیاوی اسٹیٹ قرار دیا ہے، اور ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی ہے کہ پاکستان میں حکومتِ الٰہیہ قائم ہوگی، وہ لوگ جو پاکستان کو پان اسلامزم (اتحادِ اسلامی) کا مرادف قرار دیتے ہیں وہ اتحاد کے دشمن ہیں" (ڈان ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء)

پس مسٹر جناح کے اخبار ڈان کی یہ پہلی تصریح ہے کہ پاکستان میں قرآنی اور اسلامی حکومت قائم نہیں ہوگی، اور وہ لوگ اتحاد کے دشمن ہیں جو پاکستان کا تعلق اسلام کے ساتھ قائم کرتے ہیں،

پاکستان کا غیر قرآنی دستور؛

آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری جناب نوابزادہ لیاقت علی خان سے تو آپ خوب واقف ہوں گے، یہ وہی صاحب ہیں جو مسلم لیگ کے نفسِ ناطقہ اور اس کے نقیبِ خصوصی ہیں، اور مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، ... انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

"ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا دستور اساسی کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا، اور اس کے دستور اساسی کی تشکیل ان علاقوں کے تمام باشندگان (مسلم، سکھ، ہندو، عیسائی وغیرہ) ایک مجلسِ منتخبہ کے توسط سے خود ہی کریں گے" (لیگ کا سرکاری آرگن ڈان، ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

۱۔ صاف اعلان ہے کہ پاکستان ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگی، اسلامی اسٹیٹ نہیں ہوگا،

۲۔ اس کا دستور اساسی بنایا جائے گا، جو قرآن اور اسلام سے علیحدہ ہوگا، کیونکہ قرآن کا دستور بنایا نہیں جاتا صرف نافذ کیا جاتا ہے،

۴۔ پاکستان کا دستور اساسی بنانے والے ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ ہوں گے، اور قرآن طاق پر رکھا رہے گا، کیونکہ قرآن کے دستور کو نہ تو کوئی بنا سکتا ہے اور نہ اس میں غیر مسلموں کو شریک کیا جا سکتا ہے،

پس لیگ کے جنرل سکریٹری کی یہ دوسری تصریح ہو کہ پاکستان میں اسلامی اور قرآنی حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ جمہوری حکومت قائم ہوگی، اور اس کا دستور اساسی قرآن نہیں ہوگا بلکہ وہ فیصلہ ہوگا جو ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی مل کر صادر کریں گے، اور حکومت کے زور سے اس غیر قرآنی فیصلہ کو مسلمانوں پر نافذ فرمائیں گے،

مسٹر جناح کا دوسرا اعلان؛

آپ نے مسٹر جناح کے نام سے ان کے اخبار "ڈان" کا فیصلہ سنا، لیگ کے جنرل سکریٹری کا ذمہ دارانہ اعلان پڑھا، اب خود مسٹر جناح کی تصریح بھی سنیے! آپ نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

> "پاکستان سیاسی طور پر ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندوؤں کی راہ میں کوئی معاشی رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی، میں اس عقیدہ کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان میں ایک جماعت یا ایک پارٹی (مسلمانوں) کی حکومت ہو، میں اس ایک جماعت (یعنی مسلمانوں کی جماعت) کی مخالفت کروں گا جو تنہا حکومت کرے، پاکستان کی ہندو اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان کے حقوق کی پوری حفاظت کی جائے گی، کیونکہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر کوئی مہذب حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی" (مسٹر جناح کا اخبار "ڈان" ۱۰ر نومبر ۱۹۴۵ء)

لیگ کی اندرونی آواز!

جن لیگی اخبارات نے مسٹر جناح اور لیگ کی پالیسی کو سمجھا ہے اور مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش نہیں کی ان میں لاہور کا معاصر "انقلاب" خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ پاکستانی جمہوریت کی تشریح کرتے ہوئے اپنے افتتاحیہ میں لکھتا ہے:

"لیگ کی قرارداد میں بالتصریح مذکور ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہر حصہ کی حکومت متعلقہ آبادیوں کی رائے اور مشورہ سے بنے گی۔" (انقلاب، نومبر ۱۹۴۵ء)

اور چونکہ پاکستانی حکومت تمام آبادیوں کی رائے اور مشورہ سے بنے گی، اس لیے معاصر محترم کو صاف صاف اعلان کرنا پڑا کہ:

"ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی، جو شخص ایسا خیال ظاہر کرتا ہے وہ لیگ کے مجوزہ پاکستان سے بالکل بے خبر ہے۔" (انقلاب لاہور کا افتتاحیہ، ۵ ارنومبر ۱۹۴۵ء)

پاکستان کو اسلام اور قرآن سے کوئی تعلق نہ ہوگا، نہ وہاں اسلامی نظام قائم ہوگا اور نہ قرآنی دستور کو نافذ کیا جائے گا، ہم نے جو خیال قائم کیا اس کا ثبوت مسٹر جناح کے اعلانات سے، جنرل سکریٹری کی تقریر سے، لیگ کے ترجمان "ڈان" کی تصریحات سے بلش کر دیا ہے، اب جو مسلمان اس خبط میں مبتلا ہیں کہ پاکستان خالص اسلامی اسٹیٹ ہوگا وہ اپنے خیال کا ماخذ بتائیں، اور ثبوت دیں کہ لیگ اپنے پاکستان میں اسلامی نظام اور قرآنی دستور نافذ کر کے اسے خالص اسلامی حکومت کیسے بنائیں گی؟

آزمائش کی گھڑی:

الیکشن کا زمانہ قریب آرہا ہے، اور یہ مسلم لیگی فرقہ پرست اور مذہب کے دشمن مسلمانوں کو قوم پرور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کے جھوٹے اور بے بنیاد الزام تراش کر لڑانے اور گمراہ کرنے کی خود غرضانہ کوشش کر رہے ہیں،
یاد رکھو! حرکت مسلسل اور عمل پیہم کا نام زندگی ہے، غیر حقیقی نعرے، بے مقصد رجز، خواب آور نغمے، سہولت پسندی، قربانی سے جی چرانا اور سکون وجمود زندگی کی علامتیں نہیں ہیں، فقط ؛

پاکستان اسکیم

اور

امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حضرت شاہ صاحب کے افاداتِ سیاسیہ دربارۂ تقسیمِ ہند

اور

مجلسِ احرارِ اسلام ہند کے سیاسی موقف کی وضاحت

نیز

مابعد سیاسی رویوں پر تبصرہ

تالیف و ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

امیر شریعت

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

ایک نادر روزگار شخصیت

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری)

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ابن حافظ سید ضیاء الدین (رحمہما اللہ) ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ حافظ ضیاء الدین مرحوم ترک سکونت کر کے پنجاب آ گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے تعلیم کے مراحل یہیں طے کیے۔ قابل اساتذہ کی تعلیم نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو چمکا دیا تھا اور بزرگوں کی اچھی صحبتوں اور صحیح رہنمائی نے سیرت کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ ایک ہونہار بروا تھے۔ اُبھرتے، بڑھتے اور نمایاں ہوتے ہی چلے گئے۔

۲۰-۱۹۱۹ء میں عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔ پھر وفات تک قومی و ملی تحریکات کا کوئی ایسا معرکہ نہ تھا، جس میں شریک نہ ہوئے ہوں اور قوم و وطن اور دین و ملت کی خدمت کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی آلودگی سے دامن داغ دار ہوا ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کو خدائے تعالیٰ نے ذہن و فکر، علم و عمل، اخلاق و سیرت اور خصایص و خصایل ظاہری و باطنی کے بے شمار محاسن سے نوازا تھا۔ وہ بلند پایہ عالم دین تھے اور متعدد علوم دینی میں گہری نظر و بصیرت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دین کے ایک ایک نکتے پر عمل کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ انھوں نے دین و مذہب اور معاشرت و سیاست کے مختلف میدانوں میں قوم و ملت کی رہنمائی کی اور وطن کی خدمت میں زندگی بسر کی تھی۔ وہ جتنے بڑے عالم دین تھے، اتنے ہی بڑے سیاسی مدبر بھی تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں دعوت و ارشاد اور اصلاحِ ملت کے کاموں میں

مصروف ہوتے تھے اور تحریک آزادی وطن کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ وہ عزیمت و استقامت اور ایثار و قربانی کا پیکر تھے۔

حضرت امیر شریعتؒ قرآن حکیم کے بہترین قاری اور نکتہ رس مفسر تھے۔ مسائل کے استنباط، نتایج کے استخراج اور احکام کے انطباق میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ وقت کے نامور خطیب تھے۔ ان کے بیان و خطابت میں سحر تھا۔ وہ اپنی خطابت سے دلوں کی دنیا اور فکر کے قافلوں کا رخ بدل دیتے تھے۔ وہ بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ وہ نیک صورت، نیک سیرت، نیک سرشت اور نیکی کا پیکر تھے۔ وہ حقیقت پسند، حق گو اور اظہارِ حق میں بڑے بے باک تھے۔

وہ معصوم اور فرشتہ نہ تھے لیکن ان کے دامن سیرت پر ہمیں معصیت کوئی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی۔ مخلصین ان کی خوبیوں کا احاطہ کرنے سے اور نکتہ چیں زبانیں اور قلم ان کی خامیاں تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ نیک بخت تھے اور سعادتوں نے ان کی شخصیت کا احاطہ کرایا تھا۔ ان کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ خانوادۂ نبوت کے ایک دور افتادہ فرد تھے۔ لیکن ان کے ذوق و خدمت دینی اور حسن اعمال نے انھیں عہدِ سعادت نبوت اور صحابۂ کرامؓ کے دورِ حقّہ و راشدہ کی ایک یادگار شخصیت بنا دیا تھا۔

ان کے معاشرتی و سیاسی مسلک کا تعلق ارشاد و ہدایت اور اصلاح امت کے اس مکتب فکر سے تھا، جس کی بنیاد مجدد الف ثانی، حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے رکھی تھی اور جس کا دوسرا دور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے شروع ہوتا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حوالے سے حضرات دہلوی و سرہندی سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی مسلک اور مکتب فکر کو خود بیان کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''میں ان علماے حق کا پرچم لیے پھرتا ہوں، جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ رب ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ لوگوں نے پہلے ہی کب

کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے! وہ شروع سے تماشائی ہیں اور تماشا دیکھنے کے عادی! میں اس سرزمین میں مجدد الف ثانی کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں، سید احمد شہیدؒ کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جرأت کا پانی دیوا ہوں۔ میں اُن پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر صلحائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گذار ہوں، جنھیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ہاں! ہاں! میں انھی کی نشانی ہوں، انھی کی صدائے بازگشت ہوں۔ میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے، میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتویؒ کا علم لے کر نکلا ہوں، میں نے شیخ الہند کے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے، میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا۔ میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ ہے برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا!
ہر شخص اپنا شجرۂ نسب رکھتا ہے، میرا یہی شجرہ نسب ہے۔ میں سر اونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اسی خاندان کا ایک فرد ہوں۔''

(نقیب ختم نبوت (امیر شریعت نمبر): ص ۲۲)

اسی خانوادۂ عزیمتِ دعوت کے اساتذہ و شیوخ کی صحبت میں ان کی تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے کے اصحابِ عزیمت اور رجال کار کی رفاقت و محبت میں ان کی زندگی کے شب و روز گزرے تھے اور انھیں بزرگوں کے مسلک پر اپنی زندگی کے ہر دور اور گرم و سرد موسم میں قایم رہے تھے۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے، جب کوئی فیصلہ کر لیتے تو اس سے قدم پیچھے نہ ہٹاتے، انھوں جب کسی سے کوئی عہد باندھا، تو باندھنے میں تو دیر ہوئی کہ غور و فکر کا تقاضا تھا، لیکن جب باندھ لیا تو اپنی طرف سے عہد شکنی نہ کی۔ ان کے فیصلوں میں کبھی یمین و یسار کا تذبذب پیدا نہیں ہوا۔ وہ رشتوں کا احترام کرنے والے تھے، رشتے توڑنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

جس تحریک میں شریک ہوئے ہر نشیب و فراز میں رفقا کا، دیا۔ قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹانا نہ جانتے تھے۔ وہ کسی کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا نہ ہوتے تھے۔ ہمیشہ مثبت انداز میں سوچتے تھے۔ منفی انداز فکر ان کے ذوق کے خلاف تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ زندگی بھر عقیدت و احترام کا تعلق رہا۔ قوم و وطن اور دین و ملّت کے مختلف محاذوں پر ہمیشہ جہاد میں مصروف رہے۔ کوئی قومی و ملّی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں سرفروشانہ حصہ نہ لیا ہو۔ وہ صاحب ایثار تھے، مال و دولت ان کے پاس کبھی نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے نطق و بیان کی دولت اور ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اسی کو لٹاتے اور استعمار کی بیخ کنی کرتے رہے تا آں کہ خدا کی طرف سے پیام حضوری آ پہنچا اور ۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء کی شام کو وہ اپنے رفیق اعلیٰ کی قربت کی لذت یابی اور شوق حضوری میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۳ء

مجلسِ احرارِ اسلام کا انقلابی دور

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری)

۲۶ راپریل ۱۹۴۳ء کو مجلسِ احرارِ اسلام ہند کے نئے سیاسی تاریخی دور کا آغاز ہوا۔ یہ وہ موقع تھا جب سہارن پور میں مولانا غلام غوث ہزاروی کی صدارت میں یو پی پروونشل احرار کا اجلاس ہو رہا تھا اور اسی موقع پر مجلسِ احرارِ اسلام ہند کی مجلس عاملہ نے ۲۶/۲۵ راپریل ۱۹۴۳ء کو غور و فکر اور بحث و نظر کے بعد نئے حالات میں اپنی سیاست کے اصول و مقاصد کے چند اہم اور بنیادی فیصلے کیے تھے۔ مجلس عاملہ کی منظور کردہ ایک قرارداد میں کہا گیا تھا:

۱۔ ''مجلسِ احرار اسلام ہند نے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب وغیرہ اسکیموں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جنگ عالم گیر کی تباہ کاریوں اور جنگی رقبوں سے ہزاروں میل دور علاقوں میں جنگ کے تکلیف دہ اور فتنہ زا اثرات پر دھیان دیتی چلی آئی ہے۔

مجلس تمام غور و فکر کے باوجود اپنے آپ کو اپنا یہ پرانا مسلک چھوڑنے پر آمادہ نہیں پاتی کہ ہندوستان کی سیاست کا پے چیدہ مسئلہ بہر حال اس ملک کے رہنے والے لوگوں کے درمیان امن و اعتماد باہمی کے ذریعہ ہی حل ہو سکتا ہے۔ اس لیے مجلس ان تمام اسکیموں کے حامیوں سے بھی عرض کرنا چاہتی ہے کہ اکھنڈ بھارت، پاکستان یا آزاد پنجاب جیسی کوئی اسکیم بھی باہمی اعتماد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی فریق کا یہ خیال ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے سہارے سے اپنی اسکیم منوا سکتا ہے تو اسے یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ انگریزی بم بار کے سہارے جو اسکیم بھی

منوائی جائے گی وہ انگریز کی غلامی پر مجبور کرے گی اور اسی وقت تک قائم رہ سکے گی جب تک اس کی غلامی کا طوقِ گراں بار موجود ہو۔

ایسے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب کے نمونے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں انگریز حکومت کی آمد کے وقت سے موجود چلے آئے ہیں۔ اس لیے سیاسیانِ ہند کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی گرم روی میں ایسے حالات پیدا نہ کریں جو بالآخر چند ایک اور مجبور و محصور ریاستیں ہندوستان میں پیدا کریں اور بس!

اندریں حالات مجلسِ احرارِ اسلام اپنی روش کا اظہار ان الفاظ میں کر دینا مناسب سمجھتی ہے:

۲۔ ''مجلسِ احرارِ اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ جس کی کامیابی کے لیے لندن کے طواف کی ضرورت یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو۔

مجلسِ احرار اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ہندوستان میں ایک مرکز قائم کیا جائے یا زیادہ اور اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم کو روا رکھا جائے یا اس میں تبدیلی کرنے کی خواہش ہو۔ ہر حالت میں صلح جویانہ عہد و پیمان اور امن و آشتی کا ماحول ہی بہترین فیصلے میں مدد دے سکتا ہے۔

مجلسِ احرار اس منافرت انگیز پروپیگنڈے کو جو کسی طرف سے بھی کیا گیا ہے، یا کیا جا رہا ہے، ہندوستان کے مستقبل یا اکھنڈ بھارت یا پاکستان یا آزاد پنجاب وغیرہ کے قیام کے لیے مہلک سمجھتی ہے اور ہر اس اسکیم کے حامیوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں، تحریروں اور دیگر پروپیگنڈے سے باز رہیں اور اپنے راستے میں خود ہی کانٹے نہ بوئیں۔

۳۔ ''مجلسِ احرارِ اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے
کہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قایم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان
کا مذہبی یا حقیقی اور قطعی فریضہ ہے بلکہ ہر حالت میں خدا اور رسول کی دکھائی
ہوئی راہ پر چلنا، دنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا، نیکی کی
حکومت قایم کرنا اور نیکی کو رواج دینا خلقتِ انسان کی خداوندی حکمت و
مصلحت ہے اور مجلسِ احرارِ اسلام دنیا کے جس حصہ میں بھی ممکن ہو حکومت
الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ اسلام کے زریں
اصولوں پر کار بند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جاسکتا ہے
اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔
اس ضمن میں مجلسِ احرار یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقے
میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا
حکومتِ الٰہیہ کا مترادف نہیں، بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو
اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے رہیں، اسلام کے روے
روشن پر دھبا لگایا ہے اور دنیا کے اسلام سے متنفر ہونے کی راہ پیدا کی۔
مجلس کسی ایسے تجربے کو دہرانے کے لیے مسلمانوں کو دین سے بے بہرہ
کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ میں حکومت دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی اور
وہ مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی
ذمے داریوں کا فوری اور کلی احساس کریں اور اپنی نگاہ سے حکومتِ الٰہیہ
(کے نصب العین کو اوجھل نہ ہونے دیں اور) الحاد و زندقہ کے فروغ کا
موقع نہ (پیدا ہونے) دیں، بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعتِ خدا اور رسول پر
کمربستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔''
یہی وہ تاریخی قرارداد ہے جو تاریخ برِاعظم ہند پاکستان میں سہارن پور قرارداد
یا حکومتِ الٰہیہ ریزولیوشن کے نام سے معروف ہوئی۔

مجلسِ احرارِ ہند نے حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن ایسے حالات میں پاس کیا جب کہ ہندوستان کی کوئی مسلم جماعت ہنوز اس طرف متوجہ نہیں تھی کہ بنی نوع انسان کو موجودہ تباہی سے بچائے اور کیوں کر نجات دہندہ بنے۔ البتہ صرف یہی ایک طریق کار ہے کہ وہ انسانی نظام اور آئین کو چھوڑ کر صرف اللہ کے نظام کی طرف توجہ دے اور یہی وہ آئینِ خداوندی ہے جس سے مردہ انسانیت میں حیاتِ نو کا تصور پیدا ہو سکتا ہے۔

واضح رہے کہ حکومتِ الٰہیہ کی تجویز کوئی فرقہ وارانہ اور مذہبی تعصبات پر مبنی فارمولا نہ تھا۔ بلکہ ایک ایسے نظام حکومت کی خصوصیات کا جامع تھا جو ہر طرح کے مذہبی، معاشرتی، طبقاتی اونچ نیچ اور تعصبات سے بلند، محنت، قابلیت اور وسایل کی بنیاد پر حصول معیشت کے فرق اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں برابری اور ”کُلُّکُم بَنُوْ آدَمُ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٌ“ کے اصول پر انسانی مساوات کے اعتقاد پر مبنی نظام حکومت تھا۔ معلوم رہے کہ خاک سار نے حکومتِ الٰہیہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ میں نے مجلس کے کسی اعلامیہ اور مینی فسٹو میں نہیں پڑھے، احرار کی اسپیشل کانفرنس لاہور (دسمبر ۱۹۴۳ء) میں اس کے رہنماؤں کی تقریری سے اخذ کر لیے ہیں۔ ان بزرگوں کے افکار کا نچوڑ یہی ہے جو خاک سار نے یہاں مجمل طور پر پیش کر دیا ہے۔

احرار مدبرین کی بصیرت سے یہ بات اور نہیں ہونی چاہیے تھی کہ حکومتِ الٰہیہ کی اصطلاح عربی ہے۔ یہ برادرانِ وطن کی حلق سے بہ مشکل ہی نیچے اُترے گی۔ حکومتِ الٰہیہ کی ترکیب ان کی زبان پر آتے ہی، حقیقت سے ناآشنائی کی بنا پر اسلامی حکومت کا یک نیابت ڈراؤنا تصور ان کے ذہن میں سما جائے گا اور اس کے لیے ان کی نظر محدود اور دل تنگ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ”کنگ ڈم آف گاڈ“ یا اسی قسم کی کرتی اصطلاح ناقابل قبول نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اسپیشل کانفرنس (لاہور- دسمبر ۱۹۴۳ء) کے سرکاری روداد نویس نے حکومت الٰہیہ کے لیے بے تکلف ”کنگ ڈم آف گاڈ“ کی ترکیب

استعمال کی ہے۔ رہی یہ بات کہ خصوصیات کے تجربے کے بعد یہ نظام حکومت الٰہیہ قبول کرلیا جائے گا تو اگر ذہنی اور فکری ہم آہنگی اور مناسبت نہ ہونے سے اگراس کے قیام میں عدم تعاون یا نفاذ کو قبول کرنے سے پہلے ہی انکار کردیا گیا تو تجربے کی نوبت ہی کب آئے گی اور جھجک کیوں کر دور ہوگی۔

مجلسِ احرار کے بزرگوں کو یہ بھی یقین تھا کہ برادرانِ وطن جب اس نظام کی خصوصیات پر غور کریں گے اور اس کے نفاذ کے بعد انھیں عملاً اس کے فواید کا تجربہ ہوگا تو وہ ''حکومتِ الٰہیہ'' کی اصطلاح کو بھی قبول کرلیں گے۔ اس لیے بھی کہ اس اصطلاح میں اور اس نظام میں غیر مسلمان برادران وطن کے مذہبی عقاید یا ان کی زندگی کے مقاصد و مصالح کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ اگر اس کے قبول کرنے میں کوئی جھجک ہے تو عملی تجربے کے بعد وہ دور ہو جائے گی۔

مجلسِ احرارِ اسلام کا حکومتِ الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنانا اور آزاد ہندوستان کے لیے اسے نظامِ حکومت قرار دینا اور اس کے تعارف و تشہیر کی مہم چلانا، اس کے محکم یقین اور غیر معمولی جرأت و ہمت کا کام تھا۔ اس وقت تک کوئی جماعت مستقبل ہند کے لیے کوئی واضح نظام حکومت پیش نہ کرسکی تھی۔ اس سلسلے میں اس وقت تک صرف تین کوشش کی گئی تھیں:

(۱) ۱۹۲۴ء میں مولانا سندھی کے قیام ترکی کے زمانے میں آزاد ہندوستان کے بارے میں نظامِ حکومت کا ایک خاکہ مرتب کیا تھا لیکن وہ اپنی خوبیوں کے باوجود نہ متعارف ہوسکا اور نہ عوام و خواص کی توجہ حاصل کرسکا۔

(۲) ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سربراہی میں خاص اسی مقصد کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس نے مہینوں کی شب و روز محنت کے بعد ایک نظام مرتب کیا اور ایک شدید کش مکش کے بعد اسے منظور بھی کرلیا گیا۔ لیکن حکومت کے جس چیلنج کے جواب میں اسے تشکیل دیا گیا تھا گورنمنٹ اس سے پھر گئی۔ کانگریس نے اسے واپس لے لیا اور تحریک سول نافرمانی شروع کردی۔

(۳) ۱۹۳۰ء دسمبر میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ لیگ، الہ آباد سیشن میں ایک تجویز پیش کی تھی لیکن وہ صرف ہندوستان کے فرقہ وارانہ سیاسی حل کی طرف اشارہ تھا۔ نظامِ حکومت کی بحث سے اس کا تعلق ہی نہ تھا۔

(۴) مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کی پوری مدت میں مسلمانوں کو اسلامی نظام، قرآنی حکومت، خلافت راشدہ کی مثل، نظام حکومت نعروں سے ورغلایا اور ڈان - دہلی، انقلاب - لاہور اور دوسرے لیگی اخبارات میں ایسے ہر نظام کی مسلسل تردید کی جاتی رہی جس میں اسلام، قرآن، منہاج خلافت یا مولویوں سے کسی قسم کے تعلق کا کوئی حوالہ بھی آ گیا ہو۔ لیگی قیادت کے دینی ذوق اور اسلام سے ان کے اخلاص کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا تو قرآن کی تلاوت کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا لیگ کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ خالق دینا ہال - کراچی کے خاتمے کے بعد منظر عالم ایڈووکیٹ نے کے سوال ''ہم نے تو مسلمانوں سے اسلام اور قرآن کی حکومت کے قیام کا وعدہ کیا ہے۔ اب انھیں کیا جواب دیں اور کیوں کر مطمئن کریں؟'' کا جواب تحریک پاکستان اور پاکستان کے بانی اعظم نے یہ دیا تھا کہ آپ نے وعدہ کیا تھا، پورا کیجیے! میں نے نہیں کیا تھا اور نہ لیگ نے۔ آپ مجھے میرے کسی بیان میں یا لیگ کے کسی ریزولیشن میں دکھا دیجیے؟ لیگ کا یہ مسلک اول روز سے تھا اور وہ اب بھی اسی پر قایم ہے۔

احرار کے تاریخی و سیاسی لٹریچر میں حکومت الٰہیہ کے نظام اور اصول و اساس اور خصوصیات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس وقت تک مسلم لیگ اپنی قرارداد مارچ ۱۹۴۰ء کی تفصیل و توضیح کے باب میں تذبذب میں تھی۔ اس کے رہنماؤں کو ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں کا جغرافیہ بھی معلوم نہ تھا۔ لیگ کی فارن کمیٹی کے تحت سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کی صدارت میں پاکستان اسکیم کی تالیف کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کی رپورٹ کے اعداد و شمار پر اتفاق نہ تھا اور اس کی فنی حیثیت یہ تھی کہ

اسے ناقابل عمل سمجھ کر نظر انداز و فراموش کر دیا گیا، یا اس لیے کہ اسکیم چوں کہ وایسرائے کے ایما پر مرتب کی گئی تھی۔ اور بعد میں اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ لیگ کے جس تذبذب کی طرف کاروانِ احرار کے مؤلف مرزا غلام نبی جانباز نے اشارہ کیا ہے وہ ۱۹۴۶ء تک موجود تھا۔ لیگ نے وزارتی مشن پلان حالات کے دباؤ کے تحت قبول کیا تھا۔ اور ایک ماہ کے اندر اپنے فیصلے سے رجوع کر لیا تھا تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مستقبل کے بارے میں اس کے پاس نہ کوئی منصوبہ ہے اور نہ اپنے اوپر اسے اعتماد ہے۔ گویا کہ تدبر و بصیرت سے محروم اور تذبذب میں مبتلا تھی۔

مجلسِ احرار نے کانگریس اور لیگ سے الگ ہو کر اور اپنی ہی بصیرت اور جرأت و ہمت پر اعتماد کر کے سیاست میں جو روش اختیار کی تھی۔ اس نے ہر دو طرف سے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا تھا اور سیاسی سفر میں بہت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ وقت جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۹ء سے جنگ چھڑ جانے کے بعد ملک مسایل میں الجھتا چلا گیا تھا۔ حالات نے اسے بے دم کر دیا۔ جنگ ختم ہوئی تو شملہ کانفرنس، وزارتی مشن اور پھر ماؤنٹ بیٹن پلان نے ملک کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ۱۹۴۷ء کے بعد تک رہنماؤں پر ایسا وقت گزرا اور ملک کے عوام پر ایسی قیامت ٹوٹی کہ کسی کو اپنی خبر نہ تھی! ملک ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس کے آغاز سے ۳؍ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان تک جن قیامت خیز حالات سے گزر کر جس فیصلے تک پہنچا تھا اس سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔ کانگریس اپنے نصب العین کو نہ پا سکی تھی، لیگ اپنے مقاصد میں ناکام رہی تھی۔ مشرق اور مغرب میں بڑی بڑی آبادیاں تباہ ہو چکی تھیں۔ شمالی، وسطی اور جنوبی ہند کے اہل وطن کی زندگی تہ و بالا ہو چکی تھی۔ پورے براعظم ہند پاکستان پر خوف و دہشت کا عالم مسلط تھا۔ خشکی اور تری نے فساد پھوٹ پڑا تھا۔ اگر مجلسِ احرار اپنے مقاصد سے دور جا پڑی تھی تو اس میں کوئی حیرت اور جواب طلبی کی بات نہ تھی۔ اس نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ اسے نہ متحدہ ہندوستان سے دل چسپی ہے نہ تقسیم ملک کے منصوبے میں اسے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسایل کا حل نظر آتا ہے۔ نہ

آزاد پنجاب کا قیام اس کے زخموں کا مرہم بن سکتا ہے۔ مسلم لیگ کی سیاست نے کانگریس کو زچ کر دیا تھا اور اسے وہ سب کچھ ماننے پر مجبور کر دیا تھا جسے نہ اس کا ذہن مانتا تھا، نہ دل قبول کرتا تھا اور نہ وہ اسے ملک کے مفاد ہی میں سمجھتی تھی، لیکن حالات کے جبر نے اسے منظور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہ مسلم لیگ ہی کو وہ سب کچھ مل سکا تھا جو اسے مطلوب تھا۔ اس نے جو کچھ پایا تھا۔ اس کے وزن کے مقابلے میں نقصانات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ اس کی قیادت کو بٹا لگا اور تاریخِ ملت کی نیک نامی اور تدبر و بصیرت کی داد ملنے کے بجائے بدنامی کی شہرت حصے میں آئی اور پھر جو کچھ جس حال میں ملا تھا۔ اسے بھی برقرار نہ رکھا جا سکا اور اب جو کچھ بچا ہے، وہ بھی داؤں پر لگا ہوا ہے۔

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ملت کے جن بہی خواہوں نے قدم قدم پر غلط راہ روی سے روکا تھا اور ایک بھیانک انجام سے متنبہ کیا تھا، نہ ہم ان کے ساتھ لیگی قیادت کے بے رحمانہ برتاؤ کا ماتم کر سکتے ہیں اور نہ ان کی سیرت کی پختگی، فکر کی دور اندیشی اور خطرات میں پڑ کر بھی فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرنے میں ان کی عزیمت کا جی بھر کر اعتراف کر سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ بڑی ظالم اور اس کی گرفت بہت سخت ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر چارہ نہیں۔ حالات سے مایوسی کفر ہے اور انسان دوستی اور اخوتِ ملی کا تقاضا ہے کہ شکست ملت کی ایک داستان سنا دی جائے۔ کیا تعجب کہ کوئی صاحبِ عزیمت اور رجل کار ظہور میں آئے جو ملت کے غموں کا مداوا بنے اور مستقبل میں اس کی خوش بختی کا سرو سامان کر جائے۔

دسمبر ۱۹۴۳ء:

مجلسِ احرارِ اسلام ہند کی اسپیشل کانفرنس

اور اس کے رہنماؤں کے خیالات

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

آیندہ صفحات میں ہم مجلسِ احرارِ اسلام ہند کی ایک اسپیشل کانفرنس منعقدہ لاہور کی روداد انگریزی میں پیش کررہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ اپنی قرارداد لاہور کو پاکستان کا نام دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کی تشریح و تفصیل سے اسے ہمیشہ گریز رہا۔ مجلسِ احرارِ اسلام نے اپریل ۱۹۴۳ء کے بعد حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین کے اعلان کے ساتھ ملکی سیاسیات میں جو رُخ اور نیا انداز اختیار کیا تھا، اس کی واضح نشان دہی اس کانفرنس کی روداد سے ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف حضرت امیر شریعت کے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ احرار کا موقف بھی واضح طور پر سامنے آجاتا ہے اور اس کی سند حضرت شاہ صاحب، احرار کے دوسرے رہنما مولانا مظہر علی اظہر اور احرار کے ایک اور سرگرم رہنما حافظ علی بہادر خاں کی تقاریر اور ان کے خیالات بھی ہمارے سامنے۔ ان تمام حوالہ جات سے کل ہند سیاسیات میں مجلسِ احرارِ اسلام کے سیاسی موقف اور اس کے طرزِ فکر پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

مجھے حضرت شاہ صاحبؒ کے کسی مجموعۂ تقاریر میں اس کانفرنس کی تقریر صدارت کا سراغ نہیں ملا۔ حال آں کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی اہم تقاریر میں سے ایک ہے۔ یہ ایک اہم تاریخی ڈاکومنٹ ہے اور جس مستند ماخذ سے ہمارے سامنے آیا ہے ضروری معلوم ہوا کہ اس کو اسی شکل میں محفوظ کردیا جائے۔ جہاں تک ۲۵/ و ۲۶/ اپریل ۱۹۴۳ء کو مجلسِ احرارِ ہند کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ سہارن پور کے بعد مجلس کے سیاسی موقف کا تعلق ہے۔ زیرِ نظر تالیف کے دوسرے مشمولات سے بھی اس

پر روشنی پڑتی ہے اور اگرچہ بات تشنہ نہیں رہتی لیکن زیرِ بحث کانفرنس کی یہ روداد اس بحث کا ایک اہم حوالہ ہے۔

یہ کانفرنس ۴ / و ۵ / دسمبر ۱۹۴۳ء کو لاہور میں بیرون دہلی دروازہ منعقد ہوئی تھی۔ اس کا آخری اجلاس ۶ / دسمبر کی صبح کو ہوا تھا۔ کانفرنس کی یہ روداد اینول رجسٹر ۱۹۴۳ء سے ماخوذ ہے:

The All India Ahrar Conference
Special Session-Lahore, 4th. & 5th. December 1943
Proceedings & Resolutions

The special session of the All-India Majlis-i-Ahrar conference opened at Lahore on the 4th December 1943.

The conference was held in a big "Shamianna" in the lawns outside Delhi Gate. Thousands of Mussalmans were Present and among those who participated were a large number of delegates from different parts of the country. Hafiz Ali Bahadur Khan, M.L.A. (Bombay) inaugurated the conference.

While inaugurating the conference he said that the form of government ordained by Quran, which he described as Hakumat- Elahia (the Kingdom of God) was the most suitable form of government. That government would be the most democratic form of government under which justice would be done, both to the Muslims as well as to the non-Muslims.

The Chairman of the reception Committee, Moulana Mohd. Ali. Referred to certain grievances of the Mussalmans of Kalabag and the alleged maltreatment being accorded to them.

Syed Attaullah Shah Bukhari presided over the Conference and spoke for about 2 hours. He concluded his speech at 3am.

"What is there of Islam in you? Do you have faith in the

Holy Quran? Are you prepared to live the life ordained by the holy Quran?" These were some of the questions addressed by Hazrat Moulana Attaullah Shah Bukhari to Mr. Mohammad Ali Jinnah who claimed to be the "Imam Azam" of the Mussalmans, in the course of his last speech at the special session of the All-India Majlis-i-Ahrar Conference which concluded here early in the morning of 6th. December. The Final session commenced at about 9-30p.m. And concluded at 4am. When th President of the conference, Syed Attaullah Shah Bukhari finished his speech before a gathering which he kept spell-bound.

Syed Attaullah Shah Bukhari as also Maulana Mazhar Ali Azhar, M.L.A. in the course of their lengthy speeches pleaded that the form of Government ordained by the holy Quran was the most suitable form of Government. That form was described by the tow speakers as "Hukumat Illahia."

The cry of Pakistan was described by both the speakers as a big hoax and both of them expressed their opposition to it because they maintained that the present leader of that movement did not know his own mind. Without telling the geography of the land which one wanted to possess no one could be owner of any land. Pakistan was described by the speakers as a vote-catching device.

Maulana Mazhar Ali Azhar said: "the Pakistan demand, which has as its background th theory of treating a section of the people as hostages can never be acceptable." "Did not Mr. Jinnah say,"asked Maulana Mazhar Ali, "that if Muslims in the Hindu majority province were maltreated. the Hindus living in the Pakistan area would be maltreated similarly? "This is the type of justice Mr. Jinnah offers to others and then asks them to agree to his proposal of Pakistan."

Proceeding Maulana Mazhar Ali said: "Under Hukumat

Illahia, the form of government ordained by the. Quran no injustice will be done to anyone and .all including the Non-Muslims will be treated fairly and justly."

Maulana Mazhar Ali in the course of his speech referring to the activities of the Communists said that the slogan of congress-League settlement was "a farce started by the communists Party to deceive the people and remain in the public eye." Maulana Mazhar Ali had no hesitation in saying that the demand for the release of Mahatma Gandhi made by the communists was neither sincere nor genuine. It was "a clock to cover their sins." There could possibly be no settlement between the Congress and the League. If communists were really anxious for a Congress. League Settlement they should instead of wasting breath in raising empty slogans do some constructive work by having a settlement between the Muslim League. the Hindu Mahasabha and others who were all free ind then take that formula for settlement to Mahatma Gandhi for acceptance. He felt sure that Mahatma Gandhi would accept it.

Maulana Attaullah Shah Bukhari asserted that the holy Quran. had enjoined absolute non-interference in other religions. and had called upon Muslims to respect the Prophets and founders of all religious.

Appeal was made for the Bengal Relief Fund by Maulana Attaullah Shah Bukhari and Maulana Mazhar Ali as also by Mr. Jehangir Kabir who thanked the Punjab .and other provinces for the help rendered to the distressed people of Bengal.

A resolution was passed strongly protesting against the alleged ill-treatment of the Mussalmans of Kalabag by the Nawab of Kalabag.

دسمبر ۱۹۴۵ء

حضرت امیر شریعت کی ایک اور تاریخی تقریر

۸ر دسمبر ۱۹۴۵ء: ۸، ۹ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں پنجاب پروونشل احرار کانفرنس کا صوبائی انتخابی اجلاس شیخ حسام الدین صدر آل انڈیا احرار کی صدارت میں بیرون دہلی دروازہ منعقد ہوا، جس کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے احرار رہنما امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے رات نو بجے سے صبح ساڑھے چار بجے تک اجلاس سے خطاب کیا اور ملک کے پولی ٹیکل مسایل کے متعلق مجلس احرار کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی، خصوصاً پاکستان کے متعلق احرار کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے فرمایا:

> ''نعرۂ پاکستان مسلم لیگ کا انتخابی اسٹنٹ ہے، جو محض انتخاب جیتنے کے لیے سرمایہ داروں، سروں، خان بہادروں و غیر ملکی حکومت کے پٹھوؤں نے، جن کو دراصل اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں، سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایجاد کیا ہے۔''

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فرمایا:

> ''میں آج اس اسٹیج سے اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کا جو نقشہ بتایا جا رہا ہے اور جس کا نعرہ لگایا جا رہا ہے، بہ حالات موجودہ نہ تو ہندوستان میں ویسا پاکستان بن سکتا ہے اور نہ ہی حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ جو شخص پاکستان اور حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگا کر مسلمانوں سے ووٹ کی بھیک مانگتا ہے وہ انھیں گم راہ کرتا ہے۔
>
> خود ہمارا بھی ہر گز یہ دعویٰ نہیں کہ ہمیں ووٹ دو گے تو ہم فوراً ابوبکرؓ و عمرؓ جیسی حکومت قایم کر دیں گے۔ حاشا و کلا! یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ ہم تو

صرف یہ کہتے ہیں کہ دین کے خادم کی حیثیت سے اگر ہمیں کبھی موقع مل گیا تو اللہ کے فضل وکرم سے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ! جوا، شراب، زنا، چوری، ڈکیتی وغیرہ موٹی موٹی برائیاں ہم ضرور ختم کریں گے۔ ان پر پابندی لگا دیں گے اور ان کے مقابلے میں پورا اسلام تو بہت دور کی بات ہے، اس ملک کی مخلوط آبادی اور اس فضا میں اگر ہم اسلام کے چند بنیادی احکام بھی نافذ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھیں میدان مار لیا اور بڑا جہاد ہو گیا۔ فزت ورب الکعبہ!''

آپ نے تقریر کے اوائل میں ان الزامات کا ذکر کیا جو پاکستان کے مخالف ان مسلمانوں پر جو مسلم لیگ میں شامل نہیں ہیں، مسلم لیگی لیڈروں، اخبارات اور پروپیگنڈا مشینری کی طرف سے لگائے جا رہے ہیں، آپ نے بتایا کہ پچھلے دنوں جب میں کشمیر میں تھا، مجھ پر کھلے بندوں تہمت لگائی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ہندو کے ہاتھ بک چکا ہے، اسے کانگریس نے خرید لیا ہے! میرے محترم دوست میاں افتخار الدین نے جو کل تک کانگریسی تھے، کانگریس سے کٹ جانے کے بعد امرتسر میں جا کر میرے متعلق کہا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کو کانگریس سے رُپیہ ملتا ہے، میں اس اسٹیج سے میاں صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ تو پنجاب صوبہ، کانگریس کے صدر رہے تھے، وہ خود ہی بتائیں کہ انھوں نے کانگریس سے مجھے کب اور کتنے رُپے دلوائے؟

مولانا نے فرمایا کہ مجھے اس بات کا گلہ نہیں ہے کہ مجھ پر تہمت لگائی جا رہی ہے، لیکن اس بات کا گلہ ضرور ہے کہ انتخابات کی گرما گرمی میں مسلمان قوم کا اخلاق بگاڑا جا رہا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کو اپنے بزرگوں، پیشواؤں اور علما کے سامنے ننگے ناچنے، ان کی بے حرمتی کرنے، ان کو قتل کرنے اور ان کی نورانی اور متبرک داڑھیوں میں شراب کی بوتلیں انڈیلنے کی ترغیب دی جا رہی ہے کاش! قوم کے یہ رہ نما سمجھیں کہ وہ مسلمان نوجوان کو کس طرف لے جا رہے ہیں؟

مولانا نے کہا کہ ''ان آنکھوں نے اخبارات میں جب سری نگر میں ابوالکلام

آزاد کے دریائی جلوس میں مسلم لیگیوں کی طرف سے جوتوں کی بارش کا حال پڑھا تو دل مسوس کر رہ گیا، مسلمانوں سوچو کہ تمہارے لیڈر تمھیں کس طرف لے جا رہے ہیں؟ ان لوگوں نے تار دے دے کر مولانا ابوالکلام آزاد کو رہا کرایا، ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی رہائی کا مطالبہ کیا، لیکن شملہ کانفرنس میں جب ان کی کانگریس سے نہ بن سکی تو سرسید کی اولاد جو علی گڑھ میں پل رہی ہے اور کل کی بننے والی اس مسلمان قوم نے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مولانا ابوالکلام آزاد کی بے حرمتی کی، ان نوجوانوں میں ایسے برخوردار بھی تھے، جنھوں نے مولانا کے ڈبے میں داخل ہو کر اپنے پتلونیں اُتار دیں اور اپنی شرم گاہوں کا مظاہرہ کیا۔

میں لیگی مسلمانوں کو پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا تماشا ہے کہ تم مولانا آزاد کو کافر کہتے ہو؟ لیکن یہ تو بتاؤ کہ وہ کافر کب سے بنا ہے، مکے میں پیدا ہونے والے، یکتائے روزگار عالم دین، قرآن کی تفسیر کرنے والے مفسر، صاحبِ نظر محدث اور ایک بلند پایہ مسلمان، جس کی ٹکڑ کا دوسرا عالم ہندوستان تو کیا ساری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا، تم اسے کافر کہہ کر اپنے آپ کو جہنمی بنا رہے ہو! یہ بدسلوکی مولانا ابوالکلام آزاد تک ہی محدود نہیں، اس کی قابل احترام اور پاک دامن بیوی جس کو ساری عمر کسی نے بانقاب یا بے نقاب نہ دیکھا، اس کی موت کے بعد بے حرمتی اسی مسلمان قوم نے کلکتہ میں کی، مولانا جیل میں پڑے تھے، ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا، مسلم لیگی رضا کار لٹھ لے کر کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں کو روکتے رہے کہ بیگم آزاد کے جنازے کی نماز میں شرکت نہ کرو، وہ کافرہ تھی مر گئی ہے، اسے جہنم رسید ہونے دو، میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمہارا اسلام تمھیں یہی تعلیم دیتا ہے کہ یگانۂ روزگار عالم کی دین دار، پردہ دار اور اسلامی تمدن کے گہوارے میں پلی ہوئی عورت کے ساتھ اس کی موت کے بعد یہ سلوک کرو؟

یہاں پر ہی بس نہیں، عہد حاضر کے جدید ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اخلاق کو یو پی کے ریلوے اسٹیشنوں، بازاروں، گلی کوچوں، سڑکوں اور میدانوں میں

انتہائی حد تک رسوا کیا اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالم دین کی بے حرمتی کرنے میں سرسید احمد خاں کی اولاد یہاں تک چلی گئی کہ اس کی ٹوپی جلادی گئی اور اس کی نورانی داڑھی میں شراب کی بوتل انڈیل کر اپنے اخلاق کی انتہائی پستی کا ثبوت مہیا کیا! جانتے ہو علی گڑھ کے نوجوانوں اور بہار کے مسلمانوں نے یہ سلوک کس شخص سے کیا؟ اس مقدس اور متبرک ہستی سے جو آلِ رسول ہے، جو چودہ برس مدینۃ المنورہ میں روضۂ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے بیٹھ کر ہزاروں تشنگانِ دین کو درسِ حدیث و سنتِ نبوی دیتا رہا، جس کے دریائے علم میں نہائے ہوئے آج ہزاروں محدث مدینۂ منورہ سے لے کر ہندوستان اور دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سلوک اس حسین احمد سے کیا گیا جو مدنی کہلاتا ہے، یہ سلوک اس عالم دین اور بزرگ قوم سے کیا گیا جس نے مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کے لیے ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ تب وہ حسین احمد ہمارے مقابلے میں ان کے نزدیک برحق، سچا عالم دین اور شیخ الاسلام تھا؟ لیکن جب الیکشن کے بعد مسلم پرسنل لا، سنی اوقاف ایکٹ وغیرہ، مسلمانوں کے مطالبات منظور کرانے کے متعلق جناح صاحب نے یقین دہانی سے انکار کر دیا، لیگ اپنے وعدوں سے منحرف ہوگئی، مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کا بھرم کھل گیا اور حقیقت ظاہر ہونے پر مولانا مدنی نے لیگ کی حمایت چھوڑ دی تو اب وہی مدنی لیگی لیڈروں اور کارکنوں کے نزدیک کانگریسی ایجنٹ، شیخ الہنود اور گردن زدنی ہوگیا؟

اب سننے والے ہی بتائیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی سے اس قسم کی بدسلوکی کرنے والے عہد حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے میرے جیسے شخص پر جو ان علما کی خاک پا بھی نہیں ہے، یہ الزام لگایا جائے کہ یہ کانگریس کے ہاتھ بک چکا ہے تو میں گلہ کیوں کروں، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن اور دیگر علما سے بدسلوکی کرنے والوں کی ذہنیت پر میں صرف اس لیے روتا ہوں کہ مسلمان قوم کا کیا بنے گا۔

مسلمانو! میں جانتا ہوں کہ آج جذبات کی آندھی چل رہی ہے، پاکستان کے نعرۂ مستانہ نے تم پر ایسی مستی طاری کر رکھی ہے کہ تم وعظ تو میرا سنو گے لیکن ووٹ پھر بھی مسلم لیگ کو دو گے! میرے متعلق کہا گیا ہے کہ میں ہندو کے ہاتھ بک گیا ہوں، مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میری ذات پر تہمت لگائی گئی ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تہمت لگانے والے وہ لوگ ہیں جو دین سے دور، اپنی عاقبت سے بے خبر، دوسروں کی عاقبت خراب کرنے والے، شاتم رسول راج پال کے قاتل، علم دین شہید کے مقدمے کی دس ہزار کی فیس اور فرسٹ کلاس کا کرایہ وصول کرنے والے، قادیانی، اسلام کے سب سے بڑے دشمن کارل مارکس کے خوشہ چین کمیونسٹ، بے دین، خدا کے منکر ہیں۔

مسلمانو! جانتے ہو کارل مارکس کون تھا؟ یہ وہ دشمن اسلام تھا، جو یہودی النسل تھا، جس نے پہلے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور پھر جب اس طرح اسلام تباہ نہ ہوا تو اقتصادیات کا چکر چلا کر مسلمانوں کو بے دین کرنے کا نیا راستہ اختیار کیا، اسی کارل مارکس کو گرو ماننے والے، قرآن کو بوسیدہ کتاب، ناقابل عمل تعلیم، گزرے زمانے کی یادگار کہنے والے، آج ہم لوگوں پر جو مسلمانوں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں اور جن کی روزی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے وابستہ ہے، یہ الزام لگاتے ہیں کہ ابوالکلام ہندو کے ہاتھ بک گیا، حسین احمد کو کانگریس نے خرید لیا، عطاء اللہ شاہ بخاری کو برلا کے خزانے سے رُپیہ ملتا ہے! مجھے اپنی شرم نہیں، بلکہ مسلمانوں اور اس قوم کی ہے جو ہمیں دیتی ہے اور ہم کھاتے ہیں۔

مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ حسین احمد کی داڑھی میں شراب کی بوتل انڈیلی گئی، نہ اس بات کا گلہ ہے کہ بیگم آزاد کے جنازے کی نماز میں شرکت کرنے سے مسلمانوں کو روکا گیا، بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ آج مسلمان قوم کا جو چشم و چراغ مولانا حسین احمد کی داڑھی نوچنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے، کل اپنے ابا سے ناراض ہو کر اس کی داڑھی پر بھی ہاتھ اُٹھائے گا۔ اور مولانا آزاد کے سامنے اپنی شرم گاہوں کا مظاہرہ کرنے والا

اپنے باپ اور ماں کے سامنے ننگا ہو کر ناچنے لگے گا۔

مسلمانو سوچو! مسلم لیگ قوم کو کس طرف لے جا رہی ہے؟ اور جن کے ہاتھ میں کل قوم کی باگ ڈور آنے والی ہے وہ کیا کھیل کھیل رہے ہیں؟

میں نے پاکستان کے مسئلے پر بہت غور و خوض کیا ہے، کئی راتیں نیند کے بغیر بسر کردی ہیں، ساری ساری رات کروٹیں لیتے گزری ہے، مہینوں نہیں سویا، بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔

اس نے مجھے اس قدر پریشان کیے رکھا کہ میری صحت خراب ہوگئی اور میں کشمیر چلا گیا، وہاں بھی سوچتا رہا، جب امرتسر واپس آیا تو مسٹر جناح کا ایک بیان پڑھ کر عقدہ کھلا کر معاملہ کیا ہے! قائد اعظم نے فرمایا ہے:

> ''پاکستان پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگا، اس کا طرزِ حکومت جمہوری ہوگا، اقلیتوں کو خاص نیابت حاصل ہوگی، اس میں مذہبی حکومت نہیں ہوگی اگر ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو میں اس کی مخالفت کروں گا۔ ہندو، مسلمان میں امتیاز نہ ہوگا۔''

پاکستان کی آبادی دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہوگی، جن میں سے چھ کروڑ مسلمان اور چار کروڑ غیر مسلمان ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی آبادی تیس کروڑ پر مشتمل ہوگی، جن میں چار کروڑ مسلمان اور چھبیس کروڑ غیر مسلمان ہوں گے۔ اب ذرا قائد اعظم کے ارشادات کی روشنی میں جائزہ لیجیے کہ یہ کیسا پاکستان ہوگا؟ جن صوبوں کو ملا کر پاکستان بنانا مقصود ہے ان کی اقتصادی پوزیشن پر نظر رکھیے۔ چھ کروڑ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کی تعداد چار کروڑ ہوگی، یہ غالب اکثریت کس قدر مضبوط ہوگی اس کا اندازہ لگائیے!

کارخانے غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہوں گے، اراضی کا بیشتر حصہ غیر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا، سرمایہ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہوگا۔ کالجوں اور اسکولوں کے نظام

پر غیر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ اب سوچیے کہ اس پاکستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ وہ پاکستان میں جا کر خاکستان میں جانے کے مترادف تو نہ ہوں گے؟! جب تک میں زندہ رہوں گا اور جہاں تک میرا بس چلے گا، میں مسلمانوں کو اس قسم کے پاکستان میں نہ جانے دوں گا، انھیں خطرے سے آگاہ کروں گا، اس کے باوجود بھی تباہی میں جائیں تو ان کی مرضی اور خدا کی رضا!

ابھی میں نے خالصہ جی کا ذکر ہی نہیں کیا، جانتے ہو کہ پاکستان کے رقبے میں سکھوں کی پوزیشن کس قدر نمایاں ہے، یہ خالصہ جی ہیں، جنھوں نے (لیگ کے) لاہور سیشن میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہونے کے بعد پنجاب بھر میں ''گھلو کھارا'' ڈے منا کر بتایا تھا کہ خالصہ کس قدر تباہی نازل کر سکتا ہے اور جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، اس میں سکھ کا مذہبی مقام کس قدر بلند ہے، اس کو بھی نظر انداز نہ کیجیے، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مکہ، مدینہ اور اپنے تمام مقدس مقامات بھی سکھوں کے حوالے کر دو تو بھی وہ (پنجاب) چھوڑنے کے لیے تیار نہیں (ہو سکتے!)۔

پاکستان کے متعلق مسٹر جناح نے بیان میں یہ بھی کہا کہ پاکستان کی دس کروڑ آبادی بہ طور ''ایک قوم کے ترقی کرے گی، مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔''

اگر ہم یہ ہی کہیں کہ مسلمان اور غیر مسلمان کو بھائی بھائی کی طرح رہنا چاہیے تو ہم گردن زدنی ہیں!

افسوس! یہ کیسا انصاف ہے! (کاروان احرار: جلد ۶، ص ۳۸۹-۹۴)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!

مارچ ۱۹۴۶ء

احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

اور

حضرت شاہ صاحب کی پیش کردہ قرارداد اور توضیحی تقریر

برطانوی مشن کے ہندوستان پہنچتے ہی جن سیاسی شخصیتوں نے اپنی رائے اور پالیسی کا غیر مبہم اظہار کیا ان میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کی جماعت مجلسِ احرار صفِ اوّل میں ہے۔

جیسے ہی برطانوی مشن کی آمد کا اعلان ہوا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے صدر اور سیکریٹری آل انڈیا مجلسِ احرار کے مشورے پر ۲۵؍ مارچ ۱۹۴۶ء کو لاہور میں ورکنگ کمیٹی کا فوری اور ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ اجلاس میں صدر مجلسِ احرار اور جنرل سیکریٹری کے علاوہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری (لدھیانہ)، سردار محمد شفیع جیوش احرار ہند (چونیاں ضلع لاہور)، صاحب زادہ سید فیض الحسن (آلومہار شریف ضلع سیال کوٹ)، مولانا محمد علی جالندھری، نواب زادہ محمود علی خان رئیس آف کیلاش پور (ضلع سہارن پور)، حافظ علی بہادر ایڈیٹر ہلالِ نور (بمبئی)، مولانا عبدالقیوم پوپل زئی (پشاور)، نواب زادہ نصر اللہ خاں (ضلع مظفر گڑھ)، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی (ضلع ملتان)، حکیم عبدالسلام (ہری پور ہزارہ)، آغا عبدالکریم شورش ہفت روزہ چٹان (لاہور)، صوفی عنایت محمد پسروری (راول پنڈی)، ملک لال دین (لاہور) اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سابق صدر آل انڈیا مجلسِ احرار خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔

قرارداد:

کانفرنس کے اجلاس میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے حسبِ ذیل

قرارداد پیش کی:

''آل انڈیا مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس موجودہ اہم سیاسی مسایل کے متعلق ایک بار پھر اپنی پوزیشن واضح اور غیر مبہم طور پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ

جہاں تک مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے، مجلس عاملہ کسی صورت میں بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ ہم تقسیم ہند کے نظریے کا تجزیہ محض اقتصادی اور معاشرتی اصولوں پر نہیں کرتے۔ پاکستان کے قبول کرنے کا مطلب ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کو تین مختلف حصوں میں منتشر کرنا ہوگا: پنجاب (نامکمل صوبہ)، سرحد، سندھ اور بلوچستان، ہندوستان کے ایک سرے پر اور بالکل دوسرے سرے پر مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع کو پاکستان بنایا جارہا ہے۔

ملت اسلامیہ دو حصوں میں بٹ کر نہیں رہے گی، بلکہ اسے ایک قابل قدر حصے پر ہندوستان میں دوامی غلامی مسلط رہے گی۔ ان دو پاکستانی ریاستوں میں مؤثر غیر مسلم اقلیت موجود رہے گی۔ نیز پاکستان کی یہ دونوں ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کی کسی بیرونی حملے کے وقت امداد نہیں کر سکیں گی اور ان دو ریاستوں کے درمیان ہندوؤں کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سونپ دی جائے گی۔ جس میں مسلم اقلیت کی پوزیشن حد درجے غیر مؤثر رہے گی۔

مزید برآں اب مسٹر جناح نے سکھوں کی علاحدہ سلطنت بنانے کے حق کو تسلیم کر کے پنجاب میں جمنا سے لے کر راوی تک بلکہ چناب تک کا علاقہ مغربی پاکستان سے علاحدہ ہونا درست قرار دے دیا ہے۔ اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنگال اور آسام کے صوبوں کی بھی اسی طرح سے قطع برید ہوگی۔ جس سے مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی پہلے سے

زیادہ بے وقعت اور اقتصادی لحاظ سے بے حال ہو جائے گا۔

ان ٹھوس حقیقتوں کے بعد کوئی ذی شعور جماعت جو مسلمانوں کے تحفظ حقوق کا دعویٰ کرتی ہو، اس مہلک نظریے سے متفق نہیں ہو سکتی۔

مجلس عاملہ اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ یہ تمام خلاف آئین و اخلاقی سرگرمیاں اور محدود حق رائے دہندگی مسلم لیگ کی وقتی کامیابی کی ضامن ہوں گی لیکن مسلم لیگ کی قیادت مسلمانوں کو ایک غیر منظم قوم اور بے ہنگام گروہ کی حیثیت دینا چاہتی ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس کا عمل آج تک ملت اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسلامی قوانین کی مخالفت اس کا مستقل شعار رہا ہے۔ اس لیے مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی رہنمائی کی توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے اور مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامیانِ ہند کا فیصلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

وضاحتی تقریر:

اس قرارداد پر وضاحتی تقریر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

''رفقائے محترم! گذشتہ سال کے وسط میں میں نے دہلی میں پاکستان سے متعلق اپنے خدشات اور دلی اطمینان کے لیے جناح صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے پاکستان کی تھیوری سمجھائیں۔ اگر ان کا نظریہ درست نکلا اور مجھے ذہنی اطمینان نصیب ہوا تو میں ان شاء اللہ حصول پاکستان کے لیے انگریز اور ہندو دونوں سے ٹکرا جاؤں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جناح صاحب نے میری حقیر گذارش کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آج میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا ہے۔

میں صرف، آئینی سمجھوتے میں ہندوستان کی نجات نہیں سمجھتا اور نہ ہی
میرے نزدیک الیکشن کی ہار جیت ملک اور قوم کے لیے نفع بخش ہو سکتی
ہے۔ میں تو ہندوستان میں انگریز سے ایک ایسی لڑائی دیکھنے اور لڑنے کا
متمنی ہوں جس میں گھربار تباہ و برباد کر کے پھانسیاں لگنے کا پروگرام ہو۔
بس یہی پروگرام آزاد ہند کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ جماعت کو الیکشن نہیں
لڑنا چاہیے تھا بلکہ کوئی اور ٹھوس پروگرام سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے۔
پاکستان کے بارے میں گذشتہ سال میں نے جس جگہ بھی تقریر کی
پاکستان کو مسلمانانِ ہندوستان کے لیے مہلک بلکہ ہلاکت آفریں اور
ہلاکت خیز بتایا ہے اور دلایل سے یہ باتیں ثابت کی ہیں۔ میری سمجھ میں
پاکستان کے حق میں کوئی دلیل بھی تو نہیں آئی۔ اس وقت قوم کی زندگی اور
موت کا سوال ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میری رائے مان لی جائے۔ سب ہی
کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس میرے دلایل
کے خلاف کوئی واضح اور ٹھوس دلایل ہوں تو مجھے اپنی قرارداد پر ضد نہیں۔''

جمعیت علماے ہند کی قرارداد:

شاہ جی کی اس تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی نے جمعیت علماے ہند کی حسب ذیل
سہارن پور والی قرارداد کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا:

''جمعیت علماے ہند کے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے عموماً اور مسلمانوں
کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نقاط پر اتفاق کر لیں
اور اس بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کریں:

الف۔ ہمارا نصب العین آزادئ کامل ہے۔

ب۔ وطن کی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا،
مسلم کلچر، تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں

گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

ج۔ ہم ہندوستان میں کامل آزادی اور خودمختاری کے حامی ہیں۔ غیر محدود داخلی اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے اور ان کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہوگا۔

د۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے۔ مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کے مالک نو کروڑ مسلمان نفوس پر مشتمل قوم کسی غالب اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی سیاسی وتہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

۱۔ مرکزی ممبروں کی تعداد کا یہ تناسب ہو۔ ہندو پینتالیس، مسلمان پینتالیس اور دیگر اقلیتیں دس فی صد۔

۲۔ مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخلصانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش ہو تو پاس نہ ہو سکے گی۔

۳۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قایم کیا جائے جس میں مسلم وغیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم وغیر مسلم ججوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گی۔ نیز تجویز نمبر (۲) کے تحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلہ سے

اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے۔

۴۔ محکمہ قضا کا قیام

۵۔ ہندوستانی فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمایندگی ہوگی، تاکہ کسی قوم کی زیادہ نیابت دوسری قوم کے لیے خوف و ہراس کا باعث نہ رہے۔

۶۔ مرکز کی طرف سے پس ماندہ صوبوں میں تعلیم و صنعت کے لیے مستقل عطیہ جات۔

۷۔ اقلیت کے صوبوں میں ذبیح کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

۸۔ ہندوستان میں مختلف حلقوں کے کلچر، زبان، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی عقاید، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

۹۔ دستورِ اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی۔ جس میں تشریح ہوگی کہ مجالس قانون ساز اور حکومت کی جانب سے ان میں مداخلت نہ کی جائے گی۔

اور پرسنل لا کی چیزیں مثلاً احکامِ نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار، بلوغ، تفریق زوجین، عنین و مفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح، مال، وصیت، وقف وراثت، تکفین و تدفین، قربانی وغیرہ۔

۱۰۔ مسلمانوں کے ایسے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے۔ مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا۔"

مجلسِ احرار اور جمعیت علمائے ہند کی یہ مشترک قرار داد تاریخی اعتبار سے دور رس نتایج کی حامل تھی۔ وقتی اور فوری اثرات سے بے نیاز ہو کر احرار رہنماؤں نے اپنی دانست میں مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو مندرجۂ بالا قرار داد کے ذریعے محفوظ سمجھا۔

اپریل ۱۹۴۶

وزارتی مشن سے وفد کی ملاقات

۱۶؍اپریل ۱۹۴۶ء کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت میں حریت پسند مسلمانوں کے ایک وفد نے کیبنٹ مشن سے ملاقات کی اور ملک کی آزادی کی صورت حال اور سیاسی مسئلے کے حل کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس وفد میں مختلف جماعتوں کے مندرجہ ذیل ممبران شریک تھے:

۱۔ مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جمعیت علمائے ہند۔ وفد کے سربراہ تھے۔

۲۔ شیخ حسام الدین صدر مجلسِ احرارِ اسلام ہند۔ اپنی مجلس کی نمایندگی فرما رہے تھے۔

۳۔ شیخ ظہیر الدین ایڈووکیٹ آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر تھے۔ اور اپنی کانفرنس کے نمایندہ تھے۔ شیخ صاحب وفد کے رکن ہونے کے ساتھ وفد کے سکریٹری بھی تھے۔

۴۔ حسین بھائی لال جی (ف ۱۹۷۱ء) صدر آل پارٹیز شیعہ کانفرنس آف انڈیا اسی مشترکہ نقطۂ نظر کی نمایندگی کے لیے شریک وفد تھے۔ یہ حسین بھائی لال جی وہی بزرگ ہیں جن کی صدارت میں اہل تشیع کی تمام جماعتوں کی کانفرنس گزشتہ اکتوبر (۱۹۴۵ء) میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی اور انھوں نے اپنے نہایت مدلل خطبۂ صدارت میں تقسیم ملک کے کسی منصوبے کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔

۵۔ رئیس وفد کے ترجمان کی حیثیت سے سابق وزیر یوپی گورنمنٹ حافظ محمد ابراہیم شریک تھے۔

وفد کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے آدھے گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ آدھا گھنٹہ بھی بہت زیادہ وقت ہے اور اتنی دیر بھی وفد اپنی گفتگو جاری نہ رکھ سکے گا لیکن مشن اس منصوبے کو سن کر اس کی خصوصیات سے ایسا متاثر ہوا کہ سوا گھنٹے

اس منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کر رہا ہے۔ مشن نے وفد کے پیش کردہ منصوبے کی اہمیت اور اس کی عملی حیثیت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔

اس موقع پر حسین بھائی لال جی نے مشن کو ایک یادداشت بھی پیش کی۔ جس میں شیعہ مفاد کے نقطۂ نظر سے تقسیم؟ ملک کے فارمولے کو بہ دلایل رد کیا گیا تھا۔

مورخ ملت مولانا سید محمد میاں ''حیاتِ شیخ الاسلام'' میں فرماتے ہیں:

''۱۶ راپریل ۱۹۴۶ء کو چار بجے شام سے سوا پانچ بجے تک وزارتی مشن کے ارکان سے ملاقات ہوئی۔ مشن نے جمعیت کے فارمولے سے خاص دل چسپی لی۔ حتیٰ کہ مقررہ وقت آدھے گھنٹے کے بجائے سوا گھنٹے تک گفتگو جاری رہی۔ مشن کے ارکان فارمولے کے مضمرات اور اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سوالات کرتے رہے اور ان کے جوابات پر مسرت و اطمینان کا اظہار کرتے رہے۔ اس فارمولے کے ساتھ وزارتی مشن کی دل چسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً ایک ماہ بعد یعنی ۱۶ رمئی کو مشن نے خود جو فارمولا پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بجنسہٖ جمعیت علمائے ہند کا فارمولا تھا۔''

مشن سے گفتگو کے بعد شیخ ظہیر الدین ایڈوکیٹ نے اخباری نمایندوں کو ملاقات کے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرمائے اور پیش کردہ منصوبے کی خصوصیات سے اخباری نمایندوں کو آگاہ کیا۔ اگلے روز کے اخبارات منصوبے کی خصوصیات اور اس کی عملی افادیت کے تذکرے سے بھرے ہوئے تھے۔ منصوبے میں کہا گیا تھا:

(۱) ہندوستان کا دستور حکومت وفاقی اصول پر مرتب کیا جائے۔

(۲) تمام صوبے یا وفاقی وحدتیں مکمل طور پر آزاد ہوں اور غیر مصرحہ اختیارات انھی کو حاصل ہوں۔

(۳) وفاقی مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں۔

(۴) وفاقی وحدتوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے۔

(۵) وفاق کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جس میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کا تحفظ اس طرح کیا جائے جو مسلمانوں کے لیے قابل اطمینان ہو جمعیت علما کی رائے میں یہ اطمینان ذیل کے اصولوں سے کسی اصول پر وفاقی حکومت کی تشکیل سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(ا) مرکزی ایوان میں نمایندگی کا تناسب یہ ہو:

ہندو ۴۵ مسلمان ۴۵ دیگر اقلیتیں ۱۰

جمعیت علما نے اس دفعہ کی روح کو بہ طور اصول پیش نظر رکھا ہے۔

(ب) اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان مرکزی کی ۳/۲ اکثریت اپنی مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی آزادی کے خلاف قرار دے تو قانوناً وہ بل ایوان میں زیر بحث نہ آسکے۔

(ج) ایسا سپریم کورٹ قایم کیا جائے جو مرکز اور صوبوں کے تنازعات، صوبوں کے باہمی تنازعات اور ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کر سکے اور جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو۔ سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کا اختیار مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی ایک ایسی کمیٹی کو دیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ارکان کی تعداد مساوی ہو۔

(د) یا اس کے علاوہ کوئی اور اصول جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے کیا جائے۔

یہ فارمولا پانچ بنیادی دفعات پر مشتمل تھا۔ پانچوں دفعات اور اس کی ضمنی شقوں کا تعلق خاص مسلمانوں کے تحفظات کے لیے تھا۔ ابتدائی چار دفعات کا تعلق ملک کے عمومی مصالح اور قوم کے اجتماعی مفاد میں تھا، جس سے ملک کے عوام اور قوم کی اکثریت اور اس کی نمایندہ جماعت کانگریس کو اختلاف نہیں تھا۔ اور ان چار بنیادی دفعات کو منظور کر لینے کے بعد ان کے مقتضیات کی تکمیل اور مفاد کے تحفظ سے کوئی

معقول شخص انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک ایسے دور میں جب کہ راے عامہ کو ہموار کرنے کی ضرورت بڑھ گئی تھی۔ اور خواص سے عوام تک ایک زبردست تحریک پیدا کر دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ''احرار صفت'' ایسے رجال کار کی ضرورت تھی جو فیصلۂ حق کو ایک ایک شخص کے نہ صرف کانوں تک پہنچائیں بلکہ دلوں میں اتار دیں۔ قدرت نے احرارِ اسلام کی صورت میں علماے حق کی ایک ایسی جماعت کو منظم کر دیا تھا جس نے یامرون بالمعروف وینھی عن المنکر کو اپنی زندگی کا وظیفہ بنا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے رجال کار کو نطق و بیان کی خوبیوں اور زبان کی ایسی صلاحیتوں اور تاثیر سے نوازا تھا کہ اگر اس کی مشیت بھی ہوتی تو ذرا دیر میں دلوں کی بستیوں کو پلٹ دیتیں، لیکن اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا ہی کو منظور نہ تھا۔

فارمولے کی تمام دفعات اور ہر دفعہ اور اس کی ضمنی شقوں کا ایک ایک جملہ عقل و تدبر اور قانون کے مطابق تھا۔ ان دفعات کی تالیف و ترتیب میں احرارِ اسلام کی سیاسی فکر، راے اور مشورہ شامل تھا۔ احرارِ اسلام نے اپنے اثر و نفوذ کے پیچھے تقریباً بیس برس میں خطابت کی ایک زبان، ایک اسلوب، ایک لہجہ اور قوم میں اپنا ایک دائرۂ اثر بنایا تھا۔ اس لیے مذکورہ فارمولے کی تاریخی اور سیاسی اہمیت، اس کی عملی افادیت اور وقت کے پرہجوم دور اور ہنگامی حالات میں اپنے خاص دائرے کا مرد میدان احرار اسلام کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ اگرچہ زندگی کی افراتفری، ذہنی انتشار اور حالات کو سدھارنے سے مایوسی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور مشیتِ الٰہی کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا، لیکن اتمامِ حجت کرنا بھی حکمِ الٰہی ہے اور یہ فرض ادا کرنا اہل حق اور اصحابِ بصیرت پر لازم ہوتا ہے۔

اب ان کے سامنے صبر کا میدان تھا۔ انھوں نے اس کا بھی حق ادا کیا اور گرد و پیش کے حالات میں ملی خدمت کا نیا میدان تلاش کر لیا۔ حضرت امیر شریعت اس دور میں بھی قافلۂ احرار کے نام ور حدی خواں تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی نوازشات اور عنایات و انعامات سے نوازے۔

اپریل ۱۹۴۶ء

مجلسِ احرارِ اسلام (دہلی) کا جلسہ عام

(۲۲ر اپریل ۱۹۴۶)

اور

حضرت امیر شریعت کی تاریخی تقریر

مجلسِ احرارِ اسلام نے اپنے موقف کے مطابق پچھلے چند برسوں میں سخت جدوجہد کی تھی۔ اب اپنی فکر، رائے، موقف کی سچائی اور اس کے اثر وقوت کا آخری مظاہرہ کرنے کے لیے دہلی کا میدان چنا تھا۔ یہ مارچ ۱۹۴۶ء کے آخری ہفتے کی بات ہے۔ احرار قیادت مجلس عاملہ میں ملک کی سیاسی صورت حال پر غور کرنے اور آخری قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ اب ملک کو آزاد کرنے میں برطانوی استعمار تاخیر نہیں کرے گا۔ اور اگر اس نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو پھر شاید اس کی تلافی اس کے لیے ممکن نہ ہو سکے گی۔ چناں چہ اب جان جائے یا رہے، اتمام حجت کا حق ادا کر دینا چاہیے۔

یہ موقع اس لیے اچھا تھا کہ کیبنٹ مشن کے ارکان اور ملک کی سیاسی قوتیں دہلی میں جمع تھیں۔ دنیا کی نظریں مشن کی سرگرمیوں پر لگی ہوئی تھیں اور وقت کا مورخ لکھے جانے والے فیصلے کے انتظار میں تھا۔

یہ ۲۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ مجلس احرار۔ دہلی نے شاہ جہاں کی مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے میدان میں جلسے کا انتظام کیا تھا۔ اس کے سامنے لال قلعے کی سنگین دیواریں مدت سے اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لیے فکر میں ڈوبی ہوئی خاموش کھڑی تھیں۔ قلعے کی برجیاں اُچک اُچک کر میدان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ کسی آنے والے مدبر ورہنما کے اشتیاقِ دید نے انھیں بے قرار کر رکھا

ہے۔ انھوں نے سڑک سے گزرتے ہوئے کسی سے سن لیا تھا کہ ہندوستان کا مایۂ ناز خطیب، جنگ آزادی کا بہادر سپہ سالار، استقامت کا پیکر، ایثار و قربانی کا مجسمہ، سرخیل احرار وطن، داعی حکومتِ الٰہیہ، رئیس الاحرار، امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری آج یہاں منعقد ہونے والے جلسے میں خطاب فرمائیں گے اور بتائیں گے کہ قلعے پر لہراتا ہوا یونین جیک کب تک غرور و نخوت کی اڑانیں بھرتا رہے گا اور آزادیِ وطن کا جھنڈا اس کی جگہ کب لے گا؟

جلسے کا آغاز میں اب دیر نہ تھی۔ عزیمت دعوت کی مجسم تاریخ، استقامت کے پیکر جانشینِ شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اس جلسے کی صدارت اور صدر مجلسِ احرارِ اسلام شیخ حسام الدین اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیں گے۔ اسٹیج کافی بلندی پر بنایا اور سفید چاندنی پر گاؤ تکیوں سے سجایا گیا تھا۔ محترم صدر اور سکریٹری صاحبان کے علاوہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ترجمان مجلسِ احرار ماسٹر تاج الدین، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی وضع و شکل سے دور سے پہچانے جاتے ہیں اور حاضرین کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی ہیں۔ اب جلسہ شروع ہو گیا تھا۔ کئی حضرات نے اپنے افکار کے موتی بکھیرے صاحب صدر نے مختصر جلسے سے خطاب فرمایا، لیکن اب حاضرین جلسہ کی بے چینی حد سے گزرنے والی تھی، ضبط کا دامن چھوٹنے والا تھا کہ مجمع میں ہلچل پیدا ہوئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا کہ ایک شخص اسٹیج پر نمودار ہو رہے ہیں اسٹیج پر پہنچ کر وہ سیدھے کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ ایک پختہ عمر کے بزرگ ہیں چمکتا ہوا گول سرخ چہرہ، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، مانگ کی لکیر نمایاں اور اطراف سے زلفیں بل کھاتی ہوئی کانوں کی لو تک دراز، ہاتھ میں لمبے دستے کا چمکتا ہوا طبر تھا۔ مجمع نعرۂ تکبیر اور احرار زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ حاضرین کی تسکین کے لیے ہاتھ بلند کیے تو طبر سے روشنی کی چنگاری نکلی، لمبا قد، چوڑا سینہ اور گھٹا ہوا جسم، لمبا اور ڈھیلا لباس پہنے، سانچے میں ڈھلا پیکر ظاہر ہوا۔ اندازہ ہوا خطیب اعظم امیر

شریعت حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری اسٹیج پر جلوہ فرما ہیں۔ تاریخ کو انھیں کا انتظار تھا۔ فضا پھر ایک بار اللہ اکبر اور امیر شریعت زندہ باد کے پر جوش اور ایمان پرور نعروں سے گونج اٹھی۔ فضا میں آواز گونجی تحریک آزادی وطن کے سورما، مجاہدین آزادی کے عظیم رہنما امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تشریف لے آئے ہیں۔ مورخ نے اپنا قلم اٹھا لیا۔

حضرت شاہ صاحب نے چاروں طرف پھیلے ہوئے مجمع پر نظر ڈالی، ادھر اُدھر رخ پھیرا ہاتھ بلند کیے گویا کہ مجمع کے پر جوش خیر مقدم کا جواب دے رہے ہیں۔ پھر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اب جلسے کی کارروائی شروع ہوئی کارروائی اختتام کو پہنچی تو شاہ صاحب کھڑے ہوئے اور قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے:

> ''ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آیات خداوندی کا نزول ہو رہا ہے۔ الفاظ جیسے بڑھتے گئے۔ قرآن حکیم اپنے معانی و مطالب خود واضح کرتا چلا گیا۔ لاکھوں انسانوں کا اجتماع پتھروں کا ڈھیر معلوم ہو رہا تھا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ سناٹا ایسا کہ سوئی گرے تو آواز سن لی جائے۔''
>
> (کاروانِ احرار (جلد ہفتم): ص ۱۲۷)

ٹھیک اسی وقت کہ حضرت شاہ نے قرآن پڑھنا شروع کیا تھا، پنڈت جواہر لال نہرو ایک دوست کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن کانوں میں قرآن کی آواز پڑتے ہی انھوں نے قدم روک لیے۔ اور پورے پون گھنٹے تک حضرت شاہ صاحب کی قرأت کے دوران انھیں ہوش نہ رہا کہ وہ کس عالم میں اور کس مقام پر ہیں ان کا دوست بھی مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ وحی الٰہی کی صدائے تاثیر نے ہوش گم کر دیے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے ابھی قرأت ختم ہی کی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو اسٹیج پر آئے، شاہ صاحب کو سلام کیا اور ایک منٹ کی اجازت چاہی۔ حضرت شاہ

صاحب لاؤڈ اسپیکر کے سامنے سے ہٹے اور انھیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پنڈت جی آگے بڑھے اور فرمایا:

''بھائیو! میں شاہ صاحب کا قرآن سننے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ میرے ساتھ سر اسٹیفورڈ کرپس بھی ہیں۔ میں انھیں جلسہ دکھانا چاہتا تھا۔ جن حالات میں کھڑا ہوں اور جن کاموں میں مصروف ہوں، آپ جانتے ہیں۔ کامیابی کے لیے دعا کیجیے۔ میں معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ میرے دوست میرے انتظار میں ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اسٹیج سے اتر گئے۔ اور اپنے دوست کو لے کر آہستہ آہستہ مجمع سے نکل گئے۔

راوی کے بیان کے مطابق شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے صدارتی تقریر پہلے کر لی اس کے بعد شیخ حسام الدین گویا ہوئے اور انھوں نے احرار رضا کاروں کو مستعد رہنے اور انتظامات کو سختی سے قایم رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے جواب میں چاروں طرف سے سیکڑوں طبل بلند ہوئے اور ایک بجلی چمک گئی۔ اب حضرت شاہ صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور اپنے تاریخی اور تحریک آزادی وطن کے عظیم الشان اور فیصلہ کن خطاب کا آغاز فرمایا اور لوگوں سے کہا:

''آپ لوگ درود شریف پڑھ لیں!'' حاضرین نے تعمیل ارشاد کی

حضرت نے خود بھی درود پڑھی تھی، دوبارہ پھر فرمایا: ''درود شریف پڑھیں!'' حاضرین نے دوبارہ تعمیلِ ارشاد کی۔ حضرت نے بھی درود پڑھی۔

حضرت نے تیسری بار پھر یہی ارشاد فرمایا، لوگ حیران ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں کوتاہی نہ کی۔ لوگوں کو حیرانی یہ تھی کہ حضرت شاہ نے پہلے تو کبھی ایسا نہ کیا تھا! بہر حال تیسری بار بھی درود شریف پڑھی ساتھ ہی حضرت امیر شریعت نے بھی درود شریف پڑھی!

حضرت شاہ صاحب جو سامعین کی نگاہوں سے مفہوم کے موتی چن لینے میں

کمال رکھتے تھے۔ حاضرین کے استعجاب کی وجہ سمجھ گئے اور فرمایا:

''آج یہ اس لیے میں نے کیا ہے کہ اتنے بڑے مجمع کے باوجود لوگ کل صبح کے اخبار میں پڑھیں کہ مجمع تو واقعی پانچ لاکھ کا تھا، مگر اس میں مسلمان ایک بھی نہ تھا! اس لیے میں نے درود شریف پڑھوالیا ہے، تاکہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ اس اجتماع میں مسلمان ہیں یا یہ اجتماع ہی مسلمان کا ہے!''

یہ سن کر مجمع کشتِ زعفران بن گیا۔

اس کے بعد حضرت نے خطبہ مسنونہ پڑھا اور ارشاد فرمایا:

''حضرات! آج مجھے کوئی تقریر نہیں کرنی، بلکہ چند حقایق ہیں جنھیں میں بلا تمہید کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں، خواہ دنیا کے اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، اس وقت جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے، جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق سے ہی طلوع ہوگا۔ لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا، جو ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں اس وقت موجود ہے اور جس کے لیے بڑے خلوص سے آپ کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے! سمجھا دو تو مان لوں گا لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد ہے اور بنیادی فرق ہے۔ اگر آج کوئی مجھے اس بات کا یقین دلا دے کہ کل ہندوستان کے کسی قصبے، کسی گلی یا کسی شہر کے کسی کوچے میں حکومت الہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو خدا کی قسم میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ

کا ساتھ دینے کو تیار ہو جاؤں گا، لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ
جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ کے قد پر اسلامی قوانین نافذ
نہیں کر سکتے، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا
رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا، لباس وغیرہ کوئی چیز بھی
اسلام کے مطابق نہ ہو وہ دس کروڑ انسانوں کے ایک قطعۂ اراضی پر
اسلامی قوانین کس طرح نافذ کر سکتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک فریب
ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوں!

پھر آپ نے کلہاڑی کو ہاتھ میں بلند کیا اور تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان اور
مغربی پاکستان کا نقشہ سمجھانا شروع کر دیا۔ آپ نے کہا:

''ادھر مشرقی پاکستان ہوگا، ادھر مغربی پاکستان ہوگا۔ درمیان میں ہندو کی
تیس کروڑ کی آبادی ہوگی، جس پر اس کی اپنی حکومت ہوگی (جس کی تنگ
نظری، تعصب اور اسلام دشمنی کی داستانیں ہر روز آپ کو اخبارات میں
پڑھائی جاتی ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد وہ
آپ کو چین سے جینے دے گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو یقین رکھیے کہ وہ) پاکستان
کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ اسے کمزور کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔
اس تقسیم کی بہ دولت (بے شمار مسایل پیدا ہوں گے) آپ کے دریاؤں کا
پانی روک دیا جائے گا۔ آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی
اور آپ کی حالت یہ ہوگی کہ بہ وقت ضرورت مشرقی پاکستان، مغربی
پاکستان کی اور مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کی کوئی بھی مدد کرنے سے
قاصر ہوگا۔ اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی
اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان
ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ فرنگی سامراج کے خود کاشتہ پودے، سروں،
نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان ہوں گے جو اپنی من مانی کارروائی

سے محبِ وطن اور غریب عوام الناس کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔
غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گا۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان
کے کسان اور مزدور نانِ شبینہ کو ترس جائیں گے۔ امیر دن بہ دن امیر تر
اور غریب دن بہ دن غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔''

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ حضرت امیر شریعتؒ اپنی سیاسی بصیرت کے موتی بکھیر رہے تھے۔ مستقبل سے نا آشنا (اور تحریک کے انجام سے بے خبر) مسلمان منہ کھولے انجانے واقعات کو حیرت و استعجاب کے عالم میں سن رہے تھے۔ شاہ جی نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان کی بنیاد ہندو کی تنگ نظری، مسلمان دشمنی (اور خوف و خطرات) پر استوار ہوئی ہے۔ دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے گائے کی پوجا کی۔ پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے، چیونٹیوں کے بلوں پر شکر اور چاول ڈالے۔ سانپ کو اپنا دیوتا مانا، لیکن مسلمان سے ہمیشہ نفرت کی۔ اس کے سائے تک سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ذات پات کے پجاری بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دیے، لیکن مسلمان کے لیے اپنے دل کے دروازے کبھی وا نہ کیے۔ اسی تعصب، تنگ نظری اور حقارت آمیز نفرت کا یہ نتیجہ (ہمارے سامنے) ہے کہ مسلمان اپنا الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے اور کانگریس سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی مصلحتوں کی بنا پر خاموش رہی۔ اگر کانگریس کے رہنما ہندو مہا سبھائی، جن سنگھی، انتہا پسند اور اس قسم کی تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے اور وہ یہ کر سکتے تھے تو مسلم لیگ کو یہاں پنپنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی! مگر کیا کیا جائے کہ یہ کوڑھ کانگریس کے اپنے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر سے پیدا ہوا اس کا علاج محض باہر کے اثرات سے نہیں ہو سکتا۔ کانگریس نے ہمارے ساتھ

بھی نباہ نہ کیا اور اگر مسلم لیگ سے بگاڑ پیدا کیا تھا تو نیشلسٹ مسلمانوں ہی
کی بات مان لی ہوتی لیکن ایسا بھی نہ ہوسکا اور ہوا کیا؟ (اس کا نتیجہ یہ نکلا)
کہ آج اس قدر قربانیوں کے باوجود دونوں فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے
ہیں۔ کون فرنگی؟ جو ہندوستان کے باسیوں کے لیے کبھی بھی صحت منداور
انصاف پر مبنی فیصلہ نہیں دے گا۔ اے کاش! کانگریس نے ہم سے نہیں تو
مسلم لیگ ہی سے بنائے رکھی ہوتی تاکہ آپس میں مل بیٹھ کر کوئی صحیح حل
تلاش کرلیا جاتا۔ (اور انگریز کو دخل دینے کا موقع نہ ملتا)۔''

رات کافی گزر چکی تھی، سحر قریب تھی اور حضرت امیر شریعت بے تکان بولے جا رہے تھے اور اپنے افکار کے موتی بکھیر رہے تھے۔ کیا مجال کہ ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے ہلا ہو اور کسی نے پہلو بدلا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ زندہ انسان نہیں بلکہ پتھر کی بے جان و بے زبان مورتیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ آخر میں حضرت امیر شریعت نے زوردار آواز میں کہا، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

میر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے!

''یاد رکھو! اگر تم آج باہم مل بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو وہ تمہارے حق
میں بہتر ہوتا۔ تم الگ الگ ہو کر بھی باہم شیر و شکر رہ سکتے تھے مگر تم نے
اپنے تنازعہ کا انصاف فرنگی سے مانگا ہے اور وہ تم دونوں کے درمیان کبھی
نہ ختم ہونے والا فساد پیدا کر کے جائے گا، جس سے تم دونوں قیامت تک
چین سے نہیں بیٹھ سکو گے اور آئندہ بھی تمہارا آپس کا کوئی سا تنازعہ باہمی
گفتگو سے کبھی طے نہیں ہو سکے گا۔ آج انگریز کے فیصلے سے تم تلواروں
اور لاٹھیوں سے لڑو گے تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔
تمہاری اس نادانی اور من مانی سے اس برصغیر میں انسانیت کی جو تباہی
ہوگی، عورت کی جو بے حرمتی ہوگی، اخلاق و شرافت کی قدریں جس طرح

پامال ہوں گی، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ یہاں وحشت و درندگی کا وہ دور دورہ ہوگا کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہوگا، انسانیت اور شرافت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ نہ یہاں کسی کی عزت محفوظ ہوگی اور نہ جان و مال نہ ایمان! اور تم جانتے ہو، اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ تم دونو! لیکن تم یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتے، تمہاری آنکھوں پر تمہاری اپنی خود غرضیوں اور ہوس پرستیوں نے پردے ڈال رکھے ہیں اور تم ایک ایسے شخص کی مانند ہو جو عقل رکھتا ہے لیکن صحیح بات سوچنے سے عاری ہے، کان ہیں مگر سن نہیں سکتا، آنکھیں ہیں لیکن ان کی بصیرت چھن چکی ہے۔ اس کے سینے میں دل دھڑک رہا ہے مگر احساسات سے خالی اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ. (سورۂ حج: ۴۶)"

ابھی تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی اور حضرت امیر شریعت نے دہلی والوں سے کہا:

"میری یہ بات یاد رکھنا، حالات بتا رہے ہیں کہ اب زندگی میں جیتے جی پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

حضرات یہ تھے وہ چند حقائق جن کو میں بغیر کسی تمہید کے (صاف صاف آپ سے کہہ دینا) چاہتا تھا، میں نے کہہ دیے اور اب۔

مانو نہ مانو جانِ جہاں تم کو اختیار
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

۱۹۴۶ء

قلندر ہر چہ گوید.....

احرار رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے دہلی میں تقریر کے دوران اِن پانچ باتوں کی نشان دہی کی؛

(۱) اِدھر مشرقی پاکستان ہوگا۔ اُدھر ایک ہزار میل کے فاصلے پر مغربی پاکستان ہوگا اور درمیان میں ہندوؤں کی تیس کروڑ کی آبادی ہوگی۔ وہ حکومت لالوں کی حکومت ہوگی۔ ہندو مکار ہے۔ وہ ہمیشہ پاکستان کو تنگ کرتا رہے گا۔

(۲) آپ کی حالت یہ ہوگی کہ بہ وقتِ ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی کوئی امداد کرنے سے قاصر ہوگا۔

(۳) تمہارے دریاؤں کے پانی روک لیے جائیں گے۔ اس طرح آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں اور صنعت کاروں کے خاندان ہوں گے۔ جو اپنی من مانی کارروائیوں سے عوام الناس کو پریشان کریں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور غریب مزدور نانِ شبینہ کو ترس جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں امیر دن بہ دن امیر تر اور غریب دن بہ دن غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔

(۵) تم دونوں (ہندو اور مسلمان) نے (تقسیم کے وقت) فرنگی سے اپنا انصاف مانگا ہے۔ یاد رکھو! وہ تم دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا فساد ضرور پیدا کر جائے گا کہ تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکو گے۔ آج تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑتے ہو، آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔

سیاست دان نہ تو پیغمبر ہوتا ہے کہ اس کی بات خدا کی بات مانی جائے اور نہ ہی

دلی ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ سے اجتناب کرے۔ سیاست سوچ اور فکر کی ایک گیم ہے۔ اس میدان میں بڑے سے بڑا کھلاڑی بھی مات کھا سکتا ہے۔ پھر سیاست حرفِ آخر بھی نہیں کہ اس کے فیصلے متحرک نہ ہوں۔ اگر یہ سب حقیقت ہے تو ان نکات پر غور کریں، جن کا شاہ جی نے دہلی میں اپنی تقریر میں اشارہ کیا ہے۔

یہ بات تو انگریز سیاست دان سر اسٹیفورڈ کرپس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا ایک ساتھ ربط کیسے قایم رہ سکتا ہے، جب کہ دونوں کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اور درمیان میں تیس کروڑ ہندوؤں کی حکومت ہے جو دوست نہیں۔ بحری، بری اور فضائی راستے بھی اس کے اقتدار میں ہیں۔ وہ جب چاہے سیاسی ضرورت کے تحت یہ راستے روک سکتا ہے۔ چناں چہ گنگا ہائی جیکنگ کیس ہمارے سامنے ہے کہ اس کے بعد بھارت گورنمنٹ نے پاکستان کا کوئی جہاز مشرقی پاکستان نہیں جانے دیا تا آنکہ مشرقی پاکستان ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل گیا۔

یہ کہنا کہ ہندو اور انگریز تقسیم کے خلاف تھے۔ سیاسیات سے ناسمجھی کی بات ہے دراصل دونوں ہی تقسیم کے حق میں تھے۔ انگریز اس لیے کہ اس کی اپنی اقتصادی حالت اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی نوآبادیات پر مزید قبضہ رکھ سکے۔ لیکن جانے سے پیشتر وہ برصغیر کو اس انداز میں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ یہاں کے لوگ امن اور سکون سے نہ رہ سکیں۔

ہندو تقسیم کا اس لیے خواہش مند تھا کہ وہ بلا شرکتِ غیرے ہندوستان پر قابض ہو۔ ورنہ راج گوپال اچاریہ جیسا کٹر ہندو پاکستان کے حق میں کبھی آواز بلند نہ کرتا۔ اس کے ساتھ ہی ہندو عوام کو پریس کے ذریعے یہ بات سمجھا دی گئی کہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہو تا کہ مسلمان اس مطالبے سے انحراف نہ کر جائے اور جذباتی مسلمان صرف اسی بنیاد پر پاکستان کا ہم نوا ہوا کہ ہندو اس کا مخالف ہے۔

بنا بریں شاہ جی کی قبل از وقت یہ دونوں باتیں (۱۔۲) ان کی سیاسی بصیرت کی

دلیل کہی جا سکتی ہیں۔

''تمہارے دریاؤں کے پانی روک دیے جائیں گے۔'' اس سلسلے میں دریاؤں کی پوزیشن سمجھ لینی چاہیے۔

(۱) دریائے جہلم کشمیر کے ''جل ارم'' مقام سے نکل کر تریموں ہیڈ پر چناب سے ملتا ہے۔

(۲) دریائے چناب کشمیر سے نکل کر سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا، جھنگ اور مظفر گڑھ میں بہتا ہے۔

(۳) دریائے راوی بھارت سے نکل کر لاہور، سیالکوٹ، شیخوپورہ، ساہیوال اور ملتان سے گزرتا ہے۔

(۴) دریائے ستلج بھارت سے نکل کر پاکستان میں ''قصور'' کے مقام سے داخل ہوتا ہے اور پنجند پر جہلم اور راوی سے ملتا ہے۔

(۵) دریائے بیاس بھارت سے نکل کر ''قصور'' کے مقام سے پاکستان میں داخل ہو کر پنجند پر جہلم، چناب اور راوی سے ملتا ہے۔

(یہ پانچوں دریا ''مٹھن کوٹ'' کے مقام پر دریائے سندھ سے ملتے ہیں)

تقسیم کے وقت جب دریاؤں کا مسئلہ زیر بحث آیا تو ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف مسٹر لیونارڈ موسلے اپنی کتاب ''برطانوی راج کے آخری ایام'' میں لکھتا ہے:

> ''جس وقت لارڈ ریڈکلف پنجاب تقسیم کر رہے تھے، تو انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب کے دریاؤں اور ان کے نہری نظام کو مشترک رکھا جائے۔ مسٹر محمد علی جناح اور پنڈت نہرو نے اس تجویز کی پرزور مخالفت کی مسٹر جناح نے ریڈکلف سے کہا، آپ اپنا کام کیجیے۔ پاکستان خواہ ریگستان بن جائے لیکن ہم نہری پانی کے لیے ہندوؤں کا احسان نہیں لیں گے۔ مسٹر نہرو نے ریڈکلف سے کہا کہ یہ ہندوستان کی مرضی ہے کہ وہ

اپنے دریاؤں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔''

(ہفت روزہ اخبار جہاں - کراچی: ۱۳ر جنوری ۱۹۷۱ء)

پھر ہندوستان نے مختلف حیلے بہانوں سے دریاے چناب اور دریاے راوی کے رخ کس طرح موڑ لیے، یہ کہانی اخبارات میں روزانہ پڑھنے کے لیے آتی رہی، جیسا کہ اخباری تراشے ذیل میں درج ہیں۔

''بھارت سے نہری پانی کا جھگڑا

پاکستان بننے سے پہلے موجودہ علاقوں میں سے پنجاب اس اعتبار سے ترقی یافتہ تھا کہ یہاں نہروں کا نظام قایم کیا جاچکا تھا اور پانچ دریاؤں ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم پر مختلف بند باندھ کر نہریں نکالی گئی تھیں۔ پنجاب کی تقسیم کرنے والے باؤنڈری کمیشن کے سربراہ ریڈکلف نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ

''مجھے یقین ہے کہ نہری پانی کے سلسلے میں دونوں حکومتیں جو معاہدہ بھی کریں گی اس میں اس امر کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جائے گا کہ ان نہروں کے ہیڈورکس کس ملک میں واقع ہیں۔''

اس سلسلے میں ایک ٹریبونل بھی مقرر کیا گیا تاہم اپریل ۱۹۴۸ء میں مشرقی پنجاب کی حکومت نے ان تمام نہروں کا پانی بند کر دیا جو پاکستانی علاقے کو سیراب کرتی تھیں اور دعویٰ کیا کہ اس پانی پر تمام تر ہماری ملکیت ہے۔ اس مسئلے پر بھارت سے دوطرفہ مذاکرات بھی ہوئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیوں کہ بھارتی حکومت اپنی ضد پر قایم رہی۔

اس سلسلے میں ورلڈ بنک کے صدر جین بلیک کے ساتھ معروف ماہر آبپاشی ولیم للنتھل کے منصوبے کے مطابق دونوں حکومتوں کو یہ تجویز پیش کی گئی کہ بھارت تین دریاؤں یعنی ستلج، بیاس اور راوی کے پانیوں سے مکمل فائدہ اٹھائے اور پاکستان کو اس کے بدلے کچھ رقم ادا کرے۔ جب کہ

پاکستان چناب، سندھ جہلم کے پانیوں کو ذخیرہ کرے اور ان دریاؤں سے لنک نہریں نکال کر راوی اور ستلج میں ڈالی جائیں تاکہ ان میں پانی آ سکے اور آگے نہروں کو دیا جا سکے۔ دونوں ملکوں کے مابین کئی برس تک اس قسم کے مختلف منصوبوں پر بحث جاری تھی حتیٰ کہ ۱۹۶۰ء میں جب کہ پاکستان میں ایوب خان صدر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے، سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا، جس پر پاکستان کی طرف سے ایوب خان، بھارت کی طرف سے پنڈت نہرو اور ورلڈ بنک کی طرف سے اس کے نائب صدر نے دستخط کیے۔''

سندھ طاس کا معاہدہ

(۱) ستلج، بیاس اور راوی کے دریاؤں کے پانی پر بھارت کے حقوق ملکیت تسلیم کر لیے گئے اور دس سال کے عرصے کے بعد یعنی مارچ ۱۹۷۰ء کے اختتام پر پاکستان کا ان کے پانی پر کس طرح کا کوئی استحقاق باقی نہیں رہا۔

(۲) چناب، جہلم اور سندھ کے پانیوں پر حکومت پاکستان کا تصرف تسلیم کیا گیا، البتہ ان دریاؤں کی بالائی گزرگاہوں میں جو بھارتی علاقوں میں واقع ہوں، یہ طے پایا کہ بھارت مخصوص مقاصد کے لیے ان سے محدود تعداد میں پانی لے سکتا ہے۔

(۳) طے پایا کہ پاکستان ان علاقوں کی آب پاشی کے لیے جو ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ستلج، راوی اور بیاس کے پانی سے سیراب ہو رہے تھے، متبادل تعمیراتی منصوبے بنائے گا، جس میں نہریں اور ذخائر شامل ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے بھارت، پاکستان کو ۸۲ ملین اسٹرلنگ پاؤنڈ ادا کرے گا۔

(۴) دونوں ممالک اس معاہدے کے ضمن میں کسی قسم کی مزید بحث یا

تصفیہ طلب مسئلے کے لیے کمیشن مقرر کریں گے۔
ورلڈ بنک نے پاکستان کو متبادل منصوبوں کے لیے امداد کا وعدہ کیا۔"
(نوائے وقت-لاہور: ۶/ مارچ ۱۹۸۱ء)

چند خبریں:

لاہور-۲۰/ اکتوبر (وقائع نگار) بھارت نے دریائے راوی پر ایک اور بیراج تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ نیا بیراج راوی کے بالائی علاقے میں "مادھو پور بیراج" سے کافی اوپر تعمیر کیا جارہا ہے تاکہ برسات کے موسم میں راوی کے پانی کو روک کر اسے آب پاشی کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے باوثوق ذرائع کے مطابق نئے بھارتی نہری بیراج کا نام "تھانم ڈیم" ہوگا اور یہ مادھو پور بیراج سے تقریباً سو میل اوپر ہوگا۔ دریائے راوی ان تین دریاؤں میں سے ایک ہے جن پر سندھ کے نہری پانی کے معاہدے کے تحت بھارت کا مکمل حق تسلیم کیا گیا ہے۔ مادھو پور بیراج جو تقسیم ملک سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا، بھارتی پنجاب کے ضلع گورداس پور میں واقع ہے۔ "اپر باری دوآب نہر" میں پانی پہلے اسی بیراج سے آتا تھا مگر یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو بھارت نے اس نہر کا پانی بند کردیا تھا۔ اپر باری دوآب نہر میں پانی کی کمی دور کرنے کے لیے ہی پاکستان نے سندھ طاس کے منصوبے کے تحت "مرالہ راوی لنک" بنائی تھی تھانم ڈیم کی تکمیل کے بعد پاکستان کو موسم برسات میں راوی کے سیلاب سے نجات مل جائے گی۔ تاہم سردیوں میں یہ دریا بالکل خشک ہوجائے گا۔

لاہور-۱۸/ جنوری (پ-ر) بھارت دریائے چناب پر جو بند تعمیر کر رہا ہے وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۷۸ء میں طے پانے والے سمجھوتے کے عین مطابق ہے۔ ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی اخبارات میں شائع ہونے والی یہ خبر کہ بھارت نے مقبوضہ جموں اور کشمیر میں دریائے چناب کا رخ موڑنے کے لیے ایک بند کی تعمیر شروع کردی ہے۔ اس خبر سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ بھارت نے دریائے چناب کے پانی پر تصرف کیا ہے۔ حال آں کہ اصل صورت حال

یہ نہیں۔اصل میں بھارت سلال کے مقام پر پن بجلی گھر تعمیر کر رہا ہے، جس پر اپریل ۱۹۷۸ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان سمجھوتہ طے پایا تھا اور وزرائے خارجہ نے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے۔''سلال پلانٹ'' دریائے چناب کی ایک بالائی شاخ پر تعمیر کیا جارہا ہے۔جب کہ نچلے حصے سے پانی معمول کے مطابق دریا میں بہتا رہے گا اور پاکستان کو اس کا حصہ ملتا رہے گا۔

پاکستان نے بھارت کے وزیر آب پاشی ایس کے پاٹل کی ان تقریروں کے خلاف عالمی بنک سے احتجاج کیا ہے جن میں سندھ طاس کے دریاؤں کا پانی بند کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔سرکاری ترجمان نے کہا ہے کہ اگر پاکستان کو پانی سے محروم کیا گیا تو اسے جارحانہ اقدام تصور کیا جائے گا۔ترجمان نے کہا کہ عالمی بنک سے جو گفت وشنید ہورہی ہے، اس کے بارے میں یہ طے تھا کہ کوئی فریق اس کی نوعیت کا انکشاف نہیں کرے گا۔مگر بھارت کے وزیر نے یہ انکشاف کر کے اس سمجھوتے کی خلاف ورزی کی ہے۔ (روزنامہ امروز-لاہور: ۱۰راگست ۱۹۷۵ء)

''غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ امرا کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور غریب نانِ شبینہ کو ترس جائیں گے۔اس کے نتیجے میں امیر دن بہ دن امیر اور غریب دن بہ دن غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔''

شاہ جی کے اس خدشے کی تصدیق اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر نے ۱۹۶۴ء کو اپنی سالانہ رپورٹ میں ان الفاظ میں کی:

''عام طور پر شکایت پائی جاتی ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جارہے ہیں۔''

(ہفت روزہ اخبار جہان-کراچی: ۲۷رجنوری ۱۹۷۱ء)

''تم دونوں نے فرنگی سے اپنا انصاف مانگا ہے۔یادرکھو! آج اگر تلوار یا

اینٹوں یا پتھروں سے لڑتے ہو تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے

لڑو گے۔"

پہلے پہل ۱۹۲۳ء میں ملتان سے ہندو مسلم فساد شروع ہوا۔ اس میں فریقین نے اینٹ پتھر اور ڈنڈے استعمال کیے تھے۔ اسی دور کی ایک پنجابی نظم کا مصرعۂ اولیٰ یاد ہے:

چل نی بھابو اٹاں مار

مسلے آ گئے وچ بازار

"ماں! چھت پر چڑھ کر اینٹیں برساؤ کہ مسلمان بازار میں آ گئے ہیں۔"

پھر یہی فرقہ وارانہ لڑائی دستی بموں اور تلواروں تک آن پہنچی۔ تقسیم ہند کے جواز میں یہ بات بھی سننے میں آئی کہ ہندو مسلم فساد کو روکنے کا واحد ذریعہ ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی تقسیم ہے۔ لیکن جب برصغیر تقسیم ہو چکا تو ہندو مسلمان پھر بھی لڑتے رہے۔ البتہ پہلے اینٹوں اور پتھروں سے لڑتے تھے۔ اب توپوں، بندوقوں اور ہوائی جہازوں سے لڑتے ہیں۔

شاہ جی نے درست کہا تھا کہ آج تلواروں سے لڑتے ہو تو آنے والے کل کو توپوں اور بندوقوں سے لڑو گے۔ چناں چہ پاک بھارت جنگیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔

❀

"انگریز تم دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا فساد ضرور چھوڑ جائے گا کہ تم

قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکو گے۔"

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے چونتیس پینتیس برس گزر چکے لیکن ریاست کشمیر کا قضیہ پاک بھارت کے درمیان ایک مستقل فساد کی صورت بن ہوا ہے۔ اسے لارڈ مونٹ بیٹن کی بد دیانتی کہیے، قادیانیوں کی سازش کہیے یا ہندو کی سیاسی چال کہ یہ جھگڑا طے ہونے میں نہیں آتا۔ حال آں کہ ۳؍ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان میں گورداس

پور پاکستان کے نقشے میں تھا۔ لیکن نہ جانے راتوں رات اس نقشے پر کس نے لکیر پھیر دی۔

بہر حال انگریز اور اس کی روحانی اولاد نے پاکستان اور بھارت کے درمیان فساد کی ایک ایسی دیوار کھڑی کی ہے کہ برس ہا برس گزرنے پر بھی سکون نہیں۔

مستقبل کا مؤرخ شاہ جی کی تقریر پر کیا عنوان قایم کرے گا۔ یہ مستقبل کی بات ہے، مستقبل جانے، لیکن بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کہ عطاء اللہ کی باتیں عطاء الٰہی ہیں۔

شاہ جی کے ان الفاظ کی تائید میں مسلم لیگی رہنما مسٹر ممتاز محمد خان دولتانہ کے انٹرویو کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو انھوں نے قومی ڈائجسٹ کے سال نامہ ۱۹۸۱ء میں دیا:

> ''اگر اس ایوارڈ کی بجائے یہ صورت ہی ہو جاتی کہ ہندو اور مسلمان خود مل کر تقسیم کر لیتے تو شاید یہ بہتر ہوتا کہ ایسی صورت میں انگریز کا شر تو اس میں شامل نہ ہوتا۔'' (ص ۴۵)

بہ قول علامہ اقبال

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

(کاروانِ احرار (جلد ہفتم)، ص: ۱۴۰-۱۳۲)

۱۹۴۶ء

وزارتی مشن پلان اور مسلم لیگ

منظوری اور گریز

۱۹۳۷ء کے بعد ملک کی سیاسی فضا میں جو تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی تھی اور ۱۹۴۰ء کے بعد حالات نے جو پلٹا کھایا تھا۔ ان کا تقاضا تھا کہ اصحابِ نظر و تدبر اپنے اندازِ سیاست پر غور کریں۔ مجلس احرارِ اسلام نے وقت کے اس تقاضے کا جواب دینے میں کوتاہی کی نہ تاخیر! دوسری عالمی جنگ کے پیدا کردہ اثرات و حالات نے ان کی بصیرت میں اضافہ اور احساسات و افکار کو اور پختہ کر دیا۔ جنگ کے خاتمے اور اس کے نتایج کے سامنے آنے سے پہلے برٹش استعمار کو یقین ہو گیا کہ اب وہ مشرقی ایشیا کے براعظم ہند پاکستان میں اپنے اقتدار و استحصال کو برقرار نہیں رکھ سکے گا تو اس نے ہند پاکستان کے انقلابیوں اور حریت پسندوں کو رہا کرنا شروع کر دیا، لیکن اب استعمار کے شاطر شملہ کانفرنس منصوبے کی شکل میں ایک نیا جال لائے تھے۔ لیکن گزشتہ تین چار برس کے، تجربات نے حریت پسندوں کو بھی اتنا ہوشیار اور پختہ فکر کر دیا تھا کہ وہ ان شاطروں کا شکار ہو کر وطن کی آزادی کو ان کے لیے لقمہ تر بنانے کے لیے تیار نہ ہو سکے اور کانفرنس ناکام ہو گئی۔

برطانوی حکومت پہلے ہلّے ہی میں کامیابی حاصل نہ کر سکنے پر بے چین نہ تھی۔ ایک چالاک شکاری کی طرح اب وہ ایک اور نیا جال بچھا رہی تھی۔ شملہ کانفرنس میں وایسرائے لارڈ ویول کا ترتیب دہ ایک پلان بحث و نظر کا موضوع تھا۔ کیبنٹ مشن کا طرزِ سیاست دوسرا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس کوئی تجویز اور مشورہ نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں سیاست دانوں سے مل کر مسئلے کا حل ڈھونڈے گا۔ مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچا تھا۔ ۲۵ مارچ کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مشن کے سرغنہ لارڈ پیتھک لارنس نے کہا تھا:

''ہم کوئی تجویز یا فارمولا لے کر نہیں آئے، تاہم یہ ارادہ لے کر ضرور آئے ہیں کہ ہندوستانی لیڈروں سے مذاکرات کے بعد ایسا خاکہ بنایا جائے گا جس کے تحت ہندوستان کے لیے مکمل ڈومنین اسٹیٹس کا انتظام ہو سکے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس ہسٹری کو جلد مرتب کریں اور درمیانی عرصے کے لیے انتظامات فی الفور کیے جائیں۔

آزادی اور حق خود اختیاری کا فیصلہ اصولی طور پر ہو چکا ہے۔ اب ہمیں باہمی اعتماد سے کوئی ایسی راہ نکالنی ہے کہ ہندوستانی اپنے نئے دستور اساسی کے متعلق باہمی طور پر فیصلہ کریں۔ اس میں اضطراب کم ہو اور آسانی زیادہ۔ یہ بھی لازمی ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستانی ریاستوں کو بھی دعوت دی جائے کیوں کہ انھیں بھی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق نمایاں حصہ لینا ہے۔'' (کاروانِ احرار: (جلد ہفتم)، ص ۷۸)

اس بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا کہ مشن کے ذہن میں کوئی تجویز نہ ہو اور وہ بالکل خالی الذہن ہندوستان پہنچا ہو! لیکن اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی تھا تو مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کی پہلی ملاقات ہی میں مشن کو بات آگے بڑھانے کی ایک بنیاد مل گئی اور گفتگو کا ایک رخ متعین ہو گیا۔ مولانا فرماتے ہیں:

''میں کیبنٹ مشن کے ممبروں سے پہلی مرتبہ ۶؍اپریل ۱۹۴۶ء کو ملا۔ مشن نے تبادلۂ خیال کے لیے پہلے سے کچھ سوالات تیار کر لیے تھے۔ پہلا سوال ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے سے متعلق تھا۔ جب مشن نے مجھ سے سوال کیا کہ میں فرقہ وارانہ گتھی کو کس طرح سلجھا سکتا ہوں؟ تو میں نے وہی حل پیش کیا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جوں ہی میں نے کہا کہ لازمی اختیارات کی فہرست جو کم سے ہوں گے مرکز کے پاس ہوگی اور اس کے علاوہ اختیاری امور کی بھی فہرست ہوگی۔ تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا:

''دراصل آپ فرقے وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں!''
سر اسٹیفورڈ کرپس نے خاص طور پر میری تجویز میں دل چسپی لی اور بڑی دیر تک مجھ سے جرح کرتے رہے۔ آخر میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے نقطۂ نظر سے مطمئن ہوگئے ہیں۔''

(انڈیا ونس فریڈم: مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری: ص ۳۹۱)

انھیں اصولوں پر گفتگو آگے بڑھی اور اس مقام پر بات پختہ ہوگئی، جو مشن کے پلان کی شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن انگریز کے خیال میں کوئی ایسا فیصلہ اس کے منشا اور مفاد کے مطابق نہیں ہوسکتا تھا جو کانگریس لیگ اور ملک کی دیگر جماعتوں کے آپس کے اتفاق و اتحاد سے طے پایا ہو۔ لیکن گفتگو جس انداز سے آگے بڑھی تھی اور کئی مہینوں کے تبادلۂ خیالات اور نشیب و فراز کے بعد اس نتیجے تک پہنچی تھی اس میں مشکل اور خطرے کے مقام تو کئی آئے لیکن کوئی ایسی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی جو سلسلۂ گفتگو کی شکست اور فیصلے کی منزل تک پہنچنے میں مانع بنتی اور مشن کو اس سے فرار کا موقع ملتا۔ مشن کا جو پلان کانگریس کے لیے قابل قبول تھا اور جسے سکھوں، دوسری اقلیتوں اور حریت پسند مسلمانوں کی تمام چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے بھی منظور کرلیا تھا۔ لیگ کو اسے قبول کرنے میں پس و پیش تھا۔ لیکن سیاسی حالات ایسے موڑ پر آگئے تھے کہ لیگ کے لیے بھی اسے قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیگ کونسل نے بھی اپنے لیڈر کے ایما پر اسے قبول کرلیا۔ ملک کے آیندہ سیاسی سفر میں انگریز بیچ سے بالکل نکل جاتا تھا۔ ایک مرتبہ منصوبے کے مطابق اقتدار میں آجانے کے بعد پارلیمنٹ اپنے فیصلوں میں آزاد اور ان کے نفاذ میں خود مختار ہوجاتی تھی۔ لیکن پلان کی متعلقہ شق میں یہ بات واضح نہ تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جنھوں نے حال ہی میں کانگریس کے صدر کا منصب سنبھالا تھا۔ اپنی پہلی کانفرنس میں ایک صحافی کے جواب میں یہ حقیقت ظاہر کردی۔

لیگ پلان منظور کرنے کے بعد ایک کش مکش میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ممبئی کے صنعت کار اور تاجر برادری اس فیصلے سے سخت ناراض تھی۔ اس کے لیے متحدہ ہندوستان میں

دوسری قوتوں کے مقابلے میں صنعت وتجارت میں کامیاب ہونا ہرگز ممکن تھا، پاکستان میں خواہ وہ تقسیم شدہ ہی کیوں نہ ہو، انھیں پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوتے۔ انھوں نے اسی امید پر تحریکِ پاکستان کی مدد کی تھی اور لیگ کو کامیاب کروانے کے لیے اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ لیگ کے کیبنٹ مشن پلان منظور کر لینے سے ان کی امیدوں پر پانی پھر جاتا تھا۔ اس حلقے سے لیگ کے خلاف سخت ردِعمل ظاہر ہوا۔ پنجاب میں انقلاب، لاہور نے لیگ کے اس فیصلے کے خلاف ایک سخت جنگ چھیڑ دی۔ لیگ کا ایک طبقہ نہایت خلوص کے ساتھ پاکستان کی تحریک کو ناپسند کرتا تھا۔ اس فیصلے نے اسے بھی بے چین کر دیا تھا لیکن لیگ کے اندر کوئی اثر اور عوام میں رسوخ نہ ہونے کی وجہ سے خاموش تھا۔ مولانا غلام رسول مہر صاحبِ ''انقلاب'' نے اسے زبان دے دی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر پاکستان کے مطالبے میں مخلص نہ تھے تو یہ ڈھونگ ہی کیوں رچایا تھا۔ اگر مسلمانوں کو ہندوؤں ہی کے ساتھ رہنا اور جینا مرنا تھا تو ان کے خلاف اشتعال انگیز اور متعصبانہ طرز سیاست کیوں اختیار کیا تھا اور انھیں دشمن بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ سوال یہ بھی تھا کہ اب گزشتہ دس سال کی اشتعال انگیزی اور پیدا کردہ دشمنی کے نتائج کیوں کر بھگتے جائیں گے۔ لیکن قیادت اس منظوری کو واپس لینے کے لیے بے چین ہوگئی تھی۔ لیکن چوں کہ لیگ کی کونسل اس کی منظوری دے چکی تھی۔ اس لیے اب کوئی فردِ واحد اسے اپنی مرضی سے واپس نہ لے سکتا تھا اور اس کے لیے بھی کسی بڑے سبب کی ضرورت تھی۔ خدا نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک غلط یا صحیح بیان کو اس کے لیے ذریعہ بنا دیا۔ ملک کے مختلف طبقات کا لیگ کے فیصلے پر الگ الگ ردِعمل ہوا۔ کیبنٹ مشن کے ارکان نے اپنا واقعی ردِعمل تو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اب وہ واپس جا چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی برطانوی حکومت اور برطانوی استعمار کے لیے یہ ایک نہایت مسرت انگیز فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اب ملک میں تحریک آزادی اس مقام پر پہنچ چکی تھی اور بین الاقوامی حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ اس سیاسی صورتِ حال سے فایدہ اٹھا کر استعمار کی موت کو زندگی سے نہیں بدلا جا سکتا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۶ء

حضرت شاہ صاحب کا انتخاب صدارت

اور

ایک تاریخ تقریر

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو لاہور میں آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شیخ حسام الدین کی جگہ آیندہ سال کے لیے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو آل انڈیا مجلسِ احرار کا صدر منتخب کیا گیا۔

اسی شام (۲ ستمبر) جلسۂ عام میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلسِ احرار کے صدر کی حیثیت سے لاہور (بیرون دہلی دروازہ) مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۸ اگست کی تقریر کے جواب میں کہا:

"مجلسِ احرار دین داروں کی جماعت ہے۔ اس لیے ہم دین داروں کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا اتحاد نہیں ہوسکتا ہے، جو صحابۂ کرام رضوان اللہ کو گالیاں دیتے ہیں اور اپنے کتوں اور بلیوں کو صحابۂ کرامؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں، جن کی ساری زندگی غیر اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ ہمارا ان لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں ہوسکتا۔ جو صبح کچھ اور شام کچھ فیصلے کرتے ہیں اور رات گزرنے پر نئے سرے سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔

مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے ہمیں مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی ہے، ہم انھیں اور تمام مسلم لیگیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ برے عقیدوں سے تائب ہو کر مجلسِ احرار میں شامل ہو جائیں۔

مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی تجویز کو قبول کر کے ایک مرکز اور ایک قوم کے اصول کو تسلیم کر لیا اور پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ لیکن ڈیڑھ ماہ کے بعد اسی مسلم لیگ نے اپنے اس فیصلے کو واپس لے لیا۔ اب سارا معاملہ اور جھگڑا نشستوں کا ہے کہ مسلمان کو پانچ ملیں، چھ نہ ملیں۔ میں مسٹر جناح سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کونسا بدبخت مسلمان ہوگا جو کانگریس کی طرف سے حکومت میں شامل ہو کر اسلامی مفاد کی حمایت نہیں کرے گا۔ ہم نے کانگریس کے سامنے پینتالیس، پینتالیس اور دس کا فارمولا رکھا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے پینتالیس کی بجائے پینتیس فیصد قبول کر لیا۔ اب ہم کس منہ سے کانگریس سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو پینتالیس فیصد نیابت دے۔

مسلم لیگ کے لیڈر ملک میں تشدد کی دھمکیاں نہ دیں اور آتشیں تقریریں نہ کریں۔ اس طرح وہ ملک کے امن کو خراب نہ کریں۔ مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ ظہیر الحسن لاری کی بات مان کر نئی عارضی حکومت میں شامل ہو جائیں۔ اس لیے کہ وہ حکومت کے اندر جا کر مسلمانوں کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں اور جو چیز مسلمانوں کے لیے مفید ہوگی احرار اس کی باہر رہ کر حمایت کریں گے اور جو بات اسلامی اصولوں کے خلاف ہوگی ہم اس کی ڈٹ کر مخالفت کریں گے۔

لیگی دوستو! کانگریس کو اکیلے حکومت کرنے کا موقعہ مت دو۔''

کلکتہ کے فساد کا ذکر کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:

''اس فساد سے سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ یاد رکھو! ایسے فسادات سے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔''

تقریر کے آخر میں شاہ جی نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تجویز کے انعقاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک انکشاف کیا کہ

''ہم نے گزشتہ سال ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نمایندے مسٹر محمد اقبال کے توسط سے مسٹر جناح کے سامنے اسی قسم کی ایک تجویز رکھی تھی اور اس کے لیے تمام جماعتوں کے لوگوں کو مولانا آزاد کے مکان پر جمع کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے ہماری اس اپیل کو بہرے کانوں سے سنا۔ ہم چاہتے تھے کہ مسٹر جناح اس کانفرنس میں بتائیں کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان کس طرح مفید ہے؟

ایک طرف وہ غیر لیگی مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں مانتے اور دوسری طرف انھیں لیگ میں شمولیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس واحد نمایندگی کے زعم میں جب انھیں ہندو اور انگریز سے منہ کی کھانی پڑی تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ مجلسِ احرار کو بھی دعوت دی جا رہی ہے۔

میں نے گزشتہ سال کشمیر سے واپسی پر دہلی میں اور پھر امرتسر میں جناح صاحب کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ مجھے اپنے ہاں بلا کر پاکستان کا مفہوم سمجھا دیں۔ اگر ان کی بات میرے ضمیر اور دل نے قبول کر لی تو پھر قایدِاعظم آپ آرام سے بمبئی بیٹھیں۔ میں تنہا ہندو اور انگریز سے لڑ کر انھیں پاکستان لے کے دکھا دوں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے میری بات کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ میں اب بھی انھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہو کر اپنی بات سمجھائیں۔

میری بات یاد رکھو! اگر جناح اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر ہندوستان ہی تقسیم نہیں ہوگا، پاکستان بھی تقسیم ہوگا

میں آج جہاں کھڑا ہو کر بول رہا ہوں، ایک ویرانہ بننے والا ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ قافلے آ رہے ہیں اور قافلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان، مسلمانوں کے لیے ایک زندہ

قبرستان ہوگا۔

یاد رکھو! تقسیم اگر ہوئی تو امرتسر تک کا علاقہ ہندوستان لے جائے گا اور پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے، جو آج بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں۔ یہ امرا کی ایک جنت ہوگی لیکن ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے اور اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔

میں مسلمانوں میں تصادم نہیں چاہتا۔ نقطۂ نگاہ کی بات ہے۔ محمد علی جناح مسلمان جماعتوں کی ایک مجلس مشاورت بلائیں۔ مجھے اپنے نقطۂ نگاہ پر قایل کر لیں تو میں ان کا سپاہی ہو جاؤں گا۔ مجھے کیا لینا ہے؟ کچھ نہیں لیکن اس صورت میں ان کی جنگ میں لڑوں گا۔ جنگ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہندو سے بھی لڑوں گا اور انگریز سے بھی۔ قاید اعظم بڑے ہیں۔ ہم چھوٹے ہیں۔ لیکن بڑوں کا کام چھوٹوں کو دھتکارنا نہیں سمجھانا ہے۔''

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور، ۴ر ستمبر ۱۹۴۶ء)

جلسہ کے آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:

''آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے آج اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ اگر مسلم لیگ کوئی تحریک چلائے گی تو احرار کسی صورت میں بھی اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مسٹر جناح نے غیر مسلم لیگیوں سے جو اپیل کی ہے اس کے پس منظر میں ایک کمیٹی ترتیب دی گئی ہے جس میں مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور شورش کاشمیری شامل ہیں۔ انھیں اختیار دیا گیا ہے کہ مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت سے مصالحت کی گفتگو کر سکتے ہیں۔''

صدر مجلسِ احرار کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی نے مسٹر محمد علی جناح کی اپیل کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''جمعیت علماے ہند، مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کا خیر مقدم کرتی ہے، جس میں انھوں نے لیگ کے علاوہ باقی مسلمان سیاسی جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اتحاد باہمی کے ساتھ انگریز اور ہندو کا مقابلہ کریں۔ بلاشبہ اس وقت کی ضرورت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم ربط ہو۔ لیکن جناح صاحب یہ سوچ لیں کہ ان کے واحد نمایندگی کے دعوے کا کیا ہوگا۔ جب کہ وہ خود غیر لیگی مسلمانوں کو کافر قرار دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں ان کے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ غیر مسلم لیگی جماعتوں کے اجلاس میں شریک ہو کر ان کے سامنے اپنا موقف بیان کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر تیار ہوں تو نیشنلسٹ مسلمان جماعتیں ان کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہیں۔'' (سہ روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی)

(کاروانِ احرار: (جلد ہفتم)، ص ۶۸-۳۶۴)

۱۹۴۶-۴۸ء

افادات

امیرِ شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

بانیٔ احرار، رئیس تحریک تحفظ ختم نبوت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے جدوجہدِ آزادی میں بے پناہ صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ حق گو انسان تھے، حق پژوہی ان کا شعار تھا، وہ حصارِ حق سے باہر جھانکنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھیں سچ سے جتنی محبت تھی جھوٹ سے اس سے زیادہ نفرت تھی! یہی وجہ ہے کہ وہ دوستوں اور دشمنوں میں یکساں مقبول تھے۔ دوست جتنا قریب تھے، دشمن اس سے کہیں زیادہ خوفزدہ۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد، انھوں نے سیکڑوں تقاریر کیں اور اپنی مومنانہ بصیرت سے حالات و واقعات کا جو تجزیہ فرمایا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ ذیل میں ان کی نجی مجالس اور تقریروں سے ایسے اقتباس پیش کیے جارہے ہیں۔ جو ۱۴ راگست کے پروانۂ آزادی کے پس منظر اور پیش منظر اور ان کے سیاسی موقف کو سمجھنے کے لیے کافی وشافی ہیں اور موجودہ حالات میں ان کی اہمیت وافادیت اور بڑھ گئی ہے۔ (سید محمد کفیل شاہ بخاری)

۱۹۴۶ء

(۱)

”مسلم لیگ والو! تم ہندوستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہو۔ میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تمہاری مجوزہ تقسیم سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ ہاں! اس سے دس کروڑ مسلمان تین حصوں میں ضرور بٹ جائیں گے۔“ (لاہور، جولائی ۱۹۴۶ء)

(۲)

''تقسیم ہندوستان ہی نہیں پاکستان بھی ہوگا۔ اور پھر پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج بھی انگریز کے غم خوار و نمک خوار ہیں۔ پاکستان امرا کی ایک جنت ہوگی لیکن ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے۔ اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔'' ❶

(امرتسر ۱۹۴۶ء)

(۳)

''میں بھی پاکستان کا حامی ہوں مگر لولے لنگڑے پاکستان کا نہیں...... وسیع تر پاکستان کا، جس کا ایک وجود ہو، جو واقعی پاکستان ہو، پورا پنجاب اور پورا کشمیر اس میں شامل ہو۔

میرے نادان دوستو! تم ٹکڑوں میں بٹے ہوئے پاکستان کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ یاد رکھو! اس پاکستان کا مستقبل بڑا خطرناک ہوگا اسلام کے نام پر حاصل کردہ اس پاکستان میں اسلام ہی کا مذاق اڑایا جائے گا۔

یقین جانو! پاکستان میں اسلام نافذ نہیں کیا جائے گا۔''

(احرار کانفرنس انبالہ ۱۹۴۶ء)

روایت: جناب وکیل احمد قریشی حال مقیم سلانوالی (سرگودھا)

---

❶ پاکستان کے تقسیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے وہ صوبے جو لیگ کے تصور پاکستان کے مطابق پورے پورے پاکستان میں شامل ہونے چاہیں، ان کے غیر مسلم اکثریت کے حصے، لیگ ہی کے استدلال سے اس سے الگ کر لیے جائیں گے، کٹا پٹا پاکستان مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اور پھر اس پر بھی انگریز کے نمک خواروں کا قبضہ ہو جائے گا۔

کتنا صحیح کہا تھا وقت کے اس سیاسی مدبر یا قلندر نے! اس کے فرمودہ سے ذرہ برابر بھی کم نہ ہوا اور کتنا صحیح ہے کسی کا یہ فرمودہ۔

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!

کتنا مجبور اور اجنبی ہو گیا ہے مسلمان اور اسلام سفر کے اس مقام پر پہنچ کر!

۱۹۴۷ء

(۴)

مجھے صاف نظر آرہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے، مکان جل رہے ہیں، دکانیں لوٹی جارہی ہیں اور قزاق عصمتیں اڑاتے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ بھائی بہن کو بھول گیا ہے اور خاوند بیوی سے الگ ہوگیا ہے۔ سب رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ چاروں طرف قیامت کا صور پھنک گیا ہے۔

دریاؤں میں خون ہے، ہواؤں میں دھواں، دھرتی طوطا چشم ہوگئی ہے، سیاست دانوں نے جغرافیائی نقشہ اٹھا کر اس پر ضرب و تقسیم کی ہے لیکن اس کی بہ دولت بڑی مدت کے لیے انسان مرگیا ہے۔ برصغیر میں تبلیغ کا دروازہ بند اور جذبہ جہاد ختم کرنے کی سازش ہورہی ہے۔

ہم نے سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر دینی فرائض سے بغاوت کردی ہے۔ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی گئی تو پاکستان سیاسی مفاد پرستوں اور قومی غداروں کی آماج گاہ بن جائے گا۔"

"لعنت بر پدر فرنگ"

میاں آج ہنستے ہو! کل روؤ گے۔ تم نہیں دیکھ سکتے، میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وبا پھوٹ چکی اور ایک وبا آرہی ہے۔

ہاں بھائی! انگریز کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہو جائیں اور لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کرہی جائے گا۔

تم نے آزادی مانگی تھی، یہ لو آزادی؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔

قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں! میری آنکھیں بہت کچھ دیکھ چکی ہے۔ اور بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ میں نے ہوا کا رخ جس طرف دیکھا ہے تم اس کے برعکس دیکھو گے۔ برہنہ گفتگو کا موقع نہیں ورنہ جو کچھ جہد آزادی کے دور میں ہوتا رہا اور برطانوی سرکار نے خود کاشتہ خاندانوں کے لیے جو کچھ کیا یا ان خاندانوں نے برطانوی سرکار کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ روداد اتنی تلخ ہے کہ عرش و فرش کانپ اُٹھتے ہیں۔" (اگست ۱۹۴۷ء، دفتر احرار، لاہور)

۱۹۴۸ء

(۵)

"جو لوگ اسلام کے نظام حکومت سے دامن کشاں ہیں اور اقتدار نشین ہو کر اسلامی نظام کے قیام سے فرار اختیار کرتے ہیں اور عوام کو اپنی ذہنیت کی اصلاح کے لیے کہتے ہیں، وہ دراصل اسلام پر الزام دھرتے ہیں۔ وہ خود اسلام سے تہی داماں ہیں۔ جب سب کچھ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو پھر جس نام سے یہ طاقت حاصل کی گئی ہے اس سے یہ انحراف کیوں برتا جا رہا ہے؟

اسلام ایک آفاقی اور عالم گیر دین ہے۔ وہ ایک ایسا نظام ہے جو ازل اوّل تا آخر اور تا بہ قیامِ قیامت ہر انسانی گروہ اور ہر انسانی جماعت کی خوش حالی اور برتری کا ضامن ہے۔ وہ بنیادی سعادتوں اور دنیوی خوش نصیبوں کا توشہ ہے اور ہم اس پر چل کر اپنے لیے، بنی نوع انسان کے لیے اور معاشرۂ انسانی کے لیے صحت مند مستقبل تیار کر سکتے ہیں۔

مسلمان اور موت کا خوف یک جا نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ قرآنی نظام کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی بصیرت سلب ہو چکی ہے اور وہ

اپنی نفسی کوتاہیوں کو اسلام کی کوتاہیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔"

(صوبائی احرار کانفرنس (لائل پور) فیصل آباد، ۳۰ر مئی ۱۹۴۸ء)

(۶)

"ملک بانٹ کر انگریز نے تحریک آزادئ ہند کو جس طرح ختم کیا ہے اس سے فی الحقیقت کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ کیوں کہ اسے آج نہیں کل جانا تو تھا ہی اس نے سوچا، لاؤ اپنی دو سو سالہ اولاد (معنوی) کو وارث بنا دوں کہ پھر آنا پڑے تو لڑائی جھگڑا نہ ہو اور اب بھی وہ گیا کہاں ہے؟ یہیں اندر موجود ہے اور پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے۔ کچھ دنوں تک خوب کھل کھیلے گا۔ مسلم لیگ کی طرف سے پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کا تصور کہ جس کے نام پر اللہ و رسول اور قوم کو دھوکا دیا گیا ہے، اپنے آپ کو فریب دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔

ابھی بہت سا کام باقی ہے ایک زوردار دھکے کی ضرورت ہے۔ تب شاید اطمینان کی کوئی صورت پیدا ہو اور جب تک یہ نہیں ہوتا، ہمارے لیے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ بلکہ یہ انگریز کی حکومت سے بھی بدتر! کم از کم وہ کفر خالص تو تھا اور اب نام اسلام کا ہے اور کام انگریز کا۔"

(جولائی ۱۹۴۸ء خان گڑھ میں ایک مجلسی گفتگو) روایت: حضرت سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ) (پاکستان کیا ہوگا؟ سے ماخوذ)

مسلم لیگ اور احرار

(۱)

جناب ماسٹر تاج الدین انصاری کے نام ایک خط میں حضرت امیر شریعت فرماتے ہیں:

"لیگ سے ہماری سیاسی کش مکش ختم ہو چکی ہے اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم

ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکمہ ہے۔ مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کرلیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مطالبۂ مسلم لیگ کا نتیجہ ہے، بلکہ کانگریس کا تقسیم پنجاب کے اضافے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے، جس پر ''حضور'' برطانیہ کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدف ملامت بنانا آئین شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگریس اور لیگ دونوں نے، اگر برا کیا تو دونوں نے۔ اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگریس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرائی اور کرا رہی ہے۔ ابھی نہ جانے کب تک مسلمانوں کو سود در سود ادا کرنا پڑے گا۔

میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہییں، اور اس کے لیے عملی اقدام اٹھانا چاہیے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور خلاف شرع کام سے اجتناب، اصلاحِ احوال کے لیے ایک دوسرے سے مل کر ''الدین نصیحۃ'' پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔ (۲۴؍دسمبر ۱۹۴۷ء)

(۲)

مولوی نذیر حسین کے نام ایک خط میں حضرت شاہ صاحب نے تحریر فرمایا:

''یاد فرمائی کا شکر گذار ہوں۔ رسالہ تو ان شاء اللہ تعالیٰ میرے خط سے پہلے پہنچ چکا ہوگا۔ باقی آپ کی کھٹک تو صحیح ہے، فکر صحیح نہیں۔ تقسیم سے پہلے لیگ کے ساتھ ہمارے بہت سے اختلافات تھے۔ ہم نے قوم کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا، لیگ نے اپنا، قوم نے لیگ سے اتفاق کیا اور لیگ قوت حاکمہ بن گئی۔ مد مقابل پارٹی نہ رہی۔ ہم بہ ہر حال رعایا بن گئے۔ ہم لوگ شروع سے ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ دینی مقاصد بھی رکھتے تھے

اوراب تک بفضلہٖ تعالیٰ رکھتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ان دینی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی اور صورت اگر ہو سکتی ہے تو ارشاد فرمائیں؟ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اوراب کسی صورت میں اس کو بدلنا قومی ہلاکت وتباہی ہے۔ اصلاح احوال سے انکار نہیں وہ بھی ہم کر رہے ہیں، مگر مخالف بن کر نہیں۔ موجودہ وقت میں اس فتنۂ مرزائیت کے مقابل میں جو کامیابی ہم کو حاصل ہو رہی ہے وہ باہمی تعاون ہی کا نتیجہ ہے۔ بہ صورت دیگر

منکر مئے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

مشکل ہے۔ روزہ میں یہ مختصر سا جواب عرض خدمت ہے، اسے آپ خود ذرا پھیلا کر دیکھیں اور ہماری مشکلات کا اندازہ لگائیں۔ لیگ کی مخالفت فی نفسہٖ کوئی کار خیر نہ تھا، نہ ہے۔ کسی مقصد عالی کے لیے مخالفت وموافقت معنی رکھتی ہے۔ عہد فرنگی میں اختلاف بامعنی تھا۔ اب اتفاق ہی سے اصلاح احوال کی توقع ہو سکتی ہے۔ ورنہ سرخ پوش، انجمن وطن اور دوسری جماعتیں کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ فافہم وتدبر۔''

(۲۱رجون ۱۹۵۱)

۷

الیکشن کی اخلاقیات

ان لمحوں کی حسرت ناک داستان جب مسلم لیگ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی

مشاہدات و مطالعات

حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ

ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

فہرست

پیش لفظ

حضرت مخدومی مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا یہ رسالہ پہلی مرتبہ حاجی محمد یونس دہلوی کی فرمایش پر مولانا محمد وحید الدین قاسمی نے دلّی پرنٹنگ پریس۔ دہلی میں طبع کرا کے دفتر مرکزیہ جمعیت علماے ہند (گلی قاسم جان) دہلی سے ۱۹۴۶ء کے آغاز میں شایع کیا تھا۔

اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مسلم لیگ نے مسلمان عوام، اہل قلم اور صحافیوں کے اخلاق کو کس حد تک بگاڑ دیا تھا۔ یہی کچھ عادت مسلم لیگی علما، خطبا و مقررین کی بن گئی تھی۔ طنز و تعریض ہی نہیں، شنام طرازی میں بھی زبانوں کو لگام نہ تھی۔ الزام و اتہام اور بہتان و افسانہ طرازی میں کسی کو باک نہ تھا۔ بڑے بڑے لیگی علما اس معصیت میں ملوث تھے۔ ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ کسی نہ کسی طرح الیکشن جیت لینا بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اس دور کی اخلاقیات کے مطالعے کے لیے یہ ایک مفید تاریخی رسالہ ہے۔ موضوع سے مناسبت رکھنے والی چند اور تحریریں بھی اس کے ساتھ شامل کر دی ہیں۔

حضرت مرحوم مولانا نعمانی نے لیگی اخلاقیات کے جس پہلو کی طرف اپنے ہر دو رسایل میں قارئین کرام کو توجہ دلائی ہے، وہ کوئی مزاح نہ تھا اور نہ کوئی ڈھکی چھپی بات تھی، جسے حضرت مرحوم نے پردے کے پیچھے سے جھانک لیا تھا اور اپنے مشاہدے کے لطف میں قارئین کو شریک کر لینا چاہتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک اخلاقی وبا تھی، جس نے دماغوں کو ماؤف اور سیرتوں کو متاثر کر دیا تھا۔ اور ٹھیک اس وقت جب قوم کو سب سے زیادہ سنجیدہ، بردبار، متحمل و متوازن، ہوشیار اور صاحب فکر ہونا چاہیے تھا۔ اس وبا کی سب سے بڑی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ عقل مفقود، ذہن میں فساد اور فکر میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے سفید و سیاہ میں امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور قوم پر

ایک نحوست طاری ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے فہم اور اعتراف کی توفیق اس وقت تک نہیں ہوتی، جب تک حالات و واقعات کا واشگاف مطالعہ اور حقایق کا بے پردہ نظارہ نہ کیا جائے۔

ان مضامین اوراق کے ساتھ اسی حقیقت کے آئینہ دار مراسلات و شذرات کی تالیف کا مقصد یہی ہے کہ احساسات کا رنگ گہرا ہو، ضمیر جاگ اُٹھے، بدبختی اور نحوست کا اعتراف دل میں پیدا ہو اور خدا نہ کرے کہ ماضی کے حواس باختگی اور اخلاق کی آوارگی کا دور کبھی پلٹ کر آئے۔ اگر اس مجموعے کے ساتھ "مرقعۂ عبرت۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی داستانِ عزیمت کو بھی مطالعے میں شامل کر لیا جائے تو یہ امر ہماری عبرت اور بصیرت میں مزید اضافے کا باعث ہوگا۔ نیز مسلم لیگ کی بگاڑی ہوئی ذہنیت اور اس کی ہلاکت خیزی کا بہ خوبی اندازہ ہو سکے گا اور معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے بزرگوں نے کتنے مشکل صورت میں ملک کی آزادی کی جدو جہد اور عوام کی صحیح اسلامی، اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے اور ان کی سیرت اور اخلاق کا پیمانہ زمانے کے معیار سے کتنا بلند اور ارجمند تھا۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الیکشنی جہاد اور اس کے ہتھیار

بے پناہ جھوٹ، بہتان بندی، غنڈہ گردی اور فتنہ و فساد

انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار کی نحوست نے مسلمانوں کو جو دینی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے اور اخلاقی زوال کے جس درجہ تک ان کو گرا دیا ہے، انفرادی معاملات اور لوگوں کی نجی زندگیوں میں اس کے نمونے آئے دن ہم دیکھتے رہتے ہیں، لیکن اجتماعی طور پر اس کا سب سے بڑا مظاہرہ شاید الیکشنوں کے موقع پر ہوتا ہے، بالخصوص اس الیکشن میں ہو رہا ہے جو اس وقت ہمارے سروں پر ہے، مسلم لیگی فضاء کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرنے کے لیے بے حساب جھوٹ بولنا، اور پوری قوت سے اس کو پھیلانا، دوسری پارٹی کے لوگوں کو اور بسا اوقات واجب الاحترام اور صاحب وقار شخصیتوں کو رسوا کرنے اور عوام کی نظروں سے گرانے کے لیے ان کے خلاف بے تحقیق بلکہ بسا اوقات جان بوجھ کر بے بنیاد تہمتیں تراشنا اور ذلیل سے ذلیل الزامات ان پر لگانا، ان کو بے آبرو کرنے

کے لیے شیطانی سازشیں کرنا، اور غنڈوں اور اوباشوں کو ان کے خلاف ہشکارنا، پھر ان کی بہیمانہ حرکتوں اور وحشیانہ بدتمیزیوں پر خوش ہونا، اور اخباروں میں پڑھ پڑھ کر اس سے لذت حاصل کرنا، یہ ساری حرکتیں جواز روئے دین اکبر کبائر اور انسانیت کے لیے لعنت ہیں، آج مسلمان قوم کے عوام ہی نہیں بلکہ اس پڑھے لکھے طبقہ کے لیے بھی "شیرِ مادر" بنی ہوئی ہیں جس کو اس قوم کا دماغ کہا جا سکتا ہے، ان شیطانی حرکات کی قباحت اِس وقت دلوں سے ایسی نکلی ہوئی ہے اور ان کی ملعونیت کو اس طرح بھلایا گیا ہے کہ نہ ان کے کرنے والوں کا ضمیر ان کے ارتکاب میں کوئی بوجھ اور دُکھ محسوس کرتا ہے اور نہ قوم کی رائے عامہ ہی اس سے کراہت و نفرت کرتی ہے، فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی،

کسی قوم کے دینی و روحانی احساسات کی مُردگی اور اخلاقی شعور کی موت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے ——— اور غضب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جس طرف سے بھی ہو رہا ہے "اسلام" اور "مسلم قوم" کے مفاد کے نام پر ہو رہا ہے، اور اس کو "جہاد" کہا جا رہا ہے، ——— ہاں ہاں یہ "جہاد" ہے، لیکن جہاد فی سبیلِ اللہ نہیں فی سبیل الطاغوت، کاش! تم دیکھ سکتے کہ تمہارے دلوں کی ڈوریاں اس وقت شیطان کے ہاتھوں میں ہیں،

الیکشن کے "مجاہدو"! اگر واقعی اسلام سے تمہارا کوئی تعلق ہے، اسی اسلام سے جس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، اور آپؐ کی تعلیمات کو تم در حقیقت برحق اور ذریعۂ نجات جانتے ہو، اور ان تعلیمات کا تم کو تھوڑا بہت اگر کچھ بھی علم ہے تو خدا کے واسطے چند لمحہ کے لیے غیظ و غضب اور جنون کے جہنم سے نکل کر ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ تم جو کچھ اس جوش جنوں میں

کر رہے ہو، اسلام کی نظر میں وہ سراسر کافرانہ اعمال و اطوار ہیں، اور خدا و رسولؐ ان کے کرنے والوں سے بری و بیزار ہیں،

جھوٹ:

تم الیکشنی اغراض کے لیے بیدریغ جھوٹ بولنے کے روادار ہو، اور الیکشنی ضرورتوں و مصلحتوں کے ماتحت بے محابا جھوٹ بولتے، جھوٹ لکھتے اور جھوٹی خبروں کی اشاعت کرتے ہو، مگر تمھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں جھوٹ بولنے والوں پر لعنت فرمائی ہے: لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ،
قرآن مجید میں جھوٹی باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کو کافروں کا خاصہ بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے:

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ،	"وہی لوگ جھوٹ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے ہیں"،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جھوٹ بولنے کو منافق کی خصلت اور نفاق کی علامت بتلایا ہے (اذا حدث کذب)

نیز قرآن مجید میں شرک اور بت پرستی کے ساتھ اور بالکل پہلو بہ پہلو جھوٹ بولنے کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے، گویا کہ وہ شرک و کفر کے قریب درجہ کا گناہ ہے، سورۂ حج میں ہے:-

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ،	"بت پرستی کی ناپاکی سے اور جھوٹ سے پرہیز کرو"،

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: کیا میں سب سے بڑے گناہ تمہیں بتلاؤں؟ ہم نے عرض کیا، حضور ضرور بتلائیں! آپ نے فرمایا:

اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ (وَكَانَ مُتَّكِئًا فَجَلَسَ) فَقَالَ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا لَيْتَهٗ سَكَتَ، (بخاری ومسلم)

"اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کر کے انھیں ستانا (راوی حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ اس وقت سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے لیکن اتنا فرمانے کے بعد ایک خاص کیفیت میں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے) اور پھر فرمایا خوب سن لو، اور جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا، (حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ) اس آخری بات کو آپؐ (ایک خاص کیفیت میں) بار بار دُہراتے تھے، یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں میں کہا، کاش! آپؐ سکوت فرمائیں"

پھر جھوٹ بولنے والوں کے لیے آخرت میں جو سخت دردناک عذاب ہے، اور شبِ معراج کی سیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو بچشم خود دیکھ کر بیان فرمایا ہے وہ صحیح بخاری کے حوالہ سے گذشتہ اشاعت کے انہی صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ اُن کے کلّوں کو ان کی ناکوں اور آنکھوں کو اس طرح مسلسل اور بار بار چیرا اور پھاڑا جاتا ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی کے ساتھ یہ معاملہ ہوتے ہوئے دیکھا جائے تو یقین ہے کہ دیکھنے والے چیخ اٹھیں، اور ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں، والعیاذ باللہ،

جھوٹ کی اس ملعونیت اور اُس کے اس عذاب کو پیشِ نظر رکھ کر اب تم خود سوچو کہ آجکل اپنے اس الیکشنی "جہاد" میں کتنی غلط باتیں اور کتنے بے تحقیق واقعات تم صبح سے شام تک لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہو؟ اس پر غور وفکر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی زیرِ نظر رہے:

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ،	"آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ جو بات کسی سے سُنے (بلا تحقیق) اس کو لوگوں سے بیان کرتا پھرے"۔

اس حدیث کی روشنی میں سوچو کہ صبح سے شام تک تمہاری الیکشنی باتوں میں جھوٹ کا کتنا حصّہ ہوتا ہے؟ افسوس: آج یہ بلا اس قدر عام ہے کہ الیکشن سے عملی تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ہو جو جھوٹ کی اس قسم سے بھی محفوظ ہو، ہمارے اخبارات جن کے متعلق ہر ایک کو نہ صرف یہ کہ معلوم ہے بلکہ اکثروں کو تو ذاتی تجربہ بھی ہے کہ ان میں بیدریغ جھوٹی چیزیں بھی لکھی جاتی ہیں، انہی کی ہر قسم کی اطلاعات پر اعتماد کرکے بلا کسی تحقیق کے اپنے مخالفین کے متعلق سب کچھ بیان کرنا ایک ایسی عام عادت ہے، بہت کم اللہ کے بندے ہوں گے جو شرعی اصول کے ماتحت اس میں احتیاط برتنے کا لحاظ بھی رکھتے ہوں

بلکہ مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ الیکشن میں کام کرنے والوں کے لیے جو تربیت گاہیں ہماری بعض سیاسی پارٹیوں نے بنائی ہیں ان میں ورکروں کو خاص طور سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ فضا کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرنے کے لیے کس کس طرح حسبِ موقع جھوٹ بولیں، اور کس انداز سے ان جھوٹی باتوں کو بیان کریں کہ عوام مخاطبین کو ان کا یقین ہو جائے،

اس الیکشنی کذب آفرینی کا نشانہ یہ عاجز راقم سطور خود بھی بن چکا ہے،
۲۲ر نومبر کے انگریزی روزنامہ "پاینر" میں میرے متعلق یہ اطلاع درج ہے کہ "میں مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر جمعیۃ العلماء میں شامل ہو گیا ہوں"
حالانکہ یہ محض جھوٹ اور افترا ہے، میں نہ کبھی مسلم لیگ کا ممبر تھا، نہ میں نے استعفیٰ دیا، نہ میں جمعیۃ العلماء کا ممبر ہوں،

پھر اس جھوٹ اور افترا پردازی کا انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک نمونہ یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے نام پر خواب تک گھڑے جاتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تک کو اس شیطنت کا ہدف اور نشانہ بنایا جاتا ہے، اسی نومبر میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے چند طلباء کا ایک وفد بریلی آیا، اس کے ایک مقرر نے اپنی تقریر میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رح کے متعلق بڑی بیباکی سے بیان کیا کہ:

"مولانا اشرف علی صاحب کو آپ حضرات جانتے ہوں گے، وہ ہندوستان کے کتنے بڑے عالم اور مسلّمہ بزرگ تھے، انھوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگا ہوا ہے، صحابۂ کرامؓ اور دوسرے بہت سے بزرگ بھی موجود ہیں، اور مسٹر جناح بھی ہیں، جو حضورؐ کے بالکل قریب گویا پہلو میں بیٹھے ہوئے ہیں، اور حضورؐ ان کے ساتھ بڑے لطف و محبت کا برتاؤ کر رہے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا، اور انھوں نے خواب ہی میں حضورؐ سے دریافت کیا کہ حضور والا! یہ شخص تو بڑا بدعمل تھا، روزہ نماز کا بھی پابند نہ تھا، پھر آج اس کا یہ درجہ کیوں ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں بیشک یہ تھا تو بدعمل ہی، لیکن ایک وقت میری امت

کی کشتی ڈوب رہی تھی تو اسی نے محنت کر کے اس کو ڈوبنے سے بچا لیا بس اسی کے اسی عمل نے اس کو یہ درجہ دلوایا ہے "

میں خود اس جلسہ میں موجود نہ تھا، مگر متعدد سننے والوں نے مجھ سے اس کو بیان کیا ہے، اور پھر میں نے سُنا کہ یہ خواب کسی قدر اجمال کے ساتھ اخبارات میں بھی شائع ہو رہا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،

خدا کے بندو! اللہ کے جو بندے اس دنیا سے جا چکے ہیں ان کو تو اپنی افترا پردازی کے لیے تختۂ مشق نہ بناؤ، اور عالمِ برزخ میں ان کی روحوں کو نہ ستاؤ[1]، کیا اس شیطانی بازی میں تمھاری جیت اسی پر منحصر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ پر بھی افترا پردازی کرو؟ آخر شیطنت اور ناخدا ترسی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے، وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

بہتان بندی؛

اسی طرح فریقِ مقابل کے وقار کو گرانے اور عوام کی نظروں میں ان کو بے اعتبار بلکہ ذلیل و خوار کرنے کے لیے بڑے بڑے بہتان ان پر لگانا اور سنگین سے سنگین الزامات اُن کے خلاف تراشنا اور پروپیگنڈے کے وسائل کے ذریعہ ان کو اچھالنا اس وقت الیکشن کی گرم بازاری میں کس قدر عام ہو رہا ہے، کسی کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ ہندوؤں سے روپیہ پاتا ہے، یہ انگریز کا پُرانا ایجنٹ ہے، فلاں پارٹی نے ہندوؤں سے دو کروڑ روپیہ لیا ہے، فلاں لیڈر نظام حیدرآباد کی معرفت انگریزوں سے چھ لاکھ روپیہ سالانہ وصول کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ، آج یہ باتیں کتنی سہل انگاری اور بےباکی سے بولی اور لکھی جا رہی ہیں، گویا کہ کبھی ان چیزوں کا محاسبہ ہونا ہی نہیں ہے؛

---

[1] حضرت تھانویؒ اس سے کئی سال قبل جولائی ۱۹۴۳ء میں انتقال فرما چکے تھے،

اللہ کے بندو! الیکشن کے اس عنوان سے تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آکر اللہ کی بات بھی سنو!

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ٥ (سورۂ قٓ، ع ۲)

"آدمی جو بات بھی بولتا ہے ایک نگراں اس پر مقرر رہتا ہے جو اس کی ہر چھوٹی بڑی بات کو محفوظ رکھتا ہے اور اسی تیار کردہ ریکارڈ پر حساب ہوگا۔"

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل، ع ۴۵)

"اور جس بات کا تجھے علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ لگ، قیامت کے دن کان، آنکھ اور دل ان سب سے پوچھ ہوگی۔"

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ٥ (احزاب، ع ۷)

"اور جو لوگ ایمان والوں کو ایسی باتوں سے متہم کرکے ایذا دیتے ہیں جو انھوں نے نہیں کیں تو انھوں نے بڑے بہتان اور بڑے صریح گناہ کا بوجھ اپنے اوپر اٹھایا ہے۔"

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص کسی کے متعلق ایسی بات کہے جو اس میں نہیں ہے، تو اس کو جہنم میں قید کرکے فرمائیں گے کہ تو نے میرے فلاں بندہ کے بارے میں جو یہ کہا تھا اب اس کو سچا کرکے دکھا۔" (ترغیب و ترہیب للمنذری)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ :۔

"جو شخص کسی صاحبِ ایمان پر ایسی تہمت لگائے جس سے فی الواقع وہ بری ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے بدترین حصہ میں قید کریں گے جہاں جہنمیوں کا پسینہ اور لہو، پیپ وغیرہ جمع ہوتا ہوگا"

اگر قرآن پاک پر ایمان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الحقیقت تمہارے نزدیک اللہ کے سچے رسول اور اس کے صادق و مصدوق نمائندہ ہیں اور قیامت و آخرت، جنت و دوزخ کی خبریں محض افسانے نہیں ہیں، تو پھر اس میں کیا شبہ ہے کہ الیکشنی اغراض کے لیے جو لوگ جھوٹ اور بہتان بندی کے ہتھیار اس وقت بیباکی کے ساتھ اپنے مخالف افراد یا پارٹیوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں وہ جہنم میں اپنے لیے بہت برا ٹھکانا بنا رہے ہیں، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ،

غنڈہ گردی:

اس الیکشنی جہاد میں سب سے زیادہ ناپاک اور خطرناک قسم کا جو ہتھیار استعمال ہونا شروع ہوا ہے وہ فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی ہے، ابھی اس کا استعمال جھوٹ اور بہتان بندی وغیرہ کی طرح تو عام نہیں ہوا ہے، لیکن حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوبجاتی اسمبلیوں کے الیکشن تک (جس کے ابھی کافی دن ہیں) یہ بلا بھی مسلمانوں میں بہت زیادہ عام ہو جائے گی،

دوسری کئی جگہوں کے فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی کی اطلاعات تو اخبارات میں پڑھی تھیں، لیکن ۲۰ نومبر کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی آمد پہ یہاں بریلی میں جو کچھ ہوا وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——— یہ واقعہ ہے کہ اگر میں بچشم خود اس منظر کو نہ دیکھا ہوتا اور کوئی دوسرا میرے مشاہدہ سے

کچھ کم بھی بیان کرتا تو میں اس کو مبالغہ ہی سمجھتا، اور کسی طرح میرا دل یہ باور نہ کر سکتا
کہ الیکشن لوگوں کو اتنا دیوانہ بھی کر سکتا ہے،

"الفرقان" کے اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اس وقت مسلمانوں کی جن دو
پارٹیوں کے درمیان یہ سیاسی جنگ برپا ہے راقم سطور کا تعلق ان دونوں میں
سے کسی ایک سے بھی نہیں ہے، بلکہ اس صولی اور نظری اختلاف کے علاوہ جو
مجھ کو یا مجھ جیسوں کو ان پارٹیوں کے سیاسی مسلکوں سے ہے، اب تو اس سلسلہ
کی غیر انسانی حرکتوں اور گندگیوں کی وجہ سے بھی طبیعت کو سخت بیزاری ہو گئی
ہے، بایں ہمہ ۲۰ر نومبر کو جبکہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب بریلی تشریف لائے
تو اگرچہ الیکشنی سلسلہ کی کوئی تقریر سننے سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی، مگر صرف
اس چیز کا عینی اور مشاہداتی علم حاصل کرنے کے لیے کہ مسلمان اس سیاسی
جنگ میں کس مقام پر آ گئے ہیں، میں جلسہ میں گیا، اور خاص جلسہ گاہ میں بیٹھنے
کی بجائے دور ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوا کہ سب کچھ سُن سکوں اور دیکھ سکوں؛
پھر بدنصیبی نے جو کچھ دکھایا واقعہ یہ ہے کہ قلم یا زبان سے اس کو ادا نہیں کیا جا سکتا،
مجنونانہ اور وحشیانہ حرکتوں، اوباشانہ یورشوں، مغلظ گندی گالیوں اور بدتمیزی
بہیمیت کے عریاں مظاہروں کا ایک ایسا طوفان تھا کہ جس نے نہیں دیکھا اور
اس کے دل میں اسلام کی کوئی حِس اور خیر و شر کی کوئی تمیز باقی ہو تو وہ امت
کے دینی و اخلاقی زوال و انحطاط پر روئے بغیر نہیں رہ سکتا، شہر کے غنڈوں
اور اوباشوں کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں اچھے خاصے مہذب صورت،
کوٹ اور شیروانیاں پہننے والے، کالجوں کے تعلیم یافتہ یا اسکولوں کالجوں
میں تعلیم پانے والے جو یقیناً شریفوں ہی کی نسل سے ہوں گے ایسے پاگل اور
اس قدر ذلیل درجہ کے شہدے بنے ہوئے تھے کہ خالص بازاری اور پیشہ ور

غنڈوں سے بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی، بدتمیزی اور حیوانیت کا ایک عبرتناک طوفان اور ہنگامہ تھا، کوئی دور سے جوتا دکھا رہا ہے، کوئی ہاکی اٹھا رہا ہے، کوئی بیپا بجا رہا ہے، کوئی کسی سائبان کا ٹین یا سائن بورڈ پیٹ رہا ہے، کبھی سب مل کر تالیاں بجا رہے ہیں، کبھی جانوروں کی بولیاں بولی جارہی ہیں ـــــــ پھر اس ساری غزل کا مقطع یہ تھا کہ جلسہ گاہ کے ارد گرد سڑک کوٹنے کے لیے چند ڈھیر لگے ہوئے تھے پہلے تو جلسہ گاہ پر اکا دکا پتھر پھینکے گئے اور گیس کے ہنڈے توڑ کر جلسہ گاہ میں اندھیرا کیا گیا، اور آخر میں چند ٹولیوں نے ان ڈھیروں پر کھڑے ہو کر اس بیدردی کے ساتھ بے تحاشا پتھر برسائے کہ اگر یہ سب پتھر جلسہ گاہ ہی پر جاکر گرتے تو حاضرین میں سے شاید کوئی ایک بھی صحیح سالم نہ رہتا ـــــــ جنون و درندگی کا یہ سارا تماشہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہذب اور تعلیم یافتہ، فیشن ایبل صاحبزادوں کے لباس میں "لایعقل حیوانوں" کا ایک انبوہ ہے، اور بہنگوں، آوارہ مستوں کا ایک مجمع ہے جو اپنی انسانی حیثیت کو بالکل فراموش کر کے حیوانیت و درندگی کا یہ مظاہرہ کر رہا ہے، ـــــــ اس انتخابی جنگ کے سلسلہ میں اس طرح کا مظاہرہ دیکھنے کا میرے لیے یہ بالکل پہلا موقع تھا، میں اس مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر آپس کی اس سیاسی خانہ جنگی نے چند روز اور طول کھینچا اور قوم کے "بڑوں" اور مقتدر لیڈروں نے اخلاقی زوال و انحطاط کے اس مسئلہ کو واجبی اہمیت دے کر ذہنی اصلاح اور اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں نہ کیں اور اس بارے میں جنبہ داری اور "بہر حال اپنوں کی حمایت" کی عادت نہ چھوڑی تو یہ غنڈہ گردی پوری قوم کی طبیعت بن جائے گی، اور پھر برسہا برس کی اصلاحی کوششیں بھی اس کو

نہ بدل سکیں گی،

ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے کہ جن آن پڑھ حقیقت ناشناسوں یا اسکولوں، کالجوں میں تعلیم پانے والے جن نوخیز اور ناتجربہ کار جذباتی نوجوانوں کے ذہن کو غلط تربیت دے کر آپ آج مولانا حسین احمد جیسے بزرگوں کی بے عزتی کراتے ہیں (دین و ملت کے لیے جنکی قربانیوں کی شاندار تاریخ بھی ہے) کل ایسا دن بھی آسکتا ہے کہ یہ بگڑی ہوئی ذہنیت کسی اختلاف کے موقع پر خود آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی یا اس سے بدتر برتاؤ کرے، یہ سیاست ہے، جس میں ہوا کے رخ اور عوام کے جذبات میں تبدیلی کچھ زیادہ بعید نہیں، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ؕ

دونوں ہی طرف کے ذمہ دار لیڈروں اور مقتدر رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس فرمائیں، اگر خدانخواستہ عوام اور نوجوانوں میں فتنہ و فساد کا یہ رجحان آپ کی غفلت سے اسی طرح ترقی کرتا رہا تو یقین کیجیے کہ کوئی بڑی سے بڑی سیاسی اور مادی منفعت بھی اس اخلاقی زوال کی تلافی نہ کر سکے گی،

ایسے ہنگامی اوقات، میں جاہلوں اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان برپا کر دینا اور اس کو جنون تک پہنچا دینا کوئی کمال یا دانشمندی نہیں ہے، ہر ناخدا ترس اور چالاک، آدمی یہ کھیل بڑی آسانی سے کھیل سکتا ہے ——— دیوانہ را ہوائے بس است،

ہاں اگر عزم و ہمت اور دانشمندی سے کام لے کر اپنے عوام اور نوجوانوں میں معاملات کا صحیح فہم، مضبوط کردار اور مردانہ قوتِ عمل کے اوصاف آپ پیدا کر دیتے تو یہ آپ کا کمال اور قوم کی صحیح خدمت ہوگی ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ؎ مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ،

(بشکریہ "الفرقان" بریلی، بابتہ ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ)

(دلی پرنٹنگ پریس دہلی)

ہمارے اخبارات کا غیر اسلامی اور غیر شریفانہ طرزِ عمل

مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ خطرے میں

(از جناب مولانا منظور احمد صاحب نعمانی)

"ویول پلان" اور شملہ کانفرنس" کی بدولت مسلمانوں کی مختلف سیاسی پارٹیوں اور ان کے متحارب گروہوں کی اس افسوسناک جنگ میں پھر ایک دم گرمی پیدا ہوگئی ہے جو کچھ عرصہ سے کسی قدر ٹھنڈی تھی، ایسے اہم اور پیچیدہ مسائل میں راؤں کا اختلاف کوئی خلاف توقع چیز نہیں بلکہ ناگزیر ہے، اسی طرح یہ بات کہ ایک پارٹی اگر دوسری پارٹی کے طریقۂ کار اور مسلک کو قومی مفاد کے خلاف اور غلط سمجھے تو اس کے ناکام بنانے کے لیے اس کا جد وجہد کرنا اور حدود کے اندر رہ کر اس کی تردید و تغلیط کرنا بھی یقیناً ضروری اور لابُدی ہے،

لیکن گزشتہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی (مسلم لیگ) کے حامی اکثر اخبارات نے لیگ کے سیاسی مسلک سے اتفاق نہ رکھنے والے مسلمان لیڈروں کے متعلق آبرو باختہ، گالی گلوچ، تمسخر و استہزاء اور انتہائی ناخدا ترسانہ افترا پردازی و بہتان تراشی کا جو رویّہ اختیار کر رکھا ہے وہ ان کے فسادِ مزاج، اخلاقی گراوٹ اور سیرت کی پستی کا بہت ہی گھناؤنا نمونہ ہے، جس سے یقیناً اُن کے بہت سے شریف النفس اور صاحب ضمیر ہمخیالوں کی پیشانیوں پر بھی پسینہ آجاتا ہوگا، اور ان کے دلوں کو تکلیف ہوتی ہوگی، خود راقم الحروف

ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں کا ہم خیال نہیں ہے، اور ان کے "واحد قومیت" کے نظریہ کو ملت کے لیے سخت خطرناک سمجھتا ہے، باایں ہمہ لیگ کے حامی اکثر اخبارات بالخصوص اس کے سرکاری اخبار "منشور" اور لاہور کے "احسان" کا مطالعہ اکثر و بیشتر سخت تکلیف اور دلی کراہت کے ساتھ ہی کر سکتا ہے، خصوصاً ان کے مزاحیہ کالموں کے لکھنے والوں نے تو شاید اپنے کو بالکل ہی غیر مکلف اور قیودِ شرافت و انسانیت سے یکسر آزاد سمجھ لیا ہے، اردو زبان یقیناً اتنی تنگ نہیں ہے کہ کسی مسلک پر کڑی سے کڑی تنقید شرافت و سنجیدگی کے ساتھ نہ کی جا سکے،

عبرت کی بات ہے اسی ملک اور اسی آب و ہوا میں ایک دوسری قوم بھی رہتی ہے، اس کے مہاسبھائی اور کانگریسی عنصر میں بھی "اسی ویول پلان" کے بارے میں بالکل اسی نوع کا اختلاف تھا، ان کے اخبارات نے ایک دوسرے کے مسلک پر تنقیدیں کیں اور خوب زور و قوت کے ساتھ کیں، لیکن کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ اس تردید و تنقید میں ان کے کسی اخبار نے تذلیل و توہین اور آبرو باختگی کا وہ بازاری اور غیر شریفانہ طریقہ اختیار کیا ہو جس کو ہمارے ان وکلاء اسلام و مسلمین نے اپنا شعار بنا لیا ہے،

جاہلانہ اور غیر شریفانہ ؛

اگر صرف انہی چند اخبار نویسوں کی یہ نجی بیماری ہوتی اور عام ملت پر اس کا کوئی برا اثر پڑنے والا نہ ہوتا تو شاید اس کو برداشت کیا جاتا اور اس کے خلاف کسی عمومی احتجاج کی ضرورت نہ پڑتی، مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو اس سے سخت صدمہ پہنچ رہا ہے، دوسرا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اختلاف کی خندقیں اور زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہیں، اور ان کے پاٹنے کے امکانات بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں، بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ان اخبارات کی چندے یہی روش رہی تو کچھ عجب نہیں

کہ جابجا خون خرابہ کی بھی نوبت آئے اور مسلمان ہی مسلمانوں کے گلے کاٹیں

اور سب سے زیادہ افسوسناک ایک نتیجہ یہ پیدا ہو رہا ہے کہ ان اخبارات کی اس غلط روش کی بدولت قوم کے عوام کا مزاج بڑی تیزی کے ساتھ بگڑ رہا ہے، اعتدال اور سنجیدگی ان سے بالکل نکلتی جارہی ہے، اور اس کی بجائے اختلافِ رائے کا بھی جاہلانہ، غیر شریفانہ اور فساد انگیز طریقہ ان میں عام ہوتا جا رہا ہے، کسی قوم کا مزاج بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ اس زمانہ میں اس کے پریس ہی کا ہوتا ہے، یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جبکہ کانگریس منسٹریاں قائم تھیں، اور لیگ و کانگریس کا اختلاف زوروں پر تھا، اور ہمارے یہ اخبارات بالکل اسی طریقہ پر مسلمان عوام کو "اخلاقی تربیت" دے رہے تھے، اس زمانہ میں ایک دفعہ میں لکھنؤ سے سلطانپور جا رہا تھا، راستہ میں ریل کے پاخانہ میں جانا ہوا، تو دیکھا کہ وہاں کانگریس کے دو بڑے (بلکہ کہنا چاہیے کہ سب سے بڑے) لیڈروں کو نام بنام نہایت گندی اور متعفن گالیاں لکھی ہوئی ہیں، غالباً یہ کسی ناسمجھ مسلمان لڑکے کی حرکت ہوگی، بہرحال مجھے یہ محسوس کرکے اس وقت بے حد دکھ ہوا کہ ہمارے ناعاقبت اندیش اور قیدِ شرافت و دیانت سے آزاد، اخبار نویسوں اور بے لگام مقرروں نے ہمارے قومی مزاج کو اتنا فاسد اور فضا کو اتنا گندم کر دیا ہے کہ ہمارے نوخیز بچے دوسری قوم کے رہنماؤں کو پاخانوں میں گالیاں لکھ لکھ کر لذت حاصل کرتے ہیں، کسی قوم کی اخلاقی گراوٹ کا یہ آخری ہی مقام ہوسکتا ہے،

اس واقعہ کا لکھنا درحقیقت خود اپنے آپ کو رسوا کرنا ہے، لیکن صرف اس لیے اس کو میں نے حوالۂ قرطاس وقلم کر دیا ہے کہ شاید اسی سے ہمارے ان اخبار نویسوں کو کچھ عقل آئے جو اپنے بے نیاز ہوش وجوش میں یا اپنے بازار میں گرمی پیدا کرنے کے لیے قوم کا مزاج بگاڑ رہے ہیں، اور بگاڑتے ہی چلے جا رہے ہیں،

اسلام اور اخلاق!

کاش! اسلام کے نام پہ ان لڑنے والوں کو کبھی یہ سوچنے کی بھی توفیق ہو کہ اس بارے میں اسلام کی کچھ تعلیمات اور ہدایات بھی ہیں، قرآن پاک کا ارشاد ہے:

قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ (بنی اسرائیل، ع ۶)	"اے رسول! میرے بندوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اچھی ہی بات کہیں، شیطان (بری باتیں اُن سے کہلوا کے) ان میں اختلاف اور دشمنی ڈالنا چاہتا ہے"
لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (فصلت)	"اچھی بات اور بری بات ہرگز برابر نہیں، تمہیں چاہیے کہ اپنے مخالفوں کو اچھے ہی طریقہ سے جواب دو"!

نیز اہلِ ایمان کو بتاکید اس کی ہدایت کی ہے کہ:-

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ، (حجرات، ع ۲)	اے ایمان والو! تم میں کوئی گروہ دوسرے گروہ سے ہرگز تمسخر نہ کرے، شاید کہ وہی ان سے بہتر ہو"!
وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (حجرات، ع ۲)	"اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور (برے اور مکروہ نام رکھ رکھ کے) نہ چڑاؤ، ایمان کے بعد فاسق (یا اس جیسا کوئی دوسرا) نام نکالنا اللہ کے نزدیک برا ہے، اور جو اس حرکت سے باز نہ آئیں وہ ظالمین ہیں"!

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ، (حجرات ، ع ۲)	"اے ایمان والو! بہت ہی بدگمانیاں اور تہمت طرازیوں سے بچو ، بعض بدگمانیاں صرف گناہ ہوتی ہیں"
وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ، (پ ۳۰ ، ہمزہ)	"بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے واسطے جو بیٹھ پیچھے یا رُو در رُو دوسرے کو عیب لگاتا ہے اور اس کی بدگوئی کرتا ہے"

قرآن مجید نے تو مشرکوں کے معبودانِ باطل تک کے بارے میں ہدایت کی ہے :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ، (انعام)	"تم ان مشرکین کے دیوتاؤں کو بھی گالی نہ دو کہ مبادا وہ نادانی اور بیجائی سے اللہ کو گالی دینے لگیں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا ہے :

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ، (حدیث)	"میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں"

آپؐ کی ہدایت تھی :

عَلَیْكَ بِالرِّفْقِ وَاِیَّاكَ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ ،	"نرمی اور شیریں گفتاری کو اختیار کرو اور سخت کلامی اور بدگفتاری سے بچو"

ایک اور حدیث میں ہے : آپؐ نے فرمایا :

اِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ ،	"اللہ تعالیٰ گالی دینے والے بدزبانوں سے ناراض ہوتا ہے"

افسوس! جس قرآن اور جس رسولؐ کی یہ تعلیم ہے ، ان کے ماننے والی امت کے

نمائندوں کا یہ حال ہے کہ آپس کے اختلافِ رائے میں سنجیدہ بحث و تنقید اور شریفانہ افہام و تفہیم کے بجائے دلوں کو پھاڑنے والی گالیوں اور تہمت تراشیوں کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے، اور پھر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری اس قومی جماعت کے با اثر لیڈروں میں جو سنجیدہ بھی ہیں، اور جو شرافت و آبرو کی قیمت کو جان سکتے ہیں، انھوں نے بھی اس فساد اور گندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے، حالانکہ ابھی وقت ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اس فساد انگیزی پر قابو پا سکتے ہیں، ایسی حالت میں اُن کی پُر اطمینان خاموشی کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ احتساب کی رُوح اور بُرے بھلے کی تمیز ہمارے اِن خواص سے بھی رُخصت ہو چکی ہے،

("الفرقان" بریلی، بحوالہ "زمزم" لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۴۵ء)

لیگی ذہنیت

(مدیر "زمزم" کے نام ایک خط)

علی گڑھ سے ایک صاحب جو بی اے ہیں، اور ہر وقت مسلم یونیورسٹی کو قریب سے دیکھتے رہتے ہیں، اپنے ایک نجی مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"مولانا! آپ میرے خیالات سے واقف ہی ہیں، کہ میں اور میرا سارا خاندان پاکستان کا حامی اور لیگ کی پالیسی کا پیرو ہے، مگر چند امور ایسے ہیں جن کا تصور مجھے گھُن کی طرح کھائے جا رہا ہے، اگر میری بے چینی حد سے نہ بڑھ گئی ہوتی تو میں آپ پر اُن کا اظہار کبھی نہ کرتا، میں نے ہمیشہ تعلیم یافتہ حضرات کو جاہل عوام پر ترجیح دی ہے، کیونکہ علم خواہ وہ کیسا ہی ہو بہرحال جہل پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن جب سے میں نے یونیورسٹی کے طلبہ کی.... گردی دیکھی ہے علم کے نام سے میری روح کانپنے لگی ہے، اللہ میری بے چینی دور کرے، اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ پر رحم فرمائے، ان کی حرکتوں کو دیکھ کر تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ تعلیم انسان کو حیوان اور حیوان کو درندہ

بنانے میں خاص کمال رکھتی ہے، خدا کی قسم! جاہل، ان تعلیم یافتہ حضرات سے ہزار درجہ بہتر ہے، رامپور کا شُہدہ پھر شریف ہے کہ وہ اپنے آپ کو شریف نہیں سمجھتا، کہاں سے وہ الفاظ لاؤں کہ ان روشن خیالوں کی سیرت کا ہلکا سا تصور ہی دماغ میں پیدا ہو جائے، دیکھتا ہوں اور تعلیم پر ہزار ہزار لعنت بھیجتا ہوں، دنیا کی وہ کونسی بدزبانی ہے جو اُن کی زبان پر نہ ہو، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اُن کی زبان سے سُن لیجیے: "مولوی ..... سوّر کا بچہ، حرام زادہ" جہاں کسی کتّے کو دیکھا اور ہنس کر بولے "دیکھنا ذرا مولوی ..... تشریف لے جا رہے ہیں" اور جب سے الیکشن کے سلسلے میں انھوں نے باہر قدم نکالا ہے زمین تھرا اٹھی ہے"

خدا اور مولویت

ابھی ایک اقتباس اور بھی ہے :۔

"خفا نہ ہوں، میری دعا ہے کہ پاکستان جلد قائم ہو، مگر میرا خیال ہے کہ پاکستان قائم ہونے سے پہلے خدا نہ کرے، اسلام کا گورستان بننے والا ہے، مسلم یونیورسٹی میں غالب اکثریت کمیونسٹوں کی ہے، مگر ایسے کمیونسٹ نہیں جو زبان سے بھی اقرار کریں بلکہ ایسے دشمنِ خدا جو آجکل سب سے زیادہ خدا کا نام لے رہے ہیں،

گذشتہ ہفتہ یونیورسٹی کے ایک ہونہار نے میری موجودگی میں ایک صاحب سے کہا، مولویت کو ختم کیے بغیر خدا ختم نہیں ہوگا، دوسرے نے کہا، بھئی خدا ابھی بہت سخت جان نکلا، مگر اب

ہمیں پچھاڑنے کا موقع مل گیا ہے، یہ بھی کئی بار سُنا: ہماری جنگ نہ مولوی سے نہ بالوی سے، ہماری جنگ تو خدا سے ہے،

ایک صاحب نے یونیورسٹی سے قادیان کو لمبا چوڑا خط لکھا ہے، کہ علماء سوء کی مذمت میں اسلامی لٹریچر میں جو بھی نظر سے گذرا ہو خصوصاً محدثین اور بزرگوں کے اقوال وہ سب جمع کر کے بہت جلد ارسال کر دیجیے، یہ امتحانات کا وقت ہے، مولویوں کو ختم کرنے کے لیے آپ ہمارا ہاتھ بٹائیے، فلاں احمدی صاحب جو یہاں تعلیم پا رہے ہیں ان کا سفارش نامہ بھی منسلک ہے،

غرض کیا کیا لکھوں، چاہتا ہوں کہ خودکشی کر لوں، یا ان ..... نام و نشان مٹا دوں، آپ کو پاکستان پر غصہ ہے، مجھے مسلمان پر کہ خدا نے اس مخلوق کو کیوں پیدا کیا ....."

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، یہ سطور ہمارے تبصرے سے بے نیاز ہیں، (بشکریہ اخبار "زمزم" لاہور، مورخہ ۱۱ رجنوری ۱۹۴۶ء)

ضمیمہ

(۱)
پاکستانی تہذیب کا نمونہ

ہم نے پنجاب کے لیگی اخبارات کے متعلق بطور شکایت نہیں بلکہ بطور اظہار واقعہ عرض کیا تھا کہ انہیں اپنی زبان پر قابو نہیں ہے، ان کا شیوہ ہے کہ محض اختلافِ رائے کی بنا پر عقل و نقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر برہنہ ہو جاتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ثبوت کے لیے زیادہ کاوش کرنی نہیں پڑی، اور ایک لیگی معاصر نے فوراً ہماری امداد فرما کر ہمارے خیال پر مہر تصدیق ثبت فرما دی، وہ لکھتا ہے :-

"ہمارے ان معلمِ اخلاق کی اپنی زبان اور اپنا لب و لہجہ ایسا ہے کہ لکھنؤ کی بھٹیاریاں شرما جائیں، لیکن پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سہارنپور مظفر نگر اور مراد آباد کے اطراف کے گھسیارے اور بھٹیارے فاقہ کشی سے مجبور ہو کر جب جوتیاں چٹخارتے ہوئے لاہور پہنچتے ہیں تو انھیں اپنے سے جاہل تر مالک اخبار مل جاتا ہے ......"

ہم پھر کہتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کے شریفانہ اندازِ تحریر سے کوئی شکایت نہیں، شکایت ہوتی تو مسٹر جناح سے ہوتی جو اس نجیب طبقہ کے امامِ اعظم ہیں، اور جن کے آستانہ سے شرافت کی یہ قاشیں تقسیم ہوتی ہیں، البتہ یہ ضرور عرض

کریں گے کہ پاکستان کے علم بر داروں کو عصبیت جاہلیہ کی کافرانہ ادائیں زیادہ زیب نہیں دیتیں، ایک طرف پاکستان کا نعرہ، تمام مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ، اسلام اور شریعت کی بیتابانہ دُہائی اور دوسری طرف صوبائی سرپرستی کی غلاظت میں آلودگی ایک ایسی جاہلانہ منافقت ہے جس کی ایجاد کا فخر ہمارے معزز معاصر کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا، شاید مسٹر جناح نے یونینسٹ پارٹی کے اختلاف کے موقع پر یہ غلط ہی کہا ہوگا کہ "پنجابیوں میں کوئی کیرکٹر نہیں ہوتا"، مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ قائد اعظم کا غصہ غریب سہارنپور، مظفر نگر اور مراد آباد کے فاقہ کش گھسیاروں اور بھٹیاروں پر اُتارا جائے؟ اور پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال کھڑا کر کے جاہلی تصوّر کے صنم اکبر کی پوجا شروع کر دی جائے؟ ہمیں حیرت ہوتی اگر معزز معاصر یہ طرز نگارش اختیار نہ کرتا، اس نے ہماری توقع کے مطابق وہی کہا جس کا اظہار ہم گذشتہ اشاعتوں میں کر چکے ہیں، (زمزم، لاہور، ۱۹ اگست ۱۹۴۵ء)

(۲)

شیطان کا عہدِ شباب

جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف ایک اشتہار شائع کیا گیا ہے، اس پر ایڈیٹر زمزم لاہور نے شذرات میں "شیطان کا عہدِ شباب" کے زیر عنوان ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:۔

ہمارے پاس الٰہ آباد سے ایک اشتہار پہنچا ہے، جس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی ایک گفتگو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بارے میں نقل کی گئی ہے، یعنی حکیم الامت نے مولانا آزاد کو "پکا غیر مقلد" قرار دے کر فرمایا کہ وہ تو نجات کے لیے اقرارِ رسالت کو بھی ضروری قرار

نہیں دیتے، بلکہ ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں کہ "نجات صرف اسلام ہی پر موقوف نہیں بلکہ توحید اور نیک اعمال کی برکت سے ہر مذہب والا نجات پانے کا مستحق ہے" اور حضرت مولا مدنی کے متعلق فرمایا کہ "وہ فنا فی الکانگریس ہو کر حدود شرعیہ سے متجاوز ہو چکے "

جن صاحب نے جواب کے لیے ہمارے پاس اشتہار بھیجا ہے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ الیکشن اور انتخاب کا زمانہ ہے جس میں ہر قسم کے شیاطین رسیاں توڑ کر میدان میں آگئے ہیں، ابھی تو شیطنت کی ابتداء ہے، دیکھتے رہیے آگے کیا ہوتا ہے، یہ انتخاب ہے انتخاب، جو چُن چُن کر جرائم پیشہ لوگوں کو میدان لاتا اور انگلیوں پر نچاتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج سے جو لوگ واقف ہیں' وہ جان سکتے ہیں کہ اس قسم کی بردی اور چھچھوری گفتگو مولانا کی نہیں ہو سکتی، اس قسم کی رائیں تو قائدِ اعظم مسٹر جناح کے بارے میں بھی نقل کی جا سکتی ہیں، علامہ شبلی مرحوم، مولانا محمد علی مغفور اور دیگر اکابرِ احرار نے مسٹر جناح کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے انھیں پیش کرنا یقیناً دلآزاری کا موجب ہو گا،

(زمزم، لاہور ۳ر نومبر ۱۹۴۵ء)

(۳)

ایک نیا فتنہ

علماءِ دیوبند کے خلاف محاذ

آجکل دارالعلوم دیوبند اور علماء دیوبند کے خلاف ایک نیا محاذ تیار کیا جا رہا ہے، اس "جہاد" کی وجہ یہ قرار دی گئی ہے کہ دیوبند کے صدر مدرس کانگریس کی حمایت کرتے ہیں، بعض مسلم لیگی اخباروں نے تو یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دیوبند کی امداد

کرنا گویا مسلمانوں کے قتل میں امداد کرنا ہے، ایک لکھنوی معاصر کے صفحات پر مسلسل مضامین شائع ہو رہے ہیں، جن میں دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ کو براعظم ہند میں سب سے سنگین اور عظیم خطرہ بتایا جا رہا ہے، دارالسلام کو ایک "دیوتا استھان" قرار دیا جا رہا ہے، صاف صاف دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ "دیوبند کو فنا کر دیا جائے گا"،

اور یہ سب اس لیے کہ مولانا حسین احمد صاحب کے سیاسی رجحانات کانگریس کی طرف ہیں،

ہم ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کے سخت نقاد ہیں، اور آج بھی ہم وہاں کے حالات سے مطمئن نہیں ہیں، لیکن عبرت ہوتی ہے مسلمانوں کے ایک گروہ کی اس ذہنیت کو دیکھ کر کہ وہ کس طرح جماعت بندی کے تعصبات سے مغلوب ہو کر خود اپنے قومی اداروں کے دشمن بن جاتے ہیں، سیاست ایک ہنگامی اور وقتی کھیل ہے، لیکن قومی ادارے ہر قوم کی زندگی میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں، ان کو سیاست کا کھلونا نہیں بنایا جا سکتا، ہم دیوبند کے حالات سے کبھی بھی مطمئن نہیں رہے لیکن پھر بھی اس کو مسلمانوں کا ایک مرکزی اور قومی مرکز سمجھتے ہیں، اور اسی حیثیت سے اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں، اگر یہ معاصرین دیوبند کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے مضامین لکھتے تو ہم سب سے پہلے اُن کی تائید کرتے، اس لیے کہ ہمارا نقطۂ نظر دیوبند کے متعلق بھی وہی ہے جو علیگڑھ کے نظم و نسق کے متعلق ہے، اور ہم اس نظم و نسق کی خرابیوں کا ذمہ دار علیگڑھ کے وائس چانسلر کو سمجھتے ہیں، اس لیے اُن کے خلاف اپنی قلم کی قوت صرف کرتے ہیں، اور اسی بدنظمی کا یہ نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ کا ضبط و نظم بھی برباد ہو گیا ہے،

صورتِ حال کا اختلاف؛

اور جب وہ جماعتی سیاست میں اپنے ذہنی انتشار کے عامیانہ اور جارحانہ مظاہر

کرتے ہیں تو ہم اس صورتِ حال کا الزام براہِ راست وائس چانسلر پر رکھتے ہیں جنھوں نے طلبہ کو سیاسی میدان میں آلۂ کار بنالیا ہے، اگر یہی صورت دیوبند میں ہوتی اور ہم دیوبند کے طلبہ کو بھی اسی شدت اور بے اعتدالی کے ساتھ کسی سیاسی فریق کے خلاف یا موافق ہنگامہ کرتے دیکھتے تو بلاشبہ وہی سب دیوبند کے متعلق بھی کہتے جو علیگڑھ کے متعلق کہہ رہے ہیں، لیکن دیوبند کے صورتِ حال مختلف ہے، اور حضرت مولانا حسین احمد خراجِ تحسین کے مستحق ہیں، کہ سیاست میں اپنے ذاتی عقائد کے تحت موصوف نے اپنے طلبہ کو آلۂ کار نہیں بنایا، اور دارالعلوم کے ضبط و نظم کو اپنی سیاست سے بالاتر رکھا، اگر ہم یہ سنتے کہ دارالعلوم کے طلبہ نے دیوبند کے اسٹیشن پر کسی مسلم لیگی لیڈر کے خلاف اسی طرح بداخلاقی کا مظاہرہ کیا جس طرح علیگڑھ کے طلبہ نے اپنی تہذیب و تربیت کو رسوا کیا ہے تو بلاشبہ ہم اس کا الزام مولانا کے سیاسی مشاغل پر رکھتے، جس طرح کہ ہم علیگڑھ کے ضبط و نظم کی خرابی کا الزام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی سیاسی خود غرضیوں پر رکھتے ہیں، ہمیں اس معاملہ میں لیگ کے سیاسی عقائد پر کانگریس کے سیاسی عقائد کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہم صرف تعلیم، تربیت، تہذیب اور اخلاقِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے طرزِ عمل کو دیکھ رہے ہیں، اور اس حد تک ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مدنی نے اپنے سیاسی عقائد اور اپنے حلقۂ درس کے فرائض میں مناسب توازن قائم رکھا ہے،

شرمناک حملے!

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شرمناک حملے جو دیوبند پر کیے جارہے ہیں جماعتی تعصبات کا نتیجہ ہیں، اس ادنیٰ درجہ کی سیاست نے جس کو بہت سے مسلمانوں نے اپنا تمغۂ امتیاز بنالیا ہے اسلامی اور اخلاقی رواداری کو بالکل ختم کردیا ہے،

اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے سیاسی عقائد کا احترام کرنے پر آمادہ نہیں، ہر اختلاف مخالفت ہے، اور مخالفت بھی ایسی کہ اشخاص سے گذر کر اداروں پر بے جا حملوں کی صورت اختیار کرتی ہے، یہ سیاسی فتنہ دراصل ایک ذہنی فتنہ ہے، حضرت مولانا مدنی کے سیاسی عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اس اختلاف کی بناء پر دیوبند کو تباہ کرنے کی کوشش ایک حسرتناک جہالت ہے، کتنا ہی بڑا سیاسی یا مذہبی مسئلہ زیر بحث ہو، اختلاف کتنے سخت ہوں لیکن کسی مسئلہ کی اہمیت یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے لیے زبان اور قلم کی بدتمیزی اور بیہودگی اور غنڈہ پن جائز سمجھا جائے، جو لوگ ـــــ خواہ وہ لیگی ہوں یا کانگریسی ـــــ اس قسم کی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ملک و ملت کے بدترین دشمن ہیں، کسی مہذب اور ذمہ دار سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں، اور وہ اس کے مستحق نہیں کہ ان کی بات کو توجہ کے ساتھ سنا جائے،

الیکشن کے ہنگامے عنقریب برپا ہونے والے ہیں، اور بہت سے بدلگام نوجوان لیڈروں کی فوج میں بھرتی کر کے اس میدان میں لائے جائیں گے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ ان لڑکوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑی جائیں گی، اور بدزبانی اور بدتمیزی کے عبرتناک مناظر دیکھنے میں آئیں گے، لیکن کم از کم ہم اپنے معاصرین سے اس قدر عرض کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ ایک معمولی اخلاقی معیار کو قائم رکھ کر ضبط و نظم کی طرف عوام کی رہنمائی کریں، اور دنیا کو ایسی صحافت پر ہنسنے کا موقع نہ دیں جس کی عصبیت سیاست کے عارضی ہنگاموں میں بے قابو ہو کر خود اپنی ہی قوم کے اخلاق کو بدنام اور رسوا کرنے کی ہمت افزائی کرنے لگے،

(پیام دکن بہ حوالہ زمزم لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء)

(۴)

نادان دوست

جناب اطہر جلیل صاحب بجنوری

ہندو اخبارات ان مسلمانوں کو جو مولانا آزاد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دوسرے کارکنان و لیڈران کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں، غنڈے، شہدے اور اسی قسم کے دیگر تلخ القابات سے یاد کر رہے ہیں، مسلم لیگ کی حمایت میں جو لوگ مظاہرہ کرتے ہیں ان میں سمجھدار بھی ہوتے ہیں اور ایسے بھی جو سیاست کی ابجد سے معمولی۔۔ بھی نہیں رکھتے، مگر ہندو اخبارات کی نظر میں سب شہدے، غنڈے اور اوباش ہیں، مسلم لیگی اخبارات ان کے جواب میں انہی خطابات سے انھیں نوازتے ہیں جو نائب رسول ہیں، ایثار پیشہ ہیں، قوم و ملت کی خاطر انھوں نے بارہا اپنے وجود کو خطرات میں ڈالا ہے، وہ آزمائشوں کی سخت سے سخت بھٹی سے پاک و صاف ہو کر نکلے ہیں، مگر آج قوم کی نظر میں وہ معتوب ہیں، مغضوب ہیں، کشتنی و گردن زدنی ہیں، غور کیجیے، دشنام طرازیوں اور تہمت تراشیوں کی زد میں کون لوگ آرہے ہیں؟ اس طرح مسلمانوں کے دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف ہو کر خون کی پیاس کو سب و شتم کے ذریعہ بجھانا چاہتے ہیں، اب خبریں آرہی ہیں کہ ایک طرف احرار یوں کا سر پھوڑنے کے لیے ملک لال خاں صاحب کی سرپرستی میں لٹھ بند فوج تیار ہو رہی ہے، یہ فوج کس کا سر پھوڑے گی؟ کس کا خون بہائے گی؟ کس کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر اپنے بہیمانہ جذبات کو ٹھنڈا کرے گی؟ اُمتِ محمدیہ کے اُن نام لیواؤں کا جن کا جرم صرف یہ رہا ہے کہ کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کراؤ۔

اسی طرح سننے میں آرہا ہے کہ رضاکارانِ احرار نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کے لیئے تیار رہیں،

اگر کسی جگہ کانگریسی اور لیگی جلسوں جلوسوں میں آپس میں ٹکر ہو جاتی ہے تو اخبارات میں سرخی آتی ہے کہ فلاں جماعت پٹ گئی، فلاں جماعت میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، فلاں نے اپنی تقریر میں یہ کہا اور وہ کہا، شاید اس قسم کی سرخیاں قائم کرکے ان اخبارات کا مقصد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو مرعوب کر سکیں گے، مگر اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ لوگوں کی طبیعتوں کا رجحان پہلے جس طرف ہو گیا تھا اب بھی اسی طرف ہے، اس قسم کی سرخیوں سے سوائے اشتعال کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا، جس طرح ہندو اخبارات کی سرخیاں مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا سامان مہیا کرتی ہیں، اسی طرح مسلم اخبارات کے نشتر بھی مسلمانوں ہی کے کلیجوں کو چھلنی کر رہے ہیں،، نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ ہندو کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کا کچھ نقصان ہوتا ہے، مگر مسلمانوں کے اندر بغض وعناد اور ایک دوسرے سے نفرت کے جذبات بڑھتے جا رہے ہیں، اب تک تو اس قسم کے مظاہرے لیگ ہی کے طرۂ امتیاز بنے ہوئے تھے، مگر اب کلکتہ کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ ان مظاہروں کو برداشت نہیں کیا جائے گا، اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا، ابھی الیکشن دور ہے، مگر فسادات کے خوابیدہ فتنے بیدار ہو کر ہاتھ منہ دھونے کی تیاری میں مصروف ہیں،

کاش! مسلم اخبارات کے مدیر اب بھی ہوش کریں، اور قوم کے سربرآوردہ حضرات اب بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں، مخالف کی آواز اور نعروں کی صداؤں کو تحمل سے برداشت کریں، ہر ایک کی تقریر سنیں، اور دماغ سے فیصلہ کریں، پھر دماغ جس طرف راستہ دکھائے چلیں، اور ووٹ دے کر اپنی

ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائیں، یہ ہماہمی بھی الیکشن تک ہے، اس کے بعد خود ہی یہ فتنہ فرو ہو جائے گا ؎

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

(۵)

"انجام" کا ایک سفید جھوٹ

"انجام" دہلی کے نامہ نگار خصوصی نے دو کروڑ کے افسانہ کے بعد ایک اور سفید جھوٹ گھڑا ہے، کہ مولانا آزاد قوم پرستوں کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد میں اختلاف پیدا ہو گیا،

میں پوری واقفیت اور پورے وثوق کے ساتھ اس خبر کی تردید کرتے ہوئے، دوسری مرتبہ چیلنج کرتا ہوں کہ اگر اس خبر میں شمہ برابر بھی صداقت ہے تو نامہ نگار "انجام" پہلے کی طرح اس کا جواب بھی سکوت سے دے گا،

(مولانا) محمد میاں ناظم جمعیۃ العلماء ہند
(زمزم، لاہور، ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

(۶)

آزاد کا آئینہ اور "یار کی تصویر"

"زمیندار" لاہور، ۳ نومبر ۱۹۴۵ء نے مولانا آزاد کے خلاف "بگڑا ہوا عالم" کے عنوان سے ایک نظم شائع کی ہے، ایڈیٹر "زمزم" لاہور نے اس پر یہ شذرہ تحریر کیا ہے:-

معاصر "زمیندار" نے کسی شقی ازلی کی نظم "بگڑا ہوا عالم" کے عنوان سے شائع کی ہے، جس میں مولانا آزاد کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ خود "زمیندار" بھی اگر انھیں مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جناح کی شان میں استعمال کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، "زمیندار کو حق ہے کہ وہ جس حد تک چاہے گرے، اور جس قدر چاہے اپنی روایات کو بٹہ لگائے، مگر یہ گرنا بھی صحافت کی حد تک ہی محدود ہونا چاہیے" ہم اس نظم کو دیکھ کر حیران ہیں کہ زمیندار کے ذوقِ سلیم کی داد دیں یا ناظم کی شقاوت اور سیہ بختی پر ماتم سرا ہوں؟

"زمیندار" کو مولانا آزاد سے ہزار اختلافات سہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس جہنمی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ عقل و نقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر ضرور ہی شائع کر دیا جائے، نظم کا پہلا ہی شعر ملاحظہ ہو:

جاہل ہے تو سو مرتبہ بگڑے بھی بنے بھی
بگڑا ہوا عالم ہے کہ بپھرا ہوا خنزیر

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معاصر "زمیندار" کا خاتمہ بالخیر کس صورت میں ہوگا اور وہ اللہ کو کیا جواب دے گا جو خنزیر سے بھی بدتر شکل بنانے پر قادر ہے، رہے شاعر صاحب تو اس سیہ بختی کی قیمت بس اتنی ہے کہ اخبار میں نام آگیا، اپنے کلام کو خود سو بار پڑھا، ہزار بار دوستوں کو سنایا، اور نفس دنی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی" ہم ایسے اشقیاء کے لیے نہیں اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کرتے ہیں:

لا یرمی رجل رجلاً الا ارتدت علیہ، (بخاری)	"جو شخص جس کسی کو جن الفاظ میں یاد کرے گا وہ اسی پر لوٹائے جائیں گے"

ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے رسول کا ارشاد سچا ہے، اور ہمیں یقین ہے اور خلق

مسیح کی طرح یقین ہے کہ اگر "مولانا مشقی" نے توبہ نہ کی تو تعجب نہیں کہ اس کی موت خنزیر کی موت ہو، اور قیامت میں بھی اس کا حشر خنزیر کی شکل میں ہو، ہمیں یہ تو منظور ہے کہ یہ بدبخت خنزیر کی موت مرے مگر یہ منظور نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد غلط ہو جائے، (زمزم، لاہور، ۵ ۱۹۴۵ء)

(۷)

حق پر کون ہے ؟

"زمزم" لاہور نے ایک شذرہ میں روزنامہ "انجام" دہلی کے ایک مقالۂ افتتاحیہ کی زبان پر تبصرہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لیگی اخبارات اسلامی اخلاق تو دور کی بات ہے عام اخلاق و تہذیب سے بھی کتنے عاری ہو گئے تھے، "زمزم" نے یہ شذرہ "حق پر کون ہے" کے عنوان سے ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کے شمارہ میں چھاپا تھا، ملاحظہ ہو:۔

"انجام" ہفتہ وار ایڈیشن مورخہ ۱۲ دسمبر کے مقالۂ افتتاحیہ میں اپنے روزمرہ کے انداز میں لکھتا ہے کہ "یہ بزرگ مولوی جو آج ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں کانگریس کے زرخرید ہیں،، اور "ریاکار مولوی"۔ "کانگریس کے زرخرید مولوی" سے خطاب کیا ہے، سب سے پیشتر تو ہمیں ایڈیٹر "انجام" کی شرافت کا ماتم کرنا چاہیے، کہ اُن مولویوں کے بارے میں جن کی تمام عمر جیل کی چار دیواری میں مادرِ ہند کی آزادی کے لیے کٹی، یہی وہ مولوی ہیں جنھوں نے تفسیرِ قرآن لکھی، تمام عمر اسلامی تعلیمات میں صرف کی، آج ان کی قربانیوں اور اسلام کی خدمت کے صلہ میں "ریاکار" اور "کانگریس کے زرخرید" وغیرہ کا خطاب دیا جا رہا ہے خلاف صرف سیاسی ہے، انہی مولویوں کی دیانتداری کی ایک مثال ذیل میں درج ہے:۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے سلسلہ میں (میرٹھ ڈویژن) کے ایک کانگریسی نے مولانا حسین احمد مدنی کو ایک لاکھ روپیہ دینا چاہا، لیکن مولانا نے انکار کردیا، اور فرمایا کہ خواہ الیکشن ہارنا پڑے لیکن میں روپیہ نہ لوں گا، (ریاست دہلی)

کاش! یہ لیگی چندہ ووٹوں کے حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی بے بنیاد خبریں اور الزامات لگانے سے پرہیز کریں اور "لفظ مسلم" پر عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کریں،

ایڈیٹر انجام آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ علماء سیاست کو سمجھنے سے محروم ہیں" لیکن مدیر انجام اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام اور سیاست علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں، آگے چل کر آپ لکھتے ہیں "کوئی مولوی کانگریسی وزارت میں وزیر نہیں بنایا گیا، اور نہ کوئی مولوی کانگریس کی مجلس عاملہ میں ہے" کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ جماعت جو مسلمانوں کی "واحد نمائندہ جماعت" کہلاتی ہے اپنی وزارت کے زمانہ میں کسی مولوی کو وزیر بنایا تھا؟ جہاں تک مجلس عاملہ کا سوال ہے خود مولانا آزاد صدر رہیں، (نامہ نگار)

(۸)

"انجام" کی زہر چکانی اور اس کا جواب!

دہلی کے ایک گورنمنٹ پرست لیگی اخبار "منشور" ۱۶ دسمبر ۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے خلاف زہر اگلا گیا ہے جو سراسر جھوٹ اور تہمت تراشی پر مبنی ہے، طلبائے دار العلوم آج سے نہیں اور اس تقریر کے بعد سے نہیں بلکہ جب سے حضرت مولانا آسام سے دیوبند تشریف لائے ہیں ان کے جاں نثار اور وفادار خادم ہیں، اس سے پہلے بھی مولانا مدظلہٗ کو دار العلوم سے علیحدہ کرنے کی کوشش

کی گئیں مجلسِ شوریٰ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ نے اپنی پارٹی کے ساتھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا کر مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ان حضرات کا وہ عبرتناک انجام جو قدرت کے ہاتھوں ان کے اوپر نازل کیا گیا دارالعلوم کی مقدس سرزمین کبھی نہ بھولے گی، بعینہٖ مَنْ حَفَرَ بِئْرًا لِاَخِیْہِ فَقَدْ وَقَعَ فِیْہِ والی مثال صادق آئی، مجھے اربابِ مسلم لیگ بتائیں کہ اس وقت بھی طلبہ کا کس قسم کا ہاتھ تھا؟ کیا وہ قدرت کا خاموش انتقام نہ تھا؟

"منشور" لکھتا ہے کہ "دارالعلوم کا علمی ماحول مولانا مدنی کی سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہوگیا" اللہ اکبر! اس قدر جھوٹ، اتنا افتراء، الحمد للہ! آج جب کہ بڑی بڑی برطانیہ پرست یونیورسٹیوں کے طلبہ الیکشن میں پھنس کر درحقیقت درس و تدریس کو بھول گئے، دارالعلوم کی ہر درسگاہ طلبہ سے اتنی بھری ہوئی نظر آتی ہے کہ اکثر طلبہ کو باہر بیٹھنا پڑتا ہے، دن رات قال اللہ قال الرسول کی صدا گونجتی رہتی ہے،

نامہ نگار "منشور" کی مجلسِ شوریٰ سے حسن ظنی ملاحظہ ہو، لکھتا ہے کہ: "مولانا مدنی کو ڈر ہے کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد نہ ہوجائے"، سبحان اللہ جس آہنی انسان کے فیصلہ کو بڑی بڑی قوتیں نہ رد کرسکیں، برطانیہ اور اس کے وحشیانہ مظالم جس کے جذبۂ آزادی کو نہ دبا سکے اسے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ پابند کردے، کیسا معصوم تخیل ہے! ع این خیال است و محال است و جنوں

آخر میں میں تمام طلبائے دارالعلوم سے کہتا ہوں کہ اگر اربابِ شوریٰ مولانا مدنی مدظلہ کو الگ کرسکتے ہیں اور ان کا یہ پروگرام ہے تو الگ کردیں، کیونکہ آفتاب آسمان کے ہر حصہ سے روشنی پہنچاتا ہے، مگر یہ بھی واضح رہے کہ مولانا مدنی کو الگ کرکے اربابِ مسلم لیگ یا برطانیہ کے جی حضوریوں کے سنہرے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے:

(فرید الوحیدی، دارالعلوم دیوبند)
("زمزم" لاہور، ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء)

۸

ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

فہرست

پیش لفظ

مسٹر محمد علی جناح کے اب و جد اسماعیلی اور آغا خان کے پیرو تھے۔ خود جناح صاحب نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ شیعہ اثنا عشری ہیں۔ ان کی بہن فاطمہ جناح نے ''میرا بھائی'' میں اسماعیلی خوجہ ہونا بیان کیا ہے۔ اسی بنیاد پر ان کی دوسری بہن شریں بائی نے جناح صاحب کے ترکے میں ان کی وصیت کے مطابق بعض مسلمان اداروں کے حصے کے جواز کی صحت ماننے سے انکار تھا، لیکن اس مقدمے میں جناح صاحب اور ان کے عقاید کے بارے میں بعض ایسے نکات زیر بحث آئے کہ جو ان کے مصالح کے خلاف تھے۔ چناں چہ انھوں نے مقدمہ واپس لے لیا اور عدالت کو اس نتیجے تک پہنچنے کا موقع نہ دیا کہ آیا جناح صاحب تھے کیا؟ وہ اسمٰعیلی آغا خانی تھے، شیعہ اثنا عشری تھے یا عام مسلمانوں جیسے ایک مسلمان؟ ان کی بہن کے بعد ان کے دوستوں مثل راجہ صاحب محمود آباد اور راجہ غضنفر علی خاں نے یہی بیان کیا کہ وہ شیعہ تھے اور جن دوستوں نے ان پر کچھ لکھا تھا یہی لکھا کہ وہ انھیں کے عقیدے کی شخصیت تھے، یہ ان کے دوست اور ہم عقیدہ جی اے الانا اور اصفہانی تھے۔ ان کے مصنفوں اور محققوں نے بھی ان کا شیعہ یا اسمٰعیلی ہونا تسلیم کیا ہے۔ تحریک پاکستان میں اہل تشیع کے کردار کے بارے میں ایک کتاب لکھی گئی اور چھپی بھی! اس کا موضوع بحث ہی یہ ہے کہ پوری تحریکِ پاکستان شیعہ تحریک ہے اس کے اہم ترین رہنما شیعہ تھے۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں ان کی صرف پیروی کی تھی اس کتاب میں سیکڑوں حوالے جناح صاحب کے شیعہ ہونے کے ہیں۔ پاکستان میں سرکاری طور پر ہیکٹر بولائتھو سے بانی پاکستان پر جو کتاب لکھوائی گئی۔ اس میں لکھا ہے کہ ان کے قریبی بزرگ آغا خانی اسماعیلی تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ہیکٹر بولائتھو کی تحقیق کیا تھی۔ اس کی کتاب ترمیم و تنسیخ کے بعد ایڈیٹ کر کے چھاپی گئی تھی۔ گویا کہ اسے قوم کے ذوق کے مطابق گوارا بنا کر

شایع کیا گیا۔ اس میں ان کے کسی بھی عقیدے سے وابستگی کو نظر انداز کیا گیا، لیکن حقیقت صاف جھلک رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی اپنے بزرگوں کے عقیدے کے باغی نہ تھے۔ یہی روش ''قاید اعظم'' کے مصنف و محقق رضوان احمد نے اختیار کی کہ جناح کے دادا ''پونجا میگھ جی'' کا ''اسماعیلی خوجہ'' ہونا بیان کیا ہے، جناح صاحب کا مسلمان یا شیعہ ہونا نہیں بتایا۔ اس لیے کہ ان کے تشیع کے اعتراف اور اسلام کی تشہیر میں ایک بات مصلحت کے خلاف اور دوسری حقیقت کے خلاف تھی۔

میرے نزدیک وہ اسماعیلی خوجہ ہوں یا شیعہ اثنا عشری قابل اعتراض ہی نہیں۔ ان کا اسماعیلی یا شیعہ ہونا ان کے نزدیک اتنا ہی قابل فخر ہے جتنا ایک مسلمان کے لیے مسلمان ہونا قابل فخر ہو سکتا ہے۔ پھر اگر وہ مسلمان کے بجاے کچھ اور ہوں تو ان کے لیے مسلمانوں کے کسی اسکول۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی یا اس کے کسی فرع دیو بندی، بریلوی کے عقاید پر ایمان لانا اور مسلک و مسایل کی پیروی کرنا، لازم ہی نہیں۔ اس لیے ان پر مسلمانوں کا کوئی مکتبِ فکر اعتراض ہی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت حدیث کے واضح احکام کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے تھے اور کیا کہتے تھے۔ ان کے ایک سکریٹری جنھوں نے ان کے ساتھ چار پانچ سال گزارے تھے، انھیں ملحد لکھتے ہیں، یعنی وہ خدا ہی پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ ان سے توقع رکھنا کہ وہ خدا اور اس کی شریعت پر ایمان لائیں اور نکاح، وراثت اور قرآنی قوانین و احکام پر ان کے جزئیات و شرایط کے ساتھ اسی طرح عقیدہ رکھیں اور اسی زبان و اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کریں، جو کسی فلسفۂ دین یا فقہی مکتبِ فکر کا طرز و عمل ہو، محض عبث ہے۔ جو شخص خدا پر عقیدہ نہیں رکھتا، وہ اس کے احکام کو کیوں مانے اور جو اسلامی شریعت اور اس کے نظام ہی کو نہیں مانتا وہ شریعت بل، قاضی بل وغیرہ کی تائید کیوں کرے اور جو میاں بیوی کے رشتے کے قیام کے لیے کسی مذہب کے مقررہ طریق کار اور رسوم و روایات پر ایمان نہیں رکھتا، وہ سول میرج کیوں نہ کر لے! ایسے شخص سے یہ مطالبہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے حلال و حرام کو مانے؟ لیکن خواہ کوئی آغا خانی ہو، یا کوئی شیعہ یا رافضی ہو، راسخ العقیدہ علماے دین اس کے بارے میں خواہ کوئی عقیدہ

رکھتے ہوں، لیکن انھیں چوں کہ عام طور پر ایک اسلامی فرقہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس سے یہ ضرور مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اسلام اور اسلامی شریعت کو ماننے اور کسی اور کے مسلک اور اس کی فقہ پر نہیں بلکہ اپنی پسند اور اپنے عقیدے کی فقہ (مثلاً فقہ جعفری) پر ضرور عمل کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص شیعہ یا سنی کہلاتا ہے لیکن وہ اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ رکھتا ہے اور نہ عقیدے کے مطابق احکام بجالاتا ہے تو اسے شیعہ سنی کا نام بھی کیوں کر دیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قادیانیوں کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا اور ان کے مذہب (قادیانیت) کو اسلام سے الگ مذہب قرار دینا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس اصول پر شیعہ سنی دونوں متفق ہیں۔

اب اگر ایک شخص کو شیعی اور آغاخانی نظام عقاید وعبادات اور فقہ پر ایمان نہ رکھنے اور ان کے مذہبی شعایر پر عمل نہ کرنے کے باوجود اہل تشیع اسے شیعہ سمجھتے ہیں یا آغاخانی اسماعیلیوں کو یہ اصرار ہو کہ وہ ان کے مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو کسی اور کو ان پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ ہم جس سوسایٹی میں رہتے ہیں، اس میں یہ فرقے اور ان کے شعایر پر عمل ہی اشخاص کی پہچان بن گیا ہے۔ اسی سے ان کی سیرت کی پختگی اور اخلاق کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم جس سوسایٹی میں رہتے ہیں اس میں ایک غلط مسلک سے وفاداری اور اس پر استقامت و استواری کو گوارا کرلیا جاسکتا ہے۔ الحاد اور لامذہبیت کو پسند نہیں کیا جاسکتا اور اس سے بڑا گناہ ایک عقیدہ رکھنے کے بعد بے عملی کا ثبوت دینا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مسٹر محمد علی جناح کے بارے میں جو ایک رویہ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ کوئی مذہبی تعصب اور تنگ دلی ہرگز نہیں بلکہ مذہب سے عدم وابستگی، دوری اور بے عملی ہے۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ کون نکتہ چیں ہے، جس کے تعلقات بداعمالوں اور بے دینوں سے نہیں ہوتے۔ مگر سوسایٹی کا اصول یہی ہے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو!

ہم اس سے یہ اصول بھی وضع کرسکتے ہیں کہ مخالف عقیدے کو برداشت کرسکتے

ہیں، سیرت کی کمزوری ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ہم غیر مہذب مذہبی ذوق سے ناآشنا شخص کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔

مولوی مظہر علی اظہر کے دو رسالے "مسٹر جناح کا اسلام" اور "مسلم لیگ کی مرزائیت نوازی" جن میں جناح صاحب کے مذہبی عقاید و اعمال کی بحث آئی ہے۔ یا مولانا عبدالوحید صدیقی کا مرتبہ کتابچہ "مسٹر محمد علی جناح اور لیگی علما" اور اسی طرح مولانا محمد میاں قادری برکاتی مارہروی کے دو رسالے "مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری" اور "الجوابات السنیہ علیٰ زہاء السوالات الیگیہ" اور "احکام نوریہ شرعیہ اور مسلم لیگ" میں ان کے مصنفین اور مؤلفین نے جناح صاحب کو راسخ العقیدہ مسلمان مان لیا ہے یا انھیں شیعہ یا آغا خانی اسماعیلی تسلیم کر لیا ہے۔ اگر وہ شیعہ ہوں تو ہمیں اس سے غرض نہیں، لیکن ان کے خیالات اور اعمال سے تو یہ پتا نہیں کہ وہ مسلمان مکاتبِ فکر میں سے تو کسی بھی مکتب اور مسلک سے ان کا تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

مسٹر محمد علی جناح کوئی مذہبی عقیدہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا شمار برِاعظم ہند پاکستان کے چند بڑے سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ وہ تحریکِ پاکستان کے سب سے بڑے رہنما اور پاکستان کی سب سے بڑی تاریخی و سیاسی شخصیت ہیں اور ان کا احترام ہم پر لازم ہے۔ لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں جب کوئی سوانح نگار یا مؤرخ قلم اُٹھائے گا، خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے ماحول میں تو ان کے مذہبی عقاید و اخلاق اور نجی کی زندگی اور ہر طرح کے افکار و خیالات ضرور زیرِ بحث آئیں گے۔

مولانا مظہر علی اظہر کے یہ تینوں رسالے، ان کی ایک تقریر اور زمزم-لاہور کا ایک ادارتی مضمون ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کی مہم کے دوران شائع ہوئے۔ یہ مطبوعات بنیادی طور پر مسلم لیگ کی سیاست اور اس کے صدر کے افکار و کردار کے مطالعے کا ایک باب ہیں۔ ان سے ایک زمانے کے اندازِ سیاست پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مسلم لیگ اس عہد کی ایک بڑی جماعت تھی اور اس کے صدر کی شخصیت اس سے بڑی شخصیت تھی لیکن میدانِ سیاست میں نہ مسلم لیگ تنہا جماعت تھی

نہ اس کے صدر کی ذات ذاتِ واحد تھی۔ مختلف دایروں میں مسلمانوں کی بہت سی سیاسی، مذہبی اور نیم سیاسی نیم مذہبی جماعتیں اور ان کے رہنما تھے۔ اور ان کے اثرات بھی تھے۔ اگرچہ الیکشن میں انھوں نے شکست کھائی تھی، مسلمان اہل علم اور اصحاب نظر کو انھوں نے زیادہ متاثر کیا تھا۔ مسلم لیگ الیکشن ضرور جیت گئی لیکن مخالف جماعتوں کو ختم کرنے اور ان کی فکر اور اثرات کو مٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ آزادی کی پچاس ساٹھ سالہ تاریخ کا جو دن آیا ہے ان کی فکر و دعوت کو معقولیت اور اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آج مسلم لیگ اپنے سیاسی فلسفے کے دفاع میں مصروف ہے اور بہت سے افکار و اعمال سے تو توبہ ہی کر لی ہے۔ اس کے برعکس جمعیت علماے ہند، مجلس احرارِ اسلام اور دیگر نیشنلسٹ جماعتوں کے حقیقت پسندانہ افکار کی پذیرائی کے لیے قدرت نے لوگوں کے دلوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔

یہ چند سطریں مولانا مظہر علی اظہر کے رسایل کے پیش لفظ کے طور پر لکھ دی ہیں۔ یہ باتیں مذکورۂ بالا دوسرے اہل قلم کے رسایل کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں۔ ان رسایل کے ساتھ موضوع کی مناسبت سے مولانا مظہر علی اظہر کی ایک تقریر اور اخبار زمزم لاہور کا ایک ادارتی مقالہ بھی شامل کر دیا ہے۔ ان میں چند باتیں نئی ہیں۔ مولانا اظہر کا تیسرا رسالہ ''مسٹر جناح اور تحریک مسجد شہید گنج'' (لاہور) بھی اسی کے ساتھ اسی مجموعے میں آپ کے مطالعے میں آئے گا۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مُسلم لیگ کی مرزائیت نوازی

مُسلمان کی تعریف؛

واقفانِ حال کو معلوم ہے کہ جب سے قادیان میں مرزا غلام احمد نے مختلف دعوے کیے اور علمائے اسلام نے اس کے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے فتوے دیئے، برطانوی حکومت نے قادیانیوں کو دائرۂ اسلام میں داخل رکھنے کا تہیہ کیا، اسے قادیانیوں کی رعایت مطلوب تھی،

مگر ہمیں اس سے کچھ زیادہ شکایت نہیں ہو سکتی، ان کی مصلحتیں ان کے اپنے فائدہ کے لیے ہیں، مسلمانانِ ہند کے فائدے یا ان کی دینی و روحانی ترقی کے لیے نہیں، اس بارے میں کسی مسلمان کو شکایت اُن اداروں سے ہو سکتی ہے جو اپنے آپ کو اسلامی کہتے ہیں، اور دینِ اسلام، ثقافتِ اسلام، سیاستِ اسلام وغیرہ کے تحفظ کے دعویدار ہیں، آج ان میں سے پیش پیش ہماری مسلم لیگ ہی، جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار ہے، اور جس نے ایک اکلوتا لیڈر مہیا کر کے اس کی اطاعت کا قلادہ ہر مسلمان کی گردن میں ڈالنے کے لیے پاکستان کا نعرہ بلند کر رکھا ہے، اور ان دنوں انتخابی معرکہ جیتنے کے لیے مسٹر جناح کو رُوپہلی گولیاں مہیا کر رہی ہے، تاکہ ان سے ہر مسلمان کے سینہ کو چھلنی کیا جائے، جو مسٹر جناح کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہ ہو،

انگریز نے اپنے مقاصد کے لیے اپنے ہمنوا مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ "مسلمان" کا لفظ ان سب لوگوں پر بولا جانا چاہیے جو غیر مسلموں کی نظر میں مسلمان ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی نے اسلام کے نام پر غیر مذاہب سے مناظرہ کی جنگ مول لی، آریہ سماجیوں اور عیسائیوں وغیرہ نے اسے ایک مسلمان قرار دیتے ہوئے اس کا جواب دیا، علماء اسلام نے اسے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا، مگر علماء اسلام کے مقابلہ میں انگریزوں، ہندوؤں عیسائیوں اور مرزائیت نواز لوگوں کی سنی گئی، لیکن آج تک علماءِ اسلام کی بات سنی نہیں جاتی۔

مُسلم لیگ کی مرزائیت نوازی

مسلم لیگ نے ہمیشہ علماء اسلام کی مخالفت اور تحقیر کرتے ہوئے مرزائیوں کو دائرۂ اسلام کے اندر قرار دیا، اور ان کو مسلم لیگ کا ممبر بننے دیا، وہ اس کے عہدہ دار بھی ہوتے، لیگ کونسل کے ممبر بھی بنے، اور انتہا یہ ہے کہ جب سنہ ۱۹۳۴ء کے زمانہ میں مجلس احرار نے حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ سے پُر زور مطالبہ کیا کہ وہ سر ظفر اللہ کو مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں نہ لے، اور ہندوستان کے دوسرے اسلامی اداروں نے بھی مجلسِ احرار کی ہمنوائی کرتے ہوئے اپنا احتجاج حکومت تک بلند آہنگی سے پہنچایا تو مسلم لیگ نے ہر احتجاج کی مخالفت کرتے ہوئے حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے، اور سر ظفر اللہ قادیانی کو مسلم لیگ کے اجلاسِ عام کا صدر بنا کر دنیا کے سامنے مسلمانوں کا ایک ایسا نمائندہ فرد ظاہر کیا جو باقی سب سے فائق حیثیت رکھتا ہو، مسلم لیگ کی اس کارروائی نے مجلسِ احرار اور اس کے ہمنواؤں کی پیش نہ جانے دی،

اور سر ظفر اللہ قادیانی کو مسلمانوں کی گردن پر سوار کیا،

اس کے بعد ریلوے کے محکمہ میں قادیانیوں نے اور سر ظفر اللہ نے کیا کچھ کیا اس کے لیے اخبار "پائلٹ" کے صفحات گواہ ہیں، آج شاید مسلمانوں کو وہ واقعات بھول گئے ہوں، مگر مسلمان بابوؤں کو خاص طور پر ان واقعات کی طرف ذہن دوڑانے کی ضرورت ہے، کیونکہ وہی اس زمانہ میں سب سے زیادہ شاکی نظر آیا کرتے تھے، مجھے اس وقت سر ظفر اللہ کی کارگزاریوں پر بحث مقصود نہیں، اور نہ میں معاملہ کو طول دینا چاہتا ہوں، میرے اغراض کے لیے یہ کافی ہے کہ مسلم لیگ نے علماء اسلام کی مخالفت کرتے ہوئے مرزائیت نوازی کا ثبوت دیا، اور سر ظفر اللہ کو اپنی اور سب مسلمانوں کی گردن پر سوار کرنے کی سبیل کی، اور جو کچھ مسلمانوں کے لیے اسلام کے نام پر انگریزوں سے ہندوؤں کے مقابلہ میں طلب کیا جا رہا تھا وہ مرزا محمود احمد کی جیب میں جا پڑا،

پھر ۱۹۴۴ء میں

دور جانے کی ضرورت نہیں ۱۹۴۴ء میں جولائی کے مہینہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا، مسلم لیگ کی مرزائیت نوازی کو مسلم لیگ کے ارکان بھی محسوس کر رہے تھے، مجلسِ احرار نے مرزائیت کے خلاف گذشتہ پندرہ برس میں جو کام کیا ہے وہ رائگاں جانے والا نہیں، اس کا اثر مسلم لیگ کے کارکن محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے، مگر مسٹر جناح کی آواز کے مقابلہ میں کسی کی کیا پیش جا سکتی تھی،

مولانا عبد الحامد بدایونی نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جو ۳۰ر جولائی سے شروع ہو رہا تھا مرزائیوں کو مسلم لیگ سے خارج کرانے کی ٹھانی، چنانچہ انھوں نے ایک قرارداد اس بارے میں پیش کی، جو شائع شدہ ایجنڈے میں

بھی درج تھی، اور جس کو اس ایجنڈے میں بھی شائع کیا گیا، جو اخبارات نے لوگوں تک پہنچانا مناسب سمجھا، چنانچہ روزنامہ "زمیندار" نے اپنی ۲۰ جولائی ۴۴ء کی اشاعت میں ایجنڈے کو کافی تفصیل سے شائع کیا ہے، اور اس ایجنڈے کے ذیل میں "قادیانیوں کے اخراج سے متعلق قرارداد" کے عنوان سے تحریر کیا ہے، کہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے لکھا ہے کہ "دنیائے اسلام اور ہر طبقہ وخیال کے مقتدر علمائے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیرو دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، لہٰذا انھیں مسلم لیگ کے دائرے میں شرکت کی ہرگز اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اب قادیانیوں کی مسلم لیگ میں شمولیت یا عدم شمولیت کے متعلق بعض حلقوں میں بڑا چرچا ہے، اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس قرار دیتا ہے کہ علمائے اسلام کے متفقہ فیصلہ کے احترام میں کوئی قادیانی مسلم لیگ میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

حضرت مولانا نے اس قرارداد میں وضاحت سے بیان کر دیا تھا کہ "دنیائے اسلام اور ہر طبقہ وخیال کے مقتدر علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو دائرۂ اسلام سے خارج ہیں" اور مولانا نے اپیل کی تھی کہ "علماء اسلام کے متفقہ فیصلہ کے احترام میں کوئی قادیانی مسلم لیگ میں شریک نہ ہو سکے، مگر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ایک ایسی جماعت ہے جہاں حضرت مولانا کی اپیل صدا بصحرا ثابت ہو سکتی تھی، اور ثابت ہوئی، اس روز مولانا عبدالحامد بدایونی کی معرفت دنیا کو پتہ چلا کہ مسلم لیگ کے ارباب اقتدار کو "دنیائے اسلام اور ہر طبقہ وخیال کے مقتدر علماء کے متفقہ فتوے" کی کوئی پروا نہیں، وہ دنیائے اسلام اور ہر طبقہ وخیال کے مقتدر علماء کے متفقہ فتوے کو آسانی سے ٹھکرا سکتے ہیں اور کوئی انھیں پوچھنے والا نہیں،

اس کا سبب کیا ہے؟ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی جانتے ہیں کہ مولانا

عبدالحامد بدایونی اور ان کے ہمخیال علماء مسلم لیگ کے رحم و کرم پر ہیں، اور اگر ان کی آواز نہ سُنی جائے تو وہ کسی احتجاج کے قابل نہیں، مسلم لیگ کے لیڈروں نے دانستہ علماء کی توہین کی، اور ہمارے کسی ایک علماء نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی، تاکہ خود ان کی عزت محفوظ رہ سکے، مگر اپنی عزت کے تحفظ کا ڈر ہو تو آجکل کی پروپیگنڈا مشینوں کے ہوتے ہوتے اسلام کی عزت کا تحفظ نہیں ہو سکتا،

مولانا عبدالحامد صاحب نے اپنی قرارداد پیش کی، مگر مسٹر جناح نے اس پر بحث کی اجازت نہ دی، شائع شدہ ایجنڈے میں مرزائیوں کو مسلم لیگ سے خارج کرنے کا ذکر کیا گیا، مگر وقت آیا تو مسٹر جناح کی آواز لیگ کے اندر اور باہر کے سب علماء کی آواز سے زیادہ کارگر نکلی،

ہوشیار!

میں مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور ان کے ہمنوا سب مسلمان علماء سے جو مرزائیوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضور نے پاکستان کے انتخابی نعرہ سے ہم آہنگی کا اظہار کرتے وقت کبھی واقعات کی رفتار کا جائزہ بھی لیا؟ مسلم لیگ کدھر جا رہی ہے؟ مسٹر جناح کی قیادت مسلمانوں کو کدھر لے جائے گی؟ اور علماء اور ان کے فتووں کا کیا حشر ہوا اور ہونے والا ہے؟ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ انگریز کے خوانِ کرم سے خوشہ چینی کرنے والے مقتدر بزرگ جو مسلم لیگ پر قابض بیٹھے ہیں وہ انگریز کو ناراض کر سکتے ہیں؟ جب انگریز چاہتا ہے کہ مرزائی دائرہ اسلام کے اندر رہیں تو مسلم لیگ کے سر اور خان بہادر، جاگیردار اور سب رجسٹرار ہندوؤں کی اور غیر لیگی مسلمان کی مخالفت تو کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ انگریز کے مفاد میں جاتی ہے، اور یہ درحقیقت وہ پسندیدہ متاع ہے جس کی فراوانی وہ ہندوستان کے بازارِ سیاست میں دیکھنا چاہتا ہے،

لیکن مرزائیوں کی مخالفت نہیں کر سکتے،

اگر کانگریس، جمعیۃ العلماء، مجلس احرار اور دوسرے ہر ادارے یا فرد کی مخالفت ہو تو انگریز کو کیا، مگر جب قادیانیوں کی باری آتے تو انگریز کے چشم و ابرو کو بن دیکھے دیکھنا پڑتا ہے، مسٹر جناح اگر سر ظفر اللہ، مرزا محمود اور انگریزی حکومت کو ناراض کرلیں تو ان کی لیڈری کتنے دن زندہ رہے گی؟ یہ سر اور خان بہادر کب تک اُن کے ساتھ رہیں گے؟

مولانا اگر آپ اور آپ جیسے دوسرے بزرگ یہ سوچ لیتے کہ پاکستان کا نام لے کر مسلمانوں کو اُکسانے والے کیا کرتے رہے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اور کیا کریں گے؟ تو شاید آپ اُن کا ساتھ اس طرح نہ دیتے جس طرح اس قرارداد کے ذبح کر دیئے جانے کے بعد بھی آپ دے رہے ہیں،

جس پاکستان کے لیڈر آج ہر طبقہ و خیال کے مقتدر علماء کے متفقہ فتوے کو ہیچ اور حقیر سمجھتے ہیں وہ اگر آپ کی زبان سے یہ کہلوا کر مسکراتے ہیں کہ ابو الکلام اور حسین احمد کانگریس کے زر خرید ہیں، تو ان کی مسکراہٹ میں یہ زہر خند بھی موجود ہوتا ہے کہ حضور جو تقریر فرما رہے ہیں وہ ہمارے اجیر ہونے کی حیثیت سے فرما رہے ہیں، ان کی نگاہ میں سب اجیر ہیں، وہ آپ سے اور آپ کے فتووں سے بیزار ہیں، اور میں ابھی ابھی آپ سے گزارش کروں گا کہ جو قرآن اور اسلام کو حقیر اور بے حقیقت سمجھنے والے ہوں وہ علماء کے فتووں کو کیا کریں گے؟ آپ جیسے علماء کو تو ضرورتاً برداشت کیا جا سکتا ہے، ورنہ وقت آئے گا کہ مسلم لیگی تلوار آپ کی زبانوں کو کاٹ کر رکھ دے گی،

سنو اور سمجھو!

یہاں چلتے چلتے مجھے اُن دوستوں سے ایک بات عرض کرنا ہے جو ہر جگہ یہ

کہتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں کہ آؤ مسلم لیگ میں آؤ، اور یہاں آکر اصلاح کرو" سنو اور سمجھو! اگر سمجھ کا کوئی حصہ باقی ہے!

مسلم لیگ نے قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے آج تک خارج قرار نہیں دیا، اس لیے اگر ہم مسلم لیگ میں شامل ہوں اور اسے اسلامی جماعت سمجھ کر شامل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بھی اپنے عمل سے، قادیانیوں کو دائرۂ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں، کیا وہ مسلمان جو آج مسلم لیگ میں شامل ہیں عملاً دائرۂ اسلام کے اندر قرار نہیں دے رہے، جب وہ ایک اسلامی جماعت میں شامل ہیں اور اس میں مرزائی بھی بہ حیثیت مسلمانوں کے شامل ہوسکتے ہیں،

اگر پاکستان بھی ایسا ہی بنانا ہے جس میں مرزا غلام احمد کی طرح ہزاروں مدعیان نبوت آئیں گے، وہ انبیاء کی توہین بھی کریں گے، وہ جہاد کی طرح قرآن کے باقیماندہ احکام کو اپنے فرضی الہاموں کے ذریعے منسوخ بھی کریں گے، وہ شریعتِ اسلامی کو کفر کی تائیدی مشین بنانے میں ساعی ہوں گے، مگر پھر بھی وہ مسلمان ہی رہیں گے، خواہ ہر طبقۂ خیال کے مقتدر علماء متفقہ فتویٰ کیوں نہ دیتے رہیں کہ یہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، تو پھر ایسا پاکستان اوروں کو مبارک ہو، مجلسِ احرار کے خادم ایسے پاکستان کو قبول نہیں کرسکتے،

بہت سے مقتدر علماء کا جو حال ابھی سے ہو رہا ہے مسلم لیگ کے حامی علماء کا ایسا ہی حال پاکستان قائم ہوکر ہوجائے گا، جب اُن کی ضرورت نہ رہے گی،

"زمیندار" کا نوٹ!

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں روزنامہ "زمیندار" کا وہ نوٹ بھی درج کردوں جو اس قرارداد کے پیش نہ ہوسکنے کے بعد لکھا گیا،

"۱۱ شعبان المعظم ۱۳۶۳ ہجری کی اشاعت میں "مسلم لیگ اور قادیانی"

عنوان کے تحت تحریر ہے کہ:

"مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں مولانا عبد الحامد بدایونی کی وہ قرار داد پیش نہ ہو سکی جس کے ذریعے سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ قادیانی چونکہ خارج از اسلام ہیں لہٰذا انھیں مسلم لیگ کی رکنیت سے نکال دیا جائے، یہ قرارداد اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری توجہ کی مستحق تھی، لیکن بدقسمتی سے جدید تعلیم کے دلدادہ قادیانی اور اسلامی اختلافات کو شیعہ سنی مناقشت کی طرح محض فروعی مسئلہ سمجھ رہے ہیں، اس لیے وہ صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص مرزائی نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار نہ دے لے، اور یہ قادیانیت کے بنیادی عقیدے کا تقاضہ ہے، کیونکہ میرزائی مرزا غلام احمد قادیانی کو "نبی" سمجھتے ہیں، اور نبی کا منکر مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، لہٰذا جب قادیانی مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان نہیں سمجھتے مسلمان کو کافر کہنے والا بھی کسی صورت میں مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا،

اس اختلاف کے باعث قادیانیت اور اسلام میں زمین آسمان کا فرق ہے، نہ قادیانی کو مسلمانوں سے کوئی مجلسی تعلق ہو سکتا ہے نہ مسلمانوں کے کسی ادارے میں قادیانی کو رہنا چاہیے، اور خلیفہ قادیان تو پاکستان کی مذمت کر کے مسلم لیگ سے بے تعلقی کا اظہار کر چکے ہیں، اور اپنے مریدوں کو بھی اس مجلس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دے چکے ہیں، ان حالات میں مسلم لیگ کو تو خاص طور پر قادیانیت سے قطع موالات کا اظہار کرنا چاہیے تھا، لیکن اس کے تغافل نے

ان غلط فہمیوں کا دائرہ خود ہی وسیع کر دیا ہے، جو مسلم لیگ کے مخالفین پھیلا رہے تھے، اس فرض ناشناسی سے مسلم لیگ کے وقار و اقتدار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچیگا بلکہ صحیح الخیال مسلمان مضطرب ہوتے بغیر نہ رہیں گے، اور اس اضطراب کا اثر یقیناً ناگوار ہوگا،

مقام حیرت ہے کہ جب مسلم لیگ محض فروعی و جزوی اختلاف کے باعث مسلمان خاکساروں سے قطع تعلق کا اعلان کر سکتی ہے تو غیر مسلم قادیانیوں کے متعلق کیوں خاموش ہے؟ شاید اس نے مسئلے کی نزاکت کا اندازہ نہیں لگایا۔ قائد اعظم کا فرض ہے کہ قادیانیت کے متعلق مسلم لیگ کی پوزیشن واضح کریں ورنہ اس افسوسناک "رواداری" کے نتائج بہت زیادہ افسوسناک ہوں گے"،

اس شذرہ کے بارے میں چند ایک گذارشات پیش کرنے کی ضرورت ہے،

(۱) بعض لوگوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ یہ قرارداد اتفاقیہ طور پر پیش نہ ہو سکی، مگر شذرہ کی تمام عبارت ظاہر کرتی ہے کہ قرارداد پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، ورنہ یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ "یہ قرارداد اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری توجہ کی مستحق تھی، لیکن بد قسمتی سے جدید تعلیم کے دلدادہ قادیانی اور اسلامی اختلافات کو شیعہ سنی مناقشت کی طرح فروعی مسئلہ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ حقیقت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہیں"،

یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ وقت کا قصور نہیں تھا، اور نہ کوئی ایسا امر پیش آیا بلکہ جدید تعلیم کے دلدادہ لوگ (یعنی مسٹر جناح جیسے بزرگ) قادیانی اور اسلامی اختلافات کو سمجھ نہیں سکے، اور وہ حقیقت کا

اندازہ لگانے سے قاصر رہے، گویا قصور جدید تعلیم کے دلدادہ اشخاص کا تھا، اور مسٹر جناح ان کے فردِ اول تھے، اگر وہ قرارداد کے حق میں ہوتے تو روکنے والا کون تھا؟

(۲) "زمیندار" نے لکھا ہے کہ خلیفہ قادیان تو پاکستان کی مذمت کر کے مسلم لیگ سے بے تعلقی کا اظہار کر چکے ہیں، اور اپنے مریدوں کو بھی اس مجلس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دے چکے ہیں، ان حالات میں مسلم لیگ کو تو خاص طور پر قادیانیت سے قطع موالات کا اظہار کرنا چاہیے تھا،

مگر یہ انتقامی جذبہ بھی مسلم لیگ اور اس کے قائد میں موجود نہیں، کیا سبب ہے کہ مرزا محمود تو کہہ سکتا ہے کہ اس کے معتقد مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح نہیں فرما سکتے کہ قادیانی مسلم لیگ میں شامل نہیں ہو سکتے؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۳) "زمیندار" نے کہا ہے کہ قادیانیت کے بارے میں مسلم لیگ کے "تغافل" نے ان غلط فہمیوں کا دائرہ خود ہی وسیع کر دیا ہے، جو مسلم لیگ کے مخالفین پھیلاتے تھے، مگر یہ لکھ کر "زمیندار" نے اپنی خوش فہمی کی داد نہیں دی، وہ باتیں "غلط فہمیاں" کیوں شامل ہیں جن کا دائرہ مسلم لیگ نے خود وسیع کیا؟ کیا مسلم لیگ کے مخالفین درست اندازہ نہیں لگا رہے تھے جب وہ مولانا عبدالحامد صاحب کی قرارداد کا نوٹس دیے جانے کے بعد بھی کہہ رہے تھے کہ یہ قرارداد مسلم لیگ اور اس کا قائدِ اعظم منظور نہیں کر سکتے، یہ غلط فہمی تھی یا حقیقت نگاری؟ بالخصوص جب "زمیندار" خود ہی رقمطراز ہے کہ:

"اس فرض ناشناسی سے مسلم لیگ کے وقار و اقتدار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا،

بلکہ صحیح الخیال مسلمان مضطرب ہوئے بغیر نہ رہیں گے، اور اس اضطراب کا اثر یقیناً ناگوار ہوگا۔"

اگر صحیح الخیال مسلمانوں کے لیے جائے اضطراب ہی تو پھر "غلط فہمیوں" کا تذکرہ کرنا کیونکر حق بجانب ہو سکتا ہے؟

(۴) "زمیندار" نے تحریر کیا ہے کہ:

"مقام حیرت ہے کہ جب مسلم لیگ فروعی وجزوی اختلاف کے باعث مسلمان خاکساروں سے قطع تعلق کا اعلان کر سکتی ہے تو غیر مسلم قادیانیوں کے متعلق کیوں خاموش ہے؟"

گزارش ہے کہ مسلمان خاکساران دنوں حکومت کے معتوب ہو چکے تھے، اس لیے ان سے قطع تعلق کیا جا سکتا تھا، مگر قادیانی مسلم لیگ سے قطع تعلق کرلیں پھر بھی انھیں مسلم لیگ سے اولاً تو اس وجہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ سر ظفر اللہ، مرزا غلام احمد اور مرزا محمود کے لندنی عاشق غیر مسلم قادیانیوں کے بارے میں خاموشی پسند فرماتے ہیں، اور پھر خاموشی توڑنے کو جرم سمجھتے ہیں، اور دوم مسٹر جناح کا اپنا اسلام ہے، جس کی حقیقت علیحدہ رسالہ میں تحریر کی گئی ہے،

(۵) "زمیندار" نے لکھا ہے کہ:

"قائدِ اعظم کا فرض ہے کہ قادیانیت کے متعلق مسلم لیگ کی پوزیشن واضح کریں۔"

مگر قائدِ اعظم کو اس لیے بھی پوزیشن واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنے والے بہت سے لوگ اپنے ہمخیال "زمیندار" اور اس کے مالکوں اور مدیروں کی طرح مسلم لیگ کی پوزیشن واضح

نہ کی جائے اور قائداعظم کے اپنے مقام پر ڈٹے رہنے کے باوجود ان سے اختلاف کی جرأت نہیں کرتے، اس لیے مسٹر جناح مزے سے اپنی راہ چل رہے ہیں، نیز انھیں اپنے اسلام پر بھی نگاہ ہے جو قادیانیوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے،

(٦) "زمیندار" نے تنبیہ کی ہے کہ:

"ورنہ اس افسوسناک رواداری کے نتائج بہت زیادہ افسوسناک ہوں گے"

مگر مسٹر جناح اس تنبیہ کو اس لیے خاطر میں نہیں لاتے کہ وہ نتائج سے بے نیاز ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ نتائج بہت زیادہ افسوسناک ہوں گے وہ خود ہی ان "بہت زیادہ افسوسناک" نتائج کو روکنے میں ان کی مدد کریں گے، اور ہر صحیح الخیال مسلمان کو غلط خیال قرار دے کر پاکستان کے نام پر قادیانیوں کو دائرۂ اسلام کے اندر رکھنے میں ممد و معاون ہوں گے۔ بلکہ بہت سے صحیح الخیال مسلمانوں کو اسلام کا غدار قرار دے کر "مسلم لیگ زندہ باد" کے اور "جناح زندہ باد" کا نعرہ لگائیں گے، حالانکہ "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعرہ میں "قادیانیت زندہ باد" کا نعرہ مضمر اور "جناح زندہ باد" میں "مرزا محمود زندہ باد" کا نعرہ مستتر ہے،

مظہر علی اظہر

۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

مسٹر جناح کا اسلام

اب جبکہ مسلم لیگ اور اس کے قائدِ اعظم نے اپنے سے اختلاف رکھنے والے ..... ہر شخص کو بے ایمان اور غیروں کا زر خرید بتلانا ہی اپنا شعار بنالیا ہے، اور برسوں کی ہماری صلح پسندانہ کوششوں کو نذرِ آتش کر دیا ہے، ہمارے مسلم لیگی دوستوں کے لیے ناراضی کا مقام نہیں ہونا چاہیے اگر ہم انھیں یہ بتائیں کہ جس راہ کی طرف آپ ہمیں بلانا چاہتے ہیں ہم اس طرف کیوں نہیں آسکتے؟ انھوں نے ہمارے خلاف کذب و افترا، اور بہتان طرازی کا بازار گرم کیا، لیکن میں اگر یہاں ایک حقیقت ان کے سامنے رکھوں تو امید ہے کہ انھیں اپنی روش تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی، اور اگر انھیں اسلام کا کچھ درد ہے تو وہ ضرور مسلم لیگ اور مسٹر جناح سے اپنے تعلق کو منقطع کرلیں گے،

آئیے! ہم مسٹر جناح کے اسلام کا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ ان جیسا انسان مسلمانوں کی کیا اور کیونکر رہنمائی کر سکتا ہے؟

قادیانیوں کے بارے میں مسٹر جناح کا رویہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے، اس سے بہت کچھ تعلق رکھنے والا حصہ ان کی اپنی ذاتِ گرامی کا ہے،

جب مسٹر جناح نے شریعتِ اسلامی کے مسائل سے بے نیازی برتتے ہوئے اپنی لیڈری کا ڈھنڈورا نہایت بے باکی سے پیٹنا شروع کیا اور

ہم نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ خانہ جنگی کرا کر بھی تماشہ دیکھنے کے خواہاں ہیں، اور علماء کو خاص طور پر ذلیل کرنے کے درپے ہیں، تو دکھے ہوئے پرانے دلوں سے ایک آواز اٹھی، جس نے ہماری توجہ مسٹر جناح کے سوانح حیات کی طرف منعطف کرائی، ان کی زندگی کا ایک اہم باب جو ہماری سیاسی پیدائش سے پہلے گذر چکا تھا، ہمارے نوٹس میں لایا گیا اور بتانے والوں نے بتایا کہ سول میرج کیا ہوتی ہے کبھی اس کا دھیان بھی کیا؟ مسٹر جناح نے سول میرج کس وقت کی تھی؟ ذرا اس کا حال بھی دریافت کیجیے،

سول میرج؛

"سول میرج" کا ترجمہ لفظی طور پر 'دیوانی شادی' کیا جا سکتا ہے، مگر یوں سمجھ لیجیے کہ اسے 'قانونی شادی' نام دینا شاید زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ یہ لامذہبوں کی شادی ہوا کرتی تھی،

ہندوستان میں ۱۸۷۲ء سے ایک قانون نافذ ہے جسے 'اسپیشل میرج ایکٹ' کہتے ہیں، اس ایکٹ کے بنانے کی غرض اسی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"ہرگاہ کہ یہ مناسب ہے کہ ان لوگوں کے لیے شادی کا طریقہ مقرر کیا جائے جو عیسائی، یہودی، ہندو، مسلمان، پارسی، بدھ، سکھ، یا جین مذہب کے پیرو نہیں، اور بعض شادیوں کو قانوناً جائز قرار دیا جائے جن کا جواز مشتبہ ہے، اس لیے قانون ذیل بنایا جاتا ہے"

۱۹۲۳ء میں اس ایکٹ کی ترمیم کی گئی، جس کے ذریعہ ہندو، بدھ، سکھ اور جین مذہب کے پیرووں کو بعض حالات میں اس 'قانونی شادی' کی اجازت دی گئی، مگر یہ واضح رہے کہ عیسائیوں، یہودیوں، مسلمانوں اور پارسیوں پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہو سکتا، یعنی ان مذاہب کا کوئی پیرو کسی حالت میں اس قانون

کے ماتحت شادی نہیں کر سکتا،

اس قانون کی مختلف دفعات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، میں فقط متعلقہ حصوں کا ذکر کروں گا جس کا نفس مضمون سے تعلق ہے، اس ایکٹ میں تحریر ہے کہ

"شادی ہونے سے پہلے فریقین نکاح اور تین گواہ لازماً ان شادیوں کے رجسٹرار کے سامنے ایک اعلان پر دستخط کریں گے جو اس ایکٹ کے ضمیمہ (شیڈول) نمبر ۲ کے مطابق ہوگا"

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ اعلان کیا ہے؟ ۱۹۲۳ء سے پہلے وہ اعلان یہ ہوا کرتا تھا اور مسلمانوں یا عیسائیوں یا پارسیوں یا یہودیوں کے واسطے اب بھی یہی ہے کہ

"میں (فلاں شخص) حسب ذیل اعلان کرتا ہوں

(۱) میں اس وقت غیر شادی شدہ ہوں

(۲) میں عیسائی، یہودی، ہندو، مسلم، پارسی، بدھ، سکھ یا جین مذہب کا پیرو نہیں ہوں،

(۳) میں اٹھارہ برس کی عمر حاصل کر چکا ہوں،

(۴) اور (۵) ہمارے مقاصد کے لئے غیر ضروری ہیں،

(۶) میں جانتا ہوں کہ اگر اس اعلان کا کوئی حصہ جھوٹ ہو اور اور اگر یہ بیان دیتے وقت میں یہ جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے یا میں اسے سچ نہ یقین کرتا ہوں تو مجھے قید اور جرمانہ کی سزا ہو سکتی ہے"

یہی اعلان عورت کو بھی کرنا پڑتا ہے، سوائے اس کے کہ اس کی عمر

۱۸ سال کی بجائے ۱۴ سال کی ہونی ضروری ہے،

مسٹر جناح کی شادی

اب ہمیں مسلم لیگی شہادت سے دیکھنا ہے کہ مسلم لیگ کے قائدِ اعظم کی شادی کیسے ہوئی ؟

بُک ڈپو کچے زتیاں اسٹریٹ لاہور نے مسٹر جناح کے سوانح حیات ایک مختصر سی کتاب میں جمع کیے ہیں، جس کا نام ہی "قائد اعظم" رکھا ہے، اسے ایم، اے سلام صاحب نے مرتب کیا ہے، مسٹر جناح کی شادی کے بارے میں اس کتاب کے صفحہ ۲۰ پر درج ہے:

"اپریل سنہ ۱۹۱۸ء میں آپ کی شادی سر ڈین شا پیٹٹ بمبئی کے متموّل و ممتاز پارسی کی لڑکی سے ہوئی، بیشک اُس وقت یہ شادی اسلامی اصول کے خلاف تھی، لیکن کچھ عرصہ بعد آپ کی بیوی نے اسلام قبول کر لیا اور مذہبی اصولوں پر کاربند رہیں۔"

اس مصنف اور دوسرے مصنفوں نے تسلیم کیا ہے کہ مسٹر جناح کی شادی اسلامی اصول کے خلاف تھی، مگر یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ خرابی کیا تھی ؟ البتہ مسٹر جناح کو بری کرنے کے لیے یہ افسانہ تراشا گیا ہے کہ

"کچھ عرصہ بعد آپ کی بیوی نے اسلام قبول کر لیا، اور مذہبی اصولوں پر کاربند رہیں !!"

جہاں تک میں نے تلاش کیا ہے مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا، لیکن اگر کوئی ثبوت ملے تو مجھے اس کو تسلیم کرنے میں کوئی انکار نہیں ہوگا، مگر بغیر سند کے بات کو تسلیم کرنا درست نہیں،

اب جو امرِ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر جناح نے سر ڈینشا پٹیٹ کی پارسی لڑکی سے جو شادی کی وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہ ہوئی، وہ سول میرج تھی، جو قانون ازدواج خاص یا "اسپیشل میرج ایکٹ" کے ماتحت ہوئی،

جیساکہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ایسی شادی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذکورہ مذاہب کے پیرو نہ ہوں، کوئی مسلمان ایسی شادی نہیں کر سکتا، مسلمانوں کے مذہبی رجحان کا اثر تھا کہ اب تک قانوناً کسی مسلمان کو اس قسم کے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی،

مگر جب مسٹر جناح نے اسپیشل میرج ایکٹ کے ماتحت شادی کی تو ان کو یہ بیان دینا پڑا:۔

"میں محمد علی جناح حسبِ ذیل اعلان کرتا ہوں:

(۱) میں اس وقت غیر شادی شدہ ہوں۔

(۲) میں عیسائی، یہودی، ہندو، مسلم، پارسی، سکھ یا جین مذہب کا پیرو نہیں ہوں،

(۳) (۴) اور (۵) کو چھوڑتے ہوئے اس کا حصہ نمبر ۶ تحریر کرتا ہوں:

(۶) میں جانتا ہوں کہ اگر اس کا کوئی حصہ جھوٹ ہو، اور اگر یہ بیان دیتے وقت میں یہ جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے یا میں اسے سچ نہ یقین کرتا ہوں تو مجھے قید اور جرمانہ کی سزا ہو سکتی ہے،

اس بیان سے واضح ہے کہ مسٹر جناح کے نکاح میں نقص کا جو ذکر کیا جاتا ہے وہ حقیقت کو نظروں سے کسی قدر اوجھل کرنے کے لیے ہے، جو شخص یہ بیان دے رہا ہو کہ میں مذہب اسلام کا پیرو ہی نہیں، اور گواہوں اور رجسٹرار

کے سامنے اس کی تصدیق کر رہا ہو، اس کے بارے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کہ نکاح میں نقص تھا امر واقعہ سے انصاف کرنا نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مسٹر جناح نے اپنے مسلمان ہونے سے صاف صاف انکار کیا اور اپنے آپ کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا،

جب مسٹر جناح کے اسلام کی اپنی حقیقت یہ ہو تو وہ مرزائیوں کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج کیسے قرار دیں، سر ظفر اللہ جیسے قانون داں ان کا بھید کھول کر رکھ سکتے تھے، جو ۲۷ برس سے چھپا چلا آرہا تھا اور گو کتابوں میں پڑھتے تھے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا تھا، بلکہ اب تو اس نکاح کے قصے کو سوانح عمریوں سے حذف کرنے کی کوشش ہو رہی ہے،

یہ مسلمانوں کی ہی خوش قسمتی ہے کہ انھیں ایسے لیڈر اور قائدِ اعظم میسر آجاتے ہیں جو ایک کافرہ عورت سے کورٹ شپ کی شادی کرنے کے لیے اپنے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا حتمی اعلان کریں، اور مسلمان انھیں سر پر اٹھائے ہوئے ہر طرف شور مچائیں کہ اسلام کی نجات انہی کے ہاتھوں سے ہو سکتی ہے،..

مسٹر جناح کے معذرت خواہوں نے یہ تو کہنے کی جرأت کی ہے کہ مسٹر جناح کی بیوی بعد میں مسلمان ہو گئی، یہ روایت درست ہو یا غلط اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر جناح مسلمان ہو گئے،

اسی طرح کے مسلمان آج مسٹر دانیال لطیفی پنجاب مسلم لیگ کے آرگنائزر بن کر طول و عرض پنجاب میں چکر کاٹ رہے ہیں، وہ بھی سول میرج کر کے اپنے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا اعلان کر چکے ہیں، مگر مسلم لیگ

مسٹر جناح کی قیادت عظمیٰ کے ماتحت اسے کیوں نہ برداشت کرے، آخر وہ بھی مسٹر جناح کے نقش قدم پر چلے ہیں، انھوں نے کونسا زیادہ گناہ کیا ہے؟

اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصہ ہمارے پروفیسر عنایت اللہ صاحب کا ہے، جو پاکستان کے حق میں تحریر و تقریر سے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں، اسی ۱۹۳۶ء میں وہ لاہور میونسپل انتخاب میں امیدوار ہو گئے تھے اور خان بہادر میاں امیرالدین کے مقابلہ پر ڈٹ گئے تھے، جب درخواستیں گزر چکیں تو میاں امیرالدین صاحب نے اعتراض کر دیا کہ پروفیسر صاحب عیسائی ہیں مسلمان نہیں، چنانچہ شہادت میں پادری، عیسائی انجمن امداد باہمی کے کارکن مع رجسٹر وغیرہ اور دوسرے لوگ پیش ہوئے، اور خواجہ غلام محمد صاحب ای، اے، سی نے فیصلہ دیا کہ پروفیسر صاحب عیسائی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ مسلمانوں کے حلقہ میں کھڑے نہیں ہو سکتے، مگر پاکستان زندہ باد کہنے سے انھیں کون روک سکتا ہے؟

مولانا عبدالحامد بدایونی قادیانیوں کا رونا رو رہے ہیں، یہاں جناح سے لے کر دانیال لطیفی اور پروفیسر عنایت اللہ خان تک بہت سوں کا رونا ہے، اور یہاں "این خانہ ہمہ آفتاب است" کی مثال صادق آتی ہے، اور ہر طرف نور علیٰ نور کے جلوے دکھائی دیتے ہیں،

اب مسٹر جناح پر اعتراض کرنا کہ وہ نماز نہیں پڑھتے، وہ روزہ نہیں رکھتے، وہ حج کو نہیں گئے، وہ شراب نہیں چھوڑتے اور شریعت کے قوانین کی حمایت نہیں کرتے، یہ سب باتیں غلط فہمی میں مبتلا لوگوں کی بیہودہ باتیں ہیں، انھیں صورت حال کو خود سمجھنا چاہیے، اور اپنا علاج کرنا چاہیے، مسٹر جناح تو غلط نہیں کر رہے، ہم ہی غلط سمجھ رہے ہیں، دیکھیں خدا

کس کس کو سننے اور سمجھنے کی توفیق عطا کرتا ہے،

جو لوگ ایسا قائدِ اعظم چاہتے ہیں اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے جوش اور ولولہ دکھا رہے ہیں ہم ان کے جوش اور ولولہ کی قدر کرتے ہیں، مگر ان کی بے راہ روی میں ان کے پیرو نہیں بن سکتے، ہمیں جس طرح قادیانیت کی لعنت کو مسلمانوں کی گردن سے ہٹانا پڑا ہے اسی طرح مسٹر جناح جیسے لاَمذہب لوگوں سے مسلمانوں کا پیچھا چھڑانا بھی ہماری قسمت میں لکھا ہے، اگرچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع اک جان سو عذاب عجب دُکھ ہی جان کو

تاہم ہر دُکھ کو جھیلتے ہوئے اور ہر عذاب میں سے گزرتے ہوئے ہمیں اسلام و قرآن کی خدمت کرنا ہے، اور امت کو داخلی و خارجی فتنوں سے بچانے میں مصروف رہنا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کفر بازی سے مقابلہ اتنا سخت نہیں جتنا سخت اس کفر مستتر سے ہے جو اندر ہی اندر اسلام کے جسم و روح کو کچل رہا ہے، تاہم ہمیں اپنی کوششیں اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کے لیے وقف کر دینی چاہییے، تاکہ ہم اللہ کے اجر کے مستحق ہو سکیں، اور ہماری اولادیں سوِل میرج کی لعنت میں مبتلا ہو کر دامنِ جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو چھوڑ نہ دیں،

مسلم لیگیوں نے ہماری صُلح کی ہر کوشش کو ٹھکرایا ہے، اور وہ اپنی قوت کے زعم میں ہم کو اور اپنے سے ہر اختلاف رکھنے والے کو فنا کرنے کے درپے ہیں، جیسا کہ مسٹر جناح نے اپنی تقریرِ سیالکوٹ میں کہا تھا،

مگر انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی زبردستیاں ہم ناتوانوں کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتیں، اور لوگوں کی مخالفت اور اکثریت کی یورشیں ہمیں سیدھی راہ سے ذرا اور ہٹا نہیں سکتیں،

علمائے کرام اور صوفیائے عظام سے التماس

اس وقت کئی ایک علمائے کرام اور صوفیائے عظام پاکستان کی فریبندہ بحث میں مبتلا ہو کر مسلم لیگ زندہ باد اور قائدِ اعظم زندہ باد کا نعرہ لگا رہے ہیں، وہ لوگوں کو جناح کا دامن مضبوطی سے پکڑنے کے لیے کہہ رہے ہیں، لیکن جس شخص نے ایک کافرہ عورت کے دامن سے وابستہ ہونے کے لیے اللہ اور رسول کا دامن کو تج دیا ہو اسے اپنا قائدِ اعظم بنا کر کونسی راہِ فلاح کی طرف کوچ ہو سکتا ہے،

قبل ازیں تو آپ حضرات کو غالباً لاعلمی تھی، لیکن آج کے بعد کوئی لاعلمی نہیں رہ سکتی، ہمارا اور آپ کا حساب آجکل کے انتخابِ عام کے ووٹوں پر ختم نہیں ہو سکتا، بلکہ یوم النشور کو اللہ کے حضور میں ہونا ہے، اس لیے ہم سب کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے، تاکہ ہم خود غلط راہ پر نہ جا رہے ہوں اور دوسروں کو غلط راہ پر لے جا کر ان کی بے راہ روی کا بوجھ بھی اپنی گردنوں پر نہ اُٹھا رہے ہوں،

خداوند تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے،

والسلام ۳ ستمبر ۴۵ء

لیگی پریس کا جواب اور احتراز

اس پمفلٹ کی طبع اول کے بعد ہی ہندوستان کی سیاسی فضاء میں ہیجان و اضطراب اور تحقیق و تفتیش کی راہیں کھل گئیں، سرمایہ دار طبقہ نے پریس کی قوت سے سادہ لوح مسلمانوں کو جس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا اس کا پردہ چاک ہونا شروع ہوا، مسٹر جناح کی سول میرج کے حقائق نے ہندوستانی

مسلمانوں کو مسلم لیگ کی غلط کاریوں اور دہریہ لیڈر شپ پر غور کرنے مجبور کر دیا، خدا پرست اور صحیح الخیال مسلمانوں نے الحاد و زندقہ کے اس طوفان سے اسلام کو بچانے کا تہیہ کر لیا، چنانچہ ملک کے ہر گوشہ سے مجلس احرار کے اس اقدام پر لبیک کی صدائیں بلند ہونے لگیں، خود مسلم لیگی حضرات کو بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنا پڑی، اور کئی ایک دیانتدار حضرات نے مسٹر محمد علی جناح اور اس کے معتقدین کی قیادت سے انحراف کا اعلان کر دیا، اور مسلم لیگ کا خیالی قلعہ پاش پاش ہونے لگا،

اس پمفلٹ نے فریب خوردہ مسلم لیگیوں کو حیران و ششدر کر دیا، جب اس پمفلٹ کی اشاعت کے کئی روز بعد تک ان کے 'قائد اعظم' کی طرف سے کوئی صدا نہ اٹھی تو انھوں نے نمک حلالی کرتے ہوئے چند ایک بیانات شائع کرا دیئے، اتفاق سے متذکرہ بیانات ایک ساتھ مختلف ذہنوں میں تیار ہوئے اس لیے تضاد پیدا ہو گیا،

آخر من گھڑت افسانوں میں تضاد لازمی ہوتا ہے،

امرتسر سے عبداللہ منہاس صاحب نے اعلان کیا کہ "مسٹر جناح کی بیوی رتن بائی نے شادی سے پہلے اسلام قبول کیا، اور اس کا نام غلام فاطمہ رکھا گیا، اور نکاح بمبئی کی جامع مسجد کے سُنی خطیب نے پڑھایا"،

لیکن اس بیان سے بالکل مختلف ایڈیٹر "ایسٹرن ٹائمز" لاہور (مسلم لیگی) نے بیان کیا کہ "رتن بائی کا نام مریم رکھا گیا، اور نکاح ایران کے ایک بغیر ریش شیعہ مجتہد نے پڑھایا"، ان بیانات کے بعد مسٹر محمد علی جناح کا ایک اعلان شائع ہوا، لیکن انھوں نے اپنے نکاح کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا،

ان بیانات سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر محمد علی جناح نے اسلامی

طریقہ سے نکاح کیا ہوتا تو لیگی پریس ایک طوفان برپا کر دیتا، لیکن حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے من گھڑت کہانیاں شائع کی گئیں جو اپنے تضاد کے باعث میرے حقائق کی معاون ہی ثابت ہوئیں،

مجلس احرار اسلام کا نظریہ اب بھی وہی ہے جو اس رسالہ میں لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں مزید انکشافات عنقریب ایک اور پمفلٹ میں شائع کیے جائیں گے، ہم مسلم لیگی بھائیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ بہتان تراشیوں کی بجائے حقائق کا دلائل اور ثبوت سے جواب دیں، تاکہ مسلمان قوم کسی صحیح راستہ پر گامزن ہو سکے ؛

مظہر علی اظہر

۵ راکتوبر ۴۵ء

مسٹر جناح اور تحریک مسجد شہید گنج

پاکستان کے نام پر ووٹ مانگنے والوں نے آج سے دس سال پہلے مسجد شہید گنج کے نام پر ووٹ مانگنے کی طرح ڈالی تھی، بھولا بھالا مسلمان اُس وقت بھی جذبۂ اسلامی سے سرشار ہو کر انتخابی عیاروں کے ہاتھ میں کھیل گیا، اور اس نے مجلسِ احرار کو شکست دینے میں اپنا پورا زور لگا دیا، مسلمان رائے دہندے یہی سمجھتے رہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے خاص مسجد کے لیے ہو رہا ہے، انھوں نے روپے دیئے جانیں دیں، جیلیں جھیلیں، اور گولیاں کھانے اور جیلوں میں جانے کے بعد جب انتخابی دَور آیا تو وہ مسجد شہید گنج کے نام پر مسجد شہید گنج کے پروانوں کو ووٹ دینے کے لیے تیار ہو گئے،

ہمارے وہ اخبار جو آج پاکستان کی رٹ لگا رہے ہیں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید کی رٹ لگا رہے تھے اُس وقت تو وہ لکھتے تھے کہ جب تک مسجد شہید گنج نہیں واپس لیتے نہ چین سے بیٹھیں گے نہ بیٹھنے دیں گے لیکن انتخاب کا معرکہ ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ مسجد کا درد کم ہوتا گیا حتیٰ کہ اس کا نام و نشان بھی نہ رہا، اور ۱۹۴۰ء میں جبکہ دوسرا انتخاب سر پر نظر آتا تھا... پاکستان کا مروڑا اٹھنے لگا،

اگر جنگ کے باعث انتخابِ عام ملتوی نہ ہوتا رہتا تو کب کا یہ پاکستانی نعرہ اپنا زور دکھا چکا ہوتا، اور یہ بھی شہید گنجی نعرہ کی طرح تاریخ دُہرا چکا ہوتا، مگر جنگ کی طوالت نے اسے پنپنے کا موقع دیا، اور آج یہ مسجد شہید گنج کی انتخابی

تحریک کی طرح موجودہ انتخابی تحریک کا نعرۂ ممتاز ہے،

مجلسِ اتحادِ ملت اور مسلم لیگ کے ارکان مسجد شہید گنج کے نام پر ووٹ مانگتے تھے، اور ایک مجلسِ احرار تھی جس کے مجھ جیسے کارکنوں نے سیالکوٹ اور گوجرانوالہ جیسے شہروں میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم اسمبلی میں جا کر مسجد کا کوئی کام نہیں کر سکتے، جو کوئی ایسا وعدہ کرتا ہے وہ غلط وعدہ کرتا ہے، اس لیے اگر ہماری بات پر یقین ہو تو ہمیں ووٹ دو، ورنہ جس کو چاہو ووٹ دو، میرے محترم دوست ملک لعل خاں صاحب کے حق میں "زمیندار" میں اعلان ہوا کرتا تھا کہ:

"ملک لعل خاں کو ووٹ دینا مسجد شہید گنج کو ووٹ دینا ہے اور مظہر علی کو ووٹ دینا مندر کو ووٹ دینا ہے"،

گو عام طور پر مجلس کی مخالفت ہوئی اور لوگوں نے مسجد شہید گنج کے نام پر ہمارے کرم فرماؤں کو ووٹ دیئے، مگر کہیں کہیں رائے دہندوں نے واقعات و توقعات کا درست جائزہ لیا،

دس برس کے بعد اب پاکستان کے نام پر ووٹ مانگے جا رہے ہیں، اور پانچ برس میں قوم کو آج کا محرق بخار پاکستان کے مسلسل ٹیکوں سے چڑھایا گیا ہے،

کیا آج کوئی مسلمان یہ سوچنے کو تیار نہیں کہ جو لوگ اتنے دعووں کے بعد مسجد شہید گنج نہ دلوا سکے جن کو ووٹ ملے، جن کی وزارتیں قائم ہوئیں، جن کے ڈنکے بجے، جن کا طوطی ملک میں بولا، انھوں نے اسمبلی ہال میں خود کہا کہ "گورنر کو مسجد شہید گنج کی واپسی کا مسودۂ پنجاب اسمبلی کے روبرو پیش ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیے،

تحریک مسجد شہید گنج کے بارے میں میں نے ۱۹۳۶ء میں ایک کتاب "خوفناک سازش" کے نام سے شائع کی تھی، دس برس میں اس کے ایک حرف کو بھی کوئی غلط قرار نہیں دے سکا، اور بڑے سے بڑا صاحبِ قلم اس کے جواب سے اس وقت تک عاجز رہا ہے، جس کسی کو تمام حالات پر پھر ایک نظر ڈالنی ہو وہ اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتا ہے،

اس مختصر سے مضمون میں میں فقط یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح نے بھی ان دنوں لاہور میں آ کر اس تحریک کے سلسلہ میں نمایاں پارٹ ادا کیا تھا آج ہر شہید گنجی اخبار اس یاد کو دانستہ فراموش کیے بیٹھا ہے، حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کی طرح باقی شہید گنجی لوگ بھی جو پہلے مسلم لیگ میں نہیں تھے میرے معزز دوست ملک لعل خاں کی طرح مسلم لیگ میں جا رہے ہیں، مگر اب یہ پاکستان لینے چلے ہیں، اب انھیں مسجد شہید گنج کی ضرورت نہیں، پنجاب کے رائے دہندوں کو عموماً اور لاہور کے رائے دہندوں کو خصوصاً سوچنا چاہیے کہ جو لوگ اسمبلی میں جا کر مسجد شہید گنج واپس نہ لے سکے وہ اس اسمبلی میں جا کر پاکستان کیسے بنوا دیں گے؟ جبکہ وہاں سکھ اور ہندو کافی تعداد میں موجود ہیں، اور وہاں اپنی مرضی کی ہر بات نہیں کی جا سکتی،

بہر حال اوروں سے قطع نظر مجھے مسٹر جناح کی کارکردگی کے ایک واقعہ کو بھولے ہوئے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے،

۱۹۳۶ء کے ابتدائی مہینوں میں بھی مسجد شہید گنج کی تحریک کسی نہ کسی رنگ میں چل رہی تھی، چودھری مولا بخش اور دوسرے لوگ سول نافرمانی کر کے جیل خانوں کو جا رہے تھے، اور مسجد کی بازیابی کے خواہاں تھے، تحریک شہید گنج کے لیڈر قید ہونے کی بجائے نظر بندی کے لطف اٹھا رہے تھے،

ان دنوں پنجاب اور مسجد شہید گنج کی خوش قسمتی سے مسٹر جناح بھی لاہور میں
آورد ہوئے،

انھوں نے گورنر پنجاب سے بھی ملاقات کی، لاہور کے کئی لوگوں کو بھی شرف
زیارت بخشا، اور سول نافرمانی کی تحریک کو بند کرنے کے لیے کہا، تحریک
بند کر دی گئی، نظر بند اور قیدی رہا ہونے لگے، گورنر بہادر کا دل خوش ہوا،
اور مسٹر جناح لاہور سے کامیاب واپس ہوئے، میں ان واقعات کی تفصیل
میں جا کر احباب کا وقت لینا نہیں چاہتا،

مسٹر جناح کا بیان

روزنامہ "زمیندار" نے اپنی ۴ر مارچ ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں مسٹر جناح
کا ایک بیان درج کیا ہے، عنوانات اور مضمون حسب ذیل ہیں:۔

قضیہ مسجد شہید گنج کے تصفیہ کی صورت
مسٹر محمد علی جناح کا بیان

مسٹر محمد علی جناح نے لاہور سے جانے سے پہلے حسب ذیل بیان اخبارات
اشاعت کے لیے ارسال فرمایا:

"میں دیکھتا ہوں کہ صورتِ حالات میں ایک نمایاں تغیر رونما
ہو گیا ہے، اور فضا سازگار ہو گئی ہے، سکھ اور مسلم قائدین کے
ساتھ گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جانبین ایک
قابلِ قبول مفاہمت اور باعزت سمجھوتہ کے دل سے خواہاں ہیں،
دونوں جماعتوں کی خواہش ہے کہ پنجاب کے بہتر مفادات کے لیے

ان کے درمیان یک جہتی اور محبت کا رشتہ استوار ہو جائے، اس سلسلہ میں میرے سامنے متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں، لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس مسئلہ کی نزاکت اس کی مشکلات سے زیادہ ہے، کیونکہ مذہبی جذبات بہت زیادہ بیدار ہو چکے ہیں، اور مختلف طریقوں اور متضاد تجویزوں پر غور و خوض کرنے کے لیے صرف پُرامن فضا ہی نہیں چاہیے بلکہ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ان تجاویز کا تجزیہ اور توازن اس انداز سے کیا جائے کہ دونوں جماعتیں اس آخری فیصلہ سے مطمئن ہو جائیں، جو ان تجویزوں میں سے مترتب ہو، یہ مناقشہ افراد کا نہیں بلکہ اس کا تعلق دو عظیم المرتبت جماعتوں سے ہے، اس لیے عوام سے استصواب رائے کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے، چنانچہ اس تمام کام کو پوری طرح سرانجام دینے کے لیے بہتر سمجھا گیا ہے کہ مستقبل میں سعی و جہد کو جاری رکھا جائے، اور ایک خوشگوار اور باعزت تصفیہ کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے،

مجلسِ صُلح کی تشکیل

لہٰذا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس مہم کو سرانجام دینے کا بہترین طریقہ ایک مجلسِ صُلح کی تشکیل ہے، جس کا نام انجمن مصالحتِ قضیہ شہید گنج رکھا جائے، یہ مجلس مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ہو گی، اور مجھے توقع ہے کہ یہ لوگ اس مقصد کے لیے اپنی اپنی جماعتوں کے قائدوں سے استصواب رائے کرنے کے بعد ایک ایسا متفقہ فارمولا پیش کریں گے جو جانبین کے لیے قابلِ قبول ہو، معاملہ پر

کافی غور و خوض کرنے کے بعد میں انجمن مصالحت کی رکنیت کے لیے چند اصحاب کا نام پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، اور یہ لوگ ارکان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے مجاز ہیں،

ارکان کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۱ : ڈاکٹر محمد اقبال
۲ : مولانا عبد القادر قصوری
۳ : میاں عبد العزیز
۴ : راجہ نریندر ناتھ
۵ : پنڈت نانک چند
۶ : سردار بہادر بوٹا سنگھ
۷ : سردار اجل سنگھ
۸ : سردار سمپورن سنگھ،

خان بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ اجلاس کے انعقاد کے مہتمم ہوں گے،

میں نے مذکورہ بالا اصحاب میں سے اکثر کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انھوں نے اس عظیم الشان مہم کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے، اور میں ان کے نیک عزائم کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں، آخر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انھیں جب اور جس گھڑی میری ضرورت پڑے وہ میری خدمات سے استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس اثنا میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پنجاب میں صلح و امن کی جو فضا پیدا ہو چکی ہے وہ بدستور قائم رہے گی۔"

یہ بیان اپنی جگہ واضح ہے، مگر جب تک ذرا سی تنقید کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہ ڈالی جائے اس وقت تک خواص و عوام اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے، اور نہ ہی ان حالات کا درست جائزہ لے سکتے ہیں، جو پاکستان کے نام پر آج پیدا کیے جا رہے ہیں، قابلِ غور امور یہ ہیں:۔

۱۔ مسٹر جناح نے فرمایا کہ "میں سکھ اور مسلم قائدین سے گفتگو کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جانبین ایک قابلِ قبول مفاہمت اور باعزت سمجھوتہ دل سے خواہاں ہیں"

مسٹر جناح کی بات پر شک کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن آج پاکستانی بخار میں قوم کو شدت سے مبتلا کرنے والے لوگوں سے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب سنہ ۱۹۳۶ء کے اوائل ایام میں دونوں قوموں کے قائدین قابلِ قبول مفاہمت اور باعزت سمجھوتہ کے دل سے خواہاں تھے تو کیا کوئی سمجھوتہ ہو سکا، کیا کوئی قابلِ قبول مفاہمت زیرِ عمل آئی؟ کیا کمیٹی کے مقتدر ارکان کوئی راہِ عمل پیدا کر سکے؟

جب مسلم اور سکھ قائد دل سے مفاہمت اور باعزت سمجھوتہ کے خواہاں تھے پھر بھی کوئی تصفیہ نہ ہو سکا، اس وقت مسٹر جناح پُرامن فضا کے طالب تھے اور سب ماحول کو پُرامن رکھنے کی اپیلیں کرتے تھے، کیا پاکستان کسی قابلِ قبول مفاہمت اور باعزت سمجھوتہ کے بغیر کسی ڈنڈے سے حاصل کرنا ہے؟

ہندوؤں کو ایک طرف رہنے دو، کیا سکھوں سے پاکستان کے بارے میں کسی مفاہمت یا سمجھوتہ کے لیے راہ پیدا کی گئی ہے؟ کیا موجودہ انتخابی ڈھونگ مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات کو زیادہ کشیدہ نہ کرے گا؟ کیا حکومتِ برطانیہ سکھوں کو قطعاً نظر انداز کر کے گڑگانواں اور دلی سے لے کر لنڈی کوتل تک پاکستان

بنادے گی اور سکھوں کو اس پاکستان میں رہنے پر مجبور کرے گی، یا آپ اس سے درخواست کریں گے کہ پاکستان بنا کر اس کی حفاظت بھی حضور خود ہی فرمایا کریں،

الغرض ہمارے پاکستانی دوستوں نے فضاء کو ہمیشہ مکدر سے مکدر تر رکھا ہے، اور اس طرح پاکستان کے نام پر ووٹ حاصل کرنا چاہا ہے، حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جس طرح شہید گنج کے نام پر ووٹ لے کر مسجد نہ ملی تھی اسی طرح پاکستان کے نام پر ووٹ لینے سے پاکستان نہیں بن سکتا، البتہ کانگریسیوں مہاسبھائیوں یا اکالیوں سے سمجھوتہ کر کے اکھنڈ بھارت میں وزارتیں مل سکتی ہیں، اور اسی کا بندوبست ہمارے دوست علانیہ فرما رہے ہیں، جیسا کہ میاں ممتاز دولتانہ نے ۳؍اگست کی تقریر میں لاہور میں کہا یا میاں افتخار حسین صاحب آف ممدوٹ نے اکالیوں سے گفتگو کر کے بتایا،

اگر پاکستان بنانا مقصود ہوتا تو ووٹوں کے لیے یہ جدوجہد نہ ہوتی بلکہ کوئی اور راستہ اختیار کیا جاتا،

۲۔ مسجد شہید گنج کے بارے میں متعدد تجاویز ہونے کے باوجود کوئی تصفیہ اس لیے نہ ہو سکتا تھا کہ مسٹر جناح کے الفاظ میں:

"اس مسئلہ کی نزاکت اس کی مشکلات سے زیادہ ہے، کیونکہ مذہبی جذبات بہت زیادہ بیدار ہو چکے ہیں"

اگر مذہبی جذبات کے زیادہ بیدار ہونے سے مسجد شہید گنج کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تو مذہبی جذبات اور بھی زیادہ بیدار ہونے سے پاکستان کا حل کیونکر ہو سکے گا؟

۳۔ مسجد شہید گنج کے تصفیہ کے بارے میں بقول مسٹر جناح:۔

"مختلف طریقوں اور متضاد تجویزوں پر غور و خوض کرنے کے لیے

صرف پُرامن فضا ہی نہیں چاہیے بلکہ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ان تجاویز کا تجزیہ اور توازن اس انداز میں کیا جائے کہ دونوں جماعتیں اس کے آخری فیصلہ سے مطمئن ہو جائیں جو ان تجویزوں میں سے مترتب ہو"

کیا پاکستان کے بارے میں پُرامن فضا کے بغیر ہی دونوں جماعتیں اور ان کے علاوہ ہندو اور اچھوت وغیرہ راضی اور مطمئن ہو سکتے ہیں؟ پھر پاکستان کے نام پر یہ انتخابی آگ جو ہر قوم کے اندر لگائی جا رہی ہے اور مذہبی جذبات برانگیختہ کیے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

میں برسوں سے کہہ رہا ہوں اور آج پھر پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ پاکستان پر انتخاب لڑانا پاکستان کے قیام کو ناکام بنانے کی بدترین یا بہترین کوشش ہے، پنجاب پر پاکستان کا دارومدار ہے، پاکستان کو انتخابی نعرہ بنا کر ہندوؤں، سکھوں اور اچھوتوں کو چیلنج کرنا ہے، کہ وہ پاکستان کے خلاف آواز اٹھائیں، اور مسلم وغیر مسلم دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں، جن کے درمیان مسجد شہید گنج کی طرح قابلِ قبول مفاہمت یا باعزت سمجھوتہ کی کوئی راہ نکل نہ سکے، مسٹر جناح اور ساتھی شہید گنجی راہ چل رہے ہیں، اور جس طرح مسجد لیتے لیتے اس کو رگڑوا کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجوادی گئی، اسی طرح پاکستان لیتے لیتے پاکستانی مسلمانوں کی سیاست کا کچومر ہی نکلوا کر رکھ دیا جائے گا، اگر مسٹر جناح اپنی موجودہ روش پر رہے تو نتیجہ لازماً یہی ہو گا،

میں نصیحت کا حق ادا کر رہا ہوں اور وہ بھی ایک نہایت ناساز گار ہوا میں، مگر شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی ✤ حُدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

۴۔ مسٹر جناح نے فرمایا:
"یہ مناقشہ افراد کا نہیں بلکہ اس کا تعلق دو عظیم المرتبت جماعتوں سے ہے، اس لیے عوام سے استصواب رائے کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔"

یہاں تو مسٹر جناح نے سکھوں کو ایک عظیم المرتبت جماعت تسلیم کر لیا، حالانکہ قضیہ ایک مسجد کا تھا، لیکن جب سب مسجدوں اور گوردواروں کا معاملہ سامنے آئے اور پاکستان کے قیام کا سوال ہو جس میں سکھوں کے تمام تاریخی و مذہبی مقامات کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہو تو اس وقت مسٹر جناح سکھوں کو عظیم المرتبت جماعت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے جنرل سکریٹری نواب زادہ لیاقت خان سے بروقت کہدیتے کہ کانگریس سے بات کرتے وقت سکھوں اور اچھوتوں کو علیحدہ قوم تسلیم نہ کر لینا،

اب تو نواب زادہ صاحب نے غصہ میں آکر ڈیسائی لیاقت علی فارمولا شائع کر دیا ہے، جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مساوی نمائندگی کے ساتھ سکھوں اور اچھوتوں کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی تھی، اگر ہندوستان کے مرکز کا عارضی فیصلہ سکھوں اور اچھوتوں کے بغیر نہیں ہو سکتا تو پاکستان کا مستقل ان کی مرضی کے بغیر کیسے ہو جائے گا؟ اور مسلمانوں کے ووٹ پاکستان کے نام پر لیلینے سے پاکستان کیونکر رونما ہو جائے گا؟ کیا سکھ ڈر کر دُبک جائیں گے؟ اور اونچی آواز نکالنا بھی گناہ سمجھنے لگیں گے؟

۵۔ مسٹر جناح نے اپنا چھٹکارا کرانے کے لیے "انجمن مصالحت قضیہ مسجد شہید گنج" کی بناء ڈالی، اور دوسروں کے سر بلا ڈال کر گھر کو روانہ ہو گئے،

پھر نہ ان کو کبھی کسی نے بلایا کہ آکر مسجد شہید گنج کی مفاہمت میں دخل دیجیے اور نہ خود انھوں نے اپنی انجمن مصالحت یا اس کے داعی سے دریافت کیا کہ آپ نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں؟

میں تو اس بارے میں آج تک کوئی اطلاع حاصل نہیں کر سکا، اتنا دیکھا ہے کہ مجلس کے داعی دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کا کوئی قائم مقام بھی مقرر نہ ہوا، میاں ممتاز دولتانہ صاحب اپنے والد بزرگوار کے خود ہی قائم مقام بن کر مسجد شہید گنج کی مفاہمت کی راہ نکالتے تو مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوتا، راجہ نریندر ناتھ صاحب بھی اللہ کے دربار میں جا شکایت کرنے لگے کہ میں تو مسجد شہید گنج کا کام کرنا چاہتا تھا، مگر نہ مسٹر جناح نے مسئلہ کو آگے چلایا اور نہ ان کے مسلمان دوستوں نے، مولانا عبدالقادر قصوری بھی انتظار کرتے کرتے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے، مگر کسی نے ان کو بھی انجمنِ مصالحت کے اجلاس میں طلب نہ کیا، سر محمد اقبال بھی شہید گنج کی بجائے شاہی مسجد کی طرف رحلت فرما گئے،

جو کوئی باقی ہے وہ مسجد کی بجائے پاکستان کے جھگڑے میں مبتلا ہے،

گورنر پنجاب کی تقریر

گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن نے مسٹر جناح کی شان میں جو قصیدہ خوانی کی اس کا کچھ حصہ ۱۴ر مارچ ۳۶ء کے روزنامہ "زمیندار" کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:-

"پنجاب کا خونی ڈرامہ"

""آج میں اُن واقعات کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا جن سے پنجاب

کی سرزمین لالہ زار بن گئی تھی، اور نہ میں اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہوں، صرف اسی قدر کہنا مناسب ہے کہ کئی ماہ کے بعد فضا میں اب خوشگواری پیدا ہوتی ہے، اگر ذرا کوشش سے کام لیا گیا تو کتابِ پنجاب سے یہ خونی باب بند ہو سکتا ہے"۔

مسٹر جناح کو خراجِ تحسین

فضا میں اس سازگاری کے لیے ہم مسٹر محمد علی جناح کی سعیِ مشکور کے رہینِ منت ہیں، میں مسٹر جناح کے اس مستحسن کارنامہ کو اعماقِ قلب سے خراجِ تحسین ادا کرتا ہوں، مسٹر جناح کا کام دشواریوں سے گھرا ہوا تھا، خود اپنی قوم میں انہیں ایسی فضا پیدا کرنی تھی جس سے وہ آئینی ذرائع اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے،

دوسری طرف سکھوں سے باعزت مفاہمت بھی آپ کی کوشش کا مطمحِ نظر تھا، سکھوں سے ملاقات پر مسٹر جناح نے انھیں یقین دلا دیا کہ باعزت سمجھوتہ سے ان کے اقتدار کو کسی قسم کا ضعف پہنچنے کی جگہ ان کے کلاہِ افتخار کو چار چاند لگ جائیں گے،

مسٹر جناح اپنے پہلے مشن میں کامیاب ہو چکے ہیں، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور خیال نے آپ کی نصیحت کو مان لیا ہے، جس سے حکومتِ پنجاب اُس اقدام کے لیے آمادہ ہو گئی ہے جس کے لیے وہ موقع کی منتظر تھی، اس سلسلہ میں مسٹر جناح نے حکومت کے لیے بھی بہت بڑا کام کیا ہے، آپ کے کام کا دوسرا حصہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے، اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر جناح

کی مساعی ابھی لیلائے مقصد سے ہمکنار نہیں ہوئیں، لیکن اس کا مطلب
یہ ہرگز نہیں کہ وہ ناکام رہی ہیں، گفتگوئے مفاہمت کا سلسلہ جاری
ہے اور پُرامید طریق پر جاری ہے"

گورنر بہادر کی مذکورہ بالا تقریر زیادہ تنقید کی محتاج نہیں، جو کام گورنر بہادر سے نہ ہو سکتا تھا مسٹر جناح نے وہ کر دکھایا، گورنر کا راستہ صاف ہو گیا، اور قوم کو آئینی ذرائع کی طرف راجع کر دیا گیا، یعنی مسجد شہید گنج کے نام پر سول نافرمانی بند ہو گئی،

مگر گورنر بہادر یہ کہنے پر مجبور تھے کہ کام کا دوسرا حصہ یعنی سکھوں سے مفاہمت اور مسجد کی بازیابی، اسی طرح دھرے کا دھرا رہ گیا، بس گورنر بہادر نے یہ انکشاف فرما دیا کہ :-

"سکھوں سے ملاقات پر مسٹر جناح نے انھیں یقین دلایا کہ باعزت
سمجھوتہ سے ان کے اقتدار کو کسی قسم کا ضعف پہنچنے کی جگہ ان کے
کلاہِ افتخار کو چار چاند لگ جائیں گے"

مگر گورنر بہادر یہ نہ بتا سکے کہ آیا سکھ اپنے کلاہِ افتخار کو ان کے ہاتھوں چار چاند لگوانے کو تیار ہیں یا نہیں؟ اگرچہ گورنر بہادر نے یہ فرما دیا کہ :-

"اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر جناح
کی مساعی ابھی لیلائے مقصد سے ہمکنار نہیں ہوئیں، لیکن اس کا
مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ناکام رہی ہیں، گفتگوئے مفاہمت
کا سلسلہ جاری ہے اور پُرامید طریق سے جاری ہے"

مسٹر جناح اور گورنر دونوں کے بیانات میں گفتگوئے مفاہمت پر کافی زور دیا گیا، اور 'پُرامید' کا لفظ استعمال ہوا، لیکن ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مسٹر جناح

کی کارگزاری اور گورنر کی تقریر کے بعد نظر بندوں اور قیدیوں کی رہائی، اخبار ول کی ضمانتوں کی واپسی وغیرہ کی جو کارروائی ہوئی انتخابی اغراض کے لیے اس کی ضرورت تھی، "زمیندار" اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے ہمنوا اخبار اور لیڈر خوش وخرم تھے، مگر تحریک کا جو حشر ہونے والا تھا وہ "زمیندار" کے اُس شذرہ سے ظاہر ہے، جو اسی اشاعت میں سپردِ قلم فرمایا گیا، شذرہ حسب ذیل ہے:-

تحریکِ مسجدِ شہید گنج

"اگرچہ یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقائے کار مسٹر محمد علی جناح کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت نظر بندی سے رہا کر دیے گئے ہیں، "زمیندار" "سیاست" اور "احسان" کی ضمانتوں کے احکام واپس لے لیے گئے ہیں، جس قدر قیدی اور ملزمین تھے وہ سب رہا کر دیے گئے ہیں، لیکن شہید گنج کی مسجد کا مسئلہ ابھی حل طلب ہے، ہم مسلمانانِ پنجاب کی طرف سے مسٹر جناح کی ان مخلصانہ خدمات کا سچے دل سے اعتراف کرتے ہیں جو انھوں نے مسئلۂ مذکور کے متعلق انجام دی ہیں، ہم اس بارے میں ہز ایکسیلنسی سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب کی مصالحانہ روش اور مآل اندیشانہ طریقِ کار کا بھی اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے، مسٹر جناح نے جس تدبر، صاف گوئی اور دلیری سے ہز ایکسیلنسی کو صورتِ حالات اور اس کے دور رس نتائج سے آگاہ کیا، وہ پنجاب کے زعمائے اسلام کے لیے ایک ناقابلِ فراموش سبق ہے، ہمیں مسٹر جناح کی ذات پر فخر ہے، اس لیے کہ وہ مسلمانانِ پنجاب کے دُکھ سے متاثر

ہوکر ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے سیدھے لاہور پہنچے، جہاں انھوں نے فضاء کو سازگار بنانے کے لیے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، اگر پنجاب کا کوئی مسلم سپوت اس نازک موقع پر اپنی فرض شناسی اور اخوت اسلامی کا ثبوت دیتا تو ہمیں حقیقت میں زیادہ خوشی ہوتی، ہم پنجاب اور بالخصوص لاہور کے ان تمام مسلمان نوجوانوں کو مبارک باد دیتے ہیں جنھوں نے اپنے خالق کی رضا جوئی، اس کے حبیب پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مقدس تعلیم اور اسلام کے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں مالی اور جانی قربانیاں دیں،

برادرانِ اسلام کی خدمت میں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ہمارے سامنے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے حل پر فرزندانِ اسلام کے درخشاں مستقبل کا انحصار ہے، مسلمانوں کی قومی سیرت کا ایک کمزور پہلو ہے کہ وہ جب خاص حالات اور واقعات سے متاثر ہوکر اپنی مستعدی اور سرگرمی کی نمائش کرتے ہیں تو ان کی پیش قدمی ایک سیلاب عظیم کی صورت اختیار کرلیتی ہے، لیکن جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو پھر اس سیلاب کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا، ہمسایہ اقوام ہماری سستی اور غفلت سے پورا فائدہ اٹھاتی ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں مستقل کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم بیدار اور مستعد رہیں، اور ہمارے قومی کارکن ایک مقررہ نظام کے ماتحت نام و نمود کی خواہش کے بغیر ایک سپاہی کی طرح کام کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، ہم پہلے ہی

سستی اور غفلت کا بہت بُری طرح خمیازہ اٹھا رہے ہیں، ہمارے ان مصائب کا صرف اسی صورت میں خاتمہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے تمام باہمی اختلافات کو مٹا دیں، اور پھر اسلام کی نورانی سلک میں منسلک ہو کر بُنیانِ مرصوص ہو جائیں،

ہم پنجاب کی ترقی کے لیے اپنے تمام سکھ بھائیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ تحریک مسجد شہید گنج کے متعلق ایسی مدبرانہ اور فیاضانہ روش اختیار کریں جس سے یہ مسئلہ بطریق احسن حل ہو جائے اور دونوں کے تعلقات ایک خوشگوار صورت اختیار کرلیں، ہمیں امید ہے کہ سکھ قوم کے روشن خیال اور معاملہ فہم افراد ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب کی اس مصالحانہ خواہش کا احترام کریں گے، جو ممدوح نے مذکورہ بالا مسئلہ کے متعلق حال ہی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمائی ہے، اور یہ امر زیادہ امید افزا ہے کہ حکومت پنجاب اس معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہی ہے، اور ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہے۔"

میں نے شذرہ کی تمام و کمال عبارت درج کر دی ہے، تاکہ مجھ پر قطع و برید کا الزام نہ لگے، مگر اس شذرہ پر تنقید نہ کرنا بھی نامناسب ہے، اس کے بارے میں یہ امر قابلِ لحاظ ہیں :-

۱۔ "زمیندار" اور اس کے ساتھی مسجد شہید گنج کی تحریک میں لوگوں کو گولیوں سے اُڑوا چکنے کے بعد اس بات پر مسرت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ان کے مرد رہا ہو گئے اور اخبار کی ضمانتوں کے احکام واپس ہوتے، اور اس کار خیر کے لیے وہ مسٹر جناح کے بیحد ممنون ہیں، اگر مسرت کا اظہار اسی پر ہو جانا تھا تو تحریک کو چلا کر لوگوں کو گولیوں کے سامنے رکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ لوگوں کے ساتھ جو ہوسو ہو خود

گھروں کو واپس آئے اور ضمانتیں واپس، جو روپیہ قوم سے ہاتھ آتا رہا وہ مفت میں، مسٹر جناح کی ذات پر فخر ہے کہ گو وہ مسجد لے کر نہیں دے سکے مگر ہمیں تو چھڑوا دیا، اگر رہائی کی خوشی تھی تو نظر بند ہونے اور قید کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

۲۔ سب سے ضروری اور ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ایک اور جملہ ہے، جس کی طرف مستقل اور پائدار توجہ دینے کی ضرورت ہے، "زمیندار" نے لکھا ہے کہ:-

"مسلمانوں کی قومی سیرت کا یہ ایک کمزور پہلو ہے کہ وہ جب خاص حالات اور واقعات سے متأثر ہو کر اپنی مستعدی اور سرگرمی کی نمائش کرتے ہیں تو ان کی پیش قدمی ایک سیلاب عظیم کی صورت اختیار کر لیتی ہے، لیکن جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو پھر اس سیلاب کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا"

آج ہر مسلمان بخوبی سوچ سکتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی سیرت کا کمزور پہلو ہے کہ وہ سیلاب کی طرح اٹھیں اور بلبلہ کی طرح بیٹھ جائیں، یا یہ مسلمان اخبارات کی کمزور سیرت کا کمزور پہلو ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کا دھوکہ سے غلط استعمال کریں اور اپنا کام نکال کر قوم کو گڑھے میں دھکیل دیں،

مسجد شہید گنج کی تحریک کو "زمیندار"، "سیاست"، "احسان"، "انقلاب" وغیرہ نے گرمایا، سب جانتے تھے کہ مسجد نہیں مل سکتی، ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھی یہاں تک آمادہ تھے کہ مسجد کو شہید نہ کرایا جائے بلکہ اس کی مرمت کر دی جائے، اور اسے ایک مقدس مقام کی طرح سکھ اور مسلمان اپنی زیارت گاہ بنالیں، مگر حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اس پیشکش کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ سرکاری افسر کہتا ہے کہ راضی نامہ نہ کرنا، حکومت مسجد دلا دیگی جس قوم کے لیڈر اپنی تمام سیاست فراست کو ایک غیر ذمہ دار سرکاری افسر

کے غیر محفوظ الفاظ کی موہوم امید پر بے دردی سے قربان کر دیں، قوم کی کامیاب رہنمائی کب کر سکتے ہیں؟

اگر مقصد مسجد کا تحفظ یا سکھوں سے راضی نامہ ہوتا تو ماسٹر تارا سنگھ کی ایک بات سے دونوں مقاصد حاصل ہوتے تھے، اور ایک ننھی سی ہاں کی ضرورت تھی، پھر نہ گولی چلتی، نہ قتل ہوتے، نہ پھانسیاں لٹکتیں، نہ نظر بندیوں اور جیلوں تک نوبت آتی،

مگر مقصد تھا انتخابِ عام میں ووٹ حاصل کرنا، اور اس کے لیے مجلسِ احرار سے فساد پیدا کر کے اسے خواہ مخواہ بدنام کرنا، تارا سنگھ کی بات مان کر یہ مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا، اس لیے مسجد کو شہید کروانا اور لوگوں کو گولیوں کے سامنے رکھوانا ضروری تھا، لوگ قبروں میں جا سوئے اور لیڈر نظر بندی سے نکل کر شہیدوں کی ہڈیوں پر پاؤں رکھ کر اسمبلیوں کی طرف دوڑے، جو مقصد تھا وہ حاصل ہوا،

ہندوستان کے مسلمانوں کو لاہور کے اخباروں نے ہیجان میں مبتلا کیا تھا مہینوں شوریدہ سری سے پروپیگنڈا ہوا، لوگوں نے سرگرمی دکھائی، مسجد شہید گنج کے پروانے اس کی چتا پر جل بھُن گئے، مگر اسمبلی کی راہ تکنے والی بھیڑیں جلتی چتا کو دیکھ کر واپس آ گئیں، کہ یہاں جلنا مقصود نہیں، بلکہ اسمبلی ہال میں جینا مقصود ہے،

جناح نے آ کر جلتی چتا پر پانی برسایا، ایمرسن خوش ہوا، "زمیندار"، "احسان" اور "سیاست" خوش ہوئے، جناح نے سرگرم قوم کو ٹھنڈا کیا، جو کسر رہ گئی تھی وہ لیڈروں اور اخباروں نے دوبارہ رونما ہو کر پوری کر دی، خود قوم کو ٹھنڈا کیا، خود مسجد کا نام لینا بند کر دیا، قوم مسجد کو بھول گئی، مسجد شہید گنج کی جگہ

آہستہ آہستہ پاکستان کو لا کھڑا کیا، پھر وہی اخبارات، پھر وہی گرمیِ مضامین، پھر وہی انتخابِ عام کے ووٹ، ووٹ لینے کے بعد دو تین برس میں پاکستان کی یاد بھلا کر نیا ڈھونگ تلاش کیا جائے گا،

تم خود قوم کو بے جا گرماتے ہو، اور پھر مطلب نکال کر اسے ٹھنڈا کرتے ہو، مگر اپنی کمزوریِ سیرت تسلیم کرنے کی بجائے سیرتِ قومی کو کمزور بتلاتے ہو،

اللہ تم سے سمجھے اور قوم تم کو سمجھے!

مسجد شہید گنج کا دوسرا دور

مناسب ہو کہ یہاں میں مختصراً مسجد شہید گنج کے دوسرے دَور کا بھی ذکر کردوں، انتخابِ عام میں احرار کو شکست دینے کے بعد یاروں نے مسجد شہید گنج کے بارے میں پھر کبھی کبھی قرارداد منظور کرنا شروع کی، اب اتحادِ ملت اور مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا باقاعدہ گٹھ جوڑ ہو گیا، جناح، ظفر علی خاں اور سکندر ایک ہو گئے،

۱۹۳۷ء کے اکتوبر میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، مسجد کی بازیابی کی قرارداد منظور کی گئی، اور اندرونی فیصلہ یہ تھا کہ احرار کو کوئی کام ہی نہ کرنے دیا جائے، چنانچہ ہم نے لاہور میں بادشاہی مسجد میں یوم فلسطین کے سلسلہ میں ایک جلسہ کیا، اس کو برہم کرنے کے لیے مسجد شہید گنج کا نعرہ لگایا گیا، اس نعرہ کے سبب سے کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا، مگر "زمیندار" وغیرہ اخبارات نے احرار کے خلاف قدم اٹھا لیا،

قصہ کوتاہ میں نے بھی شہید گنج کا نعرہ بلند کرتے ہوئے سب مخالفوں کو مسجد کی خاطر قربانی دینے کے لیے للکارا، لاہور والوں کو وہ جلسے اور وہ سرجوشیاں آج بھی یاد آتی ہوں گی، بالآخر میں اور میرے ساتھی جیل کو گئے، لیکن مولانا

ظفر علی خاں اور ان کے گرامی قدر ساتھی "زمیندار" میں فہرست پہلوانان شائع کرنے کے بعد بھی "دنگل" سے کنارہ کشی کر گئے، اور اکھاڑہ میں آئے ہی نہیں،

ہم جیلوں میں گئے، پنجاب کی مسلم لیگی وزارت نے جس کے وزیر اعظم سر سکندر حیات تھے، جس کے قائدِ اعظم مسٹر جناح تھے اور جس کے گُن گانے والے "زمیندار" اور "احسان" وغیرہ تھے، ہمیں گرفتار کیا، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر لاہور، شاہپور، میانوالی اور دوسرے مقامات کو ہمیں دوڑاتے پھرے،

مسجد شہید گنج کی تحریک چلانے والے جب مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانے والوں کا یہ حال کریں تو قوم بیچاری کب تک مستعد رہے اور سرگرمی دکھائے؟

انہی دنوں میں نے پنجاب اسمبلی میں مسجد کی بازیابی کی تحریک کا نوٹس دیدیا تھا، میں تو جیل میں چلا گیا، مگر جب میرے جیل میں جانے کے جلد ہی بعد اجلاس ہوا تو تحریک کی گرمی کے باعث اسمبلی کے ممبر ایک مسودہ قانون مسجد کی بازیابی کے لیے پیش کرنے پر مجبور ہوئے، جب اس کے پیش ہونے کی نوبت آئی، تو سر سکندر نے اسمبلی میں بیان دیدیا، کہ میری سفارش پر گورنر بہادر نے اس مسودۂ قانون کو اسمبلی میں پیش ہونے سے روک دیا ہے، وزیر اعظم کو اپنے سب ساتھیوں کی تائید حاصل ہوئی، اور جب احرار کے اس وقت کے ممبر خواجہ غلام حسین نے سر سکندر کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کی تو اس کی تائید میں دو احراری ممبروں کے علاوہ ایک ہی اور ممبر کھڑا ہوا، اس لیے تحریک پیش ہی نہ ہو سکی،

دلی دروازہ کے بعد اسمبلی ہال میں مسجد کا یہ حشر ہوا، اس کے بعد "زمیندار" اور اس کے ساتھی سو گئے، اور قوم کو بھی مسجد شہید گنج کی یاد بھلا کر پاکستان کی طرف کھینچنے لگے،

سنہ ۱۹۳۸ء میں پنجاب اسمبلی میں مسجد شہید گنج کا مسودہ قانون مسجد شہید گنج

کے پروانوں کے ہاتھوں جل گیا، انتخاب عام کی امید ۱۹۴۱ء کے آخر میں یا ۱۹۴۲ء کے شروع میں تھی، اس لیے ووٹوں کے لیے نیا فریب چاہیے تھا، ۳۸ء میں سوچا اور ۱۹۳۹ء میں ایک کمیٹی مرتب کی گئی جو پاکستان کی اسکیموں پر غور کرے، ۴۰ء کے مارچ میں خاکساروں کے قتل عام کے عین بعد لاہور میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا، اس نعرہ کی عمارت مسجد شہید گنج کے ملبہ، خاکساروں کی ہڈیوں کی اینٹوں اور ان کے خون کے گارے پر تیار کی گئی، یہ ابھی تک کھڑی ہے، کیونکہ اخباروں اور مقرروں نے غلط بیانوں، غلط استدلالوں، غلط امید افزائیوں اور غلط بہانوں سے قوم کو بہکایا اور گرمایا ہے، شہید گنج کے دس سال بعد پھر ووٹ لینا ہے مسجد کے نام پر نہیں، اب پاکستان کے نام پر ووٹ لینا ہے،

لاہور گرم ہے، اس نے ملک بھر کو گرمایا ہے، انتخاب کے لیے مالی جہاد کیا جا رہا ہے، امیروں کی جیبیں غریبوں کے روپوں سے پُر کی جا رہی ہیں، تاکہ ووٹ حاصل کرنے کا بندوبست کیا جائے، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ دونوں شہید گنج میں پھنسے ہوئے ہیں، لیکن بالکل اسی طرح مشتعل ہیں جس طرح مسجد شہید گنج کی تحریک کے دور میں تھے، کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ بات تو وہی ہو رہی ہے جو ۱۹۳۵، ۳۶ء میں ہو رہی تھی، مگر ۱۹۴۵، ۴۶ء میں دماغ سوچنے لگے تو دل نہیں مانتا،

جس قوم کے لیڈر اسے بیوقوف بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیں اور اخبار اُن کا ساتھ دیں، وہ قوم غلط کاری کرے تو محض اسی کا قصور نہیں، ذمہ داری لیڈروں کی زیادہ ہے،

ہماری قسمت میں یہی ہے کہ ہم چٹان کی طرح کذب و افتراء کے ہر طوفان

کا مقابلہ کریں، ہم آج بھی اپنی جگہ پر مستعدی سے کھڑے ہیں، اور جو طوفان بے تمیزی برپا کیا جا رہا ہے مردانگی اور جرأتِ ایمانی سے اُس کا حتی الوسع مقابلہ کر رہے ہیں، درست بات کہنا اور قوم کو سمجھانا ہمارا کام ہے، نتیجہ ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو ہو سو ہو،

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝

مظہر علی اظہر

۸ ستمبر ۱۹۴۵ء
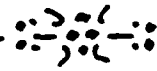
لیگ اور مسٹر جناح کے کارنامے

مولانا مظہر علی کی تقریر:

لاہور، ۱۵ ستمبر مجلس احرار اسلام ہند کا ایک عظیم الشان جلسہ باغ بیرون دہلی دروازہ میں زیر صدارت صاحبزادہ فیض الحسن منعقد ہوا، حاضرین کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار تھی،

جب قائد احرار نے تقریر شروع کی، تو تمام جلسہ نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھا،

انگلستان کے انتخابات:

حضرت مولانا نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا کہ آج ہم لوگ آپ کے سامنے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، ابھی حال ہی میں انگلستان میں انتخابات کی جنگ ہو چکی ہے، جس میں ہر ایک جماعت نے اپنی اپنی پالیسی کے تحت اعلان کیا کہ وہ برطانیۂ عظمیٰ کے لیے اپنے طے کردہ راستے بہتر سمجھتی ہے، چنانچہ انگریز قوم نے مسٹر چرچل کی جماعت کو خاص شکست دی، اور ان کی جگہ میجر اٹیلی نے وزارت عظمیٰ بنائی، یہ اس زمانہ میں ہوا جب کہ ابھی جاپان کی جنگ جیتنی باقی تھی،

لیگ کے دو سوال:

لیکن آج ہندوستان میں مسلم لیگ جس کے اجارہ داروں نے کبھی مسلمانوں کی عملی زندگی میں کوئی خدمت نہیں کی اپنے سوا کسی کو زندہ رہنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں، قائدِ اعظم فرماتے ہیں کہ عام انتخابات میں ہمارے سامنے دو سوال ہیں

۱۔ پاکستان کا حصول

۲۔ اور مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کا اثبات،

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے مسٹر جناح آج تک نہیں بتا سکے کہ وہ پاکستان کس طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اور ان کے ذہن میں پاکستان کا کوئی واضح نقشہ بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر ان کا مقصد پاکستان حاصل کرنا ہے تو وہ تمام عناصر پاکستان سے متفق ہیں جنھیں مسٹر جناح اپنی آمریت کے نشے میں مسلم لیگ سے الگ کر چکے ہیں،

فضل الحق، خضر حیات اور جناح صاحب:

پاکستانی قرارداد (۱۹۴۰ء) کے محرک مولوی فضل الحق سابق وزیراعظم بنگال مسلم لیگ سے کیوں الگ کیے گئے، کیا انھیں پاکستان کے اصول اور حصول سے اختلاف تھا، نہیں، بلکہ وہ مسٹر جناح کی آمریت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے، اور یہی حال پنجاب میں ملک خضر حیات خاں سے ہوا،

ابوالکلام کے خلاف فتوے:

لاہور کے بعض نام نہاد اسلامی اخبار اور لیگی لیڈر اور لاہور کی بعض مساجد کے امام لیگ کی لادینی سیاست کے نقیب ہیں، اور علانیہ فتوے دیئے جاتے ہیں کہ ابوالکلام یزید ہے اور مسٹر جینا حسین، کیا ان فتوے بازوں کو علم نہیں کہ وہ اس قسم کے اعلانات سے خود اسلام کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں،

احرار پر الزام تراشی:

مجھے کہا جاتا ہے کہ میں نے خضر حیات سے پچیس ہزار روپیہ لے لیا ہے، ہماری زندگیاں تو آپ کے سامنے ہیں، اور اگر ہم بکنے والے ہیں تو مسلم لیگ اور اس کے امراء ہمیں کیوں نہیں خرید لیتے، مسلم لیگ کے حواریوں نے دوسروں

پر افترا باندھنے کے ساتھ ساتھ ان کے جلسوں کو خراب کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا ہے، اور پھر ہمیں خضر حیات کا اجیر بنا کر اپنے ایمان کو روسیاہ کیا جاتا ہے، اگر مسلم لیگ واقعی ایسا سمجھتی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مظہر علی اور خضر حیات کی شرافت ہے کہ تمہارے جلسے امن وامان سے ہو جاتے ہیں، ہم چاہیں تو صوبہ بھر میں مسلم لیگ کی کی زندگی اجیرن ہو سکتی ہے، اور ابوالکلام پہ جوتیوں کی بارش کرانے والے اپنا حشر بھی دیکھ سکتے ہیں، اور کیا قائداعظم کا اس نوع کے خیر مقدم سے بچ کر نکلنا ممکن ہے؟

مسجد شہید گنج اور لیگی سیاست:

ابھی چند سال پہلے اس شہر میں مسجد شہید گنج کا غوغا بلند کیا جا رہا تھا، اور اس وقت کے الیکشن جیتنے کے لیے ایک مسجد کے انہدام کو وسیلہ بنایا گیا، مسجد گروائی گئی اور اس کے گروانے والے وہی لوگ تھے جو اس کی شکستہ اینٹوں اور منہدم میناروں کا سہارا لے کر اسمبلیوں میں پہنچے، جن لوگوں نے مجلس احرار کو فنا کرنے کی سازش کر رکھی تھی، انھوں نے قوم کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا، اور لاہور میں قتل وغارت کا موجب بنے، اور پھر ان شہداء کی روحوں کے نام پہ ووٹ حاصل کیے،

مسجد شہید گنج اور ظفر علی خاں:

ماسٹر تارا سنگھ اس بات پر رضا مند ہو گئے تھے کہ مسجد نہیں گرائی جاتی بشرطیکہ مسلمان ملکیت کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں، لیکن مولانا ظفر علی خاں نہ مانے، اور بصیغۂ راز فرمایا کہ مجھے ایک ذمہ دار سرکاری افیسر نے بتایا ہے کہ مسلمان ایجی ٹیشن کریں تو مسجد مل سکتی ہے، چنانچہ نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، اور نتیجہ مجلسِ احرار کی ابتدائی رائے سے مختلف نہ نکلا، البتہ جب مجلسِ احرار کو انتخابی جنگ میں شکست دلوا کر اس تحریک کے رہنما اسمبلی میں پہنچے تو پھر ایسی

چُپ سادھی جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا تھا،

شاید آپ پوچھیں کہ وہ ذمہ دار افسر کون تھا جس نے مولانا ظفر علی خاں کو مسجد کی بازیابی کا یقین دلایا تھا؟ تو میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ وہ افسر شاید وہی نہ ہو جس کا آپ استقبال کر چکے ہیں،

مسجد شہید گنج کمیٹی کا انجام:

مسٹر جناح نے مسجد کی بازیابی کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی بنائی، اس کمیٹی کے بہت سے ارکان رفتہ رفتہ انتقال کر گئے، لیکن ایک دفعہ بھی اس کا جلسہ نہ ہوا، یہ ایک حقیقت ہے کہ شہید گنج کے نام پر کامیاب ہونے والوں نے پھر کبھی شہید گنج کا نام نہ لیا، باوجودیکہ آج بھی کعبہ کی یہ بیٹی انھیں پکار رہی ہے،

جناح صاحب کی عملی زندگی:

ہمارے خلاف ڈان میں ایک ڈرامہ شائع کیا گیا کہ احرار روپے پر خریدے جا سکتے ہیں، اور علامہ مشرقی ایک چائے کی پیالی پر فروخت ہو سکتا ہے،

میں کہتا ہوں کہ اگر ہمارے خلاف اس قسم کے فرضی ڈرامے تصنیف کیے جا سکتے ہیں تو پھر انھیں حقیقی ڈراموں کے منظرِ عام پر آنے سے نہیں گھبرانا چاہیے، کیونکہ قوم اچھی طرح جانتی ہے کہ ان کا قائدِ اعظم نماز سے ناآشنا ہے، روزے سے تمسخر کرتا ہے، عملاً شریعت کا مذاق اڑاتا ہے، اور شراب پینا جائز سمجھتا ہے، حتیٰ کہ ایک پارسی عورت سے شادی کرتے وقت سول میرج ایکٹ کے حلف نامہ کی رُو سے اپنے نامسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے، کیا قرآنی احکام عقد و مناکحت سے باغی انسان مسلمانوں کا قائدِ اعظم بن سکتا ہے؟ افسوس!

ایک کافرہ عورت کے لیے دین کو چھوڑا
یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم؟

غازی علم الدین کا مقدمہ اور مسٹر جناح:

کیا یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے بل بوتے پر پاکستان کا مطالبہ کیا جاتا ہے؟ ہمارے بعض بھائی کہتے ہیں کہ مسٹر جناح ہمارا امیر نہیں وکیل ہے، اگرچہ یہ ان کی ولایتی پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا جاتا ہے، لیکن میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ اس وکیل سے بچو، کیا تمہیں اس کا پہلا تجربہ یاد نہیں، غازی علم الدین کا مقدمہ بھی اسی وکیل نے ہارا تھا، اور مسلمانوں کے دس ہزار روپے مقدمہ کی مسل پڑھے بغیر ہی حاصل کر لیے تھے،

لیگ اور مرزائیت:

مرزائیت کے متعلق مسلم لیگ کی پالیسی اخبار "زمیندار" کے اقتباسات اور مسلم لیگ کونسل کے حوالے دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ آج مسلم لیگ مرزا غلام احمد کی جماعت کو مسلمان سمجھ رہی ہے، اور انھیں مسلمانوں سے الگ کرنے کو تیار نہیں، کیا مسٹر جناح پاکستان میں اس قسم کی نبوتوں کو جاری رکھنا چاہتے ہیں؟

لیگ کے دیگر کرتوت:

اس طرح مولانا نے مدحِ صحابہ اور تبرہ تحریک پر نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی، اور بتایا کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں سے لے کر راجہ غضنفر علی تک اس تحریک میں مجرم ہیں، جنھیں ملت کبھی معاف نہیں کر سکتی ہے،

آپ نے کہا جو لوگ سندھ میں پیر پگاڑو اور حُروں کو قتل کروا کر مطمئن ہوئے، جنھوں نے ۱۹ ارمارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں خاکساروں کا قتلِ عام

کرایا، اور ۲۳ مارچ کو پاکستان ریزولیوشن پاس کیا، سید عطاء اللہ شاہ پر جھوٹے مقدمات بنوائے، اسلامی دنیا کو محکوم بنایا، اور بنگال میں نفع خوری کی غرض سے لاکھوں انسانوں کو بھوکوں مروایا، وہ اب کس منہ سے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور ان کی کس بات پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ یہ لوگ قوم کے مجرم ہیں جو اپنی قیادت کی ہوس میں قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں، یہ پاکستان کے نام پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں، انھیں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے،

جناح صاحب کی آمریت:

مسٹر جناح کا تکبر جس کے دامن میں واحد نمائندگی کی اُپج لگی ہوئی ہے، پاکستان سے کہیں بڑھ کر اپنی آمریت کو منوانے پر مُصر ہے، اور یہی سرکشی مسلمانوں کی ناؤ کو غرقابی کی طرف لے جا رہی ہے،

جلسہ رات کو دو بجے بخیر و خوبی ختم ہوا،

(زمزم، لاہور، ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء)

ضمیمہ:

مسلم لیگ اور شریعت اسلامیہ کی مخالفت

(زمزم کا ایک اداریہ)

زمزم کی اشاعت مورخہ ۲۷ مئی میں صوبہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کارروائی شایع ہوئی تھی جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ:

''من جملہ دیگر امور کے ایک مسئلہ اس اجلاس میں یہ پیش تھا کہ پاکستان میں کون سا قانون رائج ہونا چاہیے؟ چند دردمند مسلمانوں کی رائے تھی کہ پاکستان میں قرآن حکیم کا قانون رائج ہو۔ مگر اس تجویز کی مخالفت اور پرجوش مخالفت بعض بڑے مسلم لیگیوں نے کی اور اپنی مخالفت کی وجہ یہ پیش کی کہ اگر پاکستان میں شریعت اسلامی رائج کی گئی تو ہمیں مجبور کیا جائے گا کہ اپنی جائیدادوں سے لڑکیوں کو بھی حصہ دیں۔''

اس خبر کے شایع ہونے کے چند دن بعد ایک مقامی معاصر میں اس کی تردید بڑے پرزور الفاظ میں شایع ہوئی جس مین نہ صرف اس خبر کو غلط بتایا گیا بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر شریعت اسلامیہ کے قانون کے رائج ہونے کی مخالفت کیسے کرسکتا ہے۔

اس کے بعد اس تجویز کے محرک مسٹر عبدالستار نیازی (صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ میانوالی وممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل) نے ایک تردیدی تحریر ہمیں بھی بھیجی جس میں اس خبر کو بے اصل بتایا گیا۔

....

لیکن ایک طرف تو تردید وتغلیط کا یہ زور شور ہے اور دوسری طرف خود معاصر مذکور کی اشاعت مورخہ ۲۲ مئی میں اس اجلاس کی جو کارروائی شایع ہوئی ہے اُس میں

تحریر ہے کہ

''خان رب نواز خاں ایڈووکیٹ اور سید مصطفیٰ شاہ خاں گیلانی نے قرار داد کی مخالفت کی۔''

اس کے بعد مزید تحریر کیا گیا ہے کہ

''شاہ صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت الٰہیہ کے تصور کو میں سرے سے ہی غلط تصور کرتا ہوں۔''

بعدازاں اس تجویز کا جو کچھ حشر ہوا، اُس کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

''لہٰذا ترمیم و تنسیخ کے بعد قرار داد پیش ہو کر اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔''

اس عبارت میں ''ترمیم و تنسیخ کے بعد'' کے الفاظ صاف غمازی کر رہے ہیں کہ اصلی قرارداد کے 'بعض' اجزا پر لیگ کے بعض لیڈروں کو اعتراض تھا اور ان کے اس اعتراض کے احترام میں ترمیم و تنسیخ تک کی نوبت پہنچی۔

....

مقامی لیگی معاصر کی اس تحریری شہادت کی موجودگی میں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ زمزم کی مذکورہ بالا خبر کو غلط اور بے بنیاد کہنا کس طرح صحیح معلوم ہوسکتا ہے۔ زمزم کی اطلاع میں صرف یہی کہا گیا ہے کہ پاکستان میں شریعت اسلامیہ کو نافذ کرنے کی قرارداد کی مخالفت بعض اُن بڑے مسلم لیگیوں نے کی جو شب و روز مسلمان عوام کو کانگریس اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی کے قصے سنا سنا کر اُکسایا کرتے ہیں۔

معاصر مذکور کی مذکورۂ بالا خبر میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے صوبہ لیگ کے ممبر ظاہر ہے کہ ''بڑے مسلم لیگی'' بھی ہیں۔ پھر زمزم نے تو کسی کا نام بھی نہیں لیا تھا، لیکن معاصر مذکور نے تو مخالفت کرنے والوں میں سے دو تین کے نام بھی پیش کر دیے۔

....

بہ ہر حال جب تجویز کے ''ترمیم و تنسیخ'' کے بعد پاس ہونے کا اعتراف ہے اور اس کا بھی اعتراف ہے کہ اس کی مخالفت میں تقریریں کی گئیں، تو پھر ہم نہیں سمجھ

سکتے کہ زمزم کی مذکورۂ بالا خبر میں کونسی چیز تردید طلب رہ جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ لیگ کے ممبر شریعت اسلامیہ کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں، سواس پر تو کچھ کہنا ہی لا حاصل ہے۔ آج ایک نہیں بیسیوں مثالیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں کہ بڑے بڑے ذمے دار لیگیوں کی طرف سے عدالتوں میں یہ درخواستیں گزرتی رہتی ہیں کہ ہماری جائیداد کا فیصلہ شریعت محمدی کے مطابق نہیں بلکہ رواج کے مطابق کیا جائے۔

....

مزید براں، سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جو شریعت اسلامیہ کے خلاف ہیں اور جن کو بڑے دھڑلے کے ساتھ لیگ کے ذمے دار ممبروں کی طرف سے کیا جارہا ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے اسمبلی میں شریعت بل کا خون لیگ ہی کے ممبروں کے ہاتھوں ہوا، اس کے بعد پچھلے دنوں اسی سرکاری ایوان میں مسٹر کاظمی کے قاضی بل کا گلا بھی لیگ ہی کے ذمہ داروں نے گھونٹا۔ ان صاف وروشن واقعات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ بھلا لیگ کا ممبر، قانون شریعت کی مخالفت کیسے کر سکتا ہے ایک بے معنی سی بات ہے۔

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

لیکن اس کے باوجود ہم مسٹر نیازی کی قسم کے چند پرجوش و مخلص قسم کے نوجوانوں کی ہمت وحوصلے کی داد دیتے ہیں جو مسلم لیگ کے اس نوع کے "بڑوں" کے حلقے میں گھیرے ہونے کے باوجود بھی اپنی بساط کے مطابق جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے رہتے ہیں۔

(زمزم- لاہور، ۱۹/ جون ۱۹۴۵ء)

۹

مسلم لیگ اور اس کے رہنما

مذہبی افکار و سیرت کے ایک طرفہ مطالعہ علمائے دین کے نقطۂ نگاہ سے

مرتب

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

فہرست

حرفے چند

یہ رسالہ پہلی مرتبہ ''مسٹر جناح کے متعلق لیگی علما کے فتاویٰ'' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء کے اواخر میں سنٹرل مسلم پارلیمنٹری بورڈ دہلی کی طرف سے شایع ہوا تھا۔ اسے مولانا عبدالوحید صدیقی صاحب مرکزی مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے نایب ناظم نے مرتب کیا تھا۔ اس میں جناح صاحب کے مذہبی افکار پر جو روشنی پڑتی ہے اور ان کی سیرت کا جو پہلو سامنے آتا ہے وہ آج کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ محمد علی جناح وقت کے ایک بڑے سیاست دان تھے ان کی شخصیت ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان کی مدت میں سیاست پر چھائی رہی ہے۔ کرپس مشن، شملہ کانفرنس اور کابینہ مشن کی ناکامی میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ تحریک پاکستان کی وہ سب سے اہم اور موثر شخصیت اور پاکستان کے بانی تھے۔ دو قومی نظریے کا تصور انھوں نے جس طرح پھونکا اور ہندوستان کی سیاسی زندگی کو جس طرح تہ و بالا کیا اور ۱۱راگست کا سورج طلوع ہوتے ہی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی افتتاحی تقریر میں ان نظریات کو جو مسلمانوں کو بہت عزیز تھے اور جن کے لیے انھوں نے اپنی جان و مال کی ناقابل فراموش قربانیاں دی تھیں چند لمحوں میں انھیں جس طرح دفن کر دیا وہ ان کے سیاسی سوانح اور پاکستان کی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔

محمد علی جناح کے تاریخی سیاسی سوانح کے مطالعے کا ایک اہم پہلو ہے۔ ان کے جن خیالات کو اس کتابچے میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ اور سیرت کے جس پہلو پر ان سے روشنی پڑتی ہے وہ سراسر غیر اسلامی تھے۔ مسلمانوں کے کسی مکتبِ فکر نے ان کے خیالات کی کوئی تاویل نہیں کی۔ ان کی سیرت اسلامی نقطۂ نظر سے ہمیشہ موضوع بحث بنی رہی۔ لیکن اسلام ہی کے نام پر انھوں نے تحریک چلائی۔ پاکستان بنایا اور پاکستان کے قایم ہوتے ہوتے انھوں نے تحریک کے تمام اصول و مقاصد پر پانی پھیر دیا اور

ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو جس اکثریت اور اس کی حکومت کے خلاف بھڑکایا تھا اور جنھیں تباہی کے کنارے پہنچادیا تھا، اسی اکثریت کے ساتھ جینے مرنے اور اس کی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کر کے پاکستان چلے آئے اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ انھوں نے یہ کیا کیا؟ ہمارے حصے میں ان کا صرف تاریخی سوانحی سیاسی اخلاقی سیرت اور ان کے افکار کے نشیب و فراز کا مطالعہ آیا۔

ہمارے لیے اس مطالعے میں بڑی عبرت اور بصیرت ہے۔ خدا ہمیں اس سے استفادے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مسٹر جناح کے عقائد

اور

اُن کی تشریح

قرآن مجید میں نصِ قطعی موجود ہے

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ۔ الآیۃ

(ترجمہ) "اور مشرک عورتوں سے جبتک وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح مت کرو، ایماندار باندی آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ تم کو پسند ہو، اور کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی مشرک مرد سے مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لائے، غلام مؤمن آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ تم کو پسند ہو، یہ سب (مشرک اور مشرکہ) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جنت کی طرف بلاتا ہے"

(سیقول، سورۃ بقرہ، رکوع ۲۷)

نصِ قطعی سے انکار اور قانونِ شریعت پر حملہ!

اس نصِ قطعی کے بعد مسٹر جناح کی مندرجہ ذیل تقریر کو بغور پڑھیے جو انھوں نے

وائسرائے کی کونسل میں اس نصِ قرآنی کے خلاف قانون بنوانے کے لیے کی، وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ واقعہ ہے کہ اس کونسل میں ایک پبلک نمائندہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسے مسئلہ میں بڑی مشکل میں ہے، کیونکہ کٹر عقیدتمند لوگوں کی اکثریت اس کے خلاف رہے گی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام کے کسی سچے نمائندہ کے لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ جس بات کو صحیح جانتا ہو اس کے بے خوف اظہار سے باز رہے، اگر کسی قوم کی اکثریت کسی ایک خیال یا عقیدہ کی پیرو ہے تو لازم نہیں کہ وہ خیال صحیح بھی ہو، اور وہ لوگ صحیح راستہ پر ہوں، اگر اس کونسل میں کسی نمائندہ کی پختہ طور پر یہ رائے ہے کہ یہ ترمیم اس کے ملک اور اس کی قوم کے لیے مفید ہے تو اس کا فرض ہے وہ اس ترمیم کی حمایت کرے"

اس تمہید کے بعد مسٹر جناح نے فرمایا:۔

"آنریبل ممبر قانون (سر علی امام) نے کہا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کوران (غالباً مراد قرآن مجید ہے) میں صریح حکم ہے کہ ایک مسلمان سوائے کتابیہ کے کسی غیر مسلمہ سے شادی نہیں کرسکتا، لیکن میں

اس ترمیم کو صحیح ثابت کر دکھاؤں گا

میں آنریبل ممبر سے دریافت کرتا ہوں کہ ملک کی قانون سازی میں کیا یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اس کونسل کو مسلّم قانون (شریعت) کو منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟

نہیں، ہمارے سامنے نظیریں موجود ہیں کہ شرعی قانون معاہدہ پر اب عمل درآمد نہیں ہوتا، اسلامی قانون فوجداری جس پر انگریزی حکومت

کی آمد کے بعد تک عملدرآمد ہوتا رہا،

اب قطعی منسوخ ہوچکا ہے

قانونِ شہادت جس سے اب تک مسلمان آشنا رہے ہیں، اب اس ملک میں ختم ہوگیا ہے، اس سے زیادہ اور لیجیے ۱۸۵۰ء کے قانون "منسوخی امتناع فرقہ واری" کا حال ہی میں نفاذ ہوا ہے، اور میں کونسل کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہ وہی قانون ہے جس کے خلاف کوران (قرآن) میں صاف حکم موجود ہے کہ کسی مسلمان کے مرتد ہوجانے پر اس کا حقِ وراثت ضبط کرلیا جاتا ہے،

ممبر قانون نے شادی کے متعلق جیسا صاف حکم (قرآن کا) بتایا ہے ایسا ہی یہ حکم بھی ہے، پھر بھی قانون کے ذریعہ اسے منسوخ کیا جاچکا ہے اور اب اگر کوئی مسلمان اسلام ترک کردے (مرتد ہوجائے) تب بھی اس کا حقِ وراثت محفوظ رہے گا، اور شریعتِ اسلام کے بل پر اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، کوران (قرآن) کا یہ حکم اب قطعی منسوخ ہوگیا، اب اس کا کوئی اثر نہیں ہے، میرا دعویٰ ہے کہ یہ ایسی نظیریں موجود ہیں جن کی پیروی کرکے ہم دورِ جدید کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں،

بیشک جنابِ صدر!

ہندو قانون ہو یا محمدی قانون جسے بھی آپ پیش نظر رکھیں ان کی وجہ سے بہت سی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

اگر کوئی ہندو، غیر ہندو (مسلمان عورت) سے شادی کرنا چاہے یا کوئی مسلمان غیر کتابیہ سے شادی کا ارادہ کرے تو یہ مذہبی قانون ان کے حق میں جنجال بن جاتے ہیں، ایسی تکلیف دہ مداخلت کو ختم کرنے کے لیے

جدید قانون سازی سے امداد لینا لازمی ہے،

قانون یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان کو غیر مسلم کے ساتھ یا ہر ہندو کو غیر ہندو کے ساتھ ضروری شادی کرنا ہوگی، البتہ اگر تعلیم یافتہ، روشن خیال اور ترقی پسند ہندوستانیوں کی کافی تعداد موجود ہو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا پارسی اور وہ شادی کا ایسا دستور اختیار کرنا چاہیں جس میں زمانہ حال کے خیالات اور مذاق سے مطابقت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے لوگوں کو انصاف سے محروم رکھا جائے"

(گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ، شعبہ قانون سازی، ص ۱۶۰ و ۱۶۱)

مسٹر جناح کا دلی عقیدہ

بعد میں ایک موقع پر مسٹر جناح نے اپنی اس تقریر کے متعلق وضاحت کی کہ:

"قوم کی اکثریت اس مسودۂ قانون کے خلاف ہے، مگر میرے دلی عقیدے اس مسودہ کی موافقت میں ہیں"

(ماخوذ از سوانحعمری مسٹر جناح، ص ۲۶۷)

مسٹر جناح کی اس تقریر کو پڑھ کر ہر انسان بلا کسی ادنیٰ شک و شبہہ کے اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ:

۱۔ مسٹر جناح قرآن مجید کے اس صاف و صریح حکم کو کہ "مسلمان مشرک اور مشرکہ سے نکاح نہ کریں" (نعوذ باللہ) غلط اور غیر منصفانہ یقین کرتے ہیں؛

۲۔ مسٹر جناح کے نزدیک قرآن کا یہ حکم منصفانہ نہیں ہے بلکہ انصاف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اور غیر مسلموں کو باہمی نکاح کی قانونی اجازت دی جائے،

۳۔ مسٹر جناح اس قسم کے قرآنی احکام کو جدید قانون سازی کے ذریعہ ختم کر دینا لازمی سمجھتے ہیں،

۴۔ مسٹر جناح اس نص قطعی کو (نعوذ باللہ) تکلیف دہ مداخلت اور جنجال سمجھتے ہیں،

۵۔ مسٹر جناح، اسلامی قانون معاہدہ، اسلامی قانون فوجداری، اسلامی قانونِ شہادت، مرتد کے حقِ وراثت کے اسلامی قانون کو انگریزی قانون کے ذریعہ منسوخ کر دیئے جانے پر خوش ہیں،

اور ان نظیروں کے ذریعہ سے فائدہ اٹھا کر وہ دوسرے قرآنی احکام کو بھی منسوخ کرانے کے آرزومند ہیں،

قرآن مجید کے قانونِ وراثت سے انکار

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ الآية (سورۃ نساء)

سورۂ نساء کے پہلے رکوع کے آخر اور دوسرے رکوع میں وراثت کے متعلق تفصیل سے احکام بیان فرمائے گئے ہیں، اور آخر میں ارشاد ہے:۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الآية (جس کا ترجمہ یہ ہے):

"اور جو اللہ اور رسول کے حکم کی نافرمانی کرے، اور نکل جائے اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تو اللہ اس کو داخل کرے گا آتشِ دوزخ میں، کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا" (سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی آخری آیت)

متبنّیٰ بنانے کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے

"تمہارے مُنہ بولے بیٹوں کو (متبنّیٰ کو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیٹے نہیں بنائے"، (یعنی وہ تمہاری حقیقی اولاد کی طرح نہیں ہیں)

وصیّت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ایک تہائی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے"

نیز ارشاد ہے کہ "کسی وارث کے لیے وصیت نہ ہونی چاہیے" یہ احادیث بخاری شریف و ترمذی شریف وغیرہ جملہ کتبِ احادیث میں موجود ہیں، اور اسی کے بموجب علمائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے، بہرحال قرآن پاک اور احادیثِ مقدسہ کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ

۱۔ وارثوں کے حصّے خود خداوندِ عالم نے اپنے کلام پاک میں مقرر فرمادیئے ہیں،

۲۔ جو خداوندِ عالم کی مقرر فرمودہ حدود سے انکار اور تجاوز کرے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کے شدید عذاب میں مبتلا رہے گا،

۳۔ چونکہ وارثوں کے حصّے مقرر فرمادیئے گئے ہیں، لہٰذا کسی وارث کے لیے مزید وصیت جائز نہیں،

۴۔ لے پالک یا متبنّیٰ کو شرعاً کوئی حق نہیں پہونچے گا، بلکہ مستحق وہ رشتہ دار ہیں جن کو قرآن حکیم نے وارث قرار دیا ہے،

۵۔ لہٰذا متبنّیٰ ہونے کی بناء پر ترکہ کا استحقاق شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور اس کی حمایت قانونِ شریعت سے بغاوت ہے،

۶۔ زیادہ سے زیادہ ترکہ کے ایک تہائی کی وصیت کی جاسکتی ہے، اس سے زائد وصیت ناجائز ہے اور دوسرے وارثوں کے حق میں ظلم ہے جو کہ حرام ہے،

غیر شرعی تقسیمِ وراثت

تقسیمِ وراثت کے متعلق ان صاف احکامِ قرآنی کے خلاف مسٹر جناح نے اپنے مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی کی تائید وحمایت سے شریعت بل میں ترمیم کرادی اور قانون بنوادیا کہ:۔ "وصیت متبنّٰی کے حقوق اور وراثت کے متعلق شریعت کے قانون پر عمل کرنے کو ضروری نہ قرار دیا جائے، بلکہ جو شخص چاہے رواج کے مطابق عدالت سے فیصلہ کرائے اور جو چاہے شریعت کے مطابق فیصلہ کرائے "

(ماخوذ از سنٹرل اسمبلی پروسیڈنگ رپورٹ ، ۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء)

اِن امور کے پیش نظر جناب امید علی خان صاحب نے ان علماء کرام سے جو مسلم لیگ کے حامی ہیں حسب ذیل استفتار کیا تھا جس کے جواب میں سب نے بالاتفاق ایسے شخص کو بے دین اور مرتد قرار دیا ہے، اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے،

لہٰذا میں اپنے دینی بھائیوں کی خیرخواہی کے لیے ان تمام فتووں کا صحیح عکس شائع کررہا ہوں، تاکہ مسلمان بھائی مسٹر جناح اور لیگ کے فتنہ سے بچ سکیں، اور اپنی عاقبت کو تباہی سے بچا سکیں،

میں اس موقع پر یہ اعلان کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلم اور غیر مسلم کے نکاح اور وراثت کے متعلق مسٹر جناح کے جن خیالات کا اوپر کی سطروں میں اظہار کیا گیا ہے وہ یقیناً ان کے خیالات ہیں جو سرکاری کاغذات میں موجود ہیں، مسٹر جناح اُن سے انکار نہیں کرسکتے، اگر وہ ان کو غلط ثابت کرنے کی جرأت کرسکیں تو میرے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کریں، میں ان کے اس قانونی چیلنج کو منظور کرنے کا اعلان کرتا ہوں،

استفتاء

نمبر ۱: ایک صاحب جنھیں ہمہ دانی کا بہت دعویٰ ہے ایسی باتیں فرماتے ہیں جن سے مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں،

مثلاً وہ ایک ایسے امر کے متعلق جس کی حرمت اور ممانعت قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ موجود ہے یہ کہتا ہو کہ "میرا عقیدہ اس کے خلاف ہے، یہ مسئلہ دقت طلب اور جنجال ہے، تکلیف دہ مداخلت ہے"،

یا مثلاً یہ کہتا ہو کہ "اسلامی احکام مقتضیاتِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اس لیے ان میں ترمیم کی ضرورت بھی سمجھتا ہے اور وہ لیسے ہی لوگوں کو روشن خیال اور ترقی پذیر سمجھتا ہے جو ان احکام میں عملاً ترمیم کر دیں"،

نمبر ۲: علمائے کرام تحریر فرمائیں کہ قرآن پاک میں وراثت اور تقسیم ترکہ کے متعلق جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ لازمی ہیں یا اختیاری؟ کیا ان احکام کے خلاف تقسیم ترکہ جائز ہے؟

کیا جو شخص ان احکام کے لزوم کو نہ مانے کیا وہ نصِ قرآنی کا منکر نہیں؟

ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور شرعاً اس کو کیا کہا جائے گا؟

عنایت فرما کر آیات و احادیث کے حوالہ سے جواب تحریر فرمائیں،

امید علی خان، موضع کھیڑہ افغان
ڈاک خانہ خاص، ضلع سہارنپور
۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء

(جوابات اگلے صفحہ پر دیکھیے)

مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کا فتویٰ؛

الجواب؛ ایسا شخص مسلمان نہیں، مرتد ہے، وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ہ

قانون میراث جو قرآن میں ہو اس پر عمل کرنا فرض ہے، اس کے خلاف حرام ہے، جو اُن کے لزوم کو نہ مانے وہ نصِ قرآنی کا منکر ہے، والسلام

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون

امام صاحب مسجد فتحپوری دھلی کا فتویٰ؛

۷۸۶ ھوالموفق،

۱۔ یہ شخص گمراہ ہے، بے دین ہے، جس امر کی ممانعت کے لیے نص صریح موجود ہو، مثلاً شراب، جوا، زنا وغیرہ، ان کو حلال کہنا کفر ہے، لقولہ تعالیٰ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ہ

"حرام و حلال اللہ کی جانب سے حدیں ہیں، پس اُن سے تجاوز (حرام کو حلال، حلال کو حرام اپنی طرف سے) نہ کرو، جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے پس وہ ظالموں میں سے ہو جائے گا، ظالم سے مراد مشرک و کافر ہے، لہٰذا اس کا یہ کہنا کہ میرا یہ عقیدہ ہی کفر ہے لقولہ تعالیٰ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ہ "آپؐ کہدیں اللہ و رسولؐ کی اطاعت کرو، پس اگر وہ پھر جاویں تو یاد رکھو کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا، ہر مسلمان کو اس سے احتراز لازم ہے،

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، "اللہ تعالیٰ کی رسّی (شریعت وقرآن) کو مضبوط پکڑو، اور اس میں افتراق نہ پیدا کرو"

اس شخص کے نزدیک ابھی قوانینِ اسلام میں کمی ہے جس کی بناء پر ترمیم کی ضرورت پیش آرہی ہے، دین کی تکمیل پہلے ہی ہو چکی، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، اب اور قیامت تک صرف قرآن پاک واحادیث سے استنباط کی اجازت ہے، وہ بھی مجتہد یا محقق کے لیے، نہ کہ عوام کے لیے، ایسے شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے احتراز ضروری ہے،

۲۔ تقسیمِ وراثت اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہے، لقولہ تعالیٰ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ، ہاں البتہ وارث کو اجازت ہے کہ وہ اپنا حصہ نہ لے یا کسی اور کو دیدے، باقی تقسیم جب ہوگی قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد مظفر احمد غفرلہ
امام مسجد فتحپوری، دہلی

مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی کا فتویٰ

الجواب، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی عبدہ الکریم

جو شخص نصوصِ قرآنیہ کا منکر ہے خواہ وہ وراثت کے متعلق ہوں یا کسی اور امر کے وہ شخص قطعی کافر خارج از اسلام، مرتد ہے، قال اللہ تعالیٰ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ العبد المعتصم بحبلہ المتین
محمد نعیم الدین عفی عنہ

مولانا عبدالرؤف صاحب دانا پوری (کلکتہ) کا فتویٰ

الجواب: ایمان نام ہی ما جاء بہ الرسول کو قبول کرنے اور حق جاننے کا،
اگر کوئی شخص خداوند پاک یا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات کا بھی انکار کرے یہ سمجھ کر یہ خدا کا یا رسول کا حکم ہے وہ مومن نہیں ہے، یُؤمِنُونَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَیَکْفُرُونَ بِبَعْضٍ کا مصداق ہے،

نمبر ۲، تقسیم وراثت کا مسئلہ لازمی ہے، کسی کو اس میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے، واللہ اعلم،

ابو البرکات عبدالرؤف قادری عفی عنہ
دانا پوری

مسلمانو! خدا کے لیے آنکھیں کھولو! جذبات کی رَو میں بہنے سے بچو، غلط اور گمراہ کن نعروں کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنی دنیا اور آخرت خراب نہ کرو،

ایسے رہنما اور ایسی جماعت سے دور بھاگو جو تمہارے دین کو اور تمہارے قرآن کو (نعوذ باللہ) جنجال اور تکلیف دہ مداخلت یقین کرتا ہے،

کونسلوں میں طاقت حاصل کر کے اپنے باطل خیالات کے مطابق جدید قانون سازی کے ذریعہ اُن میں ترمیم و تبدیلی کر کے تمہارے مذہب کو مٹا دینا چاہتا ہے، مسٹر جناح کے ان باطل خیالات اور ان کے متعلق خود لیگ کے سربرآوردہ علماء کے فتووں کو پڑھنے کے بعد جوش کو چھوڑ کر ہوش سے کام لو،

آپ کا مخلص اور خیر خواہ
عبدالوحید صدیقی عفی عنہ
(رکن مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند)

مطبوعہ: مدینہ پریس بجنور

قائدِ اعظم اور اسلام

بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء کی نظر میں

مرزا غلام نبی جانباز

قائدِ اعظم پر کفر کا فتویٰ: ملکی مفادات سے بے وفائی کے مرتکب کو غدار اور حدود اللہ پھاندنے والے کو کافر کہا جاتا ہے، دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے بوجھل اور وزنی ہیں، لیکن فرنگی شہنشاہیت کا ہندوستان میں آنا تھا کہ یہ الفاظ اپنا وقار کھو بیٹھے اسلام کی متعینہ راہوں سے بغاوت اور اس کے اصولوں سے انحراف بلاشبہ کفر و الحاد کی زد میں آتا ہے، مگر سیاست کی ناہموار وادی میں محض رائے سے اختلاف کی بناء پر کسی کو غدار یا کافر قرار دینا مروّجہ الفاظ کے معنی سے ناواقفیت کی دلیل سمجھا جائے گا،

بیسویں صدی کے جنم لیتے ہی ان الفاظ کی... مٹی پلید ہونا شروع ہوئی ہے تاریخ کا یہ عجیب باب ہے کہ تادمِ تحریر اس مشینری کا کوئی پرزہ نہ تو ضائع ہونے دیا گیا اور نہ اس کی رفتار میں کمی واقع ہو سکی، غیر ملکی حکمرانوں کی... مشیت بھی یہی تھی، اور اس کی روحانی اولاد نے اپنے آقاؤں کے اشارہ کو خوب سمجھا کہ آج تک کفر گری کا یہ سانچا ٹوٹنے نہ پایا،

مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ (۱۹۳۸ء) میں مسٹر محمد علی جناح کو ایک نعرہ کی بناء پر "قائد اعظم" کے خطاب سے نوازا گیا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رہنما مسٹر کرم چند موہن داس گاندھی کو ان کی قوم نے "مہاتما" کا لقب دیا، تو اس کے مقابل مسلم لیگ کو اپنے لیڈر کے لیے کسی خطاب کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک نعرہ باز نے لیگ کی یہ خواہش پوری کر دی، بظاہر یہ کوئی بُری بات نہیں تھی لیکن بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء نے صرف اور صرف اپنی افسانوی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے رائی کا پہاڑ بنا دیا اور اس پر حسب ذیل فتویٰ دے مارا:

فتویٰ

استفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع مبین حسب ذیل مسائل میں؟

۱۔ مسٹر محمد علی جناح جو ہیں تو کس عقائد کے ہیں؟

۲۔ ان کو قائدِ اعظم و سیدنا وغیرہ وغیرہ القابات سے خطاب کرنا شرعاً کوئی حرج نہیں ہے؟

۳۔ اس وقت اہل سنت والجماعت کا یہ خیال ہے کہ مسلم لیگ نے اب تک جو کارنامے کیے ہیں وہ بالکل حق بجانب ہیں، اس وقت دنیا کے اندر مختلف کمیٹیاں قائم ہیں، ایک طرف کانگریسی دریا اُمڈ رہا ہے، دوسری جانب مجلس احرار کا سیلاب بڑھتا چلا آ رہا ہے، تیسری جانب جمعیۃ علمائے ہند دہلی کا شور ہے، اب اہلِ سنت والجماعت کو کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیے جو سیدھا

راستہ ہو شرعاً تحریر فرمائیں،

۴۔ زید و عمر و بکر کا قول ہے کہ جو شخص مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا وہ جنتی ہے، اس نے اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لیا، اور جو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے نہ آیا تو وہ (معاذ اللہ) دوزخی ہے، اس نے اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا، اور کہتے ہیں کہ جدھر مسلمانوں کی جماعت اکثریت رکھتی ہو اُدھر شریک ہونا چاہیے،

۵۔ مسلمانانِ اہلِ سنت والجماعت کو مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے، یا نہیں؟ اور اس کو مسلم لیگ کمیٹی کا ممبر بننا چاہیے یا نہیں؟

۶۔ اس مسلم لیگ کمیٹی کے اندر شرعی نقطۂ نظر سے جو خرابیاں ہوں وہ صاف صاف تحریر کریں،

۷۔ مذہب اسلام اصل ہے یا سیاست اصل ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سیاست قرآن سے نکلی ہے، اس کی بھی تشریح مفصل تحریر فرمائیں؟

ان سب کا جواب صاف صاف تشریح کے ساتھ قرآن عظیم وحدیث کریم سے مرتب فرما کر حکم خدائے عزّ وجل اور اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا عطاء فرمائیے، جس پر مسلمانان اہلِ سنت والجماعت عمل کریں، خداوند کریم آپ کو اجر عظیم عطاء فرمائے، آمین، والسلام

المستفتی فقیر ابو النصر عطاء الرضا محمد عمر خاں قادری رضوی لکھنوی غفرلہ

۲۹ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ سہ شنبہ بمطابق ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء، از بیلی بھیت یوپی

الجواب

۱۔ محمد علی رافضی ہیں (دیکھو لیگی اخبار الامان دہلی، ۱۳ رمئی ۱۹۳۹ء میں سر محمد یعقوب صاحب کا بیان)

۲۔ کسی بھی بے دین، بدمذہب کو قائد اعظم وسیدنا وغیرہ وغیرہ القاب مدح وتعظیم سے خطاب کرنا شرعاً سخت ممنوع وحرام، صریح مخالفِ قرآن مجید وحدیث ہے، اللہ عزوجل نے فرمایا "وہ جو چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ، وہی غفلت میں پڑے ہیں،

نیز فرمایا: "بے شک وہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں سب بدمذہب، مشرکین، کفار اور مرتدین ہیں، وہ سب سے زیادہ ذلیلوں سے ہیں"

جسے قرآن جانوروں کی طرح، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ، اور سب ذلیلوں سے زیادہ ذلیل بتائے اسے سیدنا یا اپنا سردار کہنا کھلی ہوئی مخالفتِ قرآن نہیں تو اور کیا ہے، اور قائدِ اعظم کے معنیٰ ہیں سب سے بڑا پیشوا، سب سے بڑا راہ چلانے والا، رہبر و رہنما، اللہ عزوجل فرماتا ہے: "اس کا کہنا نہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا"، جملہ مبتدعین ومرتدین، کفار ومشرکین اس کے مصداق ہیں، تو ان میں سے کسی کو اپنا قائدِ اعظم، سب سے بڑا پیشوا، سب سے بڑا وہ جس کے کہنے پر یہ چلتے ہیں بتانا قرآن عظیم کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں

تو اور کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے، رب عزوجل غضب فرماتا ہے اور اس کے سبب عرش ہل جاتا ہے، بدمذہب عقیدے کا فاسق ہے اور وہ عمل کے فسق سے بدتر ہے،

نیز حدیث شریف میں ہے حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی بدمذہب کی طرف اس کی توقیر کرنے چلا اس نے اسلام کے ڈھانے میں اعانت کی،

نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اھل البدع کلاب اھل النار، بدمذہب سارے جہان سے بدتر ہیں، جانوروں سے بدتر ہیں، بدمذہب جہنمیوں کے کتے ہیں، کیا کوئی سچا ایماندار مسلمان کسی کتے اور وہ بھی دوزخیوں کے کتے کو اپنا قائد اعظم، سب سے بڑا پیشوا اور سردار بنانا پسند کرے گا؟ حاشا وکلا ہرگز نہیں، ایسوں کی قیادت وسیادت و رہنمائی کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا،

۴۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لیگ نے اب تک جو کارنامے کیے ہیں وہ بالکل حق بجانب ہیں، وہ لیگ کے اب تک کے سب کارناموں کی مفصل فہرست پیش کریں تو تفصیلاً ہر ایک کی نسبت دیکھا اور بتایا جائے گا، اب لیگ کے مقاصد پر نظر ڈالیے تو سب سے پہلا اور اہم ترین مقصد ہے آزادیِ ہند، جسے حال ہی کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء لکھنؤ میں جو بصدارت مسٹر محمد علی جناح ہوا، ان الفاظ میں پیش

کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد ہندوستان میں کامل آزادی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی شکل میں ہوگا، جس میں مسلمانوں کے اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کافی اور موثر طریق پر دستور میں محفوظ ہوں گے!

لیگ کا بھی وہ سب سے پہلا اور بڑا مایہ الفخر مقصد ہے جس پر تمام لیگیوں کو بہت بڑا ناز ہے، اور جس کو لیگی اخبارات اور مقررین عوام کے سامنے اپنا بہت ہی اہم ترین کارنامہ بنا کر پیش کرتے ہیں، اور اسی کے بل بوتے پر غریب نوازی اور جذبۂ آزادی میں کانگریس پر اپنی فوقیت بڑے زور شور سے جتلاتے ہیں، مگر کیا یہ آزادی اور یہ خود مختاری اور اپنی یہ حکومت جس کے لیے لیگ اور لیگی کوشاں اور اپنا سب سے بڑا کارنامہ بتاتے ہیں شرعی اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی حکومت اور اسلام کی پسندیدہ آزادی اور سچے دینی نقطۂ نظر سے بھی حق بجانب ہے، حاشا وکلا ہرگز نہیں، جس کے ثبوت میں خود لیگیوں ہی زبان سے ان کی اس آزادی کی حقیقت پیش کر دینا کافی ہے،

سنیے! سارے لیگیوں کے قائد اعظم، لیگ کے روحِ رواں، لیگیوں کے سیاسی[1] پیغمبر، جناح نے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول

---

[1] مسلم یونیورسٹی یونین میں جناح کی تصویر کی نقاب کشائی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے غلام بھیک صاحب نیرنگ نے کہا کہ مسٹر جناح نے ان کو علی گڑھ اس لیے بھیجا ہے تاکہ طلبہ تک یہ پیغام پہنچائیں کہ "انھیں مایوس نہ ہونا چاہیے"، اس کے بعد کہا کہ "مسٹر جناح مسلمانوں کے سیاسی پیغمبر ہیں" (حق، لکھنؤ، ۷ار دسمبر ۱۹۳۸ء)

علی گڑھ کے پبلک جلسہ میں میونسپل بورڈ کے ایڈریس کے جواب میں کہا کہ:

"یہ امر واضح رہے کہ مسلمان حقیقی اور سچی آزادی چاہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو راج ہو نہ مسلم راج"۔

(وحدت ۵ رفروری ۱۹۳۸ء)

تو اب لیگیوں کے طور پر ان کے قائد اعظم صاحب مسلمانوں کے سیاسی پیغمبر بھی ہو گئے، اور بفرضِ غلط مسلمانوں کی اسلامی سیاست اسلام میں مذہب سے جدا بھی ہوتی تو بھی کون سے ایمان و قرآن سے یہ ثابت ہے کہ حضور اقدس محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا کوئی نیا سیاسی پیغمبر اور وہ بھی ایک بد مذہب رافضی ہو سکتا ہے، انھیں آج کے لیگیوں نے کل کے خلافتیوں کی حیثیت سے کل ایک مشرک گاندھی کو امام مہدی بلکہ نبی بالقوہ بلکہ معناً بالفعل کہہ دیا تھا تو آج لیگ کی آزادی کے زمانے میں ان سے ایک رافضی کو مسلمانوں کا سیاسی پیغمبر کہہ دینا کیا بعید ہے

(بحوالہ مسلم لیگ کی زریں بخیہ گری ۱۳۵۸ھ)

فقیر حقیر اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی" مارہری عفی عنہ خادمِ سجادۂ عالیہ غوثیہ برکاتیہ مارہریہ نے لکھا، اور حسب فرمائش محبِ سنت جناب سیٹھ حاجی اسمٰعیل، حاجی صدیق صاحب قادری اور دیگر ارکانِ جماعت مبارکہ اہلِ سنت مارہرہ ——— سدرشن پریس ایٹہ میں طبع ہو کر دفتر جماعت اہلِ سنت خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ ضلع ایٹہ

دوسرا فتویٰ

استفتاء :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ،

فتویٰ مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور :

کیا فرماتے ہیں علماے دین کہ زید کا خیال ہے کہ ضرورتِ وقت کا خیال کرتے ہوئے تمام کلمہ گو کو ایک جگہ پر جمع ہو جانا چاہیے ، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو . . . . . اور بکر یہ کہتا ہے کہ جب شریعت مطہرہ نے اہلِ بدعت اور اہلِ ہوا سے اتفاق واتحاد کو ناجائز وممنوع رکھا ہے وہ تمام بہتّر فرقے جن میں اہل ہوا اور اہلِ بدعت ہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر منافقین اور مرتدین شامل ہیں ، ان سے اتحاد کیونکر درست ہو سکتا ہے ، اہلِ ندوہ کے خیال اور اقوال بھی اسی طرح کے تھے کہ کسی کی تکفیر جائز نہیں ، تمام کلمہ گو حق پر ہیں ، جملہ مدعیانِ اسلام خواہ وہ کسی مذہب ومشرب (کے ہوں) سب متفق ہو جائیں ، مگر علماے حرمین طیبین نے ان کو گمراہ ، خارج از اسلام بتایا ، ان کے ساتھ مجالست وموافقت کو قطعًا حرام بیان کیا ، اور ان پر کفر کے فتوے دیے ، لہٰذا علماے اہلِ سنت ان چند باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ بحکمِ شرع جواب عنایت فرمائیں ،

۱۔ یہ جماعت مسلم لیگ کیسی ہے ؟ کیا ان سے ہم اہل سنت کا اتحاد واتفاق شرعًا جائز ہے ، اور کیا ان لیڈروں کا رہنما ہونا درست

ہے اور ان پر اعتماد صحیح ہے ؟

۲۔ مسلم لیگ کی حمایت کرنی، اس میں چندہ دینا، اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا کیسا ہے ؟

۳۔ ان کے احوال و اقوال سے گمراہی ثابت ہوتی ہے یا نہیں ؟

۴۔ جب کہ ہنود برسر پیکار اور مسلمانوں کے دشمن ہیں تو موجودہ صورت میں شریعت مطہرہ یہ اجازت دیتی ہے کہ تمام کلمہ گو جن میں رافضی، خارجی، قادیانی، وہابی، نیچری، چکڑالوی سبھی ہیں، اہل سنت کو ان سے متفق و متحد ہونا چاہیے ؟

۵۔ کیا ایسی صورت میں مصلحت وقت اجازت دیتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان واجب الاذعان فَلَا تُوَاكِلُوْهُمْ وَلَا تُشَارِبُوْهُمْ وَلَا تُصَلُّوْا عَلَيْهِمْ وَلَا تُصَلُّوْا مَعَهُمْ کو پس پشت ڈال دیا جائے ؟

۶۔ جو شخص اپنے کو سنّی کہتا ہے، اور پھر مسٹر جناح کو رافضی بلکہ نیچری جانتے ہوئے اپنا پیشوا مانے اور قائد اعظم لکھے اور اس کی حمایت کرے، اور اس کی حمایت کے لیے مبلغ بن کر لوگوں کو اس کی ترغیب دلائے وہ کیسا ہے، اور اس کے لیے کیا حکم ہے ؟

۷۔ زید و بکر میں سے اپنے اپنے قول میں کون حق پر ہے ؟

الجواب وھو الموفق للصواب

۱۔ لیگ میں مرتدین، منکرین ضروریات دین شامل ہیں، اس لیے

اہل سنت والجماعت کا اس سے اتحاد و اتفاق نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ وہ توبہ کریں، لیگ کے لیڈروں کو رہنما سمجھنا یا ان پر اعتبار کرنا منافقین و مرتدین کو رہنما بنانا اور ان پر اعتبار کرنا جو شرعاً ناجائز ہے، کسی طرح بھی جائز نہیں،

۲۔ لیگ کی حمایت کرنا، اس میں چندہ دینا اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا، منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا اور دینِ اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے،

۳۔ لیگی لیڈروں کے افعال و اقوال سے ان کی گمراہی مہر نیمروز سے زائد روشن ہے، مرتد تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں میں شیخ الاسلام اور حکیم الامت کہا جاتا ہے، اشرف علی زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں، مسٹر محمد علی کو قائدِ اعظم، سیاسی پیغمبر، ہندو مسلم اتحاد کا پیغامبر بتایا جاتا ہے ...
۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء کے خلافتی دور گاندھویت والے اسلام کش اور ایمان سوز ہندو مسلم اتحاد کی یاد میں ترانے گائے جاتے ہیں، مسٹر جناح کو قائدِ ملت، رہبرِ اعظم، رہنمائے محترم، مخدومنا، ذاتِ گرامی، تم سلامت رہو ہزار برس، مسلم ہے ترا غمخوار جناح، رہبر ہے ترا سردار جناح وغیرہ کہا جاتا ہے
ایسی صورت میں وہ لوگ جو ساڑھے تیرہ سو برس والے اصلی سچے مذہبِ اہلِ سنت پر قائم ہیں وہ اس مسلم لیگ کی شرکت و ممبری کیونکر روا رکھ سکتے ہیں؟

۴۔ بصورتِ مسئولہ میں مرتدین و منافقین سے اتحاد و اتفاق ہرگز

جائز نہیں، جب تک وہ بامِلان اپنے عقائدِ باطلہ کفریہ، شرکیہ
سے توبہ نہ کرے،

۵۔ مصلحتِ وقت کوئی شے نہیں، شریعتِ مطہرہ عین مصلحت
ہے، اس سے روگردانی کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے،
فرمانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہر آن فرض ہے،
خواہ دنیا بھر میں ایک ہی مسلمان رہے،

۶۔ اس شخص پر واجب ولازم ہے کہ فوراً توبہ کرکے سچا پکا مسلمان
بن جائے، اگر رافضی کی تعریف حلال اور جناح کو اس کا اہل
سمجھ کر کرتا ہے تو وہ مرتد ہو گیا، اس کی بیوی اس کے نکاح سے
نکل گئی، مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس سے کلی مقاطعہ کریں،
یہاں تک کہ وہ توبہ کرے،

۷۔ زید سخت غلطی پر ہے، اس کو اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہوئے
فرمانِ خداوندی پر ایمان لانا چاہیے، مصلحت وہی ہے جو
اللہ جل جلالہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد
فرمائیں، بکر حق پر ہے، اللہ تعالیٰ اسے حق پر ثابت و مستقیم
رکھے، واللہ تعالیٰ اعلم،

حقیر فقیر درماندہ از نفس شریر ابوالبرکات سید احمد عفرلہ، ناظم دارالعلوم
مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور

الجواب: ما حررہ استاذنا العلامہ فھو حق وصواب۔

فقیر ابوالطاہر محمد طیب قادری دانا پوری غفر اللہ
ذنبہ المعنوی والصوری

علامہ اقبال پر کرم فرمائی!

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

قائداعظم اور مسلم لیگ کے بعد علامہ اقبال پر نظرِ عنایت ہوتی ہے،
مولانا محمد طیب فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور تحریر فرماتے ہیں:

"فلسفی نیچریت ڈاکٹر اقبال صاحب نے اپنی فارسی وار دو نظموں میں دہریت اور الحاد کا زبردست پروپیگنڈا کیا ہے، کہیں اللہ عزوجل پر اعتراضات کی بھرمار ہے، کہیں علمائِ شریعت و ائمۂ طریقت پر حملوں کی بوچھاڑ ہے، کہیں سیدنا جبریل و سیدنا موسیٰ کلیم اللہ و سیدنا عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تنقیصوں توہینو کا انبار ہے، کہیں شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا وآلہ الصلوٰۃ والتحیۃ واحکامِ مذہبیہ وعقائد اسلامیہ پر تمسخر واستہزاء وانکار ہے کہیں اپنی زندیقیت وبے دینی کا فخر ومباہات کے ساتھ کھُلا ہوا اقرار ہے۔" (ص ۳۲۴)

"وہ خود (ڈاکٹر اقبال) اللہ عزوجل کی بارگاہ میں بکمال جرأت و جسارت گستاخیاں، بے ادبیاں کرتے رہتے ہیں۔" (ص ۳۲۷)

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فلسفہ کی حقیقت بھی فاضلِ مذکور کی زبانی ملاحظہ ہو:

"ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ کی حقیقت صوفی و مُلّا پر پھبتیاں اُڑانا اللہ عزوجل کو کھری کھری بے نقط سُنانا، حور، فردوس و قصورِ جنت کے معانی ضروریۂ دینیہ سے انکار کرنا، یورپ کی لیڈیاں، یورپین طرز کی کوٹھیاں، ان کی مراد بتانا، ابلیس کی عظمت کے گیت اور

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

کے ترانے گانا غرض کھُل کر زندیق ہو جانا ہے ، (ص ۳۴۳)

"اگر ان اعتقادات کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی اور اسلام گھڑ لیا ہے ، اور وہ اپنے گھڑے ہوئے اسلام کی بناء پر مسلمان ہیں ۔" (ص ۳۴۵)

"ڈاکٹر صاحب نے کمال صاف گوئی کے ساتھ اس امر کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ ان کو نیچریت و دھریت و زندیقیت یورپ کے فرنگیوں نے سکھائی ۔" (ص ۳۴۶)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معروف نظم "شکوہ" ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی ، یہ نظم اس قدر زبان زد عوام ہوئی کہ بریلوی عوام و علماء نے "شکوہ" کے مندرجہ ذیل شعر پر کفر کا فتویٰ دیا ۔

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے "جوابِ شکوہ" لکھا ، اس پر بھی مولینا ابوالخیر دیدار علی (جو بریلوی رہنماؤں کے اعلیحضرت مولانا احمد رضا خاں کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں ، اور اپنے گروہ میں امام المحدثین کہلائے جاتے ہیں) خطیب مسجد وزیر خاں لاہور نے اقبال کی تکفیر کی ، بلکہ تمام مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ ان سے ملنا جلنا ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے (ذکرِ اقبال ص ۱۲۹ مصنفہ عبد المجید)

فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف مولانا محمد طیب صاحب جواب شکوہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "پھر صنــ۲۲ سے ۲۳۲ تک جواب شکوہ گھڑا"، یعنی ڈاکٹر صاحب کے شکوہ کا اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا (العیاذ باللہ تعالیٰ) اس میں صــ۲۲۴ پر اللہ عز وجل کی طرف سے اس اعتراض (جو مصنفِ کتاب نے پہلے ذکر کیا ہے) کا بھی جواب گھڑا، سے

کیا کہا! بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں! ہوا کافر تو ملے حور و قصور

ان شعروں کی شرح کرنے کے بعد فاضل موصوف لکھتے ہیں:
"آہ آہ! اے پیارے سُنی مسلمان بھائیو! بنگاہِ ایمان و بنظرِ انصاف ملاحظہ فرماؤ، یہ وہی کفری ملعون مضمون ہے جو مرتد اعظم عنایت اللہ مشرقی کی ناپاک کتاب کفرِ معاب "تذکرۂ ملعونہ" کا ہے۔"

کفر کے مندرجہ بالا فتاویٰ پر جن بریلوی علمائے کرام نے دستخط کیے ان کی فہرست سیکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن طوالت کے باعث چند ایک بریلوی علماء کے خیالات حسبِ ذیل ہیں:

"بحکم شریعت مسٹر جناح کے کافر، مرتد ہونے کے لیے اس کا اثنا عشری رافضی ہونا ہی بس ہے۔"

مولانا محمد طیب فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور:-

"مسٹر محمد علی جناح کو قائداعظم کہنا حرام، مخالفِ قرآن مجید و حدیث حمید ہے۔"

چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ مسٹر محمد علی جناح کو قائداعظم کے لقب سے خطاب کرنا کیسا ہے؟ مولانا اولادِ رسول صاحب قادری برکاتی تحریر فرماتے ہیں:

"کسی بھی بد دین، بد مذہب کو قائداعظم وسیدنا وغیرہ وغیر القاب مدح و تعظیم سے خطاب کرنا شرعاً سخت شنیع و قبیح و قطیع اشد محظور و ممنوع و حرام، صریح مخالفِ قرآن مجید و حدیث حمید ہے۔"

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ:

"قائداعظم کی تعریف کرنے والوں کا نکاح ٹوٹ گیا، اسلام لا کر نکاح پھر پڑھوائیں، ورنہ پیدا ہونے والی تمام اولاد حرام ہو گی۔"

(مولانا ابوالبرکات ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف کا فتویٰ)

فتوے کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"اگر رافضی کی تعریف حلال اور جناح کو اس کا اہل سمجھ کر کرتا ہے تو وہ مرتد ہو گیا، اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی، مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس سے کلی مقاطعہ (بائیکاٹ) ——— کریں، یہاں تک کہ وہ توبہ کرے۔"

مولانا محمد طیب فاضل حزب الاحناف اپنی ایک کتاب "تجانب اہل سنت" ص ۱۲۲ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"بحکم شریعت مسٹر جینا اپنے ان عقائدِ کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد خارج از اسلام ہے، اور جو شخص اس کے ان

کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے، وہ بھی کافر ہے ''

مولانا ابوالبرکات صاحب:

''کون سے دین و قرآن نے اسے جائز رکھا کہ خود مسلمانوں پر کفار و مشرکین و مرتدین کی حکومت قائم کرنے کے لیے مسلمان اپنی جانی و مالی قربانیاں پیش کرے، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ''

شیر بیشۂ سنت مولوی حشمت علی صاحب:

''رہا مطالبۂ پاکستان یعنی تقسیم ملک کہ اتنا لیگیوں کا، اتنا ہندوؤں کا، اس صورت میں احکام کفر ملک کے بڑے حصہ میں لیگیوں کی رضا سے جاری ہوں گے، کہ وہی اس تقسیم پر راضی اور اس کے طالب ہیں، احکام کفر پر رضا کفر اور کم از کم سخت بے دینی ہے ''

شیر بیشۂ سنت مولوی حشمت علی خاں نے ایک دوسرے مقام پر صاف مسلم لیگ کی حکومت کو کفری سلطنت قرار دیا ہے۔

جب مسلم لیگی حضرات کی جانب سے یہ کہا گیا کہ ہم حضرت قائد اعظم کو صرف ایک عظیم سیاسی رہنما سمجھتے ہیں، دینی و مذہبی امور میں ہم ان کو قائد و رہبر قرار نہیں دیتے، تو اس پر بریلویوں کے سرخیل شیر بیشۂ سنت یوں گویا ہوتے ہیں:

''اگر لیگی لیڈران سچے ہیں اور مسلمانوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتے

تو وہ ظفر علی خاں، نواب سمٰعیل خاں، سر سکندر حیات خاں،
مسٹر فضل حق، مولوی عبدالحامد، مولوی قطب الدین عبدالولی
صاحبان وغیرہم اہم ذمہ دار لیگیوں سے ہمیں اس کی تحریر
لے دیں کہ لیگی لیڈران مسٹر جناح کو ایک کافر بیرسٹر سے زیادہ
حیثیت نہیں دیتے۔"

بریلوی علماء کا فتویٰ: "قائدِ اعظم کو کافر نہ سمجھنے والے بھی کافر اور مرتد ہیں۔"

"اسی پیر نیچر کے اذناب و متبعین و مقلدین و معتقدین وہ مرتدین
نیا چرہ ہیں جو مسلمانوں کے دین و ایمان اور ان کے دنیوی سروسامان
پر ڈاکے ڈالنے کے لیے ہمیشہ نئی نئی کمیٹیاں، نئی نئی پارٹیاں گھڑتے
رہتے ہیں، اور کبھی بندگانِ زر اور بدنام کنندہ نکونامے چند نام
کے مولویوں کو اپنے کفری مقاصد کی ترویج و اشاعت کے لیے
اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء و
خدامِ کعبہ و خلافت کمیٹی و جمعیۃ علماء ہند و خدام الحرمین و اتحاد ملت و
مجلسِ احرار و مسلم لیگ و اتحاد کانفرنس و مسلم آزاد کانفرنس و
نوجوان کانفرنس و غازی فوج، و جمعیۃ تبلیغ الاسلام انبالہ و سیرت
کمیٹی پٹی ضلع لاہور و امارت شرعیہ بہار شریف و آل پارٹیز
کانفرنس وغیرہ کمیٹیاں اسی مقصد کے لیے انھیں کفرۂ نیاچرہ نے
اپنی نیچریت و دہریت پھیلانے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو دین سے
آزاد اور دنیوی سروسامان سے بھی تہی دست بنانے کے لیے وقتاً
فوقتاً خود اپنے ہاتھوں سے یا دیگر بددینوں، بدمذہبوں کو اپنا شریک
کار بنا کر یا بعض جاہلوں، سادہ لوح بیوقوفوں یا چند دین فروش دنیا خرید

ملانوں کو اپنے دامِ فریب میں پھانس کر انھیں اپنا آلۂ کار بنا کر گھڑی ہیں !!

سُنّی مسلمان بھائیو ! یہ ہیں لیگ کے خیالات، یہ ہیں لیگ کے ارشادات ان سب کو دیکھنے کے بعد بھی جس کا دل چاہے لیگ کی موافقت کرے جو چاہے مخالفت کرے، ہم اپنا فرض ادا کر چکے، البتہ ہم اتنا کہے دیتے ہیں کہ کانگریس اور احرار لیگ اور خاکساران چاروں سے دور اور سب بدمذہبوں ... اور بے دینوں سے بیزار و نفور رہو، ساڑھے تیرہ سو برس والے دین اسلام و مذہب اہل سنت پر استقامت اختیار کرو،

(اراکین جماعت مبارکہ اہل سنت محلہ محتشم خاں، پیلی بھیت، پنجشنبہ ۱۱ صفر ۱۳۵۹ھ)

فتاویٰ سمیت مندرجہ بالا تمام اقتباس بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء کی حسب ذیل کتب سے ماخوذ ہیں:

مسلم لیگ کی زریں بخیہ گری، احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ، اعلام الاعلام بان الہندوستان دارالسلام تجانب اہل السنۃ، قہر القادر علی الکفار اللیاذر، الجوابات السنیہ علی زہار السوالات اللیگیہ،

(کاروان احرار، ج ۴)